سسپنس ڈائجسٹ کا مقبول سلسلہ

موت کے سوداگر



حصہ 12



ایک نوجوان کی خود نوشت جواپنوں کے ہاتھوں برباد ہوکر منزل کا نشان کھو بیٹھا تھا۔ اُن نوجوانوں کی داستان عبرت جن کی پرورش رشوت کے مال سے ہوئی تھی۔ زر پرستوں کا احوال جنھیں سونے چاندی کی خیرہ کُن چمک نے بینائی سے محروم کردیا تھا۔ موت کے اُن سوداگروں کا ماجرا جو اپنے بچوں کو اپنے ہی ہاتھوں زہر پلا رہے ہیں۔

سسپنس کا ایک تعمیری سلسلہ، مدہوشوں کی کہانی، ہوشمندوں کی عبرت کے لیے

اس ٹھکانے پر البرٹو و یلیسا کے ساتھ سات مقامی افراد موجود تھے۔ اُن میں سے چار زخمی حالت میں پکڑے گئے تھے۔ ایک اس عمارت کی چھت پر مارا گیا تھا۔ بقیہ دو افراد آخری مرحلے پر البرٹو کے ساتھ ایک کمرے میں محبوس تھے اور اس نے خود ہی فائرنگ کرکے انہیں ٹھکانے لگانے کی کوشش کی تھی لیکن وہ دونوں ہی کاری زخم کھانے کے باوجود زندہ تھے البتہ اُن کے زخموں سے خون بہت تیزی کے ساتھ بہہ رہا تھا۔

بمپرٹو نامی دیوہیکل ٹرک 'اسلام آباد میں اسپیشل ٹاسک فورس کے ٹھکانے پر رکا تو اس کے عقبی حصے سے اترنے والوں نے بتایا کہ البرٹو کے ہاتھوں زخمی ہونے والے دونوں قیدیوں نے راستے میں دم توڑ دیا تھا۔ اس طرح البرٹو ویلیسا سمیت' مرنے والوں کی تعداد چار ہوگئی تھی جب کہ چار زندہ قیدی موجود تھے۔

کمانڈر نے نہایت تپاک کے ساتھ ہم لوگوں کا استقبال کیا کیونکہ ہم لوگوں نے اس کی توقع سے کہیں زیادہ تیزی کے ساتھ البرٹو کا کھوج لگا کر اسے نیست و نابود کردیا تھا لیکن جب اوّل خان نے اسے بٹ نامی کمانڈو کے بری طرح زخمی ہونے کے بارے میں بتایا تو وہ بھی اداس اور دل گرفتہ ہوگیا۔ ایسا معلوم ہورہا تھا کہ جیسے زخمی کمانڈو اسپیشل ٹاسک فورس میں اپنی بے جگری کی وجہ سے ہر ایک کا منظور نظر رہا ہو۔

زندہ قیدیوں کو وہیں اتار لیا گیا۔ لاشیں اسی ٹرک کے ذریعے اسپتال روانہ کرنے کا پروگرام تھا۔ کمانڈر ہم دونوں کے ساتھ ٹرک کے عقبی حصے میں چڑھ گیا تاکہ اپنی نگاہوں سے لاشوں کا جائزہ لے سکے۔

ٹرک کے آہنی فرش پر کافی خون پھیلا ہوا تھا۔ بعض جگہوں پر اس نے سیاہی مائل لوتھڑوں کی شکل اختیار کرلی تھی' بغیر چہرے والی لاش تو بھیانک تھی ہی لیکن البرٹو ویلیسا کا چہرہ بھی بری طرح مسخ ہوکر رہ گیا تھا۔ کمانڈر نے خاص طور پر اس کے دونوں ہاتھوں کا جائزہ لیا اور بے اختیار اس کے ہونٹوں سے ایک گہرا سانس آزاد ہوگیا کیونکہ البرٹو کی دونوں ہتھیلیوں کی پشت اور کلائی کے نچلے جوڑ کی جِلد پر عملِ جراحت کے بہت باریک سے نشانات واضح طور پر نظر آرہے تھے۔

"ہم عمر بھر اس پر شبہ بھی نہیں کرسکتے تھے۔" کمانڈر نے میری پشت پر ہاتھ رکھ کر' بوجھل آواز میں کہا۔ "پتا نہیں ان سفاک مجرموں نے بے چارے ظفر کو کیسی کیسی اذیتیں دے

کمارا ہوگا۔"

میں خاموش ہی رہا۔ ہم تینوں ٹرک سے نیچے اتر آئے اور اوّل خان کی ہدایت پر چھ آدمی لاشوں کے ساتھ اسی ٹرک پر روانہ ہوگئے۔

اول خان اس آپریشن کی رسمی رپورٹ تیار کرنے کے لئے کمانڈر کے ساتھ اس کے دفتر میں چلا گیا اور میں ویرا کے ساتھ عمارت کے رہائشی حصے میں لوٹ آیا جہاں ہمارا قیام تھا۔

"البرٹو بھی آخر کار اپنے انجام کو پہنچ ہی گیا۔" ویرا نے تھکے ہوئے انداز میں کہا "رفتہ رفتہ یہ بات ثابت ہوتی جارہی ہے کہ کسی بھی ملک کے قانون سے لڑنے والے لمبی مدت کے لئے نہیں پنپ سکتے۔ قانون کے محافظوں کے ساتھ آنکھ مچولی کا کھیل طویل تو ہوسکتا ہے لیکن آخر کار جیت قانون ہی کی ہوتی ہے۔"

"یہ تو بہت پرانا کُلیہ ہے۔ حیرت ہے کہ بات اب تمہارے پلے پڑ رہی ہے!" میں نے کہا "اردو میں مشہور کہاوت ہے کہ سو دن چور کے‘ ایک دن کوتوال کا۔ اور وہی دن چور کو لے ڈوبتا ہے۔"

"ہر شخص کو ہر کہاوت کی سچائی کا ثبوت آسانی سے نہیں ملتا۔" وہ مضمحل سی مسکراہٹ کے ساتھ بولی "تم البرٹو و یلیسا پر اپنا محاورہ چست کررہے ہو لیکن اس کے آدمیوں کے ہاتھوں بری طرح زخمی ہونے والے کمانڈو کو کہاں لے جاؤ گے؟ وہ کسی بھی اعتبار سے مجرم نہیں تھا۔ اسے زندہ رہنا چاہئے تھا لیکن مجھے اندیشہ ہے کہ وہ جانبر نہ ہوسکے گا۔ اپنے مقصد کی سچائی کے باوجود وہ خسارے میں رہا۔"

"یہ تمہارا فلسفہ ہوسکتا ہے مگر مجھے اس سے اختلاف ہے۔ اس نے اپنے خون سے ایک مقصد اور مشن کی آبیاری کرکے دوسروں کے لئے مثال قائم کی ہے۔ وہ مر بھی گیا تو اس کا نام عزت اور احترام سے لیا جائے گا۔ تم اسے البرٹو کی صف میں شمار نہیں کرسکتیں۔"

ویرا اچانک مسکرانے لگی۔ "تم لوگوں نے موت کو بھی بہت سے خانوں میں بانٹا ہوا ہے۔ حرام موت‘ ذلت کی موت‘ بے مقصد موت‘ باعزت موت اور پھر شہادت! تمہارے مذہب میں لڑنے مرنے والوں کے لئے بھی ایک ایسا ہی اچھوتا اعزاز رکھا گیا ہے کہ مسلمان سپاہی موت سے بے خوف ہوکر‘ شہادت کی آرزو میں بس لڑتا ہی چلا جاتا ہے۔ جدید ہتھیاروں وغیرہ کو نکال لیا جائے تو شاید آج بھی بہترین جنگ جو سپاہی مسلمان خطوں سے ہی ملتے ہیں ورنہ حقیقت صرف اتنی سی ہے کہ مرنے والا مرجاتا ہے۔ اس کے لیے زندگی ایک بھولا ہوا سا خواب بن کر رہ جاتی ہے۔ موت کے بعد اسے کس نام سے پکارا جاتا ہے‘ اس سے موت کی اٹل حقیقت میں ذرا سی بھی تبدیلی نہیں آتی۔۔۔۔۔"

"مجھ سے اس موضوع پر بحث نہ کرو" میں نے اس کی بات کاٹتے ہوئے کہا "میں بہت زیادہ باعمل مسلمان نہیں ہوں لیکن پھر بھی میں اس بارے میں بے تکان تقریر کرسکتا ہوں۔"

"کہیں ایسا تو نہیں کہ تمہارے شی سے منحرف ہونے میں بھی اسی بات کا دخل رہا ہو؟"

"کس بات کا؟" اس کا مفہوم واقعی میرے پلے نہیں پڑسکا تھا۔

"ہیروئن فروش کی موت تمہارے معاشرے میں کسی عزت واحترام کی حق دار نہیں ہوتی۔"

"تم بلاوجہ بات سے بات پیدا کرنے کی کوشش کررہی ہو۔ تم اچھی طرح جانتی ہو کہ میرے انحراف کی وجوہ بہت مختلف اور ٹھوس تھیں۔ تم خود بھی ان کے جواز کی قائل تھیں۔ اگر جمی لائیڈ کے قول وفعل میں متعصبانہ تضاد سامنے نہ آتا تو شاید میں آج بھی اسی کے لئے کام کررہا ہوتا۔"

"تم بعض اوقات ضرورت سے زیادہ سنجیدہ ہوجاتے ہو۔" وہ دلفریب مسکراہٹ کے ساتھ بولی "اسی لئے کبھی کبھار تمہیں خواہ مخواہ چڑانے میں لطف آتا ہے۔"

البرٹو ویلیسا کا نام جس زور وشور کے ساتھ ہم لوگوں کے سامنے آیا تھا‘ اس کا قصہ اسی قدر اچانک نمٹ گیا تھا۔ یہ اور بات تھی کہ اول خان اسے زندہ گرفتار کرنے کی حسرت پوری نہ کرسکا۔ حالات نے اچانک ہی ایسا موڑ لیا کہ اول خان اس کے ناپاک وجود پر اپنی کلاشنکوف کا میگزین خالی نہ کرتا تو وہ اسپیشل ٹاسک فورس کے‘ نہ جانے کتنے آدمیوں کو ہلاک اور زخمی کرڈالتا۔

اس بارے میں اب صرف دو نکات قابلِ غور رہ گئے تھے۔ اول یہ کہ اولیانو کی فیکس مشین پر البرٹو کے لئے آنے والے مبہم سے پیغام کا اصل مقصد کیا تھا؟ دوم یہ کہ اس کا وہ تربیت یافتہ بندر کہاں تھا جو اولیانو کے دفتر کے ویران مضافات میں مقابلے کی رات زندہ بچ گیا تھا؟ اس رات وہاں دو بندر دیکھے گئے تھے۔ ایک کو میں نے مار ڈالا تھا جب کہ دوسرا غائب ہوگیا تھا۔ اس بندر کے ہاتھ نہ آنے کا مطلب تھا کہ البرٹو‘ سیٹلائٹ ٹاؤن والے مکان کے علاوہ کسی اور ٹھکانے پر بھی قابض تھا جہاں وہی ایک نہیں بلکہ دوسرے تربیت یافتہ اور زیرِ تربیت بندر موجود ہوسکتے تھے۔

مجھے اس بارے میں قیدیوں سے کوئی امید نہیں تھی۔ البرٹو ویلیسا ایسا کچا مجرم نہیں تھا جو غیر ضروری طور پر‘ مقامی بدمعاشوں کو اپنے اصل مقاصد کی ہوا لگنے دیتا۔ اس نے یقینی طور پر محدود مقاصد کے لئے ان کی خدمات حاصل کی ہوں گی اور وہ بدترین تشدد کے باوجود اس سے آگے کی بات بتانے سے قاصر ہوتے۔

وہ پنڈی اور اسلام آباد کی الجھنیں تھیں جو البرٹو ویلیسا کا پتا صاف ہونے کے بعد ثانوی حیثیت اختیار کرگئی تھیں اور کراچی کے معاملات میرے ذہن میں ڈنک مارنے لگے تھے۔

اول خان کے فرض شناس آدمیوں نے ہدایت ملتے ہی ان مشکوک اور مسلح افراد کو مار بھگایا تھا جو غزالہ اور سلطان شاہ کا تعاقب کرکے انہیں ہراساں کررہے تھے۔ اس کامیابی کے باوجود وہ لوگ ان دونوں کی نگرانی کررہے تھے لیکن میرے لئے اس دھمکی کو یکسر فراموش کردینا ناممکن تھا جو غزالہ کو اغوا کرکے علاقہ غیر میں فروخت کردینے کے بارے میں دی گئی تھی۔ صورتِ حال کی نزاکت کا تقاضا تھا کہ میں جلد از جلد کراچی پہنچ کر ان دہشت گردوں کے مطالبات سے واقف ہونے کی کوشش کروں تاکہ کوئی ناگوار واقعہ پیش آنے سے پہلے اس کا تدارک کیا جاسکے۔ اسی کے ساتھ ساتھ یہ خبر بھی تشویشناک تھی کہ کوئی چینی جو ڈون کوانگ فو کا گُرگا تھا‘ میرے بارے میں متجسس ہوچکا تھا۔

میں اپنے انہی خیالات میں گم تھا کہ دروازے پر ہلکی سی دستک کے بعد اول خان اندر آگیا۔ اس کے پیچھے ہی ایک آدمی بھاپ اڑاتی ہوئی‘ گرم گرم چائے کی پیالیوں کی ٹرے لئے موجود تھا۔

"میرا خیال تھا کہ اس بھاگ دوڑ کے بعد تم دونوں چائے کی ضرورت محسوس کررہے ہوگے۔" اس نے اندر داخل ہوتے ہوئے خوش دلی کے ساتھ کہا۔

اس کا آدمی چائے کی ٹرے تپائی پر رکھ کر باہر چلا گیا تو میں نے کہا "چائے سے زیادہ تمہاری ضرورت محسوس ہورہی تھی۔ معلوم ہوتا ہے کہ تم بہت زیادہ تھک گئے ہو۔"

"تھکا نہیں ہوں‘ میرا بس چلتا تو آج البرٹو ویلیسا کے خاتمے کی خوشی میں یہاں جشن برپا کروادیتا۔۔۔۔۔"

"وہ تو اب بھی ہوسکتا ہے۔" ویرا نے اس کی بات درمیان میں سے ہی اچک لی۔ "ایک بوتل کے ساتھ اپنے کمانڈر کو یہاں لے آؤ۔ رات بھر قرب وجوار میں کوئی نہیں سوسکے گا۔ میں شرط لگا کر دعویٰ کرتی ہوں کہ اسے قوالیاں گانے پر مجبور کردوں گی۔"

"وہ بہت جہاندیدہ آدمی ہے۔ اس کا رویّہ ہمیشہ اپنے منصب کے شایانِ شان رہتا ہے۔" اول خان نے مسکراتے ہوئے‘ دھیمی آواز میں کہا "میرا مطلب جشن شراب نوشی سے نہیں بلکہ اصلی جشن سے تھا لیکن بٹ کے بری طرح زخمی ہوجانے کی وجہ سے ہر ایک کو ذہنی صدمہ پہنچا ہے۔ میں خود بھی دل وجان سے اس کی مردانگی کی قدر کرتا ہوں۔ ایسے دلیر آدمی کا یوں مار لیا جانا میرے لئے اذیت ناک ثابت ہوا تھا۔"

"اب اس کی کیا حالت ہے؟" میں نے پُرتشویش لہجے میں پوچھا۔

"یہ معجزہ ہی ہے کہ اس کا اوپری دھڑ بالکل محفوظ رہا اور ساری گولیاں ٹانگوں میں لگیں۔ لیکن وہ خون اور مٹی میں اس بری طرح لتھڑ گیا تھا کہ ہمیں کوئی اندازہ ہی نہیں ہوسکا۔ اس کی داہنی ٹانگ کی دو ہڈیاں بری طرح ٹوٹی ہیں اور کمبائنڈ ملٹری اسپتال کے تین ماہر ترین سرجن کی مائیکرو سرجری میں مصروف ہیں۔ وہ بچ تو جائے گا لیکن دعا کرو کہ اسے معذوری کے عذاب سے دوچار نہ ہونا پڑے۔"

"یہ مائیکرو سرجری کیا بلا ہوتی ہے؟" ویرا نے دلچسپی کے ساتھ سوال کیا۔

"مجھے جو کچھ بتایا گیا ہے‘ اس کے مطابق ہڈی کے کئی چھوٹے چھوٹے ٹکڑے ہوجانے پر‘ ان تمام ٹکڑوں کو کسی خاص دھات کے تار یا قابلے میں پروکر‘ انہیں ان کے اصل مقام پر بٹھائے جانے کا عمل مائیکرو سرجری کہلاتا ہے۔" اول خان نے مدافعانہ لہجے میں بتایا۔ "اس کے لئے خاص مہارت اور احتیاط کی ضرورت ہوتی ہے۔"

"اس کی زندگی کی نوید نے تمہارے موڈ پر خاصا خوش گوار اثر ڈالا ہے۔" میں نے کہا۔

"یہ بھی ایک اہم سبب ہے لیکن البروٹو ویلیسا کے غیر متوقع خاتمے نے خفیہ اداروں میں کھلبلی مچادی ہے۔ اس کی موجودگی کا معاملہ پوری طرح ابھرنے سے پہلے ہی اس کی لاش کی ڈرامائی اطلاع سے ہر طرف بھونچال آگیا ہے اور ہماری فورس پھر سرخرو ہوگئی ہے۔"

"ہر کام اپنے وقت پر اور اپنی رفتار سے ہوتا ہے لیکن ایسی پیشہ ورانہ رقابتیں بعض اوقات بددلی پیدا کرنے کا سبب

بھی بن جاتی ہیں۔" ویرا بولی۔ "کل تک سب اسپیشل ٹاسک فورس کے بنیادی ڈھانچے کو تنقید کا نشانہ بنا رہے تھے اور آج وہ کوئی اور جواز پیدا کرکے البرٹو ویلیسا کی ہلاکت کی اہمیت کو گھٹانے کی کوشش کریں گے۔"

"آج کوئی زبان نہیں کھول سکے گا۔" اول خان کے لبوں پر پُراعتماد مسکراہٹ رینگ آئی۔ "وزارتِ داخلہ میں اس وقت ایک ہنگامی اجلاس کرلیا گیا ہے۔ جہاں ہمارا کمانڈر' اپنے بڑوں کے ساتھ تفصیلی بریفنگ دے گا۔ میں کمانڈر کو رخصت کرنے کے بعد ہی ادھر آیا ہوں۔"

"اور وہ چاروں قیدی کہاں ہیں؟" میں نے فوراً ہی اگلا سوال داغ دیا۔

"وہ اسی عمارت میں ہیں۔ انہیں ضابطے کی پوچھ گچھ کے بعد ہی کہیں بھیجا جائے گا۔"

"تمہارے آدمیوں نے اُن پر فوراً کام شروع کردیا ہوگا۔ وہ کیا کہتے ہیں۔"

"فی الحال ان کی زبانیں بند ہیں۔ اُن کے زخموں پر پسی ہوئی مرچیں چھڑکنے کی تیاریاں ہو رہی ہیں۔ چائے پینے کے بعد انہیں دیکھیں گے۔"

"میرا خیال ہے کہ اب شہباز خان کو بھی اٹھوا لیا جائے۔" میں نے چونک کر کہا۔ "ان چاروں کے مقابلے میں وہ البرٹو ویلیسا یا نقلی ظفر سے زیادہ قریب تھا۔"

"تم ٹھیک کہتے ہو۔" اول خان اضطراری طور پر اٹھ کر کھڑا ہوا۔ "اسے البرٹو کے عبرت ناک انجام کی بھنک بھی مل گئی تو وہ روپوش ہوجائے گا۔ مجھے فوراً ہی ایک پارٹی اس کی طرف روانہ کردینی چاہئے تھی۔"

ہم تینوں اپنی پیالیاں خالی کرکے فوراً ہی اس کمرے سے نکل آئے اور اول خان کے دفتر کی طرف چل دیئے جہاں اس وقت بھی خاصی چہل پہل تھی۔

اسپیشل ٹاسک فورس کا نظام اس قدر سلجھا ہوا اور سیدھا سادا تھا کہ اول خان کو اپنے آدمیوں کو نئے مشن پر روانہ کرنے میں بمشکل دس منٹ صَرف ہوئے۔ اس کے بعد وہ ہمیں لے کر ایک اندرونی کمرے کی طرف چل دیا جہاں اس کے دو مسلح آدمی' چاروں قیدیوں کی نگرانی کر رہے تھے۔

وہ چاروں مضبوط رسیوں سے علیحدہ علیحدہ کرسیوں میں جکڑے ہوئے تھے۔ ان کے متوحش چہروں سے خوف اور سراسیمگی کا اظہار ہو رہا تھا۔ ہمارے قدموں کی چاپ سن کر ان چاروں نے ہی ہماری طرف گردنیں گھمائی تھیں پھر اُن میں سے ایک کی آنکھوں میں شناسائی کی تحیّر آمیز سی چمک نظر آئی۔ اس وقت وہ شخص میری طرف نگراں تھا اور بس مجھے ہی دیکھے جا رہا تھا۔

"اب کہو! تمہارے کیا ارادے ہیں؟" اول خان نے کمرے کے وسط میں پہنچ کر گونجیلی آواز میں کہا "ہم قیدیوں پر زیادہ محنت کرنے کے عادی نہیں ہیں۔ تمہارے زخموں پر مرچیں چھڑکیں گے۔ اس پر بھی تمہیں ہوش نہ آیا تو انہی آہنی کرسیوں سے برقی رو گزاری جائے گی اور زبان نہ کھولنے کی صورت میں یہی برقی جھٹکے تم چاروں کو اپنے مردود مالک کے پاس پہنچا دیں گے۔"

دو آدمی دہشت زدہ ہوکر اپنے ہونٹوں پر زبانیں پھیرنے لگے۔ تیسرے کی حالت میں کوئی نمایاں تبدیلی رونما نہیں ہوئی لیکن مجھے دیکھ کر چونکنے والا چوتھا بدمعاش دھیمی آواز میں بولا "میرا خیال ہے کہ ہم لوگوں کو ایک دوسرے کے بارے میں غلط فہمی ہوئی ہے۔ ظفر دادا تم لوگوں کی لائن کا آدمی نہیں تھا۔ تم بلاوجہ ہی اس پر چڑھ دوڑے تھے۔ اب یہ معاملہ یہیں ختم ہوجانا چاہئے۔"

"کیسی غلط فہمی؟ تم کیا بکواس کر رہے ہو؟" اول خان بگڑ کر غرّایا۔

میں نے پھرتی کے ساتھ اسے روک لیا۔ "ٹھہرو! اس کی بات سن لینے میں کوئی حرج نہیں ہے۔ ہوسکتا ہے کہ یہ بھی کوئی دلچسپ کہانی ہو" پھر میں... اسی بندھے ہوئے شخص سے مخاطب ہوگیا۔ "تم جو کہنا چاہتے ہو' رکے بغیر سناتے جاؤ' ورنہ میرے ساتھی کا دماغ سنک گیا تو تمہارے ستارے گردش میں آجائیں گے۔"

"ڈپٹی صاب! میں نے تمہیں پہچان لیا ہے۔" وہ بھرائی ہوئی آواز میں بولا "میں کئی برس پہلے کراچی میں تم سے ملا تھا۔ مجھے معلوم ہے کہ تم کراچی کے ہیروئن کنگ ہو۔ ظفر دادا کا تمہاری لائن سے دور کا بھی واسطہ نہیں تھا۔ تم بلاوجہ ہی اس بے چارے پر چڑھ دوڑے تھے۔ تمہاری نفری اور تیاری دیکھ کر ہم تم لوگوں کو سرکاری آدمی سمجھ رہے تھے اس لئے ہم نے اپنی زبانیں بند رکھی ہوئی تھیں۔ اب میں نے تمہیں پہچان لیا ہے تو ہم لوگوں کو اس مصیبت سے نجات ملنی چاہئے۔ ہم تمہیں ہر بات صاف صاف بتا دیں گے۔"

"میرا خیال ہے کہ یہ ٹھیک کہتا ہے۔ اس کی بندشیں کھول دو!" میں نے براہِ راست اول خان کے آدمی سے کہا۔ اس نے استفہامیہ طلب نگاہوں سے اول خان کی طرف دیکھا اور اس کا اشارہ پاکر' مجھے پہچاننے والے قیدی کی کرسی کی طرف بڑھ گیا۔

وہ زخمی قیدی' رسیاں کھلنے کے بعد لنگڑاتا ہوا کرسی سے اٹھا اور اپنا داہنا ہاتھ پیشانی تک لے جاتے ہوئے' تقریباً ہانپتے ہوئے بولا۔ "ڈپٹی صاب! تم واقعی گریٹ ہو۔ میں پھرتا رہا ہوں کہ ظفر دادا نے کبھی بھی ہیروئن کے ایک گرام کا بھی لین دین نہیں کیا تھا۔"

"پھر اس نے تم لوگوں کو کیوں پالا ہوا تھا؟" میں نے اُن چاروں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے تلخی سے پوچھا۔

"اپنی حفاظت اور رازداری کے لئے' یہ اس کی مجبوری تھی۔ صاب! تم کو معلوم نہیں کہ وہ ہماری مدد سے کتنی بڑی قومی خدمت دے رہا تھا۔ وہ ایک بہت بڑے فوجی افسر کے اشارے پر جنگلی بندروں کو سدھا رہا تھا۔ ہم دن رات ظفر دادا اور اس کے بندروں کی حفاظت کرتے تھے تاکہ کسی کو یہ زبردست راز معلوم نہ ہوسکے۔ وہ فوجی افسر' ظفر دادا کے دیئے ہوئے بندروں پر خوب پیسہ بنا رہا تھا کیونکہ یہ بندر بھارت اور کشمیر میں جاسوسی اور تخریب کاری کرنے کے کاموں کے لئے سدھائے جا رہے تھے۔ ظفر دادا بندروں کی رگ رگ کو سمجھتا تھا۔ انہیں سدھاتے ہوئے کبھی کبھی تو وہ خود بھی بڑا بندر نظر آنے لگتا تھا۔" اچانک اس کے ایک ساتھی نے کھانسنا شروع کردیا اور وہ اپنی کہانی ادھوری چھوڑ کر اس کی طرف متوجہ ہوگیا۔

"تم اپنی کہانی جاری رکھو۔ یہ کھانستے ہوئے مر نہیں جائے گا۔" اول خان نے اسے ٹوکا۔

"کچھ دنوں سے سرکاری خفیہ محکمے کا ایک رشوت خور افسر ظفر دادا کے پیچھے لگ گیا تھا۔" اس نے اپنی بات دوبارہ شروع کرتے ہوئے کہا۔ "اسے کہیں سے بندروں والے معاملے کی بھنک مل گئی تھی اور یہ بھی معلوم ہوگیا تھا کہ بڑا فوجی افسر ہر تربیت یافتہ بندر کے دو سے ڈھائی لاکھ روپے وصول کرکے خوب مال بنا رہا ہے۔ وہ اس رقم میں اپنا حصہ چاہتا تھا۔ ظفر دادا وہ سارا کام ملک اور قوم کی خاطر کر رہا تھا۔ اس نے صاف بتا دیا کہ اصل لاٹری بیچ کے آدمی کی نکلی ہوئی ہے۔ خود اسے تو اتنا کم معاوضہ ملتا تھا کہ اخراجات اور ہماری تنخواہوں کی ادائیگی کے بعد اس کا مشکل ہی سے گزارہ ہو رہا تھا۔ اسے اپنے مطالبے کے لیے فوجی افسر سے رجوع کرنا چاہیے۔ وہ فوجی افسر سے ڈرتا تھا اور ظفر دادا ہی کے ذریعے بات آگے بڑھانی چاہتا تھا۔ اپنی کوشش میں ناکامی پر اس نے ظفر دادا کو دھمکی دی کہ وہ اسے غداری کے الزام میں اندر کرا دے گا۔ پھر اس نے بندروں کے کارخانے سے جانے والے تین بندر غائب کرکے کھوٹہ پہنچائے اور انہیں پکڑوانے کے بعد ظفر دادا کی تلاش شروع کردی۔۔۔"

"ایک منٹ!" ویرا نے ہاتھ اٹھا کر اسے خاموش

کردیا۔ "یہ بندروں کے کارخانے والی کیا بکواس ہے؟ کیا بندر بھی مشینوں پر بنائے جارہے تھے؟"

اس کے متورم ہونٹوں پر خفیف سی مسکراہٹ پھیلتی ہوئی محسوس ہوئی اور وہ آہستہ سے بولا۔ "بندر تو کسی جنگل ہی سے لائے جاتے تھے لیکن انہیں چھپانے اور سدھانے کے لیے پشاور روڈ پر واقع ایک ٹمبر فیکٹری استعمال کی جاتی تھی۔ پانچ ایکڑ زمین پر مشتمل وہ گودام اور کارخانہ برسوں سے بند پڑا ہوا ہے۔ ہم اسی میں رہ رہے تھے۔ کھوٹہ سے بندر پکڑے جانے کی خبر ملتے ہی' ظفر دادا ہم لوگوں کے ساتھ سیٹلائٹ ٹاؤن والے مکان میں چھپ گیا۔ وہ خفیہ محکمے کے رشوت خور افسر سے بہت خوفزدہ تھا۔ تم لوگ آئے تو وہ سمجھا کہ وہی افسر اپنی نفری لے کر اس کے سر پر پہنچ گیا ہے۔"

"ظفر کے سدھائے ہوئے بندر کہاں ہیں؟" میں نے اسے گھورتے ہوئے پوچھا۔

"صرف ایک بندر تیار ہے۔ باقی پانچ بندروں پر وہ کام کررہا تھا۔ وہ سب میاں جاوید کی ویران ٹمبر فیکٹری میں ہی موجود ہونے چاہئیں۔" اس نے کہا۔

"تم لوگوں نے اسلام آباد سے آگے' ایک ویران علاقے میں اقوام متحدہ کی ایک ایجنسی کو بھی اپنا اڈا بنایا ہوا تھا؟" میں نے درشت لہجے میں سوال کیا۔

"اس کے بارے میں ہمیں کچھ نہیں معلوم۔" وہ گھگیاتے ہوئے بولا۔ "ہم چاروں تو ظفر دادا اور اس کے بندروں کی حفاظت کے لیے دن رات ٹمبر فیکٹری میں رہتے تھے یا پھر سیٹلائٹ ٹاؤن والی کوٹھی میں آئے تھے۔ اس سے آگے کے بارے میں ظفر دادا ہی کچھ بتا سکتا تھا۔"

"ظفر کے ساتھ مرنے والے تینوں آدمی تمہارے ساتھی نہیں تھے؟" میں نے پوچھا۔

"نہیں۔" اس کی آنکھوں سے صداقت جھلک رہی تھی۔ "ان تینوں کے علاوہ راجا بازار کا عبدل بدمعاش بھی کبھی کبھی ظفر دادا کے ساتھ دیکھا جاتا تھا۔ ظفر دادا باہر کے کام انہی لوگوں سے لیتا تھا۔ ہمارا ان سے کوئی تعلق نہیں تھا۔ بندروں کو لانے اور لے جانے کا کام بھی وہی لوگ کرتے تھے۔"

یہ قسمت کی کس قدر ستم ظریفی تھی کہ البرٹو ویلیسا اسکینڈل کے سارے بڑے مجرم اپنے خلاف فرد جرم کا سامنا کرنے کے لیے زندہ نہیں رہے تھے بلکہ کسی نہ کسی طرح جہنم واصل ہوچکے تھے' جبکہ ان کے چار غیر اہم معاونین ہمارے سامنے زندہ و سلامت موجود تھے۔

البرٹو ویلیسا نے ان پاکستانی بدمعاشوں کی خدمات حاصل کرنے کے لیے جو بے بنیاد کہانی تراشی تھی' وہ اپنے طور پر خاصی متاثر کن اور جذبات انگیز تھی۔ اس کہانی کی بنیاد پر یہ فیصلہ کیا جاسکتا تھا کہ ان چاروں نے اپنی دانست میں کوئی جرم نہیں کیا تھا بلکہ بھارت اور کشمیر میں اہم کارروائیوں کے لیے بندروں کی تربیت میں ظفر کا ساتھ دے کر ایک طرح کا قومی کارنامہ انجام دینے کی کوشش کی تھی۔

میرے بارے میں ایک غلط فہمی کا شکار ہوکر اس نے البرٹو ویلیسا کی کہانی کے چند ادھورے باب مکمل کردیئے تھے اور ہم اس کے طریقۂ واردات سے پوری طرح باخبر ہوچکے تھے۔ وہ اسپیشل ٹاسک فورس سے وقت نکال کر بہت محنت سے اپنے مشن پر کام کررہا تھا لیکن کاتبِ تقدیر نے اس کے لیے مکمل شکست لکھ دی تھی جسے وہ اپنی سرتوڑ کوششوں کے بعد بھی نہیں ٹال سکا تھا۔

"ظفر بندروں کی تربیت کے منصوبے پر کتنے عرصے سے کام کررہا تھا؟" اول خان کو وہ اہم سوال یاد آگیا جو میرے ذہن سے پھسل گیا تھا۔

"یہ تین چار ہفتے پرانی کہانی ہے۔ ویسے وہ پہلے بھی ہم لوگوں سے چھوٹے موٹے کام لیتا رہا تھا لیکن بندروں والا کام شروع کرنے سے پہلے وہ دو مہینوں کے لیے کہیں غائب ہوگیا تھا۔ اس نے ہمیں بتایا تھا کہ وہ بھارت اور کشمیر کے سرحدی علاقوں کا جائزہ لینے کے لیے گیا ہوا تھا؟"

وہ لفظ بہ لفظ درست کہہ رہا تھا۔ پہلے البرٹو ویلیسا پنڈی میں متعین تھا تو اس نے ان لوگوں کے ساتھ مراسم استوار کیے ہوئے تھے پھر الحدید والے قصے کے بعد اسے اول خان کی جگہ کراچی بھیج دیا گیا۔ الحدید والا معاملہ سرد خانے کی نذر ہونے کے بعد ان دونوں کو پھر ان کی پرانی جگھوں پر بحال کردیا گیا۔ اپنی دو ماہ کی اس غیر حاضری کو البرٹو ویلیسا نے دشمن کے علاقے کے دورے سے نتھی کرکے فائدہ اٹھالیا تھا۔

میری اور اول خان کی نگاہیں چار ہوئیں۔ میں نے اشارے سے اسے مطلع کیا کہ ان لوگوں سے ہمارا کام نکل چکا تھا اور وہ کوئی بھی فیصلہ کرنے کے لیے آزاد تھا۔

"اسے دوبارہ باندھ دو!" اول خان نے خشک لہجے میں اپنے آدمی سے کہا اور واپسی کے لیے مڑ گیا۔

اول خان کی اس غیر متوقع ہدایت پر اُس شخص نے بلبلا کر فریاد کرنی شروع کردی۔ "ڈپٹی صاب! یہ ظلم ہے' ہم لوگوں کو آزادی ملنی چاہیے۔ میں وعدہ کرتا ہوں کہ ہم اپنی زبانیں بند رکھیں گے۔"

ہم تینوں نے اُس کی سنی ان سنی کردی اور نکاسی کے راستے پر بڑھتے رہے۔

"ان بے چاروں کو بے خبری میں آلۂ کار بنایا گیا ہے۔" چند قدم چلنے کے بعد ویرا نے ترحم آمیز انداز میں کہا۔ "ان کو کچھ نہ کچھ رعایت ضرور ملنی چاہیے۔"

"قانون میں جرم' جرم ہوتا ہے۔ بے خبری کی کوئی رو رعایت نہیں کی جاتی۔" اول خان بولا۔

"تم کون سا قانونی حدود میں رہ کر کام کرتے ہو۔" ویرا نے ہنس کر کہا۔ "دیکھا جائے تو تمہاری زبان سے نکلے ہوئے ہر لفظ کو قانون کا درجہ حاصل ہوتا ہے۔ اس کی باتوں سے ظاہر ہورہا تھا کہ وہ بدمعاش ہونے کے باوجود قوم کا غدار نہیں ہے۔ اسے زیادہ سے زیادہ نادان دوست کہا جاسکتا ہے۔"

"نادان دوست' دانا دشمن سے زیادہ خطرناک ہوتا ہے۔" میں نے اسے یاد دلایا۔ "ان کے بارے میں بحث میں نہ پڑو۔ اول خان اپنے فرائضِ منصبی کا پورا شعور رکھتا ہے۔"

"ان لوگوں کے مقدر کا فیصلہ کوئی وفاقی ادارہ ہی کرے گا۔" اول خان نے سپاٹ لہجے میں کہا۔ "انہیں ایک آدھ روز میں کسی وفاقی تحقیقاتی ایجنسی کے سپرد کردیا جائے گا۔"

اول خان نہایت متحرک اور فعال مزاج کا مالک تھا۔ میاں جاوید کی ٹمبر فیکٹری کا نام سامنے آنے کے بعد اس نے فوراً ہی ایک پارٹی ادھر بھی روانہ کردی۔ اس نے وہاں سے برآمد ہونے والے بندروں کے دھماکا خیز ہونے کے بارے میں اپنے ایک ماتحت کو سمجھا دیا تھا۔

وہ ان لوگوں سے فارغ ہوا ہی تھا کہ شہباز خان کے پیچھے جانے والی پارٹی واپس آگئی۔

شہباز خان کے حیا سوز اور شرمناک دھندے کے بارے میں ہر بات شک و شبہے سے بالاتر تھی اس لیے اسے بہت بے رحمانہ سلوک کا نشانہ بنایا گیا تھا۔ اول خان کی ہدایت پر اسے دفتر میں لایا گیا تو اس کے اوسان خطا ہوچکے تھے اور ٹانگیں بری طرح کپکپا رہی تھیں۔ اس کے چہرے کی جلد جگہ جگہ سے پھٹ گئی تھی اور ان زخموں سے رسنے والے خون نے اس کا چہرہ بھیانک بنا دیا تھا۔

"مم۔۔۔ میں بے قصور ہوں۔" وہ اندر آتے ہی' دونوں ہاتھ جوڑ کر اول خان کے سامنے ہانپتے ہوئے بولا۔ "میں نے آج تک کسی کا بھتا نہیں روکا۔ میں ہر چھوٹے بڑے کا خیال رکھتا ہوں۔ کئی وزیر میرے دوست اور خیر خواہ ہیں پھر میرے ساتھ یہ ظلم اور زیادتی کیوں ہورہی ہے؟"

اول خان نے غصے میں بے قابو ہوکر اپنی میز پر رکھا ہوا پن کشن اس کے منہ پر پھینک مارا اور دہاڑتے ہوئے بولا۔ "میں تمہارے ناپاک حمایتیوں کے بھی ٹکڑے اڑا دوں گا۔ تم جیسے لوگوں نے پورے شہر کو قحبہ خانہ بنا رکھا ہے' جہاں دوسروں کی بہن بیٹیوں کو ہر روز نیلام پر چڑھایا جاتا ہے۔"

"میں کسی کے ساتھ زبردستی نہیں کرتا۔" وہ رو دینے والی آواز میں بولا۔ "ساری لڑکیاں بھاری آمدنی کی تلاش میں بہ رضا و رغبت میرے پاس آتی ہیں۔"

اس بار اول خان طیش کے عالم میں اپنی جگہ سے اٹھا اور اس نے باکسنگ کے انداز میں شہباز خان کے جبڑے پر زوردار داہنا مکّا رسید کردیا۔ وہ کراہتا ہوا پیچھے الٹ گیا۔

"دنیا کی کوئی عورت یا لڑکی اپنی خوشی سے بازار کی جنس نہیں بنتی۔" اول خان برہمی کے عالم میں غرا رہا تھا۔ "یہ تم جیسے بے ضمیر درندے ہوتے ہیں جو اُن کی مجبوریوں کا سودا کرکے انہیں نت نئے گاہکوں کے حوالے کرنے کا دھندا شروع کرتے ہیں۔ مزید بکواس کی تو اب میں تمہاری بتیسی حلق میں اتار دوں گا۔"

"تم مجھے جانور کی طرح مار رہے ہو۔" وہ خون تھوکتے ہوئے کراہا۔ "مجھے یہ تو بتاؤ کہ تم مجھ سے کیا چاہتے ہو؟ مجھے سوتے سے اٹھا کر یہاں کیوں لایا گیا ہے؟ یہ کون سی جگہ ہے؟"

"تم واقعی جانوروں سے بھی بدتر ہو۔" اول خان غصے میں بہک چلا تھا اس لیے میں نے اصل موضوع کی طرف آنے کے لیے گفتگو میں اپنی ٹانگ اڑا دی۔ "تم سے تو ظفر کے بندر ہی بہتر ہیں جو اس کے سکھانے سے بہت کچھ سیکھ رہے ہیں اور اپنے مالک کا نام روشن کررہے ہیں۔"

اس کی ورم سے تقریباً بند ہوتی ہوئی آنکھیں میرے چہرے پر مرکوز ہوگئیں۔ وہ خاموش اور مبہوت سا ہوکر مجھے دیکھے جارہا تھا' جیسے میں نے اس سے کوئی انوکھی بات کہہ ڈالی ہو۔

"یہ کوئی پولیس اسٹیشن نہیں ہے جہاں تم بھتا دے کر اپنی جان چھڑا سکو گے۔ ہم تم سے تمہاری اور ظفر کی یاری کی کہانی سننا چاہتے ہیں۔ تم نے ہچر مچر کی تو مار مار کر تمہارا پلیتھن نکال دیا جائے گا۔" میں نے مختصر سے وقفے کے بعد اسے اپنے اصل مقصد سے آگاہ کرتے ہوئے کہا۔

"میں کسی ظفر کو نہیں جانتا۔۔۔" اس نے خوف زدہ لہجے میں اڑنے کی کوشش کی لیکن اسی وقت اول خان نے اس کے منہ پر الٹے ہاتھ کا زوردار جھانپڑ رسید کیا اور وہ چکرا

کر رہ گیا۔

"ظفر سیٹلائٹ ٹاؤن کے چوہے دان سے پکڑا جا چکا ہے۔" میں نے اس کی دردناک درگت پر رحم کھاتے ہوئے اسے آگاہ کیا۔ "اور میاں جاوید کی متروکہ ٹمبر فیکٹری بھی ہمارے قبضے میں ہے۔ تم اندازہ لگا سکتے ہو کہ تم نے اپنی زبان نہ کھولی یا جھوٹ بولنے کی کوشش کی تو تمہارا کیا حشر ہو سکتا ہے۔"

اس نے ایک بار پھر ٹال مٹول کرنے کی کوشش کی لیکن میرے انکشافات کے بعد اس کی ہمت جواب دے چکی تھی۔ مزید مار کھانے کے بعد اس نے چڑھے ہوئے سانسوں کے درمیان اپنی کہانی شروع کر دی۔

اس کی کہانی میں کوئی نئی بات نہیں تھی۔ اس نے جو کچھ بتایا، وہ وہی تھا جو ہم زخمی قیدی سے سن چکے تھے۔ فرق صرف اتنا تھا کہ شہباز خان کو البرٹو ویلیسا نے بتا دیا تھا کہ وہ اسپیشل ٹاسک فورس کا ایک اعلیٰ افسر ہے اور بندروں کے ذریعے اہم نیم فوجی مقاصد حاصل کرنے کے لیے ایک منصوبے پر خفیہ کام کر رہا ہے، جبکہ سیکرٹ سروس کا ایک بڑا افسر پیشہ ورانہ رقابت کی وجہ سے اس کا دشمن ہو رہا ہے۔

البتہ شہباز اور البرٹو ویلیسا کی دوستی کی کہانی قدرے دلچسپ تھی۔ البرٹو ویلیسا کو اسپیشل ٹاسک فورس کے سخت ڈسپلن کی وجہ سے خشک زندگی گزارنی پڑتی تھی، جبکہ وہ فطری طور پر بلانوش اور رنگین مزاج تھا۔ وہ اپنے ان فطری جذبوں کی تسکین کے چکر میں شہباز خان سے ٹکراتا تھا۔ بعد میں ان دونوں میں دوستی استوار ہوتی چلی گئی کیونکہ اس اڈے کے ذریعے البرٹو ویلیسا کو زیرِ زمین دنیا کے بارے میں بہت سی معلومات حاصل ہوتی رہتی تھیں۔ گو وہ اپنے لیے آدمیوں کے انتخاب کا کام براہِ راست خود ہی کرتا تھا لیکن ضرورت پیش آنے پر ان کی ساکھ اور رازداری کے بارے میں شہباز خان سے مشورہ بھی کر لیتا تھا۔ اس بنا پر شہباز خان اندازے تو قائم کر سکتا تھا لیکن اسے حتمی طور پر یہ معلوم نہیں ہوتا تھا کہ کس وقت کون کون اس کے لیے کام کر رہا ہے۔

"اب میں تمہیں وارننگ دے رہا ہوں کہ تم نے اپنے شرمناک دھندے کو فوراً خیرباد نہ کہا تو تمہاری زندگی اجیرن بنا دی جائے گی۔" وہ ساری گفتگو ختم ہونے کے بعد اول خان نے تلخی سے کہا۔

"اس کا مطلب ہے کہ تم مجھے چھوڑ رہے ہو؟" اس نے امید و بیم کے عالم میں سوال کیا۔

"تمہارا گوشت حرام نہ ہوتا تو ہم تمہیں ذبح بھی کر سکتے تھے۔" میں نے ٹکڑا لگایا۔

"لیکن تم یہ نہ سمجھنا کہ تمہیں یوں ہی آزادی مل جائے گی۔" اول خان نے اپنی ابتدائی دھمکی کا کوئی ردِ عمل نہ دیکھ کر قہربار لہجے میں کہا۔ "تم نے اب تک جو کچھ کیا ہے، اس کی پاداش میں تمہاری مونچھیں، بھویں اور سر مونڈ کر برہنہ اور دست و پابستہ حالت میں آب پارہ کے کسی مصروف کوڑے دان میں پھنکوا دیا جائے گا۔ تمہارے منہ میں کپڑا ٹھونس دیا جائے گا۔ تاکہ تم اجالا پھیلنے تک کسی سے مدد طلب نہ کر سکو۔"

"نن۔۔۔ نہیں، تم میرے ساتھ ایسا نہیں کر سکو گے۔" وہ اول خان کی بات پوری ہونے سے پہلے، دہشت زدہ آواز میں کراہا۔ "میں ایسی بے عزتی برداشت نہیں کر سکوں گا۔"

"خود کو ان عورتوں اور لڑکیوں کی جگہ رکھ کر سوچنا جن کے جسموں کی تجارت سے تم اپنی روزی کماتے ہو۔ مجھے یقین ہے کہ تم اس سے زیادہ بے عزتی بھی ہنستے کھیلتے جھیل جاؤ گے۔" اول خان کا چہرہ غصے سے سرخ ہونے لگا تھا۔ ایسا لگ رہا تھا جیسے وہ شہباز خان پر پھر ہاتھ چھوڑ بیٹھے گا۔

"میں تم سے وعدہ کرتا ہوں کہ مجھ پر ناقابلِ برداشت دباؤ نہ ڈالا گیا تو میں اپنے موجودہ دھندوں سے تائب ہو کر کوئی اور کام شروع کر دوں گا۔ میرے پاس پیسے کی کمی نہیں ہے۔"

"لعنت ہے تم جیسے کڑیل مرد پر جو چکلے کی کمائی پر ناز کرتا ہے۔" اول خان بپھر گیا۔ "حرام کاروں کے دباؤ کا مقابلہ کرنا تمہارا کام ہے، میں بتائے دے رہا ہوں کہ تم فوراً تائب نہ ہوئے تو تمہیں ہر دوسرے دن بزور طاقت اٹھوا لیا جائے گا اور رات کو تمہیں اسی شرمناک حالت میں کوڑا گھروں میں ڈلوایا جاتا رہے گا۔ اخباری نامہ نگاروں کو تمہارے پیچھے لگا دیا جائے گا اور ملک بھر کے اخبارات شہباز خان کی عبرتناک تصویریں چھاپیں گے تو تم بہت جلد خودکشی کرنے پر مجبور ہو جاؤ گے۔"

وہ دونوں ہاتھوں سے اپنا سر تھام کر فرش پر بیٹھتا چلا گیا۔

"لے جاؤ اس نابکار کو۔" اول خان نے اسے لانے والوں کو حکم دیا۔ "میں نے جو کچھ کہا ہے، اس پر ایک گھنٹے کے اندر اندر عمل ہو جانا چاہیے۔"

شہباز نے واویلا شروع کر دیا۔ اس نے بہت ہاتھ پیر بھی چلائے لیکن اول خان کے آدمی اسے بے رحمی کے ساتھ گھسیٹتے ہوئے باہر لے گئے۔

"اس ملک میں قانون کمزور ہے۔" چند ثانیوں کی

بوجھل خاموشی کے بعد اول خان اپنے دل کی بھڑاس نکالتے ہوئے غرایا۔ "لوگ جرم کرتے ہوئے رنگے ہاتھوں پکڑے جاتے ہیں لیکن کسی نہ کسی قانونی سقم کا فائدہ اٹھا کر باعزت بری ہونے میں کامیاب ہو جاتے ہیں۔ پیشہ ور مجرموں کے ہاتھوں قانون کی دھجیاں اڑنے سے شریف شہری دن بہ دن بزدل اور معاشرے سے لاتعلق ہوتے جا رہے ہیں۔"

"یہ صرف قانونی کمزوریوں کا قصور نہیں ہے، تم رشوت کو بھول رہے ہو۔" ویرا متاسفانہ انداز میں بولی۔

"رشوت اسی وقت کام کرتی ہے، جب قانون میں جھول ہوتے ہیں۔" اول خان اس وقت کسی کی سننے پر آمادہ نہیں تھا۔ "قانون اس قدر بے لوچ اور سخت ہونا چاہیے کہ جن مجرموں کے اڈے، ٹھکانے اور گھناؤنے جرائم کے ثبوت سب کے سامنے ہوں، انہیں فی الفور سُولی پر لٹکایا جا سکے۔ میرا بس چلے تو میں چند ہزار نیک نام اور باعزت شہریوں کو ایسے تعزیری اختیارات دے کر چند دنوں میں اس معاشرے کو سدھار دوں جہاں شہباز خان جیسے بھیڑیے معصوم بھیڑوں کا خون چوس کر دن رات اپنی تجوریاں بھرنے میں مصروف ہیں۔"

"اس وقت تم جذباتی ہو رہے ہو۔" ویرا گہری سنجیدگی کے ساتھ اسے سمجھاتے ہوئے بولی۔ "جب تم چند ہزار نیک ناموں کی تلاش میں نکلو گے تو تمہیں بدترین مایوسی کا سامنا کرنا پڑے گا۔ یہ صرف پاکستان کا نہیں، ہر جدید معاشرے کا المیہ ہے کہ مخصوص علاقوں میں صنعتوں کے ارتکاز کی وجہ سے زبردست نقل مکانی یا ہجرت یا ترکِ سکونت کا سلسلہ جاری ہے اور اس بھاگ دوڑ میں ہر فرد اپنی علاقائی اور آبائی شناخت کھو بیٹھا ہے۔ نیک نامی اور عزت کا معیار نسب کے بجائے دولت کو مان لیا گیا ہے، خواہ وہ ہیروئن بیچ کر ہی کمائی گئی ہو۔ تم جس ظفر کا پیچھا کرو گے، اس کے روپ میں کوئی نہ کوئی البرٹو ویلیسا ہی کارفرما نظر آئے گا۔"

"میں مانتا ہوں کہ خرابیاں بہت دور تک جڑیں پکڑ چکی ہیں۔" اول خان قدرے نرم ہوتا نظر آیا۔ "لیکن یہ کام ناممکن نہیں ہے۔ اس سے پہلے کہ سب لوگ خوشی سے یا مجبوراً برائیوں کی دلدل میں غرق ہو جائیں، ایک صاف ستھری تبدیلی لانے کا عمل کامیاب ہو سکتا ہے۔ جب پانی سروں سے گزر جائے گا تو تبدیلی کے بارے میں سوچنا بھی جرم کے زمرے میں شمار ہونے لگے گا۔"

"یہ تہذیبی انقلاب اور ارتقا کے معاملات ہیں۔" میں نے ایک گہرا سانس لے کر کہا۔ "ارتقا اندر سے خود بخود ہوتا ہے جو بدقسمتی سے منفی سمتوں میں جا رہا ہے اور انقلاب لانے کے لیے ہم تین آدمی بہت ناکافی ہیں، اس لیے کیوں نہ ہم آرام کرنے کے بارے میں کچھ سوچنے کی کوشش کریں؟"

اول خان بے ساختہ مسکرا دیا۔ "تم آرام کرو۔ مجھے تو ابھی اس پارٹی کی واپسی کا انتظار ہے جو بندروں کے کارخانے کی طرف گئی ہے۔" اس نے اپنی بات پر خود ہی ایک بلند آہنگ قہقہہ لگایا اور ہم دونوں بھی اس کے ساتھ شامل ہو کر ہنسنے لگے۔

اس پارٹی کے واپس آنے میں صبح کے تین بج گئے۔ وہ اپنے ساتھ صرف چھ بندر لائے تھے۔ ان میں سے پانچ نیم تربیت یافتہ ہونے کی وجہ سے قدرے بھڑکے ہوئے تھے، جبکہ چھٹا بندر خاموش اور مہذب نظر آ رہا تھا۔ ان لوگوں نے میٹل ڈی ٹیکٹر کے ذریعے ان سب بندروں کی جانچ پڑتال کی تھی جس کے نتیجے میں چھٹے بندر کے جسم میں دھات کی کسی شے کی موجودگی ظاہر ہوئی تھی لیکن ان لوگوں نے بندر کے پھٹنے کے خوف کی وجہ سے اس کے ساتھ کوئی چھیڑ چھاڑ نہیں کی تھی اور اسے سکون و احتیاط کے ساتھ وہاں لے آئے تھے۔ یہ اطلاع ملتے ہی مجھے خاموش طبع بندر سے خوف آنے لگا کیونکہ وہ انسانوں سے حد درجہ مانوس بھی تھا اور اول خان سے بھاگنے کی فکر میں نہیں تھا۔ جبکہ دوسرے بندر بار بار دروازے کی طرف بھاگنے کی کوشش کر رہے تھے۔

وہ تمام بندر اس ویران فیکٹری کے ایک خالی گودام میں آزاد پائے گئے تھے۔ وہاں ان کی خوراک کے لیے متنوع پھلوں کی خاصی مقدار موجود تھی۔ تشویش ناک بات یہ تھی کہ اسی گودام میں ایک زیرِ زمین کمرے کا راستہ بھی تھا۔ وہ تہ خانہ ہر طرح کے ساز و سامان سے لیس، ایک چھوٹی آپریشن ٹیبل، سرجری کے متعدد باریک اور نازک آلات، بے ہوشی کی مختلف ادویات اور انجکشن سرنجوں پر مشتمل تھا۔ کمرے میں جدید ترین اور ننھے ننھے لاسلکی مائیکرو فونوں سے بھرا ہوا ایک ڈبا برآمد ہوا تھا۔ ایسے مائیکرو فونوں کے ذریعے تار کی مدد کے بغیر کئی کلو میٹر دور ہونے والی گفتگو لفظ بہ لفظ سنی جا سکتی تھی۔ اس کے علاوہ بھی وہاں کچھ ایسی نئی اور جدید ساخت کی مشینیں تھیں جن کے بارے میں اول خان کے آدمی کوئی اندازہ نہیں لگا سکے تھے۔

وہ لوگ ان مشینوں اور آلات کو چھیڑے بغیر اپنے دو آدمی وہاں چھوڑ کر صرف بندروں کے ساتھ واپس لوٹ آئے تھے۔

"البرٹو ویلیسا مر گیا لیکن اس کے پھیلائے ہوئے جال

کی کڑیاں اب مل رہی ہیں۔" اول خان ان خبروں پر متفکر نظر آنے لگا تھا۔ "تربیت یافتہ اور بگ کیے ہوئے بندر باہر سے اسمگل یا در آمد نہیں کیے جاسکتے تھے بلکہ یہ سارا کام یہیں ہماری ناک کے نیچے سرانجام دیا جارہا تھا اور ہم اس سے بے خبر تھے۔ مجھے یقین ہے کہ اس زیرِ زمین لیبارٹری میں ان جدید ترین کیمروں کا سازوسامان بھی موجود ہوگا جو کھوٹہ سے پکڑے جانے والے بندروں کی جِلد کے نیچے چھپائے گئے تھے۔"

"میں تم سے متفق ہوں۔ لیکن اس سنجیدہ بندر نے مجھے خوف زدہ کیا ہوا ہے۔" میں نے چھٹے بندر کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ "اگر یہ حادثاتی طور پر یہیں پھٹ گیا تو بڑی تباہی پھیلے گی۔ میرا خیال ہے کہ ان سب بندروں کو کھلے لان پر بندھوا کر، اپنے آدمیوں کو ان سے دور رہنے کی ہدایت کردو تاکہ کسی امکانی تباہی کے خطرے کو کم سے کم کیا جاسکے اور ــــ"

اچانک چھٹا بندر اپنی جگہ بیٹھے بیٹھے خوخیانے لگا اور میں سہم کر فوراً ہی خاموش ہوگیا۔ گو میں نے اپنے خوف کا کوئی ذکر نہیں کیا لیکن میرے ذہن میں لاشعوری طور پر اس لرزہ انگیز خطرے نے سر ابھارا تھا کہ کہیں یہ بندر اپنی کسی غیر معمولی حِس کے ذریعے میرے خیالات تو نہیں پڑھ رہا ہے؟

"ان سب کو لے جاؤ اور لان پر باندھ کر دور سے نگرانی کرتے رہو۔" اول خان نے کسی ایک فرد سے مخاطب ہونے کے بجائے عمومی ہدایت جاری کی اور وہ لوگ اس کا اشارہ سمجھ کر بندروں سمیت اس کے دفتر سے رخصت ہوگئے۔

تخلیہ ہوتے ہی ویرا کے لیے اپنی ضبط کی ہوئی ہنسی پر مزید قابو پائے رکھنا دشوار ہوگیا۔ وہ کھلکھلا کر ہنسی تھی اور اول خان بھی اچانک ہی ہنسنے لگا۔

"یوں دانت پھاڑنے کی کیا تُک ہے؟" میں نے اول خان کو نظر انداز کرکے خفت آمیز انداز میں ویرا کو لتاڑا۔ "ہم کچھ سنجیدہ گفتگو کررہے تھے۔"

"وہ تو کررہے تھے لیکن بندر کی خوں خوں پر تمہاری جان کیوں نکل گئی تھی؟" اس نے ہنسی کے دوران میں کہا۔ "ایسا معلوم ہوا تھا، جیسے بندر کے بولتے ہی تمہارے حلق کا کوا گر گیا ہو۔"

"بعض اوقات تم نہایت احمقانہ باتیں کرنے لگتی ہو۔" میرے لیے حقیقت کا اعتراف کرنا دشوار تھا۔ "اس وقت بندر کے بجائے تم بھی بول پڑتیں تو میں اسی طرح چونک کر خاموش ہوجاتا۔"

"محویت کے دوران میں ایسا ہو ہی جاتا ہے۔" اول خان نے بردباری کا مظاہرہ کرتے ہوئے اپنی ہنسی موقوف کردی۔ "تمہاری وجہ سے میں بھی بلاوجہ ہنس پڑا۔"

"کاش، میرے پاس کیمرا ہوتا اور میں اس وقت تمہارے چہرے کی تصویر لے سکی ہوتی ــــ"

"پلیز، ویرا!" اول خان نے اسے خاموش کردیا۔ "اس بات کو یہیں ختم کردو۔ ہمیں ان بندروں اور کارخانے کے بارے میں فوری طور پر فیصلہ کرنا ہے۔"

"میں یہی کہہ رہا تھا کہ یہ بندر فوری طور پر وہیں بھیج دیئے جانے چاہئیں جہاں کھوٹہ کا زندہ بچنے والا بندر ماہرین کی نگرانی میں ہے۔ یہ بہت الجھا ہوا، تیکنیکی معاملہ ہے۔ اسے ماہرین ہی حل کرسکتے ہیں۔ یہ بندر تمہاری فورس کی تحویل میں ضائع نہیں ہونا چاہیے۔" میں نے ویرا کا منہ بند کرنے کے لیے فوری طور پر ایک نیا لیکن سوچا سمجھا معاملہ چھیڑ دیا جو بندر کے غرانے کے وقت میرے ذہن میں نہیں تھا۔

"تمہاری تجویز معقول اور قابلِ فہم ہے لیکن اس کے لیے مجھے اپنے کمانڈر سے منظوری لینی ہوگی۔"

"اور وہ اس وقت وزارتِ داخلہ کے ایک اہم اجلاس میں ہے۔" ویرا نے اسے یاد دلایا۔

"یہ کوئی مسئلہ نہیں ہے۔ میں اجلاس کے دوران میں بھی اس سے ٹرانسمیٹر پر بات کرسکتا ہوں۔ کام کے بارے میں ہم لوگوں کو مکمل آزادی حاصل ہوتی ہے۔"

"پھر ٹمبر فیکٹری میں دریافت ہونے والی لیبارٹری کے بارے میں بھی بات کرلو تو مناسب رہے گا۔" ویرا بھی پوری طرح سنجیدہ ہوچکی تھی۔ "وہاں بھی آپریشن تھیٹر کے علاوہ نازک آلات موجود ہیں۔ ماہرین ہی ان کے مصرف اور اہمیت کا تعین کرسکتے ہیں۔ ہوسکتا ہے کہ وہ کوئی پورٹیبل سیٹلائٹ ریسونگ اسٹیشن ہو اور اس کی میموری میں کھوٹہ سے آنے والی بعض تصاویر محفوظ ہوں۔ غیر پیشہ ورانہ چھیڑ چھاڑ سے وہ تصاویر ضائع ہوسکتی ہیں۔ البرٹو ملیسا کے مشن کے بارے میں ایسی تصاویر بہت مددگار ثابت ہوسکتی ہیں۔"

"تم یہیں ٹھہرو یا اپنے کمرے میں چل کر آرام کرو۔ میں کمانڈر سے بات کرکے تمہارے پاس واپس آتا ہوں۔" اول خان نے اپنی کرسی چھوڑتے ہوئے کہا اور ہم دونوں بھی اٹھ کھڑے ہوئے۔

"ہم اپنے کمرے میں تمہارا انتظار کریں گے۔" میں یہ کہتا ہوا باہر نکل گیا۔

"بوتل میں تھوڑی سی اسکاچ موجود ہے، میں اس کی ضرورت محسوس کررہی ہوں۔" ویرا باہر آنے کے بعد میرے کان کے نیچے منمنائی۔

"جتنی بھی ہے، اسے آدھا آدھا کریں گے۔ مجھے صبح کراچی بھی جانا ہے۔" میں نے آنکھیں نکال کر کہا اور وہ خاموش ہی رہی۔ میری تنہا واپسی کی بات شروع ہی سے اسے چبھ رہی تھی۔

الماری سے بوتل نکالتے ہی میرا دل خوش ہوگیا کیونکہ ایک لیٹر بوتل میں چوتھائی سے کافی زیادہ سیال ہلکورے لے رہا تھا جو ہم دونوں کو ترو تازہ کرنے کے لیے کافی تھا۔

ویرا نے اپنے گلاس سے دوسرا گھونٹ لینے کے بعد فیصلہ کن انداز میں اپنی زبان کھولی تھی۔ "تم اکیلے کراچی نہیں جاؤ گے۔ میں تمہارے ساتھ واپس چلوں گی۔ غزالہ کی ذرا سی خوشنودی کے لیے تم مجھے اس بری طرح نظر انداز نہیں کرسکتے۔"

"تمہیں کون نظر انداز کررہا ہے؟" میں نے حیرت سے کہا۔ "ان دونوں کو میری فوری مدد کی ضرورت ہے اور یہاں اولیانو سے فیکس وغیرہ بھی حاصل کرنا ہے۔ یہ تو ہماری مشترکہ مجبوری ہے۔"

"ہماری کوئی مشترکہ مجبوری نہیں۔" وہ تیسرا گھونٹ لینے کے بعد ہتھے سے ہی اکھڑ گئی۔ "یہ سب تمہارے اور اول خان کے بکھیڑے ہیں۔ مجھے اب شی میں اپنی ذمے داریوں کے بارے میں بھی کچھ کرنا ہوگا۔ تم اسلام آباد میں رکو یا واپس جاؤ، میں صبح کی پرواز سے کراچی جارہی ہوں۔"

میں بے بسی کے ساتھ اسے گھور کر رہ گیا۔ اس کے علاوہ کر بھی کیا سکتا تھا؟

"تمہارا یہی علاج ہے۔" وہ طنزیہ انداز میں بولی۔ "اب تم غزالہ کی جتنی زیادہ ناز برداریاں کرو گے، میں بھی اتنے ہی نخرے اٹھواؤں گی۔ تم میری بے لوث دوستی سے ہمیشہ ناجائز فائدہ اٹھاتے چلے آرہے ہو۔"

"بات بڑھانے کی کوشش نہ کرو۔" میں نے اسے سمجھاتے ہوئے کہا۔ "ہم صبح بھی ایک ساتھ چل سکتے ہیں۔ اولیانو فیکس کی نقل تو فوراً دے دے گا لیکن البرٹو ملیسا کے غیر ملکی فون اور فیکس نمبروں کا معاملہ مشکوک ہے۔ ہوسکتا ہے، اس نے وہ فہرست تیار نہ کی ہو۔ اس کے حصول میں وقت لگ سکتا ہے۔ اسی لیے میں یہ کام تمہیں سونپ رہا تھا۔"

"وقت لگے تو تم رک جانا۔ میں کراچی جاکر غزالہ کا خون سلگانا شروع کردوں گی۔"

میرے لیے ویرا کے وہ تیور خطرناک تھے۔ وہ باتوں ہی باتوں میں ایک بار پھر غزالہ کی مخالفت پر کمربستہ ہوتی نظر آرہی تھی۔ ایک طرف افغان قبائلیوں کی طرف سے غزالہ کے اغوا اور علاقہ غیر میں فروخت کی دھمکی میرے سر پر تلوار بن کر لٹک رہی تھی اور دوسری طرف ویرا بھی اپنے پر پُرزے نکال رہی تھی۔ میرے لیے یہ صورت حال خطرے کی گھنٹی سے کم نہیں تھی۔

"تم بلاوجہ اس بے چاری کی دشمن ہورہی ہو۔" میں نے اپنا غصہ پیتے ہوئے، مصالحانہ رویّہ برقرار رکھا۔ "اس میں اس کا کوئی قصور نہیں ہے۔ یہ میرا اپنا فیصلہ تھا۔ اب تم ناراض ہو تو میں اپنا فیصلہ واپس لیے لیتا ہوں۔ ہم صبح، دوپہر یا شام میں جب بھی جائیں گے، اکٹھے جائیں گے۔"

"اس کا خون سلگانے کا ذکر سنتے ہی راہِ راست پر آگئے!" اس نے خوش ہوکر میرا مضحکہ اڑاتے ہوئے کہا۔ "دنیا بھر میں مرد اپنی بیویوں کو بھول کر محبوباؤں کی دل جوئی کرتے پھرتے ہیں اور تمہارا حساب ہی الٹا ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ ڈون کے چینی مولوی نے تمہیں زن مریدی کا کوئی تعویذ بھی گھول کر پلا دیا تھا۔"

"بس اب یہ قصہ ختم کرو۔" میں نے تحمل کے ساتھ اس کا شانہ تھپکتے ہوئے کہا۔

"اس بار معاف کررہی ہوں۔" وہ تیکھے تیوروں کے ساتھ بولی۔ "آئندہ کے لیے یہ یاد رکھنا کہ وہ تمہاری بیوی ہے اور میں صرف ایک آزاد دوست۔ تم نے کبھی بھول کر بھی میری دل آزاری کی تو میں بھی اپنے ہرجائی پن پر اتر آؤں گی۔ میری طبیعت کو تم اتنا تو سمجھنے ہی لگے ہو۔"

میں سر ہلا کر رہ گیا۔ اپنی خاموشی کو باوقار بنانے کے لیے میں سگریٹ سلگانے میں مصروف ہوگیا تھا۔ سگریٹ کا سرا روشن ہوتے ہی ویرا نے اسے میرے ہونٹوں سے اچک لیا۔

"اپنے لیے دوسری جلالو اور ذرا یہ سوچو کہ یہاں غیر فطری خاموشی کیوں ہے؟"

"مجھے تو سب کچھ نارمل ہی محسوس ہورہا ہے۔" میں نے چونک کر اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

"یہاں اول خان کا خاصا عملہ موجود ہے۔ لان پر چھ بندر بندھے ہوئے ہیں۔ ایک کمرے میں البرٹو ملیسا کے چار زخمی محافظ کرسیوں سے بندھے ہوئے ہیں، پھر شہباز خان بھی اتنی خاموشی سے اپنے سر اور چہرے کے بال منڈوانے والوں میں سے نظر نہیں آتا تھا لیکن یہاں بالکل ہی سکوت

اور سناٹے کا راج ہے۔"

"صرف قیدی ہی شور و غل کر سکتے تھے۔ میرا خیال ہے کہ ان سب کو بے ہوش کر دیا گیا ہے۔ ہو سکتا ہے کہ شہباز کی آنکھ اب آب پارہ کے کسی کوڑے دان ہی میں کھلے۔"

اس بار وہ اثباتی انداز میں اپنا سر ہلانے پر مجبور ہو گئی۔

تھوڑی دیر بعد اس عمارت میں پھیلے ہوئے غیر فطری سناٹے کے بارے میں ویرا کی شکایت دور ہونے کے آثار پیدا ہو گئے اور اس ریسٹ ہاؤس کے دفتری حصے سے نقل و حرکت کی کچھ آوازوں کے بعد کسی گاڑی کا انجن اسٹارٹ ہونے کی آواز سنائی دی جو چند ثانیوں بعد تیز ہونے کے بعد دور ہوتے ہوئے بتدریج معدوم ہوتی چلی گئی اور فضا پر دوبارہ وہی سناٹا چھا گیا۔

"معلوم ہوتا ہے کہ کوئی روانہ ہوا ہے۔ اول خان بھی ابھی تک نہیں لوٹا۔ ایسا نہ ہو کہ اس کے کمانڈر نے اسے بلا تاخیر اپنے پاس بلا لیا ہو۔" ویرا اپنے گلاس سے کھیلتے ہوئے بولی۔

مجھے اس کے تبصرے کا جواب دینے کی ضرورت نہیں پڑی کیونکہ تقریباً اسی وقت اول خان اپنے مخصوص انداز میں دستک دے کر ہمارے کمرے میں آ گیا۔ اس کے چہرے پر دور دور تک تکان کی کوئی علامت نہیں تھی بلکہ وہ کچھ زیادہ ہی چونچال نظر آ رہا تھا۔

"شہباز خان کے چہرے کو بالوں سے بالکل محروم کر کے روانہ کیا جا چکا ہے۔" اس نے آتے ہی اعلان کیا۔ "اب تم کو اس کے بارے میں ایک اہم کام کرنا ہے۔ میں اس خبیث آدمی کو زیادہ ڈھیل دیے بغیر' اس کے فتنے کو یہیں کچلنا چاہتا ہوں۔"

وہ لمحہ بھر کے لیے خاموش ہوا تو میں استفسار طلب نگاہوں سے اس کی طرف دیکھتا رہا۔ اس نے دوبارہ سلسلۂ کلام جوڑتے ہوئے کہا۔ "ٹیلی فون ڈائریکٹری سے ایک دو اخباری نامہ نگاروں یا خبر رساں ایجنسیوں کے فون نمبر تلاش کر کے انہیں شہباز خان کے پیچھے لگا دو۔ میں چاہتا ہوں کہ اس کے ہوش میں آنے سے پہلے ہی اس کی تصاویر بنا لی جائیں جو کل کے اخبارات میں چھپ جائیں۔"

"اس بار تو تمہارا ایسا پروگرام نہیں تھا۔ تم نے اسے ایک موقع دینے کا وعدہ کیا تھا۔" ویرا نے اسے یاد دلایا۔

"وہ بہت ڈھیٹ اور پرانا پاپی ہے۔ اس واقعے کی فوری تشہیر نہ ہوئی تو مجھے یقین ہے کہ اس کا اڈا بدستور چلتا رہے گا۔ میں اس معاملے میں اپنے آدمیوں کا زیادہ وقت برباد نہیں کرنا چاہتا۔ کون اسے بار بار اٹھا کر گنجا کرواتا پھرے گا؟ میں خود بھی زیادہ دیر تک یہاں نہیں ٹھہروں گا۔"

"لیکن ان لوگوں کو کس مقام کے بارے میں بتایا جائے گا؟" میں نے پوچھا۔

"آب پارہ کے کسی بھی کوڑے دان کا حوالہ کافی ہوگا۔ وہ خود ڈھونڈتے ہوئے اس تک پہنچ جائیں گے۔ اخبار والے چٹپٹی اور سنسنی خیز خبر کی تلاش میں پاتال تک میں اتر جاتے ہیں۔"

"یہ کام تم خود کیوں نہیں کر لیتے؟" ویرا نے اپنا گلاس خالی کرتے ہوئے پوچھا۔

"میں فوراً سکریٹریٹ جا رہا ہوں۔ کمانڈر نے مجھے چاروں قیدیوں اور پانچوں بندروں سمیت وہاں طلب کر لیا ہے۔ وہ میرا انتظار کر رہا ہوگا۔ میری فراہم کی ہوئی اطلاعات نے وہاں سنسنی پھیلا دی ہے۔"

"اور چھٹے بندر کا کیا ہوگا؟ وہی معزز بندر' جس نے ڈینی بہادر صاحب کو ڈرا دیا تھا۔"

"اسے بالکل نہ چھیڑنے کا حکم ملا ہے۔" اول خان نے خفیف سی مسکراہٹ کے ساتھ کہا۔ "اپنے بندر کی دیکھ بھال کرنے والوں میں سے دو ماہرین اسے لینے کے لیے یہاں آنے والے ہیں۔ وہ لوگ ان بندروں سے بہت زیادہ ڈرے ہوئے ہیں اور ہر قیمت پر انہیں بچانا چاہ رہے ہیں۔"

"لگے ہاتھوں یہ بھی بتا دو کہ پشاور روڈ والی ٹمبر فیکٹری کے بارے میں کیا طے پایا ہے؟ ہو سکتا ہے کہ تمہیں واپس لوٹنے میں اتنی دیر ہو جائے کہ ہمیں تم سے ملے بغیر ہی کراچی جانا پڑ جائے۔" میں نے کہا۔

"میں نے اپنی تفصیلی رپورٹ دے دی ہے۔ میرا خیال ہے کہ سپارکو اور نیشنل انسٹی ٹیوٹ آف ماڈرن سائنسز کے ماہرین کے ساتھ انٹر سروسز انٹیلی جنس یا ملٹری سیکریٹ والے اس معاملے کو سنبھالیں گے۔ یہ فیصلہ اعلیٰ سطح پر ہی کیا جائے گا۔ تم لوگ یہاں ٹھہرو تو اگلے چند گھنٹوں میں بعض حیرتناک خبریں مل سکتی ہیں۔ کم از کم اپنے شروع کیے ہوئے کھیل کا انجام تو دیکھتے ہی جاؤ۔"

"ڈینی کو ڈر ہے کہ قبائلی افغان اس کی موم کی گڑیا کو اٹھا نہ لے جائیں۔" ویرا مجھ سے پہلے کاٹ دار لہجے میں بول پڑی۔ اس کے پتلے پتلے' گلابی ہونٹوں پر زہریلی مسکراہٹ رقصاں تھی۔

"اس کے بارے میں فکر کی کیا ضرورت ہے؟ میں نے شاہد کو اس کی حفاظت پر لگایا ہوا ہے۔"

"اس بارے میں کوئی ڈینی کو مطمئن نہیں کر سکتا۔" ویرا بدستور زہر فشانی پر تلی ہوئی تھی۔ "اسے تمہاری کوششوں پر مکمل بھروسا نہیں ہے۔ یہ اپنے معاملے کو خود دیکھنا چاہتا ہے۔"

"اس کی باتوں پر نہ جاؤ۔ یہ اس وقت بی جمالو بنی ہوئی ہے۔" میں نے خوش دلی کا جبری مظاہرہ کرتے ہوئے کہا۔ "وہ لوگ میری تلاش میں ہیں۔ میں اُن سے مل کر دیکھنا چاہتا ہوں کہ وہ کون ہیں اور مجھ سے کیا چاہتے ہیں۔ یہاں کی خبریں تو تم سے بھی مل جائیں گی۔ یہاں بھاگ دوڑ کا کام تقریباً ختم ہی ہو چکا ہے۔ اب تو بکھرے ہوئے معاملات کو سمیٹنے کا اکتاہٹ آمیز سلسلہ چل پڑا ہے۔"

"کوئی بھی ضرورت محسوس ہو تو تم بلا تکلف اسٹیشن نور پر شاہد سے کھل کر بات کر سکتے ہو۔ وہ تم کو اچھی طرح جانتا ہے۔ میں بھی اسے بریف کر دوں گا۔"

اول خان ہم سے رخصت ہو رہا تھا لہٰذا ہم دونوں بادہ نوشی کا سلسلہ وہیں معطل کر کے اس کے ساتھ باہر آ گئے تاکہ اسے پُرتپاک انداز میں الوداع کہہ سکیں۔

اس وقت اسپیشل ٹاسک فورس کا عملہ' البرٹو کے زخمی محافظوں کو ایک سیاہ وین کے عقبی حصے میں منتقل کر رہا تھا۔ ہمارے قیاس کے عین مطابق وہ چاروں بے ہوشی کی حالت میں تھے۔ صرف ان کے ہاتھ پیر بندھے ہوئے تھے۔ بعد میں پانچوں نیم تربیت یافتہ بندروں کو بھی وین کے پچھلے حصے میں سوار کرا دیا گیا اور اول خان مجھ سے گلے ملنے کے بعد اپنے مسلح محافظوں کے ساتھ سیاہ وین میں روانہ ہو گیا۔

"آج کی رات بھی گئی۔" کمرے کی طرف واپس لوٹتے ہوئے ویرا اپنی رسٹ واچ پر نگاہ ڈال کر بڑبڑائی۔

"اب یہاں واقعی سکون اور سناٹا ہو چکا ہے۔ خطرناک بندر کے علاوہ صرف دو چار آدمی رہ گئے ہوں گے۔ اب ہم اپنا کمرا بند کر کے کچھ دیر کے لیے آرام کر سکتے ہیں۔" میں نے معنی خیز انداز میں اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ "چند گھنٹوں کی گہری نیند ہمیں تازہ دم کر دے گی۔"

"اب نیند کس کو آتی ہے۔" ویرا کمرے میں داخل ہوتے ہوئے بولی۔

"آ جائے گی۔" میں نے ہولے سے اس کی پشت سہلاتے ہوئے کہا۔ "فی الحال تم باقی ماندہ اسکاچ خالی گلاسوں میں انڈیلو۔ میں اخبار والوں کے فون نمبر تلاش کرتا ہوں۔ یہ کام بھی کر ہی لیا جائے۔"

میں نے کراچی اور راولپنڈی سے شائع ہونے والے ایک موقر اردو روزنامے کے پنڈی آفس کا نمبر ملا کر آپریٹر سے سٹی پیج ایڈیٹر کا نمبر مانگا تو اس نے میری تصحیح کرتے ہوئے مجھے یہ بتانا ضروری سمجھا کہ شہری صفحے کا ایڈیٹر نہیں بلکہ سب ایڈیٹر ہوتا ہے اور وہ اس وقت اخبار کی اگلی کاپی طباعت کے لیے بھیجنے کی تیاریوں میں مصروف تھا۔

"میرے پاس ایک اہم' سنسنی خیز اور تصویری خبر ہے۔ میری کسی سے بھی بات کرا دو۔" میرے لیے اپنے اصل مدعا کا اظہار ناگزیر ہو گیا تھا۔ "تاخیر کی صورت میں تمہارا اخبار اس خبر سے محروم رہ جائے گا۔"

وہ آپریٹر ہی سہی لیکن اخباری صنعت کا کارکن تھا اس لیے خبر کی اہمیت کو اچھی طرح سمجھتا تھا۔ اس نے ذرا سے توقف کے بعد ایک کرائم رپورٹر سے فون کا سلسلہ ملا دیا۔

"تم نے شاید اسلام آباد کے شہباز خان کا نام ضرور سنا ہوگا۔" میں نے فوراً ہی اصل بات شروع کر دی۔ "وہ اس وقت آب پارہ کے ایک کوڑے دان میں آرام کر رہا ہے۔ تم چاہو تو اس کی بہترین تصاویر بنا سکتے ہو۔"

"اسلام آباد میں تو ایک ہی شہباز خان ہے جو طاقت ور اور بارسوخ لوگوں کا منظورِ نظر ہے۔" کرائم رپورٹر کی آواز تحیر زدہ تھی۔ "وہ کوڑے دان میں کیسے پہنچ گیا؟"

"اس کے اعمال اسے وہاں تک لے آئے ہیں۔ وہ عجلت میں اپنا مکمل لباس بھی گھر بھول آیا ہے۔ تم نے وہاں پہنچنے میں دیر کی تو وہ اٹھ کر گھر چل دے گا۔ پرائی عورتوں کو بے لباس کرنے والے' خود زیادہ دیر تک اپنے نفیس ملبوسات سے باہر رہنا پسند نہیں کرتے۔"

"یہ ناقابلِ یقین بات ہے کہ کسی نے اس کو چھیڑنے کی ہمت کی ہو۔ تمہارے اس مذاق کا مطلب کیا ہے؟" کرائم رپورٹر بری طرح الجھ گیا تھا۔ "کہیں تم نشے کے جھونک میں اس کے آدمیوں سے پٹ کر تو نہیں آ رہے ہو؟"

وہ اتنی لمبی دوڑ لگانے سے پہلے میری صداقت کا اندازہ لگانا چاہ رہا تھا جب کہ میں یہ یقین کر لینا چاہتا تھا کہ وہ میری فون کال کو نظر انداز کر کے اپنے دفتر میں نہیں بیٹھا رہے گا اس لیے گفتگو جاری رہی۔

"معلوم ہوتا ہے کہ تم بھی شراب و شباب کے اس سرچشمے سے فیض یاب ہوتے رہے ہو جبھی اپنے محسن کی پردہ پوشی کرنی چاہ رہے ہو۔ تم اپنے دفتر میں اونگھتے رہو' میں کسی اور کو پکڑتا ہوں۔"

"سنو! تم کون ہو؟ اور اس خبر سے تمہارا کیا تعلق

ہے؟" اس کی عاجلانہ آواز ابھری۔

"میں ایک دردمند شہری ہوں اور یہ خبر میں نے ہی تخلیق کی ہے۔ جب شہباز میرے نام سے واقف نہیں تو میں تمہیں کیا بتا سکتا ہوں؟"

"میں ابھی کسی فوٹوگرافر کو اُدھر بھیجتا ہوں۔ آب پارہ تو کافی بڑا علاقہ ہے۔ شہباز خان وہاں کے کس کوڑے دان میں پڑا ہوا ہے۔" آخر کار اس کی پیشہ ورانہ جبلت معروضی سوالات پر غالب آگئی۔

"آب پارہ مختصر سا علاقہ ہے اور اسلام آباد میں ابھی کوڑے دانوں پر نمبر نہیں ڈالے گئے۔" میں نے چبھتے ہوئے لہجے میں کہا۔ "تم اسے بہ آسانی تلاش کرلو گے۔ ہوسکتا ہے کہ تمہارے وہاں پہنچنے سے پہلے کسی نے اسے مردہ سمجھ کر شور مچادیا ہو اور وہاں بھیڑ لگ چکی ہو۔"

میں نے مزید کوئی بات سنے بغیر فون بند کردیا۔ میرے پاس دوسرا نمبر اسلام آباد میں قائم' ایک خبر رساں ایجنسی کا تھا۔ وہاں کا شفٹ انچارج بھی شہباز خان کا نام سنتے ہی چونکا تھا لیکن اس نے کوئی بحث کیے بغیر' میری فراہم کی ہوئی اطلاع کی مکمل تصدیق کرانے کا وعدہ کرلیا تھا۔

میں حیران تھا کہ شہباز کے گھناؤنے کاروبار سے جڑواں شہروں کے تقریباً تمام ہی باخبر حلقے واقف تھے لیکن اس کے پشت پناہوں کے بے پناہ اثر ورسوخ کی وجہ سے اس کے خلاف کچھ لکھنے یا عملی کارروائی کرنے سے پہلوتہی کرتے تھے۔ یہی صورتِ حال کسی بھی مہذب معاشرے کی مکمل تباہی کی نشان دہی کرتی تھی۔

ویرا اپنی مسہری پر نیم دراز ہوکر' ندیدے پن کے ساتھ باقی ماندہ اسکاچ کے چھوٹے چھوٹے گھونٹ لے رہی تھی۔ میں اپنا گلاس لے کر اسی کے بستر پر جابیٹھا تو اس کے ہونٹوں پر معنی خیز مسکراہٹ ابھر آئی۔

"مجھ سے الگ ہو کر بیٹھو۔" وہ دور کھسکنے کی کوشش کیے بغیر بولی۔ "میں تمہارے لیے نامحرم ہوں۔"

میں نے گہری نگاہوں سے اس کی طرف دیکھا اور پھر دروازہ بولٹ کرنے کے لیے وہاں سے اٹھ گیا۔ میں پلٹا تو وہ پھرتی کے ساتھ اپنا گلاس خالی کرکے' میرے گلاس پر قابض ہوچکی تھی۔ اس وقت اس کی خوبصورت آنکھیں کسی بلی کی چیلنج کرتی ہوئی آنکھوں کی طرح چمک رہی تھی۔

○☆○

اولیانولاکھ رنگین مزاج اور ذہین سہی' منافقت کے فن سے یکسر نابلد تھا۔ اس کے دل میں جو بات ہوتی تھی وہ کسی نہ کسی طرح اس کی زبان پر آہی جاتی تھی۔ اس نے مجھے ویرا کے ساتھ دیکھتے ہی کہہ دیا کہ اسے میری آمد کی امید نہیں تھی' وہ صرف ویرا کو خوش آمدید کہنے کے لیے خود کو تیار کرسکا تھا۔

"اب دوستی ہوگئی ہے تو ہماری ملاقاتیں ہوتی رہیں گی۔ تنی اپنے کام سے بیرون شہر جاتا ہے تو میں اکیلے پڑے پڑے اکتا جاتی ہوں۔ اچھا ہے کہ اب تمہارا ساتھ میسر رہے گا۔" ویرا نے موقع کی نزاکت بھانپتے ہوئے اسے وعدۂ فردا کی امید دلائی تو اس کا چہرہ کھل اٹھا۔ میری مداخلتِ بے جا اپنی جگہ پر تھی لیکن اولیانو کے لیے اتنا ہی کافی تھا کہ ویرا جیسی خوبصورت لڑکی اس کا ذہن پڑھ کر' اشاروں کنایوں میں اس کی ہم خیال ہونے کا اعتراف کررہی تھی اور میں کند ذہنی کا مظاہرہ کرتے ہوئے' اس صورتِ حال سے لاتعلق بنا ہوا تھا۔

ہم لوگ اول خان کی واپسی سے قبل' صبح ساڑھے چھ بجے ہی اسپیشل ٹاسک فورس کے ریسٹ ہاؤس سے نکل کھڑے ہوئے تھے۔ ہم نے ڈرائیور کو اپنے ساتھ لے لیا تھا۔ ہمارا ارادہ تھا کہ اولیانو کو دفتر سے روانہ ہونے سے پہلے ہی پکڑلیا جائے۔ اس سے فارغ ہوکر ہم سیدھے ائرپورٹ کی طرف نکل جاتے۔ اگر فوراً ہی کسی پرواز پر نشستیں مل جاتیں تو گاڑی کو واپس لوٹا دیتے۔ پرواز میں زیادہ دیر ہوتی تو کنفرمڈ ٹکٹ خرید کر اسی گاڑی میں واپس ریسٹ ہاؤس لوٹ آتے تاکہ اولیانو سے ہاتھ لگنے والے مواد پر اول خان کے ساتھ تبادلۂ خیال کرسکیں۔

اولیانو سحر خیزی کا عادی تھا۔ شاید اس کی صحت مندی اور تازگی کا راز بھی اسی عادت میں پوشیدہ تھا۔ وہ بیدار ہونے کے بعد ناشتے وغیرہ سے فارغ ہوچکا تھا۔ اس نے ہمیں چائے نوشی کی دعوت دی جسے ویرا نے خوبصورتی سے ٹال دیا۔

اولیانو نے بھی اصرار نہیں کیا کیونکہ وہ خود دفتر کے لیے روانہ ہونے کی عجلت میں نظر آرہا تھا۔

ہمیں نشست گاہ میں بٹھا کر وہ اندر گیا اور چند منٹ بعد واپس آیا تو ہماری توقع کے برعکس اس کے دونوں ہاتھ خالی تھے اور وہ چہرے سے متذبذب نظر آرہا تھا۔

"میں اب بھی ظفر یا البرٹو سے خوف زدہ ہوں۔" بیٹھنے کے بعد وہ اپنی دونوں ہتھیلیاں رگڑتے ہوئے بولا۔ "کہیں ایسا نہ ہو کہ میں تم سے تعاون کرکے' مصائب کی دلدل میں اور گہرا دھنس جاؤں۔"

"میں یقین دلاتی ہوں کہ ہماری وجہ سے تمہارا بال بھی

بیکا نہیں ہوگا۔" ویرا اس کا ہاتھ تھام کر محبت آمیز لہجے میں بولی۔ "یہ تو ایک ایسا جرم ہوگا کہ میں زندگی بھر خود کو معاف نہیں کرسکوں گی۔"

ویرا اس کی کمزوری بن گئی تھی۔ وہ اس کی ادا پر ریشۂ خطمی ہوگیا۔ "میں تمہاری یقین دہانی پر پورا پورا اعتماد کرتا ہوں لیکن مجھے تمہارے بوائے فرینڈ سے کوئی خاص امید نہیں ہے۔ یہ احمق ہونے کے ساتھ ساتھ بہت عیار بھی ہے۔ میں پرسوں رات دیر تک یہ سوچ سوچ کر حیران ہوتا رہا کہ اس نے نلنی کور جیسی چالاک اور مردمار عورت کو ذرا سی دیر میں' کس طرح اپنے قابو میں کرلیا تھا؟ جو باتیں میں اسے ہرگز نہ بتاتا' وہ نلنی کور نے چند منٹ میں اس کے سامنے اگل دیں اور یہ اس کو نشے میں دھت کرکے' میرے سر پر مسلط کرکے چل دیا۔"

"وہ تنی کا نہیں' میرا فیصلہ تھا۔ تم نلنی سے خوف زدہ تھے تو ہمیں رات بھر کے لیے بھی یہاں روک سکتے تھے۔"

وہ دھیمے سے ہنس پڑا۔ "میں خوبصورت عورتوں سے ذرا بھی نہیں ڈرتا۔ ان سے کھیلنے میں تو عجیب ہی لطف آتا ہے۔ اصل خوف اس کے شوہر کی طرف سے تھا۔ وہ اسے ڈھونڈتا ہوا ادھر آنکلتا تو میں بری طرح پھنس جاتا۔ وہ اسکینڈل میرے لیے ظفر کے ویڈیو کیسٹ سے بھی زیادہ تباہ کن ہوسکتا تھا۔"

میں اس دوران میں سوچتا رہا تھا۔ میں نے فیصلہ کیا کہ اسے البرٹو کے انجام سے باخبر کرنے میں کوئی ہرج نہیں تھا۔ میں نے کہا۔ "محض تمہاری خاطر ہم نے سارے وسائل داؤ پر لگا کر ظفر کو پکڑلیا ہے۔ تم اس کے بارے میں جلد ہی یہاں کے اخبارات میں بہت کچھ پڑھ لوگے۔ اب وہ تمہیں تنگ نہیں کرسکتا۔"

"تو کیا میرا کیسٹ بھی تمہارے ہاتھ آگیا؟" اس نے تیز اور پُرامید لہجے میں پوچھا۔

"ابھی اس کے ٹھکانوں کی تلاشی کا کام جاری ہے۔" میں نے اس کو تسلی دلانے کے لیے جھوٹ بولا۔ "ابھی تک سو کے قریب کیسٹ ملے ہیں جن پر نمبر پڑے ہوئے ہیں۔ وہ نہ جانے کس کس کو بلیک میل کررہا تھا۔ ان میں سے تمہارا کیسٹ تلاش کرنے میں خاصا وقت لگ سکتا ہے۔ اس کے لیے ہر کیسٹ کا کچھ حصہ چلا کر دیکھنا پڑے گا تب معلوم ہوسکے گا کہ کون سا کیسٹ کس کا ہے۔"

"تم نے میرا دل خوش کردیا۔" اولیانو کے لیے اپنی بے پناہ خوشی پر قابو پانا دشوار ہوگیا اور وہ اپنی جگہ سے اٹھ کر میرے اوپر آپڑا۔ وہ اس قدر جوش میں تھا کہ معانقہ کرنے کے لیے' اس نے مجھے اپنی جگہ سے اٹھنے کا موقع بھی نہیں دیا تھا۔ "مجھے حیرت ہے کہ تم نے آتے ہی یہ خبر کیوں نہیں سنائی؟"

"تم چاہو گے تو ہم تمہارا کیسٹ تلاش کرنے کی کوشش کریں گے لیکن میں جانتا ہوں کہ ہر فلم میں گھٹیا اور واہیات مواد ہوگا جسے دیکھ کر کوئی ذہنی بیمار ہی خوش ہوسکتا ہے۔ میرا خیال تھا کہ ہم ان فلموں کو دیکھے بغیر' جلا کر تلف کردیں تاکہ تم جیسے معزز لوگوں کا بھرم برقرار رہے۔"

"تم بالکل ٹھیک سوچ رہے ہو۔" اس نے پُرزور انداز میں میری تائید کی۔ "فلمیں بہت سے لوگ مل کر دیکھیں گے۔ ان کو یوں ہی جلا دینا بہتر رہے گا۔ میرے لیے تو بس اتنا ہی کافی ہے کہ موذی اب آزاد نہیں ہے۔ اسے دوسروں کی عزت سے کھیلنے کا کوئی اور موقع نہیں دیا جائے گا۔"

"ہم اس کے سلسلے میں بہت مصروف ہیں۔ وقت نکال کر صبح ہی صبح اس لیے آئے ہیں تاکہ اس کے خلاف ملنے والے سارے ممکنہ ثبوت یکجا کرسکیں۔ وہ فیکس اور باہر کے نمبروں کی فہرست کہاں ہے؟"

"یہ لو!" اس نے اپنی پتلون کی جیب سے ایک سفید لفافہ نکال کر میری طرف بڑھا دیا۔ "یہ میں اندر سے لے آیا تھا لیکن سچ بات یہ ہے کہ ظفر کے پکڑے جانے کی خبر سننے سے پہلے میں یہ لفافہ تم دونوں کے حوالے کرتے ہوئے ہچکچا رہا تھا۔ ہوسکتا ہے کہ میں کوئی بہانہ کرکے تمہیں ٹال ہی دیتا۔"

میں نے وہ لفافہ کھول کر دیکھے بغیر اپنی جیب میں ڈال لیا کیونکہ کام بن جانے کے بعد میں جلد از جلد اس کے گھر سے روانہ ہوجانا چاہ رہا تھا۔ ویرا میرا مدعا بھانپتے ہوئے فوراً ہی اٹھ کھڑی ہوئی۔

"ارے! تم کہاں چل دیں؟ تھوڑی دیر تو بیٹھو۔ میں پونے آٹھ بجے دفتر کے لیے نکلتا ہوں۔ اس وقت تک فرصت ہی فرصت ہے۔" اولیانو' ویرا کو اٹھتا ہوا دیکھ کر' بوکھلائے ہوئے لہجے میں بولا۔

"نہیں' اولی ڈارلنگ! ہمیں چلنا چاہیے۔ ہمیں ہر کیسٹ اپنی تحویل میں لینے کے لیے وہاں موجود رہنا چاہیے۔ تنی تو بعض اوقات باتوں میں پڑ کر بالکل ڈفر ہوجاتا ہے۔" ویرا نے میرے بارے میں بدمزاجی کا مظاہرہ کرنا ضروری سمجھا تھا۔

"ارے نہیں' یہ بھی بہت پیارا لڑکا ہے۔ آج اس نے

میرے سر پر سے بہت بڑا بوجھ ہٹا دیا ہے۔ تم نے تو اس خوشخبری کا ذکر ہی گول کیا ہوا تھا۔" اولیانو نے میرے لیے پہلی بار کوئی کلمۂ خیر استعمال کیا تھا۔

ہم دونوں بہت تیزی کے ساتھ وہاں سے روانہ ہوئے۔ میں نے گاڑی چلتے ہی سفید لفافہ چاک کیا تو اس میں دو کاغذ موجود تھے۔ میرے اشارے پر ڈرائیور نے گاڑی کا رخ ائرپورٹ جانے والے راستے کی طرف کر دیا۔ دونوں کاغذ ہاتھ آجانے کے بعد ریسٹ ہاؤس کی طرف جانا وقت برباد کرنے کے مترادف ہوتا۔

اولیانو کے بیان کے مطابق فیکس پر آنے والا پیغام بہت مختصر اور سادہ تھا۔ اس پر کہیں بھی تاریخ یا بھیجنے والے کا نام یا فیکس نمبر نہیں تھا۔ پانچ انگریزی الفاظ پر مشتمل وہ تحریر ہاتھ سے لکھی گئی تھی۔ کوئی حرف خصوصی باریکی یا موٹائی کا حامل نہیں تھا۔ پوری تحریر یکساں تسلسل میں تھی۔ ویرا بھی کافی دیر تک مغز زنی کرنے کے باوجود ان پانچ عام فہم الفاظ میں کوئی خفیہ کنایہ دریافت نہیں کر سکی۔

دوسرے کاغذ پر چار فیکس نمبر تھے۔ ان نمبروں پر اولیانو نے محنت کی تھی اور کوڈ نمبروں کی مدد سے ہر نمبر کے آگے ملک اور شہر کا نام بھی لکھ دیا تھا۔ ان میں سے دو نمبر کے تھے۔ ایک نیویارک اور چوتھا لندن کا تھا۔

بوگوٹا میں اس کے زیادہ رابطے ہونے کا مضبوط جواز تھا کیونکہ وہ وہیں کا باشندہ تھا۔ کرنل جیسی جونز کے علاوہ بھی اس کے بہت سے دوست اور رشتے دار وہاں مقیم ہو سکتے تھے۔ نیویارک کا نمبر شاید نسل پرست اور مال دار یہودیوں کی امریکی تنظیم 'ڈیوڈ اسٹارز' کے کسی اہم ٹھکانے سے تعلق رکھتا تھا کیونکہ ان دنوں وہ لوگ ڈیوڈ اسٹارز کے لیے بھی کام کر رہے تھے اور البرٹو کے لیے بعض اوقات ان سے رابطہ کرنا ناگزیر ہو جاتا ہوگا۔ لندن کے نمبر کے بارے میں اندازہ لگانا ممکن نہیں تھا۔ وہ ایسے کسی مالیاتی ادارے کا نمبر ہو سکتا تھا جو ڈیوڈ اسٹارز کے فراہم کیے ہوئے فنڈز سے البرٹو کو وقتاً فوقتاً مقررہ رقوم ارسال کرنے کا ذمے دار ہو لیکن وہ سب صرف قیاسات ہی تھے۔ ان کے بارے میں تفصیلی تحقیقات بہت ضروری تھیں۔

ہم دونوں نے اس بارے میں تبادلۂ خیال کیا اور مشترکہ طور پر اس نتیجے پر پہنچے کہ ہمارے پاس اتنے وسائل نہیں تھے کہ ہم ان نمبروں پر پیغام کے بارے میں مزید کام جاری رکھ سکتے۔ اول خان اس وقت اسلام آباد میں بیٹھا ہوا تھا جہاں سارے وفاقی وسائل مرتکز تھے۔ اگر وہ دونوں کاغذات اسے بھجوا دیے جاتے تو ان کے بارے میں فوری پیش رفت ہو سکتی تھی۔

میں نے ایک کاغذ پر چاروں فیکس نمبر نوٹ کر کے اپنے پاس رکھ لیے اور وہ دونوں کاغذ لفافے میں ڈال کر کار کے ڈرائیور کے حوالے کر دیے تاکہ وہ واپسی پر وہ لفافہ دستی طور پر اول خان کو پہنچا دے۔

ائرپورٹ پر پی آئی اے کے سیلز کاؤنٹر سے دس بجے کی پرواز کے ٹکٹ بہ آسانی مل گئے۔ وقت اتنا کم تھا کہ ہمارے لیے اسلام آباد جا کر فوری طور پر واپس آنا بے سود ہوتا اس لیے میں نے ڈرائیور کو شکریے کے ساتھ واپس لوٹا دیا اور میں ویرا کے ساتھ پبلک کال آفس کی طرف چل دیا۔

اس پبلک کال آفس میں ان دنوں ڈائرکٹ ڈائلنگ والے نمبروں پر ایسے فون موجود تھے جن کے نچلے حصوں میں کال یونٹ ریکارڈ کرنے والے میٹر لگے ہوئے تھے۔ مجھے ایسے فون پر ایک بار مختصر سی کال کے پونے دو سو روپے ادا کرنے کا تلخ تجربہ ہو چکا تھا اور میں ان لوگوں کے طریقۂ واردات سے بھی واقف ہو گیا تھا۔ وہ لوگ شریف اور سادہ لوح افراد کو خود ہی نمبر ملا کر دیتے تھے اس طرح میٹر کی ابتدائی ریڈنگ کا صارف کو علم نہیں ہوتا تھا۔ کال ختم ہونے کے بعد صارف نے ان کی بتائی ہوئی رقم بے چون و چرا کیے ادا کر دی تو ٹھیک ورنہ اعتراض کی صورت میں وہ میٹر کے ساتھ اپنی رسید بک سامنے رکھ کر مزید رقم اینٹھنے پر تُل جاتے تھے۔ نکتہ یہ تھا کہ وہ ہر شخص کو رسید جاری نہیں کرتے تھے جو اصرار کرتا اس کو فرضی ریڈنگ کے اعتبار سے بل دے دیا جاتا۔ اس طرح ان کے میٹر کی ابتدائی ریڈنگ رسید بک کے اعتبار سے ہر وقت پیچھے رہتی تھی جو اُن کے لیے فاضل آمدنی کا ذریعہ بنی رہتی تھی۔ ڈیوٹی کے اختتام سے پہلے فرضی رسیدیں کاٹ کر اس فرق کو دور کر دیا جاتا تھا۔ محکمے کو اس کا اصل محصول مل جاتا اور صارفین سے اینٹھی ہوئی فاضل رقوم عملے کی جیبوں میں چلی جاتی تھی جو کسی بھی شفٹ میں سیکڑوں روپے سے کم نہیں ہوتی ہوگی۔

میں نے کراچی کا نمبر دینے سے پہلے' آپریٹر سے میٹر دکھانے کا مطالبہ کیا تو اس نے مجھے یوں تحقیر آمیز نظروں سے دیکھا جیسے میں نے اسے کوئی ننگی گالی دے ڈالی ہو پھر اس نے بدتمیزی سے ہاتھ مار کر فون کا اگلا حصہ میرے سامنے کر دیا۔ اس وقت اس کا بس نہیں چل رہا تھا ورنہ وہ شاید انسٹرومنٹ مار کر میرا سر ہی پھاڑ ڈالتا۔

میں نے فون پر غزالہ کی خواب آلود آواز سن کر دل میں گفتگو کا ارادہ ترک کر کے اسے صرف اتنا بتایا کہ میں کسی بھی وقت کراچی پہنچنے والا تھا۔ میں نے اپنی پرواز کا نمبر اس خیال سے نہیں دیا کہ وہ میرا استقبال کرنے کے لیے ائرپورٹ دوڑی چلی آئے گی جس کے نتیجے میں دشواریاں پیدا ہو سکتی تھیں۔

اس وقت تک وہ دونوں خیریت سے تھے اور اُن کے ساتھ کوئی قابلِ ذکر واقعہ پیش نہیں آیا تھا۔

میں نے سلسلہ منقطع کر کے آپریٹر کو اول خان کا نمبر دیا تو اسے اپنے دل کی بھڑاس نکالنے کا موقع مل گیا۔ اس نے دوبارہ میٹر میری طرف گھماتے ہوئے ترش روئی کے ساتھ کہا۔ "ریڈنگ پھر دیکھ لو اور چوالیس روپے نکالو۔ یہ ایس ٹی ڈی فون ہے۔ دوسرے آدمی کے لیے جگہ خالی کرو۔ لوکل کال اُدھر سے ہوتی ہے۔" یہ کہتے ہوئے اس نے اپنے سر کی جنبش سے داہنی طرف اشارہ کیا تھا۔

"تمہیں بات کرنے کا سلیقہ نہیں ہے۔" اس کے لب ولہجے نے مجھے اچانک ہی مشتعل کر دیا۔ "یہاں آنے والوں سے اسی طرح بدتمیزی کی جاتی ہے؟"

"اجی قبلہ وکعبہ! میں نے کون سی گستاخی کی ہے؟" وہ طنزیہ لہجے میں بولا "اتنا ہی تو عرض کیا ہے کہ یہاں سے صرف ایس ٹی ڈی کالز ہوتی ہیں۔ لوکل کال کے لیے دوسرے فون پر تشریف لے جائیے۔ معلوم ہوتا ہے کہ کراچی کی کال کے چوالیس روپے بھی آپ پر بھاری پڑے ہیں جو اتنے برہم ہو رہے ہیں۔"

میری اس ہتک پر آس پاس موجود کئی افراد ہنس پڑے۔ میرے پیچھے والے کو اپنی باری کی عجلت تھی۔ اُس نے میرا بازو دبا کر مجھے غصہ تھوکنے کا مشورہ دیا۔ اسی لمحے میری اونچی آواز سے بوکھلا کر ویرا بھی میرے سر پر مسلط ہو گئی۔ لوگوں کی اس سنگدلانہ بے حسی نے میرا دل خون کر دیا۔ وہ کوئی نئی بات نہیں تھی۔ وہ ہمارا اجتماعی مزاج بنتا جا رہا تھا کہ ہم اپنی ایک پریشانی یا بے عزتی پر بری طرح بلبلاتے ہیں لیکن دوسروں کے ساتھ ویسا ہی واقعہ پیش آجائے تو ہمدردی اور حق گوئی کے دو بول بولنے کے بجائے اُس کا مذاق بنانے یا اسے شرمندہ کرنے میں مصروف ہو جاتے ہیں جیسے وہ فاترالعقل دیوانہ ہو۔

میں نے جیب سے پینتالیس روپے نکال کر کاؤنٹر پر پھینکتے ہوئے رسید کا مطالبہ کیا جو بلا حیل و حجت بنا کر' ایک روپے سمیت میرے حوالے کر دی گئی۔ مجھے یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے ہر شخص تمسخرانہ انداز میں مجھے دیکھ رہا ہو۔

اس وقت میرے وجود میں لاوا کھول رہا تھا۔ میں خفت آمیز انداز میں ملحقہ کاؤنٹر پر اول خان کا نمبر ملا رہا تھا تو میرے کانوں میں اسی آپریٹر کی تلخ آواز آئی۔ وہ کسی سے کہہ رہا تھا۔

"ارے بھائی' یہاں صبح سے شام تک سیکڑوں باؤلے آتے ہیں اور ہمیں ان کی سننی پڑتی ہے مگر ہم انہیں دور ہی سے پہچان لیتے ہیں۔ بھائی لوگ اپنے یار دوستوں اور بیوی بچوں سے فون پر لمبی لمبی باتیں کرتے ہیں اور بڑی احتیاط سے رسیدیں جمع کرتے رہتے ہیں تاکہ موقع پاتے ہی وہ رسیدیں سرکاری خرچے میں ڈال دیں۔"

"تم ٹھیک کہتے ہو۔" وہ فون کے انتظار میں کھڑے ہوئے کسی شخص کا تعریفی تبصرہ تھا۔ "عام آدمی کو رسید اور پرچی سے کیا لینا۔ بلا وجہ وقت کھوٹا ہوتا ہے۔ ہم سیکڑوں روپے کے فون کرتا ہے۔ فون کیا' پیسہ دیا اور جلدی سے دوسرے کے لیے جگہ چھوڑ دی۔ اِدھر ہر آدمی ضرورت سے اور جلدی میں آتا ہے۔ ہر آدمی رسید مانگے تو ادھر باہر تک لائن لگی رہے گی۔ لوگوں کو اپنا مال پانی بنانے کے ساتھ دوسروں کا بھی خیال کرنا چاہیے۔"

دکھ کی بات یہ تھی کہ وہ فقرے کوئی ظالم اور لٹیرا نہیں بلکہ مظلوم طبقے کا ایک فرد اپنی مرضی سے کہہ رہا تھا۔ اسے یہ احساس ہی نہیں تھا کہ وہ اپنی اس حرکت سے اپنے بعد آنے والے کے لیے کیسی مشکل کھڑی کر دیتا تھا۔ عام لوگوں کی یہی کم فہمی معاشرے میں رشوت اور لوٹ مار کو فروغ دے رہی تھی۔

میں نے بددل ہو کر فون کا ریسیور کریڈل پر ڈالا اور اول خان سے بات کیے بغیر پبلک کال آفس سے باہر آگیا۔ میں وہاں رُکا رہتا تو اشتعال کے عالم میں کوئی بڑا ہنگامہ کھڑا کر سکتا تھا۔

ویرا ہماری معاشرتی خرابیوں پر گہری نظر رکھتی تھی۔ اس کے استفسار پر میں نے اسے پورے پس منظر سے آگاہ کیا تو اس نے اعتراف کیا کہ مغرب اور امریکا میں بھی لوگ غنڈوں' لٹیروں اور بدمعاشوں کے مقابلے میں مظلوم کا ساتھ دینے سے کنی کتراتے ہیں کیونکہ وہاں جان کا خطرہ ہوتا ہے۔ البتہ دو عام شہریوں یا عام شہری اور کسی سرکاری اہل کار کے درمیان کوئی تنازعہ ہو تو حق دار کو حق ملے یا نہ ملے' اسے تماشائیوں کی تمام ہمدردیاں فی الفور حاصل ہو جاتی ہیں اور یہی یک جہتی ان میں اپنے حقوق کے لیے لڑ جانے کا حوصلہ پیدا کرتی ہے لیکن پاکستان کے بڑے شہروں کا باوا آدم ہی نرالا تھا۔ اچھے خاصے 'پڑھے لکھے لوگوں نے خود کو تیسرے درجے کا محکوم تصور کر کے خود کو بڑے تو کیا' نچلے درجے کے سرکاری اور نیم سرکاری ملازموں کے رحم و کرم پر چھوڑا ہوا

ہے اور خود سپردگی کا یہ اجتماعی رویّہ سرکاری عفریتوں کی بھوک میں روز افزوں اضافہ کررہا ہے۔

آٹھ بجے ائرپورٹ کے چیکنگ سسٹم پر پرواز نمبر پی کے تین صفر ایک کے لیے کاؤنٹر کھلنے کا اعلان ہوا تو ہم دونوں ٹکٹ دکھا کر اندر داخل ہوئے اور تمام مراحل سے گزرتے ہوئے' چند منٹ میں روانگی کے لاؤنج میں پہنچ گئے۔ وہاں کافی پینے کے بعد میرا موڈ قدرے بحال ہوا تو ویرا نے آہستگی سے مجھے اول خان سے بات کرنے کا مشورہ دیا۔ یہاں ماحول اور عملہ مختلف تھا اس لیے میں فوراً فون کی طرف چل پڑا۔

اس وقت تک اول خان اپنے دفتر میں واپس آچکا تھا۔ میری آواز سنتے ہی وہ چہکنے لگا۔ "آج تم سارے کام بہت اچھے کررہے ہو۔ پہلے تم نے اولیانو سے ملنے والے کاغذات مجھے بھجوائے اور اب فون بھی کررہے ہو۔ ٹیلی فون کے محکمے کے ڈائریکٹر جنرل کی سطح پر یہ بندوبست کرلیا گیا ہے کہ اولیانو کے فیکس نمبر کو چند روز کے لیے ایکسچینج سے کاٹ کر اس نمبر پر ایکسچینج ہی میں ایک فیکس مشین منسلک کردی جائے گی۔ اس طرح اولیانو کے فیکس نمبر پر آنے والے تمام پیغامات ان لوگوں کے ذریعے بالا ہی بالا ہم تک پہنچ جائیں گے۔ ہوسکتا ہے کہ اتوار سے پہلے کوئی اور اہم پیغام ہمارے ہاتھ لگ جائے۔ باہر کے نمبروں کے بارے میں مکمل رازداری کے ساتھ مصدقہ معلومات حاصل کرنے کے لیے قدرے طویل لیکن فول پروف طریقہ اختیار کرنے کا فیصلہ کیا گیا ہے۔"

"مجھے اب بھی یقین نہیں آرہا کہ یہ انتظامات اتنی سُرعت کے ساتھ کیے جانے ممکن تھے۔" میں نے فون کاؤنٹر پر موجود شخص کی وجہ سے گول مول بات کی۔

"اس وفاقی محکموں کے تمام ذمّے دار پوری طرح الرٹ ہیں۔ انہیں ملک کو درپیش خطرات کی سنگینی کے بارے میں پوری طرح بریف کردیا گیا ہے اور کوئی نہیں چاہے گا کہ اس کے محکمے کی کسی کوتاہی کی وجہ سے مدافعانہ کارروائیوں کو کوئی گزند پہنچے۔ وزارتِ خارجہ تک میدان میں آکودی ہے۔"

"وزارتِ خارجہ؟" میں نے حیرت سے دہرایا "لیکن کولمبیا کی حکومت البرٹو کے بارے میں کوئی ذمّے داری قبول کرنے کی پابند نہیں ہے۔ فری لانس ٹیرارسٹ اور مرسن ریز کسی کے لیے بھی کام کرتے رہتے ہیں۔ ان پر حکومتوں کا کوئی کنٹرول اور اختیار نہیں ہوتا۔" وہ تبصرہ کرتے ہوئے میں نے دیکھ لیا تھا کہ میں اس وقت اکیلا رہ گیا تھا۔

"تم غلط سمجھ رہے ہو۔ عام حالات میں ہر محکمہ ایک دوسرے پر ذمّے داریاں ڈالتا ہے لیکن وزارتِ خارجہ کے ایک ڈپٹی سیکریٹری نے فیکس نمبروں کے مالکان کا کھوج لگانے کی ذمّے داری خود قبول کی ہے۔"

"وہ لوگ اس بارے میں کیا کرسکیں گے؟" میری حیرت میں مزید اضافہ ہوگیا۔

"وہ متعلقہ ممالک میں اپنے سفارت خانوں کو ہدایات دیں گے اور وہ متعلقہ شہروں کی فیکس ڈائریکٹریوں سے مالکان کا سراغ لگا کر اسے اپنے طور پر چیک کریں گے اور حقائق پاکستان بھیج دیں گے۔ اس طرح ان ملکوں میں کسی کو بھنک بھی نہیں مل سکے گی کہ کیا ہو رہا ہے اور وہاں کے حکام کو اعتماد میں لیے بغیر ہمیں انتہائی نچلی سطح سے سارا مطلوبہ مواد مل جائے گا۔"

وہ طریقہ کار جس نے بھی سوچا تھا' اس کی نگاہیں بہت دور تک دیکھنے کی عادی معلوم ہوتی تھیں۔ اگر وہ معلومات سرکاری سطح پر منگوائی جاتیں تو ان چاروں نمبروں کے صارفین کے ساتھ کوئی بھی بڑا حادثہ پیش آنے کی صورت میں ان کی حکومتیں پاکستان کو انتقامی کارروائی کا ذمّے دار ٹھہرا سکتی تھیں لیکن اپنے سفارتی ذرائع سے معلومات حاصل کرنے کے بعد پاکستانی حکومت اپنے سیکرٹ ایجنٹوں کے ذریعے البرٹو کے ان غیر ملکی پشت پناہوں کی خاطر خواہ گوشمالی کرانے کے باوجود پسِ پردہ رہ سکتی تھی اور شاید ہونا بھی یہی تھا۔

میں نے لمحہ بھر میں وہ سب سوچا اور تعریفی لہجے میں کہا۔

"یہ بہت دوررس فیصلہ ہے۔ مجھے خوشی ہے کہ عام حالات میں ایک دوسرے کی ٹانگ کھینچنے والے برے وقت میں سیسہ پلائی ہوئی دیوار ثابت ہو رہے ہیں۔ بادی النظر میں تو یہ فائل مواصلات کے محکمے میں کھلنی چاہیے تھی اور اس کے بہت سے مضمرات بھی ہوسکتے تھے۔ بہرحال اب تک تو سب کچھ بہترین انداز میں ہی ہو رہا ہے۔" فون اٹینڈنٹ مجھے گفتگو میں مصروف پاکر بدستور کہیں غائب تھا۔

"میں تمہارے دلی جذبات سے تو لاعلم ہوں لیکن اپنے بارے میں کہہ سکتا ہوں کہ میرا سر بہت اونچا ہوگیا ہے اور میں عجیب سے سنسنی خیز ہیجان سے دوچار ہوں۔ اس وقت کچھ ویسی ہی صورتِ حال نظر آرہی ہے جو مغربی ملکوں کی محنت اور خطیر سرمائے سے تیار کی گئی اسلامی بم نامی فلم میں دکھائی گئی تھی۔ اس فلم کو دیکھ کر یقین نہیں آتا تھا کہ ہمارے بیوروکریٹ اور سرکاری اہل کار اس قدر مخلص' جفاکش اور قوم پرست بھی ہوسکتے ہیں۔ کلیدی پُرزوں اور ضروری سازوسامان کی خریداری کے لیے ہمارے سفارت کار شہر شہر اور گلی گلی بھٹکتے پھرے تھے تب کہیں کہوٹہ کا نقشہ زمین پر ابھرا تھا۔"

"تم جذباتی ہو رہے ہو' اول خان!" میں نے گہری سنجیدگی سے کہا۔ اس وقت تک فون اٹینڈنٹ کے علاوہ دو مسافر بھی وہاں آگئے تھے۔ میں نے مبہم انداز میں اپنی بات جاری رکھی۔ "وہ فلم ان لوگوں نے اپنے مقاصد کے تحت بنائی تھی۔ اصل کہانی تو بس وہی جانتا ہے جو اسے چلا رہا ہے۔"

"اوہ! میں بھول گیا تھا کہ تم کسی پبلک کال آفس سے بول رہے ہوگے۔" وہ میری مجبوری کو فوراً ہی بھانپ گیا۔ "اب کراچی میں بات ہوگی لیکن یہ ضرور سن لو کہ اصل بڑا آدمی وہ تھا جسے لٹکا دیا گیا۔ باقی نام اس کے بعد آتے ہیں۔ اور ہاں' کراچی میں میری بیوی کو ضرور سمجھا دینا۔"

"تم فکر نہ کرو۔ میں بھابی سے بات کرلوں گا۔ بس اتنا اور بتاتے چلو کہ کارخانے کی کیا خبریں ہیں؟" میں نے دزدیدہ نگاہوں سے اکتائے ہوئے مسافروں کا جائزہ لیتے ہوئے کہا۔

"بالکل خاموشی ہے۔ آپریشن مکمل ہونے پر ہی کچھ معلوم ہوسکے گا۔" اس نے جواب دیا۔

"خدا حافظ۔" میں نے فون بند کرکے پانچ روپے کا نوٹ کاؤنٹر پر رکھا اور واپس ہولیا۔

اول خان سے بات کرکے میری ساری کوفت دور ہوگئی تھی۔ وہ دوسروں کے کندھوں پر سوار ہو کر اپنا قد بڑھانے والے خود غرض لوگوں میں سے نہیں تھا۔ وہ ہر وقت میری اور ویرا کی ناقابلِ فراموش کارکردگی کا ذکر کرتا رہتا تھا۔ اگر وہ خود کو سربلند محسوس کررہا تھا تو میری کیفیت بھی زیادہ مختلف نہیں تھی۔

البرٹو' جسے ہر شخص ظفر سمجھ کر اس کے خلاف کوئی بات سننے پر آمادہ نہیں تھا' ویرا کے ایک اشارے کی بنا پر میری نظروں میں مشکوک ہوا تھا۔ اس وقت ویرا نے بھی میرا مذاق اڑایا تھا لیکن میں اپنے قریبی ساتھیوں کی ان مخالفتوں کی وجہ سے بددل ہونے کے بجائے یک سوئی سے اپنے مشن میں لگا رہا اور اب اسی البرٹو کے حوالے سے ایسی بھیانک سازش سامنے آرہی تھی کہ ہر شخص لرزہ براندام تھا۔ شاید یہ ان ذلتوں کا کفارہ تھا جو میں نے شی کے لیے ہیروئن فروشی کی ابتدا کرکے اپنی جوان نسل کی پیشانیوں پر مسلط کردی تھیں۔ مجھے اپنا سینہ کچھ کشادہ اور وجود پھول سے بھی ہلکا محسوس ہونے لگا۔

ویرا بے چینی کے ساتھ میری واپسی کا انتظار کررہی تھی۔ اتنے طویل عرصے تک میرے ساتھ رہنے کے بعد وہ بڑی حد تک میری مزاج آشنا ہوچکی تھی۔ واپسی پر میرے چہرے پر کوفت اور غصے کے بجائے بشاشت اور سکون کی علامت دیکھ کر اس نے دور ہی سے تبدیلی کا اندازہ کرلیا اور شوخی کے ساتھ بولی۔ "معلوم ہوتا ہے کہ کوئی خوش خبری سن کر آرہے ہو۔"

ویرا نے ملا سرکار جیسے رسوائے زمانہ آدمی کی تباہ کن سازشوں سے لے کر البرٹو و یلیسا کی تخریب کاریوں تک' جس بھرپور انداز میں ہم لوگوں کا ساتھ دے کر پاکستان کے قومی مفادات کے تحفظ میں حصہ لیا تھا اس کی بنا پر میرے دل میں اس کی بہت زیادہ قدرومنزلت تھی۔ وہ عملی طور پر ایک بین الاقوامی مجرمہ تھی اور اسے اپنی تنظیم کے مفادات کے علاوہ کسی بھی ملک یا قوم کی سلامتی سے کوئی ہمدردی نہیں ہوسکتی تھی لیکن اس نے محض میری دوستی کی خاطر' اپنے قول و فعل سے قدم قدم پر میرا ساتھ دیا تھا لیکن اسی کے ساتھ یہ بھی ایک کھلی حقیقت تھی کہ وہ میرے بارے میں کبھی کبھی حسد و رقابت کی آگ میں سلگنے لگتی تھی اور ایسے مواقع پر اس کا رویّہ بہت زیادہ غیر متوازن ہوجایا کرتا تھا۔ چند ہی گھنٹے پہلے کی بات تھی کہ میری کراچی واپسی کے حوالے سے وہ برہم ہو کر مجھ سے تعلق ختم کرلینے کی دھمکیاں دینے پر اتر آئی تھی۔ یہ اور بات ہے کہ میں نے ہوشیاری کے ساتھ صورتِ حال کو سنبھال لیا تھا۔ لیکن میرے ذہن میں یہ خطرہ ہر وقت ناچتا رہتا تھا کہ اگر کسی بھی وقت میری ویرا سے ٹھن گئی تو وہ اپنی معلومات کے سہارے مجھے تگنی کا ناچ ناچنے پر مجبور کرسکتی تھی۔

اس وقت بھی اگر میں اسے اول خان سے ہونے والی گفتگو کے اصل متن سے آگاہ کردیتا تو وہ ان تعریفوں میں اپنی مدح کا پہلو نکال کر عشوہ طرازیوں کی طرف مائل ہوسکتی تھی کیونکہ اولیانو میری کسی چالاکی کی بنا پر نہیں بلکہ صرف اور صرف ویرا کے نازو انداز کی بنا پر قابو میں آیا تھا۔ میں نے ویرا تک پہنچنے میں چند قدم کا فاصلہ طے کرتے ہوئے اپنے وہ ذہنی جائزے مکمل کرلیے اور ویرا کو معاملے کی پوری گہرائی سے بے خبر رکھنے کا فیصلہ کرتے ہوئے سپاٹ لہجے میں کہا۔ "فی الحال صورتِ حال جوں کی توں ہے۔ خوش خبریاں اتنی آسانی کے ساتھ نہیں ملتیں۔ بس واپسی سے پہلے اس سے الوداعی بات چیت کرکے مجھے ضرور خوشی ہوئی ہے۔"

"بندروں والے کارخانے کے بارے میں تو وہ بہت کچھ بتا سکتا تھا۔" ویرا نے اشتباہ آمیز نظروں سے میری طرف دیکھتے ہوئے سوال کیا۔ اس میں سب سے بڑی خوبی یا خرابی یہی ہو گئی تھی کہ وہ میرے کسی بھی جھوٹ پر متجسس ہو جاتی تھی۔ اس بارے میں اس کی چھٹی حس عموماً اس کا ساتھ دیتی تھی۔

"بندروں والا کارخانہ!" اس کی چبھتی ہوئی نگاہوں سے بچتے ہوئے، میں سر جھٹک کر ہنس دیا۔ "وہاں دوسرے لوگ گئے ہیں۔ ان کی واپسی کے بعد ہی کچھ معلوم ہو سکے گا کہ وہاں کیا کچھ ملا ہے۔"

"اولیانو والے کاغذات پر تو اس نے ضرور کچھ کہا ہو گا؟" وہ بدستور غیر مطمئن تھی۔

"خوش تھا۔" میں نے سپاٹ سا جواب دیا۔ "ہماری طرح وہ بھی پُر امید ہے۔ آج کے چکروں سے فارغ ہونے کے بعد وہ ان پر کام شروع کرے گا۔"

"میرا خیال ہے تم مجھ سے کچھ چھپا رہے ہو۔" آخر کار اس نے ایک گہرا سانس لیتے ہوئے کھل کر اپنے شبہے کا اظہار کر ڈالا اور میں دل ہی دل میں بھنا کر رہ گیا۔ میرے چہرے کے تاثرات کی بنا پر شاطر ترین افراد بھی کبھی میرے جھوٹ کو نہیں پکڑ پاتے تھے لیکن ویرا کے سامنے نہ جانے میری اداکاری میں کیا خامی رہ جاتی تھی کہ وہ پل بھر میں بات کی تہ تک پہنچنے میں کامیاب ہو جاتی تھی۔

"مجھ پر شبہ ہے تو خود اس سے بات کر لو۔ ابھی پرواز کی روانگی میں کافی وقت باقی ہے۔" میں نے چڑچڑے انداز میں جواب دیا۔ "اب وہ تم سے متعارف ہی نہیں ہوا بلکہ تمہارا گرویدہ بھی ہو گیا ہے۔"

"اگر اس کے دل میں یہ شبہ پیدا ہونے کا امکان نہ ہوتا کہ ہمارے درمیان بداعتمادی پیدا ہو چلی ہے تو میں اسے ضرور فون کرتی۔ بعض اوقات تم میری بات کا جواب اس قدر محتاط انداز میں دیتے ہو کہ مجھے اس پر جھوٹ کا شبہ ہونے لگتا ہے۔ تم ویسے بھی ہر ایک کو اپنی باتوں سے چکر میں ڈال دینے میں ماہر ہو۔"

"اگر یہ میری تعریف ہے تو تمہارا بہت بہت شکریہ۔ میں آئندہ محتاط رہوں گا۔"

ویرا اس وقت مجھ سے الجھنے کے موڈ میں تھی۔ کوئی خاص مسئلہ زیر بحث نہ ہو تو مجھے بھی اس سے چھیڑ چھاڑ میں لطف آتا تھا۔ اس وقت بھی اصل معاملہ خوش اسلوبی کے ساتھ نمٹ چکا تھا اس لیے جب ویرا نے دوسری باتیں شروع کیں تو میں نے اوٹ پٹانگ جوابات دے کر اسے چڑانا شروع کر دیا۔

پرواز کی روانگی کا اعلان ہونے تک ویرا خاصی برہم ہو چکی تھی اور منہ پھلائے ٹیلی ویژن دیکھ رہی تھی۔ مسافروں کی بھیڑ چھٹ جانے کے بعد ہم دونوں آخری بس سے طیارے کی طرف روانہ ہوئے اور ہمارے نشستیں سنبھالنے کے چند منٹ بعد ہی طیارے کے انجن چلا دیئے گئے۔

دوران پرواز بھی ویرا مجھ سے روٹھی رہی اور جہاز میں گونجنے والے انجنوں کے دھیمے شور میں میرا ذہن ان ہی دو معاملات میں الجھا رہا جو کراچی میں میرے منتظر تھے۔

ان میں سرفہرست مسئلہ ان سرحدی یا افغانی قبائلیوں کا تھا جو غزالہ اور سلطان شاہ کا تعاقب کر کے انہیں خوف زدہ کرتے رہے تھے۔ اول خان کے آدمیوں نے انہیں عارضی طور پر دور رکھنے کا بندوبست کر لیا تھا مگر میں جانتا تھا کہ ضدی اور خود سر طبیعتوں والے وہ پُراسرار قبائلی آسانی سے ہار مان کر میدان چھوڑنے والے نہیں تھے۔ ان اطراف کے باشندے اپنے مقصد کو برسوں بھی نہیں بھولتے تھے۔ روز مرّہ کے کاموں کو سرانجام دیتے ہوئے بھی وہ اپنے مقصد کے بارے میں سوچتے رہتے تھے اور پہلا موقع میسر آنے پر گھات لگا کر اپنا مقصد حاصل کر لینے کی شہرت رکھتے تھے۔ یہ اور بات تھی کہ ایسے مقاصد میں انتقامی قتل سب سے اہم ہوتا تھا جب کہ میرے ساتھ ان کی دشمنی کا کوئی سبب تاحال سامنے نہیں آ سکا تھا۔

اسی کے ساتھ ڈون کوانگ فو کے کسی آدمی کی دو پُراسرار فون کالز بھی میرے ذہن پر سوار تھیں۔ ڈون کوانگ فو مشرق بعید کے علاقے میں ٹی کا بہت مضبوط آئی مین تھا جبکہ اس کا بچپن کا دوست اور معزز مہمان، نیشی کاؤ مدر مافیا کا ڈان تھا۔ میں نے ڈون کوانگ فو کی نجی تقریب میں نیشی کاؤ کو جس انداز میں ہلاک کرنے کی منصوبہ بندی کی تھی وہ وقتی طور پر بہت کامیاب رہی تھی اور ہم لوگ بخیر و عافیت مکاؤ سے نکل آنے میں کامیاب رہے تھے لیکن عین آخری لمحات پر ڈون کوانگ فو کی طرف سے میری تلاش کی کوششوں سے یہ خطرہ نظر آ رہا تھا کہ ڈون اپنی چار دیواری میں ہونے والے قتل کو فراموش نہیں کر سکا تھا اور اس کے آدمیوں نے آخر کار ہماری سازش کا سراغ لگا ہی لیا تھا۔ اس کے بعد ڈون کو لامحالہ میری تلاش کی شدید ضرورت محسوس ہو سکتی تھی۔

پُرتکلف ناشتے اور اخبار بینی میں سفر غیر محسوس طریقے پر ختم ہو گیا۔ میں نے پنڈی کے اخبارات کا تفصیلی مطالعہ کر ڈالا لیکن مجھے کہیں بھی کوئی اہم خبر نظر نہیں آ سکی۔ سیٹلائٹ ٹاؤن میں البرٹو و یلیسا کے خلاف ہونے والی خوں ریز کارروائی اور پشاور روڈ پر واقع نمبر فیکٹری پر چھاپے کی خبروں کو غالباً اخبارات سے پوشیدہ رکھا گیا تھا اور شہباز خان کے بارے میں مَیں نے اخباری نامہ نگاروں کو اتنی تاخیر سے مطلع کیا تھا کہ اس تصویری خبر کا اسی صبح کے اخبار میں شائع ہونا ممکن نہیں تھا۔ وہ اگلے دن کے اخبارات ہی میں شامل ہو سکتی تھی۔

ہم دونوں کے پاس ایک مختصر سے دستی تھیلے کے علاوہ کوئی سامان نہیں تھا۔ اس لیے بس سے اترنے کے بعد ہم ائرپورٹ کی عمارت میں رکے بغیر باہر نکلتے چلے گئے۔ وہاں اس پرواز سے آنے والوں کے استقبال کے منتظر لوگوں کے ہجوم میں چند پیشہ ور دلال پیش پیش تھے۔

ان میں سے کئی تیز سرگوشیوں میں کار اور ٹیکسی کے الفاظ ادا کرتے ہوئے ہماری طرف لپکے لیکن ان میں سے ایک توانا آدمی نے دوسروں کو پھٹکار کر بھگا دیا اور خود تیزی کے ساتھ آگے بڑھ کر ویرا کے ہاتھ سے دستی بیگ تقریباً چھین ہی لیا۔ میرے لیے وہ کوئی نیا تماشا نہیں تھا۔ ان دنوں کراچی کے ہوائی اڈّے پر آنے والے ہر ملکی اور غیر ملکی مسافر کو ایسے ڈھیٹ ایجنٹوں کا سامنا کرنا پڑتا تھا۔ وہ لوگ بھاری کرائے اور بخشش کی امید میں غیر ملکیوں پر کچھ ضرورت سے زیادہ ہی مہربان ہوا کرتے تھے۔ غنیمت یہ تھا کہ ویرا سفید فام ہونے کے باوجود، اس توانا شخص کی مداخلت کی وجہ سے متعدد افراد کی یلغار سے محفوظ رہی تھی۔

میں نے غزالہ کو اپنی پرواز کی تفصیلات سے آگاہ نہیں کیا تھا اس لیے وہاں ہمارے لیے کوئی سواری موجود ہونے کا امکان نہیں تھا۔ ہمیں شرف آباد میں اپنے فلیٹ تک پہنچنے کے لیے بہرحال ٹیکسی لینی ہی تھی اس لیے میں نے اس شخص کو آنکھیں دکھانے کے بجائے اسی سے مدد لینے کا فیصلہ کر لیا۔

شرف آباد کا نام اس کے لیے اجنبی ثابت ہوا لیکن بہادر آباد کے ملحقہ علاقے کا حوالہ سنتے ہی اس نے ڈیڑھ سو روپے کرائے کا مطالبہ پیش کر دیا۔

"وہاٹ؟ ڈیڑھ سو؟" ویرا نے ملی جلی انگریزی اور اردو میں حیرت سے کہا۔ "میٹر کے حساب سے وہاں کے مشکل سے پچاس روپے بنیں گے۔ تم زیادہ سے زیادہ ساٹھ لے سکتے ہو۔"

"میم صاحیب، یہاں میٹر نہیں چلتا۔" اس نے ویرا کے قریب ہو کر خوشامدانہ انداز میں کہا۔ "بیس روپے تو ٹریفک والے یہاں ٹیکسی کھڑی کرنے کا بھتّا لیتے ہیں۔ بس تم ایک سو چالیس دے دینا۔" وہ شاید ویرا کی زبان سے اردو سن کر حیران رہ گیا تھا اس لیے اس نے کسی بحث کے بغیر فوراً ہی دس روپے رعایت کا اعلان کر دیا لیکن ویرا کے لیے وہ کمی اطمینان بخش نہیں تھی۔

ان دونوں کا مول تول کرنے کا انداز میرے لیے خاصی دلچسپی کا باعث تھا۔ میں خاموشی کے ساتھ الگ کھڑا وہ تماشا دیکھتا رہا اور آخر کار سو روپے پر بات طے ہو گئی اور وہ ہمارے ساتھ سڑک عبور کرنے لگا۔

اس کی ٹیکسی سڑک کے پار ایک دور افتادہ درخت کے سائے میں کھڑی ہوئی تھی۔ ہم تینوں کو دیکھتے ہی ٹیکسی کا باریش ڈرائیور اپنی نشست سے نیچے اتر آیا۔ اس پر نگاہ پڑتے ہی میرے ذہن کو ایک خفیف سا جھٹکا لگا لیکن میں نے اپنے اس غیر ارادی ردِّعمل پر کوئی دھیان نہیں دیا۔ کراچی کے سیکڑوں ٹیکسی ڈرائیور باریش اور پشتو بولنے والے علاقوں سے تعلق رکھتے تھے۔

ہم دونوں کو عزت و احترام کے ساتھ پچھلی نشست پر بٹھانے کے بعد ہمیں لانے والے نے ڈرائیور کے برابر والی سیٹ پر بیٹھنے کے لیے دروازہ کھولا تو میں چونک پڑا اور میں نے اسے فوراً ہی ٹوک دیا۔ "اے! تم کہاں بیٹھ رہے ہو؟ اس ٹیکسی میں ہمارے علاوہ اور کوئی نہیں جائے گا۔"

"صاحیب! ہم کو نرسری جانا ہے۔" اس نے گردن گھما کر اپنے مخصوص خوشامدانہ لہجے میں کہا۔ "تم ادھر اتار دو تو تمہارا مہربانی ہو گا۔ امارا پیسہ اور ٹیم بچ جائے گا۔"

"بیٹھ جاؤ۔" میرے بولنے سے پہلے ہی ویرا خانم نے اسے اجازت مرحمت فرما دی اور وہیں ہمارے لیے ایک نئی مشکل کی بنیاد پڑ گئی جس سے ہم اس وقت تک بالکل بے خبر تھے۔

ائرپورٹ سے اسٹار گیٹ کی طرف روانہ ہوتے ہوئے ٹیکسی کی رفتار خاصی سست تھی اور ڈرائیور بار بار عقب نما آئینے کا جائزہ لے رہا تھا۔ ان چھوٹی چھوٹی باتوں کی وجہ سے میں بے چینی سی محسوس کر رہا تھا لیکن اس وقت تک اصل خطرے کا موہوم ترین امکان بھی میرے ذہن میں نہیں آ سکا تھا۔

مُدّے ہوٹل سے پہلے ٹیکسی اچانک رکی تو میرے کان کھڑے ہوئے۔ اس وقت ہمارے پیچھے دور دور تک کوئی گاڑی نہیں تھی۔ شاید ڈرائیور نے دانستہ اپنی رفتار اتنی

دھیمی رکھی تھی کہ پیچھے آنے والا ٹریفک گزر جانے کے بعد اسے اپنی بدنیتی دکھانے کے لیے کھلا میدان میسر آسکے۔

ٹیکسی رکتے ہی ڈرائیور پھرتی سے ہماری طرف پلٹا تو اس کے ہاتھ میں ایک ریوالور دبا ہوا تھا جس کی نال ہماری طرف اٹھی ہوئی تھی۔ اسی اثنا میں تنومند شخص نہایت سرعت کے ساتھ اپنی سیٹ سے اتر کر پچھلی سیٹ میں گھس کر میرے اوپر تقریباً سوار ہو گیا تھا کیونکہ اس وقت میں ویرا سے الگ بیٹھا ہوا تھا۔ اس شخص کے ہاتھ میں اعشاریہ تین دو کا بھرا ہوا پستول موجود تھا جس کا سیفٹی کیچ ہٹا ہوا تھا۔

"خبردار! جو ذرا بھی آواز نکالی تو ہم گولی مار دے گا۔" میرے اوپر سوار ہونے والا، اپنی سمت کا دروازہ بند کرتے ہوئے غرایا اور ٹیکسی ایک جھٹکے کے ساتھ حرکت میں آگئی۔ اس بار اس کی رفتار خاصی تیز تھی۔

ہمارے ساتھ وہ سب اس قدر سُرعت کے ساتھ پیش آیا کہ میری سوچنے سمجھنے کی صلاحیتیں ہی مفقود ہو کر رہ گئیں۔ ٹیکسی کے دوبارہ حرکت میں آنے پر میرے اوسان قدرے بحال ہوتے تو مجھے اندازہ ہوا کہ اپنی چھٹی حِس کی للکار کو نظرانداز کرکے میں ایک سنگین صورتِ حال سے دوچار ہو چکا تھا۔

وہ دونوں آتشیں ہتھیاروں سے مسلح تھے۔ انہوں نے ہمیں دن دہاڑے ایک مصروف مقام سے اغوا کرنے کی کوشش کی تھی اس لیے ان سے یہ توقع باندھنی عبث تھی کہ ہماری کسی بھی مزاحمت پر وہ گولی چلانے کے بجائے بوکھلاہٹ کا شکار ہو جائیں گے اور ہمیں گلوخلاصی کا موقع مل جائے گا۔

"یہ کیا بدتمیزی ہے؟ تم دونوں کون ہو اور ہم سے کیا چاہتے ہو؟" مجھ سے پہلے ویرا نے تیز لہجے میں ان دونوں کو مخاطب کرتے ہوئے پوچھا۔ "ہماری جیبوں سے تمہیں چند سو روپوں کے علاوہ اور کچھ نہیں مل سکے گا۔"

"خوچہ میم صاحیب! ابی تم آرام سے بیٹھو۔ ہم اپنے ڈیرے پر لے جاکر تم لوگوں کو مٹھائی کا لڈو کھلائے گا۔ گڑبڑ کیا تو تمہارا سر پھاڑ کر ہم لوگ تمہیں بے ہوش کر دے گا۔" ڈرائیور نے تلخ لہجے میں ویرا سے کہا پھر پشتو میں اپنے ساتھی سے مخاطب ہو گیا۔ میں نے غیرارادی طور پر ویرا کی طرف دیکھا کیونکہ میری معلومات کے مطابق وہ تھوڑی بہت پشتو بول اور سمجھ سکتی تھی لیکن ان دونوں کے مذاکرات پر وہ خاموش رہی اور آنکھوں ہی آنکھوں میں اس نے مجھے بھی خاموش رہنے کا اشارہ کیا تاکہ وہ ان کی گفتگو سے ان کے عزائم کا اندازہ لگا سکے۔

دو چار فقروں کے تبادلے کے بعد وہ دونوں خاموش ہو گئے۔ وہ دونوں ہی اپنی اپنی جگہ اس قدر مستعد اور چوکنے تھے کہ ان سے ٹکر مول لے کر محفوظ رہنے کا کوئی امکان نظر نہیں آرہا تھا۔

اس وقت تک مجھے یہ اندازہ ہو چکا تھا کہ وہ دونوں ان ہی لوگوں میں سے تھے جو کراچی میں میری تلاش میں سرگرداں تھے اور غزالہ وغیرہ کو خوف زدہ کرتے رہتے تھے۔ لیکن مجھے حیرت اس امر پر تھی کہ انہوں نے ہماری کراچی آمد کے بارے میں کیسے اندازہ لگایا اور کیسے پہچانا جبکہ میرے لیے وہ دونوں اجنبی تھے۔

ڈرگ روڈ اسٹیشن پر پہنچ کر ان لوگوں نے شاہراہ فیصل چھوڑ کر ٹیکسی داہنی طرف موڑ لی اور چند کلو میٹر بعد آنے والے، ڈرائیوان کے چوراہے سے راشد منہاس روڈ کی طرف ہو لیے جو اس وقت بہت زیادہ مصروف نہیں تھی۔

"تم لوگ ہمارے ساتھ من مانی کر رہے ہو لیکن ہمیں اتنا جاننے کا حق ضرور حاصل ہے کہ ہمارا کیا قصور ہے یا تم ہم سے کیا چاہتے ہو؟" اس پُرسکون سڑک پر آنے کے بعد میں نے ایک مرتبہ پھر انہیں چھیڑنے کی کوشش کی۔

"یہ سب تمہیں تنگارا دیلی جانے کے بعد معلوم پڑے گا جہاں سردار پائندہ گل تمہارا انتظار کر رہا ہے۔" میرے برابر میں بیٹھے ہوئے شخص کے تنفر آمیز جملوں نے مجھے یک بیک پریشان کر دیا۔

آخرکار قصہ وہی نکلا تھا جو ابتدا سے میرے ذہن میں سر ابھار رہا تھا۔ وہ لوگ مقامی مافیا کے سلسلے میں میرے پیچھے لگے ہوئے تھے کیونکہ سیٹھ حبیب جیوانی کی مقامی مافیا کو اعلیٰ درجے کی ہیروئن فراہم کرنے والوں میں افغانی سردار پائندہ گل کا نام بہت نمایاں تھا۔ وہ پشاور سے شمال میں دیر سے ملحق تنگارا ویلی کے سنگلاخ اور دشوار گزار افغان پہاڑی علاقے میں بڑے پیمانے پر پوست کی کاشت کرکے ہیروئن تیار کرتا تھا۔ ان علاقوں میں سردار پائندہ گل کا نام قوت و جبروت کی ایک ممتاز ترین علامت کی حیثیت رکھتا تھا۔ اس کے بارے میں مشہور تھا کہ اس نے افغانستان میں محوِ سفر ایک روسی فوجی قافلے کی دس گاڑیاں تباہ کرکے بانوے روسی فوجیوں کو زندہ گرفتار کیا پھر ان سب کو اپنے فائرنگ اسکواڈ سے چھلنی کرا کے انہیں اپنی زمین میں دفن کرا دیا اور ان قبروں پر افیم کی فصل اگا دی۔ اس کے اس کارنامے میں مومن خان آفریدی نامی ایک اور افغان مَلک اس کا شریکِ کار بتایا جاتا تھا۔

میرے لیے وہ صورتِ حال بہت نازک اور روح فرسا تھی۔ ٹریڈ لائن کے دفاتر کی ہولناک تباہی رونما ہونے کے بعد ویرا نے خاص طور پر مجھ سے اس بارے میں استفسار کیا تھا لیکن میں نے کبھی بھی اسے اپنے اور مافیا کے مراسم کی ہوا نہیں لگنے دی تھی۔ اب ان دونوں نے ویرا کو بھی میرے ساتھ ہی پکڑ لیا تھا۔ اگر اس کی موجودگی میں سردار پائندہ گل یا اس کے آدمیوں سے کسی قسم کے مذاکرات کی نوبت آتی تو اس میں میرے اور مقامی مافیا کے گہرے تعلقات کا ذکر نا گزیر ہوتا۔ اس انکشاف پر ویرا کا جو بھی ردِعمل ہوتا اس کا اندازہ لگانے کے لیے کسی خاص ذہانت کی ضرورت نہیں تھی۔

"تم کہاں کھو گئے؟" ویرا نے مجھے خاموش پا کر ٹوکا۔ "یہ سردار پائندہ گل کون ہے؟ اس نام سے تو میرے کان بھی کچھ آشنا معلوم ہوتے ہیں۔ اس کی اور تمہاری دشمنی کہاں سے نکل آئی؟"

"میں بھی یہی سب سوچ رہا ہوں۔" میں نے کمزور لہجے میں کہا۔ "اگر میں غلطی نہیں کر رہا تو سردار پائندہ گل خالص اور بہترین ہیروئن کا بہت بڑا بیوپاری ہے لیکن مجھ سے اس کا کیا واسطہ ہو سکتا ہے؟ معلوم ہوتا ہے کہ ان لوگوں کو میرے بارے میں کوئی بہت بڑی غلط فہمی ہوئی ہے۔" میں واقعی گہری تشویش میں مبتلا ہو گیا تھا۔

"اوئے ڈینی صاحیب!" میرے برابر والے نے میرا نام لے کر مجھے بدترین ذہنی جھٹکا پہنچایا اور کہا۔ "ابی تم اپنا تقریر ختم کرو۔ تمہارا آدمی لوگ نے ہمیں تمہارے ڈیرے سے بھگا دیا لیکن ہم لوگ پھر بھی تم تک آگیا۔ ابی کوئی تمہارا مدد نہیں کر سکتا۔ تمہارا فیصلہ ہمارا سردار پائندہ گل ہی کرے گا۔ وہ ہم لوگ کو ادھر چھوڑ کر کل ہی ملک واپس گیا ہے۔ اب تم کو بھی ادھر ہی لے جانا پڑے گا۔"

تشویش اور پریشانیوں کے ان بدترین لمحات میں مجھے اس بات کی خوشی تھی کہ بظاہر غیر تعلیم یافتہ اور نیم مہذب نظر آنے والے افغانیوں نے ویرا کے ساتھ کسی بھی قسم کی کوئی بدتمیزی نہیں کی تھی۔

"تمہارے سردار کا جھگڑا اگر مجھ سے ہے تو اس بے چاری کا کیا قصور ہے؟ میں تمہارے ساتھ چلنے کے لیے تیار ہوں۔ تم اسے تو رہا کر دو۔" میں نے ویرا کے ساتھ ان کی نرمی سے فائدہ اٹھانے کی نیت سے کہا۔ اگر وہ کسی بھی چکر میں آکر ویرا کو آزاد کر دیتے تو میں تنہائی میں بے فکر ہو کر ان سے بات چیت کر سکتا تھا۔

"ہم نے تم کو پکڑا ہے۔ تمہارے ساتھ جو بھی ہوتا وہ بھی ہمارا قیدی بن جاتا۔ ابی ہم میم صاحیب کو نہیں چھوڑے گا۔ ہم لوگ عورت پر بلاوجہ ہاتھ نہیں اٹھاتا۔ یہ شرارت کرے گی تو ہم تم کو مارے گا۔ زیادہ بدمعاشی کرے گی تو بس اسے بے ہوش کر کے باندھ دے گا۔ ویسے میم صاحیب بہت ماشوق ہے۔ ہمارا سردار اسے تم سے خرید کر اپنا بی بی بھی بنا سکتا ہے۔" اس نے معشوق کا لفظ زورِ بیان میں استعمال کیا تھا اس میں ہتک کا کوئی شائبہ نہیں تھا۔

"لعنت ہو تمہارے سردار پر، میں اس کے منہ پر تھوکوں گی بھی نہیں۔" ویرا ایک دم بپھر گئی۔

"اوئے خدائی خوار!" میرے برابر والا غراتا ہوا حرکت میں آیا اور میرے کچھ سمجھنے سے پہلے ہی اس نے ویرا کی کنپٹی پر ایسا زوردار مکا رسید کیا کہ وہ کراہتی ہوئی میرے شانے پر ڈھیر ہو گئی۔ وہ شخص اپنے بے خبر حریف کو ایک ہی ضرب میں بے ہوش کر دینے میں خاصی مہارت رکھتا تھا۔

"یہ تم نے بہت برا کیا۔ تمہیں تو عورتوں کا بہت احترام کرنے کا دعویٰ تھا۔" میں نے بے ہوش ویرا کے سر کو سہارا دیتے ہوئے متاسفانہ لہجے میں کہا۔ "اور ایک منٹ بعد ہی اس پر ہاتھ اٹھا بیٹھے۔"

"ابی تم بھی اپنا زبان بند کرو۔" وہ غرایا۔ "سردار کے خلاف ہم ایک لفظ نہیں سنے گا۔"

"میں تمہارے سردار کی بہت عزت کرتا ہوں۔ ایک بار اس سے بات بھی کر چکا ہوں۔ مجھے اتنا تو بتا دو کہ اسے مجھ سے کیا شکایت پیدا ہو گئی ہے؟" ویرا کے بے ہوش ہو جانے کے بعد میں نے کھل کر، نرم اور مصالحانہ لہجے میں بات شروع کر دی۔ "ہو سکتا ہے کہ بات بڑھائے بغیر مسئلہ حل ہو جائے۔"

"ہم حکم کا غلام ہے۔ ہمیں تم کو اٹھانے کا حکم ملا، ہم نے اٹھا لیا۔" وہ سادگی سے بولا۔ "اندر کا چکر ہم کو نہیں معلوم۔ سنا ہے کہ تم پر سردار کے مال کا بائیس لاکھ روپیہ باقی ہے۔ ہم کچھ نہیں جانتا۔"

"بائیس لاکھ روپیہ؟" میں نے حیرت سے دُہرایا۔ "میں نے تو کبھی سردار سے ایک پیسے کا لین دین بھی نہیں کیا۔"

"وہ تمہاری کمپنی کو مال دیتا تھا۔ کمپنی غرق ہو گیا۔ ابی سردار اپنا پیسہ تم سے لے گا۔ ورنہ اسے اس کا مال واپس کرو۔" وہ اپنی بے خبری ظاہر کرنے کے باوجود بہت باخبر تھا۔ چھوٹے گروہوں میں ہر شخص ہر بات سے باخبر ہوتا ہے یہ اور بات ہے کہ نیچے والے مصلحتاً بے خبر بنے رہتے ہیں۔

بات رفتہ رفتہ میری سمجھ میں آنے لگی تھی۔ سردار پائندہ گل نے شاید مافیا کے حساب میں ٹریڈ لائن کو بائیس لاکھ کی ہیروئن فراہم کی ہوئی تھی جس کی رقم واجب الادا تھی اور اخبارات میں ٹرین لائن پر چھاپے اور گرفتاریوں کی خبریں شائع ہونے کے بعد سردار پائندہ گل کو اپنی خطیر رقم ڈوبتی ہوئی نظر آنے لگی تو وہ کراچی دوڑا چلا آیا۔ شاید اسے کسی طرح پتا چل گیا تھا کہ مافیا کے سرکردہ لوگوں میں سے صرف میں زندہ اور آزاد تھا اس لیے اس نے اپنے آدمیوں کو میری تلاش میں لگا دیا تاکہ مجھ سے اپنی رقم کا مطالبہ کرسکے۔ یہ اتفاق تھا کہ میں ان ہی دنوں کراچی سے باہر تھا اس لیے غزالہ اور سلطان شاہ کو خوف و ہراس کا سامنا کرنا پڑا۔ میں اصل پس منظر سے ناواقف تھا اس لیے اول خان کے عملے کی مدد سے سردار پائندہ گل کے آدمیوں کو بھگانے کا بندوبست کرلیا۔ وہ ان واقعات سے ایک ہی نتیجہ اخذ کرسکتا تھا اور وہ یہ کہ مال یا رقم کے بارے میں میری نیت خراب ہو گئی تھی۔ ٹریڈ لائن کی تباہی کی آڑ لے کر میں نے روپوشی اختیار کرلی تھی اور اپنے آدمیوں کے ذریعے سردار پائندہ گل کے ہرکاروں کو اپنے گھر سے دور رکھنے اور آخر کار میدان سے بھگانے پر تُل گیا تھا۔

وہ نتائج اخذ کرنے کے بعد اگر سردار پائندہ گل محاذ آرائی پر تُل گیا تھا تو اسے بہت زیادہ قصوروار نہیں ٹھہرایا جاسکتا تھا۔ اگر درمیان میں بائیس لاکھ روپے جیسی خطیر رقم کی وصولی کا معاملہ نہ ہوتا تو اس جیسا غصہ ور آدمی میرے قتل کا حکم بھی جاری کرسکتا تھا۔

میرے لیے وہ مقدر کی عجیب ستم ظریفی تھی کہ ایک طرف اول خان جیسا محبِ وطن اور فرض شناس افسر مجھے قومی ہیرو کا درجہ دیئے چلا جارہا تھا اور دوسری طرف ایک طاقت ور افغان ہیروئن فروش مجھے بے ایمان اور نادہندہ سمجھ کر میری آزادی کا دشمن ہوچکا تھا۔

"اس عورت کا میری کمپنی یا ہیروئن کے دھندے سے کوئی تعلق نہیں ہے۔" میں نے اسے سمجھانے کے لیے ایک نئے پہلو سے بات چھیڑی۔ "یہ میری دوست ہے اور مجھے عزت دار آدمی سمجھتی ہے۔ اس کے سامنے میں ہیروئن کا نام بھی نہیں لے سکتا۔ اسے آزاد کردو۔ میں سردار پائندہ گل سے اپنے معاملات خود طے کرلوں گا۔"

اس نے اپنے پہاڑ جیسے سر کو ہلاتے ہوئے کہا۔ "ناممکن' یہ بھاگ جاتا تو اور بات تھی۔ اب اسے چھوڑنا ہمارا بس سے باہر ہے۔ یہ اچھا بات ہے کہ وہ تم کو عزت دار سمجھتی ہے۔ ابی تم نے سردار بابا کی بات نہ مانی تو وہ اس عورت کو پوری بات بتا کر تم کو بے عزت کردے گا۔"

"لیکن تم اپنے بڑوں کو یہ ضرور سمجھا سکتے ہو کہ آخری نتیجہ نکلنے تک وہ مجھ سے اکیلے میں بات کریں۔ ایک بار اس عورت کے سامنے بات کھل گئی تو پھر مجھے کسی بات کی پروا نہیں ہوگی۔"

"یہ ہم کرے گا۔" اس نے تفہیمی انداز میں کہا۔ اس وقت تک ٹیکسی سہراب گوٹھ کے چوراہے سے سپرہائی وے پر داہنی طرف گھوم چکی تھی۔ مجھے لمحہ بھر کے لیے خیال آیا کہ کہیں وہ لوگ مجھے اسی ٹیکسی سے پشاور' دیر یا کسی اور سرحدی علاقے تک لے جانے کا ارادہ نہ رکھتے ہوں لیکن میں نے اس بارے میں اپنی زبان نہیں کھولی۔ ان کی ایسی حماقت کی صورت میں ہمیں راستے میں پڑنے والی کسی بھی چیک پوسٹ پر ان کے بے رحمانہ چنگل سے نجات مل سکتی تھی۔

وہ میری خام خیالی تھی کہ میں ان قبائلی غنڈوں کو عقل سے محروم سمجھ رہا تھا۔ سہراب گوٹھ اور پھر گلشن معمار والے موڑ سے کافی آگے نکلنے کے بعد ٹیکسی داہنی طرف والے کچے میں اتر گئی۔ اس طرف سنگلاخ زمین پر گاڑیوں کے ٹائروں کے متعدد نشانات نے ایک بے ترتیب سے راستے کی صورت اختیار کی ہوئی تھی۔ ٹیکسی اپنے پیچھے دھول کے مرغولے اڑاتی' اسی راستے پر آگے بڑھتی رہی۔

کافی اندر جانے کے بعد ہمیں مخالف سمت سے نئے ماڈل کی ایک پک اپ آتی ہوئی نظر آئی۔ قریب آنے پر اس کے کیبن میں بڑی بڑی پگڑیوں والے دو دیو ہیکل افغان نظر آئے۔ دونوں گاڑیوں کے ڈرائیوروں نے شناسائی کے اظہار میں ایک دوسرے کی طرف ہاتھ لہرائے' دونوں گاڑیاں زن کی آواز کے ساتھ ایک دوسرے کے قریب سے گزریں اور چند لمحوں کے لیے ہماری ٹیکسی غبار کے بادل میں چھپ گئی۔

میں نے سرجانی ٹاؤن اور سپرہائی وے کے مضافات میں افغان خیمہ بستیوں کے بارے میں بہت کچھ سنا ہوا تھا۔ چمکتی ہوئی فور وہیل پک اپ دیکھنے کے بعد مجھے اندازہ ہو گیا کہ کوئی افغان خیمہ بستی ہی ہماری منزل تھی لیکن یہ بات حیران کن تھی کہ وہ لوگ افشائے راز کے کسی خوف کے بغیر دو افراد کو اغوا کرکے دن دہاڑے افغان مہاجرین کی آبادی میں لے جارہے تھے' جیسے وہاں صرف ان ہی کا راج چلتا ہو اور چند میل کے فاصلے پر واقع' کراچی کی انتظامیہ سے ان کا کوئی تعلق نہ ہو۔

چند منٹ کے بعد ساٹھ ستر چھوٹے بڑے خیموں پر مشتمل' دور تک بکھری ہوئی وہ آبادی ہمارے سامنے آگئی۔ وہاں عورتیں اپنے کام کاج میں مصروف اور بچے تپتی ہوئی دھوپ میں کچی زمین پر کھیلنے میں مصروف نظر آئے۔ ان ہی خیموں کے درمیان پرانے ماڈلوں کی کئی پک اپس بھی کھڑی نظر آئیں۔ خیموں اور وہاں بسنے والوں کی حالتِ زار سے ان کی بے سروسامانی اور عسرت کے علاوہ ان کی سخت جانی کا بھی اظہار ہورہا تھا لیکن گاڑیوں کی موجودگی ان میں سے بعض کے تموّل کا اظہار کررہی تھی۔

ہماری ٹیکسی بستی میں داخل ہونے کے بجائے ایک چکر کاٹ کر بستی کے عقب میں پہنچی جہاں چالیس فٹ کا ایک ٹریلر مع بند کنٹینر اور پانی کا ایک ٹینکر کھڑا نظر آیا۔ ان دونوں کے ساتھ انہیں کھینچنے والی گاڑیاں نہیں تھیں۔ شاید آبادی کی ضروریات پوری کرنے کے لیے ان سے ذخائر کا کام لیا جاتا تھا۔

کنٹینر کے سائے میں ایک سرخ و سفید نوجوان بوسیدہ سی کرسی پر ایک رجسٹر لیے بیٹھا تھا مگر رجسٹر کو بھول کر ٹیکسی کی طرف دیکھ رہا تھا۔ ٹیکسی اسی کے قریب جارکی۔ وہ نوجوان اپنے لوگوں کو پہچان کر کرسی سے اٹھ کھڑا ہوا۔ ٹیکسی ڈرائیو نے نیچے اتر کر تپاک سے اس کے ساتھ ہاتھ ملایا پھر اُن دونوں نے پشتو میں تیزی سے باتیں کرنی شروع کردیں۔ اس دوران میں نوجوان بار بار ٹیکسی کی طرف دیکھتا جارہا تھا۔

میرے برابر والے نے مجھے اپنے ساتھ نیچے اترنے کا اشارہ کیا۔ جب اس نے بھی نوجوان سے ہاتھ ملایا تو میں نے محض اخلاقاً اس کی طرف ہاتھ بڑھایا لیکن اس نے ترش روئی کے ساتھ مجھ سے ہاتھ ملانے سے انکار کردیا۔ "ہم لوگ اپنے قیدیوں اور دشمنوں سے ہاتھ نہیں ملاتے۔ یہ ہماری روایت ہے۔"

اس کی اردو بہت صاف اور شائستہ تھی۔ اپنے طور طریقوں سے وہ تعلیم یافتہ معلوم ہورہا تھا۔

مجھے وہیں چھوڑ کر ان تینوں نے ٹیکسی میں بے ہوش پڑی ہوئی دیبا کا جائزہ لیا اور ایک مرتبہ پھر آپس میں کسی بات پر بحث کرنے لگے۔ وہ نوجوان عمر میں ان سے کم ہونے کے باوجود ان پر حاوی نظر آرہا تھا جیسے وہ اسی کو جواب دہ رہے ہوں۔

آخر کار اُن کی بحث کا خاتمہ ہوا اور نوجوان میری طرف متوجہ ہوگیا۔ چند ثانیوں تک وہ نیم وا آنکھوں سے میری طرف دیکھتا رہا پھر خشک لہجے میں پوچھا۔ "تمہارا نام ڈیبی ہے؟" میں نے اثبات میں سر ہلادیا۔

"تم سردار بابا کا بائیس لاکھ کا دعویٰ مانتے ہو؟" اس نے اسی لہجے میں اگلا سوال کیا۔

"سردار پائندہ گل سے بات کیے بغیر میں اس بارے میں کچھ نہیں کہہ سکتا۔ ویسے وہ کہتا ہے تو سچ ہی کہتا ہوگا۔ میں اسے بس اتنا بتانا چاہتا ہوں کہ میں کمپنی کا مالک نہیں ملازم تھا۔ مجھے تو یہ بھی معلوم نہیں کہ سردار نے مال کسے اور کب دیا تھا؟"

"مجھ سے بات کرو۔ میں اس کا بھانجا' عبدالرحیم خان ہوں۔ میں تم کو بتاتا ہوں کہ مال سات دن پہلے ٹریڈ لائن کے دفتر میں شیر شاہ خان کو دیا گیا تھا۔ اندھیرے میں بیٹھنے والے نقاب پوش نے مجھے اپنے کمرے میں بلا کر وعدہ کیا تھا کہ چار دن میں رقم ادا کردی جائے گی۔ پھر چار دن پورے ہونے سے پہلے ہی سب ختم ہوگیا۔ ہم لوگوں نے بہت مشکل سے پتا لگایا ہے کہ صرف تم باہر ہو۔ ہم اپنی رقم چاہتے ہیں۔"

وہ پوری طرح باخبر اور بااختیار معلوم ہوتا تھا۔ میں نے نرمی سے کہا۔ "تم جانتے ہو کہ میں شہر سے باہر تھا۔ تھوڑی ہی دیر پہلے واپس آیا ہوں۔ مجھے وقت ملنا چاہیے تاکہ میں پوری صورتِ حال کا اندازہ لگا سکوں۔ اس کے بعد ہی میں تم سے کوئی فیصلہ کرسکوں گا۔"

"تمہارے آدمیوں نے میرے آدمیوں کا مقابلہ کیوں کیا تھا؟" اچانک اس کے تیور جارحانہ ہوگئے۔

"انہوں نے کسی کا خون نہیں بہایا۔ صرف اپنا دفاع کیا تھا۔ انہیں معلوم ہی نہیں تھا کہ وہ لوگ کیوں انہیں ہراساں کررہے ہیں۔ ہر ایک کو اپنی حفاظت کرنے کا پورا پورا حق حاصل ہے۔ اگر وہ سردار پائندہ گل کے نام پر ان کے پاس گئے ہوتے اور ان کی بے عزتی کی جاتی تب تمہاری شکایت بجا تھی۔ کاروباری جھگڑے طاقت کے بل پر کبھی طے نہیں ہوتے۔ تم جانتے ہو کہ یہ کچا کاروبار ہے۔ مال پار نکل جائے تو سب کے وارے نیارے ہوجاتے ہیں اور کھیپ پکڑی جائے تو سب کچھ ختم ہوجاتا ہے۔ ایسے جھگڑے مل بیٹھ کر طے ہوتے ہیں۔"

ہمیں لانے والے بہت غور سے اس گفتگو کا ایک ایک لفظ سن رہے تھے اور بالکل خاموش تھے لیکن میری بات مکمل ہوتے ہی وہ دونوں بیک وقت بول پڑے۔ وہ پشتو میں اس نوجوان کو کوئی بات سمجھانے کی کوشش کررہے تھے۔ اُن میں ایک مرتبہ پھر بحث شروع ہوچکی تھی۔

میں نے اپنی مضبوطی ظاہر کرنے کے لیے لاتعلقانہ

انداز میں پیکٹ نکال کر سگریٹ سلگالی۔

"اور تم چاہتے ہو کہ اس عورت کو آزاد کردیا جائے؟" کچھ دیر کی باہمی بحث و تمحیص کے بعد وہ نوجوان ایک مرتبہ پھر مجھ سے مخاطب ہوگیا۔

"اس عورت کی آزادی تو بہت ضروری ہے کیونکہ اس کا ہمارے کاروبار سے دور کا بھی واسطہ نہیں ہے۔ اسے پتا چل گیا کہ ہم ہیروئن کا لین دین کرتے ہیں تو یہ جھگڑا نمٹنے کے بعد بھی پولیس میں مخبری کرسکتی ہے۔ اسے الگ ہی رکھو تو بہتر ہوگا۔ اس کے لیے..."

اس نے ہاتھ اٹھا کر میری قطع کلامی کرتے ہوئے کہا۔ "پھر اسے اسی وقت واپس جانا چاہیے۔ ابھی وہ بے ہوش ہے اور اسے کچھ معلوم نہیں ہے کہ اسے کہاں لایا گیا ہے۔ اس سے پہلے کہ وہ ہوش میں آئے‘ اسے شہر کے کسی حصے میں ڈلوا دینا چاہیے۔ اسے روانہ کرنے کے بعد ہم بات کرتے ہیں۔"

وہ میری پہلی کامیابی تھی۔ میں ان لوگوں کی کھوپڑیوں پر جمی برف پگھلانے میں کامیاب ہوگیا تھا۔

نوجوان کے استفسار پر تنومند شخص نے اسے بتایا کہ اس کی لگائی ہوئی ضرب کے نتیجے میں ویرا مزید ڈیڑھ دو گھنٹوں سے پہلے ہوش میں نہیں آسکے گی۔ پھر بھی اس نے ویرا کی آنکھوں کے پپوٹے اٹھا کر چند ثانیوں تک جائزہ لیا اور پھر ویرا کو ڈرائیور کے ساتھ روانہ کردیا۔

اس مرحلے پر میں سخت شش و پنج میں مبتلا ہو کر رہ گیا تھا کیونکہ اپنے ساتھ موجود‘ دو چست و چالاک اور مسلح افغانوں کے مقابلے میں‘ میں بالکل نہتا تھا۔ میری بیم گن ویرا کے پرس میں تھی۔ ان لوگوں نے اس وقت تک ویرا کی کسی چیز کو نہیں چھوا تھا۔ اگر میں اس کی روانگی سے پہلے اس کے پرس کو ہاتھ لگاتا تو وہ تینوں متجسس ہوجاتے اور میں ہمیشہ کے لیے بیم گن سے محروم ہوسکتا تھا۔

میں اپنے دل پر جبر کرکے اپنی جگہ پر کھڑا رہا اور باریش ڈرائیور‘ بے ہوش ویرا سمیت وہاں سے واپس شہر کی طرف روانہ ہوگیا۔

نوجوان کی کسی ہدایت پر تنومند افغان کنٹینر کی طرف گیا اور اس کا دروازہ کھول کر اندر سے ایک چارپائی لے آیا جسے کرسی کے قریب ہی سایہ دار جگہ میں ڈال دیا گیا۔ نوجوان نے اپنی بوسیدہ سی کرسی سنبھالنے کے بعد ہم دونوں کو چارپائی پر بیٹھنے کے لیے کہا پھر بولا۔ "اب بتاؤ کہ ہماری رقم کی واپسی کے لیے تمہارے ذہن میں کیا بات آتی ہے؟ ہم صرف اپنی رقم چاہتے ہیں۔ اگلے سودے اب خود بخود ختم ہوگئے ہیں۔ ویسے بھی اب سفید مال کی مارکیٹ میں بہت تیزی آگئی ہے۔ اندھیرے میں بیٹھنے والا نقاب پوش زندہ رہتا تو اسے بھی ریٹ بڑھانے پڑتے۔"

"تمہیں کیسے معلوم ہوا کہ وہ مرچکا ہے؟" میں نے چونک کر سوال کیا۔

"اخباروں میں سب کچھ چھپ چکا ہے۔ اس کا نام حبیب جیوانی تھا۔" وہ فخر آمیز بے پروائی کے ساتھ بولا۔ "تم نے میری بات کا جواب نہیں دیا۔"

"میں یہاں رہ کر کچھ بھی نہیں کہہ سکتا۔" میں نے بے بسی سے کہا۔ "مجھے دو تین دن کی مہلت چاہیے۔"

"اس کی تو بات ہی نہ کرو۔" وہ ہتھے سے اکھڑ گیا۔ "تمہارے لیے سردار بابا کا سخت حکم ہے۔ اس کی اجازت کے بغیر میں کوئی فیصلہ نہیں کرسکتا۔ عورت کو صرف اس لیے آزاد کردیا کہ وہ ہماری لائن کی نہیں تھی۔ اسے روکنے سے خطرہ پیدا ہوسکتا تھا۔ سردار بابا کہتا ہے کہ تم اپنی کمپنی میں نمبر دو تھے۔ تمہارے پاس بھی بہت مال ہوگا۔"

"میں کمپنی سے کماتا اور اڑا دیتا تھا۔ اس کی بربادی کے بعد تو مجھے اپنے گزارے کے لیے کوئی کام ڈھونڈنا پڑے گا۔ میرا کوئی مال یا اثاثہ نہیں ہے۔ رہنے کا مکان تک کرائے پر لیا ہوا ہے۔"

"سچ کہہ رہے ہو تو فکر نہ کرو۔" وہ زہرخند کے ساتھ بولا۔ "سردار بابا تمہیں اور تمہاری عورت کو اپنی زمینوں پر بلالے گا۔ وہاں دن بھر کی بیگار کے بدلے میں دو وقت کی روٹی اور سونے کے لیے کمبل چارپائی مل جاتی ہے۔ سردار بابا کا مال کھانے یا اس کی نافرمانی کرنے والے عمر بھر ان ہی پہاڑوں میں سڑتے رہتے ہیں جہاں جانے کے سیکڑوں راستے ہیں لیکن باہر نکلنے کا کوئی راستہ نہیں ہے۔"

"تم میری مجبوری کو سمجھنے کے بجائے مجھے خوفزدہ کر رہے ہو۔ میرے ذہن میں جو منصوبہ ہے وہ کامیاب ہوگیا تو کچھ رقم خرچ کرکے تمہارا مال تم کو واپس مل سکتا ہے۔" میں نے خوف زدگی کا مظاہرہ کرتے ہوئے کہا۔

"وہ بھی بتا دو۔ شاید تمہاری بات چھوٹے خان کی سمجھ میں آجائے۔" تنومند آدمی نے لقمہ دیا۔

"میں نیچے کے کسی آدمی کو رشوت دے کر وہ مال نکالنے کی کوشش کروں گا ورنہ بائیس لاکھ روپے تو میں مر کر بھی پیدا نہیں کرسکتا۔ اس کے لیے مجھے آزادی کی ضرورت ہے۔"

"نہیں" عبدالرحیم خان یا چھوٹے خان نے سختی سے کہا۔

"اگر تمہاری یہی ضد ہے تو میں تمہارے ساتھ اپنا وقت برباد نہیں کرسکتا۔ تمہارے بارے میں آخری فیصلہ سردار پائندہ گل ہی کرے گا۔"

"یہ میری ضد نہیں‘ اس معاملے کو حل کرنے کا اکلوتا راستہ ہے۔" میں نے ایک ایک لفظ پر زور دے کر کہا۔

"کچے سودے ادھار نہیں نقد پر کیے جاتے ہیں۔ تم نے کمپنی کی ساکھ دیکھ کر ادھار سودا کیا تھا۔ اب کمپنی ڈوب گئی تو اس کی ساکھ اور تمہاری رقم بھی ڈوب گئی۔ میں مال واپس دلوانے کی ذمے داری صرف اس لیے لے رہا ہوں کہ سردار پائندہ گل کا نام بہت بڑا ہے۔ میں اس کی بہت عزت کرتا ہوں۔"

چھوٹے خان کا چہرہ غصے سے مزید سرخ ہوگیا اور اس کی آنکھوں میں خون اتر آیا۔ "رقم ڈوبنے کا اب نام لیا تو میں ابھی تمہاری گردن توڑ دوں گا۔ وہ حرام کا مال نہیں تھا۔ ہم لوگ دن رات اپنی زمینوں اور لیبارٹری میں خون پسینہ ایک کرکے ہیروئن بناتے ہیں اور اس کے حساب میں ایک ایک پیسہ وصول کرنا جانتے ہیں۔"

"میرا ارادہ تمہیں ناراض کرنے کا نہیں تھا۔" میں نے جلدی سے اپنی صفائی پیش کی۔ "تم میری گردن توڑ سکتے ہو۔ مجھ سے عمر بھر بیگار لے سکتے ہو لیکن اس طرح تم اپنا خسارہ پورا نہیں کرسکتے۔ تم مجھے شنگارا ویلی ہی بھیج دو۔ شاید تمہارے سردار کو میں اپنی بات سمجھا سکوں۔"

"اب یہی کرنا پڑے گا۔" وہ دانت پیس کر غرایا۔ "چارپائی سے اٹھ جاؤ!"

وہ طاقت اور اختیار کے گھمنڈ میں مبتلا تھا اور میں اپنے تجربے کی مار سے ہی اس کا کوئی تدارک کرسکتا تھا۔ میں نے کسی سہمے ہوئے قیدی کی طرح فوراً چارپائی چھوڑ دی۔ اس نے آگے بڑھ کر‘ میرے بدن کو اپنی سخت اور کھردری انگلیوں سے ٹٹولتے بلکہ تقریباً نوچتے ہوئی میری جامہ تلاشی لی اور کچھ برآمد نہیں کرسکا میں نے دل ہی دل میں خدا کا شکر ادا کیا کہ مجھے ویرا کے پرس سے بیم گن نکالنے کا موقع نہیں ملا تھا۔ اگر بیم گن میرے پاس ہوتی تو اس وقت چھوٹے خان کی تحویل میں جاچکی ہوتی۔ میری تلاشی لینے کے دوران میں‘ عبدالرحیم خان اپنے ساتھی کو پشتو میں کچھ ہدایات بھی دیتا جارہا تھا اور وہ سلسلہ ختم ہوتے ہی تنومند افغان مجھے اپنے ساتھ لے کر ٹریلر کے عقبی حصے کی طرف بڑھ گیا۔

اس نے ٹریلر کے آہنی زینے پر چڑھ کر کنٹینر کا عقبی دروازہ کھولا اور مجھے اوپر بلالیا۔ اس کنٹینر کے آگے صرف دو چارپائیاں بچھانے کی جگہ خالی تھی۔ اس سے آگے اناج کی بوریاں اس طرح لگی ہوئی تھیں کہ ان کے درمیان میں ایک تنگ سا راستہ باقی تھا۔ اس کنٹینر کی نصف سے زیادہ گہرائی تک اناج کی بوریاں اسی طرح بھری ہوئی تھیں اور اندر گندم و دھان کی سوندھی سوندھی خوشبو پھیلی ہوئی تھی۔

کنٹینر کی بغلی دیواروں کے ساتھ چھت تک لگی ہوئی بوریوں کے تنگ درمیانی راستے کے اختتام پر کشادہ جگہ تھی۔ وہاں تینوں اطراف میں دیواروں کے ساتھ بوریاں چنی ہوئی تھیں اور درمیانی جگہ نے ایک کمرے کی صورت اختیار کی ہوئی تھی۔ اندر پھیلے ہوئے اندھیرے میں بھی یہ دیکھا جاسکتا تھا کہ اناج کی ترسیل کے لیے استعمال ہونے والے اس کنٹینر کی چھت بھی کسی مضبوط دھات کی بنی ہوئی تھی۔

"شنگارا ویلی روانہ ہونے تک یہ تمہارا قید خانہ ہے۔" مجھے لانے والے نے کہا پھر ایک گوشے میں لٹکتی ہوئی ڈوری کو ہلاتے ہوئے بولا۔ "یہ باہر لگی ہوئی گھنٹی بجاتی ہے۔ ٹٹی پیشاب کے لیے تم گھنٹی بجائے گا تو دروازہ کھول کر تم کو باہر نکالا جائے گا۔ روٹی پانی باہر والا اپنی مرضی سے دے گا۔ ادھر ہر وقت آدمی ہوتا ہے۔ رات میں بستی کا چار آدمی پہرا دیتا ہے۔ تم کوئی گڑبڑ کیا تو وہ لوگ بس گولی چلانا جانتا ہے۔ اس کے علاوہ باہر دو شکاری کتا بھی کھلا پھرتا ہے۔"

وہ خاصی لرزہ خیز صورتِ حال تھی۔ میں نے دھیمے سے پوچھا۔ "اور روشنی کا کیا بندوبست ہے؟"

وہ سنگدلانہ انداز میں‘ دھیمی ہنسی کے ساتھ بولا۔ "تم کو روشنی کی کیا ضرورت ہے۔ قیدی لوگ کھاتا ہے اور پھر سو جاتا ہے۔ یہ یاد رکھو کہ تم ادھر بوریوں کے بیچ میں سے نکل کر اپنا مرضی سے کنٹے نار کے دوسرے حصے میں گیا تو دروازہ کھولتے ہی تم کو گولی مار دیا جائے گا۔ ابی ہم واپس جاتا ہے۔"

اس سے بستر وغیرہ کے بارے میں کچھ پوچھنا لاحاصل تھا۔ میں خاموش رہا اور وہ بوریوں کے درمیان پھنستا پھنساتا واپس ہولیا۔ کنٹینر کا دروازہ بند اور پھر مقفل ہونے کی پُرشور آواز کے بعد اندر سکوت چھا گیا اور میں آہنی فرش پر دراز ہو کر تقدیر کے تضادات پر غور کرنے لگا۔

کہاں میں اسپیشل ٹاسک فورس کے ریسٹ ہاؤس میں خصوصی مہمان کے طور پر ویرا کی حسین رفاقت کے مزے لوٹ رہا تھا اور محض چند گھنٹوں بعد افغان مہاجرین کے ایک کیمپ میں چھوٹے خان کا بے یار و مددگار قیدی بن چکا تھا۔ وہ عزت و ذلت کی دو انتہائیں تھیں۔ شاید قدرت کو میرا وہ غرور

پسند نہیں آیا تھا جو میں نے اسلام آباد کے ڈیپارچر لاؤنج میں اول خان کو فون کرنے کے بعد کیا تھا۔ مجھے اپنا سینہ یک بیک تنگ اور وجود لوہے سے زیادہ وزنی محسوس ہونے لگا۔

میرے لیے یہ بات حیران کن تھی کہ غریب' بے سہارا اور مفلوک الحال افغان مہاجرین کی غیر انسانی بستی کی آڑ میں سردار پائندہ گل کے بھانجے نے اپنی اتنی مضبوط سلطنت قائم کی ہوئی تھی کہ کسی بازپرس یا مداخلت کے خوف کے بغیر اس نے مجھے وہاں قید کرلیا تھا۔ مجھے پورا یقین تھا کہ اس بستی پر چھوٹے خان کا حکم چلتا تھا اور کوئی بھی افغان مہاجر اس کی مرضی کے خلاف لب کشائی کی جرات نہیں کرسکتا تھا کیونکہ ان لوگوں کو خوراک اور پانی جیسے بنیادی وسائل کی فراہمی پر وہی قابض تھا۔ وہ کسی کا بھی راشن بند کرکے اسے اپنے قدموں میں جھکانے کی طاقت رکھتا تھا۔ حیران کن بات یہ تھی کہ چھوٹا خان خود بھی اپنی حویلیوں کی پُرتعیش زندگی کو خیرباد کہہ کر اسی ویرانے میں زندگی گزار رہا تھا' جو شخص اپنے ماموں کے بائیس لاکھ روپے پر گفت و شنید کا پورا اختیار رکھتا تھا' وہ دو چار لاکھ روپے خرچ کرکے کراچی میں بھی رہ سکتا تھا لیکن طاقت و اختیار پر قبضہ کرنے کے لیے اس افغان زادے نے شاید امدادی سامان کی رسد و تقسیم کا حساب رکھنے کی معمولی سی ملازمت قبول کی ہوئی تھی۔ کوئی تصور بھی نہیں کرسکتا تھا کہ چند پھٹے پرانے کپڑوں کی تقسیم پر لڑ مرنے والے افغان مہاجروں کی صف میں ایک لکھ پتی ہیروئن فروش بھی چھپا ہوا ہے۔

قصہ شاید یہ تھا کہ میں ہیروئن کی بیخ کنی کے مشن پر کام کررہا تھا تو ہیروئن بھی میری جان کو آگئی تھی اور زندگی کے ہر موڑ پر مجھے عجیب عجیب جلوے دکھا رہی تھی۔ کبھی ہیروئن کے نشے میں دھت' لُٹتے ہوئے زرد چہروں والے امیرزادے سامنے آتے تھے جن کے لباس متعفن ہوتے تھے' جسموں پر میل کی تہیں جمی ہوئی ہوتی تھیں' بے تحاشا بڑھے ہوئے ناخنوں اور بالوں میں میل کچیل کے ساتھ جوئیں پل رہی ہوتی تھیں اور ان کی بے رونق آنکھوں میں موت کی بھیانک سیاہی اپنے ڈیرے ڈالتی نظر آتی تھی تو کبھی جمی لائیڈ' نیشی کاؤ' ڈون کوانگ' فواد ریلی گینگ جیسے ساہوکار ٹکرا جاتے تھے جو اسی موت کی سوداگری سے اپنا عرقِ حیات کشید کرکے دنیا جہان کی رنگینیاں خریدتے پھرتے تھے۔ حبیب جیوانی جیسے حریص اور دیوالیہ سوداگر رات بھر میں اپنے کاروباری منصوبوں کی شاہانہ تکمیل کے حسین خواب لے کر ان کے جال میں پھنس رہے تھے لیکن ان کے ادھورے خوابوں کی تعبیر صرف ذلت کی موت کی صورت ہی میں ملتی تھی۔ اسٹاک ہوم کی پروفیسر روزینی اور اس کا بوائے فرینڈ' ملی ہیروئن کی اندھی آمدنی سے عالمی سیاحت کے خوابناک منصوبے ترتیب دے کر ان بھیڑیوں کے غول میں داخل ہوتے تھے اور اپنے جسموں کے چیتھڑے اڑوا لیتے تھے۔ ملا سرکار اور شری مان سنگھ کی سازشیں' پیٹر آرنیٹ اور ہیر کیسنجر کی ریشہ دوانیاں اور غلام رسول سے امیر جان کی غداریوں تک ہر جگہ ہیروئن سے کمایا ہوا کالا دھن یا اس کا لالچ ہی کارفرما تھا۔ وہ سب میرے بھیانک اور ڈراؤنے تجربات تھے جو اناج سے بھرے ہوئے کنٹینر کی پُرہول تاریکی اور تنہائی میں ایک ایک کرکے میری نگاہوں کے سامنے ناچ رہے تھے۔ وہ سب' موت کے سوداگروں کی زد میں آئے ہوئے باثروت لوگوں کی کہانیاں تھیں۔ کون جانے کہ ان مفلس گھرانوں پر کیسی کیسی قیامت نہ بیت جاتی ہوگی جہاں آٹھ دس افراد کے کنبے کی کفالت کا واحد سہارا دوستوں کی صحبت میں ہیروئن کا پہلا کش لے کر اس زہریلے سرور سے آشنا ہوتا ہے اور پھر رفتہ رفتہ اپنی ذمے داریوں' گھربار' بال بچوں' ماں باپ اور روزگار تک کو بھول کر ہیروئن کی دھواں اگلتی ہوئی دلدلوں میں گہرا اور گہرا غرق ہوتا چلا جاتا ہے۔ یہاں تک کہ کسی کوڑے گھر' پیشاب خانے یا تاریک و متعفن گوشے میں قزاقِ اجل اس کی رگوں میں ٹھہری ہوئی آخری چند سانسیں بھی نچوڑ کر اسے ستار ایدھی کے مردہ خانے کا حقدار بنا دیتا ہے۔ نانِ جویں اور چھت کے سائے سے محروم وارثوں کو اپنے اندوہناک مصائب سے اتنی فرصت ہی نہیں ہوتی کہ وہ حرماں نصیب اپنے باپ' بیٹے' بھائی یا شوہر کے لاشے کو تلاش کرکے اسے اپنی جیب سے کفن اور ہاتھوں سے مٹی دے سکیں!

میں نے محسوس کیا کہ وہ سب سوچتے ہوئے میرے رونگٹے کھڑے ہوگئے تھے اور بدن پر تھرتھری سوار ہوگئی تھی۔ میں اپنے ہی خیالات سے خوفزدہ ہوکر کنٹینر کے فرش سے اٹھ گیا۔

کنٹینر کے بند دروازوں اور باڈی کی بعض جھریوں سے اگر روشنی کی چند موہوم سی کرنیں اندر اجالا نہ پھیلا رہی ہوتیں تو اس وقت تاریکی سے میرا دم گھٹنے لگتا۔ میں نے تاریکی کے احساس سے چھٹکارا پانے کے لیے اضطراری طور پر سگریٹ سلگا لی اور سلگتی ہوئی دیا سلائی کو جوتے سے رگڑ دیا۔ مجھے اندازہ تھا کہ میری ذرا سی بے احتیاطی سے خشک اناج کی بوریوں نے آگ پکڑلی تو وہی آہنی کنٹینر میری آتشیں قبر میں تبدیل ہوجائے گا۔

مایوسی اور ناامیدی کے اس گھور اندھیرے میں مجھے امید کی بس ایک ہی کرن نظر آرہی تھی کہ میری محنت کے نتیجے میں چھوٹے خان نے ویرا کو آزاد کردیا تھا۔ ویرا میرے پکڑے جانے سے ہی واقف نہیں تھی بلکہ اس نے ٹیکسی میں بے ہوش کیے جانے سے قبل یہ بھی سن لیا تھا کہ مجھے اغوا کرنے والے سردار پائندہ گل کے نمک خوار تھے جو مجھے شنگارا ویلی لے جانا چاہتے تھے۔ وہ لوگ گروہ بند ضرور تھے لیکن بے حد غیر منظم تھے۔ چھوٹے خان نے ویرا کو آزاد کرنے کا فیصلہ کرنے سے پہلے یہ جاننے کی کوشش نہیں کی تھی کہ راستے میں اس کے آدمیوں نے کیا کیا بکواس کی تھی اور اس کے کیا نتائج برآمد ہوسکتے تھے۔

میری دعا تھی کہ ویرا کو واپسی کے سفر میں ہوش آگیا ہو اور اس نے ٹیکسی ڈرائیور کو اپنے قابو میں کرلیا ہو۔ اگر میری اس دعا میں اثر نہ بھی ہوتا تو ویرا ہوش میں آنے کے بعد میری رہائی کے لیے بہت کچھ کرسکتی تھی۔ سردار پائندہ گل اور شنگارا ویلی کے ناموں کے سہارے اگر وہ فی الفور اول خان سے رابطہ کرلیتی تو عین ممکن تھا کہ اسپیشل ٹاسک فورس والے براہِ راست سردار پائندہ گل کے گریبان پر ہاتھ ڈال کر چھوٹے خان کی راج دھانی پر یلغار کردیتے اور مجھے شنگارا ویلی روانہ ہونے سے پہلے ہی اس عذاب سے نجات مل جاتی۔

لیکن وہ صرف امیدیں تھیں جو زندگی کی ڈور کے تسلسل کو برقرار رکھتی ہیں۔ اصل حقیقت یہ تھی کہ میں قیدی تھا' باہر وقت بہت دھیمے دھیمے گزر رہا تھا۔ اس کے بعد رات آجاتی تھی اور ہر طرف پُرہول سناٹے کا راج ہوجاتا یا پھر دو شکاری کتوں کی خون آشام سانسوں کی آوازیں سنائی دیتی رہتیں۔

دیواروں کے ساتھ دھان اور گندم کی بوریاں چنی ہوئی ہونے کے باوجود میرے کان باہر کی آوازوں کو سن رہے تھے۔ میرے قریب ہی کوئی اونچے سُروں میں پشتو گانا گنگنا رہا تھا۔ خیمہ بستی میں کھیلنے اور لڑنے والے بچوں کا شور بھی کبھی کبھار ہوا کے دوش پر ابھرتا ڈوبتا سنائی دے رہا تھا۔ دو مرتبہ کافی فاصلے سے انجنوں کے بیدار ہونے کی آوازیں بھی سنائی دی تھیں۔ جو رفتہ رفتہ دور ہوتی چلی گئیں۔ شاید کراچی میں چوری چھپے نوکری یا کاروبار کرنے والے متمول افغان مہاجرین تفریح یا خریداری کے لیے شہر کا رخ کررہے تھے۔

اس تاریکی اور تنہائی میں آواز شناسی کا وہ شغل مجھے خاصا دلچسپ محسوس ہوا۔ اندازے لگا کر میں قدرے آسانی کے ساتھ اپنا وقت گزار سکتا تھا۔ بے کاری کے مقابلے میں اس طرح سگریٹ کی طلب کا احساس بھی کم ہوگیا تھا جو میرے لیے بہت سود مند تھا۔ میرے پیکٹ میں صرف پانچ سگریٹیں باقی رہ گئی تھیں اور مجھے کچھ معلوم نہیں تھا کہ چھوٹا خان مجھے سگریٹیں فراہم کرے گا یا اس سہولت سے انکار کردے گا۔

کچھ دیر بعد کسی کار کے انجن کی آواز آئی۔ آواز کچھ شناسا سی تھی۔ میری چھٹی حس نے ٹیکسی کی ہانک لگائی اور میرے وجود پر مایوسی کی ایک لہر چھا گئی۔ بارلیش ڈرائیور بے ہوش ویرا کو کسی ویرانے میں ڈال کر چھوٹے خان کے پاس واپس لوٹ آیا تھا۔ اس کا مطلب تھا کہ میری پہلی دعا ناکام لوٹا دی گئی تھی۔ ویرا کو واپسی کے سفر میں ہوش نہیں آیا تھا اور میرے لیے بس ایک ہی امید باقی رہ گئی تھی کہ ویرا' اول خان سے رابطہ کرنے میں کامیاب ہوجائے۔

خیمہ بستی کی کسی عارضی مسجد سے بلند ہونے والی اذان کی آواز سنائی دی تو میں نے چونک کر جھریوں سے آنے والی روشنی کا جائزہ لیا۔ روشنی باقی تھی مگر زرد پڑ رہی تھی۔ میری رسٹ واچ کے ڈائل کے روشن ہندسے پانچ بجنے کا اعلان کررہے تھے۔ جس کا مطلب تھا کہ وہ عصر کی اذان تھی۔

بے اختیار میرا دل چاہا کہ میں بھی اپنے رب کے حضور سجدہ ریز ہو جاؤں لیکن پھر یاد آیا کہ میں پاک نہیں تھا' میں بکثرت نہانے کا عادی تھا لیکن کبھی باقاعدہ غسل کرکے پاک و صاف ہونے کا خیال نہیں آیا تھا۔ غسل ہوتا تو بھی وضو کا مسئلہ تھا۔ وضو پر تیمم یاد آگیا۔ میرے دل نے کہا کہ جب وضو تیمم سے ہو سکتا ہے تو غسل بھی ہو جائے گا لیکن میں اس آہنی کنٹینر میں مٹی کہاں سے لاتا۔ اسی لمحے دماغ کے کسی حصے میں ایک بے ہودہ کہاوت گونجی۔ پتلون لگی پھٹنے' خیرات لگی بٹنے۔ یہ خیال آتے ہی میں نے ان برے لمحات میں فیصلہ کیا کہ میں جب بھی عبادت شروع کروں گا' مصیبت کے بجائے آزادی اور مسرت کے عالم میں کروں گا۔

جھریوں میں شگاف لگانے والی روشنی زرد اور پھر دھندلی پڑتے پڑتے معدوم ہو کر رہ گئی تو خیمہ بستی سے پھر وہی آواز بلند ہوئی۔ اذان ختم ہونے کے بعد فضا میں کسی انجن کی بے ہنگم آواز سنائی دی۔ چند لمحوں بعد وہ آواز بدل گئی۔ اسی کے ساتھ تاریک کنٹینر میں بہت موہوم سا اجالا پھیل گیا جسے صرف میری حساس نگاہیں ہی محسوس کر سکتی تھیں۔ اس کے بعد فضا میں ایک نغمے کی گونج سنائی دی۔ میں نے فرض کر لیا کہ چھوٹے خان نے اپنی رعایا پر احسان کرتے ہوئے وہاں کسی جنریٹر کا بندوبست کیا ہوا تھا جو اندھیرا پھیلنے کے بعد چلا دیا جاتا تھا۔ اس کی مدد سے روشنی کرنے کے ساتھ ہی شاید ٹیلی وژن وغیرہ بھی چلائے جاتے ہوں گے تاکہ اس بستی کے مجبور و محروم باسی اگلے دن کی سختیاں جھیلنے سے پہلے اپنے پرانے عذاب بھلا سکیں۔

انجن کی وہ آواز کرخت اور ایک ہی جگہ ٹھہری ہوئی معلوم ہو رہی تھی۔ تقریباً ایک گھنٹا گزرنے کے بعد مجھے یقین ہو گیا کہ اس شور کے بارے میں میرا قیاس درست ہی تھا اور اسے زیادہ سے زیادہ نو دس بجے کے قریب ختم ہو جانا چاہیے تھا۔

میرے لیے کسی سرہانے کے بغیر سخت آہنی فرش پر لیٹنا سوہانِ روح تھا۔ میں نے فرش پر اناج کی دو بوریوں کو جوڑ کر اپنا بستر تیار کرنے کا فیصلہ کر لیا۔ اس حصے میں بوریاں چھت تک چنی ہوئی تھیں اور ایک دوسرے میں اس طرح پھنسی ہوئی تھیں کہ انہیں درمیان میں سے نکالنا خاصا مشکل تھا۔ اگلے حصے سے بوری کرنے کی دھمک باہر والوں کو میری طرف سے بدظن کرکے فوری تشدد پر اکسا سکتی تھی اس لیے میں نے اپنے کمرے کی ہی ایک دیوار پر طبع آزمائی کرنے کا ارادہ کر لیا۔ میں اس رات بھوکا پیاسا سونے کی امید پر آہستگی سے کام کر رہا تھا۔

میں اپنے کام میں مصروف تھا کہ کنٹینر کے دروازے پر تیز آوازیں سنائی دیں۔ میں متوقع باز پرس کے لیے اپنے چڑھے ہوئے سانسوں پر تیزی سے قابو پانے کی کوشش کرنے لگا۔

تیز کھٹکوں کے بعد خشک قبضوں کی پُرشور آواز کے ساتھ دروازہ کھولا گیا اور پتلے راستے سے تیز روشنی میرے کمرے میں در آئی۔ اسی کے ساتھ چھوٹے خان کی استہزائیہ آواز گونجی۔ "تم زندہ ہو یا مر چکے ہو؟"

"زندہ ہوں مگر بہت بھوکا ہوں۔" میں نے کوئی پیش قدمی کیے بغیر جواب دیا۔

"باہر آؤ!" درشت لہجے میں کہا گیا۔ "میرے کتے بھی بہت بھوکے ہیں۔"

خوف سے میرا ذہن سُن ہو کر رہ گیا۔ کیا وہ مجھے شکاری کتّوں کے حوالے کرنے والا تھا؟ لیکن میں نے فوراً ہی خود کو سنبھال لیا۔ چھوٹے خان کے ذہن میں سمائی ہوئی کسی بات کو تبدیل کرنا میرے بس سے باہر تھا۔ میں نے سوچ لیا کہ میں پوری دلیری کے ساتھ ہر صورتِ حال کا سامنا کروں گا۔

"آ رہا ہوں۔" میں نے جواب دیا اور بوریوں کے درمیان چھوڑی ہوئی تنگ سرنگ میں داخل ہو گیا۔

سرنگ کے آخری سرے پر ایک بلب روشن نظر آ رہا تھا۔ اس کے پس منظر میں خیمہ بستی کے ایک حصے میں بھی برقی روشنیاں نظر آ رہی تھیں۔ میں نے چند ہی قدم بڑھائے تھے کہ کتّوں نے فضا میں میرے وجود کی بو سونگھ کر خونخوار آوازوں میں غرانا شروع کر دیا۔

سرنگ عبور کرکے میں کنٹینر کے دروازے کے قریب پہنچا تو تیز روشنی کے پیچھے کھڑا ہوا چھوٹا خان مجھے نظر نہیں آ سکا لیکن پتلی کمر اور لمبی ٹانگوں والے وہ وحشی کتے ضرور نظر آ گئے جو اپنی لمبی لمبی زبانیں نکالے' غراتے ہوئے ٹریلر پر چڑھنے کی کوششیں کر رہے تھے اور پوری طرح روشنی میں تھے۔

مجھے دیکھتے ہی ان دونوں کتّوں پر دیوانگی کا دورہ پڑ گیا اور وہ اپنے پھیپھڑوں کی پوری قوت سے چیختے ہوئے کنٹینر پر چڑھ آنے کی کوشش کرنے لگے جو زمین سے تقریباً ڈھائی فٹ بلند ٹریلر پر رکھا ہوا تھا۔

میں پیش قدمی ترک کرکے اپنی جگہ پر جم کر کھڑا ہو گیا۔

"باہر نکلو!" کتّوں کے کان پھاڑ دینے والے شور میں چھوٹے خان کی برہم آواز گونجی۔ "کتے زنجیروں سے بندھے ہوئے ہیں اور زنجیریں رکھوالوں کے ہاتھوں میں ہیں۔ تمہارا دم کیوں نکل رہا ہے؟"

چھوٹے خان کے خاموش ہوتے ہی ان کتّوں کو پیچھے کھینچ لیا گیا لیکن وہ بدستور اپنی لال لال زبانیں لٹکائے' آگے بڑھنے کے لیے زور لگاتے ہوئے بھونکے جا رہے تھے۔ میرے ذہن میں یہ امکان اُبھرا کہ کہیں میرے نیچے اترتے ہی وہ خونخوار کتے مجھ پر نہ چھوڑ دیے جائیں لیکن میں اپنی جگہ پر ٹھہرا نہ رہ سکا۔ میں نے چند ہی ثانیوں میں یہ جائزہ لے لیا تھا کہ کتّوں سے دوبدو مقابلے کی صورت میں مجھے ان کے جسم کے کن حصوں کو اپنی بے رحمانہ ٹھوکروں کا نشانہ بنانا ہے۔ میں چند قدم کا فاصلہ طے کرکے دروازے کے قریب پہنچا اور نیچے کود گیا۔

میرے نیچے اترتے ہی روشنی کا رخ تبدیل ہو گیا۔ اس وقت میں نے دیکھا کہ شیڈ میں لگا ہوا وہ طاقتور بلب' زمین میں گڑے ہوئے ایک بانس پر باندھا گیا تھا اور روشنی کا رخ حسبِ ضرورت تبدیل کیا جا سکتا تھا۔ اس وقت مجھے روشنی میں چھوٹا خان نظر آیا۔ اس کے ہاتھ میں کھلونے جیسی روسی کلاشنکوف دبی ہوئی تھی۔ کلاشنکوف میں بڑا میگزین چڑھا ہوا تھا لیکن اس وقت اس کی نال کا رخ زمین کی طرف تھا۔ چھوٹے خان کے ساتھ ہی دو اجنبی کھڑے ہوئے تھے جن کے درشت چہروں سے تُند خوئی ٹپک رہی تھی۔ ان میں سے ہر ایک ہاتھ میں آہنی زنجیر لپٹی ہوئی تھی جس کی مدد سے ان دونوں نے اپنے اپنے کتے کو مجھ تک پہنچنے سے روکا ہوا تھا۔ کتّوں کی زور آزمائی پر قابو پانے کے لیے ان دونوں کو واضح طور پر کافی محنت کرنی پڑ رہی تھی جس کے اندازے کے لیے ان کے' آگے پیچھے جمے ہوئے قدم اور پیچھے کی طرف جھکے ہوئے بدن ہی کافی تھے۔

"میں تمہارے کتّوں سے خوفزدہ نہیں ہوں۔" میں نے نیچے پہنچنے کے بعد بہت سکون کے ساتھ کہا۔ "میں بس ان کے تیوروں کا اندازہ لگانا چاہ رہا تھا۔" وہ فقرے ادا کرتے ہوئے' جہاں میں نے اپنے حوصلے کا مظاہرہ کیا تھا وہیں یہ احتیاط بھی اپنے پیش نظر رکھی تھی کہ میرے الفاظ یا لب و لہجے میں ایسی جارحیت نہیں ہونی چاہیے جس سے مشتعل ہو کر چھوٹا خان مجھے بلاوجہ ہی اپنے کتوں سے لڑوانے پر تل جائے۔ وہ تعلیم یافتہ اور مہذب ضرور تھا لیکن اس کی رگوں میں وہی قبائلی خون دوڑ رہا تھا جس نے ذرا سی دیر میں بانوے فوجیوں کو اپنی افیم کی فصل کے لیے' انسانی کھاد میں تبدیل کر دیا تھا۔

وہ بے اعتباری سے ہنس پڑا۔ "یہ نہ کہو۔ ان کتّوں سے بڑے بڑوں کا پتّا پانی ہو جاتا ہے۔ یہ خونی کتے ہیں اور میری قید سے فرار ہونے کی کوشش کرنے والے تین دشمنوں کو جہنم واصل کر چکے ہیں۔ ان پر ایک بار خون سوار ہو جائے تو ان کے رکھوالے بھی ان کے سامنے بے بس ہو جاتے ہیں۔"

"دو حریف لڑتے ہیں تو ایک کی جیت اور دوسرے کی ہار ہوا ہی کرتی ہے۔ مجھے ان سے مقابلہ کرنے کا کوئی شوق نہیں ہے لیکن مجبور ہو گیا تو انہیں بھی اب تک کا کھایا پیا یاد آ جائے گا۔" میں نے کہا۔

"آدمی دلیر معلوم ہوتے ہو۔" اس نے آگے بڑھ کر میرے کندھے پر ہاتھ مارتے ہوئے کہا۔ "خان بابا' بہادروں کی بہت قدر کرتا ہے لیکن قسمت نے تمہیں اس کے مقابلے میں لا کھڑا کیا ہے۔ اب تمہارے مقدر کا فیصلہ اُسی کی مرضی کے مطابق ہو گا۔ بس یہ یاد رکھنا کہ اب ان کتّوں نے تمہاری بو سونگھ لی ہے۔ اگر تم نے ہماری آنکھوں میں دھول جھونک کر یہاں سے بھاگنے کی کوشش کی تو یہ کتّے تمہیں چیر پھاڑ کر رکھ دیں گے۔ ان سے جیت کر بھی تم اس قابل نہیں رہو گے کہ اپنے قدموں پر کھڑے ہو سکو۔"

"میں بلاوجہ خطرات مول لینے کا عادی نہیں ہوں۔" میں نے بے پروائی کا مظاہرہ کرتے ہوئے کہا۔ "مجھے معلوم ہے کہ سردار پائندہ گل کو میرے بارے میں سنگین غلط فہمی ہوئی ہے۔ اس سے ملاقات ہو گی تو میں اسے پوری طرح مطمئن کر دوں گا۔ اور وہ خود ہی مجھے عزت کے ساتھ آزاد کر دے گا۔"

اس نے مُنہ بنا کر دونوں کندھے اچکائے اور بولا۔ "وہ تمہارا اور خان بابا کا معاملہ ہو گا۔ میں صرف یہ چاہتا ہوں کہ تم میری تحویل میں کوئی گڑبڑ نہ کرو تاکہ میں تمہیں صحیح سالم حالت میں شنگارا دلی بھیج سکوں۔"

"تم بے فکر رہو۔ میں بزدلوں کی طرح بھاگنے کے بجائے' مردانگی کے ساتھ حالات کا مقابلہ کرنے والوں میں سے ہوں۔ میرا یقین ہے کہ جب تک میرا وقت پورا نہیں ہو جاتا' دنیا کی کوئی طاقت میرا بال بھی بیکا نہیں کر سکتی۔ اور اگر میرا برا وقت آ ہی گیا ہے تو یہ کتے بہت بڑی چیز ہیں' کوئی حقیر سی چیونٹی بھی میری ناک کے راستے دماغ میں پہنچ کر مجھے ابدی نیند سلا سکتی ہے۔"

میرے جواب پر وہ خوش ہو گیا اور ایک طرف مڑتے ہوئے بولا۔ "پھر آؤ' تھوڑی دیر تک کھلی ہوا میں بیٹھ کر گپ شپ کرتے ہیں۔ اس بھری بستی میں سب لوگ میرے حکم کے غلام ہیں لیکن ان میں سے ایک بھی اس قابل نہیں ہے کہ میں اسے اپنا دوست سمجھ سکوں۔"

"تو کیا میں خود کو تمہارا دوست سمجھ لوں؟" میں نے اس کی تقلید کرتے ہوئے پوچھا۔ میں نے اس کی بات سے اندازہ لگا لیا تھا کہ وہ اس خیمہ بستی کا بے تاج بادشاہ ہونے کے باوجود تنہائی کے عذاب میں مبتلا تھا۔ وہاں رہنے والے اجڈ اور تُند خو افغان

مہاجرین کے مقابلے میں وہ خاصا تعلیم یافتہ تھا اور اس اعتبار سے اس کی ذہنی سطح بھی ان سے بلند تھی جو اسے ان کے ساتھ گھلنے ملنے نہیں دیتی تھی۔

"میری قائم کی ہوئی حد میں تم میرے دوست ہو لیکن جوں ہی تم نے میرے لیے کوئی مشکل پیدا کرنے کی کوشش کی' میں تمہاری جان کا دشمن بن جاؤں گا۔" اس کی آواز خشک اور گمبھیر تھی۔

"تم میرے دانا دشمن ہو۔" میں نے اسے خوش کرنے کی نیت سے کہا۔ "اور دانا دشمن نادان دوست سے ہزار درجے بہتر ہوتا ہے۔ میں تمہارے اعتماد کی کسوٹی پر پورا اترنے کی کوشش کروں گا۔"

اس دوران میں کتوں کا شور حیرت ناک طور پر معدوم ہوچکا تھا۔ شاید ان کے رکھوالوں نے کسی موروثی چٹکلے کے ذریعے انہیں بہلا کر خاموش کردیا تھا۔ کتے نہ صرف خاموش ہوچکے تھے بلکہ اس وقت میری نگاہوں کی رسائی میں بھی نہیں رہے تھے۔ مشتعل کتوں کا یوں خاموش ہوجانا میرے لیے حیرت سے زیادہ تشویش کا باعث تھا۔ اس سے یہ بات ظاہر ہورہی تھی کہ کتوں کی بھرپور تربیت کی گئی تھی اور وہ اپنے آقاؤں کے متعین کیے ہوئے مقاصد کے حصول کے بارے میں ہروقت مستعد رہتے تھے۔

عبدالرحیم خان کے ساتھ' اس کی چارپائی کی طرف جاتے ہوئے' میں نے دیکھا کہ ویرانے میں قائم کی ہوئی اس خیمہ بستی میں اگرچہ چراغاں نہیں تھا لیکن پھر بھی برقی قمقموں کی روشنی نے اس علاقے کو اس حد تک روشن کیا ہوا تھا کہ وہاں جنگل میں منگل کا سماں پیدا ہوگیا تھا۔ خیموں اور جھونپڑیوں کے درمیان میں ایک ٹیلی ویژن اسکرین بھی روشن نظر آرہی تھی جس کے گرد خاصی بھیڑ لگی ہوئی تھی۔

اس اثنا میں عبدالرحیم خان سگریٹ سلگانے کے لیے رکا تو مجھے بھی بے اختیار سگریٹ کی طلب محسوس ہونے لگی جسے میں نے کافی دیر سے دبایا ہوا تھا۔

"مجھے سگریٹ پینے کی اجازت ہے؟" میں نے دھیمی آواز میں اس سے سوال کیا۔

سگریٹ کا ایک گہرا کش لینے کے بعد اس نے گھور کر میری طرف دیکھا اور چبھتے ہوئے لہجے میں بولا۔ "سگریٹ پینے کے لیے میری اجازت کی ضرورت کیوں پیش آئی۔"

"میرے پیکٹ میں صرف چار سگریٹیں باقی رہ گئی ہیں۔" میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔ "ان کے ختم ہونے کے بعد نیا کوٹا ملنے کی امید ہو تو ذرا کھل کر عیاشی کرلوں۔"

"جب تک تمہیں شنگارا ویلی کے سفر پر روانہ نہیں کیا جاتا' ہم تمہیں روٹی پانی فراہم کرتے رہیں گے۔ سگریٹ تم کو خریدنی ہوگی۔ ایسی بے ضرر چیزیں رجب خان مناسب داموں پر بیچتا ہے۔"

"رجب خان کہاں ہوتا ہے؟" میں نے اپنے لیے سگریٹ سلگانے کے بعد پوچھا۔

"بستی میں اور کہاں ہوگا وہ؟" چھوٹے خان نے تیزی سے کہا۔ "اب زیادہ باتیں کرکے میرا دماغ خالی مت کرو۔ یہ بتاؤ کہ تم شراب بھی پیتے ہو یا نہیں؟"

"تھوڑی بہت اسکاچ پی لیتا ہوں۔" میں نے اس خوش خبری پر اپنا ردِعمل پوشیدہ رکھتے ہوئے کہا۔

اس نے اپنی چارپائی کے قریب پہنچ کر تکیے کے نیچے سے ریڈ لیبل کی مہربند بوتل نکالی اور اسے میری طرف بڑھاتے ہوئے بولا۔ "یہ سات سو روپے کی ہے۔ رجب خان کو شہر سے چھ سو میں ملتی ہے۔"

"اور تم کیا کروگے؟" میں نے بوتل اس کے ہاتھ سے لے کر چارپائی پر رکھتے ہوئے پوچھا۔

"میری فکر چھوڑو اور سات سو روپے نکالو۔ میں ابھی دوسری منگوالوں گا۔"

دُھول میں اَٹے ہوئے ٹریلر میں پھنسی ہوئی ایک لکڑی کے سرے پر جلتے ہوئے بلب نے وہاں خاصی روشنی پھیلائی ہوئی تھی۔ میں نے روشنی میں گِن کر ساڑھے سات سو روپے چھوٹے خان کے حوالے کیے تاکہ وہ میرے لیے سگریٹ کا ایک پیکٹ بھی منگوا دے۔

عبدالرحیم خان نے چارپائی پر بیٹھتے ہوئے کسی کو آواز دی جس کا فوراً ہی جواب آیا۔ چند سیکنڈ کے بعد کتوں کا ایک رکھوالا وہاں آموجود ہوا۔ چھوٹے خان نے اپنی مادری زبان میں اسے کچھ ہدایات دیتے ہوئے' میرے دیئے ہوئے نوٹ اس کے حوالے کیے اور وہ وہاں سے سیدھا بستی کی طرف ہولیا۔

اس وقت عبدالرحیم خان کی چارپائی پر موٹے گدّے والا بستر بچھا ہوا تھا۔ اس چارپائی کے پائے اتنے نیچے تھے کہ اسے ٹریلر کی باڈی کے نیچے بچھانے کے بعد بھی اس پر لیٹا بیٹھا جاسکتا تھا۔ چارپائی کے نیچے واٹر کولر اور اس کے ساتھ دو گلاس بھی موجود تھے۔

میرے ذہن میں عبدالرحیم خان کے اس طرزِ زندگی کے بارے میں چبھن موجود تھی جو وقت گزرنے کے ساتھ بڑھتی ہی جارہی تھی۔ وہ سردار پائندہ گل کا بھانجا تھا اور دنیا کی ہر آسائش اس کی دسترس میں تھی لیکن پھر بھی وہ بے سروسامانی کے عالم میں اس بستی میں رہ رہا تھا۔ اگر اس میں قبائلیوں کی روایتی جفاکشی اور سخت جانی نہ ہوتی تو وہ اس کھلے میدان میں شاید چند گھنٹے بھی نہ گزار پاتا اور دھول مٹی سے بوکھلا کر وہاں سے بھاگ لیا ہوتا۔ وہ اتنے اطمینان سے اپنی چارپائی پر بیٹھا ہوا تھا جیسے وہ اسی ماحول میں پلا بڑھا ہو۔

"گلاس لے کر تم شروع کرو۔ کولر میں ٹھنڈا پانی ہے۔" اس نے مجھے دعوت دی۔

میں نے نیچے سے دونوں گلاس اٹھالیے۔ ایک کے بعد جب میں دوسرے گلاس میں اسکاچ انڈیلنے لگا تو اس نے مجھے سختی کے ساتھ روک دیا۔ "تم اپنا حساب دیکھو' میں اپنی بوتل سے لوں گا۔"

"وہ آجائے گی تو تم اس میں سے ایک پیگ مجھے دے دینا۔" میں نے کہا۔ "یہ اچھا نہیں معلوم ہوتا کہ میں پیتا رہوں اور تم خالی بیٹھے اپنی بوتل کا انتظار کرتے رہو۔"

"میں اس کا عادی ہوں۔" وہ تیز مسکراہٹ کے ساتھ بولا۔ "عورت' شراب اور سگریٹ میں کسی سے ساجھا نہیں کرتا۔ یہ تینوں چیزیں اپنی ہی اچھی لگتی ہیں۔ ایسے کاموں میں دوسروں کی شراکت برداشت کرنے والے کو میرے قبیلے میں بزدل بلکہ نامرد سمجھا جاتا ہے۔ مجھ سے بحث نہ کرو۔ میں تمہاری جھوٹی بوتل سے شراب نہیں لے سکتا۔"

میں نے بات بڑھائے بغیر اپنا سر جھکالیا۔ اس کی منطق بہت عجیب اور ناقابلِ فہم سی تھی۔ میں نے اس بوتل سے اپنے لیے اسکاچ ضرور انڈیلی تھی لیکن وہ صرف اسی بنا پر بوتل کو جھوٹا قرار دے رہا تھا۔ بہرحال وہ اس کی اپنی سوچ تھی میں نے اپنا اخلاقی فرض ادا کردیا تھا۔ اگر اسے میری دعوت پر اعتراض تھا تو وہ اس کا ذاتی معاملہ تھا جس پر تکرار کرنے سے بدمزگی پیدا ہوسکتی تھی۔ میرے لیے یہی غنیمت تھا کہ اس نے مجھے اپنا قیدی قرار دینے کے باوجود' اس وقت مجھے اپنی ہم نشینی کا اعزاز بخشا ہوا تھا۔

میں نے اپنا گلاس بنالیا لیکن مے نوشی کا آغاز کرنے کے بجائے بستی کا ذکر چھیڑ دیا۔

"یہ بستی تم نے خود قائم کی ہے یا کسی ادارے نے ان لوگوں کو یہاں لاکر بسایا ہے؟" میں نے پوچھا۔

"ساری افغان خیمہ بستیاں اقوامِ متحدہ کے مہاجرین کے ادارے نے قائم کرائی ہیں۔ جگہ وغیرہ کا بندوبست پاکستان کی حکومت کرتی ہے۔ اپنا سب کچھ جنگ کی بھٹی میں جھونک کر آنے والوں کے ساتھ یہاں بہت ظلم ہورہا ہے۔ دیکھا جائے تو ان لوگوں کو دو وقت کی روٹی بھی مشکل سے ہی ملتی ہے۔"

"پھر یہ جنریٹر اور ٹیلی وژن وغیرہ کہاں سے آئے ہیں؟" میں نے حیرت سے پوچھا۔

"یہ سب سردار بابا کی مہربانیاں ہیں۔ بجلی کے علاوہ ہم نے اس آبادی میں بڑے سلنڈروں کے ذریعے گیس بھی دی ہوئی ہے۔ تین تندوروں پر عورتیں باری باری اپنی روٹیاں پکاتی ہیں۔ ہر تین گھروں کے لیے گیس کا ایک چولہا بھی ہے۔ اس سے پہلے ہماری عورتیں جلانے کی لکڑیاں جمع کرنے کے لیے میلوں دور کی خاک چھانتی تھیں۔ تمہاری زمین اتنی نکمی ہے کہ یہاں ایندھن کی لکڑی تک نہیں اُگتی۔"

"ایسی بستیاں کسی سرکاری سرپرستی کے بجائے امدادِ باہمی کے جذبے سے ہی چل سکتی ہیں۔ میں حیران ہوں کہ تمہارے سردار نے ان لوگوں کی آسائشوں کا اتنا خیال رکھا ہوا ہے۔"

"پہلے ہم اس ٹینکر میں پانی لے کر آتے تھے۔ یہ بھی ہمارا خریدا ہوا ہے۔ اس کے لیے ٹریکٹر کا بھاری کرایہ دینا پڑتا تھا۔ پھر ہم نے ایک پک اَپ پر دو بڑی بڑی جستی ٹنکیاں رکھوادیں۔ وہ پک اپ صبح شام دو پھیرے لگاتی ہے اور ہمیں پانی کی کوئی قلت نہیں ہوتی۔" عبدالرحیم خان نے فخر آمیز لہجے میں بتایا۔

اسی وقت کتوں کا رکھوالا سگریٹ کا پیکٹ اور شراب کی دوسری بوتل لے آیا اور عبدالرحیم خان نے ندیدے پن کے ساتھ نئی بوتل کھول کر اپنا آدھا گلاس اسکاچ سے بھرلیا پھر اسے پانی سے بھر کر فوراً ہی ایک بڑا گھونٹ حلق سے اتار لیا۔ میں نے بھی اس کی بے صبری سے لطف اندوز ہوتے ہوئے اپنے لب تر کرلیے۔

"کیا یہاں رہنے والے سارے افغان مہاجرین شنگارا ویلی سے آئے ہوئے ہیں؟" میں نے قدرے توقف کے بعد سوال کیا۔

"یہ مختلف علاقوں سے آئے ہوئے بدنصیب ہیں۔ پہلے انہیں جو اناج بانٹا جاتا تھا وہ دھوپ اور برسات میں گل سڑ کر خراب ہوجاتا تھا لیکن جب سے سردار بابا نے ان کے سروں پر ہاتھ رکھا ہے' ہم نے اقوامِ متحدہ والوں کا یہ ٹریلر اور کنٹینر یہاں روک لیا ہے۔ اب سارا اناج اس میں محفوظ رہتا ہے۔ تین مہینے بعد نئی کھیپ آتی ہے تو ٹرک بھرا ہوا کنٹینر یہاں چھوڑ کر' خالی کنٹینر کو ٹریلر سمیت لے جاتا ہے۔"

"تم لوگ اس قسم کے کتنے کیمپ چلا رہے ہو؟" میں نے مرعوب ہوتے ہوئے سوال کیا۔

وہ تلخ ہنسی کے ساتھ بولا۔ "کراچی میں اپنا کام چلانے کے لیے ہمیں ایسے محفوظ ٹھکانے کی ضرورت تھی۔ اس لیے میں یہاں بیٹھا ہوا ہوں۔ سردار بابا کوئی خیرات خانہ نہیں چلاتا جو اپنے وطن سے بھاگ کر پرائی زمین پر پناہ لینے والے تمام مفت خوروں کو روٹیاں فراہم کرتا رہے۔"

اس کے الفاظ کی تلخی نے مجھے چونکا دیا۔ میں نے اس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے کہا۔ "تم انہیں مفت خور کہہ رہے ہو؟ میرا تو خیال تھا کہ ان لوگوں نے روسیوں سے ٹکر لے کر تاریخ کا بہت بڑا کارنامہ سرانجام دیا ہے۔"

"دربدر کی ٹھوکریں کھانے والے یہ خانماں برباد لوگ ہتھیار اٹھانے والوں کو کوستے ہیں۔" وہ استہزائیہ انداز میں بولا۔ "یہ سب قدامت پرست لوگ ہیں۔ افغان اپنے ماضی پر نازاں اور حال میں مگن رہنے والے لوگ ہیں۔ روسی فوجیں ہمارا کچھ نہیں بگاڑ سکتی تھیں۔ ہم صدیوں سے ان کے پڑوس میں رہتے آئے ہیں لیکن ہماری ساری روایات ابھی تک زندہ تھیں۔ تم لوگوں کو اپنا اور امریکیوں کو گرم پانیوں کی بندرگاہوں کا خوف تھا اور تم دونوں نے اپنی جنگ ہمارے سروں پر مسلط کردی۔ کچھ لوگ تم دونوں کے کھیل کو سمجھے بغیر میدان میں کود پڑے اور انجام پوری افغان قوم بھگت رہی ہے۔ اتنے آدمی روسیوں نے نہیں مارے ہوں گے جتنے آپس کی پیکار میں مارے جاچکے ہیں۔ ہماری سرزمین پر بارود کو آگ

دکھانے کے ساتھ ہی تم نے ہمارے مہاجرین کو اچھوت بنا کر رکھ دیا ہے۔ ہمارے بچے بازاروں میں بوجھ ڈھوتے ہیں مگر کم اجرتوں پر چوری چھپے کام کرکے اتنے پیسے جمع کرنے کی فکر میں لگے رہتے ہیں کہ تمہارے راشی افسروں کے پیٹ بھر کر یہاں کے شناختی کارڈ بنوا سکیں۔ افغانیوں کی پوری نئی نسل اس خونریزی کا ایندھن بن چکی ہے۔ خودغرضوں کی اس سازش نے بچوں پر تعلیم اور باعزت روزگار کے دروازے بند کرکے ان کے ہاتھوں میں کشکول تھما دیئے ہیں......"

"شاید تم ٹھیک کہہ رہے ہو۔" میں نے اس کی گفتگو میں وقفہ آتے ہی' مصالحانہ سنجیدگی کے ساتھ کہا۔ "میں نے اس بارے میں اس انداز سے کبھی سوچا ہی نہیں تھا۔"

وہ بولنے کا شوقین معلوم ہوتا تھا۔ ایسا آدمی نشے میں ہو اور پھر جذباتی بھی ہونے لگے تو اسے سنبھالنا بہت مشکل ہوجاتا ہے۔ میری دانست میں وہ موضوع وہیں ختم کرنا ناگزیر ہوگیا تھا۔

"سچ پوچھو تو ان حالات سے میرے خاندان اور قبیلے کو بہت فائدہ پہنچا ہے۔" وہ ایک اور لمبا گھونٹ لینے کے بعد قدرے ٹھہری ہوئی آواز میں بولا۔ "مفت کے ہتھیاروں اور میگزین نے ہمیں شنگارا ویلی میں ناقابلِ شکست بنا دیا ہے۔ فالتو ہتھیار اور سازو سامان بیچتے رہنے کے باوجود اس علاقے میں سردار بابا کا طوطی بولتا ہے۔ کوئی ہمارے افیم کے کھیتوں یا لیبارٹریوں کی طرف دیکھنے کی ہمت نہیں کرسکتا۔ ہم دلالوں کے ہاتھوں اونے پونے داموں پر سودا کرنے کے بجائے' اپنی ہیروئن کراچی میں اصل خریداروں کے ہاتھ بیچنے لگے ہیں۔ ان بھوکے ننگے مہاجروں کی آڑ میں ہمیں پناہ ملی ہوئی ہے۔ ہمارے لیے یہ سب بہت اچھا ہے۔ ہم نے پشاور اور مردان میں جائیدادیں بنا لی ہیں لیکن پھر بھی کبھی کبھی یہ خیال آتا ہے کہ یہ سب کب تک چلتا رہے گا؟ ہماری زمین پر بھڑکتی ہوئی آگ کو بجھانے کے لیے کون آئے گا؟"

"کوئی نہ کوئی آ ہی جائے گا۔" میں نے بڑبڑاتے ہوئے کہا۔ "شاید ابھی ان کے لیے حالات سازگار نہیں ہیں۔"

"تم کس کا ذکر کررہے ہو؟ کون آجائے گا؟" اس نے آنکھیں نکال کر پوچھا۔

"اندر ہی سے کوئی اٹھے گا۔" میں نے بوکھلا کر کہا۔ "ہوسکتا ہے کہ ابھی حالات ایسی قوتوں کے حق میں نہ ہوں۔ تمہاری طرح بہت سے افغان وردمندانہ انداز میں صورتِ حال پر نگاہ رکھ رہے ہوں گے۔"

"ہاں یہ تو ہے۔" وہ سر ہلاتے ہوئے بولا اور پھر گلاس میں سے باقی ماندہ اسکاچ پانی کی طرح اپنے معدے میں اتار کر دوسرا گلاس بنانے میں مصروف ہوگیا۔ میں دلچسپی کے ساتھ اس کا جائزہ لیتا رہا۔ اگر وہ اتنی تیز اسکاچ اسی رفتار سے پیتا رہتا تو تھوڑی ہی دیر میں انٹا غفیل ہوسکتا تھا۔

دوسری اہم بات جو میرے ذہن میں تھی' اس کا تعلق خوفناک کتوں سے تھا۔ جب سے ان کتوں کو خاموش کرکے واپس لے جایا گیا تھا وہ دوبارہ میرے سامنے آئے تھے نہ ان کے بھونکنے یا تیز تیز ہانپنے کی آوازیں سنائی دی تھیں۔ ان علامات سے یوں معلوم ہو رہا تھا جیسے میری اور عبدالرحیم خان کی مے نوشی کو پُرلطف بنانے کے لیے' عارضی طور پر ان کتوں کو کہیں باندھ دیا گیا تھا۔ اگر عبدالرحیم خان تیزی کے ساتھ وہسکی پینے کے نتیجے میں مدہوش یا غافل ہوجاتا اور کتوں کے رکھوالے بھی ہماری طرف متوجہ نہ ہوتے تو میرے لیے وہاں سے فرار ہونے کا بہترین موقع پیدا ہوسکتا تھا۔

ان امکانات کو ذہن میں رکھتے ہوئے' میں نے ابتدا ہی سے اپنی مے نوشی کی رفتار سست رکھی تھی جس کا نتیجہ یہ تھا کہ عبدالرحیم خان دوسرا گلاس لے رہا تھا جب کہ میں پہلے ہی گلاس کو خالی نہیں کرسکا تھا۔ اس تیزی کے نتیجے میں عبدالرحیم خان کی آنکھوں میں خمار کی سرخی پیدا ہوچلی تھی۔ اس کے ساتھ ہی اس کے لہجے میں ہلکی سی لکنت بھی پیدا ہوگئی تھی۔ اسے نشہ ضرور ہو رہا تھا لیکن وہ گردو پیش کی صورتِ حال سے بالکل ہی غافل نہیں ہوا تھا۔ اس نے فوراً ہی میری سست روی کا اندازہ لگا لیا اور میرے چہرے پر نظریں گاڑ کر بولا۔ "تم پیتے کیوں نہیں؟ تمہارا پورا گلاس اسی طرح بھرا ہوا ہے اور میری بوتل چوتھائی خالی ہوگئی ہے۔"

"تم بلا نوش خان زادے ہو۔" میں نے اس کی بہکی ہوئی کھوپڑی پر برف جمانے کے ارادے سے کہا۔ "میں کبھی کبھار کا شوقین ہوں۔ میں نے تمہارا ساتھ دینے کی کوشش کی تو پھر یہاں سے ہل نہیں سکوں گا۔ مجھے اپنی اصل رفتار سے ہی پینے دو۔"

"تم شہری لوگ کنجوس اور بزدل ہوتے ہو۔" وہ شیخی میں آکر بولا۔ "ہر کام ناپ تول کر' ڈرتے ڈرتے کرتے ہو۔ جب تک آدمی پی کر مدہوش نہ ہو پینے کا مزہ ہی نہیں آسکتا۔ اور پھر تم تو ایک قیدی ہو۔ اندر کنٹینر میں جاکر رات گزارو یا اسی چارپائی پر لڑھک جاؤ' تمہیں کیا فرق پڑتا ہے۔"

"رات بھر یہاں پڑا رہا تو تمہارے خوں خوار کتے میری بوٹیاں اڑا ڈالیں گے۔"

"وہ بہت سمجھ دار ہیں۔" وہ میرے عقب میں ہاتھ کا اشارہ کرتے ہوئے بولا۔ "دیکھ لو کتنے آرام سے بیٹھے ہوئے ہیں۔ تم نے اس چارپائی سے نیچے قدم رکھا اور وہ تم پر جھپٹ پڑیں گے۔"

اس کے الفاظ سنتے ہی مجھے اپنی ریڑھ کی ہڈی میں ہزاروں چیونٹیوں کے رینگنے کا احساس ہونے لگا۔ میں نے غیرارادی طور پر اپنی گردن پیچھے گھمائی تو میری روح فنا ہوگئی۔ وہ دونوں کتے اپنی زبانیں باہر لٹکائے' ٹریلر کے پچھلے پہیوں کے قریب زمین پر بیٹھے ہوئے تھے۔ اس وقت ان کی گردنوں میں زنجیر بھی نہیں تھی۔ نہ ہی ان کتوں کے دونوں رکھوالوں کا کہیں نام ونشان تھا۔

"یہ تو آزاد ہیں۔" میں نے بوکھلا کر کہا۔ "ایسا نہ ہو کہ یہ میرے اوپر آ ہی پڑیں۔"

"فکر مت کرو!" وہ میری گھبراہٹ پر ہنستے ہوئے بولا۔ "یہ بہت ذہین اور وفادار کتے ہیں۔ انہیں جو کچھ سمجھا دیا گیا ہے' یہ اس کے خلاف نہیں جائیں گے۔"

"لیکن یہ جانور ہی ہیں۔ بھڑک بھی سکتے ہیں۔ ان کی ذہانت پر اندھا اعتماد نہیں کیا جاسکتا۔ اگر یہ یونہی کھلے پھرتے رہے تو میں ذہنی دباؤ کی وجہ سے تمہاری اس دعوت سے لطف اندوز نہیں ہوسکوں گا۔ مہربانی کرکے ان کے پٹوں میں زنجیریں ڈلوا دو۔"

"تم تو ان کتوں سے خوفزدہ نہیں تھے!" اس نے طنزیہ انداز میں میری کہی ہوئی بات مجھے یاد دلائی۔ "جب تک تمہارا وقت پورا نہیں ہوتا' یہ کتے تو کیا' دنیا کی کوئی طاقت بھی تمہارا کچھ نہیں بگاڑ سکتی تھی۔"

"اس وقت میں اپنے ہوش و حواس میں تھا۔ اب میں نشے میں ہوں......"

وہ اتنی زور سے ہنسا کہ میں پریشان ہوگیا۔ پھر وہ اپنی ہنسی پر قابو پاتے ہوئے بولا۔ "تمہیں شاید وہسکی سونگھ کر ہی نشہ ہوجاتا ہے۔ اتنے تگڑے جوان ہوکر عورتوں جیسی بات کررہے ہو۔"

"میں صبح سے بھوکا ہوں۔ تمہیں معلوم ہوگا کہ خالی پیٹ میں شراب سیدھی دماغ میں چڑھتی ہے۔"

"فکر مت کرو۔ کھانا بھی آتا ہی ہوگا۔ معلوم ہوتا ہے کہ تمہارے لیے تو یہی ایک گلاس رات بھر چلتا رہے گا۔ اس سے زیادہ تو میرے کتے بھی پی لیتے ہیں اور چاق وچوبند رہتے ہیں۔"

اس کے تبصرے کا بہترین جواب یہ تھا کہ وہ کتے تھے مگر میں کتا نہیں تھا لیکن میں نے خاموشی ہی بہتر سمجھی۔ اپنی بسیار نوشی کی وجہ سے وہ میرے تبصرے کا غلط مفہوم سمجھ کر ہتھے سے اکھڑ سکتا تھا۔

"جب تک تم میرے ساتھ ہو مجھے کتوں کی زیادہ فکر نہیں ہونی چاہیے۔" میں نے ایک گہرا سانس لے کر کہا۔

"اب تم نے عقل کی بات کی ہے۔" وہ خوش ہوکر بولا۔ "تم میری ہدایات پر چلتے رہے تو تمہاری حفاظت کی پوری پوری ذمے داری میرے اوپر ہوگی۔"

"برا نہ مانو تو ایک بات پوچھ لوں۔" میں نے اپنے گلاس سے ایک گھونٹ لے کر کہا۔

"دس باتیں پوچھ سکتے ہو۔ بس سردار بابا کی خلاف زبان نہ کھولنا۔"

"تم نے شراکت داری کا فلسفہ بیان کرتے ہوئے تین چیزوں کا ذکر کیا تھا۔ سگریٹ' شراب اور عورت! ان میں سے دو ہمارے سامنے ہیں' تیسری کے لیے تم کیا بندوبست کرتے ہو؟" میں نے دھیمے سے پوچھا۔

"یہاں اس کا ذکر بھی نہ کرنا۔" وہ ایک گہرا سانس لے کر بولا۔ "اس تقریباً کھلی ہوئی بستی میں ان انسانی لغزشوں کا بھی گزر نہیں ہے جو باقاعدہ آبادیوں کے بند کمروں میں پھلتی پھولتی ہیں۔ ویسے بھی یہ مفلوک الحال افغان غیرت کے معاملے میں بہت سفاک اور بے رحم ثابت ہوتے ہیں۔ اس غریب بستی میں کئی الہڑ اور خوبصورت لڑکیاں پروان چڑھ رہی ہیں۔ لیکن کوئی ان پر بری نظر نہیں ڈال سکتا۔ اس شوق کے لیے میں نے کراچی میں بندوبست کیا ہوا ہے۔ وہاں ایک کابلی لڑکی میرے فلیٹ میں رہتی ہے لیکن تم تو شاید شادی شدہ ہو اور تمہاری عورت شرف آباد کے فلیٹ میں کسی اور مرد کے ساتھ رہتی ہے۔"

"وہ اس کا بھائی ہے۔" اس نے کسی اور مرد کا تذکرہ اس قدر تحقیر آمیز انداز میں کیا تھا کہ مجھے تلملا کر سلطان شاہ کے بارے میں وضاحت ہی کرنی پڑ گئی۔ "مجھے اس قسم کا کوئی شوق نہیں ہے۔ بس تمہاری کہی ہوئی ایک بات کے بارے میں جاننا چاہ رہا تھا۔"

کھلے ہوئے کتوں کے نظر آجانے کے بعد میرے لیے فرار کے کسی فوری امکان کے بارے میں سوچنے کی گنجائش باقی نہیں رہی تھی' اس لیے میں نے بے پروائی سے عبدالرحیم کا ساتھ دینا شروع کردیا۔ بعض لوگ نشے کی حالت میں بے سدھ ہوکر خاموشی سے اونگھنے لگتے ہیں اور بعض کی زبان زیادہ جوہر دکھانے لگتی ہے۔ چھوٹے خان کا تعلق دوسری قسم کے مے خواروں میں سے تھا۔ اس نے مجھے بتایا کہ ویرا کو ٹیکسی کے ذریعے واپس لے جانے والا بارلیش ڈرائیور اسے بے ہوشی کی حالت میں نیو کراچی سے آگے' ویران ٹیلوں کے درمیان ڈال آیا تھا۔ میں نے گھما پھرا کر کئی سوال کرنے کے بعد یہ بھی اندازہ لگا لیا کہ اس ڈرائیور نے غالباً ویرا کے پرس یا لباس کی تلاشی نہیں لی تھی' جس کا مطلب تھا کہ بیم گن ان لوگوں کی دسترس سے محفوظ تھی۔

میری وہاں سے روانگی کے بارے میں وہ اس وقت بھی کچھ نہیں بتا سکا۔ میں نے گھما پھرا کر وہ سوال کئی مرتبہ دہرایا اور اس نے ہر بار ایک ہی جواب دیا کہ مجھے وہاں باعزت قیدی کی ہر سہولت میسر تھی اس لیے مجھے بے فکری سے وہاں رہنا چاہیے تھا۔ جب وہاں سے میرا دانہ پانی اٹھ جاتا تو خود بخود میری روانگی کا بندوبست ہوجاتا۔ اس نے مجھے یہ باور کرانے کی کوشش کی کہ میں جو وقت اس خیمہ بستی کے کنٹینر میں بسر کررہا تھا وہ ہر اعتبار سے بہتر تھا کیونکہ عبدالرحیم کے برعکس اس کا ماموں بہت ضدی اور مغلوب الغضب طبیعت کا مالک تھا اور اپنی خطیر رقم کے بارے میں' میری جانب سے کوئی واضح یقین دہانی نہ ملنے کی صورت میں مشتعل ہوکر میرے ساتھ بدسلوکی کرسکتا تھا۔

نو بجے کے قریب بستی سے کھانا آگیا۔ عبدالرحیم خان کے لیے گوشت کے بھنے ہوئے پارچے آئے تھے۔ میرے لیے دال بھیجی گئی تھی جس کے ساتھ گرم تندوری نان تھے۔ آنے والے نے

گوشت اور دال کے پیالے' ترتیب وار ہم دونوں کے سامنے رکھے اور فوراً ہی واپس چلا گیا۔

اس وقت عبدالرحیم خان مجھ پر مہربان تھا۔ اس لیے مجھے بھی گوشت کھانے کی اجازت مل گئی۔ دونوں ہی ڈشیں گرم اور لذیذ تھیں۔ میں کھانا کھاتے ہوئے بھی کتوں کی طرف سے بے فکر نہ رہ سکا لیکن یہ بات حیران کن تھی کہ گوشت کی بو پا لینے کے بعد بھی انہوں نے اپنی جگہ نہیں چھوڑی تھی۔

تھوڑی دیر بعد عبدالرحیم خان نے کتوں کے رکھوالوں کو بلایا۔ انہوں نے کتوں کے پٹوں میں زنجیریں ڈال کر انہیں مضبوطی سے تھام لیا۔ اس کارروائی پر کتوں کے کان کھڑے ہوگئے اور وہ چوکنے انداز میں میری طرف دیکھنے لگے۔ شاید انہیں میری نقل و حرکت کا اندازہ ہوگیا تھا۔

چارپائی چھوڑنے سے پہلے میں نے غیرارادی طور پر عبدالرحیم خان سے ہاتھ ملانے کی کوشش کی لیکن اس نے سردمہری کے ساتھ صاف انکار کردیا۔ "شاید تمہیں یاد نہیں رہا کہ ہم اپنے دشمنوں اور قیدیوں سے ہاتھ نہیں ملاتے۔ یہ رسم صرف برابر کے دوستوں کے ساتھ ادا کی جاتی ہے۔"

"گپ شپ کی دعوت دیتے ہوئے تم نے مجھے اپنا دوست قرار دیا تھا۔" میں نے خفت آمیز انداز میں اسے یاد دلایا۔ لیکن اس کے چہرے پر چھائی ہوئی سردمہری میں کوئی فرق نہیں آیا۔

"گپ شپ ختم ہوگئی۔ اب تم پھر سے قیدی بن گئے ہو۔ کنٹینر میں جاؤ اور سونے کی کوشش کرو۔"

میں جوں ہی چارپائی سے نیچے اترا' دونوں کتوں نے دانت نکوس کر' غراتے ہوئے میری طرف جھپٹنے کی کوشش کی لیکن اس بار رکھوالوں نے پچکار کر' کچھ کہتے ہوئے انہیں روک لیا اور میں تیز تیز قدموں سے ٹریلر کے عقبی حصے کی طرف جاکر کنٹینر میں چڑھ گیا۔

وہ دونوں آدمی کتوں سمیت اس طرف آئے اور کتوں کو زنجیروں سے آزاد کرنے کے بعد کنٹینر کا وزنی دروازہ بند کرنے لگے۔ میں بوریوں کے درمیانی راستے سے اندر پہنچا بھی نہیں تھا کہ آہنی پٹ' خشک قبضوں کے تیز شور کے ساتھ ایک دوسرے سے ٹکرا کر بند ہوگئے اور باہر سے ان کے بولٹ اور کلیمپ چڑھائے جانے لگے۔

ایک بار پھر خشک اناج کی تیز بُو سے رچی ہوئی وہ بند فضا میرا مقدر بن چکی تھی۔ میں باہر روشنی میں سے آیا تھا اس لیے مجھے اندر بہت تاریکی کا احساس ہوا اور میری آنکھیں خاصی دیر تک اس اندھیرے سے مانوس نہیں ہوسکیں۔ اور جب میں اندر مختلف تاریک دھبوں میں تھوڑا بہت امتیاز کرنے کے قابل ہوا تو میں نے دو بوریوں کو ملا کر' فرش پر اپنا بستر بنانے کا ادھورا کام مکمل کرنا شروع کردیا۔

بستر بنانے کے بعد میں نے جوتے اتارے اور ان بھری ہوئی سخت بوریوں پر دراز ہوگیا۔

میرے لیے وہ صورتِ حال عجیب ہونے کے ساتھ ساتھ تشویش ناک بھی تھی۔ ویرا اپنی طویل اور گہری بے ہوشی کی وجہ سے ان لوگوں کی قید سے رہا ہونے میں کامیاب ہوچکی تھی۔ اس نے بے ہوش ہونے سے پہلے بہت سی کارآمد باتیں سن لی تھیں جن کے ذریعے اسے یہ معلوم ہوچکا تھا کہ میں سردار پائندہ گل کے آدمیوں کی قید میں تھا اور وہ لوگ مجھے ٹشنگارا دیلی نامی' افغان سرحدی علاقے میں لے جانے کا ارادہ رکھتے تھے۔ ان لوگوں میں کچھ وقت گزارنے کے بعد میں نے یہ اندازہ لگا لیا تھا کہ ان معلومات کے سہارے کراچی میں صحیح خطوط پر چھان بین کی جاتی تو سردار پائندہ گل کے نام کے حوالے سے اس افغان خیمہ بستی تک پہنچنا زیادہ دشوار نہیں ہونا چاہیے تھا لیکن ویرا کو وہاں سے گئے تقریباً آدھا دن گزر چکا تھا اور اس کی واپسی کے کوئی آثار نہیں تھے جس کا واحد مطلب یہی تھا کہ وہ غزالہ اور سلطان شاہ کی مدد سے کوئی پیش رفت نہیں کرسکی تھی۔

اول خان کا بذاتِ خود کراچی میں موجود نہ ہونا بھی ایک اہم عنصر تھا لیکن ویرا اس کے اسلام آباد کے رابطوں سے بخوبی واقف تھی۔ اگر وہ اول خان کو میرے اغوا کے پورے پس منظر سے آگاہ کردیتی تو کوئی وجہ نہ تھی کہ وہ اپنے کراچی میں مامور عملے کو فوری طور پر میری تلاش کی مہم پر نہ لگا دیتا۔ یہ نکتہ اس قدر واضح اور اہم تھا کہ ویرا کسی بھی صورت میں اسے نظرانداز نہیں کرسکتی تھی۔ اگر اس کی طرف سے غیرمعمولی تاخیر ہورہی تھی تو اس کا ایک مقصد یہ بھی ہوسکتا تھا کہ اس کی کنپٹی پر لگنے والی ضرب میرے اندازے سے کہیں زیادہ شدید رہی ہو اور اس کی بے ہوشی کا دورانیہ غیرمعمولی طور پر طویل ہوگیا ہو یا پھر ہوش میں آجانے کے باوجود' ذہنی طور پر پوری طرح بحال نہ ہوسکی ہو۔

اندھیرے اور تنہائی میں میرا ذہن مسلسل ان ہی پہیلیوں میں الجھا رہا۔ سارے خیالات ایک ڈراؤنے تسلسل کے ساتھ میرے ذہن میں ابھرتے چلے آرہے تھے۔ کراچی پہنچنے سے پہلے' میں نے اسلام آباد میں کئی بے خواب راتیں گزاری تھیں' جن کا تعلق البرٹو ویلیسا کی بیخ کنی کی مہم سے تھا۔ اس بھاگ دوڑ اور بے خوابی کے نتیجے میں' میں شدید اعصابی تکان کا شکار ہورہا تھا۔ میری وہ کیفیت اس امر کی متقاضی تھی کہ میں چند گھنٹوں کی گہری نیند لے کر خود کو تازہ دم کرلوں۔ اس بارے میں میری ہلکی پھلکی بے نوشی بھی معاون ہونی چاہیے تھی لیکن تازہ ترین صورت حال اس قدر مخدوش اور پریشان کن تھی کہ میری آنکھوں میں دور دور تک نیند کا پتا نہیں تھا۔

تھوڑی دیر کے بعد فضا میں گرجتی ہوئی' جنریٹر کی تیز آواز یکایک دم توڑ گئی اور ماحول پر ایک خوف آور' آسیبی سناٹا چھا گیا۔ میں نے محسوس کیا کہ میرے لیے سکوت اور سناٹے کے مقابلے میں وہ پُرشور ماحول زیادہ سکون آور تھا۔ میں اناج کی ان دو بوریوں پر پڑا' بے چینی کے ساتھ کروٹیں بدلتا رہا۔

تھکن' فکری اور بے آرامی کے باوجود' نجانے کب میری آنکھ لگ گئی۔ کسی نے سچ ہی کہا ہے کہ نیند سُولی کے تختے پر بھی آ ہی جاتی ہے۔ میں کتنی دیر تک سوتا رہا' اس بارے میں مجھے کوئی اندازہ نہیں۔ دوبارہ آنکھ کھلی تو بند کنٹینر میں سب کچھ جوں کا توں تھا۔ کسی بھی چیز میں کوئی فرق نہیں آیا تھا لیکن باہر کی فضا میں عورتوں' بچوں اور مردوں کی ڈوبتی ابھرتی آوازیں گونج رہی تھیں جن سے اندازہ ہورہا تھا کہ صبح ہوچکی تھی۔

میں نے سخت بوریوں والے ناہموار بستر سے اٹھنا چاہا تو بدن میں درد کی ٹیسیں دوڑ گئیں۔ میری نیند تو کسی نہ کسی طرح پوری ہوگئی تھی لیکن بھری ہوئی بوریوں کے نشیب و فراز نے میرے رگ پٹھوں میں شدید تناؤ پیدا کردیا تھا جو درد کی صورت میں مجھے پریشان کررہا تھا۔ میں نے اپنی نگاہوں پر زور دے کر' اندھیرے میں وہ ڈوری تلاش کی جو باہر لگی ہوئی گھنٹی سے منسلک تھی۔ ڈوری کھینچتے ہی باہر سے کسی دھاتی کٹوری کے بجنے کی آواز سنائی دی اور میں کسی جواب کے انتظار میں تن بہ تقدیر ہوکر بیٹھ گیا۔

تھوڑی دیر بعد کنٹینر کا دروازہ کھلنے کی آواز سنائی دی۔ پھر کسی نے مجھے نام لے کر پکارا۔ آواز کے ساتھ ہی وہ لب و لہجہ بھی اجنبی تھا۔ میں جواب دے کر' بوریوں کے درمیان بنے ہوئے تنگ راستے سے باہر نکلتا چلا گیا۔ باہر سورج کی تیز روشنی میں کتوں کا وہی رکھوالا میرا منتظر تھا جو رات کو بستی سے سگریٹ لے کر آیا تھا۔

وہ خاصا اجڈ اور بدتمیز آدمی تھا۔ میں نے اس سے عبدالرحیم خان کے بارے میں استفسار کیا تو وہ مجھ پر برس پڑا کہ مجھے اس سے کیا لینا تھا۔ جب اس نے مجھ سے درشت لہجے میں گھنٹی بجانے کا سبب دریافت کیا تو میں نے اسے حوائج ضروریہ کے بارے میں آگاہ کیا۔

رات کو بھی وہاں بجلی کی روشنی پھیلی ہوئی تھی لیکن اس کے مقابلے میں سورج کی تاحدِ نظر پھیلی ہوئی روشنی نے ماحول کو بالکل ہی بدل کر رکھ دیا تھا۔ اس وقت میری رسٹ واچ صبح کے ساڑھے سات بجا رہی تھی لیکن کھلے میدان میں دور تک پھیلی ہوئی دھوپ سے یوں محسوس ہورہا تھا جیسے خاصا دن چڑھ آیا ہو۔ اس وقت بھی میرے لاشعور میں خطرناک کتوں کا خوف جاگزیں تھا لیکن میں قدرے بے خوفی کے ساتھ نیچے اتر گیا۔ مجھے یہ دیکھ کر خوشی ہوئی کہ اس وقت قرب و جوار میں کتوں کا کہیں پتا نہیں تھا۔ شاید دن کے اجالے میں انہیں خیمہ بستی میں باندھ دیا جاتا تھا۔

اس شخص کے ایما پر' میں ٹین کے ڈبے میں کولر سے پانی لینے کے لیے بڑھا تو عبدالرحیم کی چارپائی خالی پڑی تھی اور عملاً وہی شخص اس وقت میرا نگراں تھا۔

اُس نے مجھے کھلے میدان کے ایک دور افتادہ حصے کا رخ کرنے کی ہدایت دیتے ہوئے' ٹوٹی پھوٹی اور اکھڑ اردو میں متنبہ کیا کہ میں نے وہاں سے بھاگنے کی کوشش کی تو وہ مجھے بھون کر رکھ دے گا۔

اپنی اس دھمکی کی عملی تائید میں اس کے بائیں شانے سے کلاشنکوف جھول رہی تھی' جس میں میگزین بھی چڑھا ہوا تھا۔ میرے نزدیک وہ ایک غیراہم نگراں تھا جس کا مطلب مجھے اسی علاقے تک محدود رکھنا تھا۔ وہ میری کوئی الجھن دور کرنے کی پوزیشن میں نہیں تھا' اس لیے میں اس کی بتائی ہوئی سمت میں چل دیا۔

پچھلی رات واٹر کولر میں پانی خاصا ٹھنڈا تھا لیکن پوری رات گزرنے کے بعد وہ ٹھنڈک اعتدال میں ڈھل چکی تھی۔ ٹین کا ڈبا خاصا بڑا تھا اور اس میں کولر کا تقریباً تمام پانی ہی سما گیا تھا۔ مجھے اندازہ تھا کہ اس عارضی خیمہ بستی میں مجھے ہاتھ منہ دھونے کی کوئی روایتی سہولت نہیں مل سکے گی۔ اس لیے میں اپنی دیگر ضروریات سے فارغ ہونے کے بعد' دیر تک اپنے منہ پر بچے ہوئے پانی کے چھپکے مارتا رہا۔ میں نے یہ بات خاص طور پر نوٹ کی کہ اس دوران میں میرا نگراں کنٹینر کے سائے میں کھڑا مستقل طور پر میری طرف دیکھتا رہا۔ اپنی کلاشنکوف اس نے شانے سے اتار کر ہاتھوں میں لی ہوئی تھی اور میری واپسی میں تاخیر ہونے کی وجہ سے وہ بار بار بے چینی کے ساتھ ٹہلتا جارہا تھا۔

اس اکھڑ اور بے ہودہ افغان کو سلگانے کے لیے میں نے ٹین کے ڈبے میں موجود' پانی کا آخرہ قطرہ تک نچوڑ کر اپنے کمہلائے ہوئے چہرے کو سیراب کیا اور پھر خراماں خراماں واپس لوٹا تو وہ دانت پیستے ہوئے مجھ پر برس پڑا۔ "کیا وہاں اپنے گڑے مردوں کے لیے فاتحہ پڑھنے کے لیے جم کر بیٹھ گئے تھے۔" اس کی ٹوٹی پھوٹی اور دشوار اردو کا یہی مفہوم میرے پلّے پڑسکا تھا۔

"تمہارے نان کھا کر مجھے قبض ہوگیا ہے۔" میں نے مسکراتے ہوئے خوش دلی کے ساتھ کہا۔ "میں ہاتھ منہ دھو کر آیا ہوں۔ میرا ناشتا کہاں ہے؟"

وہ مجھے قہربار نظروں سے گھور کر رہ گیا۔ "میری کلاشنکوف کی ایک گولی تمہاری ساری آنتوں کو کشادہ کردے گی۔ میں تمہارے باپ کا نوکر نہیں ہوں جو تم نے ایک گھنٹے سے مجھے یہاں کھڑا کیا ہوا ہے۔"

"تم بھی اپنے ساتھیوں کی طرح جنگ جو اور خوں خوار معلوم ہوتے ہو۔" میں نے اپنے جلے دل کے پھپھولے پھوڑنے کے لیے اسے اس کے وحشی کتوں سے تشبیہ دیتے ہوئے کہا لیکن میری توقع کے عین مطابق میرے تبصرے کی باریکی اس کے پلّے نہیں پڑسکی۔

"ہم سب ایک ہی مٹی کے بنے ہوئے ہیں۔" اس نے میری بات کو اپنے ہم نسلوں سے متعلق سمجھتے ہوئے تیزی کے ساتھ کہا۔ "یہ نہ سمجھ لینا کہ تم مجھے طیش دلاتے رہے تو میں تمہارے بدن میں

گولیاں اتارنے سے گریز کروں گا۔“ وہ اس وقت جوش اور غصے کے عالم میں تھا لیکن میں اس کی دھمکی کے بودے پن سے بخوبی واقف تھا۔ اس کا آقا عبدالرحیم خان مجھے پہلے ہی بتا چکا تھا کہ میں سردار پائندہ گل کا قیدی تھا اس لیے وہ مجھے تشدد کا نشانہ بنانے سے گریز کر رہا تھا۔ شاید بڑا خان ٹوٹے پھوٹے قیدیوں کو اپنے آدمیوں کی نااہلی سمجھنے کا عادی تھا۔ میں نے اس کی کمزوری سے فائدہ اٹھانے کے لیے اسے مزید چھیڑنے کا فیصلہ کرلیا۔

”مجھے معلوم ہے کہ تمہاری گولیاں ناکارہ ہیں۔ یہ بتاؤ کہ میرا ناشتا کہاں ہے؟“

وہ بے چارہ اردو سے کام چلانے کی حد تک واقف تھا۔ اس لیے اس بار بھی میرا وار خالی ہی گیا اور اس نے درشت لہجے میں کہا۔ ”تلبلی دبے گی تو تمہارے منہ سے آواز بھی نہیں نکل سکے گی۔ میرا دماغ مت کھاؤ اور اپنی منحوس صورت غرق کرو۔ تمہارا ناشتا کنٹینر میں رکھا ہوا ہے۔“

میں بے مقصد سی مسکراہٹ کے ساتھ کنٹینر کی طرف بڑھا تو کھلے ہوئے دروازے کے قریب ہی ایک میلے سے ٹک پر خشک تندوری نان رکھا ہوا نظر آیا۔ میں نے ترم روٹی اٹھا کر مگ میں جھانکا تو اس میں گاڑھی لیکن کم دودھ والی چائے موجود تھی۔

اس ویرانے میں مکھن اور ڈبل روٹی پر مشتمل ناشتے کی توقع بھی نہیں کی جاسکتی تھی۔ ناشتے کے نام پر جو کچھ میسر تھا، وہی غنیمت تھا۔ میں نے چائے کے بے تلے گھونٹوں کے ذریعے اس نان کے لقمے اپنے حلق سے اتارنے کی کوششیں شروع کردیں۔ میرا رکھوالا اپنی مادری زبان میں کچھ بڑبڑاتا ہوا آگے چلا گیا۔

میں اپنے حلق میں پھنستے ہوئے آخری لقمے کو معدے میں اتارنے کی کوشش میں مصروف تھا کہ آبادی کی جانب سے عبدالرحیم خان مجھے اپنی طرف آتا ہوا نظر آیا۔ اس کے داہنے ہاتھ میں ایک پتلی سی بید دبی ہوئی تھی جسے وہ فضا میں گھماتا ہوا میری طرف آرہا تھا۔

پچھلی رات میرے ساتھ اس کا رویہ بہت دوستانہ تھا۔ ہم دونوں نے ایک ساتھ مے نوشی کرنے کے بعد کھانا کھایا تھا اور مجھے امید تھی کہ اس بے تکلفانہ نشست کے بعد وہ میرے ساتھ ہمدردانہ انداز میں پیش آئے گا، اس لیے میں اس کے قریب پہنچنے سے پہلے ہی، اپنے ناشتے سے فارغ ہوکر اس کے استقبال کے لیے تیار ہوگیا۔

اس کا چہرہ جب میری نگاہوں کی رسائی میں آیا تو میں یہ دیکھ کر چونک پڑا کہ اس کے بشرے سے غصے اور کبیدگی کے آثار ہویدا تھے اور وہ ان ہی جذبات کے زیر اثر اپنی بید کو فضا میں گردش دے رہا تھا۔ یوں محسوس ہورہا تھا جیسے وہ اپنے کسی نادیدہ دشمن کے بدن کو اس پتلی اور لمبی بید سے ادھیڑنے کی کوشش کررہا ہو۔

وہ بید کو فضا میں جھٹکتا اور گھماتا ہوا، سیدھا میری طرف آرہا تھا۔ جب وہ کافی قریب آگیا تو میں نے اپنے لبوں پر خوشامدانہ مسکراہٹ سجاتے ہوئے، اپنائیت کے ساتھ کہا۔ ”کیا بات ہے؟ خان اعظم کے بھانجے کی پیشانی پر مجھے تکدر اور برہمی کے آثار نظر آرہے ہیں۔ خیریت تو ہے نا؟“

وہ دو تین لمبے لمبے ڈگ بھر کر آگے بڑھا اور میری توقع کے بالکل برعکس، اس نے میرے بائیں بازو پر زور سے بید رسید کردی۔ بید کی ضرب سے میرے بازو میں چنگاریاں سی بھر گئیں لیکن میں ذرا بھی جنبش کیے بغیر، حیرت اور غصے کے عالم میں اسے گھورتا رہا۔

پچھلی رات وہ میرا ہم نوالہ اور ہم پیالہ رہا تھا اس لیے مجھے اس سے ایسے جارحانہ فعل کی توقع نہیں تھی۔ اس نے ابھی میرے ساتھ جو کچھ کیا تھا وہ شاید اس کا اضطراری ردعمل تھا۔ کیونکہ میری چبھتی ہوئی، خون آشام نگاہوں کا سامنا کرتے ہی وہ بوکھلا گیا۔

”تم پر لعنت ہو۔“ وہ اپنی بید کو فضا میں جھٹکتے ہوئے، غصے کے عالم میں غرایا۔ ”تم یہاں قید رہ کر بھی سردار بابا کے خلاف سازشوں سے باز نہیں آئے ہو....“

”چھوٹے خان! ہوش کے ناخن لو!“ میں نے اس سے زیادہ تیزی کے ساتھ غراتے ہوئے کہا۔ ”میں جب سے یہاں لایا گیا ہوں، تمہارے سامنے ہوں اور میرا کسی سے بھی کوئی رابطہ نہیں ہے۔ میں بڑے خان یا تمہارے خلاف کوئی سازش کس طرح کرسکتا ہوں۔“

”یہ ہوا ہے۔“ وہ غصے کے عالم میں دہاڑا۔ ”تمہارے آدمیوں نے سردار بابا کو پشاور کی حویلی میں محصور ہوجانے پر مجبور کردیا ہے۔ وہ محاصرہ ختم کرنے کے بدلے میں تمہاری فوری رہائی کا مطالبہ کررہے ہیں۔“

”یہ ان کا فرض ہے۔“ میں نے بے خوفی کے ساتھ کہا۔ ”میری آزادی اور خودمختاری کی حفاظت ان کی ذمے داری ہے۔ ایسا کوئی قدم اٹھانے کے لیے انہیں میری کسی ہدایت یا سازش کی ضرورت نہیں ہے۔“

”انہیں کیسے معلوم ہوا کہ تم سردار بابا کے آدمیوں کی قید میں ہو؟“ وہ جھلا کر غرایا۔

”یہ مجھے لانے والے آدمیوں سے پوچھو!“ میں نے اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کہا۔ ”انہوں نے میری ساتھی کو بے ہوش کرنے سے پہلے سب کچھ بتا دیا تھا۔“

”اور یہ تم مجھے اب بتا رہے ہو؟“ وہ آنکھیں نکال کر غرایا۔ ”اس سفید کتیا کو آزاد کرانے کے لیے تم ہی نے مجھ سے سفارش کی تھی۔ مجھے کیا معلوم کہ راستے میں تم لوگوں نے کیا گل کھلائے تھے۔“

”گل میں نے نہیں، تمہارے آدمیوں نے کھلائے تھے۔“ میں نے ترکی بہ ترکی جواب دیا۔ ”انہوں نے سردار پائندہ گل اور شنگارا ولی کے بارے میں بات کی تھی۔ اس میں میرا کوئی قصور نہیں تھا۔ اچھا ہی ہوا کہ اس عورت نے وہ باتیں میرے وفاداروں تک پہنچادیں۔ اب میرے بارے میں تمہارے کیا عزائم ہیں؟“

”میں تمہارا خانہ خراب کردوں گا۔“ اس نے غراتے ہوئے، اشتعال سے بے قابو ہوکر ایک مرتبہ پھر بید سے کام لیا۔ میں اس کی زد سے بچنے کی کوشش کیے بغیر آگے بڑھا اور میں نے فضا میں لہراتی ہوئی بید اپنی گرفت میں لے کر اسے پوری طاقت سے ایک جھٹکا دیا۔ عبدالرحیم خان میرے اس ردعمل کے لیے تیار نہیں تھا۔ اس نے بید کے سرے کو مضبوطی سے تھاما ہوا تھا اس لیے جھٹکا لگتے ہی اس کے قدم اکھڑ گئے اور وہ لڑکھڑاتا ہوا میری طرف آیا۔ میں نے اس کے چہرے کا نشانہ لے کر اپنے سر کو قدرے نیچے جھکا دیا۔ اور وہ اپنے ہی زور میں میرے سر سے آ ٹکرایا۔ اس ناگہانی تصادم سے میری کھوپڑی بھنا گئی۔ میرا اندازہ تھا کہ اس کی ناک اور پیشانی کی جڑ میں پڑنی والی اس ٹکر نے اسے بھی ہلا کر رکھ دیا ہوگا۔

جسمانی تصادم ہوتے ہی اس نے بید کو ایک طرف پھینک کر مجھے اپنے دونوں ہاتھوں کی گرفت میں دبوچنا چاہا لیکن اس وقت تک میری سرد مزاجی بھی اشتعال میں ڈھل چکی تھی۔ میں نے اپنا بایاں گھٹنا اس کے پیٹ میں اڑا کر اسے پوری قوت سے پیچھے دھکیل دیا۔

ایک غضب ناک غراہٹ کے ساتھ، اس کا بھاری بھرکم وجود پیچھے الٹ کر زمین بوس ہوگیا۔ اور میں نے کسی چیتے کی سی تیزی کے ساتھ اس کے سینے پر سوار ہوکر اس کا گلا دبانا شروع کردیا۔ میری اس کارروائی سے اس کے اوسان خطا ہوگئے۔ اس نے فضا میں ٹانگیں چلا کر میری پشت پر گھٹنے مار کر مجھے نیچے گرانے کی کوششیں کیں جو کامیاب نہ ہوسکیں۔ پھر اس کے ہاتھ میری کلائیوں پر جم گئے۔

میرا ارادہ اس سے الجھنے کا نہیں تھا۔ میں اچھی طرح جانتا تھا کہ اس بستی میں ہر شخص اس کے حکم کا غلام تھا۔ اگر میں وقتی طور پر اسے مار بھی لیتا تو بعد میں اس کے آدمی میرے بدن کا ریشہ ریشہ ادھیڑ سکتے تھے۔ اگر وہ مجھ پر دوسری بار بید سے حملہ نہ کرتا تو شاید اس مار دھاڑ کی نوبت بھی نہ آتی۔

”تم بلاوجہ میرے ساتھ زیادتی کررہے ہو۔“ میں نے ہانپتے ہوئے کہا۔ ”میرا ارادہ تم پر ہاتھ اٹھانے کا نہیں تھا لیکن تم خود ہی مجھ سے لڑ مرنے پر تلے ہوئے ہو۔ میں الگ ہورہا ہوں لیکن اب تمہیں بھی اپنی کھوپڑی پر قابو رکھنے کی کوشش کرنی ہوگی۔“ اپنی بات مکمل کرتے ہی میں اچھل کر اس کے سینے پر سے اتر گیا۔

وہاں جو کچھ ہوا، آناً فاناً میں ہوا۔ جب میں الگ ہورہا تھا تو عبدالرحیم خان کا کلاشنکوف بردار آدمی بھی ہماری آوازیں سن کر دوڑتا ہوا وہاں آپہنچا۔ عبدالرحیم خان زمین سے اٹھا تو اس کے انداز میں تیزی یا کسی قسم کی جارحیت نہیں تھی۔

کلاشنکوف والے نے اپنی مادری زبان میں عبدالرحیم خان سے کچھ پوچھا۔ اس نے جواب میں جھلا کر کچھ کہا اور آنے والا اپنا سا منہ لے کر وہاں سے چلا گیا۔ عبدالرحیم خان نے مجھ سے کچھ کہے بغیر، تنفر آمیز نگاہوں سے مجھے گھورا اور اپنی چارپائی کی طرف چل دیا۔

اس کی خاموشی اور پسپائی سے اندازہ ہورہا تھا کہ اس مختصری جھڑپ کے بارے میں اسے اپنی غلطی کا احساس ہوچکا تھا۔ وہ ہٹ دھرمی پر اتر آتا تو اس وقت صورت حال بہت مخدوش ہوسکتی تھی جس کا نتیجہ میرے حق میں ہرگز خوشگوار نہ ہوتا۔

میں نے فوری طور پر چھوٹے خان کے منہ لگنا مناسب نہیں سمجھا اور خاموشی کے ساتھ کنٹینر میں چڑھ کر، کھلے ہوئے دروازے کے قریب ہی بیٹھ گیا اور سگریٹ پینے میں مصروف ہوگیا۔

چند منٹ کے بعد کلاشنکوف والا اس طرف آیا اور اس نے مجھے اندر جانے کا حکم دینے کے بعد کنٹینر کا دروازہ بند کردیا۔ میری دانست میں اس وقت وہی طریقہ سب سے بہتر تھا۔ عبدالرحیم خان کا غصہ فرو ہونے کے بعد، میں خوشامد در آمد کرکے اسے منا سکتا تھا۔

مجھے چھوٹے خان کی زبانی جو ادھوری بات معلوم ہوئی، وہ اس اعتبار سے بہت حوصلہ افزا تھی کہ ویرا اُن کی قید سے رہا ہونے کے بعد خاموش نہیں بیٹھی تھی۔ بلکہ اس نے میری گلوخلاصی کے لیے اپنی کوششوں کا آغاز کردیا تھا۔ اگر سردار پائندہ گل کو پشاور میں گھیرنے کی کوشش کی گئی تھی تو وہ کام صرف ویرا کے بس کا نہیں تھا۔ اس نے یقینی طور پر اول خان کو پوری صورت حال سے آگاہ کردیا تھا اور شاید اول خان نے اسپیشل ٹاسک فورس کے پشاور میں متعین کسی یونٹ کے ذریعے سردار پائندہ گل پر جال ڈالنے کی کوشش کی تھی۔ اس سے پہلے کہ سردار پائندہ گل سرحد عبور کرکے شنگارا ولی کے محفوظ علاقے میں پہنچتا، اول خان کے آدمیوں نے اسے پشاور میں ہی گھیر لیا تھا۔ عبدالرحیم خان نے جو کچھ بتایا، اس سے یہ ظاہر ہوتا تھا کہ سردار پائندہ گل پکڑا نہیں گیا تھا بلکہ اپنی کسی حویلی میں قلعہ بند ہوکر بیٹھ گیا تھا اور اسپیشل ٹاسک فورس والوں نے اسے باہر آنے کی اجازت دینے کے لیے میری رہائی کی شرط عائد کردی تھی۔

وہ سب کیوں اور کیسے ہوا تھا، یہ بعد کی باتیں تھیں۔ اصل اہمیت اس بات کی تھی کہ میری آزادی کا معاملہ کسی تعطل کا شکار نہیں ہوا تھا بلکہ اس پر پوری سرگرمی کے ساتھ کام جاری تھا۔

تنہائی اور بے کاری کے عالم میں میرا ذہن مسلسل اسی معاملے میں الجھا رہا۔

دوپہر کے وقت کنٹینر کا دروازہ کھولا گیا تو میرا خیال تھا کہ کوئی شخص کھانا لے کر آیا ہوگا لیکن باہر آنے پر میرا عبدالرحیم خان سے سامنا ہوا۔ اُس کے چہرے پر خفگی کے آثار موجود تھے مگر وہ

لڑنے بھڑنے کے موڈ میں نظر نہیں آرہا تھا۔

"مجھے صبح کے واقعے پر گہرا افسوس ہے۔" میں نے اس سے سامنا ہونے پر سنجیدگی سے کہا۔ "جو کچھ ہوا' اس میں میرا قصور نہیں تھا۔ پہل تم نے کی تھی۔ میرے بائیں بازو پر پڑے ہوئے نشان میں ابھی تک درد ہو رہا ہے۔"

"جو ہونا تھا وہ ہوگیا۔ اب اس پر لعنت بھیجو۔ ایسا نہ ہو کہ مجھے دوبارہ غصہ آجائے۔" اس کے لہجے سے جھلاہٹ ٹپک رہی تھی۔ "وہ خبریں ہی کچھ ایسی تھیں کہ میں اپنے غصے پر قابو نہیں رکھ سکا تھا۔ اگر بڑے خان نے سختی کے ساتھ تشدد سے باز رہنے کی دوسری ہدایت نہ بھیجی ہوتی تو میں صبح تمہارا کام ہی تمام کردیتا۔"

"میں سردار پائندہ گل کا شکر گزار ہوں کہ وہ میرا اتنا خیال رکھ رہا ہے۔"

"اس کا تم سے خون کا رشتہ نہیں ہے جو وہ تمہارا خیال رکھ رہا ہے۔" وہ منہ بنا کر بولا۔ "بس بات ہی کچھ ایسی الجھ گئی ہے کہ ہم لوگوں کو صبر سے کام لینا پڑ رہا ہے۔ اب اندر کیا کر رہے ہو؟ باہر آؤ۔ مجھے تم سے بات کرنی ہے۔"

میں کنٹینر سے کود کر نیچے آگیا اور اس کے ساتھ اس کی چارپائی کی طرف چل دیا جس پر سے بستر لپیٹ کر پائنتی کی طرف سمیٹ دیا گیا تھا۔ عبدالرحیم خان کی سالخوردہ کرسی بھی اس کے قریب ہی پڑی ہوئی تھی۔

"تمہیں پشاور کی حویلی کے بارے میں کہاں سے خبر ملی تھی؟" میں نے چارپائی پر بیٹھنے کے بعد دوستانہ لہجے میں سوال کیا۔ عبدالرحیم خان مجھ سے پہلے کرسی پر براجمان ہوچکا تھا۔

"سردار بابا نے کراچی فون کیا تھا۔ وہیں سے ایک آدمی اس کا پیغام لایا تھا۔ تمہارے ساتھیوں نے سردار بابا کا پیچھا کرکے اچھا نہیں کیا ہے۔ وہاں کسی بھی وقت خونریز لڑائی شروع ہوسکتی ہے۔ وہ کون لوگ ہیں جو اتنی تیزی کے ساتھ سردار بابا تک پہنچنے میں کامیاب ہوگئے؟ تمہارے تو سارے ہی آدمی کراچی میں مارے یا پکڑے گئے تھے پھر یہ نئے حمایتی کہاں سے پیدا ہوگئے؟" اس کے بشرے پر فکرمندی کے آثار نمایاں تھے۔

"میں اس بارے میں تمہاری ہی طرح لاعلم ہوں۔ مجھے حیرت ہے کہ کل تم نے مجھ پر ہاتھ ڈالا اور شاید کل ہی ان لوگوں نے سردار پائندہ گل کو ڈھونڈ نکالا......"

"اس میں کوئی کمال کی بات نہیں ہے۔" اس نے میری بات کاٹ کر کہا۔ "آدھا پشاور بابا کو جانتا ہے۔ وہ برسوں سے وہاں ایک معزز سردار کی حیثیت سے مشہور ہے۔ بہت سے لوگ اس کے آنے جانے کے پروگرام سے باخبر رہتے ہیں۔ اس سفید عورت نے ساری خبریں تمہارے ان دونوں ساتھیوں تک پہنچائی ہوں گی جو شہر کے ایک فلیٹ میں رہ رہے ہیں۔ باقی بندوبست ان دونوں نے ہی کیا ہوگا۔"

"تم جانتے ہو کہ اسلام آباد سے آنے کے بعد میرا اپنے کسی آدمی سے کوئی رابطہ نہیں ہوا۔"

"یہ ان دونوں کی ہی شرارت ہے۔" یک بیک اس کی آنکھوں میں چمک پیدا ہوگئی۔ "تمہارا کھوج لگانے کے لیے ہم نے ان کا پیچھا کرنا شروع کیا تب بھی کچھ لوگ ہمارے مقابلے پر آگئے تھے۔ یہ وہی آدمی ہوسکتے ہیں۔"

میں نے دل ہی دل میں اس کی قیاس آرائی کی داد دیتے ہوئے کہا۔ "یہ بھی ممکن ہے۔ ہوائی جہاز کے ذریعے دو تین گھنٹے میں پشاور پہنچنا کوئی مسئلہ نہیں ہے۔ وہ جو کوئی بھی ہیں' میری حمایت اور ہمدردی میں ہی حرکت میں آئے ہیں۔ یہ بتاؤ کہ اس بارے میں تمہارے بڑے خان کے کیا ارادے ہیں اور مجھے شنگارا ویلی کب تک روانہ کیا جائے گا؟"

وہ چند ثانیوں تک خاموشی سے میری طرف دیکھتا رہا پھر پست آواز میں بولا۔ "فی الحال تمہیں شنگارا ویلی نہیں بھیجا جائے گا۔ سردار بابا نے اگلی ہدایت آنے تک تمہیں کراچی میں ہی روکے رکھنے کا حکم دیا ہے اور تمہاری دیکھ بھال پر بھی بہت زور دیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ صبح تم میرے ہاتھوں قتل ہونے سے محفوظ رہے۔"

"میری خاص دیکھ بھال میں بڑے خان کو کیا دلچسپی ہوسکتی ہے؟" میں نے تجسس آمیز لہجے میں پوچھا۔

"ہم لوگ روایات کے پابند ہوتے ہیں۔ اب تم ہمارے یرغمالی ہو۔ تاوان وغیرہ کے لیے اغوا کیے ہوئے لوگوں کی ہم مہمانوں سے زیادہ دیکھ بھال کرتے ہیں تاکہ ہماری شرائط پوری ہونے کے بعد انہیں آزادی ملے تو وہ اور ان کے عزیز ہم سے کوئی شکوہ شکایت نہ کرسکیں۔ معلوم ہوتا ہے کہ سردار بابا نے ان لوگوں کے سامنے اپنی کوئی شرط رکھ دی ہے۔ وہ پوری ہوگی تو تمہیں آزاد کردیا جائے گا۔"

"سردار پائندہ گل کو اپنے بائیس لاکھ روپے کے علاوہ اور کیا درکار ہوسکتا ہے؟"

"بائیس لاکھ یا چار کلو چار سو گرام ہیروئن کی واپسی۔ میرا بھی یہی خیال ہے کہ سردار بابا نے ان لوگوں کے سامنے تمہاری آزادی کی یہی قیمت مقرر کی ہوگی۔" اس نے کسی ابہام کے بغیر پوری بات کھول دی۔

"ان لوگوں کا اس مسئلے سے کیا واسطہ؟ یہ بات چیت تو میرے ساتھ چل رہی تھی۔"

"اصل بات یہی ہے۔ جب تک تم لاوارث تھے' سردار بابا کا جھگڑا تمہارے ساتھ تھا۔ تم رقم یا مال نہ لوٹاتے تو زندگی بھر سردار بابا کی غلامی کرنے پر مجبور کردیئے جاتے۔ اب تمہارے وارث یا ہمدرد سامنے آگئے ہیں تو تم یرغمالی بن گئے ہو۔ ہمارا مطالبہ ان کے سر پڑ گیا ہے۔ سردار بابا کے لیے یہ عزت کا سوال بن گیا ہے۔ وہ عمر بھر پشاور کی حویلی میں محصور رہنا گوارا کرلے گا لیکن شرائط پوری

ہونے سے پہلے تمہیں آزاد نہیں کرے گا۔ تمہارے لیے خوشی کی بات یہ ہے کہ اب تمہیں کوئی اذیت نہیں دی جائے گی۔ تم ہماری تحویل میں مرے تو تشدد سے نہیں بلکہ اپنی فطری موت مرو گے۔ یرغمالیوں پر عام طور تشدد کرنا ہماری روایات کے منافی ہے اور ہم لوگ اپنی صدیوں پرانی ایسی ہی روایات کے سہارے اپنے سر غرور سے اونچے رکھتے ہیں۔"

میں نے محسوس کیا کہ میرے ساتھ ہونے والے تصادم کو بھول کر میرے ساتھ اس تفصیلی گفتگو میں بھی عبدالرحیم کی قبائلی روایت پرستی کا نمایاں دخل تھا ورنہ وہ مجھ سے اپنی بے عزتی کا بدلہ ضرور لیتا۔

"یہ بھی تو ہوسکتا ہے کہ میری حمایت میں میدان میں اترنے والے سرکاری اہلکار ہوں......"

اُس نے مجھے اپنی بات پوری کرنے کا موقع دیئے بغیر بولنا شروع کردیا۔ "ان کے طور طریقے سرکاری آدمیوں والے نہیں ہیں۔ اور اگر وہ سرکاری آدمی بھی ہوں تو اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ ہمارے ساتھ معاملات ہمارے ہی رسوم و رواج کے مطابق طے کرنے پڑتے ہیں۔ اس میں کسی سے کوئی رعایت نہیں کی جاتی۔"

"اور اگر ان لوگوں نے بڑے خان کا مطالبہ تسلیم کرنے سے انکار کردیا؟" میں نے پوچھا۔

"شرائط پر کچھ نہ کچھ بات چیت ہوسکتی ہے لیکن وہ سرے سے انکاری ہوگئے تو وہ تمہاری زندگی کا آخری دن ہوگا۔ ایسی ہٹ دھرمی کا انجام ایک سربریدہ لاش کی صورت میں منظرِعام پر آتا ہے۔"

"ایسی کوئی صورت ہے کہ میں اپنے آدمیوں سے فون پر رابطہ کرسکوں؟" میں نے سوچتے ہوئے سوال کیا۔

"تم قیدی کے بجائے یرغمالی بن گئے ہو اس لیے تمہیں اس خیمہ بستی سے کہیں اور منتقل کردیا جائے گا۔ وہاں فون بھی ہوگا لیکن سردار بابا کی اجازت کے بغیر تمہیں کسی سے بات نہیں کرنے دی جائے گی۔"

"میرا معاملہ اتنا سیدھا نہیں ہے۔" میں نے رسانیت سے اسے سمجھاتے ہوئے کہا۔ "تم نے صرف مجھے ہی یرغمالی نہیں بنایا ہے بلکہ میرے نامعلوم حمایتیوں نے سردار پائندہ گل کا محاصرہ بھی کیا ہوا ہے۔ اگر تم نے ان لوگوں کے انکار کے بعد میری گردن کاٹ دی تب بھی معاملہ وہیں ختم نہیں ہوگا۔ وہ لوگ سردار پائندہ گل کو نقصان پہنچانے پر تلے رہیں گے۔ اگر انہیں میرے قتل کی بھنک بھی مل گئی تو تم اندازہ کرسکتے ہو کہ بات کہاں تک جائے گی۔"

اس کی آنکھوں میں فکرمندی تیرنے لگی۔ "شاید اس بارے میں کسی نے نہیں سوچا ہے۔"

"اسی لیے میں اپنے آدمیوں سے رابطہ کرنا چاہتا ہوں۔ میں انہیں ہدایت دوں گا کہ وہ رشوت دے کر تمہاری ہیروئن حاصل کرنے کی کوشش کریں۔ راشی اہل کار اس کی جگہ کوئی بھی ہم رنگ سفوف رکھ کر قصہ نمٹا دیں گے۔ ایسا نہ کیا گیا تو ہم مر کر بھی بائیس لاکھ روپے پیدا نہیں کرسکیں گے۔"

"تمہاری بات دل کو لگتی ہے لیکن سردار بابا کے اپنے اصول ہیں۔ اس کی اجازت کے بغیر تم کسی کو فون نہیں کرسکتے۔" وہ پُرخیال انداز میں بولا۔ "شہر میں تمہاری نگرانی اور دیکھ بھال کرنے والے دوسرے لوگ ہیں' لیکن میرا خیال ہے کہ اب مجھے بھی یہ ڈیرا چھوڑ کر تمہارے ساتھ جانا ہوگا تاکہ میں فون پر سردار بابا کو پوری بات سمجھا سکوں۔ سردار بابا کو تمہاری زندگی یا موت سے کوئی دلچسپی نہیں ہے۔ وہ اپنی رقم یا مال کی واپسی چاہتا ہے۔ ہوسکتا ہے کہ یہ مقصد پورا کرنے کے لیے وہ تمہیں کوئی رعایت دینے پر بھی آمادہ ہوجائے۔"

میری اور اس کی وہ تمام گفتگو شطرنج کے کھیل کی طرح تھی۔ دونوں فریق اپنا دامن بچاتے ہوئے' دوسرے کو گھیرنے کی کوششوں میں مصروف تھے۔ دونوں ایک دوسرے کا مقصد اچھی طرح سمجھتے ہوئے بھی اس طرف سے انجان بنے ہوئے تھے لیکن آخری نکات طے ہوجانے کے بعد مجھے احساس ہو رہا تھا کہ میں چھوٹے خان کو اپنے جال میں پھانسنے میں کامیاب ہوگیا تھا۔

ہم دونوں باتوں میں مصروف تھے کہ کھانے کا وقت ہوگیا۔ اس بار سبزی اور گوشت کی باری تھی۔ کولر میں تازہ برف کے ڈلے ڈال کر پانی کو ٹھنڈا کرنے کا اہتمام کیا گیا تھا۔ گیس کے تندور سے نکلی ہوئی گرم گرم روٹیاں اشتہا انگیز تھیں۔ میں نے چھوٹے خان کے ساتھ شکم سیر ہوکر کھانا کھایا۔ پھر یہ دیکھ کر میری طبیعت خوش ہوگئی کہ کھانے کے خالی برتن لے جانے والا بھاپ اُڑاتی ہوئی چائے کے مگ لے کر واپس آیا تھا۔

اس نے نیا اور بڑا مگ عبدالرحیم خان کے حوالے کیا۔ میلا اور چھوٹا مگ مجھے تھما دیا۔ گرم گرم چائے کا پہلا گھونٹ لیتے ہی مجھے پُرخوری کے ہلکے ہلکے سے سرور کا احساس ہوا۔ عبدالرحیم خان کی گفتگو یک بیک ہی کچھ زیادہ پُرجوش اور دلچسپ محسوس ہونے لگی۔

آدھی پیالی خالی ہونے پر جب میرا سر بھاری ہونے لگا تو مجھے پہلی بار کسی گڑبڑ کا احساس ہوا۔

"میرا سر گھوم رہا ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ چائے میں کوئی چیز ملائی گئی ہے۔" میں نے اپنا مگ ایک طرف رکھتے ہوئے بھرائی ہوئی آواز میں کہا۔

عبدالرحیم خان کے ہونٹوں پر ہلکی سی استہزائیہ مسکراہٹ عود کر آئی۔ "مجبوری تھی۔ تمہیں یہاں سے بحفاظت دوسری جگہ منتقل کرنے کے لیے تمہارا بے ہوش کیا جانا ضروری تھا۔ تم فکر نہ کرو۔ یہ خواب آور گولیاں تیز ضرور ہیں۔ لیکن تمہیں کوئی نقصان

نہیں پہنچائیں گی۔"

"یہ تم نے برا کیا۔" بولتے ہوئے میری زبان لڑکھڑانے لگی تھی۔ "میں تمہارے ساتھ ہر طرح تعاون کر رہا تھا۔"

عبدالرحیم خان نے کوئی جواب نہیں دیا۔ بس دلچسپی کے ساتھ میری طرف دیکھتا رہا۔

چائے میں جو گولیاں حل کی گئی تھیں وہ بے ذائقہ ہونے کے ساتھ ہی بہت سریع الاثر تھیں۔ گڑبڑ کا احساس ہونے کے بعد میں نے چائے نوشی کا سلسلہ یکسر ترک کردیا لیکن ان گولیوں کی جو مقدار میرے معدے میں منتقل ہوچکی تھی' وہ میرے اعصاب کو بے حال کیے دے رہی تھی۔ چند منٹوں کے قلیل سے عرصے میں میرا چارپائی پر بیٹھے رہنا دشوار ہوگیا اور میں بے طرح وہیں ڈھیر ہوگیا۔

مجھے دوبارہ ہوش آیا تو ویرانے میں بسی ہوئی' افغان مہاجرین کی خیمہ بستی تھی' نہ عبدالرحیم خان کی کھردری چارپائی۔ میں ایک پختہ دیوار والے کمرے میں آرام دہ مسہری کے گدے پر دراز تھا اور میرے سر پر ایک پنکھا تیزی کے ساتھ گردش کر رہا تھا۔ میں نے اپنی گردن گھما کر جائزہ لیا تو کمرے سے نکاسی کے دونوں دروازے بند تھے۔

بے ہوشی کی دوا سریع الاثر ہونے کے ساتھ ہی اعصاب شکن بھی تھی۔ میں ہوش میں آنے کے بعد بھی کافی دیر تک اس قابل نہ ہوسکا کہ بستر سے اٹھ سکوں۔ مجھے اپنا بدن ٹوٹتا ہوا محسوس ہو رہا تھا اور سر گھوم رہا تھا۔ میں اپنی ساری قوتوں کو مجتمع کرنے کے بعد بستر سے اٹھا تو پہلے دروازے پر طبع آزمائی کرتے ہی میں نے خود کو باتھ روم کے سامنے پایا۔ میں نے اندر جا کر اپنے منہ پر ٹھنڈے پانی کے چند چھپکے مارے اور باہر آکر دوسرے دروازے کی طرف بڑھ گیا۔

اس دروازے پر میری کوششیں بار آور نہ ہوسکیں۔ دروازہ مقفل تھا۔ اضطراری طور پر ہینڈل گھمانے کی آوازوں کے جواب میں باہر سے عبدالرحیم خان کی آواز سنائی دی۔ "ٹھہر جاؤ! دروازہ نہ توڑ دینا۔ میں ابھی تالا کھولتا ہوں۔ دروازہ مقفل ہے۔"

وہ شاید بیرونی راہداری یا لابی میں پڑا' میرے ہوش میں آنے کا انتظار کر رہا تھا۔

دروازے کے ہضمی قفل میں چابی گھومنے کی آواز کے ساتھ ہی دروازہ کھل گیا اور عبدالرحیم خان بالکل بدلے ہوئے روپ میں میرے سامنے آموجود ہوا۔ شہر کے بے فکرے نوجوانوں کی طرح' اس کے بدن پر رنگین ٹی شرٹ اور نیلی جینز منڈھی ہوئی تھی۔

"تمہاری دی ہوئی گولیوں نے مجھے کھوکھلا کر کے رکھ دیا ہے۔" میں نے اس کے سراپا کا جائزہ لیتے ہوئے' شکایتی لہجے میں کہا۔ "میرے لیے چند قدم بھی چلنا دشوار ہوگیا ہے۔"

"ایک دو گھنٹے میں تم بالکل نارمل ہوجاؤ گے۔" وہ شوخ مسکراہٹ کے ساتھ بولا۔ "خدا کا شکر ادا کرو کہ اس بے ہوشی کے نتیجے میں تم تپتے ہوئے آہنی کنٹینر سے اس آرام دہ کمرے میں منتقل ہوگئے ہو۔"

"میں اپنے آدمیوں سے کب تک رابطہ کرسکوں گا؟" میں نے پُرامید لہجے میں پوچھا۔

"فی الحال انہیں بھول جاؤ۔ سردار بابا کا خیال ہے کہ تم نے اشارے کنائے میں انہیں کچھ سمجھا دیا تو ہمارے لیے یہ پیچیدہ صورتِ حال قابو سے باہر ہوسکتی ہے۔ اس نازک موڑ پر تمہیں کسی سے رابطہ کرنے کی اجازت نہیں دی جاسکتی! البتہ سردار بابا تم سے ضرور بات کرنا چاہتا ہے۔"

"یہ میری خوش قسمتی ہوگی۔" میں نے برجستہ کہا۔ "میں ابھی اور اسی وقت تیار ہوں۔"

عبدالرحیم خان ذو معنی انداز میں مسکرایا اور بولا۔ "ذرا اپنی حالت اعتدال پر آنے دو۔ تمہاری زبان پر لکنت طاری ہے۔ پانچ منٹ کی ایس ٹی ڈی کال بلاوجہ دس منٹ کی ہوجائے گی۔ فون کال کے دام ویسے ہی بہت بڑھے ہوئے ہیں۔ ہم آمدنی بڑھانے کے ساتھ اخراجات پر بھی سخت کنٹرول رکھتے ہیں۔"

"اچھی بات ہے۔" میں نے لمحہ بھر کے لیے توقف کیا پھر کہا۔ "مجھے اپنے ساتھیوں سے بات کرنے کی اجازت نہیں ہے لیکن تم تو ان سے بات کرسکتے ہو۔ میں ان کی کچھ خیر خبر معلوم کرنی چاہتا ہوں۔"

"ان کی خبر لینے کے لیے چار آدمی بھیجے جاچکے ہیں۔" اس نے استہزائیہ انداز میں کہا۔ "ہماری کوشش یہ ہے کہ پشاور میں کوئی گڑبڑ شروع ہونے سے پہلے تمہارے تینوں ساتھیوں کو تمہارے پاس لے آئیں۔"

"تینوں کون؟" میں غیرارادی طور پر اس سے سوال کر بیٹھا کیونکہ اس وقت میرے ذہن میں غزالہ اور سلطان شاہ کے نام ہی گونج رہے تھے۔

"تمہاری بیوی' اس کا بھائی اور سفید فام عورت۔" عبدالرحیم خان نے وضاحت کی۔ "ان تینوں کے قابو میں آجانے کے بعد مذاکرات میں ہماری پوزیشن بہت مضبوط ہوجائے گی۔ سردار بابا کے حکم پر جب اس گوری عورت کے بدن کے ٹکڑے محاصرہ کرنے والوں کو بھیجے جائیں گے تو وہ اپنی چوکڑی بھول جائیں گے۔"

"لیکن تم مجھے یہ سب کیوں بتا رہے ہو؟" میں وہ تفصیل سن کر پراگندہ ہوگیا تھا۔

"اپنا دل خوش کرنے کے لیے۔" وہ بولا۔ "تم ہمارے یرغمالی ہو اور ہمارا کچھ نہیں بگاڑ سکتے لیکن تمہیں یہ سب سنا کر میرے دل کو سکون مل رہا ہے۔ ہوسکتا ہے کہ رات تک تم سب یکجا ہوجاؤ۔"

"تم آگ سے کھیل رہے ہو۔" میں نے اسے ڈرانا چاہا۔ "وہ تینوں اتنے بے بس اور مجبور نہیں ہیں۔ ان کی حفاظت کرنے والے تمہارے آدمیوں کو میدان چھوڑ کر بھاگنے پر مجبور بھی کرچکے ہیں۔"

"ہم نے فرض کرلیا ہے کہ وہ سب لوگ کراچی چھوڑ کر پشاور جاچکے ہیں۔ ان میں سے ایک آدھ یہاں موجود بھی ہوا تو وہ کسی بے بس چوہے کی طرح مار لیا جائے گا۔"

میں نے جواب میں کچھ کہنا مناسب نہیں سمجھا۔ میں اسے کیا بتاتا کہ ہماری حمایت پر کوئی چھوٹا موٹا گروہ نہیں بلکہ اسپیشل ٹاسک فورس کی منظم اور طاقتور نفری تھی جو کراچی میں اپنی طاقت کو کمزور کیے بغیر' پشاور میں سردار پائندہ گل کی سرکوبی کا بندوبست کرسکتی تھی۔

اس مکان کی ساخت سے یہ اندازہ ہو رہا تھا کہ وہ شہر کے کسی پُرسکون علاقے کا ایک کشادہ فلیٹ تھا جس میں شہری سہولتوں کی فراوانی تھی۔ اس فلیٹ میں عبدالرحیم خان کے علاوہ مزید دو نفوس موجود تھے۔ ان میں سے ایک' مہذب اور تعلیم یافتہ لیکن قوی ہیکل افغان تھا لیکن دوسری شخصیت کے سامنے آنے پر میں بوکھلا کر رہ گیا۔ وہ جنت گل تھی۔ عبدالرحیم خان کی کابلی محبوبہ جو اسی فلیٹ میں رہ رہی تھی۔

کشیدہ قامت' سبک اندام' گوری رنگت' تیکھے نقوش' سیاہ اور بڑی بڑی آنکھیں' گھنی اور دراز زلفیں' یاقوتی لب اور متناسب اعضا سمیت کیا تھا جو اس پری پیکر میں نہیں تھا۔ اس کی شخصیت اتنی دلکش اور مسحور کن تھی کہ وہ سامنے آئی تو میں اسے دیکھتا ہی رہ گیا۔

"تم واقعی خوش نصیب ہو جو تمہیں جنت گل جیسی لڑکی ملی ہے۔" میں نے عبدالرحیم خان سے مخاطب ہو کر اس لڑکی کو خوش کرنے کی نیّت سے کہا۔ "میں نے ایسا ملکوتی حسن اور ساحرانہ پیکر اپنی زندگی میں پہلی بار دیکھا ہے۔"

"یہ قیدی جھوٹا اور خوشامدی معلوم ہوتا ہے۔" جنت گل نے پاگل کردینے والی دل نشین مسکراہٹ کے ساتھ انگریزی میں کہا تو مجھے یوں محسوس ہوا جیسے فضا میں متعدد نقرئی گھنٹیاں بج اٹھی ہوں۔

"یہ تم کیا کہہ رہی ہو؟" میں نے حیرت اور صدمے کے ساتھ کہا۔ "یہ حقیقت ہے کہ تم یورپ میں ہوتیں تو دس پانچ برس تک کوئی تمہیں ملکۂ حسن کا اعزاز جیتنے سے نہیں روک سکتا تھا۔"

"میرا بھی یہی خیال ہے۔" عبدالرحیم خان نے مسکراتے ہوئے کہا۔ "لیکن جنت گل میری باتوں کا اعتبار نہیں کرتی۔ یہ سمجھتی ہے کہ میں اسے بے وقوف بنا رہا ہوں۔"

"اس کی انگریزی بھی شاندار بلکہ قابلِ رشک ہے۔ یہ ہر اعتبار سے عالمی ملکۂ حسن کا اعزاز جیتنے کی حقدار بنتی ہے۔" اس بار میں نے غور سے جنت گل کے سراپا کا جائزہ لیتے ہوئے کہا کیونکہ موضوع گفتگو کی نسبت سے مجھے آوارہ نگاہی کا ایک خوشگوار موقع میسّر آگیا تھا۔

"اس کی انگریزی پر نہ جاؤ۔" عبدالرحیم خان والہانہ انداز میں جنت گل کی پشت پر ہاتھ پھیرتے ہوئے بولا۔ "اس نے کابل کے امریکن اسکول میں تعلیم حاصل کی ہے اس لیے اپنی مادری زبان کے علاوہ صرف انگریزی پر عبور رکھتی ہے۔ اردو سمجھ ضرور لیتی ہے لیکن بولنا اس کے بس سے باہر ہے۔ اسے بتاؤ کہ ولایت میں شادی سے پہلے' کورٹ شپ کے دوران میں کیا کیا ہوتا ہے....."

میرے لیے وہ سنہرا موقع تھا۔ میں نے درمیان سے ہی اُس کی بات اچک لی اور ہلکا سا قہقہہ لگاتے ہوئے کہا۔ "بہت زیادہ بتانے کی ضرورت ہی نہیں ہے۔ بچے نہیں ہوتے' اس کے علاوہ کورٹ شپ میں سب کچھ ہوتا ہے اور بعض اوقات برسوں ہوتا رہتا ہے۔ چند برسوں سے تو یہ پابندی بھی ختم ہوگئی ہے۔ ایسے تمام بچے اپنی کنواری ماؤں کے نام پر ساری سہولتوں کے حقدار قرار پاتے ہیں اور کوئی ان کی ولدیت کے بارے میں کوئی سوال نہیں کرتا۔ یہ سب......"

میری باتوں کے درمیان' جنت گل کا سرخ و سفید چہرہ حیا سے سرخ ہوگیا' اس کی گھنی پلکیں اس کی غزالی آنکھوں پر بوجھل ہو کر جھکتی چلی جا رہی تھیں۔ اس نے مجھے اپنی بے حجابانہ گفتگو پوری کرنے کا موقع دیے بغیر' پھنسی پھنسی آواز میں کہا۔ "ہوتا ہوگا مجھے یہ سب بتانے کی ضرورت نہیں۔ میں ایسی بے ہودہ باتوں سے بے خبر رہنے کو ہی بہتر سمجھتی ہوں۔" بظاہر وہ مجھ سے کہہ رہی تھی لیکن اس کی ملامت آمیز نظریں عبدالرحیم خان کی طرف اٹھی ہوئی تھیں۔ اپنی بات پوری کر کے وہ بَل کھا کے پلٹی اور لہراتی ہوئی وہاں سے چلی گئی۔

"تم نے اسے ناراض کردیا۔" عبدالرحیم خان نے ایک گہرا سانس لے کر کہا۔ "یہ مجھ سے شادی کرنا چاہتی ہے مگر اس کا باپ پانچ لاکھ روپے کا مطالبہ کر رہا ہے۔ اگر تمہارا قصہ خوش اسلوبی سے نمٹ گیا تو شاید سردار بابا خوش ہو کر مجھے رقم دے دے ورنہ یہ چکنی مچھلی کی طرح' ہر بار اسی طرح پھسل کر نکل جاتی ہے۔ امریکن اسکول کی تعلیم بھی اس کے حیا اور آبرو کے تصور کو کمزور نہیں کرسکی ہے۔"

"میں نے تمہارے ایما پر تمہاری مدد کرنے کی کوشش کی تھی۔" میں نے اپنی صفائی پیش کرتے ہوئے کہا۔ "بالغ لوگوں کے درمیان ایسی باتیں ہوتی ہی رہتی ہیں......"

"تمہارا کوئی قصور نہیں۔" اس نے فوراً ہی مجھے بری الذّمہ کردیا۔ "وہ میرے ساتھ رہتی ہے۔ میں اس سے دنیا جہان کی باتیں کرتا ہوں لیکن جب بات نازک مرحلے میں داخل ہوتی ہے تو وہ اسی طرح اچٹ جاتی ہے میرے لیے یہ کوئی نئی بات نہیں ہے۔"

"بہرحال تم خوش قسمت ہو کہ تمہیں اس قدر حسین لڑکی کی خوشنودی حاصل ہے۔ میرے بس میں ہوتا تو میں اسی وقت تمہیں پانچ لاکھ روپے دے دیتا۔" مجھے اندازہ تھا کہ میری آواز جنت گل کے کانوں تک پہنچ رہی ہوگی۔ اس لیے میں اس کی تعریف و توصیف کرنے کے ہر موقع سے بھرپور فائدہ اٹھا رہا تھا۔

اسی وقت فلیٹ کے کسی اندرونی کمرے سے ٹیلی فون کی گھنٹی کی آواز سنائی دی اور عبدالرحیم خان ان مذاکرات کو ادھورا چھوڑ کر تیزی کے ساتھ باہر نکلتا چلا گیا۔

میں مسہری پر دراز ہو کر مکارانہ انداز میں اپنا منہ چلانے لگا۔ حقیقت یہ ہے کہ ان بدترین حالات میں گھرا ہوا ہونے کے باوجود' جنت گل کے حسن و شباب نے میرے دل و دماغ میں ہلچل مچا دی تھی اور میں عبدالرحیم خان کی اس محبوبہ کو تسخیر کرنے کے امکانات پر غور کرنے پر مجبور ہو گیا تھا۔

چھوٹا خان فون سننے کے کافی دیر بعد میرے کمرے میں آیا تو اُس کے چہرے سے غصے اور جھلاہٹ کے آثار نمایاں تھے اور وہ فرش پر ٹھوکریں مار کر چل رہا تھا۔

میں خاموشی کے ساتھ اس کا جائزہ لیتے ہوئے' سیدھا ہو کر بیٹھ گیا۔

"معلوم ہوتا ہے کہ تمہارا بُرا وقت آ ہی گیا ہے۔" وہ ایک کرسی پر بیٹھ کر مجھے گھورتے ہوئے بولا۔

"میں نے ہتھیار ڈالے ہوئے ہیں اور جو تم چاہ رہے ہو' وہی کر رہا ہوں۔"

"تمہارے آدمی حرام زادے ہیں۔" وہ اپنی دونوں مٹھیاں بھینچ کر غرّایا۔ "تھوڑی دیر پہلے انہوں نے ہمارے ایک آدمی کو ہلاک کر دیا ہے۔"

"کہاں؟" میں نے اضطراری لہجے میں پوچھا۔ مجھے وہ خبر سن کر تقویت کا احساس ہوا تھا۔

"کراچی میں جو لوگ تمہارے تینوں ساتھیوں کی نگرانی کے لیے گئے تھے' ان پر چھپ کر حملہ کیا گیا ہے۔ اس خوں ریزی کا نتیجہ کچھ بھی نکل سکتا ہے جو تمہارے حق میں اچھا نہیں ہوگا۔"

میں نے اسے یہ یاد دلانا ضروری نہیں سمجھا کہ اس کے آدمی کسی خیرسگالی کے ارادے سے نہیں گئے تھے بلکہ وہ ان تینوں کو بھی پکڑ کر وہیں لانے کے مذموم عزائم رکھتے تھے۔ میرے لیے یہ خوشی کی بات تھی کہ اسپیشل ٹاسک فورس والوں نے پشاور میں چھیڑ چھاڑ کا سلسلہ شروع کرنے کے ساتھ ہی غزالہ اور اس کے ساتھیوں کو نظرانداز نہیں کیا تھا۔ سردار پائندہ گل کے آدمیوں کے کسی جوابی اقدام کے پیشِ نظر' ان تینوں کی بھی مناسب حفاظت کی جا رہی تھی۔

"مقابلوں میں دونوں طرف سے لاشیں گرا ہی کرتی ہیں۔" میں نے پُرسکون رہتے ہوئے کہا۔ "ہر فریق کو لڑائی میں اپنی حفاظت کرنے کا حق حاصل ہوتا ہے۔ اور میں تو تمہاری قید میں ہونے کی وجہ سے بالکل ہی ناکارہ ہو کر رہ گیا ہوں۔ ان واقعات سے میرا کوئی تعلق نہیں ہے۔"

"دیکھنا پڑے گا کہ سردار بابا اس بارے میں کیا فیصلہ کرتا ہے۔" وہ اپنا سر جھٹکتے ہوئے بولا۔ "میرے ساتھ آؤ' میں اس کو فون کروں گا۔ ہو سکتا ہے کہ وہ تم سے بھی بات کرنا چاہے۔"

میں اس کے ساتھ لابی سے گزر کر نیم آراستہ ڈرائنگ روم میں پہنچا تو وہاں جنت گل بڑی شان سے ایک صوفے پر بیٹھی کوئی انگریزی رسالہ پڑھ رہی تھی۔ جوں ہی اس نے میری طرف دیکھا' میں نے عبدالرحیم خان کی نظر بچا کر اسے آنکھ ماری۔ اس نے ہونٹ سکوڑ کر برا سا منہ بنایا اور پھر سٹپٹا کر اپنے سامنے والی دیوار کو دیکھنے لگی۔ اس نے میری حرکت کے بارے میں چھوٹے خان کو ہوا تک نہیں لگنے دی تھی جو حوصلہ افزا بات تھی۔ اگر وہ میری شکایت کر بھی دیتی تو میں نے سوچ لیا تھا کہ اپنی آنکھ میں کچھ پڑ جانے کا عذر کر کے ان دونوں سے معافی مانگ لوں گا لیکن جنت گل نے خاموش رہ کر میرا حوصلہ بڑھا دیا تھا۔

عبدالرحیم خان وہاں موجود ایکسٹینشن پر پورے انہماک سے پشاور والی حویلی کا نمبر ملانے میں مصروف تھا تو میں پوری توجہ سے جنت گل کے حسین و جمیل سراپا پر نظریں جمائے بیٹھا تھا۔ وہ میری چبھتی ہوئی' حریصانہ نگاہوں سے مضطرب ہونے کے باوجود مجھ سے نظریں چُرا رہی تھی اور یوں ظاہر کر رہی تھی جیسے اسے میری حرکات کا علم ہی نہ ہو۔ لیکن میں اس کے تجاہلِ عارفانہ کو خوب سمجھ رہا تھا۔ وہ اتنی ہی پارسا اور راست باز ہوتی تو وہاں سے اٹھ کر بھی جا سکتی تھی کیونکہ اس کی وہاں موجودگی کسی بھی اعتبار سے ضروری نہیں تھی۔ وہ وہیں بیٹھی بار بار پہلو بدل رہی تھی اور میں اس کے بدن کے بدلتے ہوئے زاویوں سے اپنی آنکھیں سینک رہا تھا۔

سلسلہ مل جانے پر عبدالرحیم خان نے فون پر اپنی مادری زبان میں گفتگو شروع کر دی۔ میں اس زبان سے یکسر نابلد تھا اس لیے عبدالرحیم خان کی گفتگو پر دھیان دیئے بغیر' جنت گل کی بے چینی سے لطف اندوز ہوتا رہا۔ میں نے اندازہ لگایا کہ چھوٹے خان سے منسوب ہونے کے باوجود وہ کابلی حسینہ اپنی انا کی آگ میں دھیمے دھیمے سلگ رہی تھی۔ اس کے حسین و جمیل سراپا میں بھی جذبوں کی دھنک پھیلی ہوئی تھی لیکن کسی پیش رفت میں اس کا قبائلی وقار مانع تھا۔ دوسری طرف عبدالرحیم خان جیسا سعادت مند عاشق تھا جو شاید اجازت کے بغیر اپنی محبوبہ کے بدن کو چھونا بھی گناہ سمجھتا تھا اور اجازت کے حصول کے لیے پانچ لاکھ روپے کی خطیر رقم جمع کرنے کی کوششوں میں لگا ہوا تھا۔ اسے یہ اندازہ ہی نہیں تھا کہ عاشقی کی خلوت میں جام اسی کا ہوتا ہے جو خود بڑھ کر اسے اٹھا لے۔ جو لوگ دعوت اور پیشکش کے انتظار میں بیٹھے رہتے ہیں' آخر تک تشنہ کام اور مایوس رہتے ہیں۔

میری نگاہوں کی وہ دلکش تیراندازی خاصی دیر تک جاری رہی کیونکہ چھوٹا خان فون پر مسلسل بول رہا تھا۔ اس دوران میں صرف ایک بار ایسا ہوا کہ جنت گل نے میری طرف دیکھا اور مجھے ڈھٹائی کے ساتھ اپنی جانب نگراں پا کر' مجھے منہ چڑایا اور لمحہ بھر میں دوسری طرف متوجہ ہو گئی۔ میں اُس کی اس حرکت پر دل ہی دل میں ہنس کر رہ گیا۔

وہ سرکش حیوانی جذبوں کی خاموش جنگ تھی جو عبدالرحیم خان کی ناک کے نیچے' مگر اس کی لاعلمی میں جاری تھی۔ بات صرف اتنی تھی کہ میں جنت گل کی دکھتی رگ کو پہچان چکا تھا اور وہ میری دلچسپی سے اچھی طرح آگاہ ہو چکی تھی جب کہ چھوٹا خان عورتوں کا مزاج شناس تھا نہ کسی کا کشتۂ ستم۔ اس بے چارے کو اندازہ ہی نہیں ہو سکا کہ کابل کی سلطنت اس کی تحویل سے کدھر سرک رہی ہے۔

اپنی بات مکمل کرنے کے بعد عبدالرحیم خان نے فون کا ریسیور میری طرف بڑھا دیا۔ "سردار بابا سے بات کرو' وہ تمہیں کچھ بتانا چاہتا ہے۔" میں لپک کر فون کے قریب پہنچ گیا اور جنت گل استہزائیہ نظروں سے میری طرف دیکھتی ہوئی' عبدالرحیم خان کے قریب آ بیٹھی۔ صاف ظاہر ہو رہا تھا کہ اس کا وہ فعل عبدالرحیم خان کی دلجوئی کے لیے نہیں بلکہ مجھے چڑانے کے لیے تھا۔

میں نے پورے ادب و احترام کے ساتھ سردار پائندہ گل کو سلام کر کے گفتگو کی ابتدا کی۔ اس کی آواز رعب دار اور لب و لہجہ بہت باوقار تھا۔ اس نے کہا۔ "تمہیں معلوم ہو چکا ہے کہ جھگڑا کیا ہے اور میں کیا چاہتا ہوں۔ ہمارے درمیان ذاتی دشمنی نہیں ہے۔ یہ خالص لین دین کا معاملہ ہے۔ ہم نے اس معاملے میں اپنا ایک آدمی ضرور گنوایا ہے لیکن تمہارے ساتھیوں کو اچھی طرح یہ باور کرا دیا ہے کہ ہمارا قرض چکائے بغیر وہ تمہاری جھلک بھی نہیں دیکھ سکتے۔"

"یہ زبردستی کا تاوان ہے' خانِ اعظم!" میں نے اُس کی انا کو ابھارتے ہوئے ملتجیانہ انداز میں کہا۔ "میں اس کمپنی کا بہت معمولی ملازم تھا اور تمہارا لین دین بھی مجھ سے نہیں ہوا تھا۔"

"یہ سب باتیں طے ہو چکی ہیں' کمپنی ڈوب گئی۔ مالک مارا گیا جو زندہ بچے وہ سب بے سروسامانی کے عالم میں پکڑے گئے۔ میں اب اپنی رقم کس سے وصول کروں؟ تمہارے آدمیوں سے میری بات چل رہی ہے۔ وہ حویلی کے باہر میری گھات لگائے بیٹھے ہیں اور میری انگلیاں تمہارے نرخرے پر ہیں لیکن میں تمہیں یقین دلاتا ہوں کہ جب تک تمہارے آدمی بے اصولی نہیں کریں گے' تمہیں کوئی گزند نہیں پہنچایا جائے گا۔"

"اس یقین دہانی کے لیے میں تمہارا ممنون ہوں۔" میں نے کہا۔ "لیکن میں کراچی میں اپنے آدمیوں سے بات کرنی چاہتا ہوں۔ میری مداخلت سے اس معاملے کی تیزی اور گرمی میں کمی آ سکتی ہے۔"

"یہی میں نہیں چاہتا۔ یہ اعصابی جنگ ہے۔ ابھی وہ تمہاری آواز سننے کو ترسے ہوئے ہیں۔ انہوں نے ہمارا ایک آدمی مار لیا ہے۔ وہ سوچیں گے کہ اب تم پر بدترین تشدد ہو رہا ہوگا۔ میں انہیں اس ذہنی عذاب سے نہیں نکلنے دوں گا۔ قصہ نمٹے گا تو وہ خود قائل ہو جائیں گے کہ سردار پائندہ گل قول کا دھنی اور اصول پرست ہے۔"

"تمہاری مرضی۔" میں نے مایوسی سے کہا۔ "میں تو یہ سوچ رہا تھا کہ میرے آدمی بھی ضد میں آ گئے تو یہ معاملہ طول پکڑ جائے گا اور بلاوجہ دونوں طرف کی لاشیں گرتی رہیں گی۔"

"مجھے دھمکی دے رہے ہو؟" سردار پائندہ گل کی غضب ناک آواز نے میرے کانوں کے پردے ہلا دیئے۔

"خدا کی پناہ! میں یہ جرأت بھی نہیں کر سکتا' خانِ اعظم!" میں نے بوکھلا کر کہا۔

"پھر کان کھول کر سن لو کہ میں ضدیوں کو اپنے قدموں میں جھکانا جانتا ہوں۔ ابھی تو ایک آدمی مرا ہے۔ مجھے دس پانچ کے مرنے کی بھی پروا نہیں ہے۔ جوان مرد لڑتے ہیں تو مرا ہی کرتے ہیں اور ان کا خون کبھی رائیگاں نہیں جاتا اور نہ ہی ان پر رویا جاتا ہے۔ میرے قبیلے میں سورماؤں کی لاشوں پر بین کرنے والیوں کے سر مونڈ کر ان کی چھاتیاں چالیس دن تک ننگی رکھی جاتی ہیں۔ جس قبیلے میں شہ زوروں اور دلیروں کی موت پر رونے والی عورتوں کو اتنی بھیانک سزا ملتی ہو' اس سے زمین کی کون سی قوت ٹکرا سکتی ہے؟"

میں اسے یہ یاد دلانے کا حوصلہ نہیں کر سکا کہ اسپیشل ٹاسک فورس والے نہایت سبک روی اور سرعت کے ساتھ اس سے ٹکرائے تھے۔ انہوں نے صرف ایک شکار ہی نہیں مارا تھا بلکہ لاف و گزاف کرنے والے سردار پائندہ گل کو ایک بزدل چوہے کی طرح اس کی حویلی میں محصور ہونے پر مجبور کر دیا تھا۔

"کوئی نہیں۔" میں نے سردار کے خاموش ہوتے ہی برجستہ کہا۔ "لیکن تم یہ بھی مانو گے کہ میری ساری امیدیں اپنے آدمیوں کی سرخروئی سے وابستہ ہیں۔ وہ ہار گئے تو میری گردن کاٹ دی جائے گی۔"

میرے جواب سے شاید سردار پائندہ گل کی وحشیانہ انا کو بہت آسودگی حاصل ہوئی۔ ریسیور میں اس کے قہقہے کی حیوانی گھن گرج سنائی دی پھر وہ پُرغرور انداز میں بولا۔ "یہ گردنوں کا سودا ہے۔ میری گردن یا تمہاری گردن۔ بچاؤ کا بس ایک ہی راستہ ہے کہ میرا مطالبہ پورا کر دیا جائے۔ میرا اندازہ ہے کہ تمہارے آدمیوں نے بھی اس بات کو اچھی طرح سمجھ لیا ہے۔"

"میں تمہارا مجبور اور بے بس قیدی ہوں۔ جنت گل کے فلیٹ میں رہ کر میں بس دعا ہی کر سکتا ہوں۔"

”جنت گل!“ سردار پائندہ گل اپنی آواز کی پوری قوت سے دہاڑا۔ ”تو کیا وہ کراچی میں ہے؟ تم اس خوبصورت ناگن کے فلیٹ میں کیا کررہے ہو؟ وہ ہماری پیشانیوں پر سڑے ہوئے ببول کی راکھ ملنے پر تُل گئی ہے۔“

”چھوٹے خان نے مجھے خیمہ بستی سے جس مکان میں منتقل کیا ہے وہاں جنت گل بھی موجود ہے۔“ یہ کہتے ہوئے میں نے کن انکھیوں سے ان دونوں کی طرف دیکھا تو ان کے چہرے خوف سے دھواں ہورہے تھے اور وہ امید و بیم کے عالم میں میری ہی طرف دیکھ رہے تھے۔ انہیں سردار پائندہ گل کے غضبناک لب و لہجے کا علم نہیں تھا لیکن وہ میری زبان سے جنت گل کا نام سن چکے تھے اور شاید ان دونوں کو اندازہ تھا کہ میرا وہ انکشاف سردار پائندہ گل کو پاگل کردینے کی حد تک مشتعل کردے گا اور وہ اسی امکان سے بہت زیادہ خوف زدہ تھے۔

”چھوٹے خان نے مجھے اس سے متعارف کرایا ہے۔“ میں نے اپنی بات کا تسلسل برقرار رکھتے ہوئے کہا۔ ”وہ اس وقت بھی میرے سامنے بیٹھی ہوئی ہے۔ چھوٹے سردار نے مجھے بتایا ہے کہ وہ اس سے شادی کرنا چاہتا ہے۔“

”نہیں ڈینی! یہ کبھی نہیں ہوسکتا۔“ سردار پائندہ گل شاید تڑپ کر بلبلایا تھا۔ ”تم عبدالرحیم خان کو بتا دو کہ پہاڑوں میں بسنے والے عقاب کنکر نگل کر اپنے پیٹ کے جہنم سرد کرلیتے ہیں لیکن شہروں کے کوڑا گھروں میں سڑتے ہوئے مرداروں پر کبھی نہیں جھپٹتے۔ اگر اس کی شادی کے لیے شنگارا ویلی کی کسی ماں کی کوکھ سے کسی لڑکی نے جنم نہیں لیا ہے تو اسے شادی کا خیال دل سے نکال دینا چاہیے۔ جیب میں رقم ہو تو ہر قدم پر ہزار لڑکیاں مل جاتی ہیں۔ وہ اپنی ہر رات ایک نئی لڑکی کے ساتھ گزار سکتا ہے۔“

”خانِ اعظم! میں یہ جسارت نہیں کرسکتا۔“ میں نے مکاری کے ساتھ گڑگڑاتے ہوئے کہا۔ ”اجازت ہو تو میں فون کا ریسیور چھوٹے خان کو دے دوں۔ تم خود اس سے یہ ساری بات کرلو۔“

”نہیں!“ سردار پائندہ گل کی آواز ریسیور میں گونجی۔ ”میں اُس کے منہ نہیں لگنا چاہتا۔ اسے بتا دو کہ مجھے یہ جان کر صدمہ ہوا ہے کہ میرے بھانجے‘ میرے سگے خون سے شنگارا ویلی کی کوئی عورت اپنی بیٹی بیاہنے پر آمادہ نہیں ہے۔ اس سے تو بہتر تھا کہ عبدالرحیم خان اپنی ماں کی کوکھ میں ہی دم توڑ گیا ہوتا۔“

”میں کوشش کروں گا۔ یہ تمہارے خاندانی مسائل ہیں اور میں ان باریکیوں میں الجھنا نہیں چاہتا۔ ایسا نہ ہو کہ چھوٹا خان مشتعل ہوکر مجھے ہلاک ہی کردے۔ ابھی تو وہ مجھ پر بہت مہربان ہے۔“

”اس کی مجال نہیں کہ تمہیں ہاتھ بھی لگا سکے۔“ بڑے خان کا پارہ بدستور چڑھا ہوا تھا۔ ”تم یرغمالی ہو اور کوئی بھی فیصلہ ہونے تک تم پر وار کرنا ہماری روایات کے خلاف ہوگا۔ عبدالرحیم خان‘ جنت گل کے عشق میں کتنا بھی اندھا ہوگیا ہو لیکن وہ اپنے قبیلے کی روایات سے غداری نہیں کرسکتا۔ اور ہاں!“ یکایک اس کی آواز پھر بلند ہوگئی۔ ”اسے یہ بھی بتا دینا کہ لوگ بلاوجہ باتیں نہیں بناتے۔ لنگڑا ضیغم خان پکا نامرد ہے۔ وہ اپنے نطفے سے ایک رینگنے والا کیڑا بھی پیدا نہیں کرسکتا۔ جنت گل بلاوجہ اس لنگڑے کی ولدیت پر اترائی پھرتی ہے۔ اس کی ماں گناہ گار تھی۔ میں نے کابل میں اس سے منہ کالا کیا تھا۔ جنت گل میری اسی بھول کی پیداوار ہے اور اسی لیے میں اسے اپنے کسی گھر کی بہو نہیں بنا سکتا۔ گند کا کیڑا گندگی میں ہی خوش رہتا ہے۔ اسے خوشبوؤں میں بسانے کی کوشش کرو تو وہ گھٹن سے مرجاتا ہے۔“

”سردار!“ میں نے لرزتی ہوئی آواز میں کہا۔ ”مجھ پر اتنا بوجھ نہ ڈالو۔ چھوٹا خان میری زبان سے ضیغم خان اور جنت گل کے بارے میں ایسی باتیں برداشت نہیں کرسکے گا۔ جنت گل بھی امریکن اسکول کی پڑھی ہوئی‘ حساس اور سمجھ دار لڑکی ہے۔ ہوسکتا ہے کہ وہی میرا کام تمام کردے۔ میں یہ سب نہیں کہہ سکتا۔“

”جنت گل کے خون میں اگر میرا ذرا سا بھی اثر ہے تو وہ اپنے حقیقی باپ کا پیغام پہنچانے والے پر انگلی بھی نہیں اٹھا سکے گی۔ میں نے اسے اپنے نام کے علاوہ سب کچھ دیا ہے۔ اس کی تعلیم و تربیت اور دیکھ بھال کے لیے میں آج تک ضیغم خان کو ایک بھاری وظیفہ دے رہا ہوں۔ اس لڑکی کی پرورش کا بندوبست کرتے ہوئے میں بھول گیا تھا کہ کیچڑ میں پھینکے جانے والے پتھر کی چھینٹیں اپنے ہی دامن کو داغ دار کردیتی ہیں۔“

میرے لیے وہ بہت ہولناک صورتِ حال تھی۔ سردار پائندہ گل جیسا معزز اور بارسوخ آدمی اپنے ایک گناہ کا کھلا اعتراف کرنے کے باوجود‘ اپنی نسلی برتری کے زعم میں‘ دوغلی نسل کی اس لڑکی کے سر پر دستِ شفقت رکھنے پر آمادہ نہیں تھا۔ اپنی ہی ناجائز بیٹی سے اس کی نفرت کا یہ عالم تھا کہ اس نے مجھ جیسے اجنبی قیدی کو اپنے رازوں کا شریک بنا لیا تھا۔ وہ اس کے قبائلی خون میں رچے ہوئے نفرت کے جذبے کی انتہا تھی جسے سمجھنا میرے لیے یا کسی اور کے بس سے باہر تھا۔

میری باتوں سے عبدالرحیم خان اور جنت گل کو بھی موضوعِ سخن کا اندازہ ہوچکا تھا۔ ان دونوں کے چہرے خوف سے زرد پڑے ہوئے تھے۔ غنیمت یہ تھا کہ وہ صرف میرے جوابات سن رہے تھے۔ سردار پائندہ گل کی زہرناک باتیں اُن کے علم میں نہیں تھیں ورنہ شاید وہاں اسی وقت کہرام برپا ہوجاتا۔

”میں کوشش کروں گا کہ تمہارا پیغام چھوٹے خان تک پہنچا دوں۔“ میری زبان سے اتنی ہی بات نکلی تھی کہ عبدالرحیم خان ہاتھ بڑھا کر میری طرف آیا اور میں نے ماؤتھ پیس میں کہا۔ ”لو‘ چھوٹا خان خود ہی تم سے کچھ بات کرنی چاہ رہا ہے۔ میں ریسیور اسے دے رہا ہوں۔“

سردار پائندہ گل کی غضبناک غراہٹیں ابھریں۔ وہ یقینی طور پر اپنی مادری زبان میں بڑی بڑی گالیاں دے رہا تھا۔ پھر اس کی جانب سے یکلخت فون بند کردیا گیا۔ میں نے مایوسانہ انداز میں بے جان ریسیور عبدالرحیم خان کی طرف بڑھا دیا۔

”یہ تو بند ہوچکا ہے۔“ وہ ریسیور کان سے لگاتے ہی پُرتشویش لہجے میں بولا۔

”ہاں‘ بڑا خان تم سے بات کرنے سے گریز کررہا تھا۔“ میں نے نظریں جھکا کر آہستگی سے کہا۔

”تم کو سردار بابا سے جنت گل کے بارے میں بات کرنے کی کیا ضرورت تھی؟“ وہ ریسیور کو غصے میں فرش پر مارتے ہوئے دہاڑا۔ ”مجھے معلوم ہے کہ سردار بابا غصے سے پاگل ہوگیا ہوگا۔“

”مجھے کیا معلوم تھا کہ جنت گل کا نام ہی بڑے خان کو آتشِ زیرِ پا کردے گا۔“ میں نے ٹوٹا ہوا ریسیور کریڈل پر رکھتے ہوئے‘ شرمساری کے ساتھ کہا۔ ”تمہیں پہلے ہی مجھے بتا دینا چاہیے تھا۔ سردار پائندہ گل تمہارے اور جنت گل کے میل جول کو کسی بھی قیمت پر برداشت کرنے کے لیے تیار نہیں ہے۔“

”لیکن کیوں؟ میں نے اس کی کون سی جاگیر ماری ہوئی ہے؟“ جنت گل کسی بھوکی شیرنی کی طرح غرائی۔

”تم چپ رہو۔“ میرے لب کشا ہوتے ہی عبدالرحیم خان بول پڑا۔ ”میں سب جانتا ہوں۔ میں کبھی نہ کبھی سردار بابا کو سمجھا ہی لیتا لیکن اس وقت تم نے جنت گل کا ذکر کرکے سب کچھ تباہ کردیا۔“

”جو ہونا تھا‘ وہ ہوگیا۔ اب اسے لوٹایا نہیں جاسکتا۔ اس میں میری کسی بدنیتی کا دخل تھا اور نہ غلط بیانی کا۔ سردار پائندہ گل نے مجھ سے جو کچھ کہا‘ میں اسے دہرانے کی ہمت بھی نہیں کرسکتا۔“

”وہ مجھ سے اس قدر کیوں بدکتا ہے؟ میں نے اس کا کیا بگاڑا ہے؟“ جنت گل‘ چھوٹے خان سے بولی۔

”کچھ نہیں‘ بس وہ نسل خراب ہونے سے ڈرتا ہے۔ تمہیں معلوم ہے کہ اس کی کوئی نرینہ اولاد نہیں ہے اور اس کا سارا زور مجھ پر ہی چلتا ہے۔“ عبدالرحیم خان نے اسے سمجھایا۔

لیکن جنت گل ایسی باتوں سے بہلنے والی نہیں تھی۔ وہ چیخ کر بولی۔ ”جب اس کے چھوٹے بھائی نے قندھاری بزاز کی لڑکی سے شادی کی تھی تو اسے اپنا حسب نسب بگڑنے کا خیال نہیں آیا تھا؟“

عبدالرحیم خان نے اچانک ہی اپنی مادری زبان میں کچھ بولنا شروع کردیا۔ اس سے پہلے وہ مسلسل اردو بول رہا تھا اور جنت گل انگریزی میں برس رہی تھی۔ وہ دونوں کچھ دیر تک اپنی مادری زبان میں تکرار کرتے رہے پھر چھوٹے خان نے مجھے اپنے کمرے میں جانے کے لیے کہا اور میں وہاں سے اٹھ گیا۔

عبدالرحیم خان‘ جنت گل کو وہیں چھوڑ کر میرے پیچھے آیا اور کمرے میں پہنچنے کے بعد رازدارانہ لہجے میں بولا۔ ”مجھے معلوم ہے کہ سردار بابا نے تم سے بہت کچھ کہا ہوگا لیکن تم اب اپنی زبان بند رکھنا۔ جنت گل کو ان کڑوی کسیلی باتوں کا علم نہیں ہونا چاہیے ورنہ وہ مرنے مارنے پر تُل جائے گی۔ اگر سردار بابا درست کہتا ہے تو جنت گل کی رگوں میں بھی اسی کا گرم خون گردش کررہا ہے۔“

مجھے یہ جان کر حیرت ہوئی کہ عبدالرحیم خان اپنے ماموں کی سوچ سے اس حد تک واقف تھا۔ میں نے اسے اپنی زبان بند رکھنے کی یقین دہانی کرائی اور اس نے اپنی روٹھی ہوئی محبوبہ کو منانے کے لیے واپس جاتے ہوئے میرا کمرا مقفل کردیا۔

سردار پائندہ گل سے میری جو باتیں ہوئی تھیں‘ انہوں نے میرے دل و دماغ کو ہلا کر رکھ دیا تھا اور میرے ذہن میں ویرا کی کہانی تازہ ہوگئی تھی۔ ویرا کا دکھ بھی یہی تھا کہ جمی لائیڈ نے اس کا ناجائز باپ ہونے کے باوجود اسے نہیں اپنایا تھا۔ وہ مغرب کے مادر پدر آزاد معاشرے کی غلاظتوں سے جنم لینے والی کہانی تھی لیکن جنت گل کی کہانی نے افغانستان کی قدامت پسند اور روایات پرست سرزمین پر جنم لیا تھا۔ اس مماثلت سے ایک ہی بات ثابت ہوتی تھی کہ دنیا کے ہر خطے میں خود پرست انسانوں کا رویّہ ایک جیسا تھا۔ ان میں سے کوئی بھی اپنے گناہ کی ذمّے داری خود قبول کرنے پر آمادہ نہیں تھا اور دوسروں کی زندگی جہنم بنانے پر تُلا ہوا تھا۔

وہ باتیں میرے ذہن میں اس بری طرح جمیں کہ میں رہ رہ کر ان ہی کے بارے میں سوچتا رہا۔ میری اپنی پریشانی‘ جو ہر اعتبار سے سنگین ترین تھی‘ پس پشت چلی گئی۔

میرا خیال تھا کہ میں کسی حیلے بہانے سے سردار پائندہ گل سے اس امر کی اجازت لے لوں گا کہ غزالہ وغیرہ کو فون کرسکوں۔ مقصد یہی تھا کہ وہ میری آواز اور لب و لہجے سے یہ اندازہ کرلیں کہ میری سلامتی کو کوئی فوری خطرہ لاحق نہیں تھا لیکن وہ لوگ ہر کام پیشہ ورانہ انداز میں کرنے کے عادی تھے اور مجھے ایسی اجازت دے کر اپنے دباؤ میں کوئی کمی کرنے کا خطرہ مول لینے کے لیے تیار نہیں تھے۔

اگلے دن ناشتے کے بعد مجھے ایک بار پھر کمرے میں مقفل کردیا گیا۔ اس دوران میرا اور جنت گل کا دوبارہ آمنا سامنا نہیں ہوا تھا اور نہ ہی میں نے عبدالرحیم خان سے پچھلے دن کے موضوع پر مزید بات کرنے کی کوشش کی تھی۔ وہ ان کے باہمی معاملات تھے جنہیں وہ خود ہی بہتر طور پر سلجھا سکتے تھے۔ میرا مسئلہ اپنی رہائی کا تھا جس کی فوری طور پر کوئی صورت بنتی نظر نہیں آرہی تھی۔ وقتی طور پر یہی غنیمت تھا کہ مجھے کھلی دھوپ میں تپتے ہوئے آہنی کنٹینر کی صعوبتوں سے نجات مل گئی تھی اور آرام کرنے کے لیے نرم بستر میسر تھا۔

دوپہر کے قریب میرے دروازے کے قریب قدموں کی چاپ سنائی دی تو میں نے اس پر کوئی توجہ نہیں دی۔ وہ تینوں اس فلیٹ میں چلتے پھرتے ہی رہتے تھے۔ وہ آہٹیں میرے دروازے پر رکیں اور پھر قفل میں چابی لگنے کی آواز آئی تو میں بستر سے اٹھ بیٹھا۔ مجھے

خیال ہوا کہ شاید دوپہر کا کھانا قبل از وقت ہی لایا جا رہا ہے۔

دروازے کے ہینڈل کی گردش کے ساتھ پٹ کھلا تو وہاں موجود سراپا کو دیکھتے ہی میرے فرشتے کوچ کر گئے۔ حیرت سے میرا منہ کھلا اور پھر کوئی آواز پیدا کیے بغیر' یوں ہی بند ہو گیا۔

کھلے ہوئے دروازے میں جنت گل شعلۂ جوالہ بنی کھڑی تھی۔ ہلکے سے میک اپ نے اس کے حسن کو چار چاند لگا دیئے تھے لیکن جس چیز نے مجھے بھونچکا کیا وہ اس کا چہرہ نہیں بلکہ لباس تھا جو اس کے حسین اور متناسب بدن کے ہیجان انگیز نشیب و فراز کو چھپانے کے بجائے اجاگر کر رہا تھا۔

اس نے کسی بھی زیر جامے کے بغیر' مہین جالی جیسے کپڑے کی قمیص زیب تن کی ہوئی تھی۔ وہ کپڑا اس قدر باریک اور شفاف تھا کہ اس میں سے جنت گل کا گلابی شہابی بدن باہر نکلا پڑ رہا تھا۔ نگاہوں پر ذرا سا زور دے کر اس کی شلوار کے گھیر کی ہر شکن الگ الگ گنی جا سکتی تھی۔ وہ بے حجابی کے ساتھ چند ثانیوں تک دروازے پر کھڑی رہی۔ اس کے پتلے پتلے ہونٹوں پر دل آویز مسکان مچل رہی تھی۔ پھر وہ دروازے سے گزر کر میرے کمرے میں آگئی اور چیلنج کرنے والے دھیمے لہجے میں بولی۔ "ہونق بنے کیوں بیٹھے ہو؟ بڑھ کر میرا استقبال نہیں کرو گے؟"

میں نے غور سے اس کی آنکھوں کی طرف دیکھا مگر ان بڑی بڑی اور جھیل جیسی گہری آنکھوں میں قدرتی خمار کے علاوہ کسی نشے کے آثار نہیں تھے۔ میرے ذہن میں دوسرا خیال عبدالرحیم خان اور اس کے ساتھی کے بارے میں آیا کہ وہ دونوں کہاں تھے؟ کہیں وہ میرا کوئی امتحان تو نہیں تھا؟ شاید جنت گل نے میری چھیڑ چھاڑ کے بارے میں چھوٹے خان سے شکایت کر دی ہو اور اس نے انتقاماً مجھے ٹھکانے لگانے کا فیصلہ کر لیا ہو۔ سردار پائندہ گل کے قول کے مطابق میں ان لوگوں کا یرغمالی تھا اور میرے بارے میں کوئی فیصلہ ہونے تک چھوٹا خان مجھے کوئی گزند نہیں پہنچا سکتا تھا۔ شاید اس نے اس لیے جنت گل کو سراپا دعوت بنا کر تنہا میرے کمرے میں بھیجا تھا تاکہ میں نفسانی جذبات سے مغلوب ہو کر اس کی طرف پیش قدمی کروں اور عبدالرحیم خان کو میرے سینے میں گولیاں اتارنے کا بہانہ مل جائے۔ وہ حلف اٹھا کر بڑے خان سے کہہ سکتا تھا کہ میں نے جنت گل کی عزت پر ہاتھ ڈالنے کی کوشش کی اور اس نے غیرت سے مجبور ہو کر مجھے ہلاک کر دیا۔ وہ خیال ذہن میں آتے ہی مجھے جنت گل کے دعوت انگیز وجود سے خوف آنے لگا۔

اتنی دیر میں اس کا مہکتا ہوا وجود میرے سانسوں کی رسائی میں آ چکا تھا۔ میں خوفزدہ ہو کر مسہری پر چڑھ کر اس کے وسط میں پہنچ گیا اور ہکلاتے ہوئے بولا۔ "مجھ سے دور رہو! میرے قریب نہ آنا! یہ بتاؤ کہ چھوٹا خان اور اس کا طاقت ور ساتھی کہاں ہے؟"

"وہ دونوں اپنا کل والا مردہ دفنانے گئے ہوئے ہیں۔" وہ میری حالت سے محظوظ ہوتے ہوئے بولی۔ "اس وقت یہاں میرے اور تمہارے علاوہ کوئی نہیں ہے۔ کل میں بیزار ہو رہی تھی تو تم مجھے ندیدوں کی طرح گھور رہے تھے۔ اب میں خود تمہارے پاس آئی ہوں تو خوف سے ہکلا رہے ہو۔"

"لیکن کیوں؟ تم میرے پاس کیوں آئی ہو۔" میں اس کی بات پر اعتبار نہیں کر سکا۔ "تم نے یہ کیسا لباس پہنا ہوا ہے؟ چھوٹے خان نے ہم دونوں کو اس حالت میں دیکھ لیا تو وہ ہم دونوں کو گولی مار دے گا۔"

وہ مترنم آواز میں ہنسی اور پھر بولی۔ "تم یقین کرو کہ وہ شام سے پہلے نہیں آئے گا۔ اپنے آدمی کی تدفین کے بعد وہ تمہارے آدمیوں سے ملنے جائے گا۔ وہاں کوئی اہم بات طے ہونے والی ہے۔ یہ وقت باتوں میں ضائع نہ کرو۔ پکا ہوا پھل خود جھولی میں آگرے تو اسے ہر حالت میں کھا لینا چاہیے۔"

"لیکن تم یکایک مجھ پر اتنی مہربان کیوں ہو رہی ہو؟" میں نے پلکیں جھپکاتے ہوئے پوچھا۔ میرا خوف اپنی جگہ تھا لیکن میں اسے دیکھ دیکھ کر ہیجان میں بھی مبتلا ہوا جا رہا تھا اور میرے سانس سینے میں پھنسنے لگے تھے۔

"میں شنگارا ولی کے ان خانوں کی عزت اپنی ایڑی کے نیچے مسل دینا چاہتی ہوں۔" وہ ایک دم طیش میں آگئی۔ "تم ان کے یرغمالی ہو اور یرغمالی کو عورت کا قرب مل جانا ان سرداروں کے لیے ڈوب مرنے کا مقام ہوتا ہے۔ چھوٹا خان دنیا کا سب سے بڑا بزدل ہے۔ وہ بڑے خان سے ڈر کر مجھ سے شادی نہیں کرتا اور مجھ سے ڈر کر میرے بستر سے دور رہتا ہے۔ اس میں مردوں والی کوئی بات ہی نہیں ہے۔ میں تمہارے پاس آگئی ہوں لیکن میں زبردستی اس کی بانہوں میں نہیں گر سکتی۔ دنیا کی کوئی عورت اپنے محبوب کے سامنے اس طرح نہیں گر سکتی۔ اور وہ پائندہ......! خدا اسے برباد کرے۔ جب اسے میری اور تمہاری اس ملاقات کا علم ہو گا تو وہ پہاڑوں میں اس طرح سینہ کوبی کرتا پھرے گا کہ پتھروں میں شگاف پڑ جائیں گے۔ اسے یوں محسوس ہو گا جیسے میں نے اس کے پُرجلال چہرے پر سڑے ہوئے ببول کی راکھ مل دی ہو۔ یہ خان اب تک عورتوں کو پیٹتے چلے آئے ہیں لیکن میں انہیں بتاؤں گی کہ عورت کا انتقام کیا ہوتا ہے۔"

"اس بار جنت گل کا ہر لفظ میرے دل میں اترتا چلا گیا اور میرے وجود پر اس کے ہوش رُبا پیکر کا خمار چھانے لگا۔ میں مسہری کے وسط سے اس کی طرف بڑھا اور پھر اس کا مرمریں بازو تھام کر اسے اپنے قریب بٹھا لیا اور ملائمت کے ساتھ پوچھا۔ "تم جانتی ہو کہ شنگارا ولی کا سردار پائندہ خان تمہارا کون ہوتا ہے؟"

"میں بہت کچھ جانتی ہوں اور کچھ بھی نہیں جانتی۔ کابل کے جن لوگوں نے اسے دیکھا ہے وہ میری صورت میں اس کی شباہت بتاتے ہیں۔ وہ یہ بھی کہتے ہیں کہ بائیس برس پہلے سردار پائندہ گل نے ایک رات ہمارے گھر میں گزاری تھی۔ وہ منہ اندھیرے واپس لوٹ گیا تھا اور اجالا پھیلنے سے پہلے ضیغم خان نے میری ماں کی زبان کاٹ کر اسے زندگی بھر کے لیے گونگی بنا دیا تھا۔ بتاؤ' تم مجھ سے اور کیا پوچھنا چاہتے ہو؟" اس وقت اس کی مترنم اور نقرئی آواز میں بلا کا زہر اتر آیا تھا اور آنکھوں میں نفرت کے کوندے لپکنے لگے تھے۔

"میرا خیال ہے کہ تم ضرورت سے زیادہ جانتی ہو۔" میں نے تھکی ہوئی آواز میں کہا اور اس کے قریب کھسک گیا۔

"اگر پائندہ خود کو فخریہ خونی بھیڑیا کہتا پھرتا ہے تو شاید میں بھی اسی خونی بھیڑیے کی اولاد ہوں۔ میں ان خوبصورت لبادوں کو اپنے دانتوں سے نوچ ڈالوں گی جو اس نے اپنے مکروہ وجود پر سجائے ہوئے ہیں۔ یہ کیسا اندھیر اور ظلم ہے کہ وہ چوری چھپے میرا باپ ہونے کے دعوے کرتا پھرتا ہے لیکن سرعام مجھے ایک طوائف کی عزت دینے پر بھی آمادہ نہیں ہے۔ طوائف کا ایک ٹھکانا ہوتا ہے۔ وہ اپنے کوٹھے پر بن سنور کر بیٹھتی ہے اور اس کے خریدار رقم کی تھیلیاں لے کر' سر جھکائے اس کے سامنے آتے ہیں۔ وہ اس قدر آمر ہو گیا ہے کہ عبدالرحیم خان کو میری بولی لگانے سے بھی روک رہا ہے۔ میں اسے فنا کر دوں گی۔"

اس وقت جنت گل مظلوم تھی اور میں دنیا کے ہر عالی حوصلہ مرد کی طرح اس کا پشت پناہ بنا ہوا تھا۔ میں نے نرمی سے اسے پچکار کر کہا۔ "تم شنگارا ولی والوں کی روایات کو مجھ سے زیادہ جانتی ہو۔ اگر تم میرے تعاون سے سردار پائندہ گل کو ذلیل و رسوا کر سکتی ہو تو میں تمہارا ساتھ دینے کے لیے تیار ہوں۔"

اُس نے اپنی قہربار نظریں اٹھا کر میری طرف دیکھا پھر اس نرم و نازک لڑکی کو اپنے جذبوں پر کوئی اختیار نہیں رہا۔ اس نے اچانک ہی اپنا چہرہ میرے سینے میں چھپایا اور پھر بلک کر رو پڑی۔ میں نے فوراً ہی اس کے پیکر کو اپنی مضبوط بانہوں میں سمیٹ لیا۔

وہ آگ اور تیل کا ملاپ تھا۔ اس کی طرف سے میرے دل میں سلگتی ہوئی چنگاریوں نے یکایک ہی ہولناک الاؤ کا روپ دھار لیا۔ میں زیادہ دیر تک اسے تسلی اور تشفی دینے کے قابل نہ رہ سکا۔ وہ خود بھی جانتی تھی کہ وہ آگ سے کھیل رہی ہے۔ اس کی تمام تر تیاریاں ہی اس آگ کو بھڑکانے کے لیے تھیں۔ وہ شنگارا ولی کے سردار پائندہ گل کی عزت کو اپنی ایڑیوں کے نیچے مسلنے کے لیے بے چین تھی' سڑے ہوئے ببول کی راکھ اس کے چہرے پر لتھیڑ ڈالنا چاہتی تھی۔ چند ہی لمحوں میں وہ اپنا رونا دھونا بھول کر دوبارہ اپنے اسی روپ میں آگئی جو فیاض اور دل نواز تھا۔

وہ ایک بپھرا ہوا طوفان تھا جو اپنے زور میں سب کچھ خس و خاشاک کی طرح بہا لے جانا چاہتا تھا۔ وقت کا احساس ختم ہو چکا تھا اور میں اس طوفان کے زیر و بم میں بس بہے جا رہا تھا کہ اچانک ہی مجھے چھوٹا خان یاد آیا جو شام تک واپس آنے کے ارادے سے گیا ہوا تھا اور شام بس تلی ہی کھڑی تھی۔

جنت گل بھی وہ خیال آتے ہی چونک پڑی اور مجھے تیزی سے تیار ہونے کی ہدایت کرتی ہوئی اس کمرے سے باہر چلی گئی۔ میرے پاس اپنے تن کے دو کپڑوں کے سوا رکھا ہی کیا تھا جو میں تبدیل کرتا۔ ایک لمحے کے لیے مجھے خیال آیا کہ میں چھوٹے خان کے کپڑے استعمال کر لوں لیکن اس کا بدن میری جسامت سے بہت مختلف تھا۔ میں نے اپنے جلتے ہوئے بدن پر ٹھنڈے پانی کی تیز دھاریں بہا کر' اپنے سنسناتے ہوئے اعصاب کو اعتدال پر لانے کی کوشش کی اور پھر چند ہی منٹ میں تازہ دم ہو کر ایک کرسی پر بیٹھ گیا۔

تھوڑی دیر بعد جنت گل آئی تو اس کے بدن پر معقول لباس تھا اور وہ ہر اعتبار سے باوقار نظر آ رہی تھی۔ میں نے اپنی رسٹ واچ پر نگاہ ڈالی تو شام کے ساڑھے پانچ بج رہے تھے۔

وہ میرے روبرو آ کر کھڑی ہوئی تو میں نے اسے بیٹھنے کے لیے کہا لیکن وہ معنی خیز انداز میں مسکرانے لگی۔ "میں نے چھوٹے اور بڑے خان سے بغاوت یہاں بیٹھے رہنے کے لیے نہیں کی ہے۔ اب میں یہاں رہی تو میرے بدن کے ٹکڑے اڑا دیے جائیں گے۔ اٹھو' ہمیں عبدالرحیم خان یا اس کے آدمی کی واپسی سے پہلے یہاں سے نکل جانا چاہیے ورنہ ہمیں ایسا سنہرا موقع دوبارہ نہیں ملے گا۔"

اس کی وہ بات سنتے ہی میرا ذہن ماؤف ہو کر رہ گیا۔ وہ لاکھ پری پیکر اور دل رُبا سہی لیکن میں نے اسے اپنے جانی دشمنوں کی عزت سمجھ کر' وقت گزاری کے لیے اس کی ذات میں دلچسپی لی تھی لیکن وہ مجھے اپنی گرمجوشی' خلوت کی رشوت دے کر میرے گلے کا ہار بننے پر مائل نظر آ رہی تھی۔ اس کے ساتھ وہاں سے فرار میرے لیے کسی بھی طرح مناسب نہیں تھا۔ اسے میرے ساتھ دیکھ کر غزالہ بھڑک کر کوئی بھی انتہائی قدم اٹھا سکتی تھی اور پھر سردار پائندہ گل سے ایسی خوفناک دشمنی کی داغ بیل پڑ سکتی تھی کہ میری ساری عمر بھاگتے بھاگتے ہی گزر جاتی۔ اس کا بھرا قبیلہ تھا اور میں اپنی ذات میں بالکل تنہا۔ میں کہاں تک ان کا مقابلہ کر سکتا تھا؟ زن' زر اور زمین کی خاطر جنم لینے والی دشمنیاں اتنی ہولناک ہوتی ہیں کہ قبائلی علاقوں میں پوری پوری نسلیں ان کا ایندھن بن جاتی ہیں۔ جنت گل صرف عورت ہی نہیں' بہت خطرناک عورت تھی۔ اس حسینہ کے بارے میں کسی بھی وقت سردار پائندہ گل کا خون جوش مار سکتا تھا کہ وہ درحقیقت اسی کا خون تھی۔

"کیا سوچ رہے ہو؟ اٹھو اور یہاں سے نکلنے کی فکر کرو۔" اس نے مجھے سوچ میں گم دیکھ کر' میرا شانہ ہلاتے ہوئے کہا۔ "بچ نکلو گے تو سوچنے کے لیے پوری عمر مل جائے گی۔"

"میں یہ سوچ رہا ہوں کہ میں تمہیں لے کر کہاں کا رخ اختیار کروں؟" میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔ "میرے فلیٹ پر میری بیوی تمہارا سایہ بھی برداشت نہیں کر سکے گی....."

اس نے تیزی کے ساتھ میری بات کاٹ دی۔ "اس خیال

میں نہ رہنا کہ تم نے پہلی ہی نظر میں مجھے جیت لیا ہے۔ عورت صرف ایک بار محبت کرتی ہے۔ عبدالرحیم خان لاکھ بزدل اور بے ہمت سہی لیکن وہی میرا محبوب ہے۔ میں نے تو سردار پائندہ گل کو ذلیل و رسوا کرنے کے لیے تمہاری ذات میں دلچسپی لی تھی اور میرا وہ مقصد پورا ہوچکا ہے لیکن میرا مشن کسی بھی چاردیواری میں بند رہ کر پورا نہیں ہوسکتا۔ یہاں سے نکلنے کے بعد میرے اور تمہارے راستے جدا ہوجائیں گے۔ میں سردار پائندہ گل کے ہرجانے والے کو ان لمحوں کی کہانیاں سناؤں گی جو میں نے اس کے ایک یرغمالی کے ساتھ گزارے ہیں۔ مجھے اصل خوشی اسی وقت ہوگی جب لوگ میرے حوالے سے اس سے بے رحمی کے ساتھ سوالات کریں گے اور اسے منہ چھپانے کی جگہ تک نہیں ملے گی۔"

اس کا منصوبہ بہت خوفناک اور وحشیانہ تھا۔ وہ ایک عورت تھی لیکن کوئی بھی کمزور سی عورت جب انتقام لینے پر تُل جاتی ہے تو شہ زور مردوں کے پیروں تلے سے زمین سرکنے لگتی ہے۔

اس کے عزائم واضح ہونے کے بعد میرے سر پر سے بہت بڑا بوجھ ہٹ گیا لیکن میں نے جنت گل کی دلجوئی کے خیال سے 'فوری طور پر اپنی جگہ چھوڑنے کے بجائے فکرمندانہ لہجے میں پوچھا۔ "وہ تو ٹھیک ہے لیکن پھر بھی میرا سوال اپنی جگہ ہے۔ یہاں سے جانے کے بعد تمہیں فوراً ایک محفوظ ٹھکانے کی ضرورت ہوگی۔ تم کہاں جاؤگی؟ تم یوں ہی دربدر بھٹکتی رہیں تو وہ لوگ بہت جلد تم تک پہنچ جائیں گے۔ عبدالرحیم خان کے ایک اشارے پر افغان خیمہ بستی کے سارے باسی تمہاری تلاش میں نکل کھڑے ہوں گے۔"

"میں ان لوگوں سے ذرا بھی خوف زدہ نہیں ہوں۔ خیمہ بستی کے بس وہ گنے چنے لوگ مجھے پہچانتے ہیں جو چھوٹے خان کے لیے الٹے سیدھے کام کرتے رہتے ہیں۔ ان سے بچنے کے لیے میں ایک دو روز کے لیے شہر کے کسی چھوٹے سے ہوٹل میں پناہ لے سکتی ہوں۔ تم میری بالکل فکر نہ کرو۔ میں نے عبدالرحیم خان کی الماری میں سے بیس بائیس ہزار روپے نکال لیے ہیں جو مجھے سرحد پار پہنچانے کے لیے کافی ہوں گے۔ تم اچھی طرح جانتے ہو کہ کسی بھی اکیلی اور خوبصورت عورت کے سیکڑوں ہمدرد پیدا ہوجاتے ہیں۔ میرا ایک بار یہاں سے نکلنا شرط ہے۔ اگر تم اب بھی سوچ بچار کرتے رہے تو میں اکیلی ہی نکل کھڑی ہوں گی۔"

بات مناسب موڑ تک آگئی تھی اس لیے میں نے ایک جھٹکے کے ساتھ اپنی جگہ چھوڑ دی۔

جنت گل نے شاید اس فلیٹ میں کافی عرصہ گزارا تھا اس لیے وہاں سے نکلتے ہوئے اس نے ہر طرف الوداعی نظریں دوڑائیں اور پھر ہم دونوں فلیٹ سے باہر آگئے۔

میں نے اس وقت پہلی بار دیکھا کہ وہ عمارت زیرِ تکمیل اور خاصی غیر آباد تھی۔ شاید عبدالرحیم خان والا فلیٹ خاص طور پر تیار کرایا گیا تھا ورنہ اس کے سامنے والے فلیٹ پر رنگ و روغن تک نہیں کیا گیا تھا۔

ہم دونوں چند سیڑھیاں ہی اترنے پائے تھے کہ باہر کسی گاڑی کے رکنے کی آواز آئی۔ لمحہ بھر کے لیے میرے دل کی دھڑکن تیز ہوگئی۔ پھر سیڑھیوں پر کسی کے تیزی سے اوپر آنے کی آوازیں آنے لگیں۔ جنت گل نے مسکراتی ہوئی نظروں سے میری طرف دیکھا اور میں آنے والے کو راستہ دینے کے لیے اس کے پیچھے ہوگیا۔

چند لمحوں بعد وہ شخص سامنے آیا تو میرا دل اچھل کر حلق میں آگیا۔ وہ چھوٹا خان تھا۔ سیڑھیوں پر جنت گل کو اپنے سامنے پاکر بس ایک لمحے کے لیے وہ حیران نظر آیا پھر مجھ پر نگاہ پڑتے ہی شاید سارا کھیل اس کی سمجھ میں آگیا۔ اس کی آنکھیں غصے کی شدت سے اپنے حلقوں سے باہر آتی ہوئی محسوس ہونے لگیں۔ اس کی گردن کی رگیں بھی تیزی کے ساتھ پھولنے پچکنے لگی تھیں۔ "کہاں جارہی ہو؟" اس نے کسی سانپ کی پھنکار سے مشابہ تیز سرگوشیانہ آواز میں پوچھا۔

"میں اب پاکیزہ نہیں رہی ہوں۔ اس لیے یہاں سے جارہی ہوں۔" جنت گل کی آواز سخت اور بے رحمانہ تھی۔ "میرے اور ڈیڈی کے درمیان وہی رشتہ ہے جو سردار پائندہ گل اور میری ماں کے درمیان تھا۔ وہاں جبر تھا اور یہاں میری رضا شاملِ حال تھی۔ وہاں ضیغم خان نے میری ماں کی زبان کاٹ دی تھی لیکن میں تم سے انگریزی بول رہی ہوں کیونکہ میرا کوئی شوہر نہیں ہے جو مجھے حق گوئی سے روکنے کے لیے میری زبان کاٹ سکے۔"

جنت گل کے ایک ایک لفظ کے ساتھ عبدالرحیم خان کی مٹھیاں بھنچتی جارہی تھیں۔ میں نے خاص طور پر نوٹ کیا کہ اس کے بائیں ہاتھ میں چابیوں کا ایک رِنگ موجود تھا جس میں شاید اس کی گاڑی کی چابی بھی موجود تھی۔

"تت..... تم..... کنجری ہوگئی ہو۔" چھوٹا خان غضب ناک لہجے میں غرّایا۔ "تم نے ایک یرغمالی کی سیج سجا کر پوری شنگارا ولی کے منہ پر تھوکا ہے۔ تم اوپر چلو تو میں تم سے سمجھتا ہوں اور یہ یرغمالی!" اس کی آواز فرطِ غضب سے کانپ گئی۔ "اس کا تو نصیب ہی خراب ہے۔ اس کے آدمیوں نے سردار بابا کے قدموں میں اپنا سر جھکا کر' آج ہمارے مال کا پیکٹ ہمیں لوٹا دیا ہے اور میں اس کی آزادی کا فیصلہ کرکے یہاں آیا تھا لیکن اس کا قتل شاید میرا مقسوم بن چکا ہے۔ اس نے ایک افغان عورت کی پشت پر سوار ہوکر بھاگنے کی سازش کی ہے۔ میں اسے معاف نہیں کروں گا۔" اپنی بات مکمل کرتے ہی اس نے بجلی کی سی سرعت سے اپنی جیب سے ایک چاقو نکالا اور اس کا کوئی لیور دبا کر پل بھر میں چاقو کا چمکتا ہوا' لمبا پھل جنت گل کے پیٹ کے سامنے لہرانے لگا۔

جنت گل اوپر جانے کے لیے واپس مڑی تو مجھے اُس کے بند ہونٹوں کے سِروں پر استہزائیہ سی مسکراہٹ کے مچلنے کا احساس ہوا۔ وہ جاتے جاتے عبدالرحیم خان کے بے رحمانہ چنگل میں پھنس چکی تھی لیکن میں یہ اندازہ لگانے سے قاصر تھا کہ وہ فلیٹ میں واپس جاکر کیا کرنا چاہ رہی تھی۔

میں چھوٹے خان کے شکاری چاقو کے مقابلے میں غیر مسلح تھا۔ وقت حاصل کرنے کے لیے' اس موقع پر جنت گل کی تقلید ہی سب سے مناسب تھی۔ ہم چھوٹے خان کے فلیٹ کے سامنے پہنچے تو اس نے وحشیانہ انداز میں چاقو کا پھل لہرا کر ہم دونوں کو ایک طرف ہٹایا اور پھر اپنی چابی سے قفل کھول کر دروازے کو اندر کھول دیا۔ اُس کے اشارے پر ہم دونوں اندر داخل ہوگئے۔

چھوٹا خان عجلت اور اعصابی تناؤ کے عالم میں کی ہول سے اپنا کی رِنگ نکالنا بھول گیا تھا۔ میں ہر بات پر گہری نظر رکھ رہا تھا اس لیے میں نے اندر داخل ہوتے ہوئے نہایت غیر محسوس انداز میں وہ کی رِنگ نکال کر اپنی جیب میں منتقل کرلیا۔

اس لرزہ خیز صورتِ حال میں میرا ذہن پوری سرعت کے ساتھ کام کررہا تھا۔ مجھے وہ زندگی اور موت کے فیصلہ کن لمحات نظر آرہے تھے لیکن میں یہ اندازہ لگانے سے قاصر تھا کہ عبدالرحیم خان کا تنومند ساتھی کہاں تھا۔ اگر چھوٹا خان اکیلا تھا تو میری اور جنت گل کی گلو خلاصی کے امکانات موجود تھے لیکن دوسری صورت میں ہمارے لیے بچاؤ کا ہر راستہ مسدود ہوچکا تھا۔ وہ دوسری صورت یہ ہوسکتی تھی کہ وہ وحشی نیچے گاڑی میں بیٹھا ہوا اپنے آقا کی واپسی کا انتظار کررہا ہو۔ زینوں سے چھوٹے خان کے بجائے ہم دونوں کو برآمد ہوتا ہوا دیکھ کر وہ شخص ہمارے فرار کی راہ میں حائل ہوسکتا تھا۔

میرے لیے امید کی کرن بس ایک ہی تھی۔ اگر وہ شخص گاڑی میں موجود ہوتا تو چھوٹا خان چابیوں کا گچھا اگنیشن ہی میں چھوڑ کر آتا۔ چابی ساتھ لانے کا مطلب یہ تھا کہ وہ اکیلا ہی آیا تھا لیکن میری وہ خوش فہمی بھی زیادہ دیر تک قائم نہیں رہ سکی۔ فلیٹ کے داخلی دروازے کی چابی بھی اسی گچھے میں تھی۔ چھوٹا خان ہردو صورتوں میں چابیاں اپنے ساتھ لانے پر مجبور تھا۔

وہ ہم دونوں کے بعد فلیٹ میں داخل ہوا اور دروازہ بند ہوتے ہی اپنی مادری زبان میں جنت گل پر برسنے لگا۔ غصے سے جنت گل کا چہرہ سرخ ہوگیا اور وہ بھی اسی زبان میں گرجنے لگی۔

شاید جنت گل کی باتیں بہت سخت بلکہ ناقابلِ برداشت تھیں۔ عبدالرحیم خان نے پوری قوت سے الٹا ہاتھ گھمایا اور چٹاخ کی پُرشور آواز کے ساتھ جنت گل کے بائیں رخسار کی نرم و نازک جلد کئی جگہ سے پھٹ گئی اور لمحہ بھر بعد اس کی بائیں آنکھ کے گوشے پر نیل نمودار ہوگیا جس کی وجہ سے اس کی وہ آنکھ متورم نظر آنے لگی۔

تھپڑ کھانے کے بعد جنت گل کے ہونٹوں پر زہریلی مسکراہٹ آگئی۔ اس نے کاٹ دار لہجے میں پھر کچھ کہا۔ عبدالرحیم خان پھر اس کی طرف لپکا اور اس بار مجھ سے برداشت نہیں ہوسکا۔ میں نے جھپٹ کر اس کے گریبان پر ہاتھ ڈال دیا۔

عبدالرحیم خان نے وحشیانہ انداز میں اپنا چاقو والا ہاتھ گھمایا۔ اگر میں بہت تیزی کے ساتھ اچھل کر الگ نہ ہوگیا ہوتا تو چاقو کے پھل نے میرے پیٹ کا بڑا حصہ چیر کر رکھ دیا ہوتا۔

"خبردار! تم بیچ میں نہ آنا۔" وہ خونخوار انداز میں میری طرف دیکھتے ہوئے بولا۔ "یہ ہمارا آپس کا معاملہ ہے۔ تم بیچ میں آئے تو پیٹ کاٹ کر ساری آنتیں باہر نکال دوں گا۔"

"تم میری موجودگی میں جنت گل پر ہاتھ نہیں اٹھا سکتے۔ میں تمہاری گردن مروڑ کر رکھ دوں گا۔" میں نے اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کہا۔ "عورتوں پر ہاتھ اٹھانا مردانگی کے خلاف ہے۔ اپنی طاقت پر گھمنڈ ہے تو پہلے مجھ سے دو دو ہاتھ کرکے فیصلہ کرلو۔"

وہ پہلے ہی بھڑکا ہوا تھا۔ میرے فقروں نے اسے آپے سے باہر کردیا اور وہ چاقو تان کر تیزی سے مجھ پر حملہ آور ہوا۔ میں نے اس کے قدموں پر نظریں جماتے ہوئے' آخری لمحات پر اپنی جگہ چھوڑ دی۔ میرا خیال تھا کہ وہ اپنے ہی زور میں دیوار سے جا ٹکرائے گا لیکن وہ سنبھل کر فوراً ہی پلٹ پڑا۔ اس بار اس نے مجھے ایک کونے میں گھیر لیا تھا اور کوئی تیز ترین جھکائی دیے بغیر' میرا اس کے وار سے بچنا محال تھا۔

وہ دونوں ہاتھ پھیلا کر میری طرف بڑھ رہا تھا۔ میری نگاہیں اس پر جمی ہوئی تھیں۔ میں نے جنت گل کو اپنے ہینڈ بیگ میں ہاتھ ڈالتے دیکھا اور ایک فائر کی پُرشور آواز کے ساتھ ہی' سانڈ کی طرح اکڑتا ہوا' عبدالرحیم خان منہ کے بل فرش پر ڈھیر ہوگیا۔ چاقو اس کے ہاتھ سے نکل کر دور جاگرا تھا۔ اس کے حلق سے بس ہلکی سی آواز نکلی تھی۔

اس کی پشت میں بائیں طرف سوراخ ہوچکا تھا جس میں سے رِسنے والا خون اس کی ٹی شرٹ کو داغ دار بنا رہا تھا۔ اس نے اپنی دونوں ہتھیلیاں فرش پر جما کر اٹھنے کی کوشش کی۔ وہ کسی حد تک کامیاب بھی ہوگیا لیکن زخم شاید کاری تھا۔ وہ فرش سے چند انچ اوپر اٹھنے کے بعد ایک جھٹکے کے ساتھ دوبارہ فرش پر گر گیا۔ اس کے بھاری بھرکم وجود پر تشنج کی سی کیفیت طاری ہوچلی تھی۔

"کسی کے آنے سے پہلے یہاں سے نکل چلو!" جنت گل نے میرا ہاتھ تھام کر تیزی سے کہا اور پھر ہم دونوں تقریباً بھاگتے ہوئے وہاں سے نکلتے چلے گئے۔ جنت گل نے ریوالور دوبارہ ہینڈ بیگ میں ڈال لیا تھا۔

زیرِ تعمیر اور کھردرے زینے عبور کرکے ہم دونوں نیچے پہنچے تو زینوں کے ساتھ ایک پک اپ کھڑی ہوئی تھی جو افغانوں میں ہر مصرف کے لیے بہت مقبول تھی۔ پک اپ کی ڈرائیونگ سیٹ کا

دروازہ کھولتے ہوئے میں نے محسوس کیا کہ وہ ویران اور اجاڑ علاقہ میرا دیکھا بھالا نہیں۔ وہاں لق و دق میدان کے وسط میں کئی عمارتوں کے زیرِ تعمیر ڈھانچے کھڑے ہوئے تھے۔ صرف عبدالرحیم خان والی عمارت ایسی تھی جس کی دیواریں بھی بنی ہوئی تھیں اور شاید اسی عمارت میں اِکّا دُکّا فلیٹوں کو مکمل کرکے آباد بھی کرلیا گیا تھا ورنہ بیشتر علاقہ کھنڈرات کا سا آسیبی سماں باندھ رہا تھا۔ ان ڈھانچوں کے آس پاس مزدور طبقے سے تعلق رکھنے والے کچھ متجسّس افراد اِدھر اُدھر کھڑے ہوئے چہ میگوئیاں کرنے میں مصروف تھے۔ شاید جنت گل کے ریوالور سے ہونے والے فائر کی آواز نے ان کی توجہ اپنی طرف مبذول کرالی تھی۔ ان لوگوں کی توجہ اسی عمارت کی طرف تھی جس سے ہم باہر آئے تھے لیکن غالباً ان میں سے کوئی بھی صحیح اندازہ نہیں کرسکا تھا کہ گولی کہاں اور کس پر چلائی گئی تھی۔ ویسے بھی فضا میں دھندلکا پھیل چلا تھا اور لوگ اپنے ٹھکانوں سے آگے بڑھنے پر آمادہ نہیں تھے۔

جنت گل کا نشانہ اس قدر بے خطا تھا کہ چھوٹے خان کو چیخنے کا موقع بھی نہیں مل سکا تھا اور حلق سے ایک گھٹی گھٹی سی آواز نکال کر رہ گیا تھا ورنہ فائر کی مہیب گونج کے مقابلے میں انسانی چیخ کی سمت کا تعین زیادہ آسانی سے کیا جاسکتا تھا۔

میں نے ڈرائیونگ سیٹ سنبھالتے ہی پک اپ کا انجن اسٹارٹ کردیا اور جب جنت گل بھی سوار ہوگئی تو میں نے گاڑی آگے بڑھاتے ہوئے اُس سے پوچھا۔ ”یہ کون سا علاقہ ہے؟ ہم کس طرف سے باہر نکل سکیں گے؟“

”یہ سپرہائی وے سے ملحقہ علاقہ ہے جہاں فلیٹس بن رہے ہیں۔ سیدھے جاکر‘ برساتی نالے کے ساتھ داہنی طرف مڑوگے تو سپرہائی وے کا راستہ شروع ہوجائے گا۔“ اس نے اطمینان سے بتایا۔ اس پر تھوڑی دیر قبل چلائی ہوئی گولی کی ذرا بھی دہشت نہیں تھی۔ یہ معلوم ہو رہا تھا جیسے اس قسم کی مار دھاڑ اُس کے معمول میں ہو۔

”تمہاری چلائی ہوئی گولی شاید اس کے دل میں پیوست ہوئی ہے۔ میرا خیال ہے کہ وہ زندہ نہیں بچ سکے گا۔“

”اس کا مرجانا ہی اس کے حق میں بہتر رہے گا۔ اس نے میرا دل توڑا اور میں نے اس کے دل میں سوراخ کردیا۔ حساب برابر ہوگیا۔ ہاں‘ اس کے ماموں کو رسوائی کا عذاب جھیلنے کے لیے زندہ رہنا ہوگا۔“

”اور تمہیں ایک جیتے جاگتے انسان کو مارڈالنے پر کوئی قلق نہیں ہے“ میں نے حیرت سے پوچھا۔

”نہیں۔“ وہ کسی ہچکچاہٹ کے بغیر بولی۔ ”میں اسے نہ مارتی تو وہ چاقو سے تمہارا پورا بدن ادھیڑ ڈالتا۔ چاقو زنی میں اسے کمال کی مہارت حاصل تھی۔ پھر میں نے تو اسے ایک ہی وار میں زندگی کے عذاب سے نجات دلائی ہے۔ یہ سردار اور خان زادے تو اتنے سنگ دل ہیں کہ اپنے محکوموں کو زندہ رہنے دیتے ہیں نہ مرنے دیتے ہیں۔“

میں اسے اپنے ساتھ لے جانے پر آمادہ نہیں تھا۔ وہ خود بھی مجھ سے الگ ہوجانا چاہتی تھی مگر پھر بھی میں اس کی طرف سے فکرمند تھا۔ عبدالرحیم خان نے مرنے سے پہلے اس کے بائیں رخسار پر تھپڑ رسید کرکے اس کا حلیہ بگاڑ دیا تھا۔ نیلے اودے زخم سے رستے ہوئے تازہ خون کی وجہ سے وہ ہر ایک کی نگاہوں کا مرکز بن سکتی تھی۔

کچھ دور نکل آنے کے بعد مجھے داہنی طرف‘ کافی فاصلے پر سپرہائی وے کے آثار نظر آنے لگے۔ قرب و جوار کی زمین سے قدرے بلند‘ اس شاہراہ پر ٹرک اور گاڑیاں کھلونوں کی طرح رواں نظر آرہی تھیں۔

”عبدالرحیم خان کے چھوٹے ماموں نے قندھار کے ایک بزاز کی لڑکی سے شادی کی تھی۔ میں نے عبدالرحیم خان کو اس شادی کا طعنہ بھی دیا تھا۔“ کچھ دیر کی خاموشی کے بعد وہ خود ہی بولنے لگی۔ ”لیکن حقیقت یہ ہے کہ پائندہ گل نے اس شادی کے سات برس بعد تک اپنے بھائی سے میل جول بند رکھا تھا۔ ان دونوں بھائیوں میں اس وقت بات چیت شروع ہوئی جب پائندہ گل کو یقین ہوگیا کہ قندھاری لڑکی کبھی ماں نہیں بن سکے گی۔ یہ لوگ دوسروں کا نسب خراب کرتے پھرتے ہیں لیکن اپنے خون پر انہیں اتنا گھمنڈ ہے کہ وہ قندھاری عورت آج بھی شنگارا دیلی کے ایک الگ تھلگ جھونپڑے میں کسی کوڑھی کی طرح اکیلی پڑی رہتی ہے۔ شاید قدرت نے مجھے ان کے غرور کا سر نیچا کروانے کے لیے ہی زندہ رکھا ہے ورنہ میں لوگوں کی باتیں سن سن کر کئی بار مرنے کے بارے میں سوچ چکی تھی۔“

میں نے اپنی زبان بند ہی رکھی۔ وہ لڑکی کافی دکھی تھی۔ میں اسے زیادہ چھیڑ کر اس کے زخموں کو نہیں کُریدنا چاہتا تھا۔

کچے راستوں پر سست رفتار ڈرائیونگ کے بعد ہم سڑک پر آئے تو مجھے اندازہ ہوا کہ عبدالرحیم کا وہ فلیٹ افغانی خیمہ بستی سے زیادہ دور نہیں تھا۔ جنت گل نے مجھ سے درخواست کی کہ میں اسے سہراب گوٹھ پر اتار دوں۔ میرا خیال تھا کہ ان اطراف میں وہ پک اپ عبدالرحیم خان کے حوالے سے پہچانی جاتی ہوگی اس لیے میں اسے آباد علاقے میں نہیں لے جانا چاہتا تھا۔ میرے تردّد کا اندازہ کرتے ہی جنت گل نے پک اپ اسی سنسان مقام پر رکوالی۔

”تم یہیں اتر جاؤ۔“ اس نے میرا بازو دباتے ہوئے کہا۔ ”میں اسی پک اپ میں حیدر آباد جارہی ہوں۔ عبدالرحیم خان کی موت کے بعد میں کراچی کے مقابلے میں حیدر آباد میں زیادہ محفوظ رہوں گی۔ ٹنکی میں ڈیزل بھرا ہوا ہے۔ میں ڈیڑھ دو گھنٹے میں وہاں پہنچ جاؤں گی۔ تم مرد ہو۔ یہاں سے تھوڑی دور پیدل جاؤ گے تو کوئی سواری مل جائے گی۔“

میرا دل بھاری ہونے لگا۔ میں نے اُس کے نرم و گداز ہاتھ اپنے ہاتھوں میں تھام لیے۔ ”میں تمہیں کبھی نہیں بھول سکوں گا۔ میری اور تمہاری دوستی بہت مختصر لیکن یادگار رہی ہے۔ کاش تمہاری زندگی اس قدر کٹھن اور بے کیف نہ ہوتی۔“

”اب تو مجھے ان ہی مشکلات سے لڑنے میں مزہ آتا ہے۔ اپنا خیال رکھنا۔ میں بھی تمہیں یاد رکھوں گی۔ صرف ایک دوست کی طرح۔“ اس نے میرے دونوں ہاتھوں کو اپنی آنکھوں سے لگایا پھر میرے داہنے ہاتھ کی پشت پر اپنے مرمریں ہونٹوں کا ایک سلگتا ہوا بوسہ ثبت کرکے نیچے اتر گئی۔

میں نے بھی ایک جھٹکے کے ساتھ ڈرائیونگ سیٹ خالی کر دی۔ دوستیاں اور جذباتی رفاقتیں کتنی ہی گہری کیوں نہ ہوں‘ ان میں رشتوں والی مضبوطی اور پائیداری کبھی پیدا نہیں ہوتی۔ کسی نہ کسی موڑ پر مصلحتیں اور مفادات آڑے آجاتے ہیں اور پھر ہر فریق کا راستہ‘ دوسرے سے جدا ہوجاتا ہے۔ جنت گل نے گھوم کر ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھنے سے پہلے مجھ سے گرمجوشی کے ساتھ ہاتھ ملایا پھر پک اپ اسٹارٹ کرکے یوٹرن لیا اور تیزی کے ساتھ حیدر آباد کی سمت میں روانہ ہوگئی۔ میں کچھ دیر تک وہیں کھڑا‘ دور ہوتی ہوئی پک اپ کو دیکھتا رہا اور پھر سر جھکا کر ان روشنیوں کی طرف چل دیا جو سہراب گوٹھ کے قرب و جوار کی آبادی کی نشاندہی کررہی تھیں۔

پیدل طے کرنے کے لیے وہ فاصلہ خاصا طویل تھا۔ میں چنگی ناکے کے پُرہجوم علاقے سے گزرا تو فضا میں اندھیرا گہرا ہوچکا تھا۔ میں نے پہلی خالی ٹیکسی حاصل کی اور ایک صبر آزما قید سے نجات کے بعد شرف آباد کی طرف روانہ ہوگیا۔

جنت گل جب تک میرے ساتھ تھی‘ اپنی ساری اچھائیوں اور برائیوں کے ساتھ میرے ہوش و حواس پر چھائی ہوئی تھی لیکن ایک بار اس کے بچھڑنے کا پورا یقین ہوجانے کے بعد اس کا خیال نئے مسائل کے پیچاک میں خود بخود دھندلانے لگا۔

میں نے شرف آباد کی جانی پہچانی گلی میں ٹیکسی سے اتر کر کرایہ ادا کیا اور زینے طے کرکے تیزی کے ساتھ جہانگیر والے فلیٹ کے سامنے جا پہنچا۔ میں نے چند ثانیوں تک اندر کی سن گن لینے کی کوشش کی لیکن دوسری طرف سناٹا چھایا رہا تو میں نے ہولے سے ڈوربیل بجادی۔ اندر سے بھاگتے ہوئے قدموں کی دھمک دروازے کی طرف آئی اور دروازہ کھولتے ہی سلطان شاہ والہانہ انداز میں میرے سینے سے لپٹ گیا۔

اس کی تحیر زدہ آواز سن کر ویرا اور غزالہ بھی ڈرائنگ روم سے نکل آئیں۔ اس وقت تک میں سلطان شاہ کے ساتھ دروازہ عبور کرکے لابی میں داخل ہوچکا تھا۔ پھر مجھے اول خان بھی نظر آیا جو ڈرائنگ روم کے دروازے پر آکر رک گیا تھا۔

میں باری باری ان چاروں سے ملتا ہوا ڈرائنگ روم میں پہنچا تو میرے اوپر ہر طرف سے سوالات کی بوچھاڑ ہوگئی۔

اس وقت میں واضح طور پر دیکھ رہا تھا کہ میری خیر و عافیت کے ساتھ واپسی پر غزالہ سب سے زیادہ خوش نظر آرہی تھی اور اس کے لیے اپنی اس خوشی کو چھپائے رکھنا دشوار ہو رہا تھا۔

”آج میں نے بہت بڑا جُوا کھیلا تھا جس میں مجھے ناکامی نہیں ہوئی۔“ اول خان نے پُرجوش انداز میں کہا۔ ”کل ان لوگوں نے شہید ملت روڈ پر سلطان شاہ کو گھیرنے کی کوشش کی تھی لیکن میرے آدمیوں نے ان پر اتنی زبردست فائرنگ کی کہ وہ بھاگنے پر مجبور ہوگئے۔ ہوسکتا ہے کہ ان میں سے ایک آدھ مر بھی گیا ہو.....“

”ایک مرا تھا۔“ میں نے اس کی بات کاٹتے ہوئے کہا۔ ”اس کی تدفین آج ہوئی ہے۔“

”گڈ۔“ وہ خوش ہو کر بولا۔ ”وہ خبر ملنے کے بعد ہی میں شام کی پرواز سے کراچی آگیا تھا۔ اس وقت مجھے پہلی بار اندازہ ہوا کہ وہ لوگ پشاور میں بڑے خان کی حویلی کے گھیراؤ کے باوجود اپنی ضد پر اڑے رہیں گے جس کے نتیجے میں تم کو کوئی بھی نقصان پہنچ سکتا ہے۔ میرے لیے وہ صورتِ حال بہت تشویش ناک تھی۔“

”میں اپنی کتھا بعد میں سناؤں گا۔“ میں نے ہنستے ہوئے کہا۔ ”یہ بتاؤ کہ تم نے ان کی ہیروئن ہی واپس کی ہے یا اس کی جگہ کوئی اور سفوف پکڑا دیا ہے؟ اس کی مالیت بائیس لاکھ بتائی گئی تھی۔“

”میں نے اپنی زندگی میں پہلی بار بلیک میلنگ کے آگے ہتھیار ڈالے ہیں۔“ اول خان کے لہجے سے قلق کا اظہار ہو رہا تھا اور بقیہ تینوں اتنی دلچسپی کے ساتھ اس کی طرف متوجہ تھے جیسے کہانی کا وہ حصہ ان کے لیے نیا ہو۔ وہ کہہ رہا تھا۔ ”انسانوں کو یرغمال بنا کر سودے بازی کرنے والے پیشہ ور لوگ بہت شاطر اور خطرناک ہوتے ہیں۔ ٹریڈ لائن کے دفتر سے ہاتھ آنے والی ہیروئن میری ہی تحویل میں تھی۔ میں نے آج ان کے آدمی کو ایک ہوٹل میں ملنے کا پیغام دیا تھا۔ چار بجے عبدالرحیم خان آیا تو میں نے ہیروئن اسے لوٹا دی۔ اس وقت سے میرے دل کی عجیب حالت تھی اور میں ڈر رہا تھا کہ کہیں ہیروئن لینے کے بعد وہ اپنے وعدے سے نہ مُکر جائیں لیکن شکر ہے کہ وہ لوگ زبان کے پکے ثابت ہوئے۔ تمہیں دیر ضرور ہوئی ہے لیکن تم لوٹ آئے ہو۔“

”عبدالرحیم خان کی اجازت ملنے سے پہلے میں آزاد ہوچکا تھا۔“ میں نے کہا۔ ”بس وہ عین وقت پر پہنچ گیا اور اس کے نتیجے میں اپنی جان سے ہاتھ دھو بیٹھا۔ اس کی لاوارث لاش اب کسی ہمدرد کی منتظر ہوگی۔“

ان لوگوں کے اصرار پر میں نے اپنی کہانی چھیڑ دی۔ جنت گل کے بارے میں میں نے بہت اختصار سے کام لیتے ہوئے صرف اتنا بتایا کہ وہ اپنے محبوب اور اس کے ماموں سے باغی ہوچکی تھی‘ اس لیے میرا ساتھ دینے پر تُل گئی۔ اس کا مقصد ان دونوں کو زک پہنچانا تھا اور اسی چکر میں عبدالرحیم خان اس کی گولی کا نشانہ بن گیا۔

میری احتیاط کے باوجود ویرا اور غزالہ کی آنکھوں میں بے یقینی کے آثار دور سے ہی پڑھے جاسکتے تھے لیکن میں نے ان دونوں کی طرف دھیان دیے بغیر اپنی کہانی پوری کرڈالی۔ میں نے اپنے اور مافیا کے تعلق پر زبان نہیں کھولی تھی۔

عبدالرحیم خان کے قتل کی خبر اول خان کے لیے اچنبھے کا سبب ثابت ہوئی کیونکہ وہ شام کے چار بجے اس سے ملا تھا تو اس کے وہم وگمان میں بھی نہیں تھا کہ سودے بازی مکمل ہوجانے کے بعد وہ یوں اچانک مارا جائے گا۔ سردار پائندہ گل والے قصے میں سب لوگ ہی کسی نہ کسی طرح ملوث رہے تھے لیکن سب کے پاس ادھوری کہانیاں تھیں۔ جنہیں یکجا کیے بغیر وہ سب بے سروپا محسوس ہو رہا تھا۔ ہم لوگ کافی دیر تک اسی بحث میں الجھے رہے پھر غزالہ کو میرے بلکہ سب لوگوں کے کھانے کا خیال آیا اور وہ ویرا کے ساتھ وہاں سے اٹھ گئی۔

"یہ بتاؤ کہ تمہاری اچانک واپسی سے البرٹو ویلیسا والے معاملات پر تو کوئی اثر نہیں پڑا ہوگا؟" میں نے انگڑائی لیتے ہوئے اول خان سے دریافت کیا۔ "بظاہر تمہاری وہاں سے اتنی جلد گلو خلاصی کے آثار نہیں تھے۔"

"ہاں۔" وہ میری طرف جھک آیا۔ "تم آج بے فکر ہو کر آرام کرلو۔ کل رات ایک مہم درپیش ہوگی۔ اسلام آباد کے تمام معاملات میں اپنے کمانڈر کو سونپ آیا ہوں۔ انہیں نمٹانے کے لیے شاید میری ضرورت پیش نہیں آئے گی۔"

"کل رات کی مہم کی نوعیت کیا ہوگی؟" میں نے تجسس کے ساتھ سوال کیا۔

اس نے ایک نظر سلطان شاہ کی طرف دیکھا اور کہا۔ "ویرا نے اسلام آباد کے واقعات کے بارے میں ان لوگوں کو بریفنگ دے دی ہے اور شاید یہ بھی بتا دیا ہے کہ البرٹو ویلیسا، کرنل جیسی جونز کے لیے کام کررہا تھا....."

"اگر کوئی خفیہ بات کرنی ہو تو میں باہر چلا جاتا ہوں۔" سلطان شاہ نے اس کی بات کاٹتے ہوئے فوراً ہی پیشکش کرڈالی۔ "بعد میں اندر لوٹ آؤں گا۔ مجھے معلوم ہے کہ ظفر کے روپ میں البرٹو ویلیسا کیا کچھ کررہا تھا۔"

"بے وقوف ہو تم۔" اول خان ہنس کر بولا۔ "میرے کہنے کا مقصد صرف یہ تھا کہ مجھے پرانی باتوں کا اعادہ کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ تم ہر بات سے واقف ہو۔ ٹیلی فون کے محکمے میں اولیانو کا ٹیکس منقطع کرکے، اس نمبر پر جو خفیہ مشین لگائی گئی تھی، اس پر آج ہی ظفر کے نام ایک گمنام پیغام آرہا ہے جو پرانے پیغام کے تسلسل میں ہے اور اسی رسم الخط میں لکھا ہوا ہے۔ اس کے مطابق پیغام دینے والا پرواز نمبر ایل ایچ آٹھ سو بارہ سے کراچی آیا ہے۔ اس کے استقبال کے لیے ہمیں ہوائی اڈے پر پوری طرح تیار رہنا ہوگا۔"

"یہ تو لفت ہنسا کی پرواز ہوئی۔ معلوم ہوتا ہے کہ فرینکفرٹ سے آرہی ہوگی۔"

"لیکن ضروری نہیں کہ پیغام دینے والا کوئی جرمن ہی ہو۔ وہ لندن یا کسی اور شہر سے بھی فرینکفرٹ کے راستے آسکتا ہے۔ مسئلہ یہ ہے کہ ہمیں اس کی آمد کی اطلاع مل گئی ہے لیکن ہم اس کے نام اور قومیت سے لاعلم ہیں۔ ایسی صورت میں ہم اس پرواز سے آنے والے متعدد مسافروں میں سے اسے کیسے تلاش کرسکیں گے؟"

"تمہارے ریکارڈ سے کرنل جیسی جونز اور اس کے آدمیوں کے بارے میں کیا معلومات حاصل ہوسکتی ہیں؟"

"کچھ بھی نہیں۔" اس نے مایوسی کے ساتھ کہا۔ "اس کے بارے میں مختصر کوائف ہمارے ریکارڈ میں ضرور موجود ہیں لیکن تفصیل نہیں ہے۔ دراصل وہ ایشیائی ملکوں کی طرف متوجہ ہی نہیں تھا اس لیے شاید اس کے بارے میں زیادہ کام کرنے کی ضرورت محسوس نہیں کی گئی۔"

"اس ناکافی پیغام کا مطلب ہے کہ البرٹو اسے پہچانتا تھا۔" سلطان شاہ بولا۔

"وہ تو بہت سے لوگوں کو پہچانتا ہوگا لیکن وہ جہنم واصل ہوچکا ہے اور ہم اندھیرے میں ہیں۔"

"پھر یہ ضروری بھی نہیں کہ کرنل جیسی جونز خود ہی یہاں آرہا ہو۔" سلطان شاہ نے اس مسئلے پر دماغ سوزی شروع کردی تھی۔ "وہ مبہم پیغام اس کے کسی آدمی کی طرف سے بھی ہوسکتا ہے۔"

"ان خامیوں کی وجہ سے ہم یہ موقع ضائع نہیں کرسکتے۔" میں نے اپنی جگہ پر پہلو بدلتے ہوئے کہا۔ "ہمیں کل ائرپورٹ پر وقت دینا ہوگا۔ ہوسکتا ہے کہ وہ اپنی کسی بوکھلاہٹ کی وجہ سے خود ہی ہماری نظروں میں آجائے۔"

"اس بارے میں ایک اور امکان پر غور کیا گیا تھا کہ فرینکفرٹ سے اس پرواز پر سوار ہونے والے مسافروں کے امیگریشن کارڈز کی تفصیلات حاصل کرلی جائیں۔ طیارے میں بورڈنگ مکمل ہونے سے یہاں پرواز پہنچنے تک سات آٹھ گھنٹے کا وقت مل جاتا ہے۔ جب کہ ٹیکس پر مطلوبہ معلومات چند منٹ میں یہاں آسکتی ہیں لیکن یہ راستہ بھی قابلِ عمل نہیں ہے۔" اول خان اس بارے میں گہرے اضطراب میں مبتلا نظر آرہا تھا۔

"یہ تجویز جان دار معلوم ہوتی ہے۔ طیارے پر سوار ہونے سے پہلے، امیگریشن کارڈ میں سفر کی پچھلی اور اگلی منازل کے علاوہ سفر کا مقصد بھی درج کرنا ہوتا ہے۔ ان کوائف سے بھی کوئی نہ کوئی سراغ مل سکتا تھا۔ سب سے بڑی بات یہ ہے کہ مسافروں کے ناموں کی مکمل فہرست اور ان کی قومیتیں معلوم ہوسکتی ہیں۔" میں نے مسرت کا اظہار کیا۔

"ایسا ریکارڈ کسی قیمت پر نہیں مل سکتا۔" اول خان کے جواب نے میری امیدوں پر اوس ڈال دی۔ "جب سے ہائی جیکنگ وغیرہ کی وارداتوں میں اضافہ ہوا ہے۔۔غیر ملکی کمپنیاں ایسے ریکارڈ کو انتہائی خفیہ رکھنے لگی ہیں۔ کسی خاص مسافر کا نام ہی پوری پرواز کے لیے خطرہ بن سکتا ہے۔ اپنے مطلوبہ شخص کو راہ سے ہٹانے کے لیے عالمی دہشت گرد یا کسی خاص ملک کے سیکرٹ ایجنٹ طیارے کو دورانِ پرواز اُڑانے کی کوشش بھی کرسکتے ہیں۔ طیارے کے منزلِ مقصود پر پہنچنے تک ایسا ریکارڈ خفیہ اور سیل رکھا جاتا ہے۔ اس اصول سے استثنیٰ حاصل کرنا ناممکنات میں سے ہے۔"

"اس بارے میں صبح بات ہوگی۔" اول خان نے ایک گہرا سانس لے کر اپنی جگہ چھوڑ دی۔ "میرے لیے آج کا دن بہت لمبا ہوگیا ہے اور تم کو بھی آرام کی ضرورت ہے۔"

غزالہ نے کھانے کے لیے اسے روکنے کی کوشش کی لیکن اس نے مسکرا کر اسے یاد دلایا کہ اس کی بیوی بھی گھر پر اس کا انتظار کررہی ہوگی جب کہ مجھے غزالہ کی توجہ کی ضرورت تھی۔ غزالہ لاجواب ہوگئی اور اول خان رخصت ہوگیا۔

"تم نے اپنے شبہات کو حقیقت ثابت کرکے ہی دم لیا۔" کھانے کی میز پر غزالہ نے بات چھیڑی۔ "ویرا نے البرٹو ویلیسا کے بارے میں جو ڈراؤنی کہانیاں سنائی ہیں، ان سے دل دہل کر رہ گیا ہے۔ اس خبیث آدمی نے بے چارے ظفر کا نہ جانے کیا حشر کیا ہوگا۔ اس کا تو اب کچھ پتا ہی نہیں چل سکتا۔"

"اس بات میں کوئی شبہ نہیں کہ ظفر کی اصلیت پر سب سے پہلے ڈینی نے شبہ ظاہر کیا تھا۔" ویرا نے کھلے دل کے ساتھ اعتراف کیا۔ "میرا تو ذکر ہی الگ ہے، اول خان بھی ڈینی کے خیال سے متفق نہیں تھا۔"

"حالانکہ اس شبہے کی بنیاد تم نے ڈالی تھی۔ ظفر اور البرٹو ویلیسا کے قریبی شباہت کا علم ہونے کے بعد ہی میں نے اس کی حرکتوں کا تنقیدی جائزہ لینا شروع کیا تھا ورنہ یہ بات آج بھی سامنے نہ آتی۔"

ویرا میری طرف دیکھتے ہوئے ہنس پڑی۔ "معلوم ہوتا ہے کہ تمہاری کھوپڑی میں کوئی ریڈار لگا ہوا ہے جو ہر وقت اور ہر سمت میں کام کرتا رہتا ہے۔ ٹی سے بغاوت کے بعد تمہاری سوچ ہی بدل کر رہ گئی ہے۔"

غزالہ کو ان باتوں سے زیادہ البرٹو ویلیسا کی سنسنی خیز سرگرمیوں میں دلچسپی تھی۔ اس نے فوراً ہی گفتگو کا رخ اپنے پسندیدہ موضوع کی طرف موڑتے ہوئے پوچھا۔ "دھماکے سے پھٹنے والے ان بندروں کا کیا بنا جن کے جسموں میں بالکل نئی قسم کے طاقتور کیمرے لگے ہوئے تھے؟"

"کچھ دھماکوں سے پھٹ گئے۔ جو زندہ ہیں ان کی حفاظت کی جارہی ہے تاکہ ان کی کاٹ چھانٹ کرکے ان کیمروں کی اصل کارکردگی کا اندازہ لگایا جاسکے۔ اس کام کے لیے باہر سے آنے والے کسی ماہر کا انتظار ہے۔"

"سردار پائندہ گل کے آدمیوں کی طرف سے نگرانی اور ڈرانے دھمکانے کا سلسلہ شروع نہ ہوگیا ہوتا تو شاید تم ابھی تک اسلام آباد ہی میں بیٹھے رہتے؟" غزالہ نے شکایت بھرے انداز میں سوال کیا۔

"میں وہاں بھی مصروف تھا۔ تم ویرا سے پوچھ سکتی ہو کہ ہماری کتنی راتیں بھاگ دوڑ میں برباد ہوئی ہیں۔"

غزالہ ہنسنے لگی۔ "تم دونوں ہر وقت یک زبان رہتے ہو۔ مجھے معلوم ہے کہ ویرا تمہاری بات کی تائید کرے گی۔ آخر کو وہ بھی اسلام آباد میں تمہارے ساتھ ہی رہ رہی تھی۔ تمہارے ساتھ یہ بھی بھاگتی دوڑتی رہی ہوگی۔"

ویرا نے اس کے جملوں میں پوشیدہ طنز کو بھانپ لیا اور تلخ سی مسکراہٹ کے ساتھ بولی۔ "یہ تمہاری خام خیالی ہے۔ ڈینی مجھ سے اپنا مطلب نکالنے کے باوجود مجھ سے بہت سی باتیں پوشیدہ رکھتا ہے اور میں پوری کوشش کے باوجود ان باتوں سے لاعلم ہی رہتی ہوں۔ میرا یہ حال ہے کہ میرے کارڈز ہر وقت تمہارے سامنے رہتے ہیں۔"

میں اس کا اشارہ سمجھ گیا لیکن مجھے اپنی مدافعت میں کچھ نہ کچھ کہنا ہی تھا۔ "ہوسکتا ہے کہ بعض اوقات تم کو ایسا محسوس ہوتا ہو لیکن حقیقت اس کے برعکس ہے۔ میں دیدہ و دانستہ تمہیں اندھیرے میں رکھنے کی کوئی کوشش نہیں کرتا۔ تم حساس ترین معاملات میں بھی میرے اہم رازوں میں شریک رہی ہو۔"

"جب تم چاہتے ہو تو مجھے ہم راز بنالیتے ہو اور جب چاہتے ہو بالکل الگ کردیتے ہو۔" ویرا میری طرف دیکھتے ہوئے بولی۔ "اب تم سردار پائندہ گل والے واقعے کو ہی لے لو۔ اگر مجھے مجبوراً اول خان سے رجوع نہ کرنا پڑتا تو میرے فرشتوں کو بھی علم نہ ہوپاتا کہ ان واقعات کا تعلق مافیا اور ٹریڈ لائن پر آنے والی تباہی سے ہے۔ اول خان نے بھی اپنی جھونک میں کچھ باتیں بتادی تھیں لیکن جوں ہی اسے میری لاعلمی کا احساس ہوا، اس نے سختی کے ساتھ اپنی زبان بند کرلی۔ مجھے یہ بتاؤ کہ بائیس لاکھ کی ہیروئن سے تمہارا کیا تعلق تھا؟ کیا تم مافیا کی تباہی کے بارے میں اسی قدر معصوم اور بے خبر تھے جتنا خود کو ظاہر کرتے رہے تھے؟"

"ٹریڈ لائن پر کارروائی والی رات میں گھر سے ضرور غائب تھا لیکن میرا اس واقعے سے کوئی تعلق نہیں تھا۔ وہ خالص پولیس ایکشن تھا جس میں ایس ٹی ایف والوں کی مدد لی گئی تھی۔ یہ بھی مجھے بعد میں معلوم ہوا تھا۔"

"میرا اندازہ ہے کہ تم نے مافیا کی صفوں میں اپنی جگہ پیدا کرکے اُن کی گردن کٹوائی ہے۔"

"تمہاری سوچ پر میں پابندی نہیں لگا سکتا لیکن تم خود سوچو کہ جب میں نے ہیروئن کے کاروبار میں ٹی والوں کی کھلی مخالفت مول

لی تھی تو میرے مافیا میں شامل ہونے کا کیا جواز تھا؟"

"شی کے بعد ان کے قدم اکھاڑ پھینکنے کے لیے تم کچھ بھی کرسکتے ہو۔ تم شاید بھول گئے ہو کہ ابتدا میں مافیا والوں نے میرے خلاف تمہاری بھرپور مدد کی تھی اور میں ان واقعات سے پوری طرح باخبر ہوں۔"

"پھر تمہیں یہ بھی معلوم ہوگا کہ میں نے ان کی پیشکش کو ٹھکرا دیا تھا۔" میں اپنے موقف پر اڑا رہا۔

"ہوسکتا ہے کہ تم نے ان سے کوئی خفیہ سازباز کرلی ہو۔ اب تو میں یہ بھی سوچنے پر مجبور ہوگئی ہوں کہ مکاؤ میں تمہاری موجودگی کے دوران میں مافیا کے ڈان نیشی کاؤ کا قتل کوئی اتفاقی واقعہ نہیں تھا۔ ہوسکتا ہے کہ مافیا کو نقصان پہنچانے کے لیے تم ہی نے وہ سارا منصوبہ تیار کرکے نیشی کاؤ کو ہلاک کیا ہو۔"

"دل میں شبہات گھر کرجائیں تو دوراز کار امکانات بھی حقیقت کا روپ دھارتے نظر آنے لگتے ہیں۔" میں نے تناؤ دور کرنے کے لیے اس کا مضحکہ اُڑاتے ہوئے کہا۔ "تھوڑی دیر میں تم یہ بھی کہہ سکتی ہو کہ پاکستان میں کھوتہ کی بنیاد میرے ہی ایما پر رکھی گئی تھی تاکہ میں اس کے بہانے البرٹو کو مرواسکوں۔"

"بات کو مذاق میں ٹالنے کی کوشش نہ کرو۔" اس کی سنجیدگی میں ذرا بھی فرق نہیں آیا۔ "مجھے اپنے سوالات کے جوابات درکار ہیں۔ میں احمق نہیں ہوں جو یک طرفہ طور پر ہمیشہ تمہارا ساتھ دیتی رہوں گی۔"

"تم نے ابھی تک کوئی ڈھنگ کا سوال ہی نہیں کیا جو میرے کسی جواب کی ضرورت ہو۔"

"جب تمہارا مافیا سے کوئی تعلق نہیں تھا تو سردار پائندہ گل کے آدمی بائیس لاکھ روپے کی ہیروئن کے سلسلے میں تمہارے پیچھے کیوں لگے تھے؟ پائندہ گل کوئی اناڑی آدمی نہیں ہے' ہیروئن کے بادشاہوں میں شمار کیا جاتا ہے اور وہ اپنے دھندے کے اسرار و رموز کو بہت اچھی طرح سمجھتا ہے۔"

"یہ درست ہے کہ اس نے بائیس لاکھ کی ہیروئن مافیا والوں کو ادھار دی تھی۔" میں نے لحہ بھر سوچنے کے بعد اعتراف کرتے ہوئے کہا۔ "ٹریڈ لائن کی بربادی کے بعد وہ اپنی ڈوبی ہوئی رقم کی بازیابی کے لیے میدان میں اترا تو اسے علم ہوا کہ ایک زمانے میں مافیا میری بھی سرگرم طرف دار رہی ہے۔ مافیا کے حمایت یافتہ لوگوں میں سے میرے علاوہ کوئی اور نام اس کے سامنے نہیں تھا اس لیے وہ میرے پیچھے لگ گیا۔ بس یہ سارا قصہ یہیں سے شروع ہوا تھا۔ اس کے علاوہ اس میں کوئی جان نہیں تھی۔"

اس نے اپنا نچلا ہونٹ دانتوں میں دبا کر مجھے گھورا پھر سختی سے بولی۔ "دیکھو' تم مجھے باتوں میں اڑانے کی کوشش نہ کرو۔ میں پھر کہہ رہی ہوں کہ میری کھوپڑی سنک گئی تو ہم دونوں ہمیشہ کے لیے ایک دوسرے کی دوستی سے محروم ہوجائیں گے۔ گہری دوستی کے بعد ہونے والی دشمنی بہت خون آشام اور لرزہ خیز ہوتی ہے۔"

اس کی آنکھوں سے مترشح کبیدگی سے ظاہر ہو رہا تھا کہ وہ دھمکی کو عملی جامہ پہنانے کا ارادہ رکھتی تھی۔

"تم دونوں تو واقعی لڑنے کے موڈ میں معلوم ہوتے ہو۔" غزالہ نے بڑھتی ہوئی تلخی کا اندازہ لگاتے ہوئے ہماری گفتگو میں دخل دیا پھر ویرا سے مخاطب ہوگئی۔ "سچ بات یہ ہے کہ ڈینی نے مکاؤ کے بارے میں تم سے کوئی غلط بیانی نہیں کی۔ نیشی کاؤ کے قتل کی دیدہ دلیرانہ واردات پر ہر شخص حیران رہ گیا تھا۔ اس وقت تو ہم تینوں تو ڈون کوانگ فو کے آدمیوں کی کڑی نگرانی میں تھے۔"

"میرا مشورہ ہے کہ تم میرے اور ڈینی کے جھگڑے میں دخل نہ دو۔" ویرا نے بہت حلیمی کے ساتھ غزالہ کو مشورہ دیا۔ "تم ڈینی کو ایک سعادت مند بیوی کی نظروں سے دیکھتی ہو اس لیے تمہیں اس کی ہر سچی اور جھوٹی کہانی پر یقین آجاتا ہے۔ بعض اوقات تم اس کی صداقت پر شبہ کرتے ہوئے بھی اپنا یقین ظاہر کرنے پر مجبور ہوجاتی ہوگی لیکن میرا معاملہ مختلف ہے۔ میں نے اسے دوست اور دشمن کے ہر روپ میں آزمایا ہے اور میری اٹل رائے ہے کہ اس سے زیادہ مکار اور عیار شخص ملنا محال ہے۔ ہمیں اغوا کرنے والوں نے جو باتیں کی تھیں انہوں نے مجھے چکرا کر رکھ دیا تھا۔ میرا خیال ہے کہ میرے بے ہوش ہونے کے بعد ڈینی نے ان سے کھل کر باتیں کی ہوں گی۔"

"میری ان سے زیادہ بات نہیں ہوئی۔" میں نے اسے سمجھانا چاہا۔ "وہ مجھ سے بائیس لاکھ روپے یا اس ہیروئن کی واپسی کا مطالبہ کررہے تھے جو ٹریڈ لائن کے دفتر میں دی گئی تھی۔ میں اس قصے سے لاعلم تھا لیکن وہ کچھ سننے پر آمادہ نہیں تھے۔ مجھے ایک کنٹینر میں بھوکا پیاسا رکھا گیا تھا اور تم لوگوں کی طرف سے کارروائی شروع نہ ہوتی تو شاید وہ مجھے شنگھائی روانہ کردیتے۔"

ویرا کے ہونٹوں پر زہریلی مسکراہٹ ابھر آئی۔ "اپنی بھوک پیاس کی کہانی سنا کر مجھے متاثر کرنے کی کوشش نہ کرو۔ ہم لوگ ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھے رہتے تب بھی تم نکل آنے میں کامیاب ہوجاتے۔ تم خود بتا چکے ہو کہ چھوٹے خان کی باغی محبوبہ نے تمہیں قید سے نکال دیا تھا۔"

"وہ موقع بھی اس وجہ سے پیدا ہوا کہ اول خان نے چھوٹے خان کو مذاکرات کے لیے بلالیا تھا۔ اس کی موجودگی میں تو جنت گل چاہتے ہوئے بھی کچھ نہیں کرسکتی تھی۔"

"ڈینی کے بارے میں تمہاری رائے بہت سخت ہے۔" غزالہ میز سے اٹھتے ہوئے بولی۔ "اپنے پیچیدہ معاملات کو تم دونوں خود ہی بہتر طور پر نمٹا سکتے ہو۔ اس میں میری مداخلت بات بگاڑ سکتی ہے۔"

ویرا نے مسکرا کر اس کی طرف دیکھا پھر فوراً ہی سنجیدہ ہوکر میری طرف متوجہ ہوگئی۔ "تم مجھے یہ یقین دلانا چاہ رہے ہو کہ اس بار تم مسلسل اتفاقات کا نشانہ بنے رہے ہو۔ اتفاق سے پائندہ گل نے تم سے ایک اچھوتا مطالبہ کردیا اور اتفاق سے ٹریڈ لائن سے پکڑی جانے والی ہیروئن اول خان کی تحویل میں تھی اس لیے تمہاری رہائی یقینی ہوگئی ورنہ تم شنگھائی لے جائے جاسکتے تھے؟"

"بدقسمتی سے ایسا ہی ہوا ہے۔ میرے وہم وگمان میں بھی نہیں تھا کہ ٹریڈ لائن سے ہیروئن برآمد ہوئی ہوگی اور وہ پولیس کے بجائے اول خان کے قبضے میں ہوگی۔" میں نے ایک ایک لفظ پر زور دے کر کہا۔ میری وہ بات سو فیصد درست تھی اس لیے میں نے اس میں مزید زور پیدا کرنے کے لیے مزید کہا۔ "تم چاہو تو اول خان کو حلف دے کر پوچھ سکتی ہو کہ میں کس حد تک سچا ہوں۔"

"یہ سب عقل میں نہ آنے والی باتیں ہیں۔" وہ الجھن میں جلا ہونے لگی تھی۔ "میرا دل گواہی دے رہا ہے کہ تم کسی نہ کسی طرح مافیا میں ملوث تھے اور اول خان نے تمہارے ہی ایما پر حبیب جیوانی کی گردن میں پھندا ڈالا تھا۔ پائندہ گل جانتا تھا کہ تم مافیا میں ہو اسی لیے اس کے آدمیوں کو تمہاری تلاش تھی مگر میں جانتی ہوں کہ میں اپنی چھٹی حس کے اس مشاہدے کو ثابت کرنے سے قاصر ہوں اس لیے مجھے تمہارا ہی راگ سننا پڑے گا۔"

"فرض کرو کہ سب کچھ اسی طرح ہوا ہوتا جیسے تم سوچ رہی ہو تو صورتِ حال کیا ہوتی؟"

"مجھے حبیب جیوانی' مافیا یا نیشی کاؤ سے کوئی ہمدردی نہیں تھی۔" اس کی تیوریاں چڑھ گئیں۔ "یہاں سے شی کا صفایا ہونے کے بعد انہیں بھی پنپنے کا کوئی حق نہیں تھا۔ اچھا ہوا کہ سب کچھ فنا ہوگیا۔ مجھے صدمہ صرف اس بات کا ہے کہ یہ ایک دو روز میں نہیں ہوا ہوگا۔ تم نے اس طویل عرصے میں مجھے اندھیرے میں رکھا۔ تم نے مجھے اعتماد میں لیا ہوتا تو شاید میں نے بھی تمہاری کچھ مدد کی ہوتی۔"

"اگر تم نتائج سے مطمئن ہو تو پھر غصہ تھوک دو۔" میں نے دھیمے سے کہا۔ "تم بلاوجہ میری طرف سے بدظن ہو رہی ہو۔ میں نے تمہارے ساتھ کافی عرصے سے دُہرا کھیل نہیں کھیلا ہے۔"

"اور جنت گل کے بارے میں بھی تم کچھ چھپا رہے ہو۔" وہ لحظہ بھر خاموش رہنے کے بعد بولی۔

مجھے خوشی ہوئی کہ اس نے اپنے کھڑے کیے ہوئے محاذ سے پسپائی اختیار کرکے موضوع بدل دیا تھا۔ میں نے سلطان شاہ کی نظر بچا کر اسے آنکھ مارتے ہوئے کہا۔ "میں غزالہ کے سامنے وہ مکالمے تو نہیں دہرا سکتا تھا جو اسے راہ پر لانے کے لیے ادا کرنے پڑے تھے۔ تم خود سمجھ سکتی ہو کہ جنت گل جیسی زخم خوردہ لڑکی کا دل محبت کی اداکاری سے ہی جیتا جاسکتا تھا۔ میں اس بات کے اعتراف میں کوئی عار نہیں سمجھتا۔"

"اس کی کہانی حیرت ناک طور پر میری زندگی سے ملتی جلتی ہے۔ پتا نہیں بن بیاہی عورتوں کو ماں بنانے والے مرد ہر جگہ یکساں ظالم اور سفاک کیوں ہوتے ہیں؟ مجھے جنت گل سے ہمدردی محسوس ہونے لگی ہے۔"

"اس کے بارے میں ہم پھر کبھی بات کرسکتے ہیں۔ میں غزالہ کے سامنے اس موضوع پر زیادہ تفصیل میں نہیں جانا چاہتا۔" میں نے دھیمی آواز میں کہا۔ "وہ میری طویل غیر حاضری سے ویسے ہی اکھڑی ہوئی ہے۔"

ویرا نے میری بات مان لی اور سگریٹ سلگانے میں مصروف ہوگئی۔

ویرا اور جنت گل میں یہ مشابہت تھی کہ وہ دونوں اپنے اپنے باپ کی ایسی ناجائز اولادیں تھیں جنہیں کھلے دل سے تسلیم نہیں کیا گیا تھا لیکن میرے نزدیک وہ بات صرف مشکوک نسبی پس منظر کی تھی۔ اس اعتبار سے وہ موضوع غزالہ کے لیے بھی تکلیف دہ ہوسکتا تھا جب کہ میں اس کے پرانے زخموں کو کُریدنے سے ہمیشہ گریز کرتا رہا تھا۔

غزالہ کو قدرت نے ماں اور باپ' دونوں ہی کے شفقت آمیز سائے سے نوازا تھا لیکن میں اچھی طرح جانتا تھا کہ غزالہ کو اندر ہی اندر یہ کرب کھاتا رہتا تھا کہ اس کی ماں کا تعلق دنیا کے اس قدیم ترین بازار سے تھا جہاں جسموں کی خوبیاں دکھا اور گنوا کر سالم عورتوں کے مول چکائے جاتے ہیں۔ کرنل زوار زیدی نے شمع کو اس بازارِ خرافات سے اٹھا کر' اپنی بیوی بنانے کا پُرعزم فیصلہ کرکے ناقابلِ بیان اخلاقی جرأت کا ثبوت دیا تھا لیکن اس بے چارے کو اپنی اس جرأت کے نتیجے میں اپنے پورے خاندان کی نفرت کا نشانہ بننا پڑ گیا تھا۔ شمع پر ماضی کے طعنوں کے ساتھ ہر گھر کے دروازے بند کردیے گئے اور اس عورت کو اپنا غم بھلانے کے لیے نشے کے سمندر میں پناہ لینی پڑی۔ پھر ماں کا یہی نشہ' اس کے اکلوتے بیٹے کامران کی دیوانگی کا سبب بن گیا۔ رشتے داروں کی نفرتوں کا نشانہ بننے کے بعد وہ گھراتا اپنے ہی خول میں مست رہنے کا عادی ہوچلا تھا کہ کامران کی دیوانگی نے شمع کو دن رات نشے میں رہنے پر مجبور کردیا تاکہ وہ اپنے احساسِ جرم سے چھٹکارا حاصل کرسکے۔ پھر ایک دن اسی نشے نے اسے موت کی دہلیز پار کرادی۔ کرنل زوار زیدی نے دل شکستگی کے عالم میں خودکشی کرلی۔ غزالہ میری پناہ میں تھی اور جب اس کا بھائی کامران بھی موت کے گھاٹ اتار دیا گیا تو غزالہ کے دل کے زخم اور گہرے ہوگئے۔ رشتے داروں نے پھر بھی پلٹ کر اس کی خبر نہیں لی۔ مجھے اچھی طرح یاد تھا کہ کرب اور اتھاہ مایوسی کے عالم میں ایک بار اس نے کہا تھا کہ انسان خدا کو ناراض کرکے اس کی زمین پر سدا سکھی رہ سکتا ہے لیکن اپنے جیسے انسانوں اور رشتے داروں کی مرضی سے انحراف کرنے کے بعد وہ زندگی بھر تڑپتا اور بلبلاتا ہی رہتا ہے۔ میں غزالہ کے سامنے جنت گل کی کہانی چھیڑ کر ان زخموں کو ہرا نہیں کرنا چاہتا تھا۔

ویرا ہاتھ دھونے کے لیے اٹھی تو غزالہ چائے کی ٹرے لے

آئی۔ جب سے میں واپس آیا تھا‘ اسے تنہائی میں مجھ سے بات کرنے کا کوئی موقع نہیں ملا تھا۔ دوسروں کے سامنے وہ مجھ سے کھل کر کوئی بات نہیں کرسکتی تھی۔ وہ مجھ سے ذرا سی بھی زبان کھولتی تو سلطان شاہ اور ویرا کو اس کا مذاق اڑانے کا موقع مل جاتا۔ ویرا نے اسے میری بیوی تسلیم ضرور کرلیا تھا کیونکہ اس کے سوا کوئی چارۂ کار نہیں تھا۔ وہ ایک ٹھوس اور کھلی حقیقت تھی جس سے انحراف کرکے وہ خود تحقیر و استہزا کا نشانہ بن سکتی تھی لیکن اس کے دل کے نہاں خانوں میں‘ غزالہ کی طرف سے کوئی خلش پھانس بن کر چبھی ہوئی تھی۔ ویرا خاص طور پر ہروقت غزالہ کی گھات میں لگی رہتی تھی اور اسے جب بھی کوئی بہانہ ہاتھ لگ جاتا تو وہ غزالہ کا مذاق اڑا کر اپنے دل کو تسکین پہنچانے کی کوشش کرتی تھی۔ ایسے ہر موقع پر غزالہ کا رویّہ مفاہمت آمیز اور باوقار ہوتا تھا۔ وہ ویرا کا کڑوے سے کڑوا مذاق بھی ہنس بول کر ٹال دیتی تھی کیونکہ اسے میرے اور ویرا کے نازک تعلقات کا بخوبی علم تھا۔

اس وقت بھی غزالہ اپنے چہرے پر خلیقانہ مسکراہٹ سجائے‘ خاموش ہی تھی لیکن وہ جن نظروں سے میری طرف دیکھ رہی تھی ان میں شکووں اور شکایات کے پورے دفتر کھلے نظر آرہے تھے۔ مجھے اندازہ تھا کہ وہ کمرے میں پہنچتے ہی مجھے اس طرح گھیرے گی کہ میرے لیے جواب دہی مشکل ہو کر رہ جائے گی۔

”معلوم ہوتا ہے کہ میری واپسی سے تمہیں زیادہ خوشی نہیں ہوئی ہے۔“ میں نے ویرا کی غیر حاضری کی وجہ سے‘ اسے اپنے دل کا غبار قدرے ہلکا کرنے کا موقع دینے کی نیت سے چھیڑا۔

”ایسی ویسی خوشی ؟“ وہ مجھے گھورتے ہوئے بولی۔ ”میں تو حیران ہوں کہ تم جنت گل کے ہوتے ہوئے بھی اتنی جلدی واپس لوٹ آئے۔ وہاں چند روز تو بہت آرام اور بے فکری کے ساتھ گزار سکتے تھے۔“

”یہ واقعی حیرت کی بات ہے۔“ سلطان شاہ نے میری ٹانگ کھینچنی ضروری سمجھتے ہوئے کہا۔ ”ہماری قسمت میں بے تحاشا بڑھی ہوئی‘ وحشت ناک داڑھیوں والے افغان بدمعاش تھے جو دور دور سے ہتھیار لہرا لہرا کر ہماری جان نکالے دے رہے تھے اور تم وہاں پہنچے تو ان وحشیوں میں جنت گل جیسی لڑکی بھی آموجود ہوئی۔“

”وہ کوئی حور یا پری نہیں تھی۔“ میں نے غصیلی آواز میں کہا۔ ”بس ایک لڑکی تھی اور ان بدمعاشوں کی ساتھی تھی۔ میں نے اس کے کون سے قصیدے پڑھے ہیں جو تم میرے مقدر پر رشک کررہے ہو؟“

”اس پر برسنے کی ضرورت نہیں۔ اصل بات تو میں کروں گی۔“ سلطان شاہ کی چھیڑی ہوئی غزل کا اگلا مصرعہ غزالہ نے الاپنا شروع کردیا۔ ”اس وقت میں ویرا کی موجودگی کی وجہ سے تمہارا لحاظ کررہی ہوں۔“

”میرا کیا ذکر ہو رہا ہے؟“ اپنے کمرے سے ویرا کی آواز آئی۔ غزالہ کی آواز دھیمی ہونے کے باوجود اس کے کانوں میں اپنا نام پہنچ ہی گیا تھا۔

”غزالہ کو تمہاری غیر موجودگی میں یہاں مزہ نہیں آرہا تھا۔“ میں نے غزالہ کو گھورتے ہوئے اونچی آواز میں کہا۔ ”یہ بھی اب تمہاری صحبت کی عادی ہوتی جارہی ہے۔ یہ کوئی اچھی بات نہیں ہے۔“

”کمال ہے۔“ ویرا ہمارے قریب آکر‘ آنکھیں مٹکاتے ہوئے بولی۔ ”میں کب سے یہاں آئی ہوئی ہوں لیکن غزالہ نے اس بارے میں مجھ سے تو ایک لفظ بھی نہیں کہا۔ کہہ دیتی تو میرا بھی دل بڑھ جاتا۔“

”اپنی تعریف سن کر تمہارا دماغ خراب ہوسکتا تھا۔“ میں نے ہنس کر کہا۔ ”ویسے بھی کل تمہاری کنپٹی دکھ رہی ہوگی۔“

”اور ہاں‘ جہانگیر کو بھی فون کرلینا۔“ غزالہ نے چونکتے ہوئے کہا۔ ”تین چار دن پہلے اس کا فون آیا تھا۔ سلمٰی بھی ہم لوگوں کی بے مروتی کا بہت گلہ کررہی تھی۔ کسی دن وہاں چکر لگانا پڑے گا۔“

”چاہو تو میں بھی تمہارے ساتھ چل سکتی ہوں۔“ ویرا نے ڈھٹائی کے ساتھ پیشکش کی۔

”معاف کرو!“ میں نے اس کے سامنے دونوں ہاتھ جوڑ دیے۔ ”تم نے ان کے اکلوتے بچے کو اغوا کرکے انہیں دیوانگی کی حد تک پہنچا دیا تھا۔ وہ تمہاری صورت دیکھتے ہی دہشت سے بے ہوش ہوسکتے ہیں۔“

”خدا کی قدرت ہے کہ میری ایک صورت میں ایسے ایسے کمال پوشیدہ ہیں۔ غزالہ کو میرے بغیر چین نہیں آتا‘ سلطان شاہ کا بلڈ پریشر بڑھنے لگتا ہے‘ تمہیں شاید کچھ بھی نہیں ہوتا اور جہانگیر کو دہشت ہونے لگتی ہے۔“

”اپنے چکروں میں مجھے نہ گھسیٹا کرو۔“ سلطان شاہ منہ بنا کر بولا۔ ”میں نے بہت عرصے سے تمہارے ساتھ ہنسی مذاق بند کیا ہوا ہے.....“

”یہ اطلاع ہے تو اس کا بہت بہت شکریہ۔“ ویرا اس کی بات پوری ہونے سے پہلے بول پڑی۔ ”شکایت ہے تو میری طرف سے کھلی اجازت ہے۔ تم اسی وقت ہنسی مذاق بلکہ ہاتھا پائی بھی شروع کرسکتے ہو۔“

میں ان دونوں کو ایک دوسرے سے الجھتا ہوا چھوڑ کر اپنے کمرے میں چلا گیا۔ غزالہ مجھے یاد نہ بھی دلاتی تو میرے لیے جہانگیر سے رابطہ کرنا ضروری ہوگیا تھا۔ میرا خیال تھا کہ ہمارے پاس گزارے کے لیے قلیل سی رقم رہ گئی تھی جب کہ جمی لائیڈ کی گن بوٹ کی فروخت سے حاصل ہونے والی خطیر رقم سلمٰی کی تجوری میں بطور امانت رکھی ہوئی تھی اور میں حسبِ ضرورت وہیں سے چھوٹی چھوٹی رقوم نکالتا رہا تھا۔

میں نے دیوار گیر الماری کے مقفل خانے میں موجود رقم گنی تو پانچ ہزار روپے سے بھی کم رہ گئی تھی۔ کوئی ہنگامی ضرورت پیش آنے پر وہ رقم ایک جھٹکے کے لیے بھی ناکافی تھی جب کہ میرے علاوہ غزالہ اور سلطان شاہ کا انحصار بھی اسی خانے پر تھا۔



اگلی صبح کا آغاز خاصے ناخوشگوار انداز میں ہوا۔ میں غزالہ کے شکوے اور شکایات سے نمٹ کر دیر سے سویا تھا اس لیے اس وقت آنکھیں کھولنے کو طبیعت نہیں چاہ رہی تھی لیکن دروازے پر ہونے والی تیز دستکوں کے جواب میں‘ میں نے بستر پر پڑے پڑے زور سے آواز لگائی تو مجھے باہر سے سلطان شاہ کی آواز سنائی دی۔

”باہر آؤ۔ تمہارا ٹیلی فون ہے۔“ وہ اونچی آواز میں مجھے اطلاع دے رہا تھا۔

”کہہ دو کہ میں سو رہا ہوں۔ بعد میں فون کرلوں گا۔“ میں نے کروٹ بدل کر جھلاہٹ کے ساتھ کہا۔

”وہ کہتا ہے کہ میں تمہیں اٹھادوں۔ اسے بہت ضروری بات کرنی ہے۔ پشاور سے پائندہ گل بول رہا ہے۔“

پائندہ گل کے نام نے میری نیند اڑادی اور میں ہڑبڑا کر بستر سے نیچے اتر آیا۔ اس اثنا میں غزالہ بھی بیدار ہوچکی تھی۔

میں دروازہ کھول کر اسی حالت میں باہر نکلا اور ڈرائنگ روم میں پہنچ کر‘ میز پر رکھا ہوا ریسیور اٹھالیا۔

”کون بول رہا ہے؟“ میری ہیلو کے جواب میں دوسری طرف سے بھاری اور تحکم آمیز آواز سنائی دی جو میرے کانوں کے لیے اجنبی نہیں تھی کیونکہ میں عبدالرحیم خان کے فلیٹ سے سردار پائندہ گل سے بات کرچکا تھا۔

”بات کرو۔ میں ڈینی بول رہا ہوں۔ تم نے مجھے گہری نیند سے بیدار کرایا ہے۔“ میں نے نیند کی جھونک میں‘ اس سے ذرا بھی مرعوب ہوئے بغیر‘ جھلا کر کہا۔ اس وقت میں اُس کا قیدی یا یرغمالی نہیں تھا جو دب کر بات کرتا۔

”تمہیں اپنی آزادی مبارک ہو۔“ سردار پائندہ گل کی آواز سرد اور چبھتی ہوئی تھی۔ ”لیکن مجھے تمہاری آزادی کی بہت بڑی قیمت ادا کرنی پڑی ہے۔ میرا بھانجا اپنے گھر میں مُردہ پایا گیا ہے۔ تم بھی اسی گھر میں لے جائے گئے تھے۔ میں یہ جاننا چاہتا ہوں کہ تم کو اس قتل کے بارے میں کچھ معلوم ہے یا تم اسے زندہ چھوڑ کر آئے تھے؟“

”اس کے قتل میں میرا کوئی ہاتھ نہیں ہے....“ میں نے لاشعوری طور پر اپنی صفائی پیش کرنی شروع کردی لیکن اس نے نہایت سردمہری کے ساتھ میری بات وہیں کاٹ دی۔

”میں جانتا ہوں کہ تمہارے وارثوں نے میری مانگ پوری کر دی تھی۔ عبدالرحیم خان کا آدمی رات کے جہاز سے مال لے کر میرے پاس پہنچ چکا تھا۔ اسی کے بعد کی خبر ہے کہ مرحوم کو کسی نے گولی ماردی۔ میری مانگ پوری ہونے کے بعد تمہیں آزاد ہوجانا تھا۔ تم اسے نہیں مار سکتے۔ مجھے اتنا بتادو کہ تم نے کس وقت اسے زندہ چھوڑا تھا؟“

وہ بہت سیدھا اور آسان سا سوال تھا لیکن میرے بدن میں بیک وقت سیکڑوں چیونٹیاں سی رینگنے لگیں۔ اس آسان سوال کے جواب پر سردار پائندہ گل کے ردِّعمل کا دارومدار تھا۔

میرے اور جنت گل کے علاوہ‘ اس قتل کا کوئی چشم دید گواہ نہیں تھا۔ میں آزاد اور خودمختار تھا۔ جنت گل روپوشی اختیار کرچکی تھی۔ میرے لیے بہت آسان تھا کہ میں عبدالرحیم خان کو زندہ چھوڑ آنے کا ذکر کرکے اپنی ذات کو اس جھگڑے سے بالکل الگ کر لیتا لیکن جنت گل‘ سردار پائندہ گل کو رسوا کرنے کی مہم پر نکلی ہوئی تھی۔ اس کے انتقام کا محور میری ذات پر قائم تھا کیونکہ میں ہی چھوٹے خان کا یرغمالی تھا اور وہ سردار پائندہ گل کے ایک یرغمالی کو اپنی سیج سے لذت آشنا کرانے کے حوالے سے اسے بدنام کرنے کا عزم رکھتی تھی۔ وہ پنچی میں آکر لوگوں کو یہ بھی بتاسکتی تھی اس نے چھوٹے خان کو اسی یرغمالی کے سامنے ہلاک کیا تھا۔ جنت گل کے ذریعے سچ سامنے آتا تو سردار پائندہ گل پر میرا جھوٹ کھل جاتا۔ وہ ہٹ دھرم اور منتقم مزاج آدمی تھا۔ اس ایک جھوٹ پر ہی اپنے پورے قبیلے کو میری بیخ کنی پر مامور کرسکتا تھا اور میں اس ناپسندیدہ صورتِ حال سے بچنا چاہ رہا تھا۔

میں نے لمحوں ہی لمحوں میں وہ تجزیہ کرکے‘ بہت احتیاط سے سچ بولنے کا فیصلہ کرلیا۔

”تم ٹھیک سوچ رہے ہو۔ وہ میری آزادی کا پیغام لے کر آیا تو زندہ تھا مگر میں وہاں سے نکلا تو وہ اپنے آخری سانسوں پر تھا۔ اس کی پشت میں میرے سامنے گولی ماری گئی تھی۔“

”اس کا قاتل کون تھا؟“ اس نے ایک ایک لفظ پر زور دے کر سرد اور دھیمی آواز میں پوچھا۔

”جنت گل۔“ میں بس اسی قدر کہہ سکا کیونکہ سردار پائندہ گل نے کسی وحشی بھینسے کے ڈکرانے کے انداز میں‘ حلق کے بل وہی نام دہرایا تھا۔

”کہاں گئی وہ؟ مجھے اس کے بارے میں بتاؤ!“ اس کی آواز میں انتقام کی تڑپ پیدا ہوگئی۔

”مجھے کچھ نہیں معلوم کہ وہ وہاں سے نکل کر کہاں گئی۔ میں بالکل نہتا اور ان دونوں کا یرغمالی تھا۔ اس لیے ان کے آپس کے جھگڑے میں دخل نہیں دے سکا۔ چھوٹے خان کا خون دیکھتے ہی میں وہاں سے بھاگ نکلا۔“

”میں تمہارا احسان مند ہوں کہ تم نے مجھے میرے دشمن کے نام سے آگاہ کردیا۔ اب میں اسے خود دیکھ لوں گا۔“ سردار پائندہ گل کی غصے سے کانپتی ہوئی اس آواز کے ساتھ ہی فون بے جان ہوگیا۔

میں مبہوت اور سحرزدہ انداز میں چند سیکنڈ تک ریسیور یوں ہی اپنے کان سے لگائے کھڑا رہا۔ پھر آہستگی سے اسے کریڈل پر رکھ دیا۔ غزالہ حیرت سے پلکیں جھپکاتی ہوئی، میرے قریب کھڑی تھی۔

انسان کے دل میں گناہ کا پہلا بیج پھوٹتا ہے تو وہ بہت حسین اور بے ضرر نظر آتا ہے لیکن ہر گناہ پر لذّت کا ثمر سامنے آتا ہے تو انسان اندر سے دہل کر رہ جاتا ہے۔ جنّت گل بس تھوڑی دیر کے عیش و نشاط کا نام تھا۔ اس نے اپنے پری پیکر وجود کو ساری رعنائیوں کے ساتھ میرے سپرد کیا تو میرے مخمور ذہن میں یہ خیال سمایا ہوا تھا کہ بند دیواروں میں کچھ دیر کے لیے جنم لینے والی، حسنِ جمال کی اس رنگین کہانی کا کوئی گواہ نہیں ہوگا اور میں خانوں کی تیار کی ہوئی اس فصل کی خوشہ چینی کر کے ارمان انگیز یادوں میں ڈوب جاؤں گا۔ کسی کو کانوں کان بھی پتا نہیں چل سکے گا کہ وہاں کیا کچھ ہو چکا ہے لیکن چھوٹے خان کے قتل کے بارے میں سردار پائندہ گل کی آواز کی گھن گرج سن لینے کے بعد میرے معدے میں گرہیں سی پڑنی شروع ہو گئی تھیں۔

میں خان یا اس کے عتاب سے ذرا بھی خوف زدہ نہیں تھا۔ مجھ پر اس لمحے یہ انکشاف ہوا کہ میں نے جنت گل کی سازش کا ایک فریق بن کر اپنے لیے بھی ذلت و رسوائی مول لے لی تھی۔ اچھائی اچھے انسانوں کے اردگرد بستی ہے اور ان کے دلوں میں پروان چڑھتی ہے لیکن بدی کی کوئی سرحدیں نہیں ہوتیں۔ اسے جہاں راہ ملتی ہے، وہ آکاس بیل کی طرح پھیلتی اور بڑھتی چلی جاتی ہے۔ یہ ضروری نہیں تھا کہ جنت گل کی پھیلائی ہوئی کہانیاں، پہاڑوں کے اس پار رہ کر سردار پائندہ گل کو ہی ذلیل و خوار کرتی رہتیں۔ وہ چھوٹے خان کا خون ہونے کے بارے میں مجھے فون کر چکا تھا تو اپنی عزت کا خون ہونے کے بعد دوبارہ بھی فون کر سکتا تھا۔ وہ میرے ساتھیوں کو سب کچھ بتا سکتا تھا۔ بس وہی ایک خوف تھا جس نے میرے وجود کو مروڑ کر رکھ دیا تھا اور میں غزالہ سے آنکھ نہیں ملا پا رہا تھا۔

"کیا کہہ رہا تھا، سردار پائندہ گل؟" باہر سے سلطان شاہ نے سوال کیا۔

"اسے چھوٹے خان کے قتل کی خبر مل گئی ہے۔ اس پر لعنت بھیجو اور ناشتے کی تیاری کرو۔" میں نے ڈرائنگ روم سے باہر نکلتے ہوئے بے پروایانہ انداز میں کہا اور ان دونوں کے مزید سوالات سے بچنے کے لیے سیدھا غسل خانے میں گھستا چلا گیا۔

ناشتا کرتے ہوئے، میں نے میز پر پڑے ہوئے اخبارات کا سرسری جائزہ لیا تو ان میں مجھے پنڈی کا ایک پرانا اخبار بھی نظر آیا۔ میں نے متجسسانہ انداز میں اندر کے صفحات دیکھے تو سمجھ لیا کہ اوّل خان وہ اخبار ہمارے لیے ہی لایا ہوگا۔ اس میں شہباز خان کی عبرت ناک تصویر نمایاں انداز میں چھپی ہوئی تھی۔ وہ بالوں سے محروم چہرے کے ساتھ، بالکل برہنہ حالت میں کوڑے کے ایک بڑے ڈھیر پر پڑا ہوا تھا۔ اس کے جسم کے کھلے ہوئے حصوں پر سیاہ پٹیاں چھپی ہوئی تھیں۔ اسلام آباد کے بارسوخ شہباز خان کی درگت کس نے بنائی؟ اس دو کالمی سرخی کے نیچے سیاہ حاشیے میں چھپا ہوا متن بھی خبرنگار کی ذہانت کا شاہکار اور ذو معنی تھا۔ اس میں شہباز خان کے گہرے مراسم اور اس کے معروف و مقبول مہمان گھر کے حوالے سے اس کے ان نامعلوم دشمنوں پر ملامت کی گئی تھی جنھوں نے اسے اس حال کو پہنچایا تھا۔ اس ستم ظریف خبرنگار نے تصویر پر بس نہ کرتے ہوئے، شہباز کی لفظی تصویر بھی کی تھی جسے مضحکہ آرائی کے ساتھ ہی تشویش میں بھی شمار کیا جا سکتا تھا۔

اس دوران میں غزالہ ناشتے وغیرہ سے فارغ ہو کر گھر کی مرّہ ضروریات کی خریداری کے لیے سلطان شاہ کے ساتھ نکل گئی تھی۔ میں نے ویرا کو اس تصویری خبر کی طرف متوجہ کیا تو وہ کسمسا مندانہ لہجے میں بولی۔ "میں دیکھ چکی ہوں۔ اخبار والے بھی بڑے چالاک ہوتے ہیں۔ اس خبر کے چھپنے پر شہباز خان ان کے خلاف غنڈہ گردی تو کر سکتا ہے، کوئی قانونی کارروائی نہیں کر سکتا۔ میں انتظار کر رہی ہوں کہ تم اخبار چاٹ کر فارغ ہو تو میں تم سے بات کروں۔"

"اب کیا بات باقی رہ گئی ہے؟" میں نے ایک روز پرانا اخبار دوبارہ میز پر ڈالتے ہوئے پوچھا۔

"جنت گل۔" وہ مجھے چڑانے والے انداز میں مسکرائی۔ "تمھیں خوبصورت عورتیں ملتی ہیں تو بلا وجہ مہربان نہیں ہوتیں۔ اس نے بھی کسی خاص وجہ سے تمھیں چھوٹے خان کی قید سے بھگانے کی کوشش کی ہو۔"

فوراً ہی میرے ذہن میں ایک اچھوتا خیال کوندا اور میں نے فی الفور اس پر عمل کر گزرنے کا فیصلہ کرتے ہوئے متاسفانہ لہجے میں کہا۔ "مجھے ماننا پڑے گا کہ اس بار تمھارا اندازہ بے بنیاد ہے۔ میری سمجھ میں نہیں آتا کہ میں غزالہ اور سلطان شاہ کو یہ بات کیسے بتا سکوں گا۔"

"فکر نہ کرو۔ یہ کام میں کر لوں گی۔ تم مجھے مقدّس راہبہ سمجھ کر میرے سامنے اعترافِ گناہ کر لو۔"

"جنت گل کو مجھ سے کوئی ہمدردی یا دلچسپی نہیں تھی۔ وہ اور چھوٹے خان کی عزت ملیامیٹ کرنا چاہتی تھی۔"

"اور وہ تم نے کر دی؟" اس نے قطع کلامی کرتے ہوئے جواب طلب لہجے میں کہا۔

"اس نے میرے لیے فرار کی راہ نہیں چھوڑی تھی۔ انکار کی صورت میں اس نے مجھے گولی مار دینے کی دھمکی دی تھی۔ میرے لیے وہ ناقابلِ یقین اور عجیب و غریب صورتِ حال تھی۔ اس میں میری مرضی یا پسند کا ذرا بھی دخل ہوتا تو میں تم سے اس کا اعتراف کر ہی نہیں سکتا تھا۔"

"تم سے کچھ بعید نہیں۔ تمہاری اپنی مصلحتیں بھی ہوسکتی ہیں۔ تمہاری بہت سی حرکتوں کا مقصد کافی وقت گزرنے کے بعد سمجھ میں آتا ہے۔ یہ بھی ایسی ہی کوئی چال ہوسکتی ہے۔" اس کی آنکھوں سے بے اعتباری عیاں تھی۔

"چالبازیاں دوسروں کے ساتھ کی جاتی ہیں۔ اپنے گھر میں یہ سب نہیں چلتا۔ عبدالرحیم خان مرگیا' جنت گل روپوش ہوگئی۔ جلد یابدیر پائندہ گل اسے پکڑ کر مرواہی ڈالے گا۔ مجھے کسی چال بازی کی ضرورت ہی کیا ہے؟"

"یقین نہیں آتا کہ تم اتنے سیدھے بھی ہوسکتے ہو۔" وہ براہِ راست میری آنکھوں میں جھانکتے ہوئے بڑبڑائی پھر کسی خیال سے اس کی آنکھیں چمکنے لگیں۔ "اس بند کمرے میں جو کچھ ہوا وہ تمہارا اور جنت گل کا معاملہ تھا۔ جب تک پائندہ گل کو اس قصّے کا علم نہیں ہوتا' اس کی عزت پر کیا حرف آئے گا؟ وہ اپنی برادری پر اسی طرح سراونچا کرکے سرداری کرتا رہے گا۔ جنت گل کو اس واقعے کی تشہیر کیے بغیر سکون مل ہی نہیں سکے گا۔ اس کہانی کو جتنی شہرت ملے گی' پائندہ گل اسی قدر ذلتوں کی دلدل میں دھنستا چلا جائے گا اور جنت گل کی انا کو تسکین ملتی رہے گی۔"

"میں تم کو یہی سمجھانا چاہ رہا تھا۔" میں نے اس کی نکتہ آفرینی پر ہنستے ہوئے کہا۔ "اس کے عزائم سے واقف ہونے کے بعد میں اس کے ساتھ ملوث ہونے کی حماقت کیسے کرسکتا تھا؟ میں اسی تشہیر اور رسوائی کے خوف سے اس سے بچ رہا تھا لیکن جب بات میرے قتل تک آگئی تو میں مجبور ہوگیا۔ تم اس بات پر دھیان دینے کی کوشش کیوں نہیں کررہیں؟"

اس نے میری دکھتی رگ پر ہاتھ ڈال دیا تھا۔ میں نے اپنی جوابی دلیل سے اسے الجھا ضرور دیا تھا لیکن اس کے ذہن میں وہ سب چبھ رہا تھا۔ میں نے اس کے ذہن میں بنے ہوئے تسلسل کو جڑ سے اکھاڑ پھینکنے کے لیے ایک لمبی تقریر شروع کردی جس میں انسانی فطرت اور جذبوں سے لے کر رشتوں کے احترام اور خاندانی دشمنیوں کے خونیں نتائج تک کا گہرا تجزیہ شامل تھا۔ وہ پہلے صبر کے ساتھ میری باتیں سنتی رہی پھر خود بھی جوش و خروش کے ساتھ بحث میں الجھ گئی۔

کافی دیر بعد اس بحث کا اختتام ہوا تو وہ میرے اعتراف کی سچائی کی قائل ہوچکی تھی اور مجھ جیسے مرد کی جبری آبروریزی کا تصور کرکے' دل کھول کر قہقہے لگا رہی تھی۔ میں نے بہت عرصے کے بعد اسے یوں ہنستے ہوئے دیکھا تھا۔ میں خفت اور بے بسی کی اداکاری کرتے ہوئے احمقانہ انداز میں اسے دیکھتا رہا لیکن مجھے دل ہی دل میں اس بات کی خوشی تھی کہ میں نے کمال ہوشیاری کے ساتھ ویرا کو ادھورے اعتماد میں لے کر مستقبل کی راہ ہموار کرلی تھی۔ اگر سردار پائندہ گل کے ذریعے' جنت گل کی کہانی غزالہ تک بھی پہنچ جاتی تو میں ویرا کی گواہی پیش کرکے ندامت سے محفوظ رہ سکتا تھا۔

اس خوشگوار فضا کو دو دررس بنانے کے لیے میں دیر تک ویرا کے ساتھ دنیا جہان کی باتیں کرتا رہا۔ پھر غزالہ بھی سلطان شاہ سمیت لوٹ آئی۔ وہ لوگ خورد و نوش کے سامان کے تھیلوں سے لدے پھندے ہوئے تھے۔

"معلوم ہوتا ہے کہ اس فلیٹ میں آج کوئی پہلی تنخواہ لے کر آیا ہے۔" میں نے ہانک لگائی۔

"سردار پائندہ گل کے آدمیوں کے ہراساں کرنے کی وجہ سے ہم گھر ہی میں رہتے تھے۔" سلطان شاہ نے سامان میز پر رکھتے ہوئے کہا۔ "اسی وجہ سے فریج بھی خالی ہوچکا ہے اور پھر فلیٹ کی آبادی بھی دو سے چار ہوگئی ہے۔ بے فکری سے وقت گزارنے کے لیے یہ کوٹا جمع کرنا ضروری تھا۔"

ویرا سامان کو اس کی جگہوں پر پہنچانے میں مدد کرنے لگی تو میں خاموشی سے اٹھ کر فون کی طرف چلا گیا۔

فون پر خلافِ توقع جہانگیر خود موجود تھا۔ میری آواز سنتے ہی وہ پھٹ پڑا اور میں خاموشی کے ساتھ اس سے برا بھلا سنتا رہا۔ جب اس کے دل کی بھڑاس نکل گئی تو میں نے اس سے گھر پر موجود رہنے کا سبب دریافت کیا اور اس نے اپنے کاروباری مسائل کا رونا شروع کردیا۔ کپاس کے بحران کی وجہ سے دھاگے اور کپڑے کے دام بڑھ گئے تھے۔ بنکوں نے قرضوں کی فراہمی پر نئی پابندیاں عائد کردی تھیں' برآمدی قرضوں پر سود کی شرح بڑھادی گئی تھی' مہنگائی کی وجہ سے مزدوروں نے اپنی روز مرّہ اجرتوں میں از خود اضافہ کرلیا تھا' اپنی بات منوانے کے لیے وہ فاقے کرنے پر آمادہ تھے لیکن کم شرحوں پر مشینیں سنبھالنے پر تیار نہیں تھے اور ان سب مصائب کا خلاصہ یہ تھا کہ کئی دن سے اس کی ایس' جے گارمنٹ فیکٹری بند پڑی ہوئی تھی اور وہ گھر پر پڑا حالات کو کوس رہا تھا۔

"کچھ یہی حال میرا بھی ہے۔" اس کی بپتا ختم ہونے پر میں نے اپنی کتھا شروع کردی۔ "کام اس قدر ہے کہ دن رات فرصت نہیں ہے۔ ایک پیر کراچی میں ہوتا ہے تو دوسرا اسلام آباد میں۔ پچھلا کام نمٹنے میں نہیں آتا کہ نیا کام سر پر سوار ہوجاتا ہے۔ اس کے باوجود کہیں سے آمدنی کی کوئی صورت نہیں بن رہی۔ جمع پونجی ختم ہونے کی نوبت آگئی ہے اور کل میں تمہارے پاس آرہا ہوں تاکہ سلمٰی بھابی کے پاس رکھی ہوئی امانت میں سے کچھ رقم نکال سکوں۔"

"تم ایسا کون سا کام کررہے ہو جس میں آمدنی کا حال اتنا [illegible] ہے۔" وہ میری باتیں سن کر حیران رہ گیا۔ "میں تو نامساعد حالات کے باوجود گھر کا خرچ فیکٹری سے ہی نکال رہا ہوں۔ اللہ کا شکر ہے۔"

"میں تمہاری زبان سے یہی سننا چاہ رہا تھا۔ اب تم [illegible] کاروباری ہوگئے ہو۔ کوئی تمہاری خیر خواہی کرے تو نقصان اور [illegible] بھر کی مصیبتوں کا ذکر لے بیٹھتے ہو۔ کوئی اپنا دکھ سنائے تو اپنی [illegible] حالی کے قصّے سنا سنا کر اس کا خون جلانے پر تُل جاتے ہو۔ تمہاری اطلاع کے لیے عرض ہے کہ میں بس عیش ہی عیش کررہا ہوں۔ مفت کا ایک خزانہ ہاتھ آیا ہوا ہے تو مجھے پاگل کتے نے کاٹا ہے جو اپنی جان کھپاتا پھروں گا۔" میں نے بھنّائے ہوئے انداز میں کہا۔

"پھر اتنے دن سے کہاں غائب ہو؟" وہ فون پر ہی سب کچھ معلوم کرلینا چاہ رہا تھا۔

"سوشل ورک کررہا ہوں۔" میں نے جل کر کہا۔ "چاہو تو تمہارے لیے بھی کام پیدا ہوسکتا ہے۔"

"ناراض ہوگئے۔" کھسیانی ہنسی کے ساتھ اس کی آواز ابھری۔ "ہو' یہ سلمٰی بھی آگئی ہے۔ ذرا اس سے بات کرلو!"

سلمٰی کا نام سنتے ہی میری روح فنا ہوگئی۔ "کل آؤں گا تو بات کریں گے۔ فی الحال خدا حافظ۔" اپنی بات پوری کرکے میں نے پھرتی کے ساتھ فون کا سلسلہ منقطع کردیا۔ میرے لیے ویرا اور غزالہ کی موجودگی میں سلمٰی سے بات کرنی ممکن ہی نہیں تھی۔ وہ اپنے شوہر کی موجودگی میں بھی گھما پھرا کر ایسی باتیں کرجاتی تھی جن کا جواب دینا دوبھر ہوجاتا تھا۔

میں اس کال سے فارغ ہوا ہی تھا کہ میرے فون کی گھنٹی بج اٹھی۔

اس بار دوسری طرف سے اوّل خان بول رہا تھا۔ اس نے مجھے بتایا کہ فرینکفرٹ سے آنے والی متوقع پرواز کا وقت رات کے ڈیڑھ بجے تھا۔ معاملہ صرف ایک آدمی کی دیکھ بھال کا تھا اس لیے وہ اکیلا ہی ائرپورٹ پہنچنے کا ارادہ رکھتا تھا لیکن میں نے اسے بتایا کہ میرے ساتھ سلطان شاہ بھی ہوگا تو اس نے کوئی اعتراض نہیں کیا۔ رفتہ رفتہ وہ خود بھی سلطان شاہ کو پسند کرنے لگا تھا کیونکہ وہ غیر ضروری تجسّس کیے بغیر اپنے کام سے کام رکھنے کا عادی تھا۔

ایک بجے ائرپورٹ لاؤنج میں ملاقات کا پروگرام طے کرکے اس نے فون بند کردیا۔

ہم چاروں کو ایک طویل وقفے کے بعد یکجا ہونے کا موقع ملا تھا اس لیے فلیٹ میں وقت بہت اچھا گزر رہا تھا۔ آپس کی نوک جھونک نے کسی تلخی کی صورت اختیار نہیں کی تھی اس لیے ماحول بھی خوشگوار تھا لیکن پھر بھی میرے پاس فالتو وقت موجود تھا۔ ادھر میرا اندازہ تھا کہ غزالہ بھی خریداری پر ڈیڑھ دو ہزار روپے خرچ کر آئی تھی اس لیے میں نے لنچ کے بعد غزالہ کے ساتھ جہانگیر کے گھر جانے کے ارادے کا اعلان کردیا۔

"مجھے راستے میں کہیں اتار دینا۔" سلطان شاہ نے فوراً ہی اپنی فرمائش پیش کردی۔

"تم کہاں جاؤ گے؟" ویرا نے اس پر آنکھیں نکال کر پوچھا۔ "ابھی تو بازار سے ہو کر آئے ہو۔"

"میں ذرا اپنے دوستوں سے ملنے جاؤں گا۔ ادھر گئے ہوئے ایک مدّت ہوگئی ہے۔"

"کیا پٹھان کالونی اور بنارس وغیرہ کی طرف جانے کا ارادہ کررہے ہو؟" میں نے چونک کر پوچھا۔

"کوئی ضرورت نہیں دھکے کھانے کی۔ کل گاڑی لے کر سب سے مل آنا۔" ویرا نے تحکم سے کہا۔

"ارے واہ!" سلطان شاہ ہاتھ نچا کر منمنایا۔ "تم بلاوجہ میری خالہ جان کیوں بن رہی ہو؟"

"پھر جھگڑا شروع ہوگیا ان دونوں کا؟" غزالہ نے باورچی خانے سے ہی آواز لگائی۔

"تم غزالہ کو لے کر جارہے ہو۔ سلطان شاہ دوستوں سے ملنے چلا جائے گا تو میں اکیلی دیواروں سے سر ماروں گی؟" ویرا نے سلطان شاہ کے منہ لگنے کے بجائے میرے اوپر آنکھیں نکالنی شروع کردیں۔

"یہ اکیلی پڑے پڑے بیزار ہوجائے گی۔ تم آج اپنا پروگرام ملتوی کردو۔" میں نے سلطان شاہ کو سمجھانا چاہا۔ "تم دونوں اکٹھے رہ کر اچھا وقت گزار لوگے۔ کل تمہیں پوری آزادی ہوگی۔"

"مگر میرا جانا ضروری ہے۔" وہ جزبز ہو کر بولا۔ اس کی آنکھوں سے بے بسی کا اظہار ہو رہا تھا۔ معاً مجھے خیال آیا کہ وہ ویرا کے ساتھ تنہا رہنے سے خوف زدہ تھا۔ اسی لیے وہاں سے ہمارے ساتھ نکل بھاگنا چاہ رہا تھا۔ پہلے بھی ویرا ایک بار اس کی خاصی دُرگت بنا چکی تھی لیکن اس وقت وہ بھی شاید پچھلا واقعہ بھولی ہوئی تھی۔

"تم اسے تنگ نہ کرنے کا وعدہ کرو تو میں اسے رکنے پر مجبور کرسکتا ہوں۔" میں نے سلطان شاہ کی مجبوری بھانپتے ہوئے ویرا سے کہا۔ ساتھ ہی اسے آنکھ سے اشارہ بھی کردیا تاکہ وہ اختلافی ردِّعمل سے باز رہے۔

"میرا دماغ خراب ہوا ہے جو اس جیسے ڈھیلے آدمی کو تنگ کروں گی۔" ویرا نے تنک کر کہا۔ "ابھی تک میری نیند پوری نہیں ہوئی ہے۔ ایسا ہی ہے تو میں لمبی تان کر سوجاؤں گی۔ یہ دودھ وغیرہ لینے کے علاوہ فون کا بھی خیال رکھ لے گا۔ پتا نہیں یہ کبھی کبھی مجھ سے اس بری طرح کیوں بدکنے لگتا ہے؟"

"تم پھر بات بڑھا رہی ہو۔" سلطان شاہ لڑمرنے والے انداز میں بولا۔ "تم نے مجھ میں کیا ڈھیلا پن دیکھا ہے جو باتیں بنا رہی ہو۔ میں اب کسی سے بدکنے والا نہیں ہوں۔ میری مرضی کے خلاف تم نے مجھ سے الجھنے کی کوشش کی تو میں تمہارے عورت ہونے کا لحاظ کیے بغیر ہاتھ چھوڑ دوں گا۔"

"گرجنے والے برسا نہیں کرتے۔" ویرا بے پروایانہ انداز میں ہاتھ لہراتے ہوئے بولی۔ "تم نے ہاتھ چھوڑا تو میں اسے پکڑ بلکہ توڑ بھی سکتی ہوں۔ جب چاہو' تم اپنے دل کی حسرت نکالنے کی کوشش کرسکتے ہو۔"

"یہ ابھی سے لڑنے پر تُلی ہوئی ہے۔" سلطان شاہ' غزالہ سے

مخاطب ہوگیا۔ وہ اپنا کام ادھورا چھوڑ کر دروازے پر آکھڑی ہوئی تھی اور ان دونوں کی بک بک میں گہری دلچسپی لے رہی تھی۔

"ٹھیک ہے' اگر تم ویرا سے خائف ہو تو ہم تمہیں اپنے ساتھ لے چلیں گے۔" غزالہ نے اپنا فیصلہ سنا دیا۔ "جہانگیر ہم سب ہی سے اچھی طرح واقف ہے۔ وہاں تمہیں بالکل بوریت نہیں ہوگی۔"

"میں کسی سے خائف وائف نہیں ہوں۔" سلطان شاہ اس پر بھی بگڑ گیا۔ "یہاں کوئی بات سمجھنے کی کوشش ہی نہیں کرتا۔ میں کسی کے ساتھ نہیں جاؤں گا۔ بعد میں جو ہوگا' وہ دیکھ لیا جائے گا۔"

"گڈ!" ویرا نے خوش ہو کر اس کی تائید کی۔ "اب تم نے مردوں والی بات کی ہے۔"

سلطان شاہ اسے قہربار نظروں سے گھورتا ہوا' ڈرائنگ روم سے باہر نکلتا چلا گیا۔

دوپہر کے کھانے کے بعد میں' غزالہ کے ساتھ جہانگیر کے گھر روانہ ہوگیا۔ اس وقت تک صورتِ حال اعتدال پر نہیں آئی تھی۔ صبح آنے والے' سردار پائندہ گل کے فون نے بھی مجھے قدرے فکرمند کیا ہوا تھا کہ کہیں اس کے آدمی ایک بار پھر ہمارا پیچھا کرنا شروع نہ کردیں۔ اس امکان کے پیشِ نظر میں راستے بھر عقب نما آئینے میں' اپنے پیچھے آنے والے ٹریفک کا جائزہ لیتا رہا اور یہ محسوس کرکے مجھے اطمینان ہوا کہ میرا اندیشہ درست نہیں تھا۔

جہانگیر اور سلمٰی نے تحیّر آمیز خوشی کے ساتھ ہمارا استقبال کیا۔ سلمٰی نے غزالہ سے گلے ملنے کے بعد گہری اور ناقدانہ نظروں سے اس کا جائزہ لینا شروع کیا تو غزالہ بھی بے آرام ہوئے بغیر نہ رہ سکی۔

"مجھ میں کیا تبدیلی آگئی ہے جو تم اتنے غور سے دیکھ رہی ہو؟" غزالہ نے اس سے پوچھ ہی لیا۔

"تمہیں بہت دن بعد دیکھا ہے۔" سلمٰی سنبھلتے ہوئے بولی۔ "تم میں ذرا بھی تبدیلی نہیں آئی۔ اپنا دھیان رکھتی ہو۔ اسی لیے ڈینی بھائی ہر وقت مجنوں بنے رہتے ہیں۔ ہر وقت زبان پر تمہارا ذکر رہتا ہے۔" رشک اور حسد کے دو متضاد جذبوں میں جو موہوم سی حدِ فاصل ہے وہ سلمٰی کے لب و لہجے میں نمایاں تھیں۔ وہ یہ سمجھنے سے قاصر تھی کہ غزالہ کی صورت اور سیرت میں کون سی ایسی بات تھی جس نے مجھے اور اسے ایک جان' دو قالب کے سانچے میں ڈھال کر رکھ دیا تھا جب کہ وہ اپنی پوری محنت کے باوجود مجھے اپنی ذات کے سحر میں گرفتار کرنے میں کامیاب نہیں ہوسکی تھی۔ سلمٰی کی ایسی ہر کوشش میرے ہنسی مذاق میں اپنا اثر کھو بیٹھتی تھی۔

شکل و صورت اور شخصیت کے اعتبار سے سلمٰی میں کوئی کمی یا خامی نہیں تھی۔ بہتیرے دل پھینک مرد اس کی تھوڑی دیر کی ہم نشینی کو بھی اپنے لیے سعادت سمجھ سکتے تھے۔ وہ باتیں کرنے اور بات سے بات نکالنے کے فن پر بھی دسترس رکھتی تھی اور اگر اسے شادی کے ابتدائی ایام میں اسے جہانگیر کی پُراسرار مصروفیات کی وجہ سے عدم توجہی کی شدید شکایت نہ ہوتی تو وہ اس کے ساتھ بہترین ذہنی رفاقت بھی پیدا کرسکتی تھی لیکن بدقسمتی یہ تھی کہ ان دنوں جہانگیر شی کے کاموں میں گردن تک پھنسا ہوا تھا۔ وہ اپنی مجرمانہ سرگرمیوں کو اپنی بیوی سے چھپانا چاہتا تھا اس لیے ان دونوں میں بدگمانیوں کی بنیاد پڑ گئی۔ سلمٰی اپنے شوہر کے چڑچڑے پن کی وجہ سے اس سے زیادہ الجھ نہیں سکتی تھی۔ وہ اتنی متلون مزاج بھی نہیں تھی کہ باہر کسی سے راہ و رسم بڑھا لیتی اس لیے اس کا میلان میری طرف ہوگیا لیکن میں اس کے ناآسودہ جذبوں کے لیے ایک ایسا خاموش کنواں بنا ہوا تھا جس میں منہ ڈال کر اپنے دل کی ہر بری بھلی بات کہہ لیتی تھی لیکن جواب میں اسے اپنی آواز کی بازگشت کے سوا اور کچھ نہیں سنائی دیتا تھا۔

وہ باتیں غزالہ سے کر رہی تھی لیکن میری طرف بار بار ایک مجروح اور پُرشکایت نظروں سے دیکھ رہی تھی کہ میں نے براہِ راست اس کی طرف دیکھنا ہی ترک کردیا تھا پھر وہ غزالہ کو اپنے بیٹے سے ملانے کے لیے لے گئی تو میں نے اطمینان کا سانس لیا اور جہانگیر کے چہرے پر بھی سکون پھیلتا چلا گیا۔

"پینے کا موڈ ہو تو جن یا وہسکی نکالوں؟" میدان صاف ہوتے ہی اس نے حسبِ روایت مجھے مے نوشی کی دعوت دیتے ہوئے سوال کیا۔ "اکیلے پیتے پیتے اب طبیعت بے مزہ ہونے لگی ہے۔"

"کھال میں رہو۔" میں نے اس پر آنکھیں نکالتے ہوئے کہا۔ "دس دفعہ بتا چکا ہوں کہ وہسکی پینے کا وقت غروبِ آفتاب کے بعد شروع ہوتا ہے......."

"تو پھر جن کی بوتل لے آتا ہوں۔ گورڈن کی بڑی بوتل رکھی ہوئی ہے۔" اس نے میرا ابتدائی مشورہ قبول کرتے ہوئے' میری بات پوری ہونے سے پہلے ہی اپنا فیصلہ سنا دیا مگر میں نے اس کا بازو پکڑ کر اسے صوفے پر بٹھا دیا۔

"بیٹھے رہو۔ ان دونوں عورتوں کی موجودگی میں ہمیں ذرا مُہذّب رہنا چاہیے ورنہ دونوں مل کر ہماری برائیاں کرنی شروع کردیں گی۔ سلمٰی خود ہی چائے وغیرہ بنا کر لے آئے گی۔ اس وقت وہی مناسب رہے گی۔"

"وہ لے آئے گی!" اس نے استہزائیہ انداز میں اپنی گردن جھٹک کر کہا۔ "یہ بھول جاؤ۔ اب سارا کام ملازموں پر ڈال دیا گیا ہے۔ بچے کے اغوا والے واقعے کے بعد وہ بہت آرام پرست اور کاہل ہوگئی ہے۔ ہر وقت اپنے بچے کو سینے سے لگائے لیٹی رہتی ہے یا پھر بناؤ سنگھار میں مصروف رہتی ہے۔"

"وہ تمہارے لیے ہی یہ سب کرتی ہوگی۔ تمہیں اس کے بارے میں اس طرح بات نہیں کرنی چاہیے۔"

"کرتی ہوگی۔ اس پر لعنت بھیجو۔" وہ اکتائے ہوئے انداز میں بولا۔ "یہ بتاؤ کہ آج کل بلیک کوئن کہاں ہے؟"

فوری طور پر اس کا سوال میری سمجھ میں نہیں آسکا پھر مجھے یاد آیا کہ ابتدا میں ویرا ہمارے سامنے بلیک کوئن کے لرزہ خیز روپ میں ہی نمودار ہوا کرتی تھی۔ میں نے ہنستے ہوئے کہا۔ "وہ دن گئے جب اس کی ہوا ہوتی تھی۔ سخت جھگڑے کے بعد اب پھر دوست بن گئی ہے۔ وہ تمہیں کیوں یاد آرہی ہے۔"

"زبردست عورت ہے لیکن پتا نہیں مجھے کیوں پھیکی پھیکی لگتی ہے۔ بغیر نمک کی نہاری کی طرح۔ اسے دیکھ کر دل میں ذرا بھی تحریک نہیں ہوتی۔ بعد میں اکثر اس کا خیال آتا رہتا ہے۔ کبھی کبھی تو سالی خواب میں بھی آجاتی ہے۔"

"تمہارے دل و دماغ پر ابھی تک اس کی دہشت سوار ہے۔" میں نے ہنستے ہوئے کہا۔ "تمہارے لیے اپنی سیکریٹری ہی ٹھیک ہے جو اپنی ملازمت برقرار رکھنے کے لیے ہر وقت تمہاری خوشنودی حاصل کرنے کی فکر میں رہتی ہے۔ مرکھنی اور اڑیل حسیناؤں کو پھانسنا تمہارے بس سے باہر ہے۔"

"وہ بھی میرے پاس سے بدرو دادا کے پاس چلی گئی ہے۔" وہ ایک حسرت بھری سانس کے ساتھ بولا۔ "ایسی لڑکیاں بس پیسے کے پیچھے بھاگتی ہیں۔ بدرو نے چار پیسے زیادہ دیے' وہ وہاں چلی گئی۔"

"یہ بدرو دادا کون ہے؟" میں نے تیوریوں میں بل ڈال کر پوچھا۔ "کیا میں اسے جانتا ہوں؟"

"لو' اسے بھول گئے۔" اس نے میرا مذاق اڑایا۔ "شروع میں سب سے زیادہ چرس وہی نکالتا تھا۔ بعد میں نادر' کے ساتھ کام کرتا تھا۔ شی میں اس نے بہت مال بنایا تھا اب آٹھ دس ٹرکوں کے ساتھ گڈز ٹرانسپورٹ کمپنی چلا رہا ہے۔ کبھی کبھی میرے پاس آتا رہتا ہے۔ میرے دفتر ہی میں اس نے میری سیکریٹری پر ڈورے ڈالے تھے۔ بعد میں معصوم بن کر اسے اپنی ملازمت میں لینے کی اجازت مانگی تو میں نے اجازت دے دی۔ جب میں نے اس کے منہ پر تھوک ہی دیا تو وہ بدرو کے پاس جائے یا چکلے میں بیٹھ جائے' مجھے کیا فرق پڑتا ہے؟"

"اسے شرم تو دلانی تھی کہ اس نے تمہاری سیکریٹری کو توڑ لیا۔" مجھے یاد آگیا تھا کہ بدرو دادا اپنے زمانے میں کتنا شہ زور اور منہ پھٹ بدمعاش ہوا کرتا تھا مگر ہم لوگوں سے ہمیشہ دبتا چلا آیا تھا۔

"میں نے اس بات کو اہمیت ہی نہیں دی۔ اس سے شکوہ کرتا تو وہ سمجھ لیتا کہ دال میں کچھ کالا تھا۔ میں نے اس پر اپنا بھرم ابھی تک قائم رکھا ہوا ہے۔ آخر کو ہم لوگ اس کے باس رہ چکے ہیں۔"

"اس کی اڑان بہت اونچی تھی۔ مال برداری کے کام سے اس کا پیٹ بھر جاتا ہے؟"

"مال برداری تو بس ایک آڑ ہے۔ افغانستان کے لیے مال منگوانے والے اس کی ملی بھگت سے کاغذوں پر راہداری دکھا کر مال پاکستان میں بلیک کردیتے ہیں۔ وہ اس میں خاصا مال بنا لیتا ہے۔ اسے ایک شنگاری پارٹی بھی ملی ہوئی ہے۔ وہ اس کا پاؤڈر کراچی لاتا رہتا ہے۔"

"شنگاری پارٹی؟" میں نے حیرت سے دہرایا۔ "اس کا افغانستان کی شنگارا ویلی سے تو کوئی تعلق نہیں ہے؟"

وہ بے اعتباری سے ہنسنے لگا۔ "سب جانتے ہو اور میرا امتحان لے رہے ہو۔ میں نے پہلی بار یہ نام سنا تھا تو مجھے یہ تک پتا نہیں تھا کہ شنگاری کسی آدمی کا نام ہے یا جگہ کا۔ بدرو دادا نے ہی ایک دن بتایا تھا کہ سردار پائندہ گل شنگارا ویلی کا حکمراں اور افیم کا بہت بڑا زمیندار ہے۔"

مجھے یوں لگا جیسے جہانگیر نے میرے سر پر لٹھ دے مارا ہو۔ سلمٰی کی کاہلی' ویرا کے پھکڑپن اور لیڈی سیکریٹری کی طوطا چشمی سے شروع ہونے والی باتوں کی تان سردار پائندہ گل پر جا کر ٹوٹی تھی۔ دنیا واقعی بہت مختصر تھی۔ کبھی کبھار تو ہر شخص ایک دوسرے کا شناسا معلوم ہونے لگتا تھا۔

"ذرا فون پر بدرو دادا سے میری بات کراؤ۔" میں نے ایک فوری خیال کے تحت کہا۔

"میرا خیال ہے کہ وہ مجھے بھی نہیں بھولا ہوگا اس سے بات کرکے پرانی یادیں ہی تازہ ہوجائیں گی۔"

"آج وہ ٹرک پر کسی کی لاش لے کر گیا ہے۔ صبح اس نے فون کرکے بتایا تھا کہ یہاں پائندہ گل کے ایک خاص آدمی کا قتل ہوگیا ہے۔ بدرو اس کی میّت میں شریک ہوکر ہی واپس آئے گا۔"

اسی وقت وہ دونوں عورتیں آگئیں۔ غزالہ' جہانگیر کے بیٹے کو ہوا میں اچھال کر لپکتی ہوئی آرہی تھی۔ صحت مند بچہ جوش اور خوشی کے ساتھ قلقاریاں مار رہا تھا۔

غزالہ اور سلمٰی میں گہری گھُٹ رہی تھی۔ چائے وغیرہ پینے کے دوران میں بھی وہ اپنی باتوں میں مگن رہیں۔ آخر میں نے سلمٰی کو اپنی امانت کے بارے میں یاد دلایا اور وہ فوراً ہی مجھے اپنی خواب گاہ میں لے جانے پر آمادہ ہوگئی۔ غزالہ اس کے بیٹے کے ساتھ وہیں بیٹھی رہی۔

"تم مجھے بالکل ہی بھول گئے ہو۔" جہانگیر اور غزالہ سے دور نکلتے ہی سلمٰی نے شکوہ شروع کردیا۔ "مجھے معلوم ہے کہ تم غزالہ کے ساتھ مگن رہتے ہو لیکن تم پر میرا بھی کچھ حق ہے۔ کم از کم مجھے فون تو کرسکتے ہو۔ پتا نہیں کیوں' تم سے بات کرتی ہوں تو میرے دل سے سارا بوجھ دور ہوجاتا ہے۔ ورنہ اندر ہی اندر کُڑھتی رہتی ہوں۔"

"ایک بچہ ہوجانے کے بعد تمہارے اور جہانگیر کے درمیان ذہنی ہم آہنگی پیدا ہوجانی چاہیے۔" میں نے اپنا دامن بچانے کے لیے ناصحانہ لب و لہجہ اختیار کرتے ہوئے کہا۔ "جہانگیر کو تمہاری ایسی باتوں کی بھنک بھی مل گئی تو وہ مجھ سے بھی بدظن ہوجائے گا۔

آپس میں بے اعتمادی ہو تو شبہات بہت تیزی سے پروان چڑھتے ہیں۔"

"وہ مجھے ذاتی ملازمہ سے زیادہ وقعت ہی نہیں دیتا۔ چاہتا ہے کہ بس اس کے اشاروں پر ناچتی رہوں۔ میرے اوپر جب بہت زیادہ مہربان ہوتا ہے تو بس رات میرے ساتھ بسر کرلیتا ہے اور کئی کئی دنوں تک کڑک مرغی کی طرح پھولا پھرتا ہے جیسے اس نے مجھ پر کوئی احسان کیا ہو۔ ایسے آدمی کے ساتھ کیا خاک ہم آہنگی ہو سکتی ہے۔ میں تو بس اپنا وقت گزار رہی ہوں۔"

ان دونوں کے معاملات غالباً خاصے خراب ہو چکے تھے۔ اگر سلمٰی میری ہمدردیاں جیتنے کی کوشش میں مبالغہ نہیں کر رہی تھی تو ان کے درمیان کسی ثالث کا دخل بہت ضروری ہو گیا تھا مگر میں اس وقت ایسے بکھیڑوں میں پڑنے کے موڈ میں نہیں تھا۔

سلمٰی بولتی رہی اور میں اسے مختصر جوابات سے بہلاتا رہا۔ جب میں اس کی تجوری کے ایک بڑے خانے میں بھری ہوئے' اپنے ڈالروں کے ڈھیر میں سے دو گڈیاں نکال رہا تھا تو وہ میری مدد کے بہانے اس حد تک میرے قریب آگئی کہ اس کے اور میرے بدن کے درمیان فاصلہ تقریباً ختم ہی ہو گیا۔ میں مطلوبہ گڈیاں نکال کر' اسے تقریباً ایک طرف دھکیلتا ہوا دور ہٹ آیا۔

"کیا تجوری کھلی چھوڑ دو گے؟" سلمٰی نے گہری نگاہوں سے میری طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

"تم بند کر دو۔ جہانگیر کی موجودگی میں تمہیں محتاط رہنا چاہیے۔ ہمارے درمیان میں لاکھ بے تکلفی ہو۔ لیکن میں اس کا دوست ہوں۔" میں یہ کہتا ہوا اس کی خواب گاہ سے نکلتا چلا گیا۔ سلمٰی شاید میری بے اعتنائی پر دانت پیستی رہ گئی ہوگی۔

میں وہاں جس کام سے آیا تھا وہ ہو چکا تھا۔ بدرو دادا اور سردار پائندہ گل کے قریبی مراسم کے بارے میں معلومات مفت میں مل گئی تھیں۔ میرے سرد مہری پر مبنی رویے کی وجہ سے سلمٰی میری طرف سے برہم ہو گئی تھی جس کا اثر اس کی اور غزالہ کی خوش دلانہ گفتگو پر بھی پڑا تھا۔ میں نے مزید چند منٹ وہاں گزارنے کے بعد روانگی کی اجازت لے لی اور ہم سیدھے گھر لوٹ آئے۔

مجھے ڈر تھا کہ واپسی پر ویرا اور سلطان شاہ کا کوئی نہ کوئی تنازعہ ہمارا منتظر ہوگا لیکن اس دن ستارے کچھ یاور تھے کہ ان دونوں میں کسی تکرار یا تصادم کی نوبت نہیں آئی تھی اور وہ پر امن بقائے باہمی کے اصول کے تحت ٹیلی وژن پر ایک فلم دیکھنے میں مصروف تھے۔ رات ساڑھے بارہ بجے میں' سلطان شاہ کو ساتھ لے کر فلیٹ سے ائرپورٹ کے لیے روانہ ہوا تو ہم دونوں ہی کسی برے وقت کا سامنا کرنے کے لیے تیار تھے۔ ہم دونوں کے پاس نہ صرف بھرے ہوئے پستول موجود تھے بلکہ میں نے بیم گن بھی اپنے لباس میں چھپا لی تھی۔ یہ ہماری خوش قسمتی تھی کہ بے ہوش ویرا کو واپس لے جانے والے' عبدالرحیم خان کے باریش ڈرائیور نے ویرا کے پرس کو نہیں چھیڑا تھا اور بیم گن ہمارے پاس رہ گئی تھی۔

"میں تمہارے ساتھ جا رہا ہوں لیکن ابھی تک مجھے یہ پتا نہیں ہے کہ ہمیں ائرپورٹ پر کیا کرنا ہے۔ بس اندازہ کرلیا ہے کہ پُرخطر حالات بھی پیش آسکتے ہیں۔ کم از کم مجھے کچھ تفصیل تو بتا دو۔" تھوڑی دیر بعد سلطان شاہ نے کہا۔

"اسپیشل ٹاسک فورس میں ظفر کی جگہ کام کرنے والا' البرٹو و یلیسا کیفرِ کردار کو پہنچ چکا ہے لیکن اس کے کچھ پیغامات پکڑے گئے ہیں جن سے ظاہر ہوتا ہے کہ اس ریکٹ کا کوئی بہت اہم آدمی آج رات دو بجے کی پرواز سے کراچی پہنچ رہا ہے۔ ہم لوگ اس پر ہاتھ ڈالنے کی فکر میں ہیں۔ اسے پکڑ لیا گیا تو کرنل جیسی جونز اور ڈیوڈ اسٹارز کی سازشوں کا سلسلہ اسی مرحلے پر ختم ہو سکتا ہے۔" میں نے اسے آگاہ کیا۔

"اس کے لیے اتنی بھاگ دوڑ کی کیا ضرورت تھی؟ اسے طیارے سے نکلتے ہی یا پھر امیگریشن کے مرحلے پر آسانی کے ساتھ پکڑا جا سکتا ہے۔ کامیابی کو یقینی بنانے کے لیے اندر فورس بھی متعین کی جا سکتی ہے" اس نے حیرت کے ساتھ کہا "اس کام کے لیے پیچیدہ طریقہ کار اختیار کرنے کی کیا ضرورت پیش آگئی تھی؟"

اس کی الجھن اپنی جگہ بالکل بجا تھی۔ مجھے تفصیل کے ساتھ اسے پورے پس منظر سے آگاہ کرنا پڑ گیا۔ گھر پر اس بارے میں کوئی سوال کیا گیا تھا' نہ ہی میں نے اس موضوع پر بات چھیڑی تھی۔

"میری مفروضہ صورتِ حال جس قدر آسان نظر آرہی تھی' حقیقی مسئلہ اس سے بہت مختلف اور دشوار ہے" وہ پُرتشویش انداز میں بڑبڑایا "ہر بین الاقوامی پرواز پر سیکڑوں مسافر ہوتے ہیں۔ ان میں سے خاصی تعداد کی منزل کراچی ائرپورٹ ہو سکتا ہے۔ نام' قومیت یا شکل و صورت سے واقفیت کے بغیر' اس بھیڑ میں ایک مشتبہ آدمی کو کیسے پہچانا جا سکے گا؟ کسی کرامت کے بغیر ہماری کامیابی مشکوک معلوم ہوتی ہے۔"

مجھے اس سے اتفاق کرنا پڑا "کامیابی کا امکان کم ہے لیکن یہ معلوم ہو جانے کے بعد کہ اس پرواز سے ایک مجرم یہاں آرہا ہے' ہم گھر پر نہیں رہ سکتے تھے۔ ہو سکتا ہے کہ یہاں کوئی تدبیر کام کر جائے۔ بعض اوقات تمہاری کھوپڑی بھی خاصے گل کھلاتی ہے۔ اسی لیے میں تمہیں بھی اپنے ساتھ لے آیا ہوں۔"

"فی الحال میری کھوپڑی پر برف جمی ہوئی ہے" وہ ہنستے ہوئے بولا "ہو سکتا ہے کہ یہ چل ہی جائے۔"

ائرپورٹ کے پارکنگ لاٹ میں گاڑی چھوڑنے کے بعد ہم دونوں سڑک عبور کر کے لاؤنج کی طرف بڑھے تو ایک نیم تاریک دھبے سے نکل کر اچانک ہی اول خان ہمارے سامنے آگیا۔

"ارے' تم ہم سے پہلے یہاں پہنچے ہوئے ہو؟" میں نے غیر ارادی طور پر اپنی رسٹ واچ پر نگاہ ڈالتے ہوئے پوچھا۔ اس وقت دو بجنے میں کئی منٹ باقی تھے جب کہ طیارے کی لینڈنگ اور مسافروں کی باہر آمد کے دوران بھی خاصا وقت لگتا ہے۔ اس طرح اول خان وقت سے کافی پہلے وہاں موجود تھا۔

"میرا یہاں آنا اچھا ہی ہوا" وہ میرے قریب آتے ہوئے بولا "یہاں وفاقی خفیہ اداروں کے کچھ لوگ ہم سے پہلے آئے ہوئے ہیں۔ ہمیں ایک دوسرے سے الگ اور محتاط رہ کر آنے والوں پر نگاہ رکھنی ہوگی۔"

"اس بین الاقوامی ہوائی اڈے پر ایسے لوگوں کی موجودگی عام سی بات ہے۔ ہو سکتا ہے کہ کوئی بڑا افسر' عوامی نمائندہ یا کوئی اور اہم آدمی آرہا ہو۔ اس بارے میں تم پریشان کیوں ہو؟"

"میں پریشان نہیں تھا۔ ان لوگوں کی موجودگی محسوس کر کے میں چونکا تھا۔ پھر میں ان میں اپنے ایک شناسا سے مل بیٹھنے میں کامیاب ہوا تو مجھے پتا چلا کہ وہ لوگ انٹیلی جنس بیورو کے ایک اہم غیر ملکی مہمان کی حفاظت کے لیے یہاں آئے ہوئے ہیں۔ وہ جیک رونالڈو نامی کوئی امریکی ہے۔ کیا یہ بات حیرت ناک نہیں ہے کہ جس پرواز سے کرنل جیسی جونز یا اس کا نمائندہ آرہا ہے' اسی پرواز سے جیک رونالڈو بھی یہاں پہنچ رہا ہے؟"

"حیرت ناک ضرور ہے لیکن ناممکن نہیں۔ یہ دنیا بعض اوقات بہت زیادہ سکڑی ہوئی محسوس ہوتی ہے" میں نے جہانگیر کی زبان سے بدرو دادا اور سردار پائندہ گل کے تعلقات کا ذکر سننے کا اتفاقی واقعہ یاد کرتے ہوئے کہا "ان کی یہاں پر موجودگی کے مقصد سے واقف ہو جانے کے بعد تمہارا تردد دور ہو جانا چاہیے تھا۔"

"ہم الگ الگ رہ کر زیادہ مؤثر انداز میں اپنا کام کر سکیں گے۔ میں تم لوگوں کو یہی بات بتانے کے لیے اس طرف کھڑا ہوا تمہارا انتظار کر رہا تھا۔ اب ہمیں ایک ایک کر کے اندر چلنا چاہیے۔"

"جیک رونالڈو کون ہے؟" سلطان شاہ نے سوال کیا "اور یہاں کس لیے آرہا ہے؟"

"جس آدمی سے میری ملاقات ہوئی وہ بہت زیادہ باخبر نہیں تھا ورنہ میں خود بھی یہ باتیں معلوم کرنی چاہ رہا تھا۔" اوّل خان نے اس کے سوال کی اہمیت کو تسلیم کرتے ہوئے جواب دیا۔

"وہ کوئی بھی ہو سکتا ہے" میں نے خشک لہجے میں سلطان شاہ سے کہا "سرکاری دعوت پر روزانہ سیکڑوں غیر ملکی ماہرین پاکستان آتے جاتے رہتے ہوں گے۔ ہمیں ان سے کیا لینا ہے؟"

"بس یہ خیال رکھنا کہ اندر کافی لوگ مستعد ہیں۔ جیک رونالڈو کو لینے کے لیے پروٹوکول والے آئے ہوئے ہیں۔ ان کی دیکھ بھال اور حفاظت کے لیے دوسرے لوگ پھیلے ہوئے ہیں۔ آج کل کے حالات کی وجہ سے میں آئی بی والوں کے ساتھ کسی بدمزگی میں الجھنا پسند نہیں کروں گا" یہ کہتے ہوئے وہ ہم سے الگ ہو کر' تیز تیز قدموں سے چلتا ہوا برآمدے کے اس حصے کی طرف بڑھتا چلا گیا جہاں مسافروں کا استقبال کرنے والوں کی مضطرب بھیڑ موجود تھی۔

ہم دونوں بھی ایک دوسرے سے الگ ہو کر اسی طرف ہو لیے۔ میں نے اول خان کی تشویش کو کوئی اہمیت نہ دے کر شاید اسے قدرے خفا کر دیا تھا لیکن اکیلا رہ جانے کے بعد معاً مجھے خیال آیا کہ جیک رونالڈو کے معاملے میں کہیں نہ کہیں کوئی گڑبڑ ضرور تھی۔ اگر وہ اپنے میزبان محکمے کے لیے اسی قدر اہم اور ناگزیر مہمان تھا تو اسے عام مسافروں والے راستے کے بجائے' وی آئی پی لاؤنج کے ذریعے لایا جانا چاہیے تھا جہاں بھیڑ بھاڑ نہ ہونے کی وجہ سے اس کی دیکھ بھال میں کوئی دشواری نہیں ہونی چاہیے تھی۔ ایک طرف اسے اس قدر اہمیت دی جا رہی تھی کہ اس کے استقبال کے لیے غیر معمولی تیاریاں کی گئی تھیں تو دوسری طرف اسے عام مسافروں کی بھیڑ میں لایا جا رہا تھا۔

شفاف شیشے کی دیواروں کے اس پار' بیگیج ہال میں ائرپورٹ سیکیورٹی فورس' کسٹم اور دوسرے اداروں کے اہلکار گھومتے پھرتے نظر آرہے تھے لیکن اس وقت تک مسافر نہیں آئے تھے۔ الیکٹرونک انفارمیشن بورڈ پر جلتی اور بجھتی ہوئی سبز روشنی' فرینکفرٹ سے آنے والی پرواز کے پہنچ جانے کا اعلان کر رہی تھی۔ اپنے اپنے مسافروں کو خوش آمدید کہنے کے لیے آئے ہوئے شہری تجسس کے عالم میں بار بار اچک اچک کر یا شیشے کی دیواروں کے قریب جا کر خالی ہال میں شناسا چہروں کی تلاش میں سرگرداں تھے جیسے وہ پیشگی آثار و علامات کے بغیر اچانک ہی کہیں سے ہال میں آٹپکیں گے۔

ہوٹلوں کا عملہ اپنے مسافروں کو متوجہ کرنے والے ڈسپلے بورڈز تھامے ایک طرف موجود تھا۔ وہ ہر پرواز کے ساتھ ائرپورٹ پر آنے والے تجربے کار لوگ تھے۔ انہیں معلوم تھا کہ طیارے کے رن وے چھونے سے مسافروں کے عمارت میں داخل ہونے تک فنّی انتظامات کا ایک طویل سلسلہ ہوتا ہے جس کی وجہ سے پندرہ بیس منٹ اور بسا اوقات اس سے زیادہ وقت صرف ہو جاتا ہے۔ وہ اطمینان کے ساتھ خوش گپیوں میں مصروف تھے۔

انہیں دیکھ کر میرے ذہن میں ایک خیال پیدا ہوا۔ البرٹو و یلیسا کے سلسلے میں میرے سامنے افراد اور تنظیموں کے کئی نام تھے جن کے مخفف متعلقہ افراد کی توجہ فوری طور پر اپنی طرف

مبذول کراسکتے تھے۔ ان میں جیسی جونز کا مخفف جے جے‘ البرٹوو یلیسا کا مخفف اے وی یا ڈیوڈ اسٹارز کا مخفف ڈی ایس شامل تھے۔

سلطان شاہ اور اول خان مجھ سے دور‘ الگ الگ جگہوں پر کھڑے ہوئے تھے۔ میں اس موقعے سے فائدہ اٹھاتے ہوئے ایک طرف چل دیا۔ بک اسٹال پر گتے کی شیٹ موجود نہیں تھی لیکن میرے استفسار پر دکاندار نے پانچ روپے کے عوض ایک بڑے ڈبے کا سفید ڈھکنا دے دیا جسے پلے کارڈ کے طور پر استعمال کیا جاسکتا تھا۔ میں نے وہیں کھڑے کھڑے‘ سیاہ مارکر سے بہت جلی حروف میں جے جے کے انگریزی حروف لکھے اور واپس لاؤنج کے سامنے والے عظیم الشّان برآمدے میں پہنچ گیا۔

چند منٹ بعد بیگیج ہال میں مسافروں کی آمد شروع ہوئی تو انتظار کرنے والوں میں ہلچل کی ایک نئی لہر پیدا ہوگئی۔ اس پرواز سے کراچی میں اترنے والوں کی تعداد زیادہ نہیں تھی اس لیے ان کی خاطر آنے والوں کی تعداد بھی بہت زیادہ نہیں تھی ورنہ کراچی پر ختم ہونے والی‘ پی آئی اے یا دوسری ائرلائنز کی بین الاقوامی پروازوں کی آمد کے وقت یہی ہجوم دور تک پھیلا ہوا نظر آتا ہے۔

ڈھائی بجے کے بعد پہلا مسافر اپنے سامان کی ٹرالی کے ساتھ نکاسی کے راستے کی طرف آتا ہوا نظر آیا تو ہوٹلوں سے آنے والے مہمان دار بھی اپنے اپنے پلے کارڈز لے کر ایسی جگہوں پر آگئے جہاں ہر مسافر کی نظر ان پر پڑسکتی تھی۔ میں نے بھی جے جے والا سفید گتّا اونچا کرکے ایک مناسب جگہ سنبھال لی۔ اول خان اس وقت بھی مجھ سے خاصے فاصلے پر‘ داہنی طرف کی ریلنگ کے ساتھ کھڑا ہوا تھا۔ جب میں نے اس کی طرف دیکھا تو وہ بہت غور سے میری ہی طرف دیکھ رہا تھا۔ شاید میری حرکت کا مفہوم اس کے پلّے نہیں پڑسکا تھا۔

اس پرواز سے آنے والوں میں پاکستانی نژاد مسافروں کی تعداد کم تھی۔ بیشتر مسافر غیر ملکی اور سفید فام تھے جن کے ساتھ بہت زیادہ سازو سامان نہیں تھا۔ میری نظریں مسافروں کے ساتھ ساتھ ان لوگوں پر بھی تھیں جو میرے اردگرد کھڑے ہوئے تھے پھر مجھے اردلی یا ڈرائیور نما وہ وردی پوش شخص بھی نظر آگیا جس کے ہاتھ میں موجود پلے کارڈ پر انگریزی میں مسٹر جے رونالڈو کا نام لکھا ہوا تھا۔ اس شخص کے قریب ہی سوٹ میں ملبوس دو افراد غیر متعلقانہ انداز میں کھڑے ہوئے باتیں کررہے تھے۔ ان میں سے سفید بالوں والے مُعنک شخص کے دانتوں میں موٹا سا سگار دبا ہوا تھا۔ جبکہ اس سے قدرے کم عمر شخص پوری توجہ سے سفید بالوں والے کی بات سن رہا تھا۔ ان کے کروفر اور دوسروں سے الگ تھلگ رویّے کی بنا پر یہ اندازہ لگانا دشوار نہیں تھا کہ وہ بڑے عہدوں والے سرکاری افسران تھے اور انہیں عام لوگوں کی بھیڑ میں مل کر کسی کا انتظار کرنا گراں گزر رہا تھا۔

اندر سے تسلسل کے ساتھ مسافروں کی آمد شروع ہوئی تو ہوٹلوں میں پیشگی بکنگ رکھنے والے مسافر اپنے اپنے ہوٹل کے پلے کارڈز دیکھ کر ایک طرف رکنے لگے۔ میری نگاہیں پُرامیدی کے عالم میں سامنے کی طرف جمی ہوئی تھیں۔ اس وقت میرا دل تیزی کے ساتھ دھڑک اٹھا جب مجھے ایک متوسط قامت سفید فام اپنی طرف آتا ہوا نظر آیا۔ اس کی ٹرالی پر صرف ایک مختصر سا سوٹ کیس اور دو عدد بریف کیس رکھے ہوئے تھے۔ اس کے پیچھے قدرے جلی ہوئی رنگت والا ایک سرخ و سفید اور گرانڈیل غیر ملکی بھی چلا آرہا تھا۔ اس کے دونوں ہاتھ خالی تھے اور ایسا معلوم ہو رہا تھا جیسے وہ ٹرالی والے متوسط قامت سفید فام کا ہمراہی ہو۔

اچانک متوسط قامت والے نے لمحہ بھر کے لیے پیچھے مڑکر گرانڈیل سفید فام سے کچھ کہا پھر ٹرالی سمیت میری طرف ہولیا۔ اس بار اس نے واضح طور پر میرا پلے کارڈ دیکھ لیا تھا اور اس کے چہرے پر برہمی کے آثار ابھر آئے تھے۔

ٹرالی روک کر‘ وہ اس کے عقب سے نکل کر میرے قریب آیا پھر اس نے اپنا چہرہ میرے چہرے کے قریب لاتے ہوئے زہریلی‘ سرگوشیانہ آواز میں کہا ”مطلع ابر آلود ہو تو سورج بھی سامنے نہیں آتا اور تم یہ منحوس اشتہار لیے کھڑے ہو۔ اس کی بتّی بنالو...“

انگریزی میں وہ زہر آلود مگر سنسنی خیز فقرے ادا کرنے کے بعد وہ میرا جواب سننے کے لیے نہیں رکا۔ میں اس غیر متوقع تجربے کی وجہ سے اپنی جگہ پر سن ہوکر رہ گیا لیکن میں نے غیر ارادی طور پر پلے کارڈ نیچے کرلیا تھا۔

اس اثنا میں گرانڈیل غیر ملکی اس ڈرائیور یا اردلی کے پاس پہنچ چکا تھا جس کے ہاتھ میں مسٹر جے رونالڈو کے نام کا پلے کارڈ موجود تھا۔ اپنے متوقع مہمان کی شناخت ہوتے ہی دونوں سرکاری افسران پُرتپاک انداز میں ہاتھ ملاتے ہوئے اسے ایک طرف نکال لے گئے تھے۔ میری گوشمالی کرنے والا متوسط قامت غیر ملکی اپنی ٹرالی لے کر اس جلوس کے پیچھے پہنچا تو کسی نے اس کی طرف توجہ نہیں دی لیکن پھر گرانڈیل شخص نے مڑکر شاید اس کا تعارف کرایا اور ڈرائیور نے فوراً ہی اس کے ہاتھ سے ٹرالی لے لی اور وہ بھی اپنے میزبانوں کے ساتھ شامل ہوگیا۔

جیک رونالڈو اکیلا نہیں تھا۔ وہ اپنے کسی ساتھی کے ہمراہ آیا تھا لیکن میں یہ سمجھنے سے قاصر تھا کہ اس کے ساتھی نے مجھ پر اپنی برہمی کا اظہار کیوں ضروری سمجھا تھا؟ میرے لیے وہ صورتِ حال سنسنی خیز تھی اور میرا دل کنپٹیوں میں دھڑکنا شروع ہوگیا۔ میں نے فوراً ہی اول خان کی طرف دیکھا لیکن وہ وہاں موجود نہیں تھا۔ شاید اس نے بھی دیکھ لیا تھا کہ انٹیلی جنس بیورو کے دو مہمانوں میں سے ایک نے چند ثانیوں کے لیے رک کر مجھ سے بات کی تھی۔ میں نے غیر ارادی طور پر اپنے لباس میں پوشیدہ پستول کو ٹٹولتے ہوئے تیزی کے ساتھ اپنی جگہ چھوڑدی۔

جے رونالڈو اور اس کے ساتھی کے استقبال کے لیے آئے ہوئے لوگ ان دونوں کو عمارت سے نکاسی کے راستے کی طرف لے جارہے تھے اور میں اپنے ہاتھ میں تھاما ہوا گتّے کا ٹکڑا ایک کوڑے دان میں ڈال کر‘ غیر ارادی طور پر اس مختصر سے جلوس کے پیچھے ہولیا تھا۔

اس وقت تک میری کھوپڑی سُن تھی۔ عقل کو چکرادینے والی ایسی صورتِ حال میرے سان دگمان میں بھی نہیں تھی۔ مجھے وہ سب ایک ناقابلِ یقین سا خواب محسوس ہو رہا تھا۔ میں نے خالی الذہنی کے عالم میں اِدھر اُدھر نگاہیں دوڑائیں تو مجھے کچھ فاصلے پر سلطان شاہ نظر آگیا۔ وہ مجھ سے بے تعلق نظر آنے کی کوشش کرتے ہوئے میرے پیچھے ہی آرہا تھا لیکن اول خان اس بھیڑ میں کہیں گم ہوچکا تھا۔

میں اول خان کی تلاش میں دائیں بائیں دیکھتا ہوا آگے بڑھ رہا تھا اس لیے سامنے سے آنے والے شخص کے بھاری بھرکم وجود سے تصادم ہوتے ہی میں اپنی جگہ پر لڑکھڑا کر رہ گیا۔ آنے والے کی رفتار ذرا بھی زیادہ ہوتی تو میں پختہ فرش پر سر کے بل گر کر زخمی ہوسکتا تھا۔

”میرے پیچھے آؤ۔“ میرے کان کے قریب ایک تیز سرگوشیانہ آواز لہرائی۔

میں نے غصے اور جھلاہٹ کے عالم میں اپنی گردن گھما کر اس بدتمیز شخص کو لتاڑنے کا ارادہ کیا ہی تھا کہ اس کی پشت پر نظر پڑتے ہی میں نے اسے پہچان لیا۔ وہ یقینی طور پر اول خان تھا اور شاید دانستہ طور... پر مجھ سے ٹکراتا ہوا گزرا تھا تاکہ دوسروں کو کسی شبے کا موقع دیے بغیر مجھ تک اپنا پیغام پہنچا سکے۔ اس کے لبوں کی جنبش دیکھنے والوں کو یہی محسوس ہوا ہوگا کہ وہ اپنی راہ میں حائل ہونے والے بے پروا شخص پر دانت پیس رہا ہے۔

وہ لمبے لمبے ڈگ بھرتا ہوا‘ داہنی طرف والی راہداری کی طرف جارہا تھا جہاں بالکل سناٹا چھایا ہوا تھا۔

میں بھی بھیڑ سے الگ ہوکر آہستہ آہستہ اُسی طرف چل دیا۔ ستونوں کی آڑ میسر آتے ہی میں نے اپنی رفتار تیز کردی۔ اس وقت تک اول خان ایک ٹیلی فون بوتھ کے قریب جاکر رک چکا تھا۔

میں اس کے قریب پہنچا تو وہ ریسیور کان سے لگائے کھڑا تھا۔ اس کا چہرہ جوش سے تمتما رہا تھا۔ مجھے دیکھتے ہی وہ بے ساختہ بولا۔ ”تم نے کمال کردیا۔ تمہاری ایک معمولی سی حرکت نے انہیں بے نقاب ہونے پر مجبور کردیا۔“

میں خاموش کھڑا رہا۔ اول خان اس وقت بوتھ کی طرف متوجہ تھا اس لیے مجھے خیال ہوا کہ وہ فون پر کسی سے بات کررہا ہے جس میں میری دخل اندازی مناسب نہیں تھی۔

”میں تم سے بات کررہا ہوں۔ ٹیلی فون کی لائن بے جان ہے۔“ اس کی جھلّائی ہوئی آواز نے مجھے چونکا دیا۔ اول خان نے اس بار بھی اپنی پوزیشن تبدیل کرنے کی کوئی ضرورت محسوس نہیں کی تھی۔

”ہاں.... آں۔“ میں نے چونک کر کہا۔ ”ہوٹل والوں کو دیکھ کر یہ خیال سوجھا تھا کہ کیوں نہ میں بھی اپنے متوقع مہمان کے مخفف نام کا پلے کارڈ بنالوں لیکن میں اب بھی کچھ سمجھنے سے بالکل قاصر ہوں۔ اس سرکاری مہمان کو بلاوجہ ہی مجھ پر آنکھیں نکالنے کی کیا ضرورت تھی؟“

”شاید تمہاری کھوپڑی پر برف جم گئی ہے۔ ان حرامزادوں پر تو کوئی شبہ بھی نہیں کرسکتا تھا۔ ان لوگوں کی حفاظت کے لیے پوری ایک بھیڑ حرکت میں آئی تھی۔ انہوں نے دور دور سے ان کے گرد اپنا حصار قائم کیا ہوا ہے۔ میرا خیال ہے کہ وہ سب خود کار ہتھیاروں سے لیس ہیں۔ وہ بندر کی اولاد تم سے کیا کہہ رہا تھا؟“

میں نے سفید فام کے کہے ہوئے انگریزی فقرے کسی ردّوبدل کے بغیر دہرادیے۔

”یہی تین فقرے اس معاملے کی کلید ہیں۔“ اول خان کی آواز سے اندرونی ہیجان اور جوش کا اظہار ہو رہا تھا۔ ”ان لوگوں کے لیے یہاں کا مطلع صاف نہیں ہے۔ اسی لیے وہ سرکاری مہمانوں کا روپ دھار کر یہاں آئے ہیں اور تم نے جے جے یعنی جیسی جونز کے نام کا اشتہار بلند کیا ہوا تھا۔ میں شرط لگا سکتا ہوں کہ وہ بدمعاش تم کو البرٹوو یلیسا کا آدمی سمجھ کر تمہاری طرف آیا تھا۔ ان دونوں میں سے کوئی ایک جیسی جونز یا اس کا کوئی اہم آدمی ہے۔ ہوسکتا ہے کہ یہ دونوں افراد‘ البرٹوو یلیسا کے تربیت یافتہ بندروں کے بارے میں تحقیق کی آڑ لے کر یہاں آئے ہوں۔ مگر یہ ہماری سرزمین پر قدم رکھتے ہی ہمارے جال میں پھنس گئے ہیں.....“

میرے ذہن نے جوں ہی ان خطوط پر کام کرنا شروع کیا‘ میں نے اول خان کی بات کاٹ دی۔ ”اگر تمہارے اخذ کیے ہوئے نتائج درست ہیں تو ہم یہاں کیا کررہے ہیں؟ اتنی دیر میں وہ نکل جائیں گے۔“

”فکر نہ کرو۔ میں ان کی روانگی میں تاخیر کا بندوبست کرآیا ہوں۔ میں تم سے اس گورے کے مکالمات کے بارے میں معلوم کرنے کے لیے اِدھر آیا تھا۔ اب میں ان کے پیچھے جاؤں گا۔ فون خالی ہونے کے بعد تم یہاں سے ایک آدھ کال کرنے کے بعد اپنے فلیٹ کی طرف روانہ ہوجاؤ۔ میں واپسی پر اُدھر آنے کی کوشش کروں گا۔ ویسے وہ نکل بھی گئے تو میری نظروں سے بچ نہیں سکیں گے۔ سرکاری مہمانوں کی نقل و حرکت کا پتا چلانا زیادہ مشکل نہیں ہوتا۔“

وہ ریسیور ہک سے لٹکا کر عُجلت کے عالم میں وہاں سے روانہ ہوگیا۔ اگر اس وقت بھی کچھ نادیدہ آنکھیں ہماری نگرانی کررہی تھیں تو وہ دور سے اصل صورتِ حال کا ادراک کرہی نہیں سکتی

تھیں۔ بادی النظر میں یہی معلوم ہوتا تھا کہ اول خان کوئی اہم فون کال کرنے میں مصروف تھا اور میں اپنی باری کے لیے فون خالی ہونے کے انتظار میں اس دور افتادہ فون بوتھ کے سامنے کھڑا ہوا تھا۔

اول خان کے چلے جانے کے بعد میں نے بوتھ کے دیوار گیر بُڈ میں داخل ہو کر ریسیور سنبھال لیا۔

مجھے وہاں چند منٹ ہی گزارنے تھے جو میں اسی پوزیشن میں کھڑا رہ کر بھی گزار سکتا تھا۔ کوئی متنفس اپنی طرف آتا ہوا نظر آتا تو میں اسے سنانے کے لیے یک طرفہ گفتگو کا آغاز بھی کر سکتا تھا لیکن میں نے اس مضحکہ خیز صورتحال سے بچنے کے لیے مطلوبہ مالیت کے سکے ڈال کر غزالہ کا نمبر ملا ڈالا۔

مجھے امید تھی کہ غزالہ میری واپسی کے انتظار میں جاگ رہی ہوگی اور وہی فون اٹھائے گی لیکن سلسلہ ملنے پر ویرا کی آواز سنی تو میں معنی خیز انداز میں اپنا سر ہلا کر رہ گیا۔

ویرا کرنل جیسی جونز کے معاملے میں میری توقع سے زیادہ دلچسپی لے رہی تھی۔

"صبح کے تین بجنے والے ہیں۔ تم ابھی تک کیسے جاگ رہی ہو؟"

"یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ تم شکار پر نکلے ہوئے ہو اور ہم لوگ مُنہ لپیٹ کر سو جائیں؟" ویرا کی آواز میں طنز کی ہلکی سی کاٹ کے ساتھ ہی شگفتگی بھی تھی جو اس کے مزاج کا خاصہ تھی۔

"اس کا مطلب ہے کہ غزالہ بھی تمہارے ساتھ شب بیداری کر رہی ہے؟"

"شب بیداری کیسی؟ میں نے اسے رمی سکھانے کی کوشش کی تھی لیکن دوسرے ہی ہاتھ میں اس نے مجھے لوٹ لیا۔ شکل صورت سے معصوم اور بھولی بھالی نظر آنے والی یہ لڑکی تو چھپی رستم نکلی۔ بڑے اعتماد سے کھیل رہی ہے اور مسلسل جیت رہی ہے۔ یہ بتاؤ کہ تم نے اس وقت کیسے فون کیا ہے؟"

"تھوڑی سی فرصت ملی تو سوچا کہ تمہاری چہکتی ہوئی آواز سن لوں۔"

"صاف کیوں نہیں کہتے کہ اب تمہیں کام پر بھی اپنی بیوی کی یاد ستانے لگی ہے۔"

"بیوی کے یاد آنے میں کوئی بُرائی نہیں ہے۔" میں نے اپنی مدافعت کرنے کی کوشش کی۔ "ویسے میں تم ہی سے بات کرنی چاہ رہا تھا۔ یہ بتانے کے لیے کہ کرنل جیسی جونز کے ناکافی اور ضرورت سے زیادہ مختصر پیغام کے بارے میں تمہارے اندازے غلط ثابت ہوئے ہیں اور اصل آدمی ہماری نگاہوں میں آ گئے ہیں۔"

"کیا واقعی؟" میرے کان میں اس کی تحیر زدہ آواز گونجی۔ "تم سچ کہہ رہے ہو؟"

"فی الحال اتنا ہی کافی ہے۔ تفصیل واپسی پر بتاؤں گا۔ بس تم گرم گرم کافی تیار رکھو۔"

"تو کیا تم فوراً واپس آ رہے ہو؟" میری فرمائش پر اس کی حیرت میں اضافہ ہو گیا۔

"ظاہر ہے کہ میں باقی ماندہ رات تو یہاں برباد نہیں کروں گا۔"

"ابھی تو تین بھی نہیں بجے۔ مسافر باہر آئے ہی ہوں گے۔ کیا تم ان کا پیچھا کر کے ان کی کمین گاہ کا سراغ لگانے کی کوشش نہیں کرو گے؟" میری فوری واپسی کی اطلاع اس کے لیے حیرتناک ثابت ہوئی تھی۔

"اول خان ان کے پیچھے گیا ہے۔ یہ کہانی تمہارے لیے خاصی دلچسپ ثابت ہوگی۔ بس تم کافی کا پانی رکھ دو۔ میں فون بند کرنے کے بعد ہی یہاں سے نکل کر فلیٹ کی طرف روانہ ہو رہا ہوں۔"

"معلوم ہوتا ہے کہ تم نے کافی کی فرمائش نوٹ کرانے کے لیے فون کیا تھا؟"

"چلو، تم ایسا ہی سمجھ لو۔ بس میں واپس آ رہا ہوں۔" میں نے ریسیور ہک سے لٹکا دیا۔

میں عمارت سے باہر نکلا تو جیک رونالڈو، اُس کے ساتھی یا ان دونوں کے استقبال کے لیے آنے والوں میں سے کسی کا پتا نہیں تھا۔ پارکنگ لاٹ میں پہنچا تو سلطان شاہ کار کے سہارے کھڑا ہوا میرا انتظار کر رہا تھا۔

"تمہاری ترکیب لاجواب تھی۔" میرے قریب پہنچنے پر اس نے متجسس انداز میں کہا۔ "میرا خیال ہے کہ انٹیلیجنس والوں کے مہمان کا ساتھی ہی تمہارا مطلوبہ شکار تھا، جب ہی وہ جے۔ جے والا بلے کارڈ دیکھ کر تیر کی طرح تمہاری طرف آیا تھا۔ کیا کہہ رہا تھا وہ؟"

میں کار کے دروازے کا قفل کھول کر ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھ گیا۔ دوسری طرف سے سلطان شاہ بھی میرے برابر میں آ بیٹھا اور میں نے انجن اسٹارٹ کر کے گاڑی آگے بڑھا دی۔

میں نے اسے جیک رونالڈو کے ساتھی کے کہے ہوئے فقرے سنانے کے بعد، اپنی بات جاری رکھتے ہوئے کہا۔ "وہ دونوں ہی بدمعاش اور کرنل جیسی جونز کے آدمی ہیں جو کسی نہ کسی طرح پاکستان کے سرکاری مہمانوں کے روپ میں یہاں آنے میں کامیاب ہو گئے ہیں اور اب ہمیں ان کے خلاف لڑنے میں خاصی دشواریوں کا سامنا کرنا ہوگا کیونکہ انہیں آئی بی والوں نے غیر معمولی تحفظ فراہم کیا ہے۔"

"میں تمہاری بات سے پوری طرح متفق نہیں ہوں۔" سلطان شاہ نے گہری سنجیدگی کے ساتھ کہا۔ "یہ بتاؤ کہ اول خان کیا کہتا ہے اور وہ ان لوگوں کے تعاقب میں کیوں گیا ہے؟"

"جو کچھ میں نے کہا، وہ اول خان ہی کی رائے ہے۔ میرا ذہن تو اس قدر ماؤف ہو گیا تھا کہ میں اپنی طرف آنے والے سفید فام کی ہرزہ سرائی سے فوری طور پر کوئی نتیجہ ہی اخذ نہیں کر سکا تھا۔"

"وہ ان کے پیچھے کیوں گیا ہے؟" سلطان شاہ نے ایک ایک لفظ پر زور دے کر سوال کیا۔

"ویسے تو وہ سرکاری مہمان بن کر آئے ہیں اس لیے اُن کی نقل و حرکت کا پتا چلانا آسان ہوگا لیکن ان کے لیے کیے جانے والے حفاظتی انتظامات سے یہ شبہ بھی ہوتا ہے کہ کہیں انہیں کسی خفیہ مقام پر نہ پہنچا دیا جائے۔ دوسری صورت میں اول خان کا تعاقب پر نکل جانا ہمارے لیے سودمند ثابت ہوگا۔"

"ان دونوں کے استقبال کے لیے آئے ہوئے لوگوں کا میں نے دور سے گہرا جائزہ لیا ہے۔ باوردی ڈرائیوروں سمیت کل چار مقامی آدمی ان دونوں غیر ملکیوں کو لے کر گئے ہیں۔ وہ سب ایک گاڑی میں تھے۔ اس کے پیچھے دوسری سرکاری گاڑی میں صرف شوفر گیا ہے۔ بقیہ چھ افراد ایک نئی لینڈ کروزر میں گئے ہیں۔ شاید وہی لوگ آنے والوں کی حفاظت پر مامور تھے اور میں نے دیکھ لیا تھا کہ وہ اپنے کام پر عبور رکھتے ہوں گے۔"

"گاڑیوں کی تعداد کے علاوہ، یہ سب باتیں مجھے معلوم ہیں۔" میں نے قدرے ناخوشگواری کے ساتھ کہا۔ "یہ سب بتا کر تم مجھے کیا سمجھانا چاہ رہے ہو؟"

"مجھے ڈر ہے کہ اس بار اول خان مارا جائے گا۔" اس نے آہستگی سے کہا۔ "اتنے بڑے اور چاق و چوبند جلوس کے پیچھے وہ اکیلا گیا ہے۔ وہ کسی صورت میں گھاگ محافظوں کی نظروں سے نہیں بچ سکے گا۔"

"انٹیلی جنس بیورو کے لوگوں کے گن گانے کے علاوہ بھی تمہارے پاس اس خدشے کا کوئی جواز ہے؟"

"بہت مضبوط۔" اس کی آواز پُر اعتماد تھی۔ "تم یہ کیوں نہیں سوچتے کہ جس مہمان کے سیکیورٹی رِسک سے نمٹنے کے لیے آئی بی والوں نے دس نفری ٹیم بھیجی تھی، اسے وی آئی پی لاؤنج کے بجائے عام مسافروں والے راستے سے باہر کیوں لایا گیا؟ وہ لوگ تو اسے رن وے سے ہی براہِ راست اپنی گاڑی میں لے کر غائب ہو سکتے تھے اور کسی کو کانوں کان علم بھی نہ ہو پاتا کہ یہاں کون آیا ہے اور اس کی کیا اہمیت ہے؟"

"آنے والوں کے سامان کا معاملہ بھی تو تھا۔ تم نے دیکھا نہیں کہ ٹرالی پر بڑے سائز کے بریف کیسز کے علاوہ ایک سوٹ کیس بھی تھا؟" میں نے وہ کمزور سا احتجاج کرتے ہوئے سوچا کہ سلطان شاہ درحقیقت میرے دل کی بات کہہ رہا تھا۔ میں نے بھی اول خان سے خبر ملنے کے بعد یہی سوچا تھا کہ انٹیلیجنس بیورو والے ایک طرف تو اپنے مہمان کی حفاظت کو غیر معمولی اہمیت دے رہے تھے اور دوسری طرف اسے عام مسافروں والے راستے سے باہر لایا جا رہا تھا۔ میرا ماتھا وہیں ٹھنکا تھا کہ جیک رونالڈو کے معاملے میں کہیں نہ کہیں کوئی گڑبڑ ضرور تھی۔ میرا ذہن اس گڑبڑ کی تہ تک نہیں پہنچ سکا تھا اس لیے انجان بن کر سلطان شاہ کا نقطۂ نظر سن لینے سے کوئی راہ نکل سکتی تھی۔

"بریف کیس وہ اپنے ساتھ لائے ہوں گے۔ بیگیج ٹکٹ کی مدد سے اکلوتے سوٹ کیس کو کوئی بھی اہل کار بعد میں حاصل کر سکتا تھا۔ حسّاس تو کیا، عام سرکاری دفاتر کے اعلیٰ افسروں کے لیے ایسا بندوبست کرنا بائیں ہاتھ کا کھیل ہوتا ہے۔" اسے مجھ پر اپنی معلومات کا رعب جھاڑنے کا موقع مل گیا۔ "بیوروکریسی یا افسر شاہی بھی پوری مافیا ہے۔ یہ اصولوں اور قاعدوں سے ہٹ کر بھی ایک دوسرے کا پورا پورا ساتھ دیتے ہیں۔ عام لوگوں کو قاعدے قانون کی مجبوریاں پڑھانے بیٹھ جاتے ہیں۔ ان دونوں کے سوٹ کیس کی بات بالکل لغو ہے۔ میں اسے نہیں مانتا۔"

"نہ مانو، لیکن آگے تو بولو۔ تمہارے ریکارڈ کی سوئی ایک ہی جگہ پر پھنس کر رہ گئی ہے۔"

"یہ سب ایک سوانگ تھا جو کامیاب رہا۔" اس کے انکشاف نے مجھے بری طرح چونکا دیا۔ وہ کہہ رہا تھا۔ "تم کسی بھی زاویے سے سوچ لو، تمہیں کوئی بات بنتی ہوئی نظر نہیں آئے گی۔ انٹیلی جنس بیورو والوں کو اندازہ تھا کہ پاکستان میں کچھ لوگ جیک رونالڈو کی آمد میں گہری دلچسپی لیں گے۔ انہیں بے نقاب کرنے اور ان پر ہاتھ ڈالنے کی بہترین صورت یہی ہو سکتی تھی کہ اس کی حفاظت کی پوری تیاریوں کے ساتھ اسے عام مسافروں والے راستے سے منظرِ عام پر لایا جائے اور تم کسی پیشگی منصوبہ بندی کے بغیر ان کی نظروں میں آ گئے۔ حالانکہ تمہارا نشانہ جیک رونالڈو نہیں بلکہ اس کا ساتھی تھا اور وہی تمہاری طرف متوجہ بھی ہوا تھا۔"

"تم ان دونوں میں تفریق کیوں کر رہے ہو؟" میں نے حیرت سے پوچھا۔ "وہ دونوں ہی ایک تھیلی کے چٹے بٹے ہیں اور ہم کو بیک وقت ان دونوں ہی سے نمٹنا ہوگا۔"

"میرا خیال اس کے برعکس ہے۔ اسی لیے میں نے ابتدا میں کہا تھا کہ میں تمہاری بات سے پوری طرح متفق نہیں ہوں۔ ہو سکتا ہے کہ ان دونوں کی آشنائی بہت پرانی نہ ہو اور وہ دورانِ پرواز ہی ایک دوسرے کے دوست بنے ہوں۔ کسی نئے شہر کی طرف پہلا سفر کرنے والے بین الاقوامی مسافروں میں یہ فطری رجحان ہوتا ہے کہ وہ اپنے ہم منزل مسافروں سے دوستی کرنے کی کوشش کرتے ہیں تاکہ نئی جگہ پر اجنبیت کا احساس کم سے کم کیا جا سکے۔ پھر وہ دونوں ہی سفید فام تھے۔ ہو سکتا ہے کہ ان کے کچھ شوق بھی مشترک رہے ہوں....."

میں نے اس کی بات میں دخل انداز ہوتے ہوئے کہا۔ "اس وقت اس نکتے پر بحث کرنی بے سود ہے۔ اول خان واپسی پر یہ بات ضرور معلوم کر لے گا۔ ہم صرف قیاس آرائیاں کرتے رہے تو یہ سلسلہ لامتناہی بھی ثابت ہو سکتا ہے۔ ہزاروں امکانات میں سے ہم کس کس نکتے پر غور کر سکتے ہیں؟"

"میں تمہیں یہی بتانا چاہ رہا تھا کہ میری ناقص رائے میں اوّل

خان کی بخیروعافیت واپسی مشتبہ ہوگئی ہے۔ یہ اتفاق ہے کہ ایک حسّاس سرکاری محکمے کا مہمان تمہارے مطلوبہ مجرم کے ساتھ ہی ایک ہی پرواز پر یکجا ہوگیا۔ تم اپنے شکار کے لیے جال پھیلائے کھڑے تھے لیکن آئی بی والوں نے تمہیں اپنے مہمان کا دشمن تصور کیا ہوگا۔ اتنی صبح' سڑکوں پر ٹریفک نہ ہونے کے برابر ہے۔ اول خان ان کی عقابی نظروں سے بچ ہی نہیں سکے گا اور اپنی شناخت کی نوبت آنے سے پہلے ہی کسی بھاری خسارے سے دوچار ہوجائے گا۔ میری چھٹی حِس شروع ہی سے اس بارے میں مضطرب ہے۔"

"تیر کمان سے نکل چکا ہے۔ اب ہم اول خان تک نہیں پہنچ سکتے۔" میں نے خشک لہجے میں کہا۔ "میں اس بے نتیجہ بحث میں الجھنے کے بجائے یہ جاننے میں دلچسپی رکھتا ہوں کہ تم ان دونوں کو ایک دوسرے کا قریبی ساتھی تسلیم کرنے پر کیوں آمادہ نہیں ہو؟"

"اپنے اپنے مشاہدے کی بات ہے۔ تم اس معاملے کے ایک فریق بنے ہوئے تھے اس لیے تمہاری توجہ اپنی طرف آنے والے پر مرکوز تھی جب کہ میں بغور ان دونوں کا جائزہ لے رہا تھا۔ متوسط قامت والا تمہاری طرف بڑھا تو اس کے گرانڈیل ساتھی کے چہرے پر لاتعلقی چھائی ہوئی تھی۔ وہ صرف اور صرف اپنے میزبانوں کی طرف متوجہ تھا۔ انہیں تمہارے پلے کارڈ سے کوئی خطرہ ہوتا تو دونوں کو ہی چونکنا چاہیے تھا۔"

میں ہنس پڑا۔ "بنیادی طور پر تمہارا یہ مفروضہ ہی غلط ہے کہ انہوں نے مجھ سے کوئی خطرہ محسوس کیا ہوگا۔ کرنل جیسی جونز کو البرٹوو یلیسا کی دشواریوں کا علم ضرور ہے لیکن اسے یہ معلوم نہیں ہے کہ اسے اسپیشل ٹاسک فورس سے فرار ہونے کے بعد جہنم واصل کیا جاچکا ہے۔ وہ باخبر ہوتا تو ہرگز بھی اولیانو کے فیکس نمبر پر اپنی آمد کا پیغام نہ بھیجتا۔ انہوں نے مجھے البرٹوو یلیسا کا بھیجا ہوا آدمی سمجھا ہوگا۔ وہ سرکاری حیثیت میں آئے تھے اس لیے انہیں اندیشہ پیدا ہوا کہ میرے پلے کارڈ کی وجہ سے ان کا بھانڈا پھوٹ سکتا ہے اسی لیے مجھے متوسط قامت والے کی پھٹکار سُننی پڑی۔ واضح طور پر اس کا ایک ہی مقصد تھا کہ میں واپس جاکر البرٹوو یلیسا کو ان کی آمد اور سرکاری حیثیت سے آگاہ کردوں۔ بصورتِ دیگر وہ مجھے نظرانداز کرکے گزر جاتے تو آخر میں' میں وہاں اکیلا کھڑا رہ جاتا۔"

"میں نہیں مان سکتا کہ کرنل جیسی جونز یا اس کے آدمی آئی بی والوں کے مہمان ہوسکتے ہیں۔" وہ بڑبڑایا۔ "یہ کوئی کتابی نظریہ تو ہوسکتا ہے لیکن اس کا حقیقت سے دور کا بھی واسطہ نہیں ہوسکتا۔"

"تمہارے ماننے یا نہ ماننے سے حقائق بدل نہیں سکتے۔ تم خود دیکھ چکے ہو کہ البرٹوو یلیسا 'ظفر کا روپ دھار کر ایک مدت تک ایس ٹی ایف میں ایک اہم عہدے پر قابض رہا ہے اور کسی کو اس پر شبہ تک نہیں ہوسکا۔"

"البرٹوو یلیسا کا معاملہ تازہ ہے اس لیے وہ لوگ اتنی جلدی ایسی ہی دوسری حرکت نہیں کرسکتے۔ انہیں معلوم ہوچکا ہے کہ فنگر پرنٹس تک بدل لینے کے بعد البرٹوو یلیسا پاکستانیوں کی نظروں میں آنے سے نہیں بچ سکا ہے۔ یہ نفسیاتی خوف انہیں پرانی ترکیب کے فوری اعادے سے باز رکھے گا۔" اس نے پُرجوش انداز میں کہا۔

"میں تمہاری بات مانتا ہوں۔" میں نے اس کے جوش و خروش سے لطف اندوز ہوتے ہوئے کہا۔ "تم نے جو کچھ کہا' وہ انسانی فطرت کے اصولوں کے عین مطابق ہے لیکن یہ اسی وقت ممکن تھا جب ان لوگوں نے آئی بی کے اصل مہمانوں کو راستے میں سے غائب کرکے ان کی جگہ لینے کا منصوبہ بنایا ہوتا۔ اب ذرا یہ سوچو کہ اگر جیک رونالڈو جدید اور حسّاس ترین بارودی ہتھیاروں کو ناکارہ بنانے میں یدِطولیٰ رکھنے کے ساتھ ساتھ کرنل جیسی جونز کا نمک خوار بھی ہو تو کیا ہوگا؟ ایک پنتھ' دوکاج والے اس کام میں انہیں کیا ہچکچاہٹ ہوسکتی تھی؟"

"لیکن تم نے تو بتایا تھا کہ کہوٹہ سے پکڑے جانے والے بندروں کے معاملے میں آئی بی نے برطانوی حکومت سے ماہرین طلب کیے تھے جو آئرلینڈ کی بگڑتی ہوئی صورتِ حال کی وجہ سے نہیں آسکے؟"

"اس سے کیا فرق پڑتا ہے؟ کرنل جیسی جونز عالمی شہرت رکھتا ہے۔ جنوبی امریکا کے علاوہ یورپ اور برطانیہ میں بھی اس کی موجودگی کے شواہد ملتے رہے ہیں۔ لندن سے فرینکفرٹ کے لیے دن بھر میں پچاسوں پروازیں روانہ ہوتی ہیں۔ لفت ہنسا سے مشرق یا مغرب کی طرف سفر کرنے والے بیشتر مسافر فرینکفرٹ میں ہی طیارہ بدلتے ہیں۔ پھر یہ ضروری تو نہیں کہ آئی بی والے صرف برطانوی ماہرین کی آمد پر انحصار کیے بیٹھے ہوں۔ ان کے مبہم جواب کے بعد وہ دوسرے ممالک سے بھی مدد کی درخواست کرسکتے تھے۔ تم یہ کیوں بھول رہے ہو کہ کہوٹہ کا معاملہ ہر پاکستانی کے لیے موت و زیست سے زیادہ اہمیت رکھتا ہے۔ آئی بی والے بندروں کا تجزیہ کرکے' جلد از جلد کسی نتیجے پر پہنچنے کے لیے بے چین ہوں گے۔ کرنل جیسی جونز نے یہاں ہاتھ ڈالا ہے تو وہ ان حالات سے بھی باخبر ہوگا۔"

"یہ میں نے نہیں سوچا تھا۔" سلطان شاہ کی آواز پر مردنی طاری ہوگئی۔

میں دورانِ سفر اس سے بلاوجہ ہی نہیں الجھ رہا تھا بلکہ اس سے بحث کے نتیجے میں میرے اپنے بکھرے بکھرے خیالات ایک واضح صورت اختیار کرتے جارہے تھے اور وہ واضح صورت وہی تھی جو میں نے سلطان شاہ کے ذہن نشین کرانے کی کوشش کی تھی۔ جب تک میرے ذہن میں کرنل جیسی جونز کے نئے منصوبے کے خدوخال واضح نہ ہوتے' میں اول خان کی کوئی مثبت رہنمائی نہیں کرسکتا تھا۔

ایسا نہیں تھا کہ میں کرنل جیسی جونز اور اس کے حواریوں کے خلاف تنہا کوئی کارروائی کرنے سے خائف تھا بلکہ مجبوری یہ تھی کہ انفرادی طور پر میں انہیں نقصانات تو پہنچا سکتا تھا لیکن اپنی کسی تنظیم یا اسپیشل ٹاسک فورس کے تعاون کے بغیر ان کی مکمل بیخ کنی نہیں کرسکتا تھا۔ ملاّ سرکار والے واقعات کے رونما ہونے کے بعد ہی میرا ایس ٹی ایف سے واسطہ پڑا تھا۔ اگر ایس ٹی ایف میرے ساتھ نہ ہوتی تو ملاّ سرکار متعدد چوٹیں کھانے کے بعد بھی میدان میں جما ہی رہتا۔ پھر الحدید سے آنے والے غیرقانونی ہتھیاروں اور گولہ بارود کی کھیپ کا معاملہ بھی ریاستی مدد کے بغیر حل نہیں ہوسکتا تھا۔ اس وقت بھی اول خان نے میرے اور ریاستی ذرائع کے درمیان ایک موثر ترین رابطے کا کردار سرانجام دیا تھا۔ بلیوکراس ڈیل کے تحت آنے والے ایٹمی سازوسامان کی بروقت 'زیرِزمین گوداموں میں ذخیرہ اندوزی بھی اسی کی کاوشوں کی رہینِ منت تھی۔ ایرانی سرزمین پر اس اہم کارواں کو تباہی سے بچانے کے لیے ویرا اپنا یادگار کردار ادا کرچکی تھی لیکن وہ قافلہ پاکستان کے سرحدی پہاڑوں اور درّوں کو عبور کرنے کے بعد اپنا سفر جاری رکھتا تو خلا میں موجود' امریکی جاسوس سیاروں کی حسّاس ترین آنکھیں اس قافلے پر مرکوز ہوجاتیں اور ٹی کا سربراہ جمی لائیڈ اپنے تباہ کن منصوبے کی ناکامی کے بعد کسی گمنام فضائیہ کے منظّم ترین اور طاقتور فضائی حملے کے ذریعے بلیوکراس ڈیل کے ہر اس پرزے کو تباہ کرسکتا تھا جسے بچانے کے لیے میں نے ویرا کا تعاون حاصل کیا تھا۔ اسی طرح میں البرٹوو یلیسا پر اپنے تمام تر شبہات کے باوجود' اس وقت تک اس کی جگہ سے ہلانے میں کامیاب نہیں ہوسکتا تھا جب تک اسی فورس میں سے مجھے اول خان کا تعاون حاصل نہ ہوتا۔

میرے اور اول خان کے اس قریبی تعاون پر ویرا کئی بار' دبے لفظوں میں طنز کرچکی تھی لیکن وہ میرے طریقۂ کار سے کھل کر کبھی بھی اختلاف نہیں کرسکی۔ اسے اچھی طرح اندازہ تھا کہ بے پناہ وسائل اور افرادی قوت سے لیس دشمنوں کو جب جنگی ہتھیاروں سے لے کر جدید ترین خلائی سیاروں کی مدد بھی حاصل ہو تو میں کیا' مجھ جیسے دس بیس آدمی مل کر بھی اسے زیر نہیں کرسکتے۔ دشمن ہم سب کو' ہماری انفرادی کامیابیوں سمیت روند کر' بہت آسانی کے ساتھ اپنا مقصد حاصل کرسکتا تھا۔ اسے تہس نہس کرنے کے لیے ایک ایسی ہی غیرریاستی جنگی مشین درکار تھی جس میں اول خان ایک اہم پرزے کی حیثیت رکھتا تھا۔

اور اب ایک مرتبہ پھر ہم سازشوں کے اکھاڑے میں موجود تھے۔ امریکی جاسوس سیاروں کو ایران سے آنے والے ایٹمی آلات کی کھیپ کی تلاش تھی' پڑوسی حریف ہمارے آبی ذخائر کو ہولناک مگر بظاہر پُراسرار بارودی دھماکوں سے اڑا کر ہمیں عبرتناک تباہی سے دوچار کرنے کے منصوبے بنا رہا تھا۔ ڈیوڈ اسٹارز نامی یہودی نسل پرست تنظیم کے ایما پر کرنل جیسی جونز کہوٹہ کی ایٹمی تنصیبات میں تربیت یافتہ بندروں سے جاسوسی کرا رہا تھا۔ ادھر اولیانو ایک فرض شناس افسر کے روپ میں بین الاقوامی اداروں کے نام پر راول ڈیم کے وسیع آبی ذخیرے سے قرب وجوار کی دیہی آبادیوں کو پینے کا پانی پہنچانے کے قابلِ تعریف منصوبے پر کام کررہا تھا لیکن اس کے مشتبہ روابط سامنے آجانے کے بعد کون کہہ سکتا تھا کہ وہ راول جھیل سے پانی نچوڑ کر اسلام آباد میں پانی کی قلت پیدا نہیں کرنا چاہتا تھا؟ ہر طرف شکوک و شبہات کے ڈراؤنے سائے اپنا اپنا طاغوتی رقص دکھا رہے تھے اور ان سب پر بیک وقت نظر رکھنے کے لیے اسپیشل ٹاسک فورس کا ہمہ جہت تعاون ناگزیر تھا۔

پے درپے ناکامیوں کے باوجود ہمارے دشمن ہر محاذ پر بے پناہ سرمایہ لگائے جارہے تھے اور حیرتناک بات یہ تھی کہ ایسی ہر سرمایہ کاری کے پیچھے موت کے سوداگروں کی فسوں کاری نظر آرہی تھی۔ جمی لائیڈ تو ان چالاک لوگوں میں سے تھا جس نے ہیروئن کے کھلے بازار میں آتے ہی بھانپ لیا تھا کہ اس سفید سفوف کے لین دین میں قارون کے ہزاروں مدفون خزانے پوشیدہ ہیں۔ اس کی ہر سازش اسی پیسے سے پھل پھول رہی تھی۔ ملاّ سرکار' میش پال' سردار رجب علی' غلام رسول' رجنی اور شریمان سنگھ۔ سب کی پرورش اسی کالے دھن سے ہو رہی تھی اور وہ سب جہنم واصل ہوچکے تھے جب کہ البرٹوو یلیسا نے اسرائیل کی ایٹمی تنصیبات کے ساتھ ہیروئن سازی کے ایک خفیہ کارخانے کے وجود کا انکشاف کیا تھا۔ اس فیکٹری میں تیار ہونے والی ہیروئن سرکاری سرپرستی میں اسمگل ہو رہی تھی اور اسرائیلی حکومت اس دولت سے اپنے خزانوں کے مُنہ بھر رہی تھی تاکہ اس سرمائے کی مدد سے قوت حاصل کرکے اپنے دشمنوں کے سر کچل سکے۔ اس نسل پرست اور متعصب یہودی مملکت کے ہمدردوں نے کرنل جیسی جونز کی خدمات حاصل کی ہوئی تھیں اور جیسی جونز کو لمبیا میں ہیروئن اور کوکین کی غیرقانونی تجارت کے بے تاج بادشاہوں میں سے ایک شمار کیا جاتا تھا۔

میرے لیے طمانیت کی بات یہ تھی کہ میں نے اپنے علم میں آنے والے کسی بھی چھوٹے بڑے خطرے سے چشم پوشی اختیار کرنے کی کوشش نہیں کی تھی اور اپنے حریفوں کو ناک چنے چبوادیے تھے۔ ان مہمات میں' میں نے ویرا کو بھی پوری طرح اپنے مقاصد کے لیے استعمال کیا تھا لیکن خاص بات یہ تھی کہ ملک دشمن سازشوں کی بیخ کنی کرتے ہوئے بھی ہم لوگ پسِ پردہ ہی رہے تھے کیونکہ منظرِعام پر آنے کی صورت میں ہماری جانوں کو سنگین خطرات لاحق ہوسکتے تھے۔

اس وقت تک صرف دو معاملات التوا میں تھے۔ پہلے معاملے

کا تعلق ملک کے ان بڑے آبی ذخائر کی سلامتی سے تھا جو کشمیر کے مقبوضہ پہاڑوں سے آنے والے سیلابی پانی کو محفوظ کرتے تھے۔ ہمارے دشمن نے منصوبہ بنایا تھا کہ اگلے مون سون میں برف پگھلنے کے ساتھ پیدا ہونے والے سیلابی ریلوں میں ریموٹ کنٹرولڈ بارودی ہتھیاروں کے واٹر پروف صندوق ہماری طرف بہا دیے جائیں تاکہ وہ ہماری بڑی بڑی جھیلوں کی تہ میں پہنچ جائیں۔ مناسب موقع پر ان ہتھیاروں کو انگلی کی ایک خفیف سی جنبش سے استعمال کیا جاسکتا تھا۔ وہ ہولناک دھماکے ذخیرہ گاہوں کو گھیرنے والے جس پہاڑ یا اسپل وے میں دراڑیں ڈالتے‘ اسی سمت سے لاکھوں کیوسک پانی کے غضبناک ریلے بے خبر انسانی آبادیوں اور کھڑی فصلوں پر چڑھ دوڑتے اور اپنی راہ میں آنے والی ہر شے کو خس و خاشاک کی طرح بہا کر سمندر میں لے جاتے۔ وہ ایک بھیانک اور روح فرسا منصوبہ تھا لیکن اس کے بارے میں متعلقہ لوگوں کو بروقت آگاہ کردیا گیا تھا جس کے نتیجے میں‘ دشمن کے مقبوضہ علاقوں سے آنے والے طوفانی ندی نالوں اور دریاؤں پر دیوہیکل جال باندھے جارہے تھے جو مون سون کے ہولناک ریلوں میں بہہ کر آنے والی منوں وزنی اشیا کو بھی روک لینے کی طاقت رکھتے تھے۔

دوسرے معاملے کا تعلق بلیوکراس ڈیل کے تحت ایران سے آئے ہوئے اس ایٹمی ساز و سامان سے تھا جو سرحدی علاقے کے زیرِ زمین گوداموں میں ایرانی ٹریلروں سمیت چھپادیا گیا تھا۔ اس سامان کی ترسیل کے ذمے داروں نے خلا سے ہونے والی کسی ممکنہ جاسوسی اور پھر تخریب کاری کے سدِّباب کے لیے فوج کی مدد سے وہ سامان غیر سرکاری مقامی ٹرکوں کے ذریعے چھوٹی چھوٹی کھیپوں میں منزل مقصود تک لے جانے کا قصد کیا ہوا تھا اور اس پروگرام پر شاید عمل بھی شروع ہوچکا تھا۔

گو وہ دونوں معاملات اپنے منطقی انجام تک نہیں پہنچے تھے لیکن گیند ذمے دار حکام کے کورٹ میں تھی اور اس بارے میں‘ مَیں چاہتے ہوئے بھی کوئی موثر کردار ادا نہیں کرسکتا تھا۔ اسی اعتبار سے جیک رونالڈو اور کرنل جیسی جونز کی پہیلیاں میری پوری توجہ کی متقاضی تھیں۔ اول خان بہت محنتی اور فرض شناس اہل کار تھا لیکن عمر بھر کی ملازمت نے اسے کنوئیں کا مینڈک بنا کر رکھ دیا تھا۔ یہ اور بات تھی کہ دوسرے بڑے بڑے لوگوں کے مقابلے میں اول خان کے کنوئیں کا قطر یا محیط بہت بڑا تھا۔ بین الاقوامی سازشوں کو سونگھنا اور پھر اپنے نتائج اخذ کرکے کسی بھی فرد یا طاقت سے ٹکرا جانے کے بے دھڑک فیصلوں میں‘ مَیں نے اسے خاصا سُست اور روایت پرست پایا تھا۔ ہاں‘ تمام کڑیاں یکجا کرکے‘ اسے پورے جوڑ توڑ سے آگاہ کردیا جاتا تو وہ پوری قوت اور مردانگی کے ساتھ پہاڑوں سے بھی ٹکرا جانے کا حوصلہ رکھتا تھا‘ ملاّ سرکار اور سردار رجب علی سے معرکہ آرائیوں کے دُور میں‘ میں نے اباسین پر اس کے حوصلے کی اتھاہ گہرائیوں کا بہت اچھی طرح اندازہ کرلیا تھا۔

سلطان شاہ کے پاس مواد ختم ہوچکا تھا اس لیے بحث کا سلسلہ وہیں موقوف ہوکر رہ گیا تھا اور ہم دونوں خاموشی کے ساتھ باقی راستہ طے کرکے شرف آباد اپنے فلیٹ پر پہنچ گئے۔

وہاں ویرا واقعی خود کار برقی کیتلی آن کیے‘ ہم دونوں کی واپسی کے انتظار میں غزالہ کے ساتھ رمی کھیل رہی تھی۔ ہمیں دیکھتے ہی ان دونوں نے سارے کارڈ ملادیے اور ویرا نے کیتلی سے کھولتا ہوا پانی کافی مگوں میں انڈیل کر‘ کریم کافی کے چار مگ تیار کرنے شروع کردیے۔ اس نے سارے لوازمات باورچی خانے سے نکال کر ڈرائنگ روم ہی کی ایک سائیڈ ٹیبل پر جمع کیے ہوئے تھے۔

”میں نے تمہارے کہے بغیر اپنا کام شروع کردیا ہے۔ اب تم بھی خود بخود شروع ہوجاؤ!“ اس نے اپنے کام سے دھیان ہٹائے بغیر حکم صادر کیا۔ ”میں نے اندھے کی لاٹھی نشانے پر لگنے کا محاورہ سنا ہوا ہے لیکن اس کی عملی تفسیر میں تمہاری زبان سے سننی چاہتی ہوں۔“

میں نے آنکھوں ہی آنکھوں میں سلطان شاہ کو کہانی شروع کرنے کا اشارہ کیا اور خود کرسی میں پھیل کر سگریٹ سلگانے میں مصروف ہوگیا۔

سلطان شاہ نے جوں ہی اپنی کہانی کی ابتدا کی‘ ویرا چڑ کر میری طرف مڑگئی۔ ”اب نخروں کا یہ عالم ہے کہ تمہیں اپنی زبان ہلانے میں بھی دشواری ہو رہی ہے۔ واقعات بتاتے ہوئے تم کو کیا ہوجائے گا؟“

”مجھ سے تم صرف میری کہانی سن سکوگی۔“ میں نے ٹانگ پر ٹانگ رکھ کر بے پروائی سے کہا۔ ”سیدھی‘ سپاٹ اور یک طرفہ کہانی‘ جس میں کسی بھی قسم کے صوتی تاثرات نہیں ہوں گے۔“

”صوتی تاثرات؟“ ویرا غرائی۔ ”تو کیا سلطان شاہ اپنے حلق سے کتے بلیوں کی آوازیں نکالے گا؟“

”یہ ایک جدید محاورہ ہے۔“ میں نے ہنستے ہوئے کہا۔ ”سلطان شاہ تمہیں اصل واقعات کے ساتھ اپنے نظریات سے بھی آگاہ کرتا جائے گا۔ اس کے بعض اعتراضات خاصے وزنی ہیں۔ تمہارا ان سے واقف ہونا بہت ضروری ہے۔“

ویرا برا سامنہ بناتے ہوئے دوبارہ اپنے کام میں مصروف ہوگئی اور سلطان شاہ نے تکلفاً اپنا گلا صاف کرنے کے بعد ابتدا سے اپنی کہانی شروع کردی۔

میرے اور سلطان شاہ کے سامنے کافی کی پیالیاں رکھنے کے بعد ویرا بھی غزالہ کے ساتھ آبیٹھی۔ اس دوران میں سلطان شاہ احمقانہ انداز میں ہماری مہم جوئی کی داستان سناتا رہا۔ میری یاد دہانی کے بعد وہ پورے اعتماد کے ساتھ اپنی رائے بھی ان واقعات میں شامل کرتا رہا تھا اور وہ دونوں خاموشی اور انہماک کے ساتھ اس کی طرف متوجہ تھیں۔

ہمیں سلطان شاہ کی رائے سے متفق ہوں۔“ اس کے خاموش ہونے پر ویرا بولی۔ ”لیکن اس وقت کسی بھی رائے کی زیادہ اہمیت نہیں ہے۔ اول خان کی واپسی پر کئی مسائل خود بخود حل ہوجائیں گے۔“

حالات و واقعات جو کچھ بھی رہے ہوں‘ کرنل جیسی جونز یا اس کے آدمیوں کی بے خوفی قابلِ داد تھی۔ پاکستان میں حالات مخدوش ہونے کے باوجود وہ کھلے بندوں کراچی کے ہوائی اڈے سے ملک میں داخل ہوئے تھے۔ انہوں نے اپنی دانست میں سرکاری پشت پناہی حاصل کرلی تھی لیکن پھر بھی ایک اجنبی ملک میں یہ خطرہ ہروقت برقرار رہتا ہے کہ کسی وجہ سے اصل شناخت ظاہر ہوگئی تو مٹی پلید ہوسکتی ہے۔

اس پورے قصے میں کلیدی اہمیت اس پلے کارڈ کی تھی جس پر میں نے جیسی جونز کے نام کا مخفف لکھا تھا۔ ویرا یہ ماننے کو تیار ہی نہیں تھی کہ وہ ترکیب اسی وقت میرے ذہن میں آئی تھی۔ اس کا اصرار تھا کہ میں نے وہ حکمتِ عملی پہلے سے سوچ سمجھ کر تیار کی ہوئی تھی لیکن ان لوگوں کو اپنی حاضر دماغی سے مرعوب کرنے کے لیے میں نے اسے ایک فوری کرتب کا روپ دے دیا تھا۔

وہ بحث برائے بحث تھی۔ اصل بات یہ تھی کہ ہمیں اول خان کی آمد کا انتظار تھا اس لیے میں بھی ویرا کے ساتھ الجھتا رہا۔ غزالہ کھل کر ویرا کا ساتھ دے رہی تھی اور سلطان شاہ خاموش تھا۔

پانچ بجے کے بعد ڈور بیل بجی تو سلطان شاہ نے اچھل کر اپنی جگہ چھوڑ دی۔

دروازہ کھولے جانے کے بعد اول خان مختصر سی لابی سے گزر کر‘ ڈرائنگ روم میں آیا تو اس کا چہرہ اترا ہوا تھا۔ صاف نظر آرہا تھا کہ وہ کہیں سے کوئی زک اٹھا کر واپس آرہا تھا۔

”یہاں کافی کی بو محسوس ہو رہی ہے۔“ اس نے گہرے گہرے سانس لیتے ہوئے کہا۔

غزالہ نے خاموشی سے برقی کیتلی کا بٹن آن کردیا اور پیالیوں کی طرف متوجہ ہوگئی۔

”کچھ اداس نظر آرہے ہو؟“ میں نے گہری نظروں سے اوّل خان کا جائزہ لیتے ہوئے کہا۔

”اداس اور نامُراد!“ اس نے پھیکی سی مسکراہٹ کے ساتھ کہا۔ ”آج میں موت کے مُنہ میں جانے سے بال بال بچا ہوں۔ بس ستارے ہی یاور تھے جو اس وقت زندہ و سلامت یہاں نظر آرہا ہوں۔“

”بالکل الفریڈ ہچکاک والا انداز ہے۔“ ویرا غور سے اس کی طرف دیکھتے ہوئے پُرتشویش انداز میں بولی۔ ”اس کی کہانیوں میں آخری فقرے پر سسپنس ختم ہوتا ہے بعض اوقات تو اس کی بھی نوبت نہیں آتی۔“

میں ویرا کو گھور کر رہ گیا لیکن وہ دانستہ طور پر میری طرف متوجہ نہیں تھی۔

بات دراصل یہ تھی کہ غائبانہ طور پر ایک دوسرے سے بہت زیادہ واقف ہونے کے باوجود‘ وہ دونوں ایک دوسرے سے بے تکلف نہیں تھے کیونکہ ان کی بالمشافہ ملاقاتوں کی تعداد بہت محدود تھی۔ مجھے خوف تھا کہ کہیں اول خان‘ ویرا کے اس طنزیہ مذاق کا برا نہ مان جائے۔

میرے اندیشے کے برعکس‘ اول خان کے ہونٹوں پر ایک جان دار مسکراہٹ عود کر آئی اور وہ گہری نظروں سے ویرا کی طرف دیکھتے ہوئے بولا۔ ”ڈارون کے نظریۂ ارتقا کے بارے میں تمہاری کیا رائے ہے؟“

اول خان کے اس غیر متعلقہ اور سنجیدہ سوال پر ویرا بوکھلا گئی اور تقریباً ہکلاتے ہوئے بولی۔ ”مم... میرا خیال ہے کہ اس کی تھیوری جان دار ہے لیکن تمہیں اچانک ڈارون کیوں یاد آگیا؟“

”الفریڈ ہچکاک مرتے مرگیا لیکن اس نے آخر تک اپنی دُم ظاہر نہیں ہونے دی۔ تمہاری طرح وہ بھی ڈارون کا پرستار تھا۔ اس نے اپنی دم ایسے کسی خانے میں چھپائی تھی کہ وہ آخر تک ظاہر نہ ہوسکی اور یہ اس کی تجسس انگیز طبیعت کی سب سے روشن مثال ہے۔ ویسے تم بھی دم کے بغیر خاصی مکمل نظر آتی ہو۔“

اول خان کے اس جوابی حملے پر میں بھونچکا رہ گیا۔ میرے فرشتوں کو بھی گمان نہیں تھا کہ اول خان اتنی بلاغت اور روانی کے ساتھ مذاق کرنے کی صلاحیت رکھتا ہے۔ یا پھر یہ ویرا کی پُرکشش شخصیت کا کمال تھا کہ اس سے مخاطب ہونے والا ہر شخص اس کے ساتھ سلسلۂ کلام کو طول دینے کا متمنی رہتا تھا۔

ویرا خفت آمیز انداز میں زور سے ہنستے ہوئے بولی۔ ”ڈارون کے نظریۂ ارتقا کے مطابق انسان اپنے جدِ امجد کی دُم سے چھٹکارا پانے کے بعد ہی انسان بنا ہے۔ میرا خیال ہے کہ میرے آباواجداد کی دُم جھڑنے کا واقعہ ہزاروں برس پہلے رونما ہوا تھا۔ تمہیں اس وقت اس کا خیال کیوں آرہا ہے۔“

”بس ایسے ہی خیال آگیا تھا۔“ اول خان نے اپنے پُراعتماد رویّے سے مجھے حیران کردیا۔ ”تم میں بس دُم کی کسر رہ گئی ہے ورنہ تم ہر اعتبار سے حسینۂ عالم منتخب کیے جانے کے قابل ہو۔ اگر تم الفریڈ ہچکاک کے مزاج کے برعکس اپنی دم ظاہر کردو تو اس وقت بھی تمہارے حسن کو چار چاند لگ سکتے ہیں۔“

”اس وقت تمہارے سر پر اچانک ہی دم کیوں سوار ہوگئی ہے؟“ ویرا نے تنک کر پوچھا۔

”اس کی کمی محسوس ہو رہی ہے۔“ اول خان نے بھرپور سنجیدگی کے ساتھ کہا۔ ”دُم ہوتی تو اس کی پوزیشن سے میں تمہارے موڈ کا بہ آسانی اندازہ لگا سکتا تھا لیکن اس وقت میں تمہارے موڈ پر کوئی تبصرہ کرنے کی پوزیشن میں نہیں ہوں۔ دل ہی

دل میں تم اپنے حسن کی تعریف پر محظوظ ہو رہی ہو لیکن گفتگو میں چڑچڑے پن کا مظاہرہ کررہی ہو۔ تمہاری دُم ہوتی تو وہ اس وقت بے خودی کے عالم میں ہولے ہولے لہرانا شروع کردیتی۔"

ویرا کا چہرہ سرخ ہوگیا اور وہ غصیلے لہجے میں بولی۔ "یہ کیا واہیات موضوع لے بیٹھے ہو؟ تمہیں....."

"بس!" میں نے ہاتھ اٹھا کر سختی کے ساتھ ویرا کی بات کاٹ دی۔ "تم الفریڈ ہچکاک والا الزام واپس لے لو تو اول خان بھی اسی لمحے ڈارون کی دُم کاٹ دے گا۔ کسی پر وار کرنا بہت آسان ہوتا ہے لیکن جوابی حملے کو سہنے کے لیے بڑے ظرف کی ضرورت ہوتی ہے۔ ہمیں ایک دوسرے سے الجھنے سے گریز کرنا چاہیے۔"

"الفریڈ ہچکاک تو کب کا جہنم واصل ہوچکا۔" ویرا منہ پھلا کر بولی۔ "ڈارون کی دُم کہاں سے بیچ میں آگئی؟"

"ڈارون' الفریڈ ہچکاک سے بہت پہلے جہنم واصل ہوچکا تھا۔" اول خان نے گہری سنجیدگی کے ساتھ کہا۔ "جدید اردو میں سسپنس کی انتہا یہ ہوتی ہے کہ ہاتھی نکل جائے مگر دم پھنس جائے۔ اس اعتبار سے ڈارون اور الفریڈ ہچکاک میں ایک قریبی رشتہ پیدا ہوجاتا ہے جو میرے اور تمہارے اختیار سے باہر ہے۔"

"تم بلاوجہ بحث کو طول دے رہی ہو۔" میں نے تلخ لہجے میں ویرا کو ٹوکا۔ "تمہارا یہی رویہ رہا تو ہم اہم معاملات کو بھول کر بندروں اور ان کی دُموں میں ہی الجھے رہیں گے۔ کوئی نتیجہ خیزبات نہیں ہوسکے گی۔"

ویرا بے ساختہ انداز میں کھلکھلا کر ہنس پڑی اور اس نے میری کہی ہوئی بات کو دہرایا۔ "دُموں میں الجھے رہیں گے! واہ' کیا اچھوتا خیال پیش کیا ہے تم نے چلو' میں ہی اپنی دُم نیچی کرکے اول خان سے معافی مانگ لیتی ہوں۔"

اول خان کے ہونٹوں پر مسکراہٹ پھیل گئی۔ "اتنی باضابطہ معافی کی ضرورت بھی نہیں تھی۔ بعض اوقات تو صرف خاموشی ہی بھرپور معذرت سے زیادہ بھاری ہوجاتی ہے ویسے اطلاعاً عرض ہے کہ میں سنجیدہ نہیں تھا۔"

"تم اپنی کہانی سنا رہے تھے۔" سلطان شاہ نے اسے یاد دلایا۔

"میں پہلے ہی ڈینی سے کہہ چکا تھا کہ آج تم نے ان لوگوں کے پیچھے جاکر سنگین غلطی کی تھی۔ وہ تمہیں گھیر کر مار بھی سکتے تھے۔"

"بے خبری میں کچھ بھی ہوسکتا تھا لیکن ایک بار میری شناخت ہوجانے کے بعد وہ کچھ بھی نہیں کرسکتے تھے۔ آج کل کے حالات میں مجھے ان سے کسی تعاون کی امید نہیں رہی ہے اس لیے میں خفیہ طور پر اپنا کام پورا کرنا چاہ رہا تھا لیکن وہ بھی بہت مستعد اور چوکنے تھے۔ میں ان کی نظروں سے محفوظ رہنے میں کامیاب نہیں ہوسکا۔" اول خان بتانے لگا۔ "راشد منہاس روڈ پر انہوں نے میری گاڑی کو دیکھ لیا پھر وین کے عقبی حصے سے کسی ماہر نشانے باز نے میری گاڑی کے اگلے حصے پر سب مشین گن سے ایک برسٹ مارا اور میری گاڑی تباہ ہوگئی۔ وین ایک لمحے کے لیے رکی اور دو آدمیوں کو اتار کر دوبارہ آگے بڑھتی چلی گئی۔ وہ دونوں میری کار کی طرف دوڑے تھے لیکن میں نے ان کے قریب آنے سے پہلے ہی اپنی گاڑی چھوڑ کر داہنی طرف پھیلی ہوئی زیرِ تعمیر عمارات کی طرف دوڑ لگادی....."

"یعنی تمہاری تباہ شدہ گاڑی راشد منہاس روڈ پر ہی کھڑی ہوئی ہے؟" سلطان شاہ نے اس کی بات کاٹ کر حیرت سے سوال کیا۔ "پھر تم یہاں تک کیسے آئے ہو؟"

"میری گاڑی پر فائرنگ کرنے والا اتنا غضب کا نشانے باز تھا کہ اس نے ایک ہی برسٹ میں اگلے دونوں ٹائروں کے ساتھ ریڈی ایٹر اور ہیڈ لیمپس بھی تباہ کردیے۔ اس کی ایس ایم جی کی نال کا رخ ذرا سا بھی اوپر ہوجاتا تو ساری گولیاں ونڈ شیلڈ کو چکنا چور کرتی ہوئی میرے سر اور سینے میں پیوست ہوجاتیں۔"

"اس کا مطلب یہ ہوا کہ انہوں نے تمہیں ہلاک یا زخمی کرنے کے بجائے صرف روکنے کی کوشش کی اور اس میں کامیاب ہوگئے۔" میں نے پُرتشویش انداز میں کہا۔ "شاید وہ تمہیں زندہ پکڑنے کے چکر میں رہے ہوں گے۔"

"وین سے اتارے جانے والے دونوں آدمی برق رفتاری کے ساتھ میری تباہ شدہ کار کی طرف آئے تھے۔ اگر میں اس وقت اپنے اوسان پر قابو نہ رکھتا تو وہ مجھے گھیر لیتے۔ میں نے فائر اور ٹائروں کے دھماکے سنتے ہی گاڑی چھوڑ دی تھی کیونکہ مجھے کار میں آگ لگ جانے کا خوف لاحق ہوگیا تھا۔ ان دونوں کو اپنی طرف آتے دیکھ کر' میں نے داہنی طرف کے اس تاریک میدان کی طرف دوڑ لگادی جہاں فلیٹوں کا ایک نیا جنگل ابھر رہا ہے۔ نامکمل ڈھانچوں اور تعمیراتی ملبے سے گزرتا ہوا' میں ایک لمبا چکر کاٹ کر دوبارہ سڑک پر آیا اور اپنی کار کا رخ کیے بغیر ٹیکسی پکڑ کر اِدھر آگیا۔"

"کار کے ذریعے وہ تمہارا سراغ لگا ہی لیں گے۔" میں نے دھیمے سے کہا۔ "بس یہ شکر ادا کرو کہ تم فوری تصادم کے ناخوشگوار نتائج سے بچ آئے ہو۔ آج دن میں وہ لوگ ایس ٹی ایف کے بڑوں تک ضرور پہنچ جائیں گے۔"

"مجھے اس کی پروا نہیں ہے۔ فکر اس بات کی ہے کہ جیک رونالڈو اور اس کے ساتھی کی حفاظت کے لیے اس قدر سخت انتظامات کیوں ضروری سمجھے گئے ہیں؟ اتنی سختی تو مقامی وی آئی پیز کے لیے بھی نہیں کی جاتی۔"

"یہ بتاؤ کہ تمہاری گاڑی پر فائرنگ ہونے تک دونوں گورے اسی پارٹی کے ساتھ تھے؟" سلطان شاہ نے چونک کر سوال کیا۔ اس کا ذہن بدستور اسی مفروضے میں الجھا ہوا تھا کہ وہ دونوں ایک دوسرے سے الگ شناخت رکھتے تھے۔ اول خان کے بارے میں اپنا قیاس درست ثابت ہونے کے بعد اس کے اعتماد میں اضافہ ہوگیا تھا۔

"وہ اور کہاں جاتے؟" اول خان نے حیرت سے کہا۔ "اب دن نکلنے کے بعد ہی معلوم ہوسکے گا کہ ان دونوں کو کہاں ٹھہرایا گیا ہے۔ میری معلومات کے مطابق گلشن اقبال میں وفاق والوں کا کوئی ریسٹ ہاؤس یا مہمان خانہ نہیں ہے۔"

اول خان کی الجھن دور کرنے کے لیے میں نے اسے سلطان شاہ کے نظریے سے آگاہ کردیا۔

ہم ان ہی باتوں میں الجھے ہوئے تھے کہ اچانک بج اٹھنے والی فون کی گھنٹی نے ہمیں چونکا دیا۔

"صبح چھ بجے کسے فون کرنے کا خیال آگیا؟" ویرا وال کلاک کی طرف دیکھتے ہوئے بڑبڑائی۔

میں نے ہاتھ بڑھا کر بے پروائی سے فون کا ریسیور اٹھا کر اپنے کان سے لگالیا۔

"ہیلو! کیا میں ڈینی سے بات کرسکتا ہوں؟" خالص امریکی لب ولہجے اور مردانہ آواز میں کیے گئے اس سوال نے میرے پورے بدن میں سنسنی کی لہریں دوڑا دیں۔ میرے لیے وہ آواز اجنبی نہیں تھی۔ اسے میں نے بہت کم سنا تھا لیکن پھر بھی میں اسے لاکھوں آوازوں میں الگ شناخت کرسکتا تھا۔ فون اٹھاتے ہی مجھے وہ مخصوص اور مترنم کلک کی آواز سنائی دی تھی جو ہر بین الاقوامی کال پر لازماً سنائی دیتی ہے۔

"تم کون بول رہے ہو؟" میں نے اپنے ہیجان پر قابو پاتے ہوئے سرسری لہجے میں سوال کیا۔ میں اسے یہ احساس نہیں دلانا چاہتا تھا کہ میں نے اسے پہچان لیا ہے۔

"یہ غیر اخلاقی سوال ہے۔" دوسری طرف سے شائستگی کے ساتھ کہا گیا۔ "کیا ڈینی کے موجود ہونے یا نہ ہونے کا انحصار اس بات پر ہے کہ اُس سے کون بات کرنی چاہ رہا ہے؟ تم مجھے اس کے بارے میں بتاؤ۔ وہ موجود ہوا تو میں تمہیں اپنا نام بھی بتادوں گا۔ ورنہ فون بند کردوں گا۔ مجھے اس سے اہم بات کرنی ہے۔"

"امریکی واقعی مُنہ پھٹ اور بدتمیز ہوتے ہیں۔" میں نے تلخی کے ساتھ کہا۔ "تمہاری جگہ کوئی انگریز ہوتا تو اپنا تعارف کرائے اور ناوقت فون کرنے پر معذرت کیے بغیر اصل بات شروع نہ کرتا۔ تمہیں اندازہ ہے کہ اس وقت پاکستان میں صبح کے چھ بجے ہیں اور یہ وقت شرفا کی گہری نیند کا ہوتا ہے؟"

"مجھے یہ سب بتانے کی ضرورت نہیں۔" اس کی آواز میں برہمی عود کر آئی۔ "انگریز اپنی ذہنی بیماریوں اور معذرت خواہانہ رویے ہی کی وجہ سے برٹش چینل اور بحرِ اوقیانوس کے چند جزائر تک محدود ہو کر رہ گیا ہے جب کہ امریکی دنیا کے ایک سرے سے دوسرے سرے تک' بلکہ خلاؤں تک میں راج کررہے ہیں۔ مجھے معلوم ہے کہ پاکستان کے شرفا اکثر سوتے رہتے ہیں لیکن ڈینی کا شرافت سے دور کا بھی تعلق نہیں ہے۔ اس کے سونے اور جاگنے کا کوئی وقت مقرر نہیں ہے۔ اگر وہ موجود ہے تو تم بے تکلفی کے ساتھ اسے بیدار کردو۔ اسے مجھ سے بات کرکے خوشی ہوگی۔"

"ابھی تک تو کوفت ہی ہو رہی ہے۔ کہو کیا کہنا چاہتے ہو؟" میں نے بدمزگی سے کہا۔

"کیا مطلب؟" دوسری طرف سے بولنے والے کی تحیر زدہ آواز سنائی دی۔

"مطلب یہ کہ میں ڈینی ہی بول رہا ہوں۔ اب بتاؤ کہ تم کون ہو اور کیا چاہتے ہو؟" میں نے اپنی شناخت کا کوئی حوالہ دیے بغیر بے زاری کے ساتھ کہا۔ "میں اجنبیوں کے بے تکلفانہ طرزِ تخاطب کو عام طور سے نظرانداز نہیں کرتا لیکن مجبوری یہ ہے کہ تم میرے روبرو ہونے کے بجائے' کہیں دور سے بول رہے ہو اس لیے بس بولتے ہی چلے جاؤ۔"

"کمال ہے کہ تم نے میری آواز نہیں پہچانی!" دوسری طرف سے کہا گیا "میں جمی لائیڈ بول رہا ہوں۔"

"اوہ! تو یہ تم ہو۔ تم میری آواز نہیں پہچان سکے اور میں نے تمہیں نہیں پہچانا۔ حساب برابر ہوگیا۔ یہ بتاؤ کہ تمہیں صبح سویرے اس خادم کا خیال کیسے آگیا اور تمہیں میرا یہاں کا نمبر کیسے ملا؟"

"میں اس وقت لاس اینجلس سے بول رہا ہوں۔ یہاں کا وقت تم سے ٹھیک بارہ گھنٹے پیچھے ہے۔ بے دھیانی میں مجھے یاد ہی نہیں رہا کہ پاکستان میں ابھی سورج بھی طلوع نہیں ہوا ہوگا۔ رہا تمہارا فون نمبر تو یہ یاد رکھو کہ تم کبھی بھی میری نگاہوں سے اوجھل نہیں ہوسکے۔ میرے ہمدرد اور خیر خواہ مجھے خبریں پہنچاتے ہی رہتے ہیں۔"

"کبھی کبھار میں بھی تمہارے خیر خواہوں کی گوشمالی کرتا رہا ہوں۔ میں پاکستان میں تمہارے نیٹ ورک سے بخوبی واقف ہوچکا ہوں۔ ہیری کیسنجر کا پورا قونصلیٹ بھی مل کر میرا کچھ نہیں بگاڑ سکا تھا۔"

"مکاؤ کے ڈون کوانگ فو کے ساتھ تم نے بدترین نمک حرامی کی تھی۔ حال ہی میں اس کی شکایتیں مجھ تک پہنچی ہیں اور اب وہ کسی خونخوار ہاتھی کی طرح' تمہاری تلاش میں مصروف ہے۔ یہ تمہاری خوش قسمتی تھی کہ کوانگ فو پہلے سے تمہارے نام سے واقف نہیں تھا ورنہ تم مکاؤ سے زندہ نہیں لوٹ پاتے۔ تمہارا فون نمبر مجھے کوانگ فو سے ہی ملا ہے۔ تم اس کے آدمیوں سے جھوٹ بولتے رہے ہو کہ تم نے یہ مکان چھوڑ دیا ہے....."

"میں یہ سمجھنے سے قاصر ہوں کہ میں نے ڈون کوانگ فو کے ساتھ کون سی نمک حرامی کی تھی۔" میں نے اس کی بات کاٹ کر ترشی سے کہا۔ "وہاں جو کچھ ہوا' بھرے مجمع میں سب کی آنکھوں کے سامنے ہوا۔ کوانگ فو نے اپنا اطمینان کرنے کے بعد ہی ہمیں مکاؤ چھوڑنے کی اجازت دی تھی۔ معلوم ہوتا ہے کہ تم نے اس کے کان بھر کر' اسے میرے پیچھے لگا دیا ہے تاکہ گوشت کے اس

پہاڑ کے ذریعے مجھے زیر کرنے کی اپنی دیرینہ حسرت پوری کر سکو۔“

”ایسا ہوتا تو میں اس وقت کوانگ فو کا نام بھی نہ لیتا۔ اس کے محل میں نیشی کاؤ کے قتل کی وجہ سے اس کی بہت بے عزتی ہوئی ہے۔ نیشی کاؤ کے ساتھیوں نے تم پر ہی قاتل ہونے کا شبہ ظاہر کیا تھا۔ پھر بعد میں کوانگ فو کو شی سے تمہاری دیرینہ رقابت کا بھی علم ہوگیا۔ اب تو میں تمہاری اور کوانگ فو کی لڑائی سے لطف اندوز ہونے کے موڈ میں ہوں۔ یہ مقابلہ روایتی اور بہت دلچسپ ثابت ہونا چاہیے۔“

”دلچسپ ہونے کے ساتھ ساتھ پہلے کی طرح عبرتناک بھی ہوگا۔“ میں نے زہریلے انداز میں کہا۔ ”کم از کم کوانگ فو کے بدن سے پھپھوندی کی تہ ضرور اتر جائے گی۔ تم نے مکاؤ کا ذکر چھیڑ دیا ہے لیکن ہیری کیسنجر اور اس کے قونصلیٹ کے بارے میں کوئی رائے زنی نہیں کی؟ تمہارے لیے وہ لوگ قابلِ قدر خدمات انجام دیتے ہیں۔“

”دیکھو ڈیپی! آپس کے معاملات میں ایسے معزز لوگوں کے نام نہ لو جو تمہاری دسترس سے باہر ہوں۔“ جمی لائیڈ کی آواز یک بیک سرد اور گمبھیر ہوگئی۔ ”یہ وہ لوگ ہیں جن سے حکومتیں اور مقبول حکمراں تک تھراتے ہیں۔ ان کے بارے میں غیر ذمے داری سے زبان کھول کر تم خود پر عرصہ حیات تنگ کر لوگے۔“

”تم اسی قونصلیٹ کے آرنیٹ کا حشر بھول رہے ہو۔“ میں نے اسے یاد دلایا۔ ”ہیری کیسنجر بھی ہر وقت میری دسترس میں ہے۔ یہ میرا ملک ہے۔ یہاں وہ بزدلوں اور چوروں کو خوفزدہ کر کے بلیک میل کر سکتے ہیں۔ مجھے نہیں جھکا سکتے۔ میں ہر وقت اپنی جان ہتھیلی پر لیے پھرتا ہوں کیونکہ یہ صرف ایک بار جانی ہے‘ اور جب اس کا وقت آجائے گا تو دنیا کی کوئی طاقت یا تدبیر اسے نہیں روک سکے گی۔“

”میں نے اپنا فرض پورا کر دیا۔ اگر تم خود کو عبرت کا شاہکار بنانے پر تل گئے ہو تو کوئی تمہارے دماغ کا فتور زائل نہیں کر سکتا۔ یہ یاد رکھنا کہ چٹانوں سے سر پھوڑنے والے ہمیشہ خود ہی لہولہان ہوتے ہیں‘ چٹانوں میں خفیف سی دراڑ بھی نہیں پڑتی۔ یہ ایک ابدی کلیہ ہے اور تم اس سے مستثنیٰ نہیں ہو۔“

”ان ہمدردانہ مشوروں کا شکریہ۔ کیا تم نے صرف یہی بتانے کے لیے فون کیا تھا؟“ میرا لہجہ زہریلا ہوگیا۔

”مجھ پر دانت پیسنے کی ضرورت نہیں۔“ ریسیور میں جمی لائیڈ کی غراہٹ ابھری۔ ”شاید ویرا نے تمہیں بتا دیا ہوگا کہ میرے اور اس کے درمیان مصالحت ہو چکی ہے اور اس کے نتیجے میں تمہاری پوزیشن بھی تبدیل ہوگئی ہے۔ میں جانتا ہوں کہ ویرا تم کو پسند کرتی ہے۔ مجھے اس کی پسند کا لحاظ کرنا پڑے گا۔ اب میں سفاکانہ انداز میں تمہاری گردن کاٹنے کا حکم جاری نہیں کر سکتا۔“

میں نے کن انکھیوں سے ویرا کی طرف دیکھا۔ وہ پوری طرح میری طرف متوجہ تھی۔ وہی کیا‘ بقیہ تینوں بھی اس وقت ہمہ تن گوش بنے ہوئے تھے اور میری یک طرفہ گفتگو سن کر انہوں نے اندازہ کر لیا تھا کہ اس وقت میری جمی لائیڈ سے بات ہو رہی تھی۔

”شاید تمہیں علم نہیں کہ تمہارے بدگوشت نے مکاؤ میں زبردستی میری شادی کرادی تھی۔“ میں نے دانستہ ایسے الفاظ کا انتخاب کیا کہ ویرا کو دوسری طرف سے کہی ہوئی بات کا اندازہ ہو سکے۔

”مجھے سب کچھ معلوم ہے لیکن تمہاری اس جبری شادی سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ تم مسلمان تو ایک وقت میں چار عورتیں بھی رکھ سکتے ہو۔ مغرب میں بیوی ایک ہی ہوتی ہے لیکن گرل فرینڈز اور بوائے فرینڈز کی تعداد پر کوئی پابندی نہیں ہوتی۔ ویرا کچھ عرصے کے لیے تمہاری گرل فرینڈ رہ سکتی ہے۔ مجھے معلوم ہے کہ وہ اپنی پسند ہر قیمت پر حاصل کر کے رہتی ہے۔ وہ جلد ہی تمہاری بیوی کا کوئی نہ کوئی تدارک کر لے گی۔“

”اگر یہ تمہاری طرف سے اوپن پرمٹ ہے تو میں بخوشی اسے قبول کرنے کے لیے آمادہ ہوں۔“

”میں احمقوں کی دنیا میں رہنے کا عادی نہیں ہوں‘ حقائق کی دنیا کا آدمی ہوں۔ میں اچھی طرح جانتا ہوں کہ ویرا جیسی لڑکی کے جھکاؤ کو دنیا کا کوئی مرد نظرانداز نہیں کر سکتا۔ تم دونوں کے مراسم پہلے ہی بے تکلفی کی حدوں سے بہت زیادہ بڑھے ہوئے تھے۔ ان حالات میں میرے پرمٹ دینے یا نہ دینے سے کوئی تبدیلی رونما نہیں ہو سکتی اور تمہیں پوری سنجیدگی کے ساتھ میرے بدلے ہوئے رویّے کو قبول کر لینا چاہیے۔“

جمی لائیڈ ناجائز اور غیر قانونی ہی سہی لیکن ویرا کا باپ تھا۔ اس کی زبان سے وہ گفتگو سن کر میری پیشانی عرق آلود ہونے لگی۔ مغربی معاشرے کے نچلے طبقوں میں رائج بہت سی برائیوں میں سے ایک یہ بھی تھی کہ ہر جوان لڑکی کے والدین محدود مفہوم میں اس کے بوائے فرینڈ کو قبول کرنے کے لیے ذہنی طور پر تیار رہتے تھے لیکن امرا اور شرفا کے طبقات میں نوجوان لڑکوں اور لڑکیوں کے مادر پدر آزاد میل جول کو بے راہ روی ہی سمجھا جاتا تھا جبکہ جمی لائیڈ مجھ جیسے ایک ایشیائی کو اپنی لڑکی پر ہر قسم کے تصرف کی کھلی چھوٹ دینے پر آمادہ تھا۔ یہی نہیں بلکہ وہ اس تصرف کی بنا پر مجھے کچھ رعایتیں دینے کا بھی اعلان کر رہا تھا۔

”میں نے تمہاری کہی ہوئی ہر بات پوری سنجیدگی کے ساتھ نوٹ کر لی ہے۔“ میں نے اضطراری طور پر اپنی پیشانی رگڑتے ہوئے‘ چور نظروں سے غزالہ کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ”تمہاری بات ختم ہوگئی ہو تو اب میں فون بند کر کے سونے کے لیے چلا جاؤں؟ مجھ پر نیند کا غلبہ ہونا شروع ہوگیا ہے۔“

”یہ سب رسمی باتیں تمہیں جو روا روی میں نکلتی چلی آئیں۔ اب یہ بتاؤ کہ ویرا کہاں ہے؟“ ایک گہرے سانس کے بعد اس کی بوجھل آواز ابھری۔ ”مجھے اس سے کچھ ضروری باتیں کرنی ہیں۔“

میں نے ویرا کی طرف دیکھتے ہوئے اسے آنکھ ماری اور ماؤتھ پیس میں کہا۔ ”تمہیں معلوم ہے کہ ویرا ایک آزاد منش لڑکی ہے۔ وہ اپنی نقل و حرکت کے بارے میں مجھے تو کیا‘ کسی کو بھی اعتماد میں لینے کی عادی نہیں ہے۔ میں اس کے موجودہ ٹھکانے سے لاعلم ہوں۔“

”تمہاری اس سے آخری ملاقات کب ہوئی تھی؟“ چند ثانیوں کی خاموشی کے بعد سوال کیا گیا۔

”میں کافی عرصے سے اس سے ملنے کا متمنی ہوں۔ ہو سکتا ہے کہ وہ شہر سے باہر گئی ہوئی ہو۔“

”تم جھوٹ بول رہے ہو۔“ جمی لائیڈ کی آواز غصیلی ہوگئی۔ ”ایران روانہ ہونے سے پہلے وہ تمہارے ساتھ دیکھی جا رہی تھی۔ یہ کوئی بہت پرانی بات نہیں ہے۔ شاید اس نے تمہیں ایران کے مشن کے بارے میں بھی بتایا ہوگا۔“

”وہ کسی بلیو کراس ڈیل کی فکر میں لگی ہوئی تھی۔“ میں نے اسے چھیڑنے کے لیے بے پروایانہ لہجے میں کہا۔ ”میرے اصرار کے باوجود اس نے مجھے اس ڈیل کے بارے میں کچھ نہیں بتایا پھر وہ کوانگ فو سے غزالہ کی واپسی کے انتظامات طے کرنے کے بعد اچانک کوئٹہ چلی گئی۔ اس کے بعد میری اور اس کی ملاقات نہیں ہوئی۔“

”یہ کوئٹہ کیا ہوتا ہے؟“ جمی لائیڈ کا وہ سوال بے ساختہ اور اضطراری تھا۔

”یہ پاکستان کے مشرقی علاقے کا ایک سرحدی شہر ہے جو ایران کے قریب واقع ہے۔“

”اوہ! میں سمجھا یہ کہوٹہ کا بگڑا ہوا یا مقامی تلفظ ہے۔ چند ثانیوں کے لیے میں الجھن میں پڑ گیا تھا کہ... ویرا کو ایران جانے کے لیے کہا گیا تھا تو وہ کہوٹہ کیسے پہنچ گئی؟ کوئٹہ اور کہوٹہ بہت ملتے جلتے نام ہیں۔“

اس کی زبان سے یوں بے ساختہ انداز میں کہوٹہ کا ذکر بہت معنی خیز تھا۔ اس کا مطلب تھا کہ کہوٹہ کا نام مغرب کی ہر قابلِ ذکر شخصیت کے ذہن پر ایک آسیب بن کر سوار تھا۔ میں نے اس موقع سے فائدہ اٹھاتے ہوئے جمی لائیڈ کو کریدنے کی نیت سے سوال کیا۔ ”کہوٹہ تو پاکستان کا بہت چھوٹا اور غیر معروف قصبہ ہے۔ تم اس کے نام سے کیسے واقف ہو؟ پاکستان کے عام نقشوں میں تو اسے دکھایا بھی نہیں جاتا۔“

جمی لائیڈ کی جوابی ہنسی بہت گھنی تھی۔ اس نے کہا۔ ”ہو سکتا ہے کہ تمہارے حکمراں تم لوگوں کو بھی اس ایٹمی ہیبت کدے سے بے خبر رکھنے کی کوشش کرتے ہوں ورنہ پوری دنیا میں اس نام کے چرچے ہیں کیونکہ وہاں چوری چھپے یورینیم افزودہ کر کے بھیانک ایٹمی ہتھیار بنائے جاتے ہیں اور سنجیدہ عالمی قوتیں پہاڑوں سے گھری ہوئی اس وادی کو ہولناک ایٹمی تابکاری سے یکسر آزاد رکھنے کی خواہاں ہیں۔ کمال ہے کہ تم اتنے بے خبر ہو!“

”اس ملک کے لیے غربت‘ جہالت اور بیماریاں‘ ایٹمی تابکاری سے زیادہ مہلک ثابت ہو رہی ہیں لیکن ان کے سدِباب کے لیے کسی سنجیدہ عالمی قوت کو زبان ہلانے کی توفیق نہیں ہوئی تو اب یورینیم کی افزودگی کے معاملے میں ہر ایک پر یک بیک ہمدردی کے دورے کیوں پڑ رہے ہیں؟ کیا یہ کھلی ہوئی منافقت نہیں ہے؟“

”ہوگی۔“ اس کی آواز سے بے پروائی مترشح ہونے لگی۔ ”مجھے ان جھگڑوں سے کوئی دلچسپی نہیں ہے۔ میں تو صرف اتنا جانتا ہوں کہ ارتقا سے پہلے انسان گروہوں کی شکل میں رہتا تھا اور اپنے گروہ کے مفاد سے آگے نہیں سوچتا تھا۔ پھر بستی‘ قصبے اور شہر کی بنیادوں پر مفادات طے ہونے لگے۔ آج انسان ملکوں یا قوموں کی صورت میں بٹے ہوئے ہیں لیکن ارتقا کا غیر محسوس عمل تیزی سے جاری ہے۔ تم دیکھ لینا کہ اکیسویں صدی میں عالمی معاشرے اور برادری کا تصور سر اٹھائے گا جس میں قطب شمالی میں رہنے والے ایک اسکیمو اور نیویارک میں رہنے والے خلا باز کی سوچ اور مفادات میں کوئی فرق نہیں ہوگا۔ دور اندیش قومیں ابھی سے ان خطرات کا تدارک کرنا چاہ رہی ہیں جو آنے والے دنوں میں عالمی برادری کے تصور کے لیے نقصان دہ ثابت ہوں گے۔“

”اور شاید امریکا اس عالمی برادری کا پولیس مین بننے کی تیاریوں میں مصروف ہے۔ جسے چاہتا ہے گردن سے پکڑ لیتا ہے اور جسے چاہتا ہے‘ کھلی چھوٹ دے دیتا ہے۔ اس کی لغت میں عالمی مفادات کا مطلب صرف اور صرف امریکی مفاد ہوتا ہے۔ اسی لیے اس نے اسرائیل کو بھلا کر کہوٹہ کا نقارہ بجایا ہوا ہے۔“

”معاشرتی ارتقا اور ٹوٹ پھوٹ کے عمل میں ہمیشہ یہی ہوتا آیا ہے کہ بدلنے والی قدروں میں طاقتور عناصر کی مرضی حاوی رہتی ہے۔ تم اس فطری رویّے سے منکر نہیں ہو سکتے۔ یہ ایک طویل بحث ہے۔ میں اس میں نہیں الجھنا چاہتا۔ ویسے ہی میری یہ کال کافی طویل ہوگئی ہے۔ میں ویرا سے بات کرنی چاہتا ہوں۔“

”ویرا سے میری ملاقات ہوئی تو میں تمہارا پیغام اس تک پہنچا دوں گا۔“ میں نے خشک لہجے میں کہا۔

”تم میری خاطر اسے تلاش کرو۔“ اس نے زور دے کر کہا۔ ”مجھے اس سے بہت اہم بات کرنی ہے۔ تم اسے بتا سکتے ہو کہ میں ایران میں اس کی ناکامی کے سبب سے واقف ہوں۔ پاکستان‘ ایران اور ترکی کی حدود میں موجود سیٹلائیٹ نیٹ ورک کے ذریعے مجھے معلوم ہو چکا ہے کہ ایک گاڑی کی خرابی کی وجہ سے ویرا کا کام نہیں بن سکا لیکن حیرت کی بات یہ ہے کہ پاکستان کے سرحدی پہاڑوں سے آگے‘ ہمارا نیٹ ورک اس کارواں کا سراغ کھو بیٹھا ہے۔ اس کی نقل و حرکت یا منزل کا پتا چلانا لازمی ہوگیا ہے.....“

”یہ تم کس کارواں اور نیٹ ورک کی بات کر رہے ہو؟“ میں

نے اس کی قطع کلامی کرتے ہوئے' الجھن آمیز لہجے میں سوال کیا۔ مجھے معلوم تھا کہ جمی لائیڈ کی وہ گفتگو بلیوکراس ڈیل کے تحت آنے والے کارواں کے بارے میں تھی۔ مگر میں انجان بن کر اسے اپنی بے خبری کا مکمل یقین دلانا چاہ رہا تھا۔

"تم بس ویرا کو یہ بتادینا۔" جمی لائیڈ کی جھلّائی ہوئی آواز ابھری۔ "آج تم بہت زیادہ غیر ضروری باتیں کررہے ہو۔ ویرا مناسب سمجھے گی تو تمہیں بقیہ تفصیلات بھی بتادے گی۔ دوسری ضروری بات یہ ہے کہ پاکستان آنے والے' میرے ایک دوست کو ویرا کی مدد درکار ہوگی۔ وہ مجھے فون کرے گی تو میں اسے اپنے دوست کے بارے میں بتادوں گا۔ ان دو معاملات کی اہمیت کا اندازہ تم اس بات سے لگا سکتے ہو کہ میں نے کوانگ فو سے تمہارا فون نمبر لینے کے بعد تم سے براہِ راست رابطہ کیا ہے۔ مجھے یقین ہے کہ تم ماضی کی تلخیوں کو بھلا کر مجھ سے تعاون کروگے۔"

"تمہارے مصالحت آمیز رویّے نے مجھے سوچنے پر مجبور کردیا ہے۔ میں ویرا کو پیغام پہنچانے کی پوری کوشش کروں گا۔ اس کے بعد کے معاملات کا انحصار تمہارے اپنے رویّے پر ہوگا۔"

"اتنی بات ہوگئی ہے تو لگے ہاتھوں یہ بھی بتادو کہ بیم گن اور سلور آئی کہاں ہے؟" اس نے اچانک ہی وہ نازک موضوع چھیڑ دیا۔ "مجھے معلوم ہوا ہے کہ تمہیں اپنے ساتھ ملانے کے بعد مافیا بھی غرق ہوگئی ہے۔ ان کے ذریعے ملنے والا' تمہارا جواب میرے لیے کبھی بھی تسلی بخش نہیں رہا ہے۔ وہ دونوں چیزیں تمہارے پاس ہونی چاہئیں۔"

"مجھے یاد نہیں پڑتا کہ ان میں سے کوئی چیز میرے پاس رہی ہو۔"

"پھر بھی سوچنے کی کوشش کرو۔ ہوسکتا ہے کہ تم نے انہیں کہیں گنوادیا ہو۔"

"میں غور کروں گا لیکن مجھے امید نہیں کہ اس کا نتیجہ کچھ مختلف نکلے گا۔"

جمی لائیڈ نے مجھے ویرا کے بارے میں یاددہانی کراتے ہوئے فون کا سلسلہ موقوف کردیا۔

جمی لائیڈ کی وہ فون کال ہم میں سے ہر ایک کے لیے غیر متوقع تھی۔ میرے لیے اس کال کی اہمیت یوں بھی بہت زیادہ تھی کہ میرے ٹی سے باغی ہونے کے بعد اس نے پہلی بار مجھے کسی قسم کا مصالحت کا عندیہ دیا تھا۔ مجھے اس امر کا اعتراف کرنے میں کوئی شرمندگی نہیں تھی کہ وہ پاکستان سے ہزاروں میل دور رہنے کے باوجود' یہاں کے حالات سے پوری طرح باخبر تھا۔ اسے معلوم تھا کہ میں نے ٹی میں رہتے ہوئے' پاکستان میں ہیروئن کی ترویج کے خلاف علمِ بغاوت بلند کیا تھا۔ پھر بلی اور چوہے کے اس ہولناک کھیل میں' میں نے اپنے محدود وسائل کے باوجود ٹی کی تنظیم اور اس کے مفادات کو پاکستان سے یورپ تک ناقابلِ تلافی نقصان پہنچایا تھا تو دوسری طرف اس کی حریف تنظیم' مافیا میں شامل ہوکر بھی میں نے اپنے مشن کو خیرباد نہیں کہا تھا۔ جس طرح پاکستان سے ٹی والے اپنا بوریا بستر لپیٹ کر فرار ہونے پر مجبور ہوگئے تھے' اسی طرح مافیا کا بھی کریا کرم کردیا گیا تھا۔ میرے حق میں یہ بہت اچھی بات تھی کہ جمی لائیڈ مافیا کی تباہی کا سہرا بجا طور پر میرے سر باندھ رہا تھا۔ یہ نکتہ میری اور جمی لائیڈ کی آئندہ مصالحت میں کلیدی کردار ادا کرسکتا تھا اور میں اس کی طرف سے بے خوف ہوکر زندگی گزار سکتا تھا۔

جب تک میں اسلام آباد میں تھا تو مجھے کراچی کے دو سنگین معاملات کی فکر لاحق تھی۔ ان میں سے سردار پائندہ گل اور عبدالرحیم خان کے آدمیوں کا معاملہ تقریباً طے ہوچکا تھا۔ اس وحشت ناک مقابلے میں جنت گل جیسی نرم و نازک اور لچک دار لڑکی کی رفاقت مفت انعام کی صورت میں میرے ہاتھ آئی تھی۔ دوسرے معاملے کا تعلق کسی چینی کی اُن فون کالز سے تھا جو ڈون کوانگ فو سے منسوب کی جارہی تھیں۔ جمی لائیڈ سے کھلی کھلی گفتگو ہونے کے بعد یہ واضح ہوگیا تھا کہ ڈون کوانگ فو اپنی بے عزتی کا انتقام لینے کے لیے واقعی میری تلاش میں سرگرداں تھا اور شاید جمی لائیڈ سے مصالحت ہوجانے کے باوجود مجھے اپنے طور پر اس سے معاملات طے کرنے تھے۔

اول خان کے لیے جمی لائیڈ کا موضوع بہت زیادہ دلچسپی کا باعث نہیں تھا اس لیے وہ میرا بتایا ہوا خلاصہ سننے کے بعد ہی فلیٹ سے رخصت ہوگیا۔ وہ جیک رونالڈو وغیرہ کے معاملے میں اپنی پوزیشن صاف رکھنے کے لیے صبح سویرے اپنے افسرانِ بالا کو اعتماد میں لینے کا ارادہ رکھتا تھا۔ وہ اپنا دامن بچاتے ہوئے' جلد از جلد ان کی اصلیت کا کھوج لگا کر کسی نتیجے پر پہنچ جانے کے لیے بے چین تھا۔ البرٹو ویلیسا کے قصے کی ابتدا اسپیشل ٹاسک فورس میں شمولیت سے ہوئی تھی اس لیے وہ کرنل جیسی جونز کے معاملے کو نمٹانے کی ذمے داری بھی اپنے سر پر ہی محسوس کررہا تھا۔ دوسری اہم ترین بات یہ تھی کہ اپنے آقاؤں کے اشارے پر بلیوکراس ڈیل والے کارواں کو ٹھکانے لگانے کی ناکام سازش کرنے والے لوگ اس مشینی قافلے کی یکایک گمشدگی پر بہت زیادہ حیران تھے اور دوبارہ اس کا کھوج لگانے کی کوشش میں مصروف تھے۔ اس سازو سامان کی منتقلی کے ذمے داروں کو یہ بتایا جانا بہت ضروری تھا کہ ان کے سروں پر منڈلاتا ہوا خطرہ بدستور موجود تھا اور ان کی ذرا سی بھی بے احتیاطی ایک ہولناک صورتِ حال کو جنم دے سکتی تھی۔ یہ کام بھی اول خان ہی بہتر طور پر سرانجام دے سکتا تھا ورنہ کوئی اور بلیوکراس ڈیل کا حوالہ بھی دے بیٹھتا تو اسے یہ واضح کرنے میں تارے نظر آجاتے کہ اس کو وہ کوڈ نام کہاں سے اور کیسے معلوم ہوا ہے۔

میں نے جمی لائیڈ کی گفتگو میں موجود وہ حوالے دانستہ طور پر حذف کردیے تھے جن کا تعلق میرے اور ویرا کے باہمی تعلقات سے تھا۔ ویرا اس حد تک بات کھل جانے کے بعد شیئر ہوسکتی تھی جب کہ وہ متن غزالہ کے لیے دل آزاری کا سبب بن سکتا تھا۔

ویرا نے فون پر دیے جانے والے میرے جوابات کو شاید بہت غور سے سن کر ذہن نشین کرلیا تھا اور میرے سنائے ہوئے خلاصے کو ان جوابات سے ملاتی رہی تھی۔ اس نے اول خان کے جاتے ہی سوال داغ دیا کہ میں نے جمی لائیڈ سے اوپن پرمٹ والی بات کس سلسلے میں کی تھی اور اس سے پہلے میں نے اسے یہ یاد دلانا کیوں ضروری سمجھا تھا کہ مکاؤ میں کوانگ فو نے میری جبری شادی کرادی تھی۔

"وہ دراصل بے فکری اور عیش و نشاط کی پُرفریب زندگی کے بارے میں اپنا فلسفہ مجھ پر تھوپنے کی کوشش کررہا تھا۔ اس نے مجھے اپنے گروہ کی آزاد خیال خواتین سے متعارف کرانے کی پیشکش تک کرڈالی تھی۔ اس کے جواب میں مجھے وہ سب کہنا پڑا تھا۔" میں نے اصل بات سے ملتا جلتا بہانہ بناتے ہوئے کہا۔

"مبارک ہو۔" ویرا مسکرا کر بولی۔ "اب تو تمہارا حریف بھی تمہارے مزاج کو سمجھنے لگا ہے۔ مجھے حیرت ہے کہ اس بار اُس نے تمہارے ساتھ دوستانہ رویّہ اختیار کیا ہے ورنہ وہ ہمیشہ تمہارے خون کا پیاسا رہا ہے۔"

"معلوم ہوتا ہے کہ بلیوکراس ڈیل کے لیے وہ تمہیں بھی استعمال کرنا چاہتا ہے۔" سلطان شاہ نے پُرخیال انداز میں کہا۔ "اسی لیے اس بار اس کی گفتگو دوستانہ رہی ہے۔ تمہیں اس سے ہوشیار رہنا ہوگا۔"

"تم نے میری اکھڑی اکھڑی ہوئی گفتگو سے اندازہ لگالیا ہوگا کہ میں نے اس کے بدلے ہوئے لب و لہجے کو زیادہ اہمیت دینے کے بجائے نظرانداز کیا ہے۔ فوری طور پر تو مجھے یہ فکر لاحق ہے کہ اگر کوانگ فو میری تلاش میں ہے تو اس کے آدمی کسی بھی وقت یہاں پہنچ سکتے ہیں۔ ہمیں اب اپنا ٹھکانا بدل لینا چاہیے۔"

"یہ دانشمندانہ فیصلہ ہوگا۔" غزالہ نے وہاں سے اٹھتے ہوئے کہا۔ "روز روز کی مارڈھار اور بھاگ دوڑ سے اب میری طبیعت بیزار ہونے لگی ہے۔" یہ کہتی ہوئی' وہ سونے کے لیے چلی گئی۔

"اور مجھے یہ فکر ہے کہ اس کا کون سا دوست یہاں آرہا ہے جو میری مدد کا طلب گار ہوگا۔" ویرا نے معنی خیز انداز میں کہا۔ "میرا خیال ہے کہ آج میری اور تمہاری ملاقات ہوہی جانی چاہیے۔"

میں نے کچھ نہ سمجھنے والے انداز میں اس کی طرف دیکھا تو اس نے ہنستے ہوئے مجھے یاد دلایا کہ میں نے خود ہی جمی لائیڈ سے یہ کہا تھا کہ میری اور اس کی کافی عرصے سے ملاقات نہیں ہوئی ہے۔

جمی لائیڈ کی اس فون کال سے ظاہر ہو رہا تھا کہ وہ فوری طور پر ویرا سے بات کرنے کا متمنی تھا۔ اگر اس بندوبست میں غیر ضروری تاخیر کی جاتی تو عین ممکن تھا کہ جمی لائیڈ کی وہ ایمرجنسی ختم ہوجاتی اور وہ دوبارہ اپنی پرانی ڈگر پر لوٹ آتا اس لیے میں نے پوری طرح ویرا کی رائے کی تائید کی اور کچھ بحث مباحثے کے بعد ہم نے یہ طے کرلیا کہ تھوڑی دیر تک آرام کرنے کے بعد بازار سے ایک اسپیکر فون خرید لیا جائے تاکہ سب لوگ بیک وقت دو طرفہ مکالمات سن سکیں۔ ویرا کو اس تجویز پر کوئی اعتراض نہیں تھا کیونکہ اس نے ہمارے سامنے اپنی ساری رازداری ختم کی ہوئی تھی اور ایک اعتبار سے وہ ہماری صفوں میں شریک ہوچکی تھی۔

ہم لوگ ناشتا وغیرہ کرکے سوئے تو پھر شام ہی کی خبر لائے۔ سلطان شاہ دوپہر میں کسی وقت بیدار ہوکر بازار سے اسپیکر فون لے آیا تھا اور دوبارہ گدھے گھوڑے بیچ کر سوگیا تھا۔

پانچ بجے اول خان کا فون آیا اور اس نے بتایا کہ جیک رونالڈو کے ساتھ آنے والا اس کا ماتحت اور ہم وطن تھا۔ اس کا نام پال ایتھرٹن تھا۔ دستیاب معلومات کے مطابق وہ دونوں ڈلاس کی ایک نجی اسلحہ ساز کمپنی میں حسّاس ترین بارودی سرنگوں اور ڈیٹونیٹرز کے ماہرین تھے۔ کھونہ میں پائے جانے والے پُراسرار بندروں کی جانچ پڑتال اور تحقیقات کے لیے نجی طور پر ان دونوں کی خدمات حاصل کی گئی تھیں۔ کراچی میں جانوروں کی پیچیدہ سرجری اور دیگر فنی مسائل پر بہتر سہولتیں میسر تھیں اس لیے ان دونوں کو کراچی میں مہمان رکھ کر' باقی ماندہ دو بندروں کو اسلام آباد سے کراچی لایا جارہا تھا تاکہ وہ جلد از جلد اپنے کام سے فارغ ہوکر واپس لوٹ سکیں۔ ان دونوں کو سائٹ کے ریسٹ ہاؤس میں ٹھہرایا گیا تھا۔

ان دونوں کی آمد میں کسی قسم کے سفارتی ذرائع ملوث نہیں تھے لیکن اسی کے ساتھ یہ بھی معلوم نہیں ہوسکا تھا کہ انہیں کن لوگوں نے آئی بی والوں کی فرمائش پر پاکستان بھیجا تھا۔ جیک رونالڈو ان دونوں بندروں کو بے ضرر بنا کر' مزید تحقیقات کے لیے اپنے ساتھ امریکا لے جانے کا ارادہ رکھتا تھا۔

جیک رونالڈو نے فرینکفرٹ کے راستے' اس طویل سفر کی رنگینی سے لطف اندوز ہونے کے لیے اکانومی کلاس میں سفر کرنا پسند کیا تھا اور یہ بھی اسی کی ذہنی اپج تھی کہ ان دونوں نے کراچی پہنچنے کے بعد وی آئی پی سہولتوں سے استفادہ کرنے کے بجائے عام مسافروں کے ساتھ باہر آنے کا فیصلہ کیا تھا۔

اول خان کی جمع کی ہوئی وہ معلومات چونکا دینے والی تھیں۔ ان کی روشنی میں وہ دونوں ہی مشتبہ تھے۔ انہوں نے عام مسافروں والے راستے کو صرف اس لیے استعمال کرنے کا فیصلہ کیا تھا کہ وہ البرٹو ویلیسا کے بھیجے ہوئے کسی آدمی سے رابطہ کرسکیں اور وہ اپنی دانست میں اس کوشش میں کامیاب رہے تھے۔ اگر البرٹو ویلیسا زندہ ہوتا تو کرنل جیسی جونز کے تشنہ پیغام کی روشنی میں اس کے فرشتے بھی یہ اندازہ نہیں لگا سکتے تھے کہ اس کے متوقع مہمان اہم سرکاری حیثیت میں پاکستان پہنچیں گے۔ اس کی ساری توجہ عام

مسافروں پر مرکوز رہتی اور جیک رونالڈو یا پال ایتھرٹن کو اس سے رابطہ کرنے کا کوئی موقع نہیں ملتا۔

اول خان اس بارے میں کوششوں میں لگا ہوا تھا لیکن میں نے وہ اطلاعات حاصل کرتے ہی اپنا ذہن بنالیا تھا۔ ہم ایک دوسرے سے الگ رہ کر موثر انداز میں کام کرسکتے تھے۔

دیکھنے والی بات صرف یہ تھی کہ پاکستان پہنچنے والے دونوں امریکی وہی تھے جنھوں نے ڈلاس سے غالباً نیویارک اور پھر فرینکفرٹ کے راستے کراچی کے سفر کا آغاز کیا تھا یا اصل افراد کو راستے میں کہیں غائب کرکے، ان دونوں نے ان کی جگہ لے لی تھی۔ یہ سوال اپنی جگہ بہت اہم تھا اور اسی کے جواب پر ان لوگوں کی بے گناہی یا سازش میں ملوّث ہونے کا انحصار تھا جنھوں نے آئی بی والوں کی درخواست پر ان دونوں ماہرین کو ڈلاس سے کراچی روانہ کرنے کا بندوبست کرنے کی ذمے داری قبول کی تھی۔

میں نے آنے والوں کی اصلیت کے بارے میں اپنے نظریے سے اول خان کو بھی آگاہ کردیا تھا تاکہ وہ موقع محل کی مناسبت سے اس بارے میں چھان بین کرکے اپنی تسلی کرلے۔ یہ نکتہ پہلے سے اس کے ذہن میں موجود تھا کہ آنے والوں کو البرٹو ویلیسا کی موت کی ہوا بھی نہ لگنے دی جائے اور لاجسٹکس سیکیوریٹی سیل میں ہونے والی بھیانک آتشزدگی میں اصل بدنصیب کے بجائے ظفر ہی کے جل مرنے کا بیان برقرار رکھا جائے تاکہ اس سے اسی منصوبے کی تصدیق ہوسکے جو البرٹو ویلیسا نے اپنی محفوظ روپوشی کے لیے تیار کیا تھا۔

ان سب معاملات سے نمٹنے کے بعد جمی لائیڈ کو فون کرنے کی فرصت میسر آئی تو وال کلاک کی سوئیاں ساڑھے سات بجے سے آگے بڑھ چکی تھیں۔ جو لاس اینجلس کے حساب سے کوئی ناگوار وقت نہیں تھا۔

اسپیکر فون کو لائن سے جوڑنے کے بعد ایک الل ٹپ مقامی نمبر ڈائل کرکے اس سیٹ کو چیک کیا گیا۔ اسپیکر پر دوسری طرف کی واضح آواز سن کر ویرا نے کوئی جواب دیے بغیر سلسلہ منقطع کردیا۔

اس دیکھ بھال کے بعد ویرا بین الاقوامی کوڈ کے ذریعے جمی لائیڈ کا نمبر ملانے میں مصروف ہوگئی۔ ویرا کے ساتھ برسوں کے طویل عرصے پر محیط عداوت اور رفاقت میں وہ پہلا موقع تھا کہ وہ میری موجودگی میں اپنے باپ سے فون پر گفتگو کرنے والی تھی ورنہ مجھے وہ ابتدائی ایام بھی یاد تھے جب لاہور میں لائیڈز کا نج نامی قلعے میں ویرا کسی دیوانی کی طرح میرے ساتھ اپنے باپ کی تصویر تلاش کرتی پھر رہی تھی۔ ان دنوں وہ شی میں سیاہ پوش بلیک کوئین ہوا کرتی تھی اور اس کے قہر سے بڑے بڑے بدمعاش بھی تھرایا کرتے تھے۔ ایک طرف ویرا کا وہ لرزہ خیز روپ ہوا کرتا تھا تو دوسری طرف اس کے دل میں جمی لائیڈ کی طرف سے گہری نفرت بھری ہوئی ہوتی تھی کیونکہ۔ جمی لائیڈ نے اس کا غیر قانونی باپ ہونے کے باوجود اسے کبھی بھی اپنی بیٹی تسلیم نہیں کیا تھا لیکن وقت کے ساتھ ساتھ حالات میں بھی انقلاب رونما ہوا چکا تھا۔ پدر الحرام اور بنت الحرام میں سمجھوتا ہوچکا تھا۔ باپ نے اسے اپنی بیٹی مان لیا تھا اور وہ اپنا خودساختہ حدود میں اپنے باپ کی وفادار رہنے کا عہد کرچکی تھی۔

لاس اینجلس سے فون کا رابطہ ہونے پر پہلی دو گھنٹیوں پر کوئی جواب نہیں آیا۔ ویرا کے چہرے پر ہلکی سی مایوسی اتر آئی۔ اسپیکر فون آن تھا اس لیے میں نے ہاتھ کے اشارے سے اسے انتظار کرنے کی ہدایت کی پھر تیسری گھنٹی مکمل ہونے سے پہلے ہی اسپیکر فون پر بین الاقوامی رابطہ ہونے کی مخصوص آواز سنائی دی پھر کمرا گویا جمی لائیڈ کی بھاری اور تحکم آمیز ہیلو سے بھر گیا۔

"ہیلو ڈیڈ! میں ویرا بول رہی ہوں۔" خود پر قابو رکھنے کی کوشش کے باوجود ویرا کی آواز جذباتی ہوگئی تھی۔

"ہیلو ڈارلنگ!" جمی لائیڈ کا لہجہ سرد اور رسمی سا تھا جو فوراً ہی تادیبی ہوگیا۔ "تم نے پھر وہی غلطی دہرائی۔ تم اچھی طرح جانتی ہو کہ میں نے تمھیں صرف تنہائی میں اور اپنے روبرو ہر طرز تخاطب کی اجازت دی ہے۔ دوسری صورتوں میں مَیں تمھارا ڈیڈ نہیں بلکہ صرف اور صرف باس ہوں۔" اس نے ویرا کی کسی بھی قسم کی مزاج پُرسی کیے بغیر جس روکھے انداز میں اسے سرزنش کی تھی، اس پر میرا دل اس کے لیے نفرت سے بھر گیا۔

"سوری باس، مجھے اعتراف ہے کہ میں طویل وقفوں کے بعد اپنے کانوں میں تمھاری آواز سنتی ہوں تو جذباتی ہوجاتی ہوں اور اپنا وعدہ بھول جاتی ہوں۔ تم نے ڈینی کے ذریعے مجھے یاد کیا تھا۔"

"تم اس وقت کہاں سے بول رہی ہو؟" جمی لائیڈ بہت چالاک اور مکّار تھا۔ اس نے اپنی اصل بات شروع کرنے سے پہلے ہی احتیاطی پیش بندیوں کا مظاہرہ کرنا شروع کردیا تھا۔

چند ثانیوں کے لیے ویرا کے چہرے پر بوکھلاہٹ کے آثار نظر آئے لیکن اس نے فوراً ہی خود کو سنبھال لیا اور جلدی سے بولی۔ "میں اس وقت ڈینی کے فلیٹ میں تنہا ہوں۔ وہ اپنی بیوی کو کھانے پر باہر لے گیا ہے۔ آج سارا دن وہ میری تلاش میں سرگرداں رہا تھا۔ تھوڑی دیر پہلے ہی وہ مجھ تک پہنچنے میں کامیاب ہوا تھا اور میں اس کے پروگرام سے واقف ہونے کے بعد اسی کے ساتھ چلی آئی۔"

"تم فون بند کردو۔ میں تمھیں رنگ کرتا ہوں۔" جمی لائیڈ نے اس کا جواب سنے بغیر ریسیور رکھ دیا۔ ویرا نے بھی ایک گہرا سانس لے کر اسپیکر فون کا بٹن آف کردیا۔

وہ خود نمبر ملا کر اس بات کی تصدیق کرنی چاہتا تھا کہ ویرا اس سے جھوٹ نہیں بولی تھی اور یہ غنیمت تھا کہ اس وقت ویرا نے جھوٹ نہیں بولا تھا۔ ورنہ وہ بری طرح پھنس سکتی تھی۔ وہ آخر اس کا خون تھی اور اس کی رگ رگ سے بخوبی واقف تھی۔ اس نے فون آف کرنے کے بعد دونوں ہاتھ جوڑ کر طمانیت کے اظہار

میں اپنی آنکھیں چھت کی طرف اٹھا کر "خدا کا شکر ہے کہ......" ہی کہا تھا کہ فون کی گھنٹی بج اٹھی اور اس نے اپنا فقرہ ادھورا چھوڑ کر ایک سیکنڈ بھی ضائع کیے بغیر اسپیکر فون دوبارہ آن کردیا۔

"گڈ، تو تم اسی کے نمبر پر ہو۔" بلا کسی تمہید کے جمی لائیڈ کی جذبات سے عاری آواز ابھری۔ "تمھیں یقین ہے کہ اس فون میں لگا ہوا کوئی بگ ہماری گفتگو ریکارڈ نہیں کررہا ہوگا؟"

"میں اتنی احمق نہیں ہوں، باس میں نے یہ اطمینان کرلینے کے بعد ہی اس اپارٹمنٹ سے تمھارا نمبر ملایا تھا۔ دراصل یہاں سے میں سکون اور آزادی کے ساتھ بات کرسکتی ہوں۔ کسی پبلک کال آفس پر میری ذات بلاوجہ ہی لوگوں کی توجہ کا نشانہ بن جاتی۔ یہ لوگ سفید فام لڑکیوں کو بہت للچائی ہوئی نظروں سے گھورتے ہیں۔"

"تم کہاں رہ رہی ہو؟ کیا وہاں فون کی سہولت نہیں ہے؟" جمی لائیڈ نے پوچھا۔

"میں نے خشک گودی میں مرمّت کے لیے کھڑے ہوئے ایک جہاز کے سیکنڈ آفیسر کے کیبن میں روپوشی اختیار کی ہوئی ہے۔ جہاز پر ریڈیو ٹرانسمیٹر موجود ہے مگر فون نہیں ہے۔"

"خیر، وہ تمھارے ذاتی معاملات ہیں۔ بس اتنا یاد رکھنا کہ ڈینی روئے زمین کے حرامی ترین آدمیوں میں سے ایک ہے۔ میں اس کی ذات میں تمھاری دلچسپی سے واقف ہوں۔ لیکن تمھیں اس سے ہوشیار رہنا چاہیے۔ وہ ضرورت پیش آنے پر اپنی عزیز ترین ہستی کو بھی اپنے ہاتھوں سے ذبح کرنے پر تل سکتا ہے۔"

"تمھارا بہت بہت شکریہ!" ویرا اپنی ایک آنکھ دبا کر بولی۔ "تم اپنے لیے کام کرنے والوں کی بہتری کا ضرورت سے زیادہ خیال رکھتے ہو۔ مجھے ڈینی سے تمھارے دو ادھورے پیغامات ملے ہیں لیکن میں یہ سمجھنے سے قاصر ہوں کہ جس معاملے میں حسّاس ترین خلائی سیاروں کے ذریعے کامیابی نہیں ہوسکی، وہاں میں کیا کرسکوں گی؟ اب تو میرے پاس نفری بھی نہیں ہے۔"

"اس کام کے لیے زیادہ بھیڑ بھاڑ کی ضرورت نہیں ہوگی۔" جمی لائیڈ نے وضاحت کی۔ "اگر تم کسی اہم فوجی افسر تک رسائی حاصل کرلو تو مطلوبہ معلومات بہت آسانی کے ساتھ حاصل ہوسکتی ہیں۔ ہم سب کو پورا یقین ہے کہ پاکستانی علاقے میں اس قافلے کی نقل و حرکت پر فوج کا سخت کنٹرول رہا ہے۔"

"ہوسکتا ہے کہ ان ٹرالروں کو جنگلات ہی میں کیموفلاج کردیا گیا ہو۔" ویرا نے خیال ظاہر کیا۔

"بہت سے امکانات ظاہر کیے جارہے ہیں لیکن اس بڑے کارواں کے ساتھ کیا ہوا ہے، اس کا صحیح اندازہ نہیں ہو رہا۔ تمھیں اس کا پتا چلانا ہوگا۔ قیاس آرائیوں سے کام نہیں چل سکے گا۔"

"ٹھیک ہے، میں فوری طور پر کوششوں کا آغاز کیے دیتی ہوں۔"

"لیکن فی الحال تمھیں یہ کام کراچی ہی میں رہ کر کرنا ہوگا کیونکہ یہاں تمھیں میرے ایک دوست کو کچھ مدد فراہم کرنی ہے۔ ہوسکتا ہے کہ وہ اب تک کراچی پہنچ چکا ہو۔ وہ جیک رونالڈو کے نام سے سفر کررہا ہے اور انٹیلی جنس بیورو کا مہمان ہے۔ تمھیں اس کی تلاش میں کوئی دشواری نہیں ہونی چاہیے۔"

جمی لائیڈ کی زبان سے جیک رونالڈو کا نام سن کر ہم سب اس بری طرح چونکے جیسے ہمارے سروں پر اچانک کوئی وزنی چیز آگری ہو۔ میری اور ویرا کی نگاہیں چار ہوئیں تو وہ بھی اس انکشاف پر ششدر نظر آرہی تھی۔

"لیکن میں اس سے کس حیثیت میں ملوں گی؟ ایسا نہ ہو کہ میں سرکاری سراغرسانوں کی نظروں میں آنے کے بعد دشواریوں سے دوچار ہوجاؤں۔" ویرا نے کمالِ ہوشیاری سے سوال کیا۔

"تمھارا سرکار یا سرکاری سراغرسانوں سے کوئی واسطہ نہیں ہوگا۔" جمی لائیڈ نے ایک ایک لفظ پر زور دے کر کہا۔ "جیک رونالڈو کوئی سرکاری افسر نہیں ہے۔ شاید تمھیں کولمبیا والا کرنل جیسی جونز یاد ہو۔ جیک رونالڈو اسی کا اکلوتا بیٹا ہے اور وہ ایک انتہائی اہم مشن پر پاکستان پہنچنے والا ہے۔ اپنی سرکاری حیثیت کی وجہ سے اسے کسی بااعتماد مددگار کی ضرورت ہوگی جو اس کے خفیہ مقاصد کے لیے کام کرسکے۔ تم اس کا سراغ لگا کر، جین واکر کے نام سے اسے فون کرکے معاملات طے کرسکتی ہو۔ جین واکر کا نام ہی تمھارا شناختی کوڈ ہوگا۔ وہ سمجھ لے گا کہ تمھارا تعلق میری ذات سے ہے۔"

"لل...... لیکن ایک زمانے میں تو ہمارے، کرنل جیسی جونز سے سخت اختلافات رہ چکے ہیں۔ اب وہ ہمارے دوستوں میں کیسے شامل ہوگیا؟" ویرا نے دبی دبی حیرت کے ساتھ پوچھا۔

"یہ سب تمھارے سوچنے کی باتیں نہیں ہیں۔" کھردری آواز میں جواب دیا گیا۔ "اختلافات اور لڑائی جھگڑے نچلی سطح پر ہوتے ہی رہتے ہیں۔ مفادات کے تصادم میں ایسا ہونا ناگزیر ہوتا ہے لیکن جیسی جونز سے ہمیشہ میری گہری دوستی رہی ہے۔ آج کل میں اس کے ساتھ خاصا وقت گزار رہا ہوں۔"

"سوری، باس! یہ تمھاری مصلحتیں ہیں جو میری سمجھ میں آہی نہیں سکتیں۔" ویرا نے فوراً ہی سنبھل کر کہا۔ "تم نے جو کچھ کہا ہے، میں اس پر فوری طور پر عمل کرنے کی کوشش کروں گی۔"

"گڈ، تم ایک اچھی اور فرمانبردار لڑکی ہو۔ اب میری ایک اور بات سنوگی؟"

"میں انکار کیسے کرسکتی ہوں؟" ویرا نے حیرت سے کہا۔ "میں تو تمھاری ادنیٰ سی کارکن ہوں۔"

"نہیں، یہ تمھارا ذاتی معاملہ ہے۔ اس میں، مَیں تمھاری مرضی کے بغیر دخیل نہیں ہوسکتا۔"

"میں سن رہی ہوں۔ یہ تمہاری مہربانی ہے کہ تم میرے ذاتی معاملات کو الگ سمجھتے ہو۔"

"بل جونز بہت اچھا لڑکا ہے۔ مزاج کی خوبی کے علاوہ' وہ جیسی جونز کے کروڑوں ڈالر کے اثاثوں کا اکلوتا وارث بھی ہے۔ وہ تمہیں ہر طرح خوش رکھ سکے گا۔ اسے اس نظر سے بھی دیکھ لینا۔ ویسے تم خود بالغ اور سمجھ دار ہو۔ اپنا اچھا برا خود جانتی ہو۔ میں اپنی رائے تم پر مسلط نہیں کروں گا۔"

"شکریہ باس' اس معاملے میں' مَیں اپنی خود مختاری پر ذرا بھی آنچ نہیں آنے دوں گی۔ بل جونز یا جیک رونالڈو کتنا ہی خوش مزاج اور مال دار کیوں نہ ہو' میں نے ملے بغیر اسے مسترد کردیا ہے۔"

"اوکے' بے بی۔" ایک سانس کے ساتھ جمی لائیڈ کی آواز ابھری۔ "تم ابھی تک ضدی اور خود سر ہو۔ میں تمہاری بہتری کے لیے دعاگو رہوں گا۔ اور ہاں' اب ذرا پاکستان میں قدم جمانے کی کوشش کرو۔ میرا خیال ہے کہ اس بار ڈینی تمہارے ساتھ بھرپور تعاون کرے گا۔"

"ایک بار میدان چھوڑ جانے والے دوبارہ مشکل ہی سے کہیں جم سکتے ہیں۔ اور ڈینی کو تو تم جانتے ہی ہو۔ شی کے مخصوص فلسفے سے واقف ہونے کے بعد ہی اس نے اپنی باغیانہ سرگرمیاں شروع کی تھیں۔"

"اس بار وھائٹ شوگر پاکستان میں نہیں پھیلائی جائے گی۔ وہاں کی مقامی منڈی میں بیس لاکھ سے زیادہ افراد اس کے طلب گار ہوچکے ہیں۔ اتنی زیادہ مقامی کھپت پیدا ہوجانے کے بعد اب پاکستان میں اس کی فاضل پیداوار برقرار نہیں رہی ہے۔ وہاں کی کمی افغان ہیروئن سے پوری کی جارہی ہے۔ دوم یہ کہ ہماری ترجیحات اب بدل چکی ہیں۔ امریکا میں ہیروئن کے عادی افراد اب تیزی کے ساتھ کوکین کی طرف راغب ہو رہے ہیں اس لیے ہماری توجہ جنوبی امریکا کی ریاستوں کی طرف مبذول ہو رہی ہے تاکہ امریکا میں کوکین کی آمد کو روکا جاسکے۔ پاکستان سے ہم سستی اور اعلیٰ درجے کی ہیروئن خرید کر یورپ' خصوصاً فرانس میں پہنچائیں گے۔ اس بارے میں ڈینی کو کوئی اعتراض نہیں ہوگا۔ اس کا یہ خیال بھی غلط ثابت ہوجائے گا کہ شی صرف رنگ دار نسلوں کے خلاف کام کرتی ہے۔ یورپ اور فرانس کے سفید فام نوجوانوں کے لیے ہیروئن کا نعرواس کے لیے دلکش ثابت ہوگا۔"

"مگر کیوں؟" ویرا اپنی حیرت کو نہ دبا سکی۔ "کچھ عرصے قبل ہم یورپ کو اس وبا سے بچانے کے لیے مرے جارہے تھے اور آج ہم خود یہ زہر وہاں پھیلائیں گے۔ آخر اس کی کوئی وجہ بھی تو ہوگی۔"

اسپیکر فون پر جمی لائیڈ کی بے رحمانہ ہنسی کی آواز ابھری پھر وہ سرد آواز میں بولا۔ "تم ایک مرتبہ پھر جذباتی ہو رہی ہو۔ ویسے تمہاری ننھی سی کھوپڑی کے لیے صرف اتنا جان لینا کافی ہے کہ ایسے فیصلے بدلتے ہوئے عالمی حالات اور مفادات کے تابع ہوتے ہیں۔ شاید یہ یورپی مشترکہ منڈی قائم کرنے کی مہم کا شاخسانہ ہے' یہ میرا اندازہ ہے۔ تم جانتی ہو کہ مجھے پالیسی کہاں سے ملتی ہے' میں اسے پوری قوت سے نافذ کرنے کا پابند ہوتا ہوں۔ مجھے جلد نئی پالیسی آنے کی توقع ہے اس لیے تم ابھی سے تیاری شروع کردو۔ پاکستان کے مخصوص حالات کی وجہ سے ہمیں وہاں سے سستے داموں میں ہمیشہ بہترین مال ملتا رہا ہے۔"

"کہیں ایسا تو نہیں کہ جنوبی امریکا سے کوکین کی اسمگلنگ روکنے ہی کے چکر میں کرنل جیسی جونز سے مراسم بڑھائے جارہے ہوں۔" ویرا نے ایک دم چونک کر سوال کیا۔

"تم بہت چالاک اور شاطر ہو۔ مجھے امید تھی کہ تم بات کی تہ تک پہنچ جاؤ گی۔ جو کام دوستی اور نرم روی سے نکل سکتا ہو' اس کے لیے طاقت اور سرمائے کا استعمال حماقت کہلاتا ہے۔"

"ٹھیک ہے۔" ویرا تھکی ہوئی آواز میں بولی۔ "میں ڈینی کو راہِ راست پر لانے کی کوشش کروں گی۔"

"تم جہاں بھی رہو' مجھے اپنے رابطے سے باخبر رکھو تاکہ ضرورت پیش آنے پر میں تم سے بات کرسکوں۔"

"فی الحال میں اسی بحری جہاز پر رہوں گی جہاں رابطے کا کوئی ذریعہ نہیں ہے۔ تم چاہو تو ڈینی کی معرفت مجھے پیغام دے سکتے ہو۔ تم سے مصالحت ہوجانے پر وہ خاصا مطمئن نظر آرہا ہے۔"

"تم ڈینی کے پاس ہی کیوں نہیں رک جاتیں؟" جمی لائیڈ نے پوچھا۔

"اس کی بیوی میری موجودگی پسند نہیں کرتی۔" ویرا نے غزالہ کو آنکھ مار کر کہا۔

"کوانگ فو بتا رہا تھا کہ وہ عورت نہایت آسانی کے ساتھ موت کے گھاٹ اتاری جاسکتی تھی۔ اگر تم اس سے براہِ راست بات نہ کرتیں تو اس کی بازیابی ناممکن ہو کر رہ جاتی۔"

"ڈینی کی خوشنودی کے لیے مجھے بعض کام اپنی مرضی کے خلاف بھی کرنے پڑتے ہیں۔" ویرا زیرِ لب مسکراہٹ کے ساتھ بولی۔ "ورنہ اب تک میرے اور اس کے درمیان دوبارہ ٹھن چکی ہوتی۔"

"بیم گن اور سلور آئی کے معاملے میں وہ ابھی تک انکار پر اڑا ہوا ہے۔ اُس سے ان دونوں چیزوں کا واپس لیا جانا بہت اہم ہے کیونکہ ہمارے لیے انہیں ترک کرنا آسان نہیں ہے۔"

"میرا خیال ہے کہ ہم اس معاملے کو غیر ضروری اہمیت دے رہے ہیں اور ڈینی ہماری کمزوری سے فائدہ اٹھا رہا ہے۔ ہو سکتا ہے کہ وہ خود بھی ان دونوں چیزوں سے محروم ہوچکا ہو اور ہماری نظروں میں اپنی اہمیت برقرار رکھنے کے لیے اس حقیقت کا اعتراف نہ کررہا ہو۔"

"اگر میں نے اس کے ساتھ مصالحانہ رویّہ اختیار کیا ہے تو جواب میں اسے بھی کھلے دل سے ہر بات بیان کردینی چاہیے' ہوسکتا ہے کہ کسی وقت وہ باقاعدہ طور پر سلور آئی کا حق دار بھی بن جائے۔"

"میں مناسب موقع دیکھ کر اُس سے بات کروں گی۔ شاید یہ مسئلہ بھی حل ہوہی جائے۔"

"یہ یاد رکھنا کہ میں آج شام سات بجے کے بعد لاس اینجلس چھوڑ دوں گا......"

"پھر میں رپورٹ کس طرح دے سکوں گی؟" ویرا نے اس کی بات کاٹ کر پوچھا۔

"بل جونز یا آدمیوں کو جمع کرنے کے بارے میں کسی رپورٹ کی ضرورت نہیں۔ حالات کے مطابق تم خود فیصلے کرسکتی ہو۔ بلیو کراس ڈیل والی گاڑیوں کے بارے میں' میں خود دو تین دن میں رابطہ کرلوں گا۔"

دوسری طرف سے فون بند کردیا گیا۔ ویرا نے بٹن آف کرکے کرسی کی پشت گاہ سے ٹیک لگا کر اس طرح آنکھیں موندلیں جیسے وہ کافی دیر سے شدید ذہنی مشقت کرتی رہی ہو۔

جمی لائیڈ سے ہونے والی تازہ ترین گفتگو نے سارے معاملات کو ایک ہی دھارے میں شامل کرکے بہت سی الجھنیں دور کردی تھیں جن میں جیک رونالڈو اور پال ایتھرٹن کی اصلیت کا معاملہ بھی شامل تھا۔

مجھے یہ جان کر مایوسی ہوئی تھی کہ ان دونوں میں سے کوئی بھی جیسی جونز نہیں تھا۔ وہ بین الاقوامی سطح کا ایک بدنام دہشت گرد اور گروہ بند تھا۔ اس سے مقابلہ ہمارے لیے خاصا دلچسپ اور سنسنی خیز ثابت ہوسکتا تھا لیکن یہ ایک عام اصول تھا کہ اس سطح کے بڑے مجرم عام طور پر بھرپور حفاظتی انتظامات اور جاں نثاروں کے حصار کے بغیر خطرات میں چھلانگ لگانے سے گریز کرتے ہیں اور خود پسِ پردہ رہ کر اپنی کٹھ پتلیوں کے ذریعے اپنے مقاصد حاصل کرتے رہتے ہیں۔ کرنل جیسی جونز نے بھی پہلے البرٹو یلیسا کو پاکستان بھیج کر کہوٹہ کے خلاف ان طویل المدت سازشوں کا آغاز کیا جو ڈیوڈ اسٹارز جیسی نسل پرست یہودی جماعت کی خواہشات پر مبنی تھیں اور مسائل کے نئے سلسلے کی ابتدا ہوتے ہی اپنے بیٹے' بل جونز کو خطرات کے جہنم میں دھکیل دیا تھا۔ بل جونز یا جیک رونالڈو کو پاکستان میں تبدیل شدہ حالات اور ان میں مضمر خطرات کی گہرائی کا کوئی ادراک نہیں تھا۔ وہ سمجھ رہا تھا کہ البرٹو یلیسا زندہ مگر روپوش تھا اور وہ البرٹو کی مدد سے حالات کو سنبھالنے میں کامیاب ہوجائے گا لیکن بدقسمتی اس نوجوان کی گھات میں تھی۔ وہ اپنے باپ کے پیشے میں گہری دلچسپی لینے کے ساتھ ساتھ' ڈلاس کے اسلحہ سازی کے ایک نجی کارخانے میں پیشہ ور ماہر کے طور پر کام کررہا تھا۔ اسے یقین تھا کہ وہ جس سرکاری حیثیت میں پاکستان آیا تھا' اس کے پیشِ نظر اسے کوئی بڑا خطرہ درپیش نہیں تھا لیکن جمی لائیڈ نے اسے نہایت آسانی کے ساتھ بے نقاب کردیا تھا۔ میرا خیال تھا کہ میں بل جونز کا سر کچل کر' کرنل جیسی جونز کو گہرا چرکا لگا سکتا تھا۔ میرا اصل نشانہ سانپ تھا لیکن سپنولیا خود ہی میری زد پر آگیا تھا تو اسے معاف کرنا کسی گھناؤنے جرم سے کم نہ ہوتا۔

ہیروئن کی غیر قانونی تجارت میں ملوث' شی کے طفیل' میں مجرم گروہوں اور عالمی طاقتوں کے قریبی گٹھ جوڑ کے بہت سے اسرار و رموز سے آگاہ ہوچکا تھا۔ عالمی امن اور آشتی کا پرچار کرتے ہوئے نہ تھکنے والے لوگوں کی اصل قوت ان بڑے مجرموں اور دہشت گردوں میں پوشیدہ تھی جو سیاست اور معاشرت کے ہر شعبے میں اس حد تک دخیل تھے کہ ان کی مرضی کے خلاف کچھ بھی نہیں ہوسکتا تھا۔ ایک طرف ہیری کیسنجر اور شرمان سنگھ کا سیاسی گٹھ جوڑ تھا تو دوسری طرف جمی لائیڈ اور کرنل جیسی جونز جیسے رسوائے زمانہ مجرم ہمارے خلاف شانہ بہ شانہ صف آرا نظر آرہے تھے۔ قانونی اور غیر قانونی ذرائع سے ان سب کی ایک ہی کوشش تھی کہ بلیک کیٹس اور ڈیوڈ اسٹارز کے مذموم عزائم کو پورا کرتے ہوئے' اس ملک کو بالکل مفلوج اور ناکارہ کردیا جائے تاکہ اس خطے میں طاقت اور توازن کا دوسرا پلڑا زمین سے اٹھنے سے پہلے' ہمیشہ کے لیے پیوندِ خاک ہوجائے۔

پہلے میرا ارادہ تھا کہ میں گمنام نقاب پوش کا روپ دھار کر جیک رونالڈو کو خوف زدہ کرکے' اس کی اصلیت اگلوانے کی کوشش کروں لیکن جمی لائیڈ کے ذریعے اس کا اصل نام معلوم ہونے کے بعد میں نے اپنا وہ منصوبہ یکسر تبدیل کرنے کا فیصلہ کرلیا تھا۔

میرے حق میں ایک بات یہ بھی جاتی تھی کہ ائرپورٹ پر جے جے والے بلے کارڈ کی وجہ سے بل جونز کا ساتھی، پال ایتھرٹن نہ صرف میری طرف متوجہ ہوا تھا بلکہ اس نے میرے قریب آکر مجھے پھٹکارنے کی کوشش بھی کی تھی۔ اس نے مجھ سے جو کچھ کہا، اس سے ظاہر ہوتا تھا کہ ائرپورٹ پر مجھے البرٹو ویلیسا کا فرستادہ سمجھا گیا تھا۔ البرٹو ویلیسا جہنم واصل ہوجانے کی وجہ سے اس پوزیشن میں نہیں تھا کہ ان دونوں کی غلط فہمی رفع کرسکے، اس لیے میں اپنے اسی ابتدائی تعارف کے ذریعے بہ آسانی ان دونوں تک رسائی حاصل کرسکتا تھا۔ کم از کم پال ایتھرٹن مجھے صورت سے پہچانتا تھا اس لیے مجھے کسی نقاب وغیرہ کے استعمال کی سرے سے ضرورت ہی نہیں تھی۔

میں نقاب لگا کر یا کوئی اور روپ بدل کر ان دونوں کے سامنے پہنچتا تو وہ لازمی طور پر مجھے اپنا حریف یا دشمن تصور کرتے ہوئے ہر قسم کی مزاحمت پر تل جاتے اور مجھے ابتدا ہی سے انہیں طاقت کے بل پر اپنے قابو میں رکھنا پڑتا جبکہ اصل روپ میں ان کا سامنا کرتے ہوئے مجھے کسی بھی ذہنی یا جسمانی مزاحمت کا سامنا نہیں کرنا پڑتا اور وہ مجھے اندر کا آدمی سمجھتے ہوئے، مجھ سے رازدارانہ گفتگو بھی کرسکتے تھے جو اُن کے پوشیدہ عزائم کو پوری طرح سامنے لاسکتی تھی۔

اس مشن کے لیے مجھے کسی کی مدد کی ضرورت نہیں تھی لیکن پھر بھی سلطان شاہ کو اپنے ساتھ لینے میں کوئی ہرج نہیں تھا۔ میرے ڈرائیور کی حیثیت سے وہ ریسٹ ہاؤس سے باہر رہ کر صورتِ حال پر نظر رکھنے کا فرض انجام دے سکتا تھا۔

بیم گن میرے لیے ہر نازک موقع پر ایک موثر ہتھیار ثابت ہوتی رہی تھی۔ اس لیے اُسے چھوڑنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ اس کے علاوہ ہم دونوں نے بھرے ہوئے پستول ساتھ لیے اور نو بجے گھر سے روانہ ہوگئے۔

"اگر اندر کوئی گڑبڑ ہو تو مجھے کیا کرنا ہوگا؟" راستے میں سلطان شاہ نے پوچھا۔

"ہم نے ہتھیار محض احتیاط کے طور پر اپنے ساتھ لیے ہیں۔ ورنہ مجھے وہاں کوئی گڑبڑ ہونے کا اندیشہ نہیں ہے۔ اگر کچھ ہو ہی جاتا ہے تو تم دودھ پیتے بچے نہیں ہو۔ اپنی صوابدید کے مطابق کوئی بھی قدم اٹھا سکتے ہو۔"

"اور مجھے ابتدا میں ہی گڑبڑ ہونے کا خطرہ ہے۔" سلطان شاہ فکر مندانہ لہجے میں بولا۔ "ائرپورٹ پر ان دونوں کے لیے جو حفاظتی انتظامات کیے گئے تھے ان کی روشنی میں ریسٹ ہاؤس پر بھی مسلح لاؤ لشکر کی موجودگی کا امکان نظر آتا ہے۔ ہوسکتا ہے کہ تمہیں تلاشی دیے بغیر اندر جانے کی اجازت نہ ملے۔"

سلطان شاہ کی بات میں وزن تھا۔ تلاشی کے مرحلے پر میری تحویل سے بیم گن جیسے جدید ترین اور نامانوس ہتھیار کا برآمد ہونا خطرناک ہوسکتا تھا۔ میں اس سے ہمیشہ کے لیے محروم بھی ہوسکتا تھا۔ بات اگر صرف پستول تک محدود رہتی تو بل جونز سے مذاکرات کے بعد واپسی پر، اس کی مداخلت..... پر وہ واپس مل سکتا تھا۔ بل جونز خود سمجھ سکتا تھا کہ اس کے کسی آدمی کا ہر وقت مسلح رہنا کتنا ضروری ہوتا ہے۔

میں نے اپنی جیب سے بیم گن نکال کر سلطان شاہ کے حوالے کردی۔ "بعض اوقات تم بہت دور کی بات سوچ لیتے ہو۔ بیم گن کا نہ لے جانا ہی میرے حق میں بہتر رہے گا۔"

اُن دنوں شہر کے حالات سازگار نہیں تھے۔ معلوم ہوتا تھا کہ شہر میں چوروں، ڈاکوؤں اور دہشت گردوں کی بن آئی ہے۔ روز متعدد گاڑیاں اسلحے کے بل پر چھینی جارہی تھیں۔ سورج ڈھلتے ہی شہر کے گنجان آباد علاقوں میں نامعلوم دہشت گردوں کی اچانک اور اندھا دھند فائرنگ کا سلسلہ شروع ہوجاتا تھا جس میں ایک آدھ ہلاکت کے ساتھ متعدد بے گناہ شہریوں کا زخمی ہونا معمول بن گیا تھا۔ متمول آبادیوں میں ڈاکے پڑنے کے وقت کی کوئی تخصیص نہیں رہی تھی۔ شہریوں کو کوئی اندازہ نہیں ہوتا تھا کہ گھنٹی کی آواز پر وہ اپنا دروازہ کھولیں گے تو کوئی شناسا چہرہ نظر آئے گا یا بھیانک ہتھیاروں سے لیس ڈاکو، انہیں بے بس کرکے اندر گھس آئیں گے۔ ان واقعات کے سدِباب کے لیے شہر میں جا بجا پولیس کی چوکیاں قائم کردی گئی تھیں جہاں مشتبہ گاڑیوں وغیرہ کو روک کر ان کی تلاشی لی جاتی تھی ان وارداتوں کا تسلسل ٹوٹنے کی کوئی صورت نظر نہیں آرہی تھی۔ ان اقدامات کا ایک یہ نتیجہ ضرور برآمد ہوا تھا کہ شہر سرِشام ہی ویران ہوجاتا تھا اور رات رات بھر کھلے رہنے والے، خورد و نوش کے مراکز پر خریداروں کے ہجوم سرے سے غائب ہوگئے تھے۔

سڑکوں پر ٹریفک کی کمی کی وجہ سے سلطان شاہ خاصی تیز رفتاری کے ساتھ ڈرائیونگ کررہا تھا۔ مجھے یہ خوف بھی لاحق ہوگیا تھا کہ کسی عارضی چوکی پر ہمیں روک لیا گیا تو غیر قانونی پستولوں کی وجہ سے ہماری گلو خلاصی مشکل ہوجائے گی لیکن اس دن ہمارے ستارے یاور تھے یا پولیس اہل کار بے گناہ اور امن پسند شہریوں پر زیادہ توجہ دے رہے تھے کہ ہمیں کہیں بھی نہیں روکا گیا اور ہم حبیب بینک کے مشہور چوراہے سے گزر کر سائٹ کے صنعتی علاقے میں داخل ہوگئے۔

سائٹ کا وہ ریسٹ ہاؤس خاصے کشادہ رقبے پر موجود ایک منزلہ عمارت پر مشتمل تھا۔ ہیڈ لیمپس کی تیز روشنی اور پھر ہارن کے جواب میں پھاٹک کے اوپر ایک چہرہ نمودار ہوا اور ہم سے کوئی پیشگی استفسار کیے بغیر پھاٹک کھول دیا گیا۔ البتہ اندر داخل ہونے کے بعد دوسرے آدمی نے ہاتھ کے اشارے سے ہماری کار رکوا لی۔

بادی النظر میں ہی وہ دونوں سادہ لباس والے مسلح نظر آرہے تھے۔ لیکن ان دونوں کے علاوہ احاطے میں دور دور تک کسی متنفس کا وجود نظر نہیں آرہا تھا۔

میرے کار روکنے والے کے استفسار پر سلطان شاہ نے جیک رونالڈو کا نام لیا تو اسے گاڑی آگے بڑھا لے جانے کی اجازت مل گئی۔ سلطان شاہ نے عمارت کے برآمدے کی ایک دیوار کے قریب کار پارک کردی۔ اسی اثنا میں ریسٹ ہاؤس کا ایک خادم باہر آچکا تھا۔ اس نے مجھے اپنے ساتھ لے جاکر ایک کشادہ اور آراستہ ڈرائنگ روم میں بٹھا دیا اور خود میرا نام دریافت کرکے دوبارہ باہر چلا گیا۔ میں نے جیک رونالڈو کے ملاقاتی کی حیثیت سے اپنا نام شہزادہ بتایا تھا۔

اس ریسٹ ہاؤس کی عمارت برسوں پرانی معلوم ہورہی تھی لیکن مجھے حیرت تھی کہ اس کا وسیع و عریض خالی رقبہ، اس شہر کی طرح شجرکاری سے یکسر محروم تھا۔ اگر ریسٹ ہاؤس کی عمارت بننے کے ساتھ ہی وہاں کچھ پودے لگا دیے جاتے تو ہر طرف خوشگوار سائے کے ساتھ ہی بہتر ماحول بھی میسر آسکتا تھا۔

چند منٹ بعد برآمدے میں کئی بھاری قدموں کی چاپ سنائی دی اور پھر وہ دونوں ہی آگے پیچھے، اس کمرے میں آگئے۔ ان کے جسموں پر نئی شرٹ اور نیکر نظر آرہے تھے۔ مجھ سے ملنے کے لیے انہوں نے لباس کی تبدیلی کی کوئی ضرورت محسوس نہیں کی تھی۔ بل جونز کی آنکھوں میں موجود چمک سے ظاہر ہورہا تھا کہ وہ شراب پیے ہوئے تھا۔

"تو یہ تم ہو!" دراز قامت بل جونز نے مجھ سے ہاتھ ملائے بغیر ایک کرسی میں ڈھیر ہوتے ہوئے کہا۔ "تمہیں کس نے ائرپورٹ بھیجا تھا؟" وہ بہت صاف ستھری انگریزی بولنے پر قادر تھا۔

"ظفر نے!" میں نے البرٹو ویلیسا کا اصل نام لینے سے گریز کرتے ہوئے کہا۔

"تم نے وہاں بلے کارڈ بلند کرکے ایسی حماقت کی تھی جو ہمارے لیے عذاب بھی بن سکتی تھی۔" اس بار پال ایتھرٹن نے قدرے غصے کے ساتھ کہا۔ "وہ مشورہ کس بے وقوف کا تھا؟"

میرا ارادہ معذرت خواہانہ رویّہ اختیار کرنے کا تھا لیکن اس کے بے تکے سوال پر میں اپنے اضطراری جواب کو تبدیل نہیں کرسکا۔ میں نے سادگی سے کہہ دیا۔ "ظفر نے۔ میں تم دونوں میں سے کسی کو نہیں پہچانتا تھا اس لیے بلے کارڈ کے علاوہ باہمی شناخت کی کوئی اور صورت نہیں تھی۔"

پال ایتھرٹن بوکھلا کر اپنی بغلیں جھانکنے لگا۔ شاید البرٹو ویلیسا اس گروہ میں اُس سے بلند درجہ رکھتا تھا۔

"ظفر خود کہاں ہے؟ کیا اسے میرا پیغام نہیں ملا تھا؟" بل جونز نے میری توجہ اپنی طرف مبذول کرالی۔

"اسے پیغام مل گیا تھا لیکن وہ نہایت نامساعد حالات میں روپوش ہے۔ وہ اسلام آباد سے اپنی کمین گاہ سے نکلتے ہی پکڑ لیا جائے گا۔ اسی لیے اُس نے مجھے کراچی روانہ کردیا تھا۔ موقع ملتے ہی وہ خود بھی کراچی پہنچنے کی کوشش کرے گا۔ ایک تباہ کن آتش زدگی میں اپنی موت کا ڈراما رچا کر وہ بری طرح پھنس گیا ہے۔ دوسرے لوگوں سے اس کا رابطہ بالکل ٹوٹا ہوا ہے۔"

"میری سمجھ میں نہیں آتا کہ میں تم سے کس حد تک بات کرسکتا ہوں۔" بل جونز الجھن آمیز نگاہوں سے میری طرف دیکھتے ہوئے بولا۔ "میں زیادہ دنوں تک ظفر کی آمد کا انتظار نہیں کرسکوں گا۔"

"تم مجھ سے ہر بات کرسکتے ہو۔ ظفر کے تربیت دیے ہوئے بندروں کو میں ہی کہوٹہ کی وادی میں چھوڑ کر آتا تھا۔ مجھے اس سے اپنی خدمات کا بہت معقول معاوضہ ملتا ہے جس نے مجھے اس کا گرویدہ بنایا ہوا ہے۔" میں نے اِدھر اُدھر دیکھتے ہوئے رازدارانہ لہجے میں کہا۔ "تمہاری کہی ہوئی ہر بات میرے سینے میں دفن رہے گی۔ ظفر کے علاوہ کسی اور کو اس کی بھنک بھی نہیں مل سکے گی۔"

"تم ایک معتبر ساتھی اور قابلِ اعتماد پیغام رساں تو ثابت ہوسکتے ہو لیکن یہاں کے حالات پر تم کوئی صائب مشورہ نہیں دے سکتے۔ یہ کام ظفر ہی کرسکتا ہے۔" بل جونز بدستور پریشان نظر آرہا تھا۔ "اگر میں تم سے یہ سوال کروں کہ کہوٹہ کی ایٹمی تنصیبات کی تباہی کی سب سے موثر صورت کیا ہوسکتی ہے اور اس پر کیسے عمل کیا جاسکتا ہے تو تمہارا جواب کیا ہوگا؟"

"سچ بات یہ ہے کہ میں نے اس بات پر کبھی غور ہی نہیں کیا۔" میں نے اس بے ہودہ سوال پر کسی جذباتی ردِعمل کا مظاہرہ کیے بغیر، ٹھنڈے ماتھے کے ساتھ جواب دیا۔

"پھر تم اب تک ظفر کے ساتھ کیا کرتے رہے ہو؟" اس نے چبھتے ہوئے لہجے میں پوچھا۔ اس کی بدن میں اتر جانے والی تیز نگاہیں مسلسل میرے چہرے پر مرکوز تھیں۔

"میرا اندازہ تھا کہ ہم کہوٹہ کے قیمتی راز حاصل کرنے میں دلچسپی رکھتے ہیں۔ ظفر نے مجھ سے کبھی کوئی ایسی بات نہیں کی جس سے یہ ظاہر ہوتا ہو کہ وہ کہوٹہ کو کھنڈر بنا دینا چاہتا ہے۔"

"بس، تم میں اور اُس میں یہی فرق ہے کہ اس کی پوری سوچ تم تک منتقل نہیں ہوسکی......"

"لیکن ایسے کسی منصوبے پر کام کیا جاسکتا ہے۔" میں نے اس کی بات کاٹ کر نرمی سے کہا۔

بل جونز نے ایک جھٹکے کے ساتھ اپنی جگہ چھوڑ دی۔ پال ایتھرٹن بھی چونک کر کرسی سے اٹھ کھڑا ہوا۔ "میرے ساتھ آؤ۔" بل جونز نے دروازے کی طرف مڑتے ہوئے کہا۔ "ایسی گفتگو کے لیے یہ کمرا مناسب نہیں ہے۔ ہماری آواز راہداری میں بھی سنی جاسکتی ہے۔"

وہ دونوں برآمدے میں سے دوبارہ گزر کر ایک راہداری میں مڑے پھر ایک بند دروازہ کھول کر ایک بہت بڑی خواب گاہ میں

داخل ہوگئے۔ جسے ائرکنڈیشنر نے کافی ٹھنڈا کیا ہوا تھا۔ دو ڈبل بستروں والی اس خواب گاہ میں الکحل کی تیز بو رچی ہوئی تھی۔ میری متجسس نگاہوں نے فوراً ہی ایک گوشے میں پڑی ہوئی گول میز پر بلیک لیبل اسکاچ کی بڑی بوتل دیکھ لی۔ اس میز کے گرد بید کی کئی آرام دہ کرسیاں پڑی ہوئی تھیں۔ بل جونز کی رہنمائی میں ہم لوگ ان ہی کرسیوں پر براجمان ہورہے تھے کہ پال ایتھرٹن نے اچانک اپنی جیب سے شکاری چاقو نکال کر، کھٹکے کے ساتھ اس کا چمک دار پھل کھول کر میری طرف تان لیا۔

"اپنے ہاتھ اوپر اٹھالو۔" وہ میرے اوپر غرایا پھر بل جونز کی طرف متوجہ ہوکر بولا۔ "اس کی جیب میں پستول موجود ہے۔ اس کے ارادے خطرناک معلوم ہوتے ہیں۔"

"ہمارا پیشہ ہی ایسا ہے کہ ہم ہروقت مسلح رہنے پر مجبور ہیں۔" میں نے اس کی ہدایت پر اپنے دونوں ہاتھ اوپر اٹھالیے تھے۔ "میرے پستول سے تمہیں کوئی خطرہ نہیں ہے۔ تم چاہو تو اسے نکال بھی سکتے ہو۔"

بل جونز نے میری جیب سے پستول نکال کر اس کا جائزہ لیا پھر اسے اپنی گود میں لے کر بیٹھ گیا۔ پال ایتھرٹن نے چاقو بند کرکے دوبارہ نیکر کی جیب میں ڈالا اور اپنا گلاس لے کر کرسی پر بیٹھ گیا۔

"تم بھی بیٹھ جاؤ۔" بل جونز نے نرمی کے ساتھ کہا اور میں اپنے ہاتھ گرا کر ایک خالی کرسی پر بیٹھ گیا۔ بل کہہ رہا تھا۔ "پال کا قصور نہیں ہے۔ تم نے ائرپورٹ پر دیکھا ہوگا کہ ہماری حفاظت کے لیے پورا لشکر موجود تھا۔ بعض افسران اپنے سرکاری اختیار اور دبدبے کی بے جا نمائش کو شان تصور کرتے ہیں۔ ان انتظامات نے ہم دونوں کو ابھی تک پراگندہ کیا ہوا ہے۔ ہمارا استقبال کرنے والوں نے بلاوجہ ہمیں خوفزدہ کردیا تھا گویا یہاں ہر شخص ہماری گھات میں لگا ہوا ہے۔ ریسٹ ہاؤس میں بھی ان کی بھیڑ لگ گئی تھی لیکن میں نے اپنے سکون کی خاطر ان سب کو رخصت کردیا۔ اب یہاں صرف دو گارڈ رہ گئے ہیں۔ پال کی حرکت کا برا نہ ماننا۔"

"احتیاط اچھی چیز ہے۔" میں نے روکھے لہجے میں کہا۔ "تم دونوں ویسے بھی میرے بڑے ہو۔"

بل جونز واقعی شائستہ مزاج آدمی تھا۔ اس نے میرے لیے ایک خالی گلاس میں اسکاچ انڈیل کر میری طرف بڑھا دی۔ "یہ پیو۔ اس سے تمہارا موڈ دوبارہ بحال ہوجائے گا۔"

میں نے اس کا شکریہ ادا کرکے گلاس میں برف اور سوڈا ملا کر دو گھونٹ لیے پھر کہا۔ "ظفر نے جو بات مجھ سے کی ہی نہ ہو، اس کے بارے میں مجھے کچھ سوچنے سمجھنے کی ضرورت ہی نہیں تھی۔ یہ بتاؤ کہ اب تمہارا منصوبہ کیا ہے۔ میں اس پر عمل درآمد کی کوئی نہ کوئی راہ نکالنے کی کوشش کروں گا۔"

"ہماری معلومات کے مطابق ان ایٹمی تنصیبات میں تو کیا، اس وادی میں بھی کسی اجنبی یا مشتبہ آدمی کا داخلہ ناممکن ہے۔" بل میرے پستول سے کھیلتے ہوئے کہنے لگا۔ "البتہ جانوروں کے بارے میں وہ بے بس ہیں۔ ہوسکتا ہے کہ وہاں سے بھیانک بندروں کے پکڑے جانے کے بعد اس بارے میں بھی چھان بین ہونے ہو۔ ہم کہوٹہ میں جانوروں کے ذریعے مکمل تباہی لانا چاہتے ہیں۔"

"پہلی بات تو یہ ہے کہ کہوٹہ میں کوئی ری ایکٹر یا ایٹمی تعمیر نہیں ہے۔" میں نے اس وقت تک خود بھی کہوٹہ میں قدم نہیں رکھا تھا لیکن ان دونوں کو مرعوب کرنے کے لیے میری وہ پُراعتماد تقریر ضروری تھی۔ "وہاں ایک بڑے رقبے پر ریسرچ لیبارٹری ضرور ہے جہاں ایٹمی ری ایکٹر سے آنے والی یورینیم کو افزودہ کیا جاتا ہے۔ اور اس عمارت کے گرد برقی باڑھ اور مضبوط دیواروں سمیت ہر قسم کا حفاظتی نظام موجود ہے۔ اس لیے وہاں کسی انسانی رسائی کا امکان، نہ ہونے کے برابر ہے۔ البتہ زقندیں لگانے والے بندروں کی بات اور تھی۔ ہوسکتا ہے کہ حفاظتی عملہ بھی انہیں بے ضرر سمجھ کر نظرانداز کردیتا ہو......"

پال ایتھرٹن نے میری بات کاٹ کر اچانک ہی ایک نیا سوال چھیڑ دیا۔ "بندروں والے کیمروں کے ذریعے حاصل ہونے والی تصاویر کہاں ہیں؟ انہیں دیکھ کر اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ بندر کہاں تک پہنچنے میں کامیاب رہتے ہوں گے۔ وہ تصویریں ہمارے ٹارگٹ کو آسان بناسکتی ہیں۔"

"مجھے ان کے بارے میں کوئی علم نہیں۔" میں نے مایوسی سے کہا۔ "یہ سب ظفر ہی بتاسکے گا۔"

چند ثانیوں کے لیے اس کمرے میں سکوت چھا گیا۔ تینوں اپنے اپنے گلاسوں سے چسکیاں لینے میں مصروف ہوگئے۔ آخر بل جونز ہی نے معنی خیز ہنکار کے ساتھ اس بوجھل سکوت کو ختم کیا۔ "پرندوں کے ذریعے نازل ہونے والی کسی ناگہانی تباہی کے بارے میں تمہاری کیا رائے ہے؟"

بل جونز کے اس سوال پر پال ایتھرٹن بے چینی کے ساتھ اپنی کرسی میں کسمسا کر رہ گیا جیسے اسے بل کی زبان سے وہ تذکرہ پسند نہ آیا ہو لیکن وہ اسے روکنے کی ہمت نہیں کرسکا۔

پرندوں کے ذریعے تباہی کے ذکر پر مجھے بے اختیار ابرہہ کے لشکر پر ابابیلوں کے کنکر برسانے کا واقعہ یاد آگیا۔ میں نے کہا۔ "یہ بھی ممکن ہے لیکن اس کے ذریعے محدود تباہی سے زیادہ کچھ نہیں ہوسکتا۔ پرندوں کی پرواز اور ان پر کنٹرول کے معاملات اتنی آسانی سے قابو میں آنے والے نہیں ہیں۔"

"مجھے صرف کہوٹہ میں واقع ان عمارات کی تفصیلی سروے پوزیشن درکار ہے۔ باقی کام حیرت ناک حد تک آسان ثابت ہوگا۔ ہوا کے رخ پر واقع کسی بھی معینہ مقام سے ان عمارت کے فاصلے کا تعین ہونا بہت ضروری ہے۔ اس کے بعد جو کچھ ہوگا وہ اپنی نوعیت کا یادگار واقعہ ہوگا۔"

"سروے رپورٹ حاصل کرنی بہت دشوار ہوگی۔ اتنی درد سری مول لینے سے بہتر ہوگا کہ کوئی گمنام فضائی طیارہ ہی حاصل کرلیا جائے تاکہ تم اپنا اصل مقصد حاصل کرسکو۔" میں نے اسے مزید ٹٹولنے کی نیت سے، دھڑکتے ہوئے دل کے ساتھ وہ تجویز پیش کی۔

"سب یہی کہتے ہیں۔" وہ اپنا گلاس میز کی چوبی سطح پر پٹختے ہوئے بولا۔ "لیکن یہ عملاً ممکن نہیں ہے۔ ہر بمبار طیارے کی ایک رینج ہوتی ہے۔ کہوٹہ سے اس رینج میں ہمیں کوئی ہوائی اڈا میسر نہیں ہے۔ ایسی کارروائی کسی بھی صورت میں راز میں نہیں رہ سکتی۔ منصوبہ بنانے والوں کی شناخت کے بدترین سیاسی اثرات ہوں گے جن کی ذمے داری لینے سے ہر ایک بچتا ہے۔ لمبی رینج کے بمبار طیارے گنے چنے ملکوں کے پاس ہیں۔ ان کی ساخت دور ہی سے پہچانی جاتی ہے۔ پاکستان کے کچھ دوست ممالک ایسے ہیں جن کی ناراضگی کوئی مول نہیں لے گا۔ ان کے دباؤ کی وجہ سے فوجی کارروائی ناممکن ہے۔"

"پھر پرندوں والا معاملہ میری سمجھ سے باہر ہے۔" میں نے ہاتھ اٹھاتے ہوئے کہا۔

"بہت آسان ہے۔ تمہارے ملک میں ابابیلوں کی ایک قسم ایسی ہے جو صرف اور صرف ہوا کی مخالف سمت میں اڑتی ہے۔ ان ابابیلوں کے معدوں میں نہایت سریع الاثر زہر کے کیپسول اتار دیے جائیں گے۔ ان کیپسولوں کا جلاٹین بہت ناپ تول کے ساتھ اتنا نازک رکھا جائے گا کہ وہ ایک معینہ مدت کے بعد تحلیل ہوجائے۔ کیپسول گھلتے ہی پرندے مر کر پٹ پٹ نیچے گر جائیں گے۔ ان کے پیروں میں ہلکے لیکن نہایت تباہ کن بم بندھے ہوئے ہوں گے جو زمین سے ٹکراتے ہی ہولناک تباہی پھیلا دیں گے۔ وقت کے تعین کے لیے یہ جاننا ضروری ہے کہ کہوٹہ سے ہوا کے رخ پر واقع کسی بھی غیر ممنوعہ مقام سے ان عمارات کا فاصلہ کتنا ہے اور ابابیلیں وہ فاصلہ طے کرنے میں کتنا وقت لیں گی؟ یہ اعداد و شمار کیپسولوں کے جلاٹین کی موٹائی طے کریں گے۔ اس پورے کھیل میں ذرا سی بھی غلطی ہوئی تو تباہی اصل نشانے سے پہلے یا آگے بھی نازل ہوسکتی ہے۔" بل جونز کے ذہن میں پورا نقشہ تیار تھا۔

"لیکن وہ تباہ کن بم کہاں سے آئیں گے؟" میں نے حیرت زدہ ہوکر پوچھا۔

بل جونز نے نخوت آمیز انداز میں سگریٹ سلگائی پھر بولا۔ "تم بھول رہے ہو کہ ہم بارود کے ماہرین اور سرکاری مہمان ہیں۔ ہمارے پیشہ ورانہ سامان کے کریٹ آج کی ایک پرواز سے یہاں آچکے ہیں۔ کل انہیں چیک کیے بغیر، چھڑوا کر ہمارے حوالے کردیا جائے گا۔ بم یہاں چھوڑ دیے جائیں گے۔ ان کے خالی کیسز میں ماربل اور گرینائٹ کا پاؤڈر بھر کر، وہ کریٹ ہم اپنے ساتھ واپس لے جائیں گے۔ کسی کے فرشتوں کو بھی علم نہیں ہوسکے گا کہ یہ کارروائی کس نے اور کیسے کی ہوگی۔"

"مردہ ابابیلوں کا تجزیہ زہر کی کہانی ضرور سنائے گا۔" میں نے کہا۔

"ان کے چیتھڑے بھی نہیں مل سکیں گے کیونکہ بم ان ہی کے پیروں سے باندھے جائیں گے۔ بالفرض یہ بات سامنے آ بھی جاتی ہے تو اس تخریب کاری کا الزام کس پر عائد کیا جائے گا؟ مہلک ابابیلوں کو اڑانے والے اپنی بندوین میں ممنوعہ علاقے سے کافی دور، اپنے اڈے سے اس غول کو اڑاتے ہی وہاں سے نکل جائیں گے۔ یہ سب سے بے ضرر اور محفوظ منصوبہ ہے جسے پال اور ظفر مل کر سرانجام دے سکتے ہیں۔"

"تو کیا پال تمہارے ساتھ واپس نہیں جائے گا۔" اس کا ہولناک منصوبہ سامنے آنے کے ساتھ میری آنکھیں کھلتی جارہی تھیں۔

"یہ بیمار ہوکر یہاں رک جائے گا۔" بل جونز مکّارانہ مسکراہٹ کے ساتھ بولا۔ "پھر آب و ہوا کی تبدیلی کے لیے یا تفریحاً اسلام آباد کا رخ کرلے گا۔ دراصل ان مخصوص ابابیلوں کو یہی پہچان سکتا ہے۔"

میں گہری سوچ میں ڈوب گیا۔ کسی بھی چڑی مار کے ذریعے سو پچاس ابابیلیں خرید کر، ان میں سے ناکارہ ابابیلوں کو آزاد کرکے اپنی ضرورت پوری کرنا کوئی مشکل کام نہیں تھا۔ ان دونوں کا منصوبہ ہر اعتبار سے مکمل تھا۔ کمی صرف کلیدی کردار کی تھی جو جہنم سے کبھی واپس لوٹ ہی نہیں سکتا تھا۔

"کس سوچ میں ڈوب گئے؟" مجھے خاموش پاکر پال ایتھرٹن نے ٹوکا۔

"میں ظفر کے بارے میں سوچ رہا تھا۔ اگر وہ جلد ہی اپنی کمین گاہ سے باہر نہ آسکا تو کیا ہوگا؟"

"ظفر ہمارے لیے بہت اہم بلکہ ناگزیر ہے۔" بل نے کہا۔ "لیکن ایک فرد کے ہونے یا نہ ہونے کی وجہ سے کسی بڑے مشن کو ادھورا نہیں چھوڑا جاسکتا۔ تم شاید اتنا بڑا بوجھ نہ اٹھاسکو۔ ہمیں ظفر کی مخدوش پوزیشن کا اندازہ تھا اس لیے ہم نے اپنے کچھ دوستوں سے مدد لینے کا بندوبست کیا ہوا ہے۔ اگلے ایک دو دن میں ظفر نہ آسکا تو ہم ان لوگوں کو اعتماد میں لے کر اپنا کام آگے بڑھائیں گے۔ تم ان کے ساتھ رہ سکو گے۔"

اس وقت مجھے اندازہ ہوا کہ جمی لائیڈ، ویرا سے بات کرنے کے لیے کیوں مضطرب تھا۔ بل جونز کے ذہن میں یقیناً جمی لائیڈ اور ویرا کے نام موجود تھے اور وہ ظفر کے موجود نہ ہونے کی صورت میں ویرا سے کام لینے کے بارے میں سوچ رہا تھا۔ یہ اس کی بدقسمتی تھی کہ وہ دونوں طرف سے گھیر لیا گیا تھا۔ ظفر، البرٹو ویلیسا ہلاک کیا جاچکا تھا اور ویرا ہمارے ساتھ تعاون کررہی تھی۔ وہ کسی بھی صورت میں اپنے منصوبے کو عملی جامہ پہنانے کے قابل نہیں تھا

لیکن ان دونوں کو ان کے ناپاک عزائم کی سزا ملنی بہت ضروری تھی۔

"ہمارے دوستوں نے بھی کسی معذوری کا اظہار کیا تو ہم تیسری راہ اختیار کریں گے۔" اس بار پال ایتھرٹن کو جوش آگیا تھا۔ "میں خود یہاں رہ کر اس منصوبے کو پایۂ تکمیل تک پہنچاؤں گا۔ پیسے کی مدد سے میں ہر کام کر گزروں گا۔ اس دور میں حب الوطنی سے لے کر فرض شناسی تک کی کوئی نہ کوئی قیمت ہوتی ہے۔ جو شخص ایک سو ہزار ڈالر کی رشوت کو ٹھکرا کر محبِ وطن بنا پھرتا ہے' ایک ملین ڈالر کی پیشکش پر بک جاتا ہے۔ بات صرف اتنی ہوتی ہے کہ آدمی کو دیکھ بھال کر' اس کی صحیح قیمت لگائی جائے' وہ جال میں ضرور پھنسے گا۔"

"تم ٹھیک کہہ رہے ہو۔" میں نے سنجیدگی سے کہا۔ "ظفر نے اسی طرح مجھے اپنا وفادار بنایا ہوا ہے۔"

"تمہاری نہیں' یہ ایک عام بات تھی۔" پال نے جلدی سے کہا۔ "ہماری بھی ایک قیمت ہے۔ ہمیں کھوٹر کی تنصیبات سے کوئی ذاتی پرخاش نہیں ہے۔ ہم پیسے کے لیے یہ سب کر رہے ہیں۔ کھوٹہ کے دشمنوں نے ہمیں ہماری خدمات کا معقول معاوضہ دینے پر رضامندی ظاہر کی ہے جب ہی ہم نے ان کے تفکرات کو اپنے سر لیا ہوا ہے ورنہ ہم خدائی فوجدار نہیں ہیں جو ہزاروں میل دور سے بلاوجہ یہاں دوڑے آتے۔"

"تم پڑھے لکھے اور کام کے آدمی معلوم ہوتے ہو۔ آج رات کو تم یہیں رہ جاؤ۔" بل جونز نے میرا پستول میری طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔ "شراب سے دل بھر جانے کے بعد یہیں صوفے پر سو جانا۔"

"میرا گھر جانا ضروری ہے۔" میں نے لجلجا کر کہا۔ "بیوی اور دو یتیم بچوں کو میرا انتظار رہے گا۔"

"یتیم بچے؟" اس نے حیرت سے سوال کیا۔ "تمہاری زندگی میں تمہارے بچے یتیم کیسے کہلا سکتے ہیں؟"

"بیوی میری ہے مگر وہ دونوں بچے میری مرحومہ بہن اور بہنوئی کی یادگار ہیں۔"

وہ دونوں ہنس پڑے اور پال بولا۔ "تم باتیں بھی دلچسپ کر لیتے ہو۔ کل دوپہر کو ہم تمہارا انتظار کریں گے۔"

مگر میرے ذہن میں ایک ہلچل سی مچی ہوئی تھی۔ ریسٹ ہاؤس میں کوئی غیر معمولی حفاظتی انتظام نہیں تھا۔ ان کی رفتار بہت تیز تھی۔ ویرا کی جانب سے رابطہ ہوتے ہی وہ اس کے سر پر سوار ہو جاتے۔ ویرا کی طرف سے لیت و لعل کی صورت میں وہ کرنل جیسی جونز کے ذریعے جمی لائیڈ پر دباؤ ڈلوا سکتے تھے اور جمی لائیڈ فون پر ویرا کو تیزی دکھانے پر مجبور کر سکتا تھا۔ دوسری طرف ان کے لائے ہوئے خوفناک مگر چھوٹے بموں کے کریٹ اگلے دن ان کی تحویل میں آنے والے تھے۔ میں ان سے ساری کار آمد باتیں اگلوا چکا تھا۔ اس لیے اس سنہری موقع سے فائدہ اٹھاتے ہوئے ان کے ساتھ چھیڑ چھاڑ کی ابتدا کرنے میں کوئی مضائقہ نہیں تھا۔

"تم چاہو تو کچھ وقت نکال کر ہم ایک بڑا کام سرانجام دے سکتے ہیں۔" میں نے ایک فیصلے پر پہنچتے ہوئے کہا۔ پھر ان کے استفسار پر اپنی بات جاری رکھتے ہوئے کہا۔ "ظفر کے سارے مصائب کی ذمے داری ڈینی نامی ایک بدمعاش پر ہے اور وہ آج کل کراچی میں دیکھا جا رہا ہے۔ ہم اسے ٹھکانے لگا سکتے ہیں۔"

"ہمیں معلوم ہے۔" ڈینی کا نام سنتے ہی بل جونز کے ہونٹوں پر تنفر آمیز کھنچاؤ آگیا۔ "میرا بس چلے تو میں ڈینی کا بھیجا اس کی ناک کے راستے بہا دوں۔ ظفر نے اپنی رپورٹ میں اس کا ذکر کیا تھا۔"

"اگر تمہارا موڈ ہو تو میں اسی وقت اس کے ٹھکانے پر چلنے کے لیے تیار ہوں۔" میں نے پیشکش کی۔

"ہمارے پاس گاڑی نہیں ہے۔ ایسے کاموں میں ٹیکسی ڈرائیور پر اعتماد نہیں کیا جا سکتا۔" بل بولا۔

"اس کی فکر نہ کرو۔ میرے پاس قابلِ اعتماد ڈرائیور سمیت گاڑی موجود ہے۔"

"اوہ! پھر تو تم خاصی مال دار اسامی ہو۔ میں نے سنا ہے کہ یہاں بہت کم لوگوں کے پاس اپنی کار ہوتی ہے۔"

"ظفر کی مہربانی ہے۔ وہ فراخدلانہ معاوضہ نہ دے تو گزر بسر بھی دشوار ہو سکتی ہے۔"

وہ دونوں ڈینی کے قتل کے لیے فوراً ہی میرے ساتھ روانہ ہونے پر تیار ہو گئے۔

"تم تیار ہو کر آؤ' میں ذرا ڈرائیور کو بریفنگ دے دوں۔" وہ لباس بدلنے میں مصروف ہوئے تو میں ان سے بہانہ کر کے باہر آگیا۔ میں نے فیصلہ کر ہی لیا تھا تو سلطان شاہ کو اعتماد میں لینا ضروری ہو گیا تھا۔

سلطان شاہ ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھا ہوا میری واپسی کا انتظار کر رہا تھا۔ اس نے بہت سکون کے ساتھ میری مختصر کہانی سنی پھر سر ہلاتے ہوئے بولا۔ "یہ اچھا ہے۔ روگ کا جلد از جلد خاتمہ ہونا چاہیے۔"

ہم دونوں باہر کھڑے ہو کر نیچی آوازوں میں تبادلۂ خیال کرنے لگے۔ باتیں کرتے ہوئے میں نے چہل قدمی کے انداز میں کار کا طواف کر کے یہ بھی دیکھ لیا کہ سلطان شاہ کی بے توجہی اور کافی دنوں سے زیادہ استعمال نہ ہونے کے سبب کار خاصی گندی حالت میں تھی۔ خاص طور پر اس کی دونوں نمبر پلیٹیں ایسی حالت میں تھیں کہ انہیں سرسری نظر میں پڑھنا ممکن نہیں رہا تھا۔

وہ دونوں تیار ہو کر باہر آئے تو ان کی وزنی جیبوں پر نظر پڑتے ہی مجھے احساس ہوا کہ میں نے انہیں تخلیہ فراہم کر کے غلطی کی تھی۔ میں ان کے ساتھ موجود رہتا تو مجھے یہ اندازہ ہو سکتا تھا کہ وہ اس مہم کے لیے کس قسم کا اور کتنا اسلحہ اپنے ساتھ لے رہے ہیں۔

انہیں آتا ہوا دیکھ کر سلطان شاہ نے پھرتی کے ساتھ ڈرائیونگ سیٹ سنبھال لی لیکن بل جونز نے باہر رک کر ہی چابی کا مطالبہ کر دیا۔ اس کا کہنا تھا کہ وہ دورانِ سفر صرف اسی وقت پُرسکون رہ سکتا ہے جب اسٹیئرنگ وہیل اس کے قابو میں ہو۔ میں نے اسے امریکا کے برعکس پاکستان میں بائیں ہاتھ پر گاڑی چلانے کے قانون اور گندے ٹریفک کا حوالہ دے کر ڈرائیونگ سے باز رکھنا چاہا لیکن وہ نہ مانا۔ اس کے اصرار پر چابی اسے دے دی گئی۔

ہم وہاں سے روانہ ہوئے تو میں' بل جونز کے برابر میں بیٹھا ہوا تھا۔ سلطان شاہ' پال ایتھرٹن کے ساتھ عقبی نشست پر براجمان تھا۔ گاڑی چلنے کے بعد پال نے سلطان شاہ سے متعارف ہونے کی کوشش کی لیکن وہ میری ہدایت کے مطابق انگریزی سے لاعلمی ظاہر کر کے رہ گیا۔ میرے لیے وہ بندوبست ضروری تھا تاکہ میری اور سلطان شاہ کی کسی بات میں عدم مطابقت کی وجہ سے ان دونوں کو چوکنا ہونے کا موقع نہ مل سکے۔

ریسٹ ہاؤس سے روانہ ہونے کے بعد میں نے بل جونز کو اس سڑک پر چلنے کا مشورہ دیا جو پٹھان کالونی اور بنارس چوک سے گزرتی ہوئی' بلوچستان کی طرف جاتی تھی۔ آبادی' سیمنٹ سازی کے کارخانوں اور پھر گندھک ملے ہوئے گرم پانی کے چشموں کے قریب سے گزرنے کے بعد گاڑی ویران علاقے میں داخل ہوئی تو سڑک کے دونوں طرف چٹیل اور تاریک میدان دیکھ کر پال ایتھرٹن چونکے بغیر نہ رہ سکا۔

"معلوم ہوتا ہے کہ ہم شہری حدود سے باہر نکل آئے ہیں۔" اس نے کہا "کیا ہم کراچی سے باہر' کسی دوسرے شہر کی طرف جا رہے ہیں؟"

"کراچی ایک بے تکا شہر ہے" میں نے اسے باتوں میں الجھائے رکھنے کے ارادے سے کہا "اس کی مختلف آبادیوں کے درمیان ایسے غیر آباد علاقے ہر طرف بکھرے ہوئے ہیں۔ شاید شہر کے منصوبہ سازوں نے مستقبل کی ضروریات کے لیے ان قطعاتِ اراضی کو بچا کر رکھا ہوا ہے۔"

"لیکن یہاں تو تاحدِ نظر اندھیرے کا راج نظر آ رہا ہے" پال کی پُرتشویش آواز ابھری "آگے کوئی آبادی ہو تو یہاں سے اس کی روشنیاں وغیرہ تو نظر آنی چاہئیں۔ اس ویرانے میں ڈینی کیا کر رہا ہے؟"

اس کا اضطراب خطرے کی علامت تھا۔ میں نے بل سے کہا "آگے ایک کچا راستہ نظر آئے گا۔ بس وہیں سے گاڑی بائیں طرف اتار لینا۔ میرا خیال ہے کہ ہم اپنی منزل سے کافی قریب ہیں۔"

"تو کیا ہمیں سڑک سے اتر کر کچے میں جانا ہو گا؟" بل کی آواز بھی تفکر آمیز تھی۔

"چند منٹ کے بعد ہم دوبارہ نیم پختہ سڑک پر ہوں گے جو نشیبی علاقے میں موجود آبادی تک جاتی ہے۔"

میں نے کچے راستے کی بات الل ٹپ کہہ دی تھی۔ مجھے اندازہ تھا کہ قرب و جوار کے دیہی علاقوں تک رسائی کے لیے اس سڑک سے جابجا کچے میں اترنے کے نشانات ملتے رہیں گے۔ ہیڈ لیمپس کی روشنی میں' بل کو جوں ہی کسی پگڈنڈی کے آثار نظر آئے' اس نے بریک لگا کر گاڑی کی رفتار کم کی اور اسے سڑک سے نیچے اتار دیا۔ گاڑی جھٹکے کھاتی ہوئی' پتھریلے اور ناہموار راستے پر آگے بڑھنے لگی۔ گاڑی میں بوجھل اور غیر فطری سکوت چھایا ہوا تھا۔ ہم دونوں ان پر وار کرنے کے موقع کی تلاش میں تھے اور وہ شاید اپنے لیے خطرہ محسوس کرنے لگے تھے۔

ایک گڑھے سے نکلتے ہوئے گاڑی کے ہیڈ لیمپس کی روشنی دور تک گئی تو راستے میں پتھریلے ٹیلوں کا ایک سلسلہ نظر آیا اور بل نے پورے بریک لگا کر گاڑی وہیں روک دی۔

"اب تم چاہو گے کہ ہم دو سو گز کے بعد گاڑی چھوڑ کر ان ٹیلوں کو پیدل عبور کریں" بل کی غراہٹ گونجی۔

میں نے اپنے بائیں ہاتھ میں موجود پستول کے وزنی دستے سے اس کے سر پر بھرپور ضرب لگانی چاہی جو اوچھی پڑی۔ بل جونز کا ہاتھ شاید پہلے سے دروازے کے لیور پر تھا' وہ بہت پھرتی کے ساتھ کار سے باہر نکل گیا۔ پچھلی نشست پر بھی دھماچوکڑی شروع ہو چکی تھی مگر میرے لیے بل زیادہ اہم تھا۔ مہلت پا کر وہ کوئی آتشیں ہتھیار نکال لیتا تو خطرناک صورتِ حال پیدا ہو سکتی تھی۔ میں بھی فوراً ہی ڈرائیونگ سیٹ والے دروازے سے باہر نکل گیا۔

بل زمین پر ہی لڑھک کر ایک طرف نکل جانے کی کوشش کر رہا تھا۔ میں اس پر سے ہوتا ہوا سنگلاخ زمین پر پھسل گیا۔ میں نے سنبھلتے سنبھلتے ہی فضا میں ایک فائر جھونک مارا۔ مقصد صرف انہیں خوف زدہ کرنا تھا۔ فوراً ہی ایک اور فائر ہوا جو بل جونز نے کیا تھا۔ وہ میری توقع سے زیادہ پھرتیلا ثابت ہوا تھا کیونکہ زمین پر گرنے کے باوجود وہ اپنا پستول نکال چکا تھا۔ پھر میں نے دیکھا کہ کار کی پچھلی سیٹ کا دروازہ کھلا اور ایک دوسرے سے گتھے ہوئے دو ہیولے باہر آگرے۔ ان دونوں کی وحشیانہ غراہٹیں ویرانے میں دور تک گونج رہی تھیں۔

لمحہ بھر کے لیے میری توجہ کار کی طرف مبذول ہوئی تھی کہ بل جونز کی طرف سے دوسرا فائر ہوا اور گولی میرے سر کے بالوں کو تقریباً چھوتی ہوئی گزر گئی۔ اگر میں اس وقت زمین پر پڑا ہوا نہ ہوتا تو میری کھوپڑی میں ایک کھڑکی کھل چکی ہوتی۔ میں نے اندازے سے کام لیتے ہوئے بل کی طرف فائر کیا مگر میری گولی کار کے کسی آہنی حصے میں جا گھسی۔

کھلے میدان میں جب دو مسلح حریف ایک دوسرے کے مقابل ہوں تو ان میں سے کوئی بھی اپنے قدموں پر کھڑا ہونے کا بھیانک

خطرہ مول نہیں لے سکتا۔ میں نے پھرتی کے ساتھ ایک قریبی نشیب میں لڑھکنے کے بعد سینے کے بل پوزیشن لے لی اور قوی ہیکل بل کو تلاش کرنے لگا۔

میرے مقابلے میں بل جونز کی پوزیشن اس اعتبار سے بہتر تھی کہ وہ کار کے قریب تھا۔ اگر وہ کار کی آڑ لینے میں کامیاب ہوجاتا تو ہم رات بھر بھی اس کے قریب نہیں پھٹک سکتے تھے۔ ادھر سلطان شاہ نے اپنے حریف کو بری طرح رگیدا ہوا تھا۔ پال ایتھرٹن جسمانی طور پر سلطان شاہ سے بہت کم تر تھا۔ خطرہ بھانپ لینے کے باوجود اسے کوئی ہتھیار نکالنے کا موقع نہیں مل سکا تھا اس لیے سلطان شاہ اسے پیسے ڈال رہا تھا اور فضا اس کی دردناک غراہٹوں سے گونج رہی تھی۔

اسی وقت مجھے بل جونز کا زمین سے چپکا ہوا وجود نظر آگیا۔ وہ بوکھلاہٹ میں کار سے کافی دور نکل چکا تھا اور اوسان بحال ہونے کے بعد، پیٹ اور کہنیوں کے بل کار کی طرف رینگ رہا تھا۔

میں نے اندھیرے میں نظریں گاڑ کر، بہت احتیاط سے اس کا نشانہ لیا اور فائر کردیا۔ ایک ہلکی سی چیخ کے ساتھ وہ پیچھے اچھل گیا۔ چیخ میں بہت زیادہ اذیت نہیں تھی۔ شاید میری گولی نے اس کی جلد کے کسی حصے کو ادھیڑ ڈالا تھا جس پر اس کے منہ سے اضطرابی چیخ آزاد ہوگئی تھی۔

میرے لیے وہ فیصلہ کن لمحات تھے۔ میں بل جونز کو ایک ہلکا یا کاری زخم لگانے کے بعد اس پر ذہنی برتری حاصل کرچکا تھا۔ مجھے یقین تھا کہ میرے آخری فائر سے خوف زدہ ہونے کے بعد وہ کچھ دیر کے لیے فطری طور پر کار کی طرف بڑھنے کی ہمت نہیں کرسکے گا۔ میں نے اس میدان میں موجود اس واحد مورچے کی طرف بڑھنا شروع کردیا۔

کار پر ہمارا قابض رہنا اس لیے بھی ضروری تھا کہ بل جونز کو وہاں سے فرار ہونے کا موقع نہ مل سکے۔ کار کی طرف رینگتے ہوئے میں گردوپیش سے غافل نہیں تھا۔ آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھنے کے باوجود مجھے کہیں بھی بل جونز کا زمین سے چپکا ہوا، ساکت یا متحرک ہیولا نظر نہیں آیا۔ دوسرے طرف سلطان شاہ کو بھی شاید اپنا پستول نکالنے کا موقع نہیں مل سکا تھا کیونکہ ادھر سے تابڑتوڑ مکوں وغیرہ کے ساتھ پال ایتھرٹن کی کراہیں سنائی دے رہی تھیں۔ میں حیران تھا کہ کمزور جسمانی ساخت رکھنے اور اس قدر مار کھانے کے باوجود پال ایتھرٹن کسی جونک کی طرح سلطان شاہ سے چمٹا ہوا تھا۔

میں نے پھر اسی سمت میں ایک فائر جھونک مارا جدھر میں نے بل جونز کو دیکھا تھا لیکن جواب میں ادھر سکوت چھایا رہا اور میں چند ثانیوں بعد ہی اس مقام پر پہنچ گیا جہاں سلطان شاہ، پال ایتھرٹن پر سوار ہوکر اسے ادھیڑ رہا تھا۔

"جلدی اس کا قصہ ختم کرو" میں نے کار کی طرف بڑھتے ہوئے تیز سرگوشی میں کہا "ہمیں اس کے ساتھی کو بھی گھیرنا ہے۔ وہ بچ کر نکلنے میں کامیاب ہوگیا تو ہماری ساری محنت رائیگاں جائے گی۔"

"یہ حرام زادہ ربر کا بنا ہوا معلوم ہوتا ہے" سلطان شاہ کی غصے اور جھلاہٹ میں ڈوبی ہوئی آواز ابھری "میں نے اس کی دونوں کنپٹیاں پھاڑ دی ہیں۔ سالا لہولہان ہورہا ہے لیکن مرتا ہے نہ بے ہوش ہونے کا نام لیتا ہے۔"

میں نے فوراً ہی اپنا رخ تبدیل کرلیا اور پھر پال ایتھرٹن کے سر پر پہنچ گیا۔ وہ منہ پھاڑے بری طرح ہانپ رہا تھا لیکن اس کی مزاحمت بدستور جاری تھی۔ میں نے اس کے کھلے ہوئے دہانے میں اپنے پستول کی نال اڑائی اور لبلبی دبادی۔ ہولناک دھماکے کے ساتھ اس کا بدن اتنی زور سے اچھلا کہ سلطان شاہ فضا میں اڑتا ہوا دور جاگرا۔ پال ایتھرٹن کی موت کے درد میں ڈوبی ہوئی آخری چیخ بھی فائر کی بھیانک گونج میں دب کر رہ گئی۔ میری گولی شاید اس کے تالو سے ہوکر کھوپڑی سے نکل گئی تھی کیونکہ میرے پلٹنے سے پہلے ہی اس کا جسم دو تین جھٹکے لے کر ساکت ہوگیا۔

"اس کی تلاشی لے کر ہتھیاروں پر قبضہ کرلو" سلطان شاہ کو ہدایت دے کر میں کار کی طرف متوجہ ہوگیا۔

کار کے اگنیشن میں چابی موجود نہیں تھی۔ میں نے ڈیش بورڈ میں ہاتھ ڈالا تو بیم گن وہاں نہیں تھی۔ میں نے کچھ سوچتے ہوئے کار کے ہیڈ لیمپس روشن کردیے۔ دور تک روشنی کی چادر پھیل گئی لیکن اس بنجر اور سنگلاخ زمین پر بل جونز تو کیا کسی بھی ذی روح کا وجود نہیں تھا۔

اچانک داہنی طرف سے فائر ہوا۔ میں غیرارادی طور پر ڈرائیونگ سیٹ میں ہی نیچے جھک گیا۔ گولی داہنے فینڈر کی چادر میں پیوست ہوگئی۔ میں نے فوراً ہیڈ لیمپس بجھادیے۔ گھور تاریکی میں ان کے انعکاس کی وجہ سے شاید بل جونز نے مجھے دیکھ لیا تھا۔ فائر کی سمت سے اندازہ ہوا کہ اس نے بہت تیزی کے ساتھ اپنی پوزیشن تبدیل کرلی تھی اور کم وبیش ان ہی اطراف میں موجود تھا جہاں سے گولی چلاکر میں نے اسے زخمی کیا تھا۔ شاید اس نے کار کی اوٹ لے کر مقابلہ کرنے کے بجائے، ایک چکر کاٹ کر مجھے گھیرنے کی ناکام کوشش کی تھی۔

میں کار سے اتر کر، اس کے بائیں جانب چلا گیا۔ سلطان شاہ بھی وہیں آگیا۔

اسے پال ایتھرٹن کے قبضے سے بھرے ہوئے پستول کے علاوہ ایک بھرا ہوا فاضل میگزین اور شکاری چاقو ملا تھا۔ میرے استفسار پر معلوم ہوا کہ سلطان شاہ نے ریسٹ ہاؤس سے روانہ ہونے سے پہلے بیم گن اپنی تحویل میں لے لی تھی۔

"ہتھیار ڈال کر خود کو میرے حوالے کردو ورنہ میں تمہارے چیتھڑے اڑادوں گا" اچانک فضا میں بل جونز کی بلند اور ہذیانی آواز گونج اٹھی "میں تمہیں زندہ نہیں جانے دوں گا۔"

میں نے آواز کی سمت میں ایک فائر کردیا۔ مجھے یہ تسلی تھی کہ میرا پستول خالی ہونے کے بعد بھی ہماری تحویل میں دو بھرے ہوئے پستول اور ایک مکمل میگزین موجود تھا۔ ہم وقفے وقفے سے گولیاں چلاکر بل جونز کو ہراساں کرسکتے تھے۔

"تم اکیلے رہ گئے ہو" فائر کی گونج ختم ہونے کے بعد میں نے اونچی آواز میں کہا "ہم دونوں تمہیں گھیر کر چوہے کی موت ماردیں گے۔ تمہاری موت تمہیں کھینچ کر پاکستان لائی ہے۔"

چند ثانیوں کے سکوت کے بعد اس نے سوال کیا "تم کون ہو اور ہم سے تمہاری کیا..."

اس کا فقرہ مکمل ہونے سے پہلے میں نے اس طرف گولی چلادی۔ میں ہر گولی گن کر استعمال کررہا تھا۔ اس فائر کے بعد میرا میگزین خالی ہوگیا۔ میں نے خالی پستول سلطان شاہ کو دے کر پال ایتھرٹن کے قبضے سے برآمد ہونے والا بھرا ہوا پستول لے لیا۔ اس وقت تک بل جونز نے صرف تین فائر کیے تھے۔ وہ اپنے پستول کو بس احتیاط سے استعمال کررہا تھا۔ اس سے ظاہر ہورہا تھا کہ وہ گولیوں کی قلت کی طرف سے فکر مند تھا۔ اس کے پستول کے میگزین میں صرف تین چار گولیاں رہ گئی تھیں۔ ان کے بعد وہ زیادہ سے زیادہ ایک اور میگزین چڑھا سکتا تھا۔ کیونکہ پال کے قبضے سے بھی صرف ایک فاضل میگزین برآمد ہوا تھا۔ اس کے بعد وہ نہتا رہ جاتا اور ہم لوگ بھاگ دوڑ کرکے بھی اسے پکڑ سکتے تھے۔

لیکن وہ احمق نہیں تھا۔ اس نے جوش میں آکر اپنی ایک گولی بھی بے مقصد نہیں چلائی تھی۔

بل جونز نے اچانک بلند آواز میں ہمیں غلیظ گالیاں دینی شروع کردیں ان گالیوں کے دوران میں ہی اس کی آواز نے جھٹکا لیا جیسے اس نے کسی چیز پر اپنا پورا زور صرف کیا ہو۔ اس کے لحظہ بھر بعد ہی ایک پُرہول دھماکے سے ہماری نظریں خیرہ ہوگئیں۔ ہم سے صرف چند گز دور کوئی دستی بم زمین پر گر کر تیز چمک اور دھماکے کے ساتھ پھٹا تھا۔ اگر ہم دونوں گاڑی کی اوٹ میں نہ ہوتے تو فضا میں اڑنے والے بموں کے ٹکڑوں اور کنکروں سے لہولہان ہوچکے ہوتے۔

"وہ بموں سے لیس ہے اور شاید گاڑی کے ساتھ ہی ہمیں بھی اُڑادینا چاہتا ہے" سلطان شاہ نے پُرتشویش لہجے میں سرگوشی کرتے ہوئے کہا "اس بار ہم چند گز کے فرق سے بچ گئے لیکن وہ اگلا بم قریب آکر پھینکے گا۔ اندھیرے کے باوجود اسے یہ کار اچھی طرح نظر آرہی ہوگی۔ ہمیں...."

اچانک ہی اس نے اپنی بات ادھوری چھوڑ کر میرا ہاتھ تھاما اور ایک طرف دوڑ لگادی۔ میں کوئی مزاحمت کیے بغیر مشینی انداز میں اس کے پیچھے ہولیا۔ ہم چند گز دور ہی گئے ہوں گے کہ دوسرا دھماکا ہوا اور فضا میں خون آلود سرخی پھیل گئی۔ ہم اس بار بھی بال بال بچے تھے۔

کچھ دور نکل آنے کے بعد میں نے مڑ کر دیکھا کہ بم پھٹنے کے ساتھ ہی ہماری کار آگ کے بھیانک شعلوں کی لپیٹ میں آچکی تھی اور بل جونز کافی دور کھڑا، کسی پاگل کی طرح قہقہے لگارہا تھا۔ آگ کے شعلے اور کثیف دھواں اگلتی ہوئی کار پر اپنی توجہ مرکوز کیے رکھنے کی وجہ سے شاید وہ نہیں دیکھ سکا تھا کہ ہم اس کے مہلک وار سے بچ نکلے تھے۔

لمحہ بھر کے لیے میرے دل میں خیال آیا کہ وہ اپنے قدموں پر کھڑا ہوا تھا اور میں اس پر فائر کرسکتا تھا لیکن میں فوراً ہی وہ ارادہ ترک کرکے زمین پر گر گیا۔ سلطان شاہ نے میری تقلید کی۔

اس وقت بل جونز نظر ضرور آرہا تھا لیکن وہ پستول کی رینج سے باہر تھا۔ فائر کیے جانے کی صورت میں وہ ایک مرتبہ پھر ہماری طرف سے چوکنا ہوسکتا تھا۔ میری متبادل کوشش یہ تھی کہ ہم خود کو اس کی نظروں سے محفوظ رکھتے ہوئے، اس خوش فہمی میں مبتلا رہنے دیں کہ اس نے ہمیں مارلیا ہے اور جب وہ اپنے کارنامے کا جائزہ لینے کے لیے، جلتی ہوئی کار کے قریب آئے تو بے خبری میں اس پر حملہ کرکے اسے بے دست وپا کرلیں۔

"اگر میری نگاہ فضا میں آتے ہوئے بموں پر نہ پڑگئی ہوتی تو اس وقت ہم کہاں ہوتے؟" سلطان شاہ جھرجھری لیتے ہوئے میرے کان کے نیچے منمنایا "خیریت اسی میں ہے کہ ہم اب یہاں سے نکلنے کی فکر کریں۔"

"پاگل ہوئے ہو" میں نے اسے جھاڑا "وہ پورا بارود خانہ لے کر نہیں آیا ہوگا۔ وہ بارودی اسلحے کا ماہر ہے اس لیے دوچار شعبدے جیب میں ڈال لایا ہوگا۔ ہوسکتا ہے کہ اب اس کے پاس پستول کی گولیوں کے علاوہ اور کچھ باقی نہ رہا ہو۔ ہم اتنے قریب آئے ہوئے شکار کو چھوڑ کر نہیں جاسکتے۔"

ہم سینوں کے بل زمین سے بالکل چپک کر ایک طرف رینگ رہے تھے لیکن ہماری پوزیشن تسلی بخش نہیں تھی۔ وہ کھڑا ہوا تھا اور پھر بھڑکتے ہوئے شعلوں نے کافی دور تک کا علاقہ روشن کردیا تھا، اس لیے وہ کسی بھی لمحے ہمیں دیکھ سکتا تھا۔ اگر کسی طرح ہمارے اور اس کے درمیان جلتی ہوئی کار حائل ہوجاتی تو ہم اس کی نظروں سے بالکل محفوظ ہوسکتے تھے لیکن اس مقام تک پہنچنے کے لیے ایسی جگہ سے گزرنا ناگزیر تھا جو اس وقت بھی بل کی نظروں میں تھی۔ اس مجبوری کی وجہ سے ہم دونوں ہی لمحہ بہ لمحہ کار سے دور کھسکتے جارہے تھے۔

لیکن ہماری وہ کوششیں بے سود ثابت ہوئیں۔ بل جونز کا مجنونانہ ہنسی کا دورہ ختم ہوا تو اس نے کار کے جلتے ہوئے ڈھانچے کی طرف اندھا دھند پیش قدمی کے بجائے، گردوپیش کا جائزہ لیا اور ہمیں دیکھ لیا۔

"جہنمی کتو! میں تمہیں فنا کردوں گا" وہ ہمیں دیکھتے ہی پوری قوت سے چیخ پڑا اور اس بار اس نے اضطراری طور پر ہماری طرف دو فائر جھونک مارے۔

جس طرح وہ ہماری پستول کی رینج سے باہر تھا' اسی طرح ہم دونوں اس کی زد سے محفوظ تھے۔ اس کی مزید دو گولیاں ضائع ہوگئیں اور ہم دونوں بھی اپنے قدموں پر اٹھ کھڑے ہوئے۔

"ہمیں دو مختلف سمتوں میں نکل کر اسے گھیرنے کی کوشش کرنی چاہئے" میں نے رائے دی "جو بھاگ دوڑ سے جلد ہی نڈھال ہوگیا وہی مارلیا جائے گا۔ اسے مسلسل بھاگنے پر مجبور کرنا ہوگا۔"

ہم دونوں ایک دوسرے سے الگ ہوئے تو یہ طے کرلیا گیا تھا کہ سلطان شاہ ایک چکر کاٹ کر اس کی توجہ کا ارتکاز ختم کرنے کی کوشش کرے گا اور میں سیدھا اس کی طرف جاؤں گا۔ میں نے بھرا ہوا فالتو میگزین' بیم گن سمیت اپنے ساتھ لے لیا تھا کیونکہ براہِ راست ٹکراؤ کے لیے مجھے ان چیزوں کی زیادہ ضرورت تھی۔

میں نے تیز قدموں سے اس کی طرف بڑھنا شروع کیا تو وہ کچھ دیر تک اپنی جگہ کھڑا میری طرف دیکھتا رہا۔ پھر اس نے بھی تقریباً میری رفتار سے سڑک کی طرف چلنا شروع کردیا۔

میری طرف اس کی پشت ہوتے ہی میں نے پنجوں کے بل دوڑ لگائی پھر رک کر پوری طاقت سے ایک پتھر اس کی طرف کھینچ مارا۔ وہ پستول کی رینج سے ضرور باہر تھا لیکن میرے پھینکے ہوئے پتھر نے اس کی پشت کو نشانہ بنا ہی لیا۔ پتھر لگتے ہی وہ بلبلا کر پیچھے مڑا۔ اس کے رکتے ہی میں نے دوڑ لگادی۔ وہ گالیاں دیتے ہوئے اچھل کر بھاگا لیکن رخ بدلنے کی کوشش میں اس کی ٹانگیں ایک دوسرے میں الجھ گئیں۔

وہ لڑکھڑا کر سنبھلنے کے بعد دوبارہ دوڑا تو میرا اور اس کا درمیانی فاصلہ خاصا کم ہوچکا تھا۔ میں نے بھاگتے بھاگتے اس پر فائر کیا لیکن اس وقت بھی ہم دونوں کا درمیانی فاصلہ پستول کی بساط سے باہر تھا۔ میں نے اسے ایک اور پتھر مارنا چاہا جو اس کے پہلو سے نکل گیا۔

اس وقت دو مضبوط حریفوں کا وہ خونریز تصادم' آوارہ گرد لڑکوں کی لڑائی میں تبدیل ہوچکا تھا۔ میری سنگ باری کے نتائج دیکھتے ہوئے بل جونز نے بھی اس سے استفادہ کرنے کی کوششیں کیں لیکن ناکام رہا۔ اصل بات یہ تھی کہ میں اس سے ٹکرا جانے کے فراق میں تھا اور وہ بھاگ رہا تھا۔ اگر وہ بھی ہمت کرکے میرے مقابلے پر ٹھہرنے کی کوشش کرتا تو شاید صورتِ حال دشوار تر ہوسکتی تھی۔

ایک ٹیلے کے قریب سے گزرتے ہوئے اس نے رک کر میری طرف دیکھا پھر فائر کردیا۔ گولی مجھ تک نہیں پہنچ سکی لیکن اسی وقت ٹیلے پر سے گولی چلی اور بل جونز ایک چیخ کے ساتھ زمین پر ڈھیر ہوگیا۔

بھاگ دوڑ میں ہم لوگ جلتی ہوئی کار سے کافی دور نکل آئے تھے اور وہاں شعلوں کی روشنی میسر نہیں تھی اس لیے مجھے اس ٹیلے پر فائر کی روشنی کے علاوہ کچھ نظر نہیں آیا لیکن بل جونز کے گرتے ہی ٹیلے پر سے کسی نے اس پر چھلانگ لگادی۔ میرے لیے یہ سمجھنا دشوار نہیں تھا کہ وہ سلطان شاہ ہی ہوسکتا تھا۔ میں نے پوری قوت کے ساتھ ان دونوں کی طرف دوڑ لگادی تاکہ بل جونز جیسے دیوہیکل سانڈ کے مقابلے میں سلطان شاہ کی مدد کرسکوں۔

میرے پہنچنے تک بل جونز' سلطان شاہ کی گرفت سے آزاد ہوچکا تھا اور وہ دونوں ایک دوسرے پر ٹوٹ پڑنے کے لئے موقع کی تلاش میں پاؤں بدلتے ہوئے ایک دائرے میں گھوم رہے تھے۔

میں نے پہلی ہی نظر میں دیکھ لیا کہ بل جونز خالی ہاتھ تھا۔ شاید سلطان شاہ کے حملہ آور ہوتے ہی پستول اس کے ہاتھ سے نکل گیا تھا۔ وہ نہ صرف غیر مسلح تھا بلکہ لنگڑا بھی رہا تھا۔

"بل جونز! ہاتھ اٹھالو۔ تمہارا کھیل ختم ہوچکا ہے" میں نے پستول تان کر اسے للکارا۔

میری زبان سے اپنا اصل نام سن کر وہ بری طرح چونکا اور گھبرائی ہوئی آواز میں بولا "تمہیں کوئی غلط فہمی ہوئی ہے۔ میں بل جونز نہیں' جیک رونالڈو ہی ہوں' تم یقیناً وہ نہیں ہو جو بنتے رہے ہو۔"

"پھر مجھے شاید کرنل جیسی جونز کا نام بھی بدلنا پڑے گا" میں نے ہوا میں فائر کرتے ہوئے کہا "مجھے افسوس ہے کہ آج کی رات وہ اپنی مجرمانہ سرگرمیوں کی وجہ سے اپنے اکلوتے وارث سے بھی محروم ہوجائے گا۔"

"تم کون ہو اور مجھ سے کیا چاہتے ہو؟" وہ شکست خوردہ اور پریشان نظر آنے کے باوجود خوفزدہ نہیں تھا۔

"یہ تم سب کا باپ 'ڈینی ہے" سلطان شاہ نے بڑھ کر اس کے گھٹنے پر ٹھوکر مارتے ہوئے کہا "اور یہ....."

وہ اپنی بات مکمل نہیں کرسکا کیونکہ بل جونز نے پھرتی سے اسے اپنے بازوؤں میں جکڑلیا تھا۔ اس طرح سلطان شاہ میرے اور اس کے درمیان حائل ہوگیا تھا۔ میں نے پینترا بدل کر بل جونز کے پہلو کو اپنے پستول کی زد میں لینے کی کوشش کی مگر بل جونز نے آسانی کے ساتھ سلطان شاہ کو اسی رخ پر اپنے سامنے کرلیا۔ ایسا معلوم ہورہا تھا جیسے سلطان شاہ اس کے مضبوط بازوؤں میں بالکل بے بس ہوکر رہ گیا ہو۔

سلطان شاہ کا اوپر اٹھا ہوا ہاتھ بالکل بے جان انداز میں نیچے گرا تو مجھے نازک صورتِ حال کا احساس ہوا۔ شاید بل جونز پوری قوت کے ساتھ اپنے بازوؤں میں اس کا سینہ دبا کر اس کا دم گھونٹنے کی کوشش کررہا تھا جس میں اسے کامیابی حاصل ہورہی تھی۔ سلطان شاہ جوش میں خود ہی اس شکنجے میں جا پھنسا تھا۔

"اسے فوراً چھوڑدو ورنہ میں تمہارا بھیجا اڑادوں گا۔" میں نے فوراً پستول کی نال کا رخ اس کی کھوپڑی کی طرف کردیا۔ وہ سلطان شاہ سے زیادہ دراز قامت تھا' اس لئے اس کا سر کسی آڑ میں نہیں تھا۔ میں نے غراتے ہوئے ایک فائر کردیا۔

میں نے فائر کرتے ہوئے بل جونز کے جسم کے کسی حصے کا نشانہ نہیں لیا تھا لیکن وہ دھماکے کے ردعمل میں ایک طرف جھکا تو گولی شاید اس کے کان کو چھیدتی ہوئی گزر گئی۔ بل جونز کا ایک ہاتھ غیر ارادی طور پر زخمی کان کی طرف گیا اور سلطان شاہ اپنی بدحالی کے باوجود اس کی گرفت سے آزاد ہونے میں کامیاب ہوگیا۔

"ٹھہرو!" اس نے اچانک فضا میں ہاتھ اٹھا کر کہا "مجھے محسوس ہورہا ہے کہ تم مجھے مارنا چاہتے ہو۔ لیکن میں اپنی زندگی کے عوض تمہارا کوئی بھی مطالبہ پورا کرنے کے لئے تیار ہوں۔"

"دونوں ہاتھ اٹھا کر تلاشی دینے کے بعد ہی تم سے کوئی بات کی جاسکتی ہے۔"

"پستول گرچکا ہے۔ میری جیب میں ایک بھرے ہوئے میگزین کے علاوہ اور کچھ نہیں ہے۔"

"میں دیکھنا چاہتا ہوں کہ ابھی تمہارے پاس کتنے بم باقی ہیں" میں نے تلخی سے کہا۔

"میں صرف دو میجک بالز لایا تھا۔ وہ دونوں استعمال ہوچکی ہیں" وہ بولا۔

"پھر تمہیں تلاشی دینے میں کیا اعتراض ہے؟ تلاشی دو یا مرنے کے لئے تیار ہوجاؤ۔"

وہ بھیانک انداز میں ہنس پڑا "تم بہت چالاک اور ضدی ہو" پھر ہاتھ اٹھاتے ہوئے بولا "آؤ! میری جامہ تلاشی بھی لے لو تاکہ پوری طرح اپنی تسلی کرسکو۔ یہ یاد رکھنا کہ میں موت سے ذرا بھی خائف نہیں ہوں۔ بس اتنی جلدی مرجانے کا تصور کچھ خوش گوار نہیں ہے۔ ابھی میں نے اپنی زندگی کی صرف چوبیس بہاریں ہی دیکھی ہیں۔"

سلطان شاہ نے اس کی تفصیلی جامہ تلاشی لی تو بھرے ہوئے میگزین اور ایک چھوٹے سے دھاتی خول کے علاوہ کچھ برآمد نہیں کرسکا۔ میجک بالز یا تباہ کن بموں میں سے کوئی باقی ماندہ بم دستیاب نہیں ہوسکا۔

وہ بیضوی دھاتی خول اتنا مختصر تھا کہ بہ آسانی ہتھیلی میں سماسکتا تھا لیکن اس کے ایک سرے پر اسی قسم کا اسپرے نوزل نظر آرہا تھا جیسا خوشبویات کی بیش قیمت بوتلوں پر لگا ہوا ہوتا ہے۔ اسے الٹ پلٹ کر دیکھنے کے باوجود میں کچھ نہیں سمجھ سکا تو بل جونز سے اس کے بارے میں سوال کیا۔

"یہ دھاتی خول ایک ہائی پریشر سلنڈر ہے۔ جس میں مائع حالت میں سی نائین نامی مہلک ترین گیس محفوظ ہے۔ اس گیس کی خفیف ترین مقدار بھی جسم میں داخل ہوجائے تو نصف سیکنڈ کی مدت میں انسان شریانوں میں خون جم جانے کے سبب سے ہلاک ہوجاتا ہے۔ نوزل کا سرا دبانے سے سی نائین کی بال سے زیادہ باریک دھار لمحہ بھر کے لئے خارج ہوکر خود بخود بند ہوجاتی ہے۔" اس نے سنجیدگی کے ساتھ بتایا۔

"گیس ختم ہونے کے بعد یہ خول ناکارہ ہوجاتا ہوگا؟" میں نے وہ خول اپنی جیب میں ڈالتے ہوئے کہا۔

"میں اسے گیس پستول کہتا ہوں اور اپنی تجربے گاہ میں دوبارہ بھر سکتا ہوں۔ تمہارے لئے یہ سو' سوا سو مرتبہ دبانے کے بعد ناکارہ ہوجائے گا۔ تم نے اسے اناڑی پن سے استعمال کیا تو خود بھی مرسکتے ہو۔"

"اپنے اس تحفے کے صحیح استعمال کا طریقہ بھی بتا ڈالو" میں نے نرمی سے کہا۔

"یہ گیس ہوا کے بعض اجزاء میں بہت تیزی کے ساتھ تحلیل ہوتی ہے۔ اس کا ایک اسپرے یا فائر چھ فٹ دور تک اثر کرتا ہے۔ احتیاط بس اتنی ہے کہ اسے چلانے کے بعد پندرہ سیکنڈ تک آدمی آگے نہ بڑھے۔ پسپائی میں کوئی حرج نہیں ہے۔ پندرہ سیکنڈ بعد' ہوا میں مل کر یہ گیس ناکارہ ہوجاتی ہے۔"

"شاید تم اسے ہم پر استعمال کرنا چاہ رہے تھے؟" سلطان شاہ نے طنز سے پوچھا۔

"جنگ میں ہر فریق کو اپنے ہتھیار آزمالینے کا پورا پورا حق حاصل ہوتا ہے۔"

"کیوں نہ اس گیس پستول کو تم پر ہی آزمایا جائے؟" سلطان شاہ نے استہزا کے ساتھ کہا۔

"تم مجھے اس سے نہیں مار سکوگے" وہ پورے اعتماد کے ساتھ بولا "ہمارا درمیانی فاصلہ اس وقت بھی چھ فٹ سے زیادہ ہے۔ اس کھلے میدان میں' میں اسے ہر وقت بڑھا سکتا ہوں۔"

مجھے بل جونز کی اس صاف گوئی نے متاثر کیا کہ اس نے اپنی نجات کے سارے دروازے بند کرنے کے بعد مجھے گیس پستول کے بارے میں دھوکا دینے کی کوشش نہیں کی تھی۔ اگر وہ اس میں کسی نادر قسم کی خوشبو کی موجودگی کا فریب دے کر اسے سونگھنے پر اکساتا تو اس کا ایک حریف کم ہوسکتا تھا۔ یہ اور بات ہوتی کہ میں اس کے راغب کرنے کے باوجود اس کے مشورے پر عمل کرنے پر تیار نہ ہوتا۔ میں نے فیصلہ کرلیا کہ اس کی موت کے عمل کو سہل اور مختصر ترین ہونا چاہئے تاکہ وہ تڑپنے کی کربناک اذیت سے بچ سکے۔

"تمہیں یہ جان کر خوشی نہیں ہوگی کہ البرٹو ویلیس اب زندہ نہیں ہے" میں نے قدرے سکوت کے بعد وہ انکشاف کیا تو حیرت اور بے یقینی سے بل جونز کا منہ کھل گیا۔ میں نے اپنی بات جاری رکھتے ہوئے کہا "یہ راز بھی کھل چکا ہے کہ تم لوگ کہوٹہ کے خلاف ڈیوڈ اسٹارز کے ایما پر کام کررہے ہو۔ میں یہ جاننا چاہتا ہوں کہ پاکستان کے خلاف ڈیوڈ اسٹارز کے کیا عزائم ہیں اور وہ ہمارے دشمن کیوں ہورہے ہیں؟"

"دشمنی کے اسباب ڈھکے چھپے نہیں ہیں۔ وہ ہر قسم کا نقصان پہنچانا چاہتے ہیں لیکن ہمارا اور ان کا موجودہ معاہدہ صرف کہوٹہ تک ہے" بل جونز نے اپنی زخمی ٹانگ کا بوجھ دوسرے پیر پر منتقل کرتے ہوئے کہا "یہاں آنے کے بعد مجھے اندازہ ہورہا ہے کہ ہم

نے ایک مشکل سودا مول لیا ہے۔ پاکستان کی سرزمین پر رہ کر اس ملک کے خلاف کام کرنا بچوں کا کھیل نہیں ہے۔ ہمارے معاہدے میں دراصل ڈیوڈ اسٹارز کا سرے سے ذکر نہیں ہے۔ ہمیں نیویارک کے راس المیڈا نامی ایک یہودی نے معاوضہ ادا کیا ہے۔ وہ خود بھی سرگرم ڈیوڈ اسٹار ہے اس لئے شاید ڈیوڈ اسٹارز کا نام نکل گیا ہے۔ راس المیڈا کا خیال تھا کہ ہم بہت جلد اپنا ہدف حاصل کرلیں گے تو پھر وہ ہم سے کوئی نیا معاہدہ کرے گا۔"

بل جونز کی وہ گفتگو قدرے بے ربط مگر معلومات افزا تھی۔ اس کی روشنی میں راس المیڈا کا ایک نیا نام سامنے آیا تھا جسے کسی مناسب وقت پر نشانہ بنایا جاسکتا تھا۔

"تمہارے وہ دوست کون ہیں جو البرٹو ۔ بلیسا کی غیر موجودگی میں تمہارا ساتھ دینے والے تھے؟" میں نے قطعی انجان بنتے ہوئے سوال کیا "پاکستان میں ان کے کیا رابطے ہیں؟"

"جمی لائیڈ۔" اس نے بلا تامل جواب دیا۔ "ایک زمانے میں وہ پاکستان میں بہت سرگرم رہا ہے۔ اسی کا کوئی نمائندہ مجھ سے رابطہ کرنے والا تھا لیکن اب تو اس قصے کو ختم ہی سمجھو۔"

"مقامی نمائندے کا نام اور ٹھکانا؟" میں نے سرد لہجے میں سوال کیا۔

"اسے چھوڑ دو۔" وہ دردمندانہ لہجے میں بولا "مجھے معلوم ہے کہ میرے بعد تم اس کی زندگی جہنم بنا دو گے۔ اس نے ابھی تک کچھ کیا ہی نہیں تو تم اس کا نام اور پتا لے کر کیا کرو گے؟"

"تمہاری مرضی۔" میں نے بے پروائی سے کہا۔ "ویسے ویرا لائیڈ کا نام میری لسٹ پر ہے۔"

"خدا کی پناہ! تم بہت دہشت ناک آدمی معلوم ہوتے ہو۔ معلوم ہوتا ہے کہ تم میرا امتحان لے رہے ہو۔"

"تمہارا امتحان لیا جاچکا ہے۔ تم اس میں پورے اترے ہو لیکن ہماری مجبوری ہے کہ ہم اپنے شکار کو زخمی کرنے کے بعد زندہ نہیں چھوڑتے۔ زخمی شکار ہمیشہ پلٹ کر خطرناک وار کرتا ہے' جسے جھیلنا آسان نہیں ہوتا۔ ہم اس خطرے کا پیشگی سدباب کرنے کے عادی ہیں۔"

"مجھے معلوم تھا کہ یہی ہوگا۔" وہ سرد اور جذبات سے عاری آواز میں بولا۔ "ایسے کھیلوں میں مارنے یا مارے جانے کے علاوہ تیسرا راستہ نہیں ہوتا۔ میں نے تمہیں پہلے ہی بتا دیا ہے کہ میں موت سے نہیں ڈرتا۔ میں تم سے زندگی کی بھیک نہیں مانگوں گا' تمہارے سامنے کھڑا ہوں جو چاہتے ہو وہ کر گزرو۔"

اس کے الفاظ اور لب ولہجے میں چھپے ہوئے حوصلے نے مجھے اندر سے ہلا کر رکھ دیا۔ اگر وہ نوجوان اپنے باپ کی وجہ سے غلط راستوں پر نہ چل پڑا ہوتا تو اپنی مردانگی کی بناء پر ایک مثال بن سکتا تھا۔

"تم بھاگ کیوں نہیں جاتے؟" سلطان شاہ نے اس سے ایک عجیب سا سوال کیا۔ "بھاگتے ہوئے مارے گئے تو تمہیں بھی سکون رہے گا کہ تم نے آخری سانس تک خود کو بچانے کی کوشش کی تھی۔"

وہ دھیمی آواز کے ساتھ ہنسا اور بولا "سنو! میں بھی راس المیڈا کی طرح یہودی ہوں۔ میں اپنے مذہب پر عمل نہیں کرتا لیکن زندگی اور موت کے بارے میں میرا وہی یقین ہے جو مسلمانوں کا ہے۔ جس کی موت آگئی اسے کوئی نہیں بچا سکتا اور جس کی زندگی باقی ہو اسے کوئی نہیں مار سکتا۔ میری زندگی باقی ہے تو گولی' چلنے سے پہلے ہی تمہارے پستول کی نال میں پھٹ جائے گی۔ گیس پستول کے نوزل میں آجائے گی۔ تمہارا ہاتھ کانپ جائے گا۔ کچھ بھی ہوسکتا ہے لیکن مجھ سے یہ امید مت رکھو کہ میں اپنی بازی ہار جانے کے بعد بھی کسی فاترالعقل دیوانے کی طرح زندگی کے لئے بھاگتا پھروں۔ میں تم دونوں کی حیوانی آنکھوں میں اپنی تقدیر کا لکھا پڑھ چکا ہوں۔"

"تمہارا مطلب ہے کہ کرنل جیسی جونز بھی یہودی ہے۔" میں نے حیرت سے پوچھا۔

"تمہیں اس میں کوئی شبہ نہیں ہونا چاہئے۔ وہ کٹر نہیں ہے اور نہ ڈیوڈ اسٹار ہے۔"

میں نے اپنا داہنا بازو سیدھا کرکے اس کی پیشانی کا نشانہ لینا چاہا تو میرا بازو کانپ رہا تھا۔ لیکن وہ میری آنکھوں میں آنکھیں ڈالے کسی چٹان کی طرح اٹل اور ساکت کھڑا ہوا تھا۔

میں نے اپنے بازو کی لرزش پر قابو پاتے ہی اس کی پیشانی کے وسط میں فائر کردیا۔ وہ کسی وزنی شہتیر کی طرح لڑکھڑا کر زمین پر گرا اور مغز میں پیوست ہونے والی گولی نے اسے جلد ہی ٹھنڈا کردیا۔

بل جونز میرے لئے ایک سخت جان حریف ثابت ہوا تھا۔ اس نے اپنی بے خوفی اور سخت جانی کی وجہ سے میرے دل میں گہرا نقش چھوڑا تھا۔ اس کے صاف ہوتے ہی میں سر جھکا کر سڑک کی طرف چل دیا۔

رات کے سناٹے میں وہ ویران سڑک خاصی دور تک نمایاں نظر آرہی تھی۔ ہم دونوں سڑک عبور کرکے پیدل ہی واپسی کی سمت چل پڑے۔ مدعا صرف یہ تھا کہ ایک ہی جگہ رک کر وقت برباد کرنے کے بجائے فاصلہ کم کرنے کی کوشش کی جائے۔ اس وقت ہم شہر سے اتنی دور تھے کہ ہمیں پیدل ہی وہ سفر طے کرنا پڑجاتا تو ہم صبح کا اجالا پھیلنے سے پہلے آبادی کے آثار بھی نہیں دیکھ سکتے تھے۔

"یہ قصہ تو بالکل ہی بودا ثابت ہوا" سلطان شاہ نے سکوت توڑنے کی نیت سے گفتگو کا سلسلہ چھیڑ دیا "ایک ہی جھٹکے میں کرنل جیسی جونز کے بیٹے کا تیا پانچا ہوگیا۔ ویسے لڑکا بہت جی دار تھا۔"

"تم نے بالا ہی بالا قصہ نمٹا لیا ہے۔ اب دیکھنا ہے کہ اول خان کتنا تلملاتا ہے۔" میں نے بوجھل ہنسی کے ساتھ کہا۔ "وہ اس بار بھی بہت سنجیدگی کے ساتھ بھاگ دوڑ میں لگا ہوا تھا۔ صبح اس کے اوسان خطا ہوجائیں گے۔"

"لیکن لطف آگیا۔ کافی دنوں بعد ہاتھ پیر کھلے ہیں۔ اول خان کے آدمیوں کی موجودگی میں ہمارا کردار بہت محدود ہوتا ہے۔ ساری مار دھاڑ وہ کر گزرتے ہیں۔ کبھی کبھی تو مجھے یہ محسوس ہونے لگتا ہے کہ جیسے بے قاعدہ طور ہم دونوں بھی اسپیشل ٹاسک فورس میں شامل ہوچکے ہیں۔"

"مجبوریاں" میں نے سگریٹ سلگانے کے بعد کہا "ہم نے خوشی سے کبھی بھی ایس ٹی ایف کو شامل نہیں کیا۔ جب معاملات بے مہار ہوکر قابو سے نکلتے ہوئے نظر آئے' تب ہی ہم نے اول خان کو اعتماد میں لیا ہے۔ ایسے مواقع پر ہمیں اس کا تعاون حاصل نہ ہوتا تو ہم بہت پہلے مارے گئے ہوتے۔"

"خوشی کی بات یہ ہے کہ اب حالات کی گرد دبتی نظر آرہی ہے۔ شاید ہم کچھ عرصے تک سکون کے ساتھ اپنے ذاتی معاملات پر توجہ دے سکیں گے۔ ہر وقت کی آپا دھاپی نے بری طرح تھکا کر رکھ دیا ہے۔"

"ویرا تو تمہارے ذاتی معاملات کے حل میں کئی بار گہری دلچسپی لے چکی ہے۔ تم خود ہی اس بارے میں سنجیدہ نہیں ہوتے ہو۔ اب دیکھ لو کہ اس کے لیے جمی لائیڈ نے امریکا سے بر روانہ کیا تو اسے ہم نے مار ڈالا۔ ویرا ابھی کب تک کسی کٹی ہوئی پتنگ کی طرح آوارہ اور اکیلی پھرتی رہے گی؟"

"ویرا پر لعنت بھیجو۔" وہ جھلا کر بولا "تمہیں بھی اب اپنے گھر بار کی فکر کرنی چاہئے۔ جہانگیر کے فلیٹ میں کب تک خانہ بدوشی کی زندگی گزارتے رہو گے؟ کبھی نہ کبھی تو تمہیں اپنا بندوبست کرنا ہی ہوگا۔"

"فی الحال کسی لفٹ کا بندوبست کرو۔ باقی سوچ بچار بعد میں ہوتی رہے گی۔" میں نے عقب سے آنے والی روشنی پر رک کر پلٹتے ہوئے کہا اور ہم دونوں ہی شہر کی طرف جانے والی گاڑی کے انتظار میں سڑک کے کنارے کھڑے ہوگئے تاکہ اسے ہاتھ کے اشارے سے روک سکیں۔

ویران سڑک پر وہ گاڑی بہت تیز رفتاری کے ساتھ چلی آرہی تھی۔ ہم دونوں نے بے تابانہ انداز میں ہاتھ ہلا ہلا کر اسے روکنے کا اشارہ کیا لیکن اس کی رفتار میں کوئی کمی نہیں آئی وہ زن کی آواز کے ساتھ ہمارے قریب سے گزری تو پتا چلا کہ وہ پرائیویٹ کار تھی۔ اس میں صرف ایک ہی آدمی سوار تھا۔ شاید اسی لیے اس نے ہم دونوں کو اپنے ساتھ بٹھا کر کوئی خطرہ مول لینے سے گریز کیا تھا۔

سلطان شاہ اپنا سر جھٹک کر بڑبڑاتا ہوا آگے بڑھ گیا۔ میں بھی اس کے ساتھ ہولیا۔

اس کے بعد ایک وین اور پک اپ بھی آئی اور رکے بغیر گزر گئی۔ اس غیر آباد اور ویران علاقے میں رات کے وقت کوئی بھی دو مشتبہ اجنبیوں کی خیر خواہی کرنے پر آمادہ نہیں تھا اور مجھے یہ تصور کرکے ہی اپنے بدن میں درد کا احساس ہونے لگا تھا کہ شہر تک یونہی پیدل جانا پڑے گا۔

کافی دیر بعد شہر کی طرف سے پہلی گاڑی کی روشنیاں نمودار ہوئیں تو ہم دونوں نے پھرتی کے ساتھ سڑک عبور کرلی۔ ایک بار کوئی شریف رکنے پر آمادہ ہوجاتا تو ہم خوشامد درآمد کے ذریعے اسے اپنی مدد پر آمادہ کرسکتے تھے۔ شہر کی طرف سے آنے والے کو بھاری معاوضے کا لالچ دے کر واپسی کے سفر پر بھی تیار کیا جاسکتا تھا۔ لیکن شرط یہی تھی کہ کوئی ہمارے اشاروں پر رکنے پر آمادہ ہوتا۔

آنے والی گاڑی کے سفر کی سمت الٹی تھی لیکن اس بار ہمارے ستارے کچھ سیدھے کہ دور ہی سے گاڑی کی رفتار میں کمی کے آثار نظر آنے لگے اور ہمارے اشاروں میں تیزی آگئی۔

"یہ نہ رکا تو ہم بڑے بڑے پتھر ڈال کر سڑک بلاک کردیں گے" سلطان شاہ غصے میں بولا "پھر دیکھیں گے کہ کوئی ہمیں کیسے نظر انداز کرتا ہے۔"

"اگر ہمارے مقدر میں پیدل چلنا لکھ دیا گیا ہے تو آنے والی گاڑیوں کے ڈرائیور' سڑک پر رکاوٹیں دیکھتے ہی واپس لوٹ جائیں گے اور ہم دونوں اپنے سر پیٹتے رہ جائیں گے۔"

وہ گاڑی ہمارے قریب آکر رکی تو یہ دیکھ کر خوشی ہوئی کہ وہ ایک ٹیکسی تھی۔ ڈرائیونگ سیٹ پر ایک درشت رو نوجوان بیٹھا ہوا تھا۔ گاڑی روکتے ہی اس نے ہم دونوں پر اشتباہ آمیز نظریں ڈالیں تو مجھے احساس ہوا کہ ہمارے کپڑے مٹی میں اٹے ہوئے تھے۔ سلطان شاہ کے کپڑوں پر تو شاید خون کے دھبے بھی تھے جو گہرے رنگ کی وجہ سے نمایاں نہیں تھے۔ شاید دوسروں کے نہ رکنے کی وجہ ایک یہ بھی تھی کہ ہمارے حلئے بہت مشتبہ تھے جبکہ ٹیکسی ڈرائیوروں کو اپنی روزی کمانے کے لئے ہر قسم کے برے بھلے لوگوں کو برداشت کرنا پڑتا ہے۔ کراچی واپسی کا ذکر سنتے ہی ڈرائیور ہتھے سے اکھڑ گیا۔ اس نے فوراً ہی گاڑی آگے بڑھانی چاہی لیکن اس وقت تک سلطان شاہ ڈرائیور کی سمت میں پہنچ چکا تھا۔ اس نے پھرتی کے ساتھ اگنیشن آف کرکے چابی اپنے قبضے میں لے لی۔ ڈرائیور غصے اور بوکھلاہٹ کے عالم میں ہکلا کر رہ گیا۔

"یہ ٹیکسی ہے اور خالی ہے' ہم کہیں گے تو کراچی کیا' تمہیں جہنم میں بھی جانا پڑے گا۔" سلطان شاہ غرایا۔

"چابی دو ورنہ میں پیٹ پھاڑ دوں گا۔" ڈرائیور سرد آواز میں غرایا۔ اس نے بہت پھرتی کے ساتھ کہیں سے ایک چھوٹا سا ریوالور نکال لیا تھا۔ "میں تمہارے باپ کا نوکر نہیں' اپنی مرضی کا مالک ہوں۔"

وہ بدمعاشی دکھانے پر تل گیا تھا۔ اس لئے مجھے سلطان شاہ ساتھ دینا ہی پڑا۔ ٹیکسی ڈرائیور کا خیال تھا کہ اس کا اکلوتا ریوالور ہم دونوں کو خوف زدہ کرنے کے لئے کافی ہوگا۔ اس لئے وہ مجھے نظر انداز کرکے صرف سلطان شاہ کی طرف متوجہ تھا جو اس کی چابی پر قابض تھا۔ میں نے خاموشی کے ساتھ اپنا پستول نکالا اور اس کی

مہیب آہنی نال ٹیکسی ڈرائیور کی کنپٹی سے لگاتے ہوئے غرا کر کہا "جلدی سے اپنا ریوالور میرے ساتھی کو دے دو۔ ورنہ گولی مار دوں گا۔"

ٹیکسی ڈرائیور کو ہم دونوں کی طرف سے اتنے سنگین رد عمل کی توقع نہیں تھی۔ اس نے فوراً ہی اپنا ریوالور سلطان شاہ کی طرف بڑھا دیا۔ سلطان شاہ نے اسے غیر مسلح کرتے ہی گریبان سے پکڑ کر ٹیکسی سے نیچے اتار لیا۔ "ٹیکسی چلاتے ہو یا بدمعاشی کرتے ہو؟" اس نے ڈرائیور کے گریبان کو جھٹکا دیتے ہوئے ڈپٹ کر پوچھا۔

"چور ڈاکوؤں سے اپنے بچاؤ کے لئے آج کل ہتھیار لے کر چلنا ہی پڑتا ہے۔" وہ گڑگڑا کر بولا۔ "مجھے صرف اپنی جان بچانی تھی' ورنہ مجھے تم سے کیا دشمنی ہے؟ تم نے خود ہی اشارہ کرکے مجھے روکا ہے۔"

"اب کراچی چلنا ہے یا نہیں؟ میٹر سے سو روپے زیادہ ملیں گے۔" سلطان شاہ نے پوچھا۔

"نہیں مائی باپ۔ گاؤں میں میری ماں بیمار ہے۔ آگے چلنا ہے تو چلو' میں تم سے کرایہ نہیں لوں گا۔ لیکن میں کسی بھی قیمت پر کراچی واپس نہیں جاؤں گا۔ میری ماں بیمار ہے۔"

"کیا اپنی ماں کی بیماری کی رٹ لگا رکھی ہے۔ ایک آدھ گھنٹے کی دیر سے وہ مر نہیں جائے گی۔"

"نہیں مائی باپ! وہ بہت...... بہت ہی زیادہ بیمار ہے۔ میں تمہارے پیر پکڑتا ہوں۔"

"اسے پچھلی سیٹ پر ڈال دو۔" میں نے سرد لہجے میں سلطان شاہ سے کہا "میں پیچھے اس کی گردن دبا کر بیٹھوں گا' تم ٹیکسی کراچی کی طرف لے چلو۔ یہ سیدھی طرح ہماری بات نہیں مانے گا۔"

اس نے پائیدان پر پیر ٹکا کر خاصا زور لگایا کہ سلطان شاہ اسے پچھلی سیٹ پر نہ ڈال سکے لیکن سلطان شاہ پیدل چلنے پر اس قدر بھنایا ہوا تھا کہ اس نے دو تین ہاتھ مار کر ڈرائیور کے کس بل ڈھیلے کردیے اور اسے کسی مویشی کی طرح اندر ڈال دیا جہاں میں اسے دبوچنے کے لئے تیار تھا۔

ٹیکسی واپس روانہ ہوتے ہی اس نے پھر واویلا مچانا شروع کردیا۔ ساتھ ہی وہ ہاتھ پیر بھی چلا رہا تھا۔

"ابے چین سے بیٹھ!" میں نے اس کی گردن پر ہاتھ رسید کرتے ہوئے کہا "شہر پہنچ کر ہم تجھے اور تیری ٹیکسی کو چھوڑ دیں گے۔ پھر تجھے اپنی ماں کے پاس جانے سے کوئی نہیں روک سکے گا۔"

"مم...... مگر میں کراچی جانا ہی نہیں چاہتا۔ تم مجھے یہیں اتار دو۔" وہ پھر مچل گیا۔

"اور تیری ٹیکسی؟" میں نے اس کے عجیب و غریب مطالبے پر حیرت سے پوچھا "تو اپنی ماں کے پاس کیسے جائے گا' ابھی تو اس کے پاس جانے کے لئے مرا جا رہا تھا۔ یہاں سے تجھے کون سی سواری ملے گی۔"

"ماں کی ایسی کی تیسی! میری کوئی ماں نہیں ہے۔ بس تم مجھے اتار دو۔ ٹیکسی بھی تم لے جاؤ۔"

اس نے کئی قلابازیاں کھا کر مجھے شبے میں مبتلا کردیا۔ اس کی حیلہ سازی سے یہ ظاہر ہو رہا تھا کہ وہ کراچی جانے پر تیار نہیں تھا۔ خواہ اسے ساری رات پیدل ہی چلنا پڑتا۔

وہ خاصا ڈھیٹ اور سخت جان تھا۔ میں نے مزید دو چار گھونسے ہاتھ رسید کئے تو وہ راہ راست پر آگیا اور تقریباً گھگیاتے ہوئے بولا "خدا کے لئے مجھے یہیں اتار دو اور ٹیکسی تم لے جاؤ لیکن اتنا یاد رکھنا کہ اس ٹیکسی میں شہر میں گھسے تو تم بھی مصیبت میں پھنس جاؤ گے۔"

میرے کان کھڑے ہوگئے "اس ٹیکسی میں کیا خرابی ہے؟ کیا یہ چوری کی ہے؟"

"ہاں!" اس نے سر ہلاتے ہوئے کہا "یہ میں نے ڈرائیور کو پستول دکھا کر گلشن اقبال سے چھینی تھی۔ اب تک شہر بھر میں اس کی تلاش شروع ہوچکی ہوگی۔ تم میرے منہ سے روٹی چھین رہے ہو۔ یہ صرف میرے گاؤں میں محفوظ رہ سکتی ہے۔ تم مجھ سے چھین کر شہر لے گئے تو یہ تم سے بھی چھن جائے گی۔ مجھے یہ ٹیکسی گاؤں لے جانے دو یا پھر یہیں اتار دو۔ میں گرفتاری اور پولیس کی مار دھاڑ سے بہت ڈرتا ہوں۔"

سلطان شاہ نے اچانک بریک لگا کر ٹیکسی کو کنارے سے روک لیا اور غراتے ہوئے بولا "پھینکو سالے کو باہر! بلاوجہ چیخ چیخ کر ہمارا دماغ خراب کر رہا ہے۔ جیسے یہ اس کے باپ کی ٹیکسی ہے۔"

"تو کیا تم واقعی مجھے میری کمائی سے محروم کرنے کا فیصلہ کرچکے ہو؟" ڈرائیور نے روہانسی آواز میں پوچھا۔

"تیری کمائی؟" میں نے اسے ایک ہاتھ مارا۔ "اتر جلدی نیچے ورنہ ابھی گولی مار دوں گا۔"

"اللہ تیرا شکر" وہ دروازے کی طرف کھسکتے ہوئے کراہا پھر میری طرف مڑ کر بولا "ٹیکسی زبردستی چھین کر لے جا رہے ہو تو میرا ریوالور تو مجھے دے دو۔ کڑکی میں بس اپنا ایک یہی آسرا رہ گیا۔"

"تاکہ کل تو دوسری کوئی گاڑی ہتھیا سکے۔ بھاگ جلدی۔ تجھے کچھ واپس نہیں ملے گا۔" میں نے ڈپٹ کر کہا۔

وہ دروازہ کھول کر سرعت سے باہر نکل گیا۔ اسی لمحے سلطان شاہ نے اپنا ہاتھ کھڑکی سے باہر نکال کر اس کا ریوالور اس کے قریب پھینک دیا۔ سڑک پر لوہا گرنے کی وزنی کھنک سنائی دی اور ہماری ٹیکسی تیزی کے ساتھ آگے پھسلتی چلی گئی۔

"یہ کیا حرکت تھی؟ میرے انکار کے باوجود تم نے اسے ریوالور کیوں لوٹایا؟"

"ڈپٹی صاحب! اس دنیا میں بھلوں کے ساتھ ساتھ بروں کو بھی زندہ رہنے کا کچھ حق حاصل ہے۔" سواری میسر آجانے کے بعد سلطان شاہ ترنگ میں آگیا تھا۔ "میں نے اس کی چیز اسے واپس دے کر کیا برا کیا؟"

"اب وہ اس ریوالور کی نال پر اور گاڑیاں چھینے گا۔ اس کی ذمے داری تم پر ہوگی۔"

"ذرا یہ بھی تو سوچو کہ وہ اپنی جان پر کھیل کر یہ ٹیکسی چھین کر لایا تھا جس پر ہم مزے سے سوار ہیں۔ وہ تو ہمارے لئے رحمت کا فرشتہ بن کر آیا تھا۔ وہ نہ آتا تو پیدل چل چل کر پلیتھن نکل گیا ہوتا۔ اتنی بڑی خدمت کا انعام دینے کے بجائے ہم اسے ریوالور سے بھی محروم کردیتے تو کیسا ظلم ہوتا؟"

"میرا خیال ہے کہ بل جونز نے پوری قوت سے تمہارا سینہ بھینچ کر اسی بسیار گوئی کی پیشگی سزا دی تھی۔" میں نے غصے سے کہا "جزا و سزا اور عمل و رد عمل کے اصولوں کی بات کرو گے تو پھر ہر بات کا جواز ڈھونڈتے ڈھونڈتے پاگل ہو جاؤ گے۔ تم نے ایک غلط حرکت کی ہے تو غلطی مان لو۔ اس کے لئے جواز اور تاویلیں پیش نہ کرو۔"

وہ ڈھٹائی سے ہنسنے لگا۔ "چلو مان لیا کہ میں نے غلطی کی تھی لیکن تمہیں یہ ماننا پڑے گا کہ ٹیکسی چھین کر لانے والا بہت بڑا اداکار تھا۔ اس نے اتنی مظلومیت کے ساتھ اپنی ماں کی بیماری کا ذکر کیا تھا کہ میرا دل پسیجنے لگا تھا۔"

"بعد میں اس نے اپنی ماں کی ایسی کی تیسی بھی کر ڈالی تھی۔" میں نے تلخی سے کہا۔

"وہ ٹیکسی چھین کر ہم تک پہنچانے میں اس نے بڑی محنت کی تھی۔ اب وہ ہمیں کوس رہا ہوگا۔ اگر اس کی بددعا لگ گئی اور پولیس نے ہمیں اس چھینی ہوئی ٹیکسی سمیت روک لیا تو ہم کیا کریں گے؟"

"خاموشی سے حوالات میں چلے جائیں گے۔" میں نے رکھائی سے جواب دیا۔

"اگر تمہارا یہی ارادہ ہے تو مجھے بھی یہیں اتار دو۔" اس نے ٹیکسی کی رفتار کم کرتے ہوئے کہا۔ "ورنہ کوئی سنجیدہ حل سوچو۔ ہم ڈکیتی در ڈکیتی کے مرتکب ہوئے ہیں اور یہ مسئلہ بہت سنگین ہے۔"

"پیدل چلتے ہوئے تمہاری زبان کو تالا لگ گیا تھا اب بہت روانی سے بول رہے ہو؟"

"خدا جب کار دیتا ہے تو روانی آہی جاتی ہے۔" وہ سر کے ساتھ گنگنایا اور میں بے ساختہ ہنس پڑا۔

"بالکل بھانڈ معلوم ہو رہے ہو۔ زبان روک کر گاڑی کی رفتار بڑھاؤ۔"

"غضب خدا کا! ہم ساٹھ کلومیٹر کی رفتار سے بیس منٹ سے ڈرائیونگ کر رہے ہیں اور ابھی تک شہر کی مضافاتی آبادیوں کی روشنی تک نظر نہیں آئی ہے۔ شاید ہم جوش میں شہر سے بہت دور نکل گئے تھے" وہ ایکسلیٹر پر اپنے پاؤں کا دباؤ بڑھاتے ہوئے بڑبڑایا "خدا بل جونز کو غرق کرے۔ اس نے تو ہمیں مروا ہی دیا تھا۔"

گاڑی اس ویران سڑک پر تیزی کے ساتھ فراٹے بھرتی رہی۔ وقفے وقفے سے سلطان شاہ کی زبان بھی چلتی گئی۔ سڑک پر انجن کی مسلسل اور یکساں گونج نے رات کی تاریکی میں کچھ ایسا خواب آور آہنگ اختیار کرلیا تھا کہ سلطان شاہ کی آواز اس تسلسل کو مجروح نہ کرتی رہتی تو میرے اوپر غنودگی طاری ہونے لگتی۔

آبادی کی روشنیوں کے ابتدائی آثار نظر آتے میں اپنی نشست پر سنبھل کر بیٹھ گیا اور پولیس سے کسی متوقع مڈبھیڑ کے امکانات پر غور کرنے لگا۔

میری یادداشت کے مطابق ہمارے راستے میں پولیس والوں کی آخری چیک پوسٹ بنارس چوک سے چند سو گز آگے پڑی تھی اور واپسی میں وہی ہماری پہلی چیک پوسٹ ہوسکتی تھی۔ معاً مجھے اس کچے اور نیم پختہ راستے کا خیال آیا جو سیمنٹ کی چادریں بنانے والی فیکٹری کے قریب سے ہو کر پہاڑیوں کے درمیان سے گزرتا ہوا نیو کراچی میں نکلتا ہے۔ اس راستے کو اختیار کرکے ہم پولیس والوں کا سامنا کئے بغیر شہری آبادی میں داخل ہوسکتے تھے۔ نیو کراچی میں مسروقہ ٹیکسی سے چھٹکارا حاصل کرکے' گھر پہنچنے کے لئے دوسری سواری حاصل کی جاسکتی تھی۔

روشنیوں کے قریب آجانے پر سلطان شاہ نے ایک مرتبہ پھر پولیس والوں کے خطرے کا ذکر چھیڑا تو میں نے اسے کچھ دیر تنگ کرنے کے بعد اپنے مجوزہ راستے کے بارے میں بتایا تو وہ مگن ہوگیا۔ "مجھے پہلے ہی معلوم تھا کہ تمہارے ذہن میں اس مسئلے کا کوئی نہ کوئی حل ضرور موجود ہوگا ورنہ تم اتنے اطمینان کے ساتھ مسروقہ ٹیکسی میں سفر نہیں کرسکتے تھے۔"

○☆○

ہم نو بجے گھر سے روانہ ہوئے تھے۔ واپس پہنچے تو رات کے دو بج رہے تھے۔ ہماری تمام تر کوششوں کے باوجود واقعات کچھ اس ڈھب پر چل رہے تھے کہ شب بیداری ہمارا معمول بنتی جا رہی تھی۔

جب ویرا نے دروازہ کھولتے ہی سرگوشیانہ لہجے میں یہ اطلاع دی کہ فلیٹ کے ڈرائنگ روم میں سردار پائندہ گل میرا انتظار کر رہا ہے تو حیرت سے میری آنکھیں پیشانی پر جا چڑھیں۔ میرے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا کہ وہ مجھ سے ملاقات کے لئے شکارا دیلی سے وہاں تک دوڑ لگائے گا۔

"وہ کب آیا ہے اور کیا چاہتا ہے؟" میں نے باہر کھڑے کھڑے سرگوشیانہ لہجے میں پوچھا۔

"وہ گیارہ بجے سے تمہارا منتظر ہے اور صرف تم سے ملنا چاہتا

ہے۔ جب سے آیا ہے کھائے پیئے بغیر بیٹھا ہے۔"

"لیکن تم نے اسے گھر میں کیوں بٹھایا ہوا ہے؟ کیا اس نے زبردستی کی تھی؟"

"نہیں۔ وہ تو عورتوں کی موجودگی کا ذکر سنتے ہی واپس جا رہا تھا لیکن اس کی متبرک اور مقدس وضع قطع سے متاثر ہو کر غزالہ نے اسے گھر میں بٹھالیا۔ میں اس وقت نہا رہی تھی۔"

"خدا خیر کرے۔ اس کا آنا کوئی اچھی بات نہیں ہے۔" میں بڑبڑاتے ہوئے اندر داخل ہو گیا اور لابی سے گزر کر سیدھا اپنے کمرے کی طرف ہو لیا۔ ویرا میرے پیچھے پیچھے تھی۔

"میرا حال ابتر ہے۔ اسے بتا دو کہ میں حلیہ درست کر کے آتا ہوں۔"

"تمہیں میری غیر موجودگی میں ایک اجنبی مرد کو گھر میں بٹھانے کی کیا ضرورت تھی؟" ویرا کے جانے کے بعد، میں نیچی آواز میں غزالہ پر برس پڑا۔ "تمہیں معلوم ہے کہ وہ ہیروئن کا اسمگلر اور ایک مجرم ہے۔"

"اس کی صورت اس قدر مقدس اور نورانی ہے کہ میں اسے لوٹا نہ سکی۔ اس نے نگاہیں نیچی کر کے مجھے بیٹی کہہ کر مخاطب کیا تھا۔ اسے دیکھ کر مجھے یقین نہیں آسکا کہ وہ کوئی برا آدمی ہو گا۔ قتل و خوں ریزی اور نسل در نسل انتقام کے واقعات تو ان لوگوں کی معاشرت کا ایک روایتی حصہ ہیں۔"

میں دانت پیستا ہوا غسل خانے میں داخل ہو گیا۔ عجلت میں غسل کر کے میں نے لباس تبدیل کیا تو سلطان شاہ مجھ سے پہلے تیار ہو کر اسی کمرے میں میرا منتظر تھا۔

"تم میرے ساتھ آؤ لیکن یہ یاد رکھنا کہ فلیٹ میں کوئی تصادم نہیں ہو گا۔ تم کسی بات میں دخل نہیں دو گے اور میرا اشارہ پاتے ہی وہاں سے اٹھ جاؤ گے۔" میں نے سلطان شاہ سے کہا اور اس کمرے سے نکل گیا۔ اس وقت بے یقینی اور سنسنی کی وجہ سے مجھے اپنا دل کنپٹیوں میں دھڑکتا ہوا محسوس ہو رہا تھا۔

میں ڈرائنگ روم میں داخل ہوا تو چوکھٹ پر قدم رکھتے ہی اپنی جگہ مبہوت ہو کر رہ گیا۔ بڑے بڑے پائنچوں والی، ٹخنوں سے اونچی شلوار پر ڈھیلے ڈھالے کرتے میں ملبوس ایک روایتی قبائلی سردار ننگے پاؤں میرے روبرو موجود تھا۔ اس جسیم شخص کا قد کسی بھی طرح سوا چھ فٹ سے کم نہیں تھا جو اس کے سر پر موجود بہت بڑی پگڑی کی وجہ سے فلیٹ کی چھت تک پہنچتا ہوا محسوس ہو رہا تھا۔ کشادہ پیشانی کے نیچے بڑی بڑی سیاہ آنکھوں میں خمار کے سرخ ڈورے تیر رہے تھے۔ ان آنکھوں میں ایسی ساحرانہ کشش تھی جو دیکھنے والے کو بے چین کر سکتی تھی۔ لمبی اور طوطے کی چونچ کی طرح آگے سے خم کھائی ہوئی ناک کے نیچے مونچھیں صاف تھیں لیکن بھرے بھرے چوڑے جبڑے اور سرخ و سفید چہرے پر دھنکی ہوئی روئی جیسے سفید بالوں پر مشتمل گھنی داڑھی سینے تک پہنچی ہوئی تھی۔ اس کے قد کاٹھ کے سامنے وہ ڈرائنگ روم بہت حقیر اور تنگ نظر آ رہا تھا۔ مجھے حیرت ہوئی کہ اس کے پر شکوہ وجود پر کوئی ہتھیار نہیں سجا ہوا تھا۔

"میرا نام سردار پائندہ گل ہے۔" پتلے پتلے، گلابی ہونٹوں کو جنبش ہوئی اور لہجہ دھیما ہونے کے باوجود وہ کمرا اس آواز کی گونج سے بھر گیا۔ پھر سیاہ و سفید بھووں کے نیچے چمکتی ہوئی آنکھوں نے متجسسانہ انداز میں ہم دونوں کا جائزہ لیا۔ چند ثانیوں کے سکوت کے بعد وہ پھر بولا۔ "تم میں ڈینی کون ہے؟"

"مجھے ڈینی کہتے ہیں۔" میں مصافحے کے لئے اپنا داہنا ہاتھ پھیلا کر اس کی طرف بڑھا۔

اس نے پرتپاک انداز میں میرے ہاتھ کو اپنی جناتی ہتھیلی کی گرفت میں لے کر گرمجوشی سے دبایا اور مجھے اپنے ہاتھ کی ہڈیاں کڑکڑاتی ہوئی محسوس ہوئیں۔ وہ اندر سے بھی اسی قدر سخت، مستحکم اور طاقتور تھا جتنا دیکھنے میں نظر آتا تھا۔ میرا خیال تھا کہ ہم دونوں مل کر بھی اس بوڑھے سردار کو زیر نہیں کر سکتے تھے۔

"تم سے میری فون پر بات ہوئی تھی اور اب میں تم سے ملنے آیا ہوں۔" اس نے میرا ہاتھ چھوڑ کر سلطان شاہ کی طرف متوجہ ہوتے ہوئے کہا۔

سلطان شاہ سے تعارف کرانے کے بعد میں نے اسے بیٹھنے کے لئے کہا تو وہ صوفے کے بجائے قالین پر بیٹھ گیا۔ شاید وہ پہلے بھی نیچے ہی بیٹھا ہوا تھا۔ میں نے نیچے بیٹھتے ہوئے اس سے دیر سے واپسی پر معذرت کی اور کھانے پینے کے بارے میں دریافت کیا تو نپی تلی، دھیمی آواز میں بولا۔ "اس گھر کی عورتیں بہت نرم خو اور مہمان نواز ہیں۔ ان بچیوں نے بھی مجھ سے بہت اصرار کیا تھا لیکن اجنبیوں کے گھر کچھ کھانا پینا ہماری روایات میں نہیں ہے۔..."

"مگر سردار! فون پر بات ہونے کے بعد ہم اجنبی نہیں رہے ہیں۔" میں نے اس کی بات اچک کر کہا "تم ہمارے مہمان ہو اور مہمان نوازی ہمارے خون میں شامل ہے۔ ہماری بھی کچھ روایات ہیں۔"

میری چھٹی حس مجھے کسی خطرے کا احساس دلا رہی تھی اس لئے میں نے سردار پائندہ گل کی شخصیت کا سحر توڑنے اور اس سے برابری کی سطح پر بات کرنے کے لئے دانستہ اس کی قطع کلامی کی تھی۔

"ضد نہ کرو۔" وہ مربیانہ انداز میں ہاتھ اٹھا کر بولا۔ "پہاڑوں میں ہتھیار ہمارے زیور اور محافظ ہماری آن ہوتے ہیں لیکن تمہارے گھر آنے کے لئے میں ہتھیار اتار کر آیا ہوں۔ میرے محافظ یہاں سے دور، ایک ہوٹل میں میری واپسی کا انتظار کر رہے ہیں۔ جب ہم دوست بن جائیں گے تو میں تمہارے گھر کھانا بھی کھا لوں گا۔ میں نے تمہارے لئے اپنی دو روایتیں توڑ دی ہیں۔ تیسری کے لئے مجبور نہ کرو۔"

"تو کیا اب ہم دوست نہیں ہیں؟" میں نے اس کی صاف گوئی پر حیرت سے پوچھا۔

"میں یہی فیصلہ کرنے آیا ہوں۔" اس نے پرعزم لہجے میں کہا۔ "مجھے تخلیئے میں تم سے کچھ باتیں کرنی ہیں پھر میں چلا جاؤں گا۔ مجھے افسوس ہے کہ میں نے آتے ہی تمہیں گھیر لیا۔ اگر تمہیں بھوک لگ رہی ہے تو تم کھانے سے فارغ ہو سکتے ہو۔ میں کچھ دیر اور انتظار کر لوں گا۔"

"نہیں۔ میں بعد میں کھانا کھا لوں گا۔ تم نجانے کب سے بھوکے پیاسے بیٹھے ہو۔"

"عبدالرحیم خان میری جان تھا۔" وہ دل گرفتہ آواز میں بولا۔ "اس کے قتل کے بعد میری بھوک پیاس اڑ چکی ہے۔ میری رگوں میں آگ بھر گئی ہے اور دل میں انتقام کے الاؤ دہک اٹھے ہیں۔ جب تک میں اپنے اس پیارے کے قاتل کو پیوند خاک نہیں کروں گا، میری زندگی خالی اور بے مقصد رہے گی۔ تم جاؤ اور اپنا پیٹ بھر لو تاکہ ہم پوری توجہ کے ساتھ دو دو باتیں کر سکیں۔"

"نہیں، تم اپنی بات کرو۔ میں پوری توجہ کے ساتھ سن رہا ہوں۔" اس کی رمز آمیز گفتگو سن کر میرا دل ہول رہا تھا۔ وہ نجانے کیا کہنا چاہتا تھا؟ گھما پھرا کر کس قصے کی تمہید باندھ رہا تھا؟

"پھر تخلیئے کا بندوبست کرو!" اس نے سلطان شاہ کی طرف دیکھا۔

میں نے سلطان شاہ کی طرف سر گھمایا تو میری نظریں ان بڑی بڑی چپلوں پر پڑیں جو دروازے کے قریب پڑی ہوئی ایک کرسی کے نیچے رکھی ہوئی تھیں۔ انہیں دیکھ کر سردار پائندہ گل کے ننگے پیروں کے بارے میں میرا تجسس دور ہو گیا۔ وہ فرش نشینی کا عادی تھا اس لئے چپلیں اتار کر بیٹھا تھا۔

سلطان شاہ میری آنکھ کا اشارہ پاتے ہی وہاں سے اٹھ کر چلا گیا۔

"دروازہ بھی بند کر دو!" سردار پائندہ گل کی حالت عجیب ہوتی جا رہی تھی۔

"اس کی ضرورت نہیں۔ کوئی ادھر نہیں آئے گا۔ تم بے خوف ہو کر بات کر سکتے ہو۔"

لمحہ بھر کے لئے اس کی آنکھیں سلگ اٹھیں اور وہ بھڑک کر بولا۔ "سردار پائندہ گل نے کسی سے خوف نہیں کھایا۔ وہ انگلیوں سے بھینچ کر اپنے دشمنوں کی کھوپڑیاں چٹخا دیتا ہے مگر وہ اپنی رسوائی سے ڈرتا ہے۔ جب بند دروازے کی کہانی نگر نگر پھیل سکتی ہے تو کھلے دروازوں پر کون اعتبار کر سکتا ہے؟ میری التجا ہے کہ اسے بند ہی کر دو۔" اس نے غیر ارادی طور پر اپنا ہاتھ پیچھے لے جا کر اپنی گردن سہلائی اور اس کی پھیلی ہوئی پگڑی پیشانی پر قدرے نیچے کھسک آئی۔ وہ یک بیک مضطرب نظر آنے لگا تھا۔

سردار پائندہ گل کی گفتگو کا طریقہ انوکھا ہی تھا۔ اس میں دھمکیوں کے ساتھ التجا بھی تھی۔ دھمکیاں بھی ایسی بالواسطہ اور ڈھکی چھپی تھیں کہ میں ان پر کوئی اعتراض بھی نہیں کر سکتا تھا۔ اس نے بند دروازے کی کہانی کا ذکر کر کے میرے دل میں وسوسوں کو بیدار کر دیا تھا لیکن میں اس کی آخری فرمائش کو نہیں ٹال سکا۔

میں نے اٹھ کر دروازہ بند کیا اور دوبارہ سردار کے سامنے آ بیٹھا۔

"میرے قبیلے میں کہرام ہے۔" چند ثانیوں تک خاموشی کے ساتھ میری طرف دیکھنے کے بعد سردار پائندہ گل کے حلق سے دھیمی اور بھرائی ہوئی آواز برآمد ہوئی۔ "ہر آنکھ خون کے آنسو رو رہی ہے۔ جن لوگوں کے مرد وارث موجود ہوں، ان کے قتل پر ہمارے قبیلوں میں رونے کا ماتم کرنے کا رواج نہیں ہے۔ ہر خون ایک نئے خون کا پیش خیمہ ثابت ہوتا ہے۔ مرنے والے کے ولی وارث قاتل یا اس کے قبیلے کے لوگوں کو مار کر اپنا کلیجہ ٹھنڈا کر لیتے ہیں لیکن تم جانتے ہو کہ میرے ساتھ کیا ہوا؟"

وہ چند لمحوں تک خاموش رہا پھر کرب آلود آواز میں خود ہی بولنے لگا۔ "عبدالرحیم خان کی لاش پر شگارا ویلی میں پہاڑ تک رو رہے تھے۔ عورتوں نے اس کی میت پر اپنے بال کھول کر ماتم کیا ہے اور دل کھول کر اس کوکھ کو کوسا ہے جس سے معصوم عبدالرحیم خان کے قاتل نے جنم لیا ہے۔ یہ اس لئے ہوا کہ عبدالرحیم خان کنوارا تھا۔ اس کا کوئی چچا، تایا، باپ یا بھائی زندہ نہیں ہے۔ بس ایک ماموں ہے جسے لوگ شاید اس قابل نہیں سمجھتے کہ وہ اپنے اکلوتے بھانجے کے قتل کا انتقام لے سکے۔ اس ماموں کی بوڑھی ہڈیاں ابھی بھی جوانوں سے زیادہ سخت ہیں اور قہر و غضب سے چیخ رہی ہیں۔ شگارا ویلی میں میری عزت اسی وقت بحال ہو سکے گی جب میں اپنے بھانجے کے خون کا انتقام لے لوں گا۔ اس وقت تک میں نے پلنگ یا کرسی پر نہ بیٹھنے کا عہد کیا ہوا ہے۔ اپنے ملازموں کے علاوہ، میں نے بستی والوں پر حکم چلانا چھوڑ دیا ہے۔ ایسی بھی کیا سرداری کہ لوگ سردار کے بھانجے کے سوگ میں مردار خور چیونٹیوں کی طرح ماتم و گریہ کے لئے نکل پڑیں؟ جس دن میں عبدالرحیم خان کے خون کا انتقام لے لوں گا، اس دن ان سب کی زبانیں گنگ ہو جائیں گی اور عبدالرحیم خان کی میت پر گریہ و ماتم کرنے والے میرے پیروں کی دھول اپنے سروں میں ڈالنے پر مجبور ہو جائیں گے۔ وہی میری سرخروئی اور سربلندی کا تابناک دن ہو گا۔ میں بین کرنے والیوں کے سر منڈوا کر چالیس دن تک ان کی چھاتیاں برہنہ رکھواؤں گا۔"

اس کی پرہول باتوں سے میرا دل دہلنے لگا حالانکہ سردار پائندہ گل نے اس وقت تک جو کچھ بھی کہا تھا وہ اس کا اور اس کے قبیلے کا معاملہ تھا جس سے میرا کوئی تعلق نہیں تھا۔ وہ اپنی کہانیاں مجھے سنا رہا تھا۔ اس کا مطلب تھا کہ دال میں کچھ کالا تھا۔ یہی ایک اندیشہ بار بار میرے ذہن میں نیشِ عقرب کی طرح چبھ رہا تھا۔

ہم دونوں خاموشی کے ساتھ ایک دوسرے کی طرف دیکھتے رہے۔ سردار پائندہ گل شاید میری آنکھوں میں میرے دل کی کوئی تحریر پڑھنے کی کوشش کر رہا تھا۔ وہ سرد اعصابی جنگ تھی۔ میں سردار کی ساحرانہ آنکھوں میں آنکھیں ڈالے سکون سے بیٹھا رہا۔ وہ بڑی بڑی اور چمک دار آنکھیں میرے بدن میں چبھ رہی تھیں لیکن میں اپنا بھرم رکھنے کے لئے اس مقابلے پر ڈٹا ہوا تھا۔

اچانک سردار پائندہ گل نے اپنے دونوں ہاتھوں سے اپنی بڑی سی پگڑی سر سے اتار کر میرے قدموں میں ڈال دی اور میں نے بوکھلا کر اپنے پیر پیچھے کھسکا لئے۔ "یہ... یہ کیا کر رہے ہو سردار؟" یہ کہتے ہوئے میں نے پورے احترام کے ساتھ وہ پگڑی واپس اس کی گود میں ڈال دی۔

سردار پائندہ گل کے کھلے ہوئے سر پر گھنے بال موجود تھے لیکن اس کی سفید براق داڑھی کے مقابلے میں اس کے بالوں میں سیاہی کا تناسب زیادہ تھا۔ اس کا سر بھی غیر معمولی طور پر بڑا تھا۔

سردار پائندہ گل کی آنکھوں میں یکایک ہلکی سی نمی جھلملانے لگی اور وہ سر جھکا کر بولا۔ "اب میں تم سے پوچھتا ہوں کہ میرے بھانجے، عبدالرحیم خان کو کس نے قتل کیا تھا؟"

"میں تمہیں پہلے بھی بتا چکا ہوں کہ چھوٹے خان کی پشت پر جنت گل نے گولی چلائی تھی۔" جنت گل کا نام لیتے ہوئے مجھے اپنے پیٹ میں کوئی گولا سا گردش کرتا ہوا محسوس ہونے لگا تھا۔

"تم اس واقعے کے چشم دید گواہ ہو۔ اس لڑکی نے چھوٹے خان کو کیوں قتل کیا؟" اس کی نگاہیں میرے چہرے پر مرتکز ہو کر رہ گئی تھیں اور لہجہ اس قدر سرگوشیانہ ہو گیا تھا کہ وہ مجھے بہت دور کی آواز محسوس ہو رہی تھی۔

"ان دونوں میں کسی بات پر تلخ کلامی ہو رہی تھی۔ وہ اپنی مادری زبان میں ایک دوسرے پر برس رہے تھے۔ میں تمہاری زبان سے ناواقفیت کی بنا پر اس لڑائی کا سبب نہیں جان سکا۔" میں نے اس خونریز واقعے کی تفصیلات یاد کرتے ہوئے بہت احتیاط کے ساتھ جواب دیا۔

"چھوٹے خان کی لاش کے قریب اس کا کھلا ہوا چاقو بھی پڑا ہوا تھا۔" سردار پائندہ گل اس سانحے کی جزئیات جمع کرنے کے بعد میرے پاس آیا تھا۔ میں نے جواب دیتے ہوئے مزید احتیاط کرنے کا فیصلہ کر لیا۔

"ہاں۔ چھوٹے خان نے کسی بات پر مشتعل ہو کر چاقو بھی نکالا تھا۔" میں نے اعتراف کیا۔

"یہ بہت عجیب بات ہے، ڈپٹی خان!" سردار پائندہ گل تیوریاں چڑھا کر میری طرف جھک آیا۔ "ہمارے مرد عورتوں پر ہتھیار کبھی نہیں اٹھاتے۔ اپنے ہاتھوں سے ان کے چہرے بگاڑ کر سزا دے لیتے ہیں اور عبدالرحیم خان تو میرا بھانجا تھا۔ وہ ہماری روایات سے کیسے منحرف ہو سکتا تھا؟"

"میں اس کا کیا جواب دے سکتا ہوں؟" میں نے بے چارگی کے ساتھ کہا۔

"میں جانتا ہوں۔ اس چاقو نے پوری کہانی کھول کر رکھ دی ہے۔ ہمارے مرد اپنی عورتوں پر اسی وقت ہتھیار اٹھاتے ہیں جب وہ حرام کاری کی مرتکب ہو کر سڑے ہوئے بول کی راکھ کے برابر ہو چکی ہوں۔" وہ تفہیمی انداز میں اپنا سر ہلاتے ہوئے غضبناک سرگوشیوں میں کہہ رہا تھا۔ "کیا جنت گل نے حرام کاری کی تھی؟"

"تم مجھ سے عجیب سوالات کر رہے ہو۔" برہمی ظاہر کرنے کا ارادہ کرنے کے باوجود میں صرف ہلکا سا احتجاج ہی کر سکا۔ "تم کیوں بھول رہے ہو کہ میں وہاں ایک قیدی اور یرغمالی تھا۔ میں ان دونوں کے بارے میں کیا کہہ سکتا ہوں۔"

"تمہاری آنکھیں بتا رہی ہیں کہ تم جھوٹ بول رہے ہو۔" وہ خون آشام آنکھیں نکال کر کسی درندے کی طرح غرایا۔ "وہاں صرف تم تھے جو آگ میں تپتی ہوئی اس کتیا کی ہوس کو سرد کر سکتے تھے۔ میں نے چھوٹے خان کو اس سے شادی کرنے سے روک دیا تھا۔ وہ مجھے ذلیل کرنا چاہتی تھی۔ اس سے بڑی ذلت اور کیا ہو سکتی تھی کہ ایک یرغمالی کے بستر پر عورت پہنچ جائے؟ وہ تم کو خوش کر کے مجھ سے انتقام لینا چاہتی تھی۔ کہو! کیا یہ جھوٹ ہے؟"

میرے ذہن کو ایک شدید جھٹکا لگا۔ جنت گل کا منصوبہ یہی تھا کہ وہ میری اور اپنی خلوت کی کہانی عام کر کے سردار پائندہ گل کو منہ دکھانے کے قابل نہیں چھوڑے گی۔ شاید اس نے داستان گوئی کی ابتدا کر دی تھی اور نہیں بھی کی تھی تو اس کا آغاز کسی بھی وقت متوقع تھا۔ میں سردار پائندہ گل سے جھوٹ بول کر زیادہ دیر تک اس کا دفاع نہیں کر سکتا تھا۔ اس نے بڑے ماہرانہ انداز میں کڑیاں ملا کر اصل تصویر ترتیب دی تھی۔ میں نے نہایت تیزی کے ساتھ سوچتے ہوئے، اس کہانی کا سہارا لینے کا فیصلہ کر لیا جو میں ان کو پہلے ہی سنا چکا تھا۔

"تم جانتے ہو کہ میں یرغمالی اور بے بس تھا۔" میں نے تھوک نگلتے ہوئے مدافعانہ لہجے میں بات شروع کی۔ "چھوٹے خان کی غیر موجودگی میں وہ میرے کمرے کا قفل کھول کر اندر آئی تھی۔ میں چھوٹے خان کے خوف کی وجہ سے اس کی مہربانیوں سے دہشت زدہ ہو گیا۔ اپنے سارے جتن کر لینے کے باوجود وہ مجھے اکسانے میں کامیاب نہ ہو سکی تو اس نے ریوالور نکال لیا اور مجھے دھمکی دی کہ اگر میں نے اس کی مرضی پر عمل نہ کیا تو وہ مجھے گولی مار دے گی اور چھوٹے خان کو بتائے گی کہ یرغمالی نے اس کے ساتھ دست درازی کی تھی جس پر اسے گولی چلانی پڑ گئی۔ وہ میرا شوق نہیں، جان کا خوف تھا جس نے مجھے گناہگار بننے پر مجبور کر دیا۔ میں بالکل بے قصور تھا۔"

سردار پائندہ گل کی آنکھیں غصے کی شدت سے دہکنے لگی تھیں۔ میرے خاموش ہونے پر وہ کانپتی ہوئی غصیلی آواز میں بولا۔

"چاقو نے سب کچھ واضح کر دیا تھا۔ مجھے یقین تھا کہ ایسا ہی کوئی واقعہ ہوا ہو گا اور عبدالرحیم خان کو اس کا علم ہو گیا ہو گا۔ وہ جنت گل کو ذبح کرنا چاہتا تھا لیکن اس حرافہ نے اپنے چاہنے والے کو خود ہی مار ڈالا۔ بس ایک ہی بات میری سمجھ سے باہر ہے کہ گولی اس کی پشت میں کیوں لگی؟ تم نے ان دونوں میں بیچ بچاؤ کرانے کی کوشش تو نہیں کی تھی؟"

میں اس بوڑھے سردار کے قیاس اور تجربے کی داد دیئے بغیر نہ رہ سکا۔ "تمہاری باتوں سے معلوم ہوتا ہے کہ تم نے سب کچھ اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا۔ مجھے تمہاری روایات کا کوئی علم نہیں تھا۔ میں اس بات سے خوف زدہ تھا کہ وہاں ایک قتل ہوتا نظر آ رہا تھا۔ چھوٹے خان کے ہاتھ میں خنجر اور جنت گل کے ہاتھ میں ریوالور تھا۔ میں نے چھوٹے خان سے کچھ کہنا چاہا اور وہ مشتعل ہو کر میری طرف گھوم پڑا۔ جنت گل نے اسی لمحے گولی چلا دی۔"

"لیکن چھوٹے خان کو اس عورت کی روسیاہی کا علم کیسے ہوا؟" اس نے پوچھا۔

"مجھے اس کا کوئی علم نہیں۔ چھوٹا خان واپسی پر بہت خوش تھا۔ مجھے آزادی کی خوش خبری سنا کر وہ جنت گل کے پاس چلا گیا۔ تھوڑی دیر بعد میں نے ان کی اونچی اونچی آوازیں سنیں۔ میں وہاں پہنچا تو وہ اپنی مادری زبان میں لڑ رہے تھے۔ چھوٹے خان کے ہاتھ میں چاقو تھا۔ بعد میں جنت گل نے بھی اپنے بیگ سے ریوالور نکال لیا۔ میں چھوٹے خان کے گرتے ہی وہاں سے بھاگ نکلا تھا۔"

"بعد میں وہ بھی وہاں سے فرار ہو گئی۔" سردار پائندہ گل ایک گہرا سانس لے کر بولا۔ "وہ بہت چھچھوری اور کم ظرف عورت ہے۔ عبدالرحیم خان کی مردانہ انا کو زخمی کرنے کے لئے اس نے خود ہی اسے بتایا ہو گا کہ اپنے ماموں سے ڈرنے والے محبوب کو ٹھکرا کر اس نے ایک یرغمالی کی سیج سجا ڈالی ہے۔"

میں منہ سے کچھ نہ بولا لیکن مجھے دل ہی دل میں ماننا پڑا کہ سردار پائندہ گل کا ہر اندازہ سو فیصد درست تھا۔ وہ اپنی کہانی مکمل کرنے کے بعد مجھ سے ملنے آیا تھا۔ اگر میں تھوڑے بہت مگر کلیدی ردوبدل کے ساتھ حقائق بیان نہ کرتا تو وہ میرے خون کا پیاسا بھی بن سکتا تھا۔

سردار پائندہ گل اپنی پگڑی سر پر جماتا ہوا، ایک جھٹکے سے اٹھ کھڑا ہوا۔ "اس کمرے کی باتیں صرف تم تک محدود رہیں گی۔"

"اب تو کچھ مہمان داری کر لینے دو۔" میں اس الم زدہ بوڑھے کے لئے اپنے دل میں ہمدردی محسوس کرنے لگا تھا۔

"ابھی یہ دور کی بات ہے۔" اس نے خشک لہجے میں کہا اور چپلیں پہننے لگا۔

"تم نے میری پوری کہانی سن لی لیکن یہ نہیں بتایا کہ تمہاری کیا رائے ہے۔" میں نے کہا۔

"تم نے میرے اندازوں کی تائید کی ہے۔ تمہاری ہر بات دل کو لگنے والی ہے۔ موت کے خوف سے تم نے اس لڑکی کے ایک ایسے جرم میں تعاون کیا جس کا انجام میرے بھانجے کے قتل پر ہوا۔ تم بے گناہ ہو۔ میرے آدمی اس بدکار عورت کی تلاش میں ہیں۔ بس دعا کرو کہ وہ اس کہانی کو پھیلانا نہ شروع کر دے۔"

میں نے اسے روکنے کی بہت کوشش کی لیکن وہ ان لوگوں میں سے تھا جو صرف اپنی مرضی منوانا جانتے ہیں۔ دوسروں کی مرضی پر زیادہ دھیان نہیں دیتے۔ میں نے اس کے ساتھ نیچے جانا چاہا لیکن اس نے زبردستی مجھے روک دیا اور فلیٹ کے دروازے سے ہی عجلت میں رخصت ہو گیا۔

میں دروازہ بولٹ کر کے پلٹا تو ان تینوں نے مجھے گھیر لیا۔ تخلیے میں ہونے والی گفتگو نے ان سب کو سنسنی خیز ہیجان میں مبتلا کیا ہوا تھا۔ غزالہ پہلے ہی سردار پائندہ گل کی وضع قطع سے بہت زیادہ متاثر تھی اس لئے اس کا جوش و خروش سب سے زیادہ تھا البتہ دیرا اس معاملے میں حیرت انگیز طور پر سب سے پیچھے تھی۔

رات کا کھانا صبح کے چار بجے کھاتے ہوئے، میں نے ان لوگوں کو اپنی اور سردار پائندہ گل کی خفیہ گفتگو سناتے ہوئے وہ حصہ حذف کر دیا جس میں میرے اور جنت گل کے مراسم کے بارے میں سردار پائندہ گل کی پرپیچ باز پرس شامل تھی جس کی وجہ سے سارا مواد پھسپھسا ہو کر رہ گیا تھا۔

میرے خاموش ہونے پر دیرا کوئی اعتراض کئے بغیر، معنی خیز انداز میں مسکراتی رہی لیکن غزالہ تقریباً لڑنے والے انداز میں مجھ سے الجھ پڑی۔ "ایسا معلوم ہوتا ہے کہ مشکارا ویلی سے آنے والے اس افغان سردار نے یہ سارا ڈرامائی کھیل صرف اس لئے رچایا تھا کہ تم سے عبدالرحیم خان کے قاتل کے بارے میں معلومات حاصل کر سکے جب کہ یہ بات تو تم اسے فون پر ہی پہلے بتا چکے تھے......"

دراصل اسے شبہ تھا کہ میں نے اس کے بھانجے کو قتل کر کے اپنی جان بچانے کے لئے جنت گل کا نام لے دیا ہے۔ اس شبے کو تقویت اس بات سے بھی ملی کہ قتل کے واقعے کے بعد سے جنت گل روپوش ہے۔ اسے شبہ تھا کہ میں نے جنت گل کو بھی ٹھکانے لگا کر اس کی لاش کہیں چھپا دی ہے۔" میں نے کہا۔

"یہ تو بے سروپا مفروضہ تھا۔ خوفناک قبائلی انتقام سے بچنے کے لئے کسی بھی قاتل کا روپوش ہونا ایک عام سی بات ہے۔ کون ایسا سورما ہے جو قتل کرنے کے بعد منظر عام پر آ کر اپنے حریفوں کا کھلا نشانہ بننے کا خطرہ مول لے گا۔ تم یقیناً ہم سے کوئی اہم بات چھپا رہے ہو۔" غزالہ نے اعتراض کرتے ہوئے کہا۔

"میں نے اصل بات بتا دی۔ تم نہ مانو تو میں کیا کر سکتا ہوں؟" میں نے بے بسی سے کہا۔

"جنت گل کی روپوشی کے بارے میں تم نے اسے ایسا کون سا نکتہ سمجھا دیا کہ وہ یہاں سے مطمئن ہو کر واپس چلا گیا؟" غزالہ

نے اشتباہ آمیز نظروں سے میری طرف دیکھتے ہوئے سوال کیا۔

"حقائق سے آگاہ ہونے کے بعد خود اسی نے یہ خیال ظاہر کیا ہے کہ جنت گل اپنے کسی آشنا کے ساتھ کہیں گل چھرے اڑا رہی ہوگی۔ اب وہ پورے زور و شور سے اس کی تلاش شروع کرائے گا۔"

"ایسا تو نہیں کہ وہ تم ہی کو جنت گل کا آشنا سمجھ رہا ہو؟" ویرا نے میٹھی سی چٹکی لی۔

"یہ تم اس سے پوچھ سکتی تھیں۔" میں نے بھڑک کر کہا۔

"میں غیب داں نہیں ہوں جو تمہیں اس کے دل کا حال بتا سکوں۔ اتنا ضرور ہے کہ یہاں آنے سے پہلے میری طرف سے مطمئن نہیں تھا۔ غنیمت یہ ہے کہ اس نے یک طرفہ طور پر میرے خلاف محاذ کھولنے کے بجائے مجھ سے بات کرنے کا فیصلہ کرلیا ورنہ ہم ایک بار پھر اس کے آدمیوں کے خوف و ہراس کا نشانہ بن سکتے تھے۔"

"دوسرے لفظوں میں تم یہ کہنا چاہ رہے ہو کہ اب وہ تمہیں بے گناہی کا سرٹیفکیٹ دے کر گیا ہے؟" ویرا نے چبھتے ہوئے لہجے میں پوچھا۔ "اور تمہیں اس کے آدمیوں کی طرف سے کوئی خطرہ نہیں ہے۔"

"بظاہر تو یہی معلوم ہو رہا تھا۔ وہ میری وضاحتوں سے پوری طرح مطمئن نظر آ رہا تھا۔"

بستروں پر جانے تک وہ بحث اور تکرار جاری رہی اور میں انہیں اسی دائرے میں گھماتا رہا جو میں نے سوچ سمجھ کر منتخب کیا تھا لیکن ویرا کی بات ذرا مختلف تھی۔

مجھے سردار پائندہ گل نے چلتے چلتے یہ بتا دیا تھا کہ اس وقت تک جنت گل نے اسے بدنام کرنے کی مہم کا آغاز نہیں کیا تھا جب کہ مجھے ابتدا سے ہی یہ ڈر تھا کہ جنت گل کی کہانی پھیلتے پھیلتے کہیں غزالہ کے کانوں تک نہ پہنچ جائے۔ اس لئے میں نے حفظ ماتقدم کے طور پر، ویرا کے سامنے اپنے اور جنت گل کے مراسم کا اعتراف کرلیا تھا تاکہ بوقت ضرورت میں اس کی گواہی پیش کرکے غزالہ کو مطمئن کرسکوں۔ یہ اور بات تھی کہ ویرا کو اس واقعے کے اصل پس منظر کی ہوا بھی نہیں لگ سکی تھی۔ میں نے ان واقعات میں اپنی ضرورت کے مطابق ایسی تبدیلیاں کرلی تھیں جو مجھے بالکل بے گناہ قرار دیتی تھیں لیکن ویرا کے اترانے کے لئے اتنا ہی کافی تھا کہ وہ کسی اور لڑکی سے میرے مراسم کے بارے میں جان گئی تھی اس لئے وہ غیر معمولی طور پر خاموش تھی۔ شاید اس نے اندازہ لگا لیا تھا کہ میری اور سردار پائندہ گل کی ملاقات میں جنت گل کا مسئلہ بھی آیا ہوگا جس پر میں غزالہ کے سامنے بات نہیں کرسکتا تھا۔ اس وجہ سے وہ تخلیئے کی تلاش میں تھی کہ فرصت سے مجھ سے پوچھ گچھ کرسکے لیکن اس وقت ایسی فرصت میسر آنے کا کوئی امکان نہیں تھا۔ میں غزالہ کے ساتھ خوابگاہ میں گیا تو یہ سمجھ چکا تھا کہ اگلی صبح میں ویرا کے رحمانہ چنگل سے نہیں بچ سکوں گا۔ البتہ یہ میرا اٹل فیصلہ تھا کہ شنگارا ویلی میں معزز اور محترم سمجھے جانے والے سردار کی پگڑی اپنے قدموں میں آنے کا واقعہ میں اپنی ہی ذات تک محدود رکھوں گا۔ اس میں غزالہ یا ویرا سمیت کسی کو بھی شریک راز بنانے کا میرا کوئی ارادہ نہیں تھا۔ ویسے بھی سردار پائندہ گل نے اس کمرے میں ہونے والی خفیہ گفتگو کو صیغۂ راز میں رکھنے کی درخواست کی تھی۔ میں اس کی درخواست کا جزوی احترام کر کے خود کو سرخرو رکھ سکتا تھا۔

خوابگاہ میں پہنچنے کے بعد غزالہ نے بل جونز اور پال ایتھرٹن کے حوالے سے بات چھیڑی تو مجھے سخت حیرت ہوئی کہ سردار پائندہ گل کا چکر شروع ہو جانے کی وجہ سے 'ان دونوں عورتوں نے ہماری آخری مہم کے بارے میں ایک لفظ بھی نہیں پوچھا تھا۔ میرے لئے ان کی وہ خاموشی حیران کن ہی نہیں تشویشناک بھی تھی۔

"سردار پائندہ گل کی پھیلائی ہوئی سنسنی میں تم دونوں نے انہیں بالکل ہی فراموش کر دیا تھا۔ میرا خیال تھا کہ ویرا کو اپنے باپ کے مہمانوں کے انجام سے بہت زیادہ دلچسپی ہوگی۔" میں نے حیرت سے کہا۔

"یہ ویرا ہی کا مشورہ تھا کہ تمہیں ذہنی جھٹکا دینے کے لئے اس بارے میں ایک لفظ بھی نہ پوچھا جائے۔" غزالہ نے اپنے ملائم بالوں کا جوڑا بناتے ہوئے ہنس کر کہا۔ "کمال ہے کہ تمہیں بھی یہ بات اب یاد آئی ہے۔"

"سچ بات یہ ہے کہ سردار پائندہ گل اور اس کا موثر انداز گفتگو ابھی تک میرے دل و دماغ پر چھایا ہوا ہے۔ مجھے دکھ ہے کہ اس جیسا شاندار اور باوقار آدمی بھی ہیروئن کی چکی میں پس رہا ہے۔"

"یہی بات میں نے کہی تھی تو تم مجھ پر ناراض ہونے لگے تھے۔" اس نے تیکھی چتون کے ساتھ شکوہ کیا۔

میں نے ہاتھ تھام کر اسے اپنے قریب بٹھا لیا اور نرمی سے کہا۔ "بل اور پال سے نمٹنے میں ہمیں کافی دشواریوں کا سامنا کرنا پڑا۔ وہاں سے آتے ہی سردار پائندہ گل کی موجودگی کی خبر ملی تو میری کھوپڑی گھوم کر رہ گئی تھی۔ اس کی آمد کا امکان میرے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا۔ بس اسی جھونک میں تم پر برس پڑا تھا۔ اب میں اپنی خوشی اور غصے کا اظہار تم پر نہیں تو کس پر کروں گا؟ تمہیں ان باتوں کو ایک کان سے سن کر دوسرے سے اڑا دینا چاہئے۔"

"چلو اڑا دیا۔" وہ اپنے داہنے کان کے قریب ہاتھ لہرا کر بولی اور پھر کھلکھلا کر ہنس پڑی۔

"تمہیں اب بھی بل جونز اور اس کے ساتھی کے بارے میں کوئی تجسس نہیں ہے؟" میں نے تھوڑی دیر کی چھیڑ چھاڑ کے بعد اس سے پوچھا اور اس نے شوخ نظروں کے ساتھ اپنا سر نفی میں ہلا دیا۔

"کمال ہے! تمہاری ذات میں اتنا بڑا انقلاب؟ تم تو ہر بات

کے رونما ہونے سے پہلے اس کے بارے میں جاننے کے لئے بے چین رہتی ہو۔" میں نے غور سے اس کی شرارت آمیز نگاہوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔

"بعض اوقات تم اس بڑھیا کی طرح سادہ لوح ہو کر رہ جاتے ہو جو اپنے گاؤں والوں کے مذاق سے تنگ آ کر اپنے مرغے سمیت وہاں سے ہجرت کر گئی تھی اور کہہ گئی تھی کہ اب دیکھتی ہوں کہ تمہاری صبح کیسے ہوتی ہے؟"

"یہ کیا بات ہوئی؟" غزالہ کی وہ بات واقعی میرے پلے نہیں پڑ سکی تھی۔

"بڑھیا کا خیال تھا کہ اس کے مرغے کی بانگ دینے سے گاؤں میں صبح طلوع ہوتی ہے۔ مرغا نہیں ہوگا تو گاؤں میں صبح ہی نہیں ہو سکے گی۔ اب آئی بات تمہاری سمجھ میں؟"

"میں خود کو بڑھیا سمجھتا ہوں، نہ اس کا مرغا۔ تمہاری یہ مثال کچھ غلط ہو گئی۔"

"تم یہ کیوں بھول رہے ہو کہ اس مہم میں سلطان شاہ بھی تمہارا شریک تھا۔ جب تم نے اسے باہر بھیج کر ڈرائنگ روم کا دروازہ بند کرلیا اور ہم کوشش کے باوجود اندر سے سرگوشیوں کی آواز بھی نہیں سن سکے تو ویرا، سلطان شاہ کو لے بیٹھی۔ اس نے ہمیں اس مہم کے بارے میں ایک ایک بات بتا دی تھی۔"

"تمہاری مثال واقعی ٹھیک تھی۔" میں بے اختیار ہنس پڑا اور وہ بھی میری ہنسی میں شریک ہو گئی۔

پتا نہیں وہ ذہنی دباؤ کی شدت تھی یا جسمانی تھکان کی زیادتی کہ میں صبح ہونے تک گہری نیند نہیں سو سکا۔ سارا وقت غنودگی یا بیداری کی کیفیت میں گزر گیا۔ ذرا سی آنکھیں بند ہوتی تھیں تو سردار پائندہ گل کی کہی ہوئی عجیب و غریب باتیں مجسم ہو کر نظر آنے لگتی تھیں۔ چھوٹے خان کی میت پر اپنے بال بکھیرے گریہ کناں عورتیں، سڑے ہوئے ببول کی راکھ سے ہولی کھیلتے ہوئے شیطانی ہیولے، سردار پائندہ گل کے قدموں کی خاک اپنے سروں میں ڈالتے ہوئے مرد و زن، زار و قطار روتے ہوئے پہاڑ، گنجے سروں اور برہنہ چھاتیوں والی شرمسار عورتیں اور نجانے کیا کیا میرے تصور میں چکراتا رہا! اور ان کا زور بندھتے ہی میری آنکھ کھل جاتی۔ آخر کار اجالا پھیلتے ہی میں نے بستر چھوڑ دیا۔ غزالہ بے پروایانہ انداز میں گہری نیند سو رہی تھی۔ نیند کی بے حجابی نے اس کے پیکر کو اس قدر دلربا اور کشش انگیز بنا دیا تھا کہ اسے بے اختیار بانہوں میں سمیٹ لینے کو دل چاہنے لگا۔ اس سے قبل کہ میں بے لگام اور منہ زور جذبوں سے بے بس ہو کر اس کی نیند میں خلل انداز ہوتا، میں اپنی خواب گاہ سے باہر نکل گیا۔

میں نے اپنی ڈار سے بچھڑے ہوئے کسی بے چین پرندے کی طرح پورے گھر کا طواف کیا تو ہر طرف نیند کی دیوی اپنے ڈیرے ڈالے نظر آئی۔ ویرا اپنے بستر پر زہد شکن انداز میں پڑی بے خبر سو رہی تھی۔ سلطان شاہ ڈرائنگ روم میں صوفے کی گدیوں میں الجھا بے سدھ پڑا ہوا تھا۔ میں سیدھا باتھ روم میں گھس گیا۔ نیم گرم پانی کی تیز دھاروں میں دیر تک نہانے کے بعد میری تھکان اور بے خوابی کی کسلمندی بالکل بہہ گئی۔ آخر میں، میں نے ٹھنڈے پانی کی دھاریں بہائیں تو مجھے یوں محسوس ہوا کہ میرے جسم کا ایک ایک مسام کھل گیا ہو۔

طویل غسل سے فارغ ہو کر میں کچن میں جا گھسا جہاں خورونوش کا وافر سامان موجود تھا۔

میں اپنے لئے ناشتے کی تیاری میں مصروف تھا کہ ہلکی سی ڈور بیل بجی۔ میں نے کچن سے نکل کر دروازہ کھولا تو باہر اول خان موجود تھا اور اس کے چہرے پر ہوائیاں اڑ رہی تھیں۔ میں نے نرمی سے اس کا ہاتھ تھام کر اسے اندر کھینچ لیا۔

"خیریت تو ہے؟ بہت پریشان اور بدحواس نظر آ رہے ہو۔" میں نے سادگی سے پوچھا۔

"وہ دونوں لاپتا ہو گئے۔ وہ رات کو اپنے دو مہمانوں کے ساتھ گئے تھے۔ اس کے بعد سے ان کا کوئی سراغ نہیں مل سکا۔ میں رات کے تین بجے سے اس چکر میں پھنسا ہوا ہوں۔" وہ گہرا سانس لے کر بولا۔

"صبح ہی صبح یہاں تک دوڑ لگانے کی کیا ضرورت تھی؟ فون پر ہی بات کرلی ہوتی۔"

"بس بوکھلاہٹ میں، میں خود ہی دوڑا چلا آیا۔ ان کے غائب ہونے سے میری پوزیشن مخدوش ہو گئی ہے کیونکہ آئی بی والوں نے یہ سراغ لگا لیا ہے کہ غیر ملکیوں کے تعاقب میں ناکارہ ہونے والی گاڑی میری ہی تھی......!"

"کچھ نہیں ہوتا۔" میں نے اس کی بات کاٹ دی۔ "وہ دونوں مارے جا چکے ہیں۔ تھوڑی دیر بعد میں خود فون کرکے تمہیں خوش خبری سنانے والا تھا کہ بل جونز اور پال ایتھرٹن اب اس دنیا میں نہیں ہیں۔"

"مارے گئے؟" اس نے بے اعتباری سے دہرایا۔ "یہ تم کیسے کہہ سکتے ہو؟"

"اس لئے کہ ان دونوں کو میں نے اپنے ہاتھوں سے گولیاں ماری تھیں۔" میں نے فخریہ لہجے میں کہا۔

"تت...... تم نے انہیں مار دیا۔" اول خان مجھے گھورتے ہوئے بولا۔ غصے کی وجہ سے اس کی آواز میں لکنت پیدا ہو گئی تھی۔

"کیوں؟ کیا میں نے برا کیا؟" میں نے اس کی متغیر حالت دیکھتے ہوئے حیرت سے پوچھا۔

وہ برہمی کے عالم میں صوفے پر سے اٹھ کھڑا ہوا میں بھی اس کے ساتھ کھڑا ہو گیا لیکن اس کا وہ رد عمل میرے لئے یکسر ناقابل فہم تھا۔

اول خان کی نگاہوں سے واضح طور پر اشتعال ظاہر ہورہا تھا۔ اُس کا سینہ بہت تیزی کے ساتھ پھول پچک رہا تھا اور میں حیران تھا کہ میں نے ایسی کون سی بات کہہ دی تھی جس نے اسے یک بیک مشتعل کردیا تھا۔

"میں ہر قدم پر تمہارا بھرپور ساتھ دیتا رہا ہوں مگر تت...... تم......" وہ غصّے کی زیادتی میں ہکلا کر رہ گیا اور اس کی بات ادھوری رہ گئی مگر میں اس کی ادھوری بات سے ہی اس کا مدعا سمجھ چکا تھا۔

"اگر تم ہمارا ساتھ دیتے رہے ہو تو ہم نے بھی تمہیں کہیں دھوکا نہیں دیا۔" میں نے کہا "میں یہ جاننے سے قاصر ہوں کہ تم میری کس خطا پر اِس قدر برہم ہورہے ہو۔ مجھے معلوم ہونا چاہیے کہ میں نے کون سا گناہ کیا ہے۔"

"بات مت بڑھاؤ" اول خان غصہ ضبط کرتے ہوئے بولا "تمہیں معلوم تھا کہ میں بل جونز اور پال ایتھرٹن کے پیچھے لگا ہوا تھا ان پر ہاتھ ڈالنے سے پہلے، تمہیں مجھ سے مشورہ کرنا چاہیے تھا۔" میں ایک گہرا سانس لے کر، کرسی میں ڈھیر ہوگیا "ناگہانی صورت حال میں، ہم حالات کے سامنے بے بس ہو کر رہ گئے تھے۔ ہم ان دونوں کو چھوڑ دیتے تو پھر قیامت تک ان کا سراغ نہیں لگا سکتے تھے۔"

"تم اب بھی مبہم باتیں کررہے ہو۔ کیا مجھے یہ جاننے کا حق بھی نہیں ہے کہ وہ کیسے اور کن حالات میں مارے گئے؟ شاید تم بھول رہے ہو کہ ان کے معاملے میں میری پوزیشن بہت مخدوش تھی۔ میں نے ائرپورٹ سے ان کا تعاقب کیا تھا اور آئی بی والوں نے میری کار کے ذریعے میرا سراغ لگالیا ہے۔ میں نے ان لوگوں کی سرکوبی کے لیے جو کچھ کیا، اپنی ذاتی حیثیت میں کیا تھا اور اب مجھے اس بارے میں اپنی صفائی پیش کرنی پڑے گی۔"

"میرا خیال ہے کہ تم اس معاملے میں بلاوجہ جذباتی ہورہے ہو۔" میں نے سگریٹ سلگاتے ہوئے پرسکون لہجے میں کہا "اسپیشل ٹاسک فورس پر قومی معاملات کی ذمے داری عائد ہوتی ہے۔ تم لوگ کسی سے اجازت لیے بغیر بھی اپنی صوابدید کے مطابق کارروائی کرسکتے ہو۔ اس بارے میں کسی کو تم سے بازپرس کرنے کا اختیار نہیں ہے۔"

"میں اپنی حدود اور مجبوریوں سے بہت اچھی طرح واقف ہوں۔" اول خان نے قدرے تلخی کے ساتھ کہا "جب ایک وفاقی محکمہ کسی مسئلے پر کام کررہا ہو تو دوسروں کو باضابطہ اجازت کے بغیر اس میں ٹانگ اڑانے کا حق نہیں ہوتا اور میں بدقسمتی سے اسی جرم کا مرتکب ہوا ہوں۔ انٹیلی جنس بیورو والوں کا کردار سامنے آجانے کے بعد مجھے اِس معاملے سے کنارہ کشی اختیار کرلینی چاہیے تھی جو میں نے نہیں کی۔"

"میں پھر بھی یہ سمجھنے سے قاصر ہوں کہ تم مجھ سے برہم کیوں ہو؟"

"اگر وہ دونوں مارے گئے ہیں تو اس بارے میں مجھ سے بازپرس ضرور کی جائے گی۔"

"تمہارا سایہ بھی ان دونوں کے قرب و جوار میں موجود نہیں تھا۔ تمہیں پریشان ہونے کی کیا ضرورت ہے؟"

"یہ بات تم اس لیے کہہ رہے ہو کہ تم سرکاری اداروں کے طریقہ کار سے ناواقف ہو۔ وہ دونوں پاکستان پہنچے تو میں نے ان کی ذات میں اس حد تک دلچسپی لی کہ ان کا تعاقب کرنے کا فیصلہ کرلیا۔ اگر وہ اس کے بعد ہی مردہ پائے جاتے ہیں تو میری ذات شکوک و شبہات سے بالاتر نہیں رہ سکے گی۔"

"جو لوگ ان سے ملنے کے لیے گئے اور انہیں وہاں سے لے کر نکلے، وہ اجنبی تھے۔ دنیا کی کوئی طاقت ان لوگوں سے تمہارا تعلق ثابت نہیں کرسکتی۔ پھر تم اس بارے میں اس قدر پریشان کیوں ہو؟"

اُس نے گہری نظروں سے میری طرف دیکھا پھر تھکے ہوئے انداز میں ایک صوفے میں گرگیا۔

"مجھے بتاؤ کہ یہ سب کیسے ہوا۔ پوری صورت حال جانے بغیر میں کوئی رائے قائم نہیں کرسکتا۔" اس نے شکست خوردہ لہجے میں کہا "تمہاری کارروائی کی وجہ سے میری پوزیشن بہت مخدوش ہوگئی ہے۔"

"ہم نے کچھ نہیں کیا۔ میرا خیال ہے کہ تم بلاوجہ ہی خوف زدہ ہو۔"

"میں خوف زدہ نہیں بلکہ فکرمند ہوں۔" اس نے زور دے کر کہا "جو کچھ ہوچکا ہے اس کی بنا پر مجھے سولی پر نہیں چڑھایا جاسکے گا۔ بس مجھے یہ بات پسند نہیں ہے کہ میں کسی الزام کا سامنا کرتے ہوئے مدافعانہ رویہ اختیار کرنے پر مجبور ہوجاؤں۔ اس سبکی کو سہنا میرے بس سے باہر ہے۔"

"ان دونوں کی اصلیت کھل کر سامنے آچکی ہے۔ وہ جس روپ میں بھی یہاں آئے ہوں مگر اب بات بالکل صاف ہوگئی ہے کہ جیک رونالڈو دراصل کرنل جیسی جونز کا بیٹا تھا۔ تم بتا سکتے ہو کہ تمہیں اپنے ذرائع سے اطلاع ملی تھی کہ آئی بی کے مہمان وہ نہیں ہیں جو نظر آنے کی کوشش کررہے ہیں۔ تم اُن کی اصلیت کا سراغ لگانے کے لیے اپنے طور پر ان کا پیچھا کررہے تھے۔"

"کیا؟" میرا وہ انکشاف سنتے ہی اس کا منہ حیرت سے کھل گیا "تمہیں کیسے پتا چلا کہ جیک رونالڈو، کرنل جیسی جونز کا بیٹا ہے؟ یہ خبر تو ہر طرف تہلکہ مچادے گی۔"

"شاید ہمیں اس کی اصلیت کا سراغ لگانے میں دانتوں پسینہ آجاتا۔" میں نے اول خان کے موڈ میں پیدا ہونے والی خوشگوار تبدیلی پر محظوظ ہوتے ہوئے کہا "یہ اطلاع جمی لائیڈ سے ملی تھی۔"

"جمی لائیڈ سے؟" اول خان پر حیرت کا دوسرا حملہ ہوا "لیکن اُس وقت تو تم نے مجھ سے اِس بات کا کوئی ذکر نہیں کیا تھا۔ کیا اس سے دوبارہ بھی تمہاری بات ہوئی تھی؟"

"یہ بات اُس نے مجھے نہیں، ویرا کو بتائی تھی۔ اس کا اصل نام جیک رونالڈو نہیں، بلکہ بل جونز تھا۔ ہوسکتا ہے کہ وہ ڈلاس کی اسلحہ ساز فیکٹری میں نام بدل کر نوکری کررہا ہو۔"

"اس کا مطلب یہ ہوا کہ میں کل بلاوجہ ہی جھک مارتا رہا۔ میں نے ان کے بارے میں معلومات جمع کرنے میں کافی محنت کی تھی اور تم بتارہے ہو کہ ان کوائف کا حقیقت سے دور کا بھی واسطہ نہیں تھا۔"

"میں نے یہ نہیں کہا۔ تمہاری معلوم کی ہوئی بہت سی باتیں بالکل درست تھیں۔" میں نے ہنس کر کہا "وہ واقعی ڈلاس کی اسلحہ ساز فیکٹری میں کام کرتا تھا۔ اس کے ساتھی کا نام پال ایتھرٹن ہی تھا۔"

"معلوم ہوتا ہے کہ اس کی اصلیت سے واقف ہوتے ہی تم نے اس کی طرف دوڑ لگادی تھی۔"

"میں اسے قتل کرنے کے ارادے سے نہیں گیا تھا۔ پال ایتھرٹن ائرپورٹ پر مجھ سے ہم کلام ہوچکا تھا۔ اُس نے مجھے البرٹو ریلیبا کا آدمی سمجھ کر بات کی تھی اور میں اسی حیثیت میں اُن دونوں کے عزائم کا اندازہ لگانے کے لیے ریسٹ ہاؤس کی طرف گیا تھا۔ بس وہاں صورت حال بدلتی چلی گئی۔"

"مجھے تفصیل سے پورے واقعات بتاؤ تاکہ میں بھی کچھ سوچ سمجھ سکوں۔"

میں نے ریسٹ ہاؤس سے آخر تک کے واقعات مَن و عَن دہرادیے۔

اُن دونوں کے بھیانک منصوبے کے بارے میں سن کر اول خان ششدر رہ گیا۔ پرندوں کے ذریعے کسی نشانے کو تباہ کرنے کا وہ منصوبہ بادی النظر میں احمقانہ معلوم ہوتا تھا لیکن ان لوگوں نے جس دماغ سوزی کے ساتھ اُس کی جزئیات تیار کی تھیں اس کی وجہ سے ناکامی کے آثار مفقود نظر آتے تھے۔

"شاید تم نے ان کی تیز رفتاری کی وجہ سے ان پر فوراً ہاتھ ڈالنے کا فیصلہ کیا ہوگا۔" میرے خاموش ہونے پر اول خان نے پُرتجسس انداز میں پوچھا۔

"اگر وہ مجھے اعتماد میں لے کر اپنے عزائم کے بارے میں کھلی کھلی باتیں نہ کرتے تو شاید ان کی رسی دراز ہوسکتی تھی۔ ان کے ارادوں سے واقف ہونے کے بعد انہیں ڈھیل دینا خطرناک ہوسکتا تھا۔ وہ اس قدر پُراعتماد نظر آرہے تھے جیسے کراچی کے بجائے ڈلاس میں بیٹھ کر منصوبہ بندی کررہے ہوں۔ ان کے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا کہ انٹیلی جنس بیورو والوں کو اپنے فریب میں مبتلا کرنے کے بعد انہیں کوئی خطرہ لاحق ہوسکتا ہے۔ ان کے حد سے بڑھے ہوئے اعتماد نے مجھے فوری کارروائی کر گزرنے پر مجبور کیا۔ دوسری بات یہ تھی کہ وہ زندہ رہتے تو ان کے لائے ہوئے چھوٹے مگر مہلک ترین بموں کا ذخیرہ آج اُن کی تحویل میں چلا جاتا۔ ہوسکتا ہے کہ وہ اسے کہیں محفوظ کردیتے اور ہم اس کا سراغ لگانے میں ناکام ہوجاتے۔ میری دانست میں ان کا فوری طور پر مارا جانا ناگزیر تھا۔"

"یہ سب درست ہے لیکن بل جونز نے جیک رونالڈو کے نام سے سفر کیا تھا۔ ان دستاویزات کو کیسے چیلنج کیا جاسکے گا؟ اس کی کمپنی کے ریکارڈ میں بھی اس کا نام جیک رونالڈو ہوگا اور وہ اسی حیثیت میں اس کی لاش کی واپسی کا مطالبہ کریں گے۔ ان حالات میں اسے بل جونز کیسے ثابت کیا جاسکے گا؟" اول خان نے فکرمندانہ لہجے میں کہا۔

"مجھے حیرت ہے کہ یہ بات تم کہہ رہے ہو۔ تم اپنے وسائل سے بہت کچھ ثابت کرسکتے ہو۔ پھر ایک بار آئی بی والوں کے ذہن میں شبہات پیدا ہوگئے تو وہ خود بھی حقیقت کا کھوج لگالیں گے۔ ان کے لیے یہی کافی ہوگا کہ بل جونز اور پال ایتھرٹن کے ساتھ آنے والے کریٹوں میں سے جدید ترین اور تباہ کن بم برآمد ہوں۔"

"جو ہونا تھا وہ ہوگیا۔ اب اسے لوٹایا نہیں جاسکتا۔ میری چھٹی حس کہہ رہی ہے کہ جب تک دونوں لاشیں پاکستان میں موجود رہیں گی۔ کرنل جیسی جونز ان کا دعویدار بننے کی حماقت نہیں کرے گا......"

"نہیں" میں نے تیزی کے ساتھ اُس کی بات کاٹ دی "اتنی مایوسی کی ضرورت نہیں۔ میں تمہیں یہ بتانا بھول گیا کہ بل جونز، کرنل جیسی جونز کی اکلوتی اولاد تھی۔ ہوسکتا ہے کہ بیٹے کی موت کی خبر اسے پاگل کردے۔ لاشوں کی یہاں سے روانگی میں تاخیر تمہارے لیے سودمند ثابت ہوسکتی ہے۔"

"کیا یہ درست ہے کہ کرنل جیسی جونز، ڈیوڈ اسٹارز نامی یہودی تنظیم کے ایما پر یہاں تخریب کاری کے منصوبے پر کام کررہا ہے؟" اول خان نے پوچھا۔

"بل جونز نے یہ اعتراف کرلیا تھا۔ ان لوگوں سے نیویارک کے راس المیڈا نامی ایک یہودی نے معاملات طے کیے تھے۔ وہ خود بہت سرگرم ڈیوڈ اسٹار ہے اور دلچسپ بات یہ ہے کہ بل جونز بھی یہودی تھا۔ تھوڑی سی محنت کی جائے تو راس المیڈا کا سراغ لگانا زیادہ مشکل ثابت نہیں ہوگا۔"

اول خان نے جیبی ڈائری میں راس المیڈا کا نام نوٹ کرتے ہوئے کہا "یہ بظاہر چھوٹی چھوٹی باتیں ہیں لیکن ان سے مجھے بہت مدد ملے گی۔ میرے ذہن پر سوار بوجھ اب بہت ہلکا ہوگیا ہے۔"

اول خان اس وقت اپنی ہی الجھن میں مبتلا تھا اس لیے میں نے اس سے کسی دوسرے موضوع پر بات کرنی مناسب نہیں سمجھی اور وہ مجھ سے ان دونوں کی لاشوں کی جائے وقوع سمجھ لینے کے بعد، عُجلت کے عالم میں واپس روانہ ہوگیا۔

اس کا خیال تھا کہ جیک رونالڈو کو کرنل جیسی جونز کا بیٹا تسلیم کرنا یا نہ کرنا تو بعد کی بات تھی۔ اس کے غیر متوقع قتل کی خبر انٹیلی

جنس والوں کو ہلا کر رکھ دینے کے لیے کافی تھی۔

اول خان کے جانے کے بعد غزالہ بیدار ہوئی پھر یکے بعد دیگرے ویرا اور سلطان شاہ بھی اٹھ گئے۔

"صبح ہی صبح کون آگیا تھا؟" سلطان شاہ نے بیدار ہونے پر نیم وا آنکھوں سے میری طرف دیکھتے ہوئے پوچھا۔

"اِس کا مطلب ہے کہ تم اُس کے آجانے پر سوتے ہوئے بن گئے تھے؟"

"یہ حویلی کا دیوان خانہ نہیں' ایک فلیٹ کا ڈرائنگ روم ہے اور تم دونوں جس انداز سے باتیں کررہے تھے اس کے نتیجے میں کوئی نیم مردہ شخص بھی بیدار ہوسکتا تھا میں تو پھر بھی زندہ تھا۔"

"یہی تو پوچھ رہا ہوں کہ زندہ تھے تو اس سے سلام دعا کرنے میں کیا عار تھا؟"

"میری دخل اندازی سے بدمزگی پیدا ہوسکتی تھی۔ اس کے رویے سے ایسا معلوم ہورہا تھا جیسے ہمیں اس کی اجازت اور مرضی کے بغیر کوئی قدم اٹھانے کا حق نہیں ہے۔" سلطان شاہ بُرا سامنہ بنا کر بولا۔

میں اسے گھور کر رہ گیا۔ ویسے اس کی بات درست تھی کہ اول خان سے باتیں کرتے ہوئے میں نے اسے یکسر نظرانداز کردیا تھا جب کہ ویرا کی موجودگی میں وہ ہمیشہ ڈرائنگ روم میں ہی سویا کرتا تھا اور ہماری آوازوں سے اس کی نیند میں یقیناً خلل پڑا ہوگا۔

وہ میری تیز نظروں سے کترا کر غسل خانے کی طرف چلا گیا لیکن ویرا میری جان کو آگئی۔ وہ فی الفور یہ جان لینا چاہتی تھی کہ سلطان شاہ کس کا ذکر خیر کررہا تھا۔

"یہ وہی قصہ ہے جس کے بارے میں اپنی زبانیں بند رکھ کر تم لوگوں نے پچھلی رات مجھے ذہنی جھٹکا لگانے کی کوشش کی تھی۔" اسے کچھ دیر تک زچ کرنے کے بعد میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"اول خان آیا تھا؟" اس نے تائید طلب لہجے میں پوچھا پھر میرے سر کی اثباتی جنبش پر بولی "اسے ان دونوں کے قتل سے کیا تکلیف پہنچی جو وہ تمہارے ساتھ الجھ رہا تھا؟"

"وہ الجھ نہیں رہا تھا۔ اُس کے لیے مسئلہ کھڑا ہوگیا ہے۔ اس نے ان لوگوں کے تعاقب میں جو کار چھوڑ کر راہ فرار اختیار کی تھی' اس کا سراغ لگالیا گیا ہے اور ان دونوں کی گمشدگی پر وہ دباؤ میں آگیا ہے۔ پوری صورت حال سننے کے بعد اس کا غصہ ٹھنڈا ہوگیا تھا۔"

"ان دونوں کا انجام تو یہی ہونا تھا لیکن میرا خیال ہے کہ تم نے انہیں ٹھکانے لگانے میں بہت عجلت سے کام لیا۔"

"ابھی تم اول خان کے الجھنے پر اعتراض کررہی تھیں اور اب خود وہی راگ الاپنا شروع کردیا؟" میں نے بھنا کر کہا۔

"اس کی کچھ وجوہ ہیں" ویرا نے جلدی سے وضاحت پیش کی "میری بل جونز سے ملاقات ہی نہیں ہوسکی اس لیے میں جی لائبریری اس کے بارے میں کچھ بھی نہیں بتاسکوں گی۔ اگر مجھے ان دونوں سے مل بیٹھنے کا ایک موقع مل جاتا تو آگے چل کر ہمیں اس سے فائدہ پہنچ سکتا تھا۔"

"اکیسویں صدی کے ان امکانات کو رہنے دو۔" میں نے برا کر کہا "اول خان بھی کچھ وجوہ کو جواز بنا کر مجھ سے بحث کررہا تھا۔ میرے مسلک میں سانپ اور سنپولیے کو چھوٹ دینا حرام ہے۔ یہ نظر پڑتے ہی اس کا سر کچل دینا چاہیے۔ میں نے جو کچھ کیا' بالکل درست کیا۔ میں اس پر کوئی تقریر سننی پسند نہیں کروں گا۔"

"میں تقریر نہیں کررہی لیکن یہ خلش ضرور ہے کہ تم نے بل جونز کو شایان شان انداز میں مارنے کے بجائے' حقارت کے ساتھ بلکہ ذلت کے ساتھ مارا ہے۔ بڑا شکار کھیلنے کے کچھ آداب ہوتے ہیں۔ ڈھول ڈبے بجائے اور ہانکا کیے بغیر شیر کا اور تیتر کا شکار یکساں ہوجاتا ہے....."

"خوب بول رہی ہو۔" سلطان شاہ نے دوبارہ ڈرائنگ روم میں داخل ہوتے ہوئے طنز سے کہا "آخر کو تمہارے باپ نے اسے تمہارے لیے پسند کیا تھا۔ اسے کچھ نہ کچھ اہمیت تو ملنی ہی چاہیے تھی۔ ڈیڈی نے اسے کسی حقیر چوہے کی طرح گھیر کر ماردیا۔ شاید ڈیڈی اس سے رقابت محسوس کرنے لگا تھا۔"

"اپنی زبان بند رکھو۔ ابھی میں کچھ کہہ دوں گی تو عورتوں کی طرح منہ بسورنا شروع کردو گے۔ میرے باپ نے جو کچھ کہا' وہ اس کا خیال تھا۔ تم سب نے میرا جواب بھی سن لیا تھا۔ میں بل جونز کو اپنی جوتی کی نوک پر آئی ہوئی خاک جتنی اہمیت دینے کو بھی تیار نہیں تھی....."

"جب ہی اس کی شان و شوکت کی فکر میں گھلی جارہی ہو۔" سلطان شاہ شانے اچکا کر بولا۔

"اس پر لعنت بھیجو" ویرا برا سا منہ بنا کر سلطان شاہ سے بولی "تم جس بات کو پکڑ لیتے ہو' جونک کی طرح اس کی جان کو آجاتے ہو۔ مجھے اُس ملعون کی فکر میں گھلنے کی کیا ضرورت ہے؟"

"گڈ!" سلطان شاہ نے اچھل کر نعرہ لگایا "اب تم نے کسی نیک اور سگھڑ بی بی کی طرح بات کی ہے۔ جوان جہان عورتیں غیر مردوں میں زیادہ دلچسپی لیتی ہوئی اچھی نہیں لگتیں۔"

ویرا نے دانت پیستے ہوئے' اس پر جھپٹنے کا ارادہ کیا لیکن وہ ویرا کے تیور بھانپتے ہی' پھرتی کے ساتھ ڈرائنگ روم سے نکلتا چلا گیا اور ویرا نے اپنی جگہ چھوڑنے کا ارادہ ترک کردیا۔

"وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ یہ بہت سر چڑھتا جارہا ہے۔ میں سچ کہہ رہی ہوں کہ کسی دن اسے بری طرح پیٹ کر رکھ دوں گی۔ میرے صبر کا پیمانہ کسی دن لبریز ہوجائے تو تم مجھ سے شکوے شکایات کے دفتر لے کر نہ بیٹھ جانا۔ میں اسے بہت اچھی طرح سبق سکھاؤں گی۔" وہ تلخی کے ساتھ بولی۔

"مجھے یقین ہے کہ ایسی نوبت کبھی نہیں آئے گی۔" میں نے خوش دلی کے ساتھ کہا "تم بہت صابر اور نرم خو عورت ہو۔ جب سر سے پیر تک سیاہ نقاب اور چست لباس میں بلیک کوئین کے سفاکانہ روپ میں تم سامنے آتی تھیں تو ابتدا میں میری بھی روح فنا ہوتی تھی لیکن آج تم کسی بھی طرح مجھے مرعوب کرنے میں کامیاب نہیں ہوسکتیں۔ طویل رفاقت اور حوصلہ افزائیوں کے نتیجے میں ایسی تبدیلیاں ناگزیر ہوتی ہیں......"

"اب تم مجھ پر الزام تراشی کررہے ہو۔ میں نے کب اس کی حوصلہ افزائی کی ہے؟"

"دھینگا مشتی اور چھیڑ چھاڑ کو میں اور کیا نام دے سکتا ہوں؟ ابتدا میں تو وہ تمہارے سائے سے بھی بھڑکتا تھا اور مجھے تم سے دور رہنے کا مشورہ دیا کرتا تھا۔ تم نے خود ہی اس کا حوصلہ بڑھایا ہے۔ یہ نہ بھولو کہ وہ ایک جوان مرد ہے۔ ہوسکتا ہے کہ دل ہی دل میں وہ تمہیں پسند کرنے لگا ہو اور اب تمہیں چھیڑ کر لطف اندوز ہوتا ہو۔"

"میرا خیال ہے کہ وہ اس نازک حس سے یکسر محروم ہے جو مردوں کو صنف مخالف کی طرف رغبت دلاتی ہے۔ میرے بارے میں تو وہ خاص طور پر ایذا رسانی کی طرف مائل دکھائی دیتا ہے۔ میری ہر بات کی تردید اور میرے ہر جذبے کی مضحکہ آرائی' اس کی عادت بن چکی ہے۔ وہ کسی کو کیا پسند کرے گا؟"

"یہ نہ کہو۔ یہ بھی جارحانہ محبت کا ایک انداز ہوتا ہے۔ ایسے لوگ زبان سے محبت کا اقرار کرنے کو اپنی توہین سمجھتے ہیں۔ بس اپنے محبوب کو ہر لمحے ستا کر اسے یہ احساس دلانے کی کوشش کرتے ہیں کہ انہیں اس کی ذات سب سے زیادہ عزیز ہے۔ یہ اور بات ہے کہ تم اس کے ان ڈھکے چھپے پیغامات کو نہ سمجھ سکو۔"

"خوب!" وہ مجھے گھورتے ہوئے طنزیہ لہجے میں بولی "اپنی اس گفتگو سے تم مجھے کس راہ پر ڈالنا چاہتے ہو؟ تمہاری باتوں سے مجھے کچھ شرارت کی بو آرہی ہے۔"

"میری ناک بند ہے اس لیے میں بو کے بارے میں کچھ نہیں کہہ سکتا۔" میں نے مسکراتے ہوئے کہا "کچھ عرصے پہلے وہ تمہارے لیے جنگلی گھوڑا تھا' اس لیے ذرا ذرا سی بات پر بدکتا تھا۔ میرا خیال ہے کہ اب وہ تم سے کافی مانوس ہوچلا ہے۔ تم چاہو تو آسانی کے ساتھ اس پر سواری گانٹھ سکتی ہو۔"

"اپنے مشورے اپنے پاس رکھو۔" وہ آنکھیں نکال کر بولی "میں اپنا بُرا بھلا اچھی طرح سمجھتی ہوں۔"

"تم کہتی ہو تو ایسا ہی ہوگا۔ میرا خیال اس سے قدرے مختلف تھا۔"

"تم نے ابھی تک یہ نہیں بتایا کہ اول خان سے سردار پائندہ گل کے بارے میں تمہاری کیا گفتگو ہوئی؟" چند ثانیوں کی بوجھل خاموشی کے بعد اس نے نرم لب و لہجے میں سوال کیا۔

"اس بارے میں مجھے اول خان سے کیا بات کرنی تھی؟ وہ میرا سرپرست یا ولی نہیں ہے کہ میں ہر معاملے میں اس سے مشورہ کرنے کا پابند ہوجاؤں۔" میں نے بدک کر جواب دیا۔

"تم بلاوجہ چڑ رہے ہو۔ وہ ہم سب کا ہمدرد اور ایک اچھا انسان ہے اور تمہارے معاملات میں تو وہ بہت زیادہ دخیل ہوچکا ہے۔ میرا اندازہ تھا کہ تم نے اسے سردار پائندہ گل کی آمد کے اہم واقعہ سے ضرور آگاہ کیا ہوگا۔ مجھے اس پُراسرار قبائلی سردار کی اچانک یہاں آمد کوئی نیک شگون نہیں معلوم ہورہی۔"

"اس بارے میں' میں بھی فکرمند ہوں لیکن وہ میرا ذاتی معاملہ ہے۔ میں اسے اول خان سے دور ہی رکھنا چاہتا ہوں۔ میری اور اس کی حد سے بڑھی ہوئی مفاہمت کی وجہ سے تم لوگ مجھے اور اسے' ایک جان دو قالب سمجھنے لگے ہو۔ تمہارے اس رویے سے میری انفرادیت مجروح ہونے لگی ہے۔ پائندہ گل سے اب میں خود ہی نمٹوں گا۔"

"انفرادیت اور انا ایک ہی احساس کے دو نام ہیں۔ حریفوں کے درمیان تو جنگ ہی انا کی ہوتی ہے لیکن جب دو حلیفوں کی انا آپس میں ٹکرانے لگے تو بڑے تلخ نتائج برآمد ہوتے ہیں۔ یہ بُری بات ہے کہ تم اول خان کے معاملے میں اپنی انا کو ملوث کرنے لگے ہو۔ وہ تمہاری خیرخواہی میں کسی حد کی پروا نہیں کرتا۔"

"وہ میری صورت یا عادتوں پر فریفتہ نہیں ہے۔ وہ میری خدمات کی وجہ سے مجھ سے متاثر ہے۔ میں ہمیشہ پکا پکایا حلوہ تھالی میں سجا کر اسے پیش کرتا رہا ہوں جسے وہ تھوڑی سی ردوکد کے بعد بخوبی ہضم کرلیتا ہے۔ وہ خود بھی اعتراف کرتا رہا ہے کہ مجھ سے دوستی ہونے کے بعد اسے بڑی کامیابیاں حاصل ہوئی ہیں۔"

"پکا پکایا حلوہ اسے پیش کرکے تم نے اس پر کبھی کوئی احسان نہیں کیا۔ اپنی مجبوری کی وجہ سے تم اپنی ہر کامیابی اس کے کھاتے میں ڈالتے رہے ہو۔ یہ نہ بھولو کہ تم اپنا نام بلکہ شخصیت تک بدل کر پاکستان آئے تھے اور وہ ایسا دور تھا کہ تم یہاں منظر عام پر آنے کی حماقت نہیں کرسکتے تھے کیونکہ تم اپنے پرانے جرائم کی بنا پر یہاں کے قانون کے ساتھ ہی اپنے بدترین حریفوں کو بھی مطلوب تھے۔ وہ سب تمہیں زمین کے سینے میں پہنچانے کے آرزومند تھے......" وہ بحث کرکے مجھے نیچا دکھانے پر تلی ہوئی تھی اس لیے میں نے اس کی بات کاٹ دی۔

"وہ صورت حال اب بھی کم و بیش وہی ہے۔ اس میں کون سی تبدیلی آگئی ہے؟"

"یہ نہ کہو۔ ثی کا شیرازہ بکھر چکا ہے۔ مجھ سے تمہاری دوستی ہوچکی ہے۔ مافیا کی جڑوں کو تم ہی نے بارود سے اڑایا ہے اور تمہارے کھلے بندوں پھرنے پر بھی قانون تم سے کوئی تعرض نہیں کرتا۔ معلوم ہوتا ہے کہ اسپیشل ٹاسک فورس والوں کے اثرورسوخ کی وجہ سے تمہاری فائلیں سرد خانے میں ڈال دی گئی

ہیں اور تمہاری تلاش کی مہم ترک کی جاچکی ہے۔ یہ بہت بڑی تبدیلی ہے۔ اس کے بعد تمہیں اچانک اول خان کی ذات غیر ضروری محسوس ہونے لگی ہے۔"

اس کے طنزیہ لہجے پر میں چڑ گیا اور اسے گھورتے ہوئے بولا "تمہیں جھک ہوگئی ہے۔ سرکاری فائل ایک مرتبہ کھل جائے تو اپنے منطقی انجام کو پہنچنے سے پہلے کبھی بند نہیں ہوتی۔ یہ اور بات ہے کہ کسی مصلحت کی خاطر اسے عارضی التوا میں ڈال دیا جائے۔ پاکستان کے ایک منتخب وزیر اعظم کو ایسی ہی ایک بند فائل کو دوبارہ کھول کر موت کے پھندے تک پہنچایا گیا تھا۔ میرے نزدیک میری ہر فائل بھی دوبارہ کھولی جاسکتی ہے۔ میں نام بدل کر پاکستان آیا تھا اس لیے ابھی تک ہر عتاب سے بچا ہوا ہوں۔ جس دن میں نے خود کو نمایاں کرنے کی کوشش کی، میں مشکلات میں گھر جاؤں گا۔"

"میری اب بھی یہی رائے ہے کہ سردار پائندہ گل کی یہاں آمد کا معاملہ اول خان کے علم میں آجانا چاہیے۔ اس کی طرف سے تم خود بھی فکرمند ہو۔ وہ شخص ایک طویل سفر طے کرکے صرف اس لیے یہاں نہیں آسکتا کہ تم سے دوبارہ اس بات کی تصدیق کراسکے، جو تم اسے فون پر بتا چکے تھے۔ مجھے رات ہی کو اندازہ ہوگیا تھا کہ تم اپنی اور سردار پائندہ گل کی گفتگو کا اہم حصہ چھپانے کی کوشش کر رہے تھے۔ میں اس خیال سے خاموش رہی کہ اس وقت غزالہ بھی موجود تھی اور تم اسے اصل معاملے سے بے خبر رکھنا چاہ رہے تھے۔ مجھے سچ سچ بتاؤ کہ وہ یہاں کیوں آیا تھا۔"

ویرا نے رات ہی کو چند چبھتے ہوئے اور ذو معنی سوالات کرکے مجھ پر یہ واضح کردیا تھا کہ وہ میری ادھوری کہانی سے مطمئن نہیں تھی۔ میں نے خود ہی کسی غیر متوقع انکشاف کے مضر اثرات سے محفوظ رہنے کے لیے، اسے اپنے اور جنت گل کے ہیجان آمیز تعلق کے بارے میں ایک نپی تلی کہانی سنائی تھی اور میں نے اندازہ لگالیا تھا کہ ویرا تخلیہ میسر آتے ہی، میری اور سردار پائندہ گل کی ملاقات کے بارے میں سوالات کرے گی۔ اسے وہ موقع میسر آگیا تھا اور میں بھی جواب دہی کے لیے ذہنی طور پر تیار تھا لیکن میں نے اسے تھوڑا سا اشتعال دلانے کے لیے بے پروایانہ مسکراہٹ کے ساتھ کہا "تمہارا کیا خیال ہے؟ وہ مجھ سے کس بارے میں بات کرسکتا تھا؟"

"پہلی بات یہ ہے کہ عبدالرحیم خان کے قاتل کے بارے میں وہ ڈنکے کی چوٹ پر بھی پوچھ گچھ کرسکتا تھا۔ اس کے لیے کسی تخلیئے کی ضرورت نہیں تھی۔ آدمی صرف اسی معاملے کے بارے میں رازداری کی ضرورت محسوس کرتا ہے جس کے افشا ہوجانے کی صورت میں اس کی عزت یا انا کو شدید ٹھیس پہنچنے کا خطرہ موجود ہو۔" وہ معنی خیز لہجے میں بولی "میں نے اس کی آمد کی خبر سنتے ہی اندازہ لگالیا تھا کہ وہ کیوں آیا ہے۔"

"پھر اپنے اندازے کا اظہار کرتے ہوئے شرما کیوں رہی ہو؟" میں نے ٹکڑا لگایا۔

"جنت گل کے علاوہ کوئی اور بات ہو ہی نہیں سکتی۔ مجھے بخوبی اندازہ ہے کہ جب عورت کسی مرد سے انتقام لینے پر تل جائے تو وہ کیسی بے باک اور خطرناک ہوجاتی ہے۔ شاید اس نے سردار پائندہ گل کی ساکھ تباہ کرنے کے لیے اپنی کہانی پھیلانی شروع کردی ہے۔"

"خدا کا شکر ادا کرو کہ ابھی تک ایسا نہیں ہوا ہے۔" میں نے ایک گہرا سانس لے کر کہا۔

"تم جھوٹ بول رہے ہو۔" وہ مجھے اپنی بات جاری رکھنے کا موقع دیئے بغیر ترشی سے بولی۔

"پوری بات سنے بغیر، درمیان میں نہ بولا کرو۔" میں نے منہ بنا کر کہا "میں یہ کہہ رہا تھا کہ اب تک جنت گل نے کسی چوپال میں قصہ گوئی کا آغاز نہیں کیا ہے لیکن سردار پائندہ گل کی گھاگ اور عقابی نظریں اصل معاملے تک پہنچ گئی ہیں۔ وہ مجھ سے جنت گل کے بارے میں ہی بات کرنے کے ارادے سے آیا تھا۔"

"اور پھر خاموشی سے دُم دبا کر چلا گیا۔ میں تو ڈر رہی تھی کہ کہیں تم دونوں کے درمیان وحشیانہ لڑائی نہ چھڑ جائے۔ وہ عمر رسیدہ ہونے کے باوجود تم جیسے دو چار شہری جوانوں پر بھاری نظر آرہا تھا۔"

"سردار پائندہ گل حیرت ناک صلاحیتوں کا مالک ہے....."

میں اپنی بات ادھوری چھوڑ کر خاموش ہوگیا کیونکہ غزالہ ڈرائنگ روم میں آگئی تھی۔

"سردار پائندہ گل کا کیا ذکر ہورہا ہے؟" اس نے ڈرائنگ روم کی تپائیوں پر رکھے ہوئے استعمال شدہ برتن سمیٹتے ہوئے سرسری انداز میں سوال کیا۔

"وہ بہت چالاک بوڑھا تھا۔" میں نے ویرا کو آنکھ مارتے ہوئے غزالہ کو جواب دیا "مجھے حیرت تھی کہ وہ ویرا کو یہاں دیکھ کر نہیں چونکا، ہیروئن بنانے والے قبائلیوں میں ویرا کو خاصی شہرت حاصل ہونی چاہیے تھی۔ اردو بولنے والی ایک سفید فام عورت کو اس نے اتنی آسانی سے کیسے نظرانداز کردیا؟"

"ویرا نے اسے اپنا نام فرزانہ بتایا تھا۔" غزالہ ہنستے ہوئے بولی "اپنا تعارف کرانے کے بعد ویرا نے اس کی طرف ہاتھ بڑھایا تو وہ یوں بھڑک کر پیچھے ہٹ گیا تھا جیسے ویرا ہاتھ ملاتے ہی اس سے لپٹ پڑنے کا ارادہ رکھتی ہو۔ پتا نہیں ایسے لوگ برسرعام پاکباز بننے کا مظاہرہ کیوں کرتے ہیں؟"

"حالانکہ سردار پائندہ گل خود ایک ناجائز بچی کا باپ ہے" ویرا بولی "یہی ایک حقیقت اس کی پارسائی کی پول کھولنے کے لیے کافی ہے۔ میری اس سے پہلے کوئی ملاقات نہیں ہوئی تھی حالانکہ شی کے آدمی اس سے ہیروئن خریدتے رہے تھے۔ علاقہ غیر میں میرا براہ راست واسطہ مغربی حصے کے قبائلیوں سے رہا تھا جن پر مومن خان حکمرانی کرتا تھا۔ ہوسکتا ہے کہ پائندہ گل نے کبھی میرا نام بھی سنا ہو۔ اس نے صاف کہہ دیا تھا کہ وہ اپنے دشمنوں اور اجنبیوں سے ہاتھ ملانے کا قائل نہیں ہے۔" سلطان شاہ بھی اس مرحلے پر وہیں آکر خاموشی سے بیٹھ گیا۔

"اس نے مجھ سے بھی ہاتھ نہیں ملایا تھا۔ یہ اس کے قبیلے کی روایت ہے۔ ویسے تم نے کیا سوچ کر اسے اپنا اصلی نام بتانے کے بجائے فرزانہ کے فرضی نام کا سہارا لیا تھا؟" میں نے پوچھا۔

"میرے مشاہدے کے مطابق یہ لوگ ہر سفید فام کو فرنگی سمجھتے ہیں اور اپنی قدیم تاریخ کی بنا پر فرنگیوں سے نفرت ان کے خون میں شامل ہے۔ میرا خیال تھا کہ وہ مجھے اینگلو پاکستانی لڑکی سمجھ کر مجھ سے متعصبانہ رویہ اختیار نہیں کرے گا اور میں اس سے مل بیٹھنے میں کامیاب ہوجاؤں گی۔"

سلطان شاہ اچانک ہی زور سے ہنس پڑا۔ میں نے غصیلی نظروں سے اسے گھورا تو وہ گڑبڑا کر بولا "مجھے تو حیرت ہے کہ تم دونوں کو ہنسی نہیں آئی۔ ویرا خانم کی بعض باتیں لطیفے سے کم نہیں ہوتیں۔"

"معلوم ہوتا ہے کہ آج تمہاری جلد میں خارش ہورہی ہے۔" ویرا اسے گھورتے ہوئے، خشک لہجے میں غرائی "اس وقت میں نے آپ کے حضور میں کون سا لطیفہ پیش کرنے کی حماقت کی ہے؟"

"اینگلو پاکستانی لڑکی!" سلطان شاہ اس کے لب و لہجے کو کوئی اہمیت دیئے بغیر، استہزائیہ انداز میں بولا "کچھ خدا کا خوف کرو۔ اب تم لڑکی نہیں رہی ہو۔ تمہارے باوا جان نے مناسب عمر میں تمہاری شادی کردی ہوتی تو آج تم کئی بچوں کی ماں ہوتیں۔ چھوٹے بڑے، ٹیاؤں میاؤں کرتے ہوئے بچوں میں گھری ہوئی کوئی باشعور عورت خود کو لڑکی سمجھنے کا دعویٰ نہیں کرسکتی۔ یہ اور بات ہے کہ اس کے ذہن میں خلل آجائے۔"

"بک بک مت کرو۔" غزالہ نے ویرا کی طرف داری کرتے ہوئے کہا "یہاں مرد اور عورت کی جب تک شادی نہ ہوجائے، وہ لڑکا لڑکی ہی کہلاتے ہیں بلکہ ستر برس کی عمر میں چوتھی شادی رچانے والے بوڑھوں کو بھی نکاح اور دیگر رسوم کے وقت روایتاً لڑکا ہی کہا جاتا ہے۔"

"تمہارا اپنے بارے میں کیا خیال ہے؟" ویرا نے سلطان شاہ سے تلخ لہجے میں پوچھا۔

"مکمل مرد ہوں۔" اس کے پاس جواب تیار تھا "میں نے کبھی لڑکا ہونے کا دعویٰ نہیں کیا۔ سینگ کٹا کر بچھڑوں میں شامل ہونے کی احمقانہ کوششیں تم ہی کرتی رہی ہو۔"

"ہم کام کی باتیں کررہے تھے۔" میں نے سلطان شاہ سے ملامت آمیز انداز میں کہا "ہر وقت کی نوک جھونک اچھی نہیں لگتی۔ کسی وقت سنجیدہ بھی رہا کرو۔ تم موقع محل دیکھے بغیر اپنی ہانکتے رہتے ہو۔"

غزالہ برتن سمیٹ کر باہر نکل رہی تھی کہ سلطان شاہ بولا "اسے کہتے ہیں ماروں گھٹنا پھوٹے آنکھ، میرا خیال ہے کہ تم مجھے بلاوجہ ہی سنا رہے تھے۔ تمہارا اصل تخاطب غزالہ سے تھا اور اس بے چاری نے فوراً ہی تمہیں کام کی باتیں کرنے کے لیے تخلیہ فراہم کردیا ہے۔ حکم ہو تو میں بھی باہر چلا جاؤں۔"

"میرا خیال ہے کہ اس وقت یہی بہتر ہوگا۔" میں نے بے بسی سے ہنستے ہوئے کہا "آج تمہاری کھوپڑی کچھ زیادہ ہی چل رہی ہے۔ تم یہاں رہو گے تو موقع بے موقع دخل اندازی کرتے ہی رہو گے۔"

"کام کی باتیں، اگر باتوں تک محدود رہیں تو میں دخل نہیں دوں گا۔" وہ اپنی جگہ چھوڑتے ہوئے ویرا سے مخاطب ہوکر شرارت آمیز لہجے میں بولا "یہ یاد رکھنا کہ ان باتوں نے کوئی عملی صورت اختیار کی تو میں خدائی فوج دار بنے بغیر نہ رہ سکوں گا..... اے اینگلو پاکستانی لڑکی!" وہ گنگناتا ہوا کمرے سے نکلتا چلا گیا۔

"پتا نہیں آج اسے کیا ہورہا ہے۔" اس کے چلے جانے کے بعد، ویرا بولی "معلوم ہوتا ہے کہ خوشگوار موسم نے اس کے اعصاب پر ناخوشگوار اثر ڈالا ہے۔"

"وہ آج تمہارے ہی گرد منڈلا رہا ہے۔ میرا خیال ہے کہ میں غزالہ کو لے کر لمبی ڈرائیو پر نکل جاؤں تاکہ تم دونوں کو اپنی اپنی بھڑاس نکالنے کا موقع مل سکے۔ پتھر میں جونک روز روز نہیں لگا کرتی۔"

"معلوم ہوتا ہے کہ اس کی گھٹیا باتیں تم پر بھی اثر انداز ہورہی ہیں۔ اسے جونک نہیں بلکہ دیمک لگ رہی ہے۔ اسے بھول جاؤ اور اپنی بات کرو۔ تم سردار پائندہ گل کے بارے میں کیا کہہ رہے تھے؟"

"ہاں!" میں نے ایک گہرا سانس لے کر کہا "سردار پائندہ گل کی تخیل کی صلاحیت قابل رشک ہے۔ اس نے شکارا ویلی میں بیٹھے ہی بیٹھے، چھوٹے خان کی موت کا نقشہ بنالیا تھا۔ سب کچھ بالکل اسی طرح ہوا تھا جس طرح اس نے اندازے لگائے تھے۔ میں اس کے پے در پے سوالات کے جواب میں حقیقت کے اعتراف سے گریز نہیں کرسکا۔ وہ مجھ سے اپنے ان اندازوں کی تصدیق کرانے کے ارادے سے آیا تھا۔"

"ان اندازوں میں تمہارے اور جنت گل کے تعلق کا قصہ بھی شامل تھا؟" ویرا نے میری آنکھوں میں براہ راست آنکھیں ڈال کر سرگوشیانہ لہجے میں سوال کیا۔

"وہ سب کچھ سمجھ چکا تھا۔" میں نے اپنے سر کو اثبات میں جنبش دیتے ہوئے کہا "بس اسے یہ معلوم نہیں تھا کہ جنت گل نے میری رضامندی سے فائدہ اٹھایا تھا یا مجھے مار ڈالنے کی دھمکی دے کر، مجھے اپنے قریب آنے پر مجبور کیا تھا۔ میری بات اس کی سمجھ

میں آ گئی۔ اسے معلوم ہے کہ جنت گل نے اس کی عزت کو نیلام کرنے کے لیے وہ کھیل رچایا تھا۔ اس نے چھوٹے خان کو جنت گل سے شادی کرنے سے روک دیا تھا اور وہ انتقاماً ایک یرغمالی کی سیج سجانے پر تل گئی۔ اپنی اس حرکت سے جنت گل نے سردار پائندہ گل کے سینے پر گہرا زخم ڈال دیا ہے۔"

"تمہاری مجبوری کو سمجھ لینے کے بعد اس کا ردعمل کیا تھا؟" ویرا نے سوال کیا۔

"مبہم اور غیر یقینی۔ اس نے چلتے چلتے بھی مجھ سے دوستانہ رویے کا اظہار نہیں کیا۔ اتنا ضرور کہا تھا کہ میں دعا کروں کہ جنت گل اس کہانی کو پھیلانا نہ شروع کردے۔" میں نے اسے حقیقت بتادی۔

"ان پڑھ قبائلی' انا پرست اور مغلوب الغضب ہوتے ہیں۔" وہ پرخیال لہجے میں بولی "اسے تمہاری کہانی پر ذرا بھی شبہ ہوتا تو وہ اعتراف جُرم سنتے ہی تمہاری گردن دبوچ لیتا۔ اس کا خاموشی کے ساتھ واپس چلا جانا اس اُمر کا غماز ہے کہ فی الحال وہ تمہارے خون کا پیاسا نہیں ہے۔ اب تک یہ اس کا اور جنت گل کا باہمی معاملہ تھا۔ اس نے جنت گل کے جذبات کو مجروح کیا اور جنت گل نے اپنی آبرو ایک یرغمالی کے حوالے کرکے اُس کے دل میں ناسور پیدا کردیا۔ اس نے شاید یہاں حساب برابر سمجھ لیا ہے۔ اب اگر جنت گل ان باتوں کو قبیلے اور برادری میں پھیلائے گی تو وہ اسے معاف نہیں کرے گا۔ اس کی دعا والی بات خطرناک اور معنی خیز معلوم ہوتی ہے۔"

"میرا بھی یہی خیال ہے لیکن میں ان الفاظ میں پوشیدہ دھمکی کو سمجھنے سے قاصر ہوں۔"

"مجھے تو یہ سیدھی سی بات معلوم ہوتی ہے۔ جنت گل خاموش رہے گی تو پائندہ گل تمہیں بھولنے کی کوشش کرے گا۔ ہوسکتا ہے کہ وہ خفیہ طور پر اپنے آدمی جنت گل کی تلاش پر مامور کردے اور ان کے ذریعے اسے مروادے۔ وہ بات پھیلاتی ہے تو کچھ بھی ہوسکتا ہے۔ ممکن ہے کہ پائندہ گل تمہیں بھولنے کے بجائے اس آگ میں گھسیٹنے کی کوشش کرے جو اسے اندر ہی اندر راکھ کیے دے رہی ہو۔"

"میں جانتا ہوں اور یہ بات میں تمہیں بھی بتاچکا ہوں کہ جنت گل خاموش نہیں رہے گی۔ اس نے اپنے آتشیں بدن کے اندر ابلتے ہوئے لاوے کو سرد کرنے کے لیے میرا سہارا نہیں لیا تھا بلکہ ایک مقصد کی خاطر وہ رنگین کھیل رچایا تھا۔ وہ کسی بھی وقت اپنی زبان کھول بیٹھے گی۔" میں نے پر تشویش انداز میں کہا۔

"ہمیں اس وقت کے لیے تیار رہنا چاہیے۔ ایسا نہ ہو کہ سردار پائندہ گل کے وحشی جاں نثاروں کی ٹولی' ہماری بے خبری میں ہم پر آپڑے۔ کوانگ فو کے ساتھ ہی ہمیں ان لوگوں کی طرف سے بھی ہوشیار رہنا ہوگا۔"

"سردار پائندہ گل کل رات گئے یہاں سے واپس گیا ہے۔ وہ فوراً ہی نہیں پلٹے گا۔ ہمیں کوئی حکمت عملی طے کرنے کے لیے ایک دو دن کا وقت حاصل ہے۔ ہم اپنی رہائش گاہ بھی تبدیل کرسکتے ہیں۔"

"لیکن یہ یاد رکھنا کہ کسی مکان کے مقابلے میں فلیٹ ہی ہمارے لیے زیادہ محفوظ رہے گا۔ دشمنوں میں گھرے ہوئے لوگوں کے لیے بلند و بالا عمارتوں کے جنگل میں پھنسے ہوئے فلیٹ بہترین کمین گاہ ثابت ہوتے ہیں۔ کسی مکان کو آسانی کے ساتھ گھیر کر قتل و غارت گری کا بازار گرم کیا جاسکتا ہے۔ فلیٹوں میں یہ امکان نہیں ہوتا۔"

"تمہاری بات قابل فہم ہے۔ ہم فلیٹ ہی لے لیں گے لیکن اس کے لیے ہمارے پاس وقت ہے۔ فی الحال مجھے ایک اور ہی فکر کھائے جارہی ہے۔" میں نے فکرمندی سے بوجھل لہجے میں کہا۔

ویرا کوئی کم چالاک نہیں تھی۔ میرے لب و لہجے سے میرا مدعا تاڑ گئی اور مسکراتے ہوئے بولی "غزالہ کی طرف سے فکرمند ہو؟ سردار پائندہ گل کے معاملے نے طول پکڑا تو تم غزالہ کے سامنے کیا جواز پیش کروگے؟"

"یہی بات ہے۔" میں نے اس سے کوئی اختلاف کیے بغیر کہا

"تم خود ہوشیار رہو۔"

"یہ کام تم مجھ پر چھوڑ دو۔ میں موقع نکال کر اسے اپنے اعتماد میں لے لوں گی۔"

"ایسے معاملات میں تم سے ڈر ہی لگتا ہے۔ تم نے جنت گل کے بارے میں نمک مرچ لگا کر بات کی تو میرے لیے بدترین دشواریاں پیدا ہوجائیں گی۔ تم جانتی ہو کہ غزالہ مجھ پر کتنا اعتماد کرتی ہے۔"

ویرا کے چہرے کے تاثرات بدل گئے۔ لمحہ بھر کے لیے مجھے گمان ہوا کہ میری طرف سے بے اعتباری کے اظہار پر وہ ناراض ہوگئی ہے لیکن وہ کیفیت چند ثانیوں سے زیادہ قائم نہیں رہی۔ ویرا نے ہنستے ہوئے کہا "مجھے یہ بھی معلوم ہے کہ غزالہ کے اعتماد سے تم کتنا ناجائز فائدہ اٹھاتے ہو۔ جنت گل نے تو تمہیں موت کی دھمکی دے کر اپنی خواہشات کا غلام بنایا تھا مگر میں نے دوستی کے معاملے میں کبھی جبر یا زیادتی سے کام نہیں لیا۔"

"یہ نہ کہو" میں نے اس کے' خلافِ حقیقت دعوے پر اعتراض کرتے ہوئے نرمی سے کہا "آج کی صورت حال کے بارے میں شاید تمہارا بیان درست ہو لیکن ہمارے درمیان بے تکلفی کی ابتدا تمہاری خودسری اور دھونس سے ہوئی تھی۔ تم نے دعویٰ تھا کہ تم اپنی پسند کے ہر مرد کو اپنا کھلونا بنانے میں یدطولیٰ رکھتی ہو اور جب تمہارا دل بھر جائے تو اس کھلونے کا خیال ہی اپنے دل و دماغ سے کھرچ کر پھینک دیتی ہو۔ یہ اور بات ہے کہ آج تک مجھ پر اسی طرح مہربان چلی آرہی ہو جس طرح پہلے دن

تھیں۔ میں تمہاری اس وضع داری کی قدر کرتا ہوں۔"

اس کے گلابی اور پتلے پتلے ہونٹوں پر کشش آمیز مسکراہٹ نمودار ہوگئی۔ شاید اسے ماضی کے اس تذکرے سے کسی قسم کی آسودگی حاصل ہوئی تھی۔ پھر وہ بولی "تمہاری پوری بات کا نچوڑ آخری فقرے میں پنہاں ہے۔ جب ہماری ملاقات ہوئی تو غزالہ تمہاری بیوی نہیں تھی۔ خالی زمین اور لاوارث خزانے پر ہر شخص کو مساویانہ طور پر قبضہ کرنے کا حق حاصل ہوتا ہے۔ میں نے تم پر قابو پانے کی کوشش کی تو کوئی غلطی نہیں کی۔ آج اگر تم غزالہ کے ساتھ مخلص ہو تو میری پرانی وضع داری کی قدر کرنے کے بجائے' مجھ سے کنارہ کش کیوں نہیں ہوجاتے؟"

میں نے نظر بھر کر اس کی طرف دیکھا۔ وہ بے حجابانہ انداز میں میری آنکھوں میں جھانکتی رہی۔ میں نے فی الفور اپنے دل کا محاسبہ کیا اور محسوس کیا کہ اس بت طناز سے یک لخت بے تعلق ہوجانا میرے بس سے باہر ہوگا۔ میں نے کہا "تم نے زر اور زمین کا ذکر تو کردیا' زن کی بات نہیں کی۔ اکیلی عورت بھی ہر شوقین نگاہ کا مرکز ہوتی ہے۔ کسی روز تم نے شادی کرلی تو پھر شاید میں تمہیں بھولنے کی کوشش کرسکوں۔ فی الحال تو یہ گاڑی یوں ہی چلتی رہے گی۔ میری رائے ہے کہ ہمیں اپنے بارے میں زیادہ تنقیدی انداز میں نہیں سوچنا چاہیے۔"

وہ مترنم آواز میں ہولے سے ہنس پڑی اور میری بات سے لطف اندوز ہوتے ہوئے بولی "تم واقعی آج کے مطلب پرست دور کے مثالی انسان ہو۔ ایسے لوگ پوری دنیا پر بہت نفیس اور اثر انگیز انداز میں تنقید کرتے ہیں۔ کاخ امراء اور قصرِ سلطانی سے لے کر مسجد و کلیسا کے انتظام تک میں کیڑے نکالتے رہتے ہیں لیکن اپنی ذات اور ہر قول و فعل کے تضاد کو محاسبہ تو کیا' تنقید تک سے بالا سمجھتے ہیں۔ تم بہت اچھے جارہے ہو۔"

غزالہ ایک ٹرے میں گرم گرم چائے کی پیالیاں سجا کر لائی تو ہماری باتوں کا رخ بدل گیا۔

اس روز صبح سے موسم بہت خوشگوار تھا۔ آسمان پر گہرے سیاہ بادلوں کے پرے کے پرے آوارہ گردی کرتے پھر رہے تھے۔ باہر شاید وقفے وقفے سے ہلکی پھلکی بارش بھی ہوتی رہی تھی۔ میں نے ارادہ کیا کہ مجھے شہر میں کبھی کبھار میسر آنے والے اس موسم سے لطف اندوز ہونے کے لیے واقعی لمبی ڈرائیو پر نکل جانا چاہیے۔ اگر ہم چاروں ہی ہاکس بے وغیرہ کی ساحلی پٹی کی طرف نکل جاتے تو کسی بھی غیر آباد' نجی ہٹ کے چوکیدار کو کچھ رقم دے کر عارضی طور پر وہاں ڈیرہ ڈال سکتے تھے۔ اس بے تکلفانہ ماحول میں ویرا کو غزالہ کے ساتھ بات کرنے کا موقع بھی مل سکتا تھا۔ میری چھٹی حس اس بارے میں بہت زیادہ فعال ہوچکی تھی۔ میری خواہش تھی کہ جنت گل کی کہانی جلد از جلد غزالہ کے کانوں تک پہنچ جائے تاکہ صورت حال بگڑنے پر اسے یہ شبہ نہ ہوسکے کہ میں نے شرمساری سے بچنے کے لیے' بعد میں وہ کہانی تراشی ہے۔

میں نے اپنے اس ارادے کا اعلان کیا تو سلطان شاہ نے یاد دلایا کہ فلک کج رفتار کی کرشمہ سازیوں کے نتیجے میں ہم لوگ پیدل ہوچکے تھے۔ جہانگیر سے مُستعار لی ہوئی سیاہ شیراڈ کار پہلے ہی تباہی کی نذر ہوچکی تھی اور حبیب جیوانی کے ذریعے' مافیا یا ٹریڈ لائن سے ملی ہوئی دوسری کار کو پچھلی رات بل جونز نے اپنی ایک میجک بال کے ذریعے نذر آتش کردیا تھا۔

میں نے عبدالرحیم خان کی قید سے رہائی کے بعد جہانگیر سے ملاقات کی تھی تو سلمٰی کے پاس رکھی ہوئی' اپنی خطیر رقم میں سے کچھ پیسے نکال لایا تھا۔ میرے پاس اس وقت بھی اتنی رقم موجود تھی کہ ہم فوری طور پر کوئی معقول کار خرید سکتے تھے لیکن میں اس وقت ایسے کسی سودے کے جھنجھٹ میں نہیں پڑنا چاہتا تھا۔

پاکستان کی حکومتیں کافی عرصے سے ملک کے ہر چھوٹے بڑے مالیاتی لین دین کو لازمی دستاویزات کے ضابطے میں لاکر' اُس پر نگاہ رکھنے کے لیے کوشاں تھیں لیکن ایماندار صنعتی اور کاروباری افراد کی صفوں میں ایسی کالی بھیڑیں بھی گھسی ہوئی تھیں جو کسی بازپرس کے بغیر' اپنے کالے دھن کے زور پر ہر شعبے کی جڑوں پر قابض ہوتی جارہی تھیں۔ رسید' بل' کیش میمو اور چالان وغیرہ کے بکھیڑوں کے نفاذ سے ان کے چہرے اور پُراسرار دھندے بے نقاب ہونے کا اندیشہ تھا اس لیے انہوں نے کسی بھی ایسی مہم کو کامیاب نہیں ہونے دیا تھا البتہ اتنا ضرور ہوا تھا کہ سرکاری سطح پر کسی بھی اثاثے کی ملکیت تبدیل کرانے کے لیے شناختی کارڈ پیش کرنے کی شرط لازمی قرار دے دی گئی تھی اور ہر بڑی خرید و فروخت کے لیے شناختی کارڈ ابتدا ہی سے ضروری تھا۔ اس کا توڑ کرنے کے لیے کالی بھیڑوں کے قبضے میں نہ صرف جعلی شناختی کارڈ رہتے تھے بلکہ وہ اپنے مجبور اور بے حیثیت ملازمین کے نام بھی ڈنکے کی چوٹ پر استعمال کرکے' قانون کا کھلم کھلا مذاق اڑاتے رہتے تھے کسی کار کی خریداری کے لیے ہم چاروں میں سے کسی کے پاس شناختی کارڈ نہیں تھا۔ میرا اور سلطان شاہ کا کارڈ ضائع ہوچکا تھا۔ غزالہ کا شناختی کارڈ بنوانے کی نوبت ہی نہیں آسکی تھی اور ویرا غیر ملکی تھی۔

میں جانتا تھا کہ کوئی نہ کوئی کار ڈیلر' کار کے سودے میں اپنی دلالی کے لالچ میں ہماری اس مجبوری کو رفع کرسکتا تھا لیکن میں کسی جعلی یا مشتبہ نام پر خریدی ہوئی کار میں سفر کرتے ہوئے پھنسنا نہیں چاہتا تھا۔ جب سے میری کایا پلٹ ہوئی تھی میں حتی الامکان قانون کی حدود ہی میں رہنے کی کوشش کرتا تھا۔ بے اعتدالیاں صرف ان لوگوں کے بارے میں کرتا تھا جن کی خباثت ہر قسم کے شک و شبے سے بالاتر ہوتی تھی یا ان سے ملک و قوم کی سلامتی کو سنگین خطرات لاحق ہوتے تھے۔ قانون سے ماورا' میرے ایسے اقدامات کی فہرست میں آخری اضافہ بل جونز اور پال ایتھرٹن نے کیا تھا۔

مستقبل قریب میں اِس میں کسی اور اضافے کا امکان نظر نہیں آرہا تھا۔

میں جہانگیر سے ملنے کا قصد کرکے گھر سے نکل کھڑا ہوا۔ مجھے معلوم تھا کہ وہ اپنے گھر کی یک رنگ اور بے کیف زندگی سے اکتاہٹ کے سبب اپنی گارمنٹ فیکٹری میں خوب صورت لڑکیوں کو ملازم رکھ کر' ان میں دلچسپی لیا کرتا تھا لیکن اس میں ایک بڑی کمزوری یہ بھی تھی کہ اچھے موسم میں وہ دل کھول کر وہسکی پینے کا شوقین تھا اور اپنا یہ شوق وہ اپنے گھر کی چار دیواری ہی میں پورا کرنے کا عادی تھا۔ مجھے یقین تھا کہ اِس بھیگے بھیگے موسم میں وہ گھر پر ہی پی رہا ہوگا اس لیے میں نے اسے فون کرنے کی ضرورت محسوس نہیں کی تھی۔

میں ٹیکسی کے ذریعے جہانگیر کے گھر پہنچا۔ کرایہ ادا کرتے ہی پھاٹک کی طرف بڑھا لیکن چوکیدار ٹیکسی رکنے کی آواز سن کر پہلے ہی ایک جھری میں سے مجھے دیکھ چکا تھا۔ وہ مجھے اچھی طرح پہچانتا تھا اس لیے میرے پہنچنے سے پہلے ہی' میرے لیے پھاٹک کھول دیا گیا تھا۔

میرے اندازے کے مطابق جہانگیر گھر پر ہی موجود تھا۔ شاید چوکیدار نے انٹرکام پر اندر اطلاع دے دی تھی اس لیے میرے پہنچنے تک جہانگیر خود برآمدے میں آچکا تھا۔ اس کے سفید براق لباس پر بے ترتیبی سے سیکڑوں شکنیں پڑی ہوئی تھیں۔ مجھے دیکھ کر اس نے دور ہی سے ہانک لگائی "آؤ پیارے! آج میں تمہیں اپنے دل کی گہرائیوں سے یاد کررہا تھا۔ تمہاری عمر بہت بڑی ہے کہ جب بھی میں یاد کرتا ہوں تم چلے آتے ہو۔"

"یاد آرہی تھی تو مجھے فون نہیں کرسکتے تھے؟" میں نے چبھتے ہوئے لہجے میں کہا۔

"ایک گھنٹے سے فون کرنے کا ارادہ کررہا تھا لیکن اٹھنے کا موڈ نہیں بن رہا تھا۔" یہ کہتے ہوئے وہ مجھ سے بغل گیر ہوا تو اس کے منہ سے اسکاچ کے تیز بھبکے اڑ رہے تھے۔

"تم پر لعنت ہو" میں نے اسے الگ دھکیلتے ہوئے کہا "صبح ہی صبح پینے بیٹھ گئے ہو۔"

وہ برا مانے بغیر ڈھٹائی کے ساتھ ہنسنے لگا "نہار منہ پینے میں بہت لطف آتا ہے۔ پہلا ہی گھونٹ ٹھک سے اپنا کام دکھاتا ہے اور پھر ڈٹ کر ناشتا کرنے' بلکہ کھانا کھانے کو دل چاہتا ہے۔"

"تمہارے تجربات تم کو مبارک ہوں' میں نے اب پینے میں کمی کردی ہے۔"

"آج موسم غضب کا ہے اس لیے میں نے دفتر گول کردیا ہے۔" وہ میرے ساتھ اندر جاتے ہوئے بولا "سات بجے میری آنکھ کھل گئی تھی۔ موسم کی مستی دیکھتے ہوئے میں نے بوتل کھول لی۔"

"سلمٰی نے تمہاری کمر پر لات رسید نہیں کی؟" میں نے جل بھن کر پوچھا۔

"وہ کیا لات مارے گی!" اُس کا انداز استہزائیہ تھا لیکن بیوی کے خوف کا یہ عالم تھا کہ غیر ارادی طور پر اس کی آواز سرگوشیانہ ہوگئی تھی "دس بج رہے ہیں لیکن وہ ابھی تک بے خبر سو رہی ہے۔ ماں بننے کے بعد سے وہ اور زیادہ کاہل اور بے پرواہوگئی ہے مگر میں کب اس کی پروا کرتا ہوں۔"

"ہونی بھی نہیں چاہیے۔ آخر تم نے کوئی نئی سیکریٹری بھی تو رکھی ہوگی۔ سارے ناز نخرے وہی اٹھوالیتی ہوگی۔ بیوی کے مقدر میں تھکن اور دفتری مصائب کی بے سروپا کہانیاں آتی ہوں گی۔"

وہ مجھے لے کر اُس آراستہ خواب گاہ میں داخل ہوگیا جس کی شیشے کی دیوار سے سرسبز لان کا مسحور کن منظر نظر آرہا تھا۔ جہانگیر نے وہ کمرا اپنی ہنگامی ضرورت کے تحت آراستہ کرایا تھا۔ عام طور پر وہ اپنی بیوی کے ساتھ ایک ہی خواب گاہ میں سوتا تھا لیکن اس سے چپقلش ہونے کی صورت میں اِس خوب صورت خواب گاہ میں چلا آتا تھا وہاں قدم رکھتے ہی مجھے اندازہ ہوگیا کہ ان دونوں کے مراسم سردمہری کا شکار تھے۔

"اپنی وہ پرانی سیکریٹری تو چلی گئی تھی۔" وہ گہرا سانس لے کر' حسرت بھری آواز میں کہہ رہا تھا "چند روز پہلے' میں نے ایک نئی سیکریٹری رکھی ہے۔ وہ خوب صورت تو نہیں لیکن دلکش ضرور ہے گداز بدن اور کھلے دل کی مالک ہے۔ اسے دیکھو گے تو تمہارا دل خوش ہوجائے گا۔"

"تمہاری سیکریٹری کو دیکھ کر بھلا میں کیوں خوش ہونے لگا؟ میں تمہارا حاشیہ بردار تو نہیں ہوں۔"

وہ میری بات سنی اَن سنی کرکے اپنی دھن میں بولتا رہا "وہ خود کو مسز خان کہتی ہے لیکن مجھے کل ہی پتا چلا کہ وہ مسز نہیں بلکہ مس ہے اور ضرورت کے تحت مسز بنی رہتی ہے۔"

"الٹی بات" میں نے چونک کر کہا "عورت دس بچوں کی ماں ہوکر بھی مس کہلوایا جانا پسند کرتی ہے۔ وہ خود کو کس ضرورت کے تحت مسز کہتی ہے؟"

"اس کی بات سمجھ میں آتی ہے۔ آج کل کراچی کے سیٹھوں میں عجیب رجحان چل پڑا ہے۔ کنواری لڑکیوں سے فلرٹ کرنے سے بھاگنے لگے ہیں کیونکہ کوئی ناخوشگوار نتیجہ پیدا ہونے کی صورت میں وہ دبال میں پڑسکتے ہیں۔ شادی شدہ عورتوں کی مانگ بڑھ رہی ہے کیونکہ وہ روتی ہیں' نہ گھر جاکر کسی سے کچھ کہتی ہیں بلکہ ان سے مراسم استوار کرنے کے بعد زیادہ احتیاط کی ضرورت بھی نہیں پڑتی۔ اپنے نام کی بنا پر کئی جگہ سے مایوس ہونے کے بعد اس نے اپنے نام سے مس ہٹا کر مسز کا لفظ لگایا ہے۔ مسز بن کر اس نے دو سال لگاتار ایک ہی نوکری کی۔ مالک کے انتقال کے بعد' اس کے بیٹے نے اس کی چھٹی کی تو وہ پہلی ہی کوشش میں میرے پاس لگ گئی۔ میں نے بھی سوچا تھا کہ مسز کے لفظ پر سلمٰی مطمئن رہے گی۔ مجھے کسی کے مس یا مسز ہونے سے کیا لینا ہے۔ چہرہ مہرہ اور اخلاق اچھا ہونا چاہیے۔ مسز خان میں ان خوبیوں کی بہت فراوانی ہے۔"

"لعنت ہو تم پر اور تمہارے ہم ذوق سیٹھوں پر۔ تم اُن تمام عورتوں کی توہین کررہے ہو جو شادی شدہ ہونے کے باوجود کسی نہ کسی وجہ سے ملازمت کرنے پر مجبور ہیں۔"

اِس بار وہ میری بات کا بُرا مان کر بولا "تم نے ذرا سی دیر میں مجھ پر دوسری بار لعنت بھیجی ہے۔ تمہاری زبان تو سلمٰی سے زیادہ کاٹ دار ہوگئی ہے۔ میں نے کب ساری عورتوں کی بات کی ہے۔ سارے سیٹھ دل پھینک ہوتے ہیں اور نہ ساری عورتیں بدقماش ہوتی ہیں۔ دونوں طرف ایسے لوگ ہوتے ہیں جن کے شوق ایک دوسرے سے میل کھاتے ہیں۔ بس ان میں آج کل شادی شدہ سیکریٹریوں کی مارکیٹ اونچی جارہی ہے۔ جو لوگ دفاتر میں صرف کام کرتے ہیں وہ مس یا مسز کو نہیں بلکہ اس کے کام اور ہنر کو دیکھتے ہیں۔ ایسی کام والیاں صرف تنخواہ پر گزر بسر کرنے کی عادی ہوتی ہیں لیکن مسز خان جیسی عورتیں ہر وقت تحائف' دعوتوں اور اوور ٹائم کی بھی امید رکھتی ہیں۔"

"تم نے دفتر کو اپنی عیاشی کا گڑھ بنا رکھا ہے اور سلمٰی پر ہر وقت اپنے کام کے دباؤ کا رعب ڈالتے رہتے ہو۔" اس مردود نے گفتگو کو ایسے ڈھرے پر چلایا کہ اس کے ساتھ میں بھی پٹڑی سے اتر گیا۔

"آج کل میں نے اسے دبانے کے لیے نیا ڈراما شروع کیا ہوا ہے۔" وہ لوفرانہ انداز میں آنکھ دبا کر بولا "ہفتے میں ایک آدھ بار پینے' دل یا بازو میں درد کا بہانہ کھڑا کردیتا ہوں۔ سلمٰی کا خیال ہے کہ مجھے شراب نوشی کی وجہ سے دل کی بیماری لاحق ہوتی جارہی ہے۔ سوچ رہا ہوں کہ یہاں دو چار ڈاکٹروں سے رسمی رائے لینے کے بعد لندن یا ہیوسٹن جاکر اپنے دل کی بائی پاس سرجری کروالوں گا۔"

"بغیر کسی مرض کے آپریشن کراؤ گے؟" میں نے آنکھیں پھاڑ کر پوچھا "ترقی یافتہ ملکوں میں تو ڈاکٹر ضرورت کے بغیر کوئی تیز دوا تک نہیں دیتے۔ تمہاری سرجری کون کرے گا؟"

"گلیشین تھراپی نام کی ایک امریکی کتاب پڑھ لو تو یہ سب جان جاؤ گے۔ تیسری دنیا کے ابھرتے ہوئے سرمایہ داروں میں یہ رجحان پیدا ہوگیا ہے کہ وہ چالیس برس کی عمر کے بعد اپنے سینے اور ٹانگوں پر سرجری کے نشانات دیکھنا چاہتے ہیں۔ ان کی لاشعوری خواہش یہ ہوتی ہے کہ وہ اپنے زیر کفالت افراد اور کنبوں کو یہ جتا سکیں کہ ان کی پرورش کے لیے انہوں نے اپنی جوانی برباد کرکے خود کو اس حال تک پہنچالیا ہے کہ اوپن ہارٹ سرجری کی نوبت آگئی ہے۔ یہ تمغا خاندان اور معاشرے میں ان کا رتبہ بلند کردیتا ہے۔ گورے اس نفسیات کو اچھی طرح سمجھتے ہیں اور اپنے پاس آنے والے دس میں سے نو افراد کو چیر پھاڑ کر پیسہ بٹورتے ہیں جب کہ ان نو میں سے صرف دو مریض شاید سرجری کے ضرورت مند ہوتے ہیں بقیہ سات کی شکایتیں معمولی ادویات اور متوازن غذا کے استعمال سے دور ہوسکتی ہیں۔ اس کتاب کے مصنف نے نام لے لے کر مریضوں کی مثالیں دی ہیں جہاں ایسی صورت حال ہو' وہاں مجھے کون گورا سرجن مایوس کرے گا۔ وہ صرف ڈالر اور پونڈ دیکھتے ہیں۔ میرے پاس ان کی کوئی کمی نہیں ہوگی۔ اس کے بعد سلمٰی زندگی بھر میرے سامنے سر نہیں اٹھا سکے گی۔"

"ایک چھوٹے سے خانگی تنازعہ کی وجہ سے تم اتنا بڑا خطرہ مول لوگے؟"

"تم احمق اور بے خبر ہو۔" وہ اپنی رو میں بولا "خطرہ دیکھنے اور سننے والوں کے لیے ہوتا ہے۔ جو لوگ اس قسم کی سرجری کے لیے خود کو ذہنی طور پر تیار کرلیتے ہیں وہ اچھی طرح جانتے ہیں کہ پیشہ ورانہ مہارت اور جدید ترین آلات نے ایسے کسی بھی آپریشن کو تقریباً سو فیصد محفوظ بنادیا ہے بشرطیکہ مریض کو کوئی دوسری پیچیدہ بیماری نہ ہو۔ مجھے یقین کہ سرجری کے بعد سلمٰی ہر لمحے میرا اور میری ضروریات کا خیال رکھے گی۔"

"تمہاری یہ گفتگو میری سمجھ سے باہر ہے۔ سرجری' سرجری ہی ہوتی ہے۔ اس میں خطرہ بہرحال ہوتا ہے۔"

"موہوم سا۔ نہ ہونے کے برابر۔ اس سرجری سے زیادہ اموات کا تناسب تو عورتوں کی ڈیلیوری میں ہوتا ہے مگر دن رات بچے پیدا ہورہے ہیں۔ منتیں تک مانی جاتی ہیں۔ میں تو کوئی منت مانے بغیر ایک لمبی دوڑ لگانی چاہتا ہوں۔ اور کچھ نہیں تو اس بہانے پرانے دل کی مرمت ہوجائے گی۔ دل جوان تر ہوجائے تو زندگی کا لطف ہی دوبالا ہوجائے گا۔ چند روز کی تکلیف زندگی بھر کی کِل کِل سے بہتر ہے۔"

"تم سات بجے سے پی رہے ہو۔" میں نے مضبوطی کے ساتھ اس کا داہنا شانہ دبوچ کر کہا "اور اب ساڑھے دس بجنے والے ہیں۔ میں تمہاری اس گفتگو کو ایک عادی شرابی کا ہذیان سمجھتے ہوئے نظرانداز کررہا ہوں۔ آئندہ میں نے ایسی کوئی بات سنی تو میں سلمٰی کو تمہارے عزائم سے آگاہ کردوں گا۔"

وہ ہنس پڑا "تم میرے دوست اور بڑے بھائی ہو۔ ہم دونوں ایک ساتھ امریکا چلیں گے۔ تمہارے بائی پاس کا خرچ بھی میں ہی اٹھاؤں گا۔ تم دیکھنا کہ اس کے بعد غزالہ بھابی کیا سے کیا ہوجاتی ہے۔"

"یہ تقریر بند کرو اور سلمٰی کو اٹھاؤ۔ مجھے اس سے ایک ضروری کام ہے۔" میں نے اس کی گُدی پکڑ کر کہا۔

"ہائیں ہائیں' یہ کیا کررہے ہو۔" اس نے ایک جھٹکے سے اپنی گدی آزاد کرالی اور اسے سہلاتے ہوئے بولا "سلمٰی کو تم خود ہی اٹھالینا لیکن ایسی بھی کیا جلدی؟ دیکھو! باہر کیا ابر آلود موسم ہے سبزہ لان پر پھوار پڑرہی ہے۔ یہ کمرا ائرکنڈیشنر نے یخ کیا ہوا ہے اس

موسم اور ماحول میں تھوڑی سی تو پی لو۔"

میں نے اس کی طرف سے دی گئی' مے نوشی کی دعوت پر کوئی تبصرہ نہیں کیا کیونکہ اس کی حیران کن گفتگو کے بعد' میں خود بھی اسکاچ کی ضرورت محسوس کر رہا تھا لیکن خواب گاہ میں جاکر سلمٰی کو بیدار کرنے کا تصور میرے لیے لرزہ انگیز تھا۔ شیرنی اپنے بھٹ میں آئے ہوئے شکار کو کبھی نہیں چھوڑتی جب کہ سلمٰی میرے لیے ہر وقت شیرنی بنی رہتی تھی لیکن میں خود ہی گیدڑ بن کر اس سے اپنی جان بچاتا رہتا تھا۔ میں نے اس سے کہا "تم بہت بے شرم ہوگئے ہو۔ پتا نہیں وہ اپنے بچے کے ساتھ کس حالت میں سو رہی ہو اور تم مجھے اس کی خواب گاہ میں بھیج رہے ہو! اسے تم خود ہی جاکر بیدار کروگے' میں وہاں نہیں جاؤں گا۔"

"کیا فرق پڑتا ہے؟ تم کوئی غیر تو نہیں ہو۔ وہ تمہاری بھابی ہے۔" وہ میرے لیے گلاس بناتے ہوئے بولا۔

"ابے! میں تو پھر بھی تیرا دوست ہوں تیرے بھائی ہوتے تو وہ بھی سلمٰی کے لیے نامحرم ہوتے۔ یہ بات تیری سمجھ میں کیوں نہیں آتی؟" میں نے غصے سے بے قابو ہو کر نہایت تلخی سے کہا۔

"ہوں گے۔ آج کل تو وہ مجھے بھی نامحرم سمجھتی ہے۔ کاش مسز خان کی تھوڑی سی فراخ دلی اس میں منتقل کی جاسکتی!" اس کے لہجے میں حسرت اور مایوسی سمٹ آئی۔ اس نے میرے جارحانہ طرز تخاطب پر سرے سے دھیان ہی نہیں دیا تھا "تم نہیں جانتے کہ وہ مجھے کیسے کیسے دکھ دیتی ہے۔"

اپنے خالی معدے میں اسکاچ کی کافی مقدار اتار لینے کی وجہ سے وہ نشے میں ضرور تھا لیکن کھوپڑی سے باہر نہیں ہوا تھا۔ بس ذہنی رو جدھر بہک جاتی تھی اس کی زبان قینچی کی طرح چل پڑتی تھی۔ مسز خان کا خیال آیا تو وہ ایک مرتبہ پھر اس کی تعریف میں رطب اللسان ہوگیا۔

میں نے شیواز ریگل کا پہلا گھونٹ لینے کے بعد اس سے پوچھا کہ مسز خان نے اسے اپنے مس ہونے کے راز میں کیسے شریک کرلیا تو اس نے احمقانہ انداز میں بتایا کہ مسز خان اس کی محبت میں مبتلا ہو چکی تھی اور اسے اپنے باس سے زیادہ محبوب تصور کرتی تھی اس لیے اس نے جہانگیر کو ایمانداری کے ساتھ اصل بات سے آگاہ کردیا تھا ورنہ اس کے پچھلے باس کو مرتے دم تک یہ معلوم نہیں ہوسکا تھا کہ اس کی سیکریٹری درحقیقت مسز نہیں بلکہ مس تھی۔ وہ جو کوئی بھی تھی بہت چالاک تھی اور اپنے مدمقابل مرد کی کمزوریوں کو بھانپ کر' اس پر اسی پہلو سے وار کرنے کے فن میں طاق تھی۔ اسے جہانگیر کے پاس ٹکنے کا موقع مل جاتا تو وہ اس کی جیبیں صاف کرنے کے ساتھ ہی سلمٰی کی جگہ لینے کی کوشش بھی کرسکتی تھی۔

سلمٰی اور جہانگیر کا معاملہ بہت عجیب تھا۔ اپنی جگہ وہ دونوں ہی مظلوم تھے اور دوسرے کو ظالم سمجھتے تھے لیکن ان میں سے کسی نے اپنی ذات کے خول سے باہر نکل کر دوسرے کے مسائل کو سمجھنے یا ان کا ازالہ کرنے کی کوئی کوشش نہیں کی تھی۔ ان دونوں نے اپنے گھریلو اختلاف کو دور کرنے کے بجائے اس سے فرار حاصل کرنے پر زیادہ توجہ دی تھی۔ جہانگیر ملازمت کی آڑ میں شکار پر نکلی ہوئی پیشہ ور عورتوں کی زد میں آگیا تھا اور سلمٰی نے تو مجھ ہی کو تاک لیا تھا۔ وہ میرے عزیز ترین دوست کی بیوی تھی اور میں نے کبھی بھی جہانگیر کے اعتماد پر کوئی آنچ نہیں آنے دی تھی لیکن کون کہہ سکتا تھا کہ سلمٰی کا بھکا ہوا ذہن میری ذات سے مایوس ہونے کے بعد کسی اور پر مائل نہیں ہوا تھا۔ سلمٰی خوش شکل اور متناسب الاعضا تھی۔ کوئی بھی اوباش مرد اس کے ایک اشارے پر سدھائے ہوئے کسی بندر کی طرح ناچنا شروع کرسکتا تھا۔

یہ صرف جہانگیر کا نہیں' نہ جانے کتنے ہی گھروں کا سنگین المیہ تھا لیکن اس وقت جہانگیر کو سمجھانا بجھانا بے سود تھا۔ مجھے معلوم تھا کہ نشہ اترنے کے بعد وہ عالم خمار میں کہی اور سنی ہوئی ہر بات کو یکسر بھول چکا ہوگا۔

میں اشاروں کنایوں میں پہلے بھی کئی بار اسے سمجھانے کی کوشش کرچکا تھا لیکن اس نے سلمٰی کو ناقابل اصلاح تصور کرتے ہوئے' میری ہر بات کو مذاق میں اڑانے کی روش اپنائی ہوئی تھی میری مجبوری یہ تھی کہ میں جہانگیر سے صرف اسی کے کردار اور رویے کے حوالے سے بات کرسکتا تھا۔ میں سلمٰی کے ذہن میں پرورش پانے والے خطرناک اور رسوا کن رجحانات کے بارے میں ایک حرف بھی زبان پر لاتا تو جہانگیر کے ذہن میں میری طرف سے شکوک و شبہات جنم لے سکتے تھے اور پھر ایسی خرابی کی بنیاد پڑسکتی تھی جس کا انجام اس مختصر سے گھرانے کی مکمل تباہی کے علاوہ اور کچھ نہ ہوتا۔ وہ انجام میرے لیے کسی بھی صورت میں پسندیدہ نہیں ہوسکتا تھا۔

میں جہانگیر کے نازک خانگی معاملات پر لب کشائی کیے بغیر اس کی ذہنی رو کے مطابق ہلکی پھلکی باتیں کرتا رہا۔ اس دوران میں جہانگیر کو ایک مرتبہ پھر اپنی پرانی سیکریٹری کا خیال آگیا کیونکہ اس میں بعض ایسی نادر خوبیاں تھیں جو مسز خان میں نہیں پائی جاتی تھیں اس نے بدرو دادا کو برا بھلا کہنا شروع کیا۔

معاً مجھے یاد آیا کہ بدرو دادا کے بارے میں' جہانگیر نے پچھلی مرتبہ کئی اہم باتیں بتائیں تھیں۔ ایک زمانے میں وہ بھی ٹی کے لیے کام کرتا تھا اور ہم لوگوں کے احکام بجالاتا تھا۔ ٹی کی ٹوٹ پھوٹ کے بعد اس شہ زور اور منہ پھٹ بدمعاش نے آخر کار ایک ٹرانسپورٹ کمپنی کھول لی تھی۔ آٹھ دس ٹرکوں کے ساتھ مال برداری کی آڑ میں وہ غیر ملکی اجناس کی غیر قانونی درآمد اور بلیک کرنے والے لوگوں کے لیے کام کرتا تھا۔ سب سے زیادہ دلچسپ بات یہ تھی کہ وہ سردار پائندہ گل کے کھیتوں میں پیدا ہونے والی افیم سے تیار کی ہوئی ہیروئن کراچی کی منڈی میں لاتا تھا۔ اس کے اور سردار پائندہ گل کے مراسم اتنے گہرے تھے کہ بدرو دادا' چھوٹے خان کی لاش لے کر بذات خود شنگارا ویلی گیا تھا اور شاید اس کی تدفین میں شرکت کے بعد کراچی واپس آچکا تھا۔

"میں نے پچھلی بار بھی تم سے کہا تھا کہ بدرو دادا سے میری بات کرادو لیکن تم نے مجھے ٹال دیا تھا۔ اب تو وہ شنگارا ویلی سے واپس آچکا ہوگا؟" جہانگیر کی زبان رکنے پر میں نے اسے یاد دلایا۔

"میری اس سے بات نہیں ہوئی لیکن وہ واپس آچکا ہوگا۔" جہانگیر نے اپنے پاؤں فرنچ ونڈو کی چوبی چوکھٹ پر ٹکاتے ہوئے کہا "واپسی میں اس کا ارادہ جہاز سے آنے کا تھا۔ وہ کراچی میں بہت مصروف رہتا ہے۔"

"شنگارا ویلی سے کون سی کمپنی فضائی سروس چلاتی ہے؟" میں نے طنز سے پوچھا۔

"ارے بھائی' پشاور سے تو جہاز آتے ہیں نا؟ شنگارا ویلی سے پشاور تک وہ جیپ اور ٹرک سے آیا ہوگا۔ شنگارا ویلی تو ایسی خطرناک جگہ ہے کہ وہاں جہاز تو کیا' ٹرک بھی نہیں جاتے۔ ٹرکوں کی آخری منزل شنگارا ویلی سے ساٹھ ستر کلومیٹر پہلے چینا سرائے نامی قصبے میں ہے۔ دریائے کنار کے ساتھ ساتھ آنے والی نیم پختہ سڑک اس مقام سے شمال مغرب یا کسی اور سمت میں مڑجاتی ہے۔ وہاں سے شنگارا ویلی تک کا پُرخطر سفر صرف جیپ پر طے کیا جاسکتا ہے کیونکہ ان پہاڑی راستوں پر جگہ جگہ تنگ موڑ' اندھی کھائیاں اور خطرناک ڈھلانیں ملتی ہیں جو اجنبیوں اور اناڑیوں کو خاموشی سے نگل جاتی ہیں۔"

وہ مجھے فون کرنے کا ارادہ کرلینے کے باوجود' بوتل اور گلاس چھوڑ کر نہیں اٹھ سکا تھا اس لیے بدرو دادا سے بات کرنے کے لیے کیا اٹھتا۔ ویسے بھی اس وقت جہانگیر کے دل میں بدرو کے لیے بغض و عناد کا ایک لاوا ابلنے لگا تھا اس لیے میں نے اس سے بدرو کے گھر اور دفتر کے فون نمبر لینے پر اکتفا کیا۔ میرا ارادہ تھا کہ میں بعد میں خود ہی اس سے فون پر بات کرلوں گا اور موقع ملا تو جنت گل کے حوالے سے بھی اس کی رائے معلوم کرنے کی کوشش کروں گا۔ وہ ایک طرح سے سردار پائندہ گل کا کاروباری حلیف تھا اور اسے سردار کا مزاج شناس ہونا چاہیے تھا۔

میں نے تھوڑی دیر بعد جہانگیر کو سلمٰی کو بیدار کرنے کی یاددہانی کرائی تو وہ نشے کی جھونک میں چونک کر بولا "تم نے ابھی تک یہ نہیں بتایا کہ اس نے تمہیں کس راز و نیاز کے لیے بلایا ہے؟"

وہ میری طرف متوجہ نہیں ہوا تھا۔ میں چند ثانیوں تک ترحم آمیز نظروں سے اس کی طرف دیکھتا رہا پھر بولا "مجھے اپنی امانت میں سے کچھ رقم نکالنی ہے۔ تجوری کی چابیاں اس کے پاس رہتی ہیں اس لیے اس کا اٹھایا جانا ضروری ہے۔ تم صرف چابیاں لاسکو تو اسے اٹھانے کی ضرورت نہیں ہے۔"

"تم پچھلے ہفتے ہی کافی رقم لے گئے تھے۔" اس نے میری طرف دیکھ کر کہا تو خمار سے اس کے پپوٹے آنکھوں پر جھکے پڑ رہے تھے۔ اس کا ذہن کام کر رہا تھا لیکن زبان اور اعصاب پر اسے زیادہ اختیار نہیں رہا تھا۔ میرا اندازہ تھا کہ شیواز ریگل کا وہ ایکسٹرا لارج گلاس اس کے لیے اونٹ کی پشت کا آخری تنکا ثابت ہونے والا تھا۔

"ما... آ... نا کہ تمہارے پاس کروڑوں روپے مالیت کے ڈالر موجود ہیں۔" وہ لہراتے ہوئے لہجے میں کہہ رہا تھا "لیکن تم اس رفتار سے انہیں لٹاتے رہے تو تمہیں قارون کا خزانہ بھی کم پڑجائے گا۔"

"تمہاری کالی شیراڈ کے بعد میں دوسری کار سے بھی محروم ہوچکا ہوں۔ تمہاری کار کا معاوضہ ادا کرنے کے علاوہ مجھے فوری طور پر کوئی گاڑی خریدنی ہے اس کے لیے پیسوں کی ضرورت پیش آگئی ہے۔"

"معاوضہ ..... ہونہہ" اس نے اپنا گلاس پٹخ کر حقارت سے کہا "میں تم سے معاوضہ لوں گا۔ یار! ہم دوست ہیں اور وہ بھی بُرے وقت کے۔ اگر ہم نے ذرا ذرا سی چیزوں کا حساب کتاب شروع کردیا تو ہم سے بُرا مطلبی اور خود غرض کوئی اور نہیں ہوگا۔ میرے پاس تین گاڑیاں ہیں۔ شیراڈ کو بھول جاؤ اور ان میں سے کوئی بھی گاڑی لے جاؤ۔ وہ چلی جائے تو کوئی اور لے جانا لیکن خدا کے لیے معاوضے کی بات نہ کرو۔ کبھی میں بھوکا ننگا ہوگیا تو اس سے زیادہ مدد کرکے اپنا دل خوش کرلینا۔ فی الحال تمہارا سرمایہ تم کو مبارک ہو۔ اب اس بارے میں زبان نہ کھولنا۔"

پیسے دھیلے کے معاملے میں ہمارے مراسم کچھ ایسے ہی تھے۔ پیسہ کہاں گیا؟ دیگ میں۔ دیگ کہاں گئی؟ یاروں کے پیٹ میں اور قصہ ختم۔ ہم نے اس سے آگے کبھی سوچا ہی نہیں تھا اور جہانگیر نشے کی ترنگ میں آجانے کے باوجود اس پرانے اصول کو نہیں بھولا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ میں نے گن بوٹ کی فروخت سے حاصل ہونے والی خطیر رقم کسی خوف یا خطرے کے بغیر' جہانگیر کی بیوی کی تحویل میں دے دی تھی۔ میں نے اس رقم کا کوئی حساب رکھا تھا نہ سلمٰی نے رقم گنی تھی۔ مجھے معلوم تھا کہ ہمارے مراسم کی نوعیت اور اپنے مزاج کی بنا پر سلمٰی اس رقم میں کوئی ہیر پھیر نہیں کرے گی۔

جہانگیر' کچھ دیر تک رک رک کر اور لکنت آمیز لہجے میں' حساب دوستاں دردل کے فلسفے پر اپنے دل کا غبار نکالتا رہا۔ اس دوران میں وہ جذباتی بھی ہوگیا۔ شراب کے نشے میں بوجھل کھوپڑی پر جذباتی کیفیت طاری ہوجائے تو انسان کسی حاملہ بکری کی یاس آمیز ممیاہٹ پر بھی فرط رقت سے رونا شروع کردیتا ہے۔ میرے فرشتوں کو بھی اندازہ نہیں ہوسکا کہ میری کس بات نے جہانگیر کے بربطِ دل پر مضراب کا کام کیا تھا۔ وہ اپنی جگہ سے لڑکھڑاتا ہوا اٹھا اور میرے اوپر آگرا۔ اس نے مجھے اپنی دونوں بانہوں میں لے کر یک بیک رونا شروع کردیا تھا۔

اس ناگہانی افتاد سے میں بوکھلا گیا۔ میں نے اسے ایک طرف ہٹا کر اپنی کرسی سے اٹھنا چاہا لیکن کامیاب نہ ہو سکا۔ میں کرسی میں بیٹھا ہوا تھا اور وہ کھڑا ہوا تھا مگر اس نے اپنا سارا بوجھ میرے شانوں پر ڈالا ہوا تھا۔ ڈھائی من کی اس بہکی ہوئی لاش کو نقصان پہنچائے بغیر اپنے اوپر سے ہٹانا آسان کام نہیں تھا۔

مجھے دل ہی دل میں اس پر سخت تاؤ آ رہا تھا۔ اس میں سب سے بڑی خرابی یہی تھی کہ جب وہ موج میں آ کر پینا شروع کرتا تھا تو اپنی قوت برداشت کے بارے میں اس وقت تک خوش فہمی کا شکار رہتا تھا جب تک وہ آپے سے باہر نہیں ہو جاتا تھا۔

اس کی بھوں بھوں کی آواز بتدریج بلند آہنگ ہوتی جا رہی تھی۔ رونے کے ساتھ ساتھ وہ کچھ بین بھی کرتا جا رہا تھا مگر اس کا کہا ہوا ایک لفظ بھی میرے پلے نہیں پڑ رہا تھا۔ مجھے خوف یہ تھا کہ اگر کسی اتفاق کے تحت، سلمٰی بیدار ہو کر اِدھر آ نکلی تو ہم دونوں کو اس حالت میں دیکھ کر میرے پیچھے پڑ جائے گی۔ وہاں دو آدمیوں کی مے نوشی کے تمام تر شواہد موجود تھے۔ سلمٰی یہی سمجھتی کہ اس کے شوہر نے میری میزبانی کا حق ادا کرتے ہوئے جام و سبو سنبھالا ہو گا پھر وہ کھوپڑی سے باہر ہو گیا اور میں اپنی اعتدال پسندی کی وجہ سے اس کی ملامت سننے کے لیے اپنے اوسان میں رہا۔

میں نے اپنے غصے اور جھلاہٹ پر قابو پاتے ہوئے، رقت زدہ جہانگیر کو پچکارنا شروع کر دیا۔ چند منٹ بعد میری اس تدبیر کے اثرات ظاہر ہونے لگے۔ اس کے سُر دھیمے ہوتے جا رہے تھے اور اگر مزید تھوڑی سی مہلت مل جاتی تو شاید وہ خاموش ہو کر بستر پر دراز ہو جاتا لیکن مقدرات اٹل ہوتے ہیں۔ وہی ہوا جس کا مجھے خوف تھا۔ پتا نہیں سلمٰی کس وقت اس کمرے کا دروازہ کھول کر اندر آ گئی تھی۔ میں اس وقت بری طرح اچھل پڑا جب مجھے اپنی پشت سے سلمٰی کی طنز و ملامت میں ڈوبی ہوئی شناسا آواز سنائی دی۔

"مجھے تم سے یہ امید نہیں تھی کہ تم صبح سویرے ہی انہیں دھندے سے لگا کر، بیوائوں کی طرح رونا شروع کر دو گے۔"

سلمٰی کی آواز بلند ہوتے ہی جہانگیر کے رونے کی آواز یک لخت بند ہو گئی اور وہ مجھ سے الگ ہو کر جھومتا ہوا سیدھا کھڑا ہو گیا۔ پھر شاید اس نے سلمٰی پر غرانے کی کوشش کرتے ہوئے کہا تھا "دافاع ہو جاؤ، یہ میرا کامرہ ہائے، تم نے یاہاں داخیل ہونے کی ہیمت کیسے کی؟"

اس اثنا میں، میں جہانگیر کے بوجھ سے چھٹکارا پاتے ہی اٹھ کھڑا ہوا تھا۔ میں نے دیکھا کہ سلمٰی ہمارے عقب میں کسی بھوکی شیرنی کی طرح تنی ہوئی کھڑی تھی۔ جہانگیر کے بہت محنت سے ادا کیے ہوئے لمبے لمبے الفاظ پر اس کے ہونٹوں پر تنفر آمیز کھنچاؤ پیدا ہو گیا اور وہ اس کی طرف ہاتھ نچاتے ہوئے بولی "ذرا اپنی حالت تو دیکھو! کھڑا ہوا جا رہا ہے نہ زبان کے بل نکل رہے ہیں۔ کھڑے کھڑے بھی جھوم رہے ہو۔ پتا نہیں صبح صبح پینے کی کیا آفت آئی ہوئی تھی اور پھر پی بھی اتنی ہے کہ اپنے آپے ہی میں نہیں رہے ہو۔"

"چوپ ہو جاؤ" اس نے بھی فضا میں ہاتھ لہرا کر کہا اور نتیجے میں ڈگمگا کر رہ گیا۔ اس وقت اس کے لیے اپنے قدموں پر کھڑا رہنا دشوار ہو رہا تھا "ماں تم کو فانا کار دوں گا۔ آ بھی تو ماں نے صرف چا کھی ہے۔ میرا یار آ گیا ہائے۔ اب ہام پینا شوروع کاریں گے اور پھیر ماست ہو کار تومیں جالائیں گے۔" اسے ایک ہچکی آئی اور وہ دو قدم آگے لڑکھڑا کر اپنی مسہری پر گر گیا۔

"مجھے حیرت ہے کہ ان کا بیڑہ غرق کر دینے کے باوجود تم اپنے ہوش و حواس میں نظر آ رہے ہو۔" اس بار سلمٰی کی بدن میں اتر جانے والی، شرربار نگاہیں میرے اوپر مرکوز ہو گئی تھیں۔ "انہیں تمہارے اتنے خلوص اور پیار کی ضرورت نہیں ہے۔ اس کے بغیر ہی انہوں نے گھر کو بھنڈار خانہ بنا رکھا ہے۔ شراب پینے کے بعد جب یہ گھر میں دندنانا شروع کرتے ہیں تو ان اول فول حرکتوں اور بے مقصد باتوں پر ملازم بھی چھپ چھپ کر ان کا مذاق اڑاتے ہیں۔ میں ایسی بدتمیزیوں پر اپنے تین ملازموں کو نکال چکی ہوں مگر کب تک؟ رفتہ رفتہ میں بھی ان میں شامل ہو جاؤں گی۔"

"باند کارو یہ باکواس" جہانگیر اپنی مسہری پر اوندھا پڑے پڑے غرایا "تم ڈیڈی کے ریٹ کو ناہیں بہکا سکتیں۔ ہام باکرے کے تھنوں کی طرح جوڑواں دوست ہیں۔ ایک دوسرے سے کابھی آلگ نہیں ہو سکتے۔ تم سالی عورتیں! تم ساب بدمعاش ہوتی ہو۔ چار پیسے کا لالچ ہو تو نوکری چھوڑ کر دوسرے کے پاس چالی جاتی ہو......"

اس بار جہانگیر کی ہرزہ سرائی نے مجھے بوکھلا کر رکھ دیا۔ شاید اسے ایک مرتبہ پھر اپنی وہ بے وفا سیکریٹری یاد آ گئی تھی جو زیادہ تنخواہ کے لالچ میں اسے چھوڑ کر بدرو دادا کے پاس چلی گئی تھی۔ میں جھپٹ کر مسہری پر پہنچا اور ایک ہاتھ سے اس کی کھوپڑی سہلاتے ہوئے دوسرے ہاتھ سے اس کا منہ بند کر دیا۔

"بات کو طول نہ دو۔ میں سلمٰی کو سمجھا لوں گا۔ تم نے واقعی بہت زیادہ پی لی ہے۔ تمہارے لیے وہ نہیں تو اور کون فکرمند ہو گا۔ آخر کو وہ تمہاری بیوی ہے۔" میں نے اسے سمجھاتے ہوئے کہا۔

اس نے زور لگا کر اپنا دہانہ آزاد کرانے کی کوشش کی لیکن کامیاب نہ ہو سکا۔

"تم جا کر اپنا ہاتھ منہ دھوؤ۔" میں نے سلمٰی کو آنکھ سے اشارہ کرتے ہوئے کہا "شاید تم بستر سے اٹھ کر سیدھی اِدھر ہی چلی آئی ہو۔ میں بھی بس چند منٹ پہلے ہی آیا ہوں۔ یہ میرے آنے سے پہلے پی رہا تھا۔"

"مجھے ہمیشہ جانا ہی پڑتا ہے۔" وہ رندھی ہوئی آواز میں بولی "یہاں رکی رہی تو یہ ابھی گالم گلوچ اور مار دھاڑ شروع کر دیں گے میں تو کہتی ہوں کہ یہ ایک مرتبہ ہی میرا گلا گھونٹ دیں تاکہ ہمیشہ

کے لیے پاپ کٹے۔ روز روز کے اس تماشے اور کِل کِل سے میں عاجز آچکی ہوں۔ فیکٹری اور شراب کے علاوہ یہ دنیا کی ہر چیز کو بھولے ہوئے ہیں۔"

وہ بڑبڑاتی ہوئی وہاں سے چلی گئی۔ باہر نکلنے کے بعد اس نے غصے میں بہت زور سے دروازہ بند کیا تھا۔

"چالی گئی" دہانے کو آزادی ملتے ہی جہانگیر عجیب سی ہنسی کے ساتھ بولا "موجھے اس کی رگ رگ مالوم ہے۔ سالی کو ذرا سی دھونس دو تو اوس کا دام نکل جاتا ہائے۔ ہام کو آپنے باپ کا نوکر سمجھتی ہائے۔ اب ہام اس سے پوچھ کر شاراب پیا کریں گے۔ لاؤ باناؤ ایک اور ڈبل پیگ! آج تو سالا ناشا ہی نہیں ہورا ہا۔"

"بس اب تم گلاس کو ہاتھ بھی نہیں لگاؤ گے۔" میں نے سختی کے ساتھ کہا "یہ تمہارا اپنا گھر ہے۔ میری عدم موجودگی میں تم یہاں جو جی چاہے کرتے رہو۔ آج کے ہنگامے کی وجہ سے مجھے سلمیٰ کی سامنے سخت شرمندگی اٹھانی پڑی ہے۔ ابھی تمہاری عقل کچھ نہ کچھ کام کر رہی ہے۔ پتا نہیں تم پر یک بیک رونے کا دورہ کیوں پڑ گیا تھا؟"

"ہانگامہ ہائے کیوں برپا؟ تھوڑی سی جو پی لی ہائے
چوری تو ناہیں کی ہائے' ڈاکہ تو ناہیں ڈالا"

اُس نے فضا میں الٹے سیدھے ہاتھ لہرا کر بے ہنگم انداز میں وہ شعر پڑھا اور پھر خود بخود ہنسنے لگا۔ میں نے اپنی زبان بند رکھنے کا فیصلہ کر لیا۔ اس کی ذہنی حالت ابتر تھی اور اس سے کسی بھی بات کا کوئی معقول جواب ملنے کی امید نہیں تھی۔ وہ بس وہی بکتا رہتا جو اس کے دل میں تھا۔

میں وہاں سے اٹھا ہی تھا کہ اچانک فون کی گھنٹی نے مجھے چونکا دیا۔ میں اس طرف متوجہ ہوا تو وہ انٹر کام تھا۔ جہانگیر اس قابل ہی نہیں رہا تھا کہ اٹھ کر وہاں تک جاتا یا کوئی بات کرتا۔ میں نے لپک کر ریسیور اٹھا لیا۔ دوسری طرف سے چوکیدار جہانگیر کے کسی ملاقاتی کی آمد کی اطلاع دے رہا تھا۔ اس کی آواز میں' میں نے کوئی غیر معمولی پن محسوس کیا جسے میں فوری طور پر کوئی نام نہیں دے سکا۔ میں نے اسے مہمان کو ڈرائنگ روم میں بٹھانے کی ہدایت کی اور غصے میں دانت پیستا ہوا جہانگیر کے سر پر مسلط ہو گیا۔

"تمہارا کوئی مہمان آیا ہے اور تم یہاں مرے ہوئے ہو۔ جاؤ اور دیکھو کہ وہ کون ہے۔"

"توم بھی دوشمن سے میل گئے ہو۔ بھاگ جیاؤ ہام کو نیند آرہی ہائے۔" اس نے بھڑک کر کہا اور خاموش ہو کر جگالی کرنے کے انداز میں خالی منہ چلانے لگا۔ میں نے اسے لعنت دکھائی لیکن بے سود۔ اس کی آنکھیں بند تھیں اور پپوٹوں کے نیچے ڈھیلے گردش کر رہے تھے۔ میں اسے اس کے حال میں چھوڑ کر اس کمرے سے نکل آیا۔ باہر آنے کے بعد میں نے دروازہ باہر سے بولٹ کر دیا تھا۔ مجھے اندیشہ تھا کہ کہیں وہ گرتا پڑتا باہر نکل کر ایک نیا ہنگامہ نہ کھڑا کردے۔

میں اندرونی دروازے سے ڈرائنگ روم میں داخل ہوا تو کمرے کے وسط میں ایک تندرست و توانا شخص اس طرح کھڑا ہوا تھا کہ ڈرائنگ روم کے دونوں دروازے بیک وقت اس کی نظروں میں تھے۔ وہ قمیص شلوار میں ملبوس تھا۔ اس کی وضع قطع اور انداز سے یہ ظاہر نہیں ہو رہا تھا کہ اس کا تعلق معاشرے کے اس طبقے سے ہے جسے عرف عام میں معزز کہا اور سمجھا جاتا ہے۔

"دروازہ بند کر کے اندر سے بولٹ کر لو' مسٹر جہانگیر!" سردار تحکمانہ انداز میں اس کے لبوں سے خارج ہونے والا پہلا فقرہ ہی سنسنی خیز اور چونکا دینے والا تھا۔ اس سے یہ بات تو بالکل صاف ہو گئی تھی کہ وہ جہانگیر کے لیے اجنبی تھا۔ ایسا نہ ہوتا تو وہ مجھے جہانگیر کے نام سے ہرگز مخاطب نہ کرتا۔

"یہ دروازہ کھلا رہتا ہے۔" میں نے ترشروئی سے کہا "اپنا تعارف کراؤ اور آرام سے کسی بھی جگہ بیٹھ جاؤ۔ ضروری ہوا تو میں بعد میں دروازہ بند کر دوں گا۔" یہ کہتے ہوئے' میں دروازے سے دو قدم آگے بڑھ گیا۔

اس نے بازاری غنڈوں کے سے انداز میں اپنے بائیں ہاتھ سے اپنی مونچھ کا بایاں گوشہ مروڑا اور پھر اپنی پشت پر چھپا ہوا داہنا ہاتھ تیزی سے سامنے لے آیا۔ اس ہاتھ میں ریوالور دبا ہوا تھا جس کی نال کا رخ میری جانب تھا۔

"میں جس طرح کہہ رہا ہوں' اسی طرح کرو ورنہ گھاٹے میں رہو گے۔" اس بار اس نے کھُل کر دھمکی دی تھی۔

"تم اگر چور یا ڈاکو ہو تو تمہیں یہاں کچھ نہیں مل سکے گا۔" میں نے ریوالور پر نظریں جما کر سکون سے کہا "میری ہر قیمتی شے بینک کے لاکر میں محفوظ رہتی ہے۔ بہتر ہے کہ تم یہیں سے واپس لوٹ جاؤ۔"

"قیمتی شے!" اُس نے حقارت سے کہا "تمہاری جان شاید بالکل ہی ناکارہ ہے کہ اسے کسی لاکر میں چھپانے کے بجائے میرے سامنے لے آئے ہو۔ میری بات نہ مانی تو تمہیں پچھتانے کا موقع بھی نہیں مل سکے گا۔"

میں دروازہ بند کرنے کے انداز میں واپس پلٹا تو ایک لمحے کے لیے میرے ذہن میں خیال آیا کہ میں تیزی کے ساتھ' دروازہ بند کرنے کے بجائے باہر نکل جاؤں۔ مجھے پورا یقین تھا کہ میں اس کے فائر سے خود کو محفوظ رکھنے میں کامیاب ہو جاؤں گا لیکن خرابی یہ ہوتی کہ میں اس کی اصلیت اور عزائم کے بارے میں کچھ نہیں جان سکتا تھا۔

غنیمت یہ تھا کہ بظاہر وہ اکیلا تھا۔ اگر اس کا کوئی ساتھی بھی تھا تو وہ یقیناً پھاٹک پر چوکیدار کے سر پر مسلط تھا۔ جو بات اس کے حق میں جاتی تھی' وہ یہ تھی کہ اس کے پاس بھرا ہوا ریوالور موجود تھا۔ میں اس وقت کسی مہم جوئی کے ارادے کے بغیر جہانگیر کے لیے اور رقم لے جانے کی نیت سے آیا تھا اس لیے قطعی غیر مسلح تھا لیکن مجھے پورا اعتماد تھا کہ میں اپنے اِس حریف کو' جو اپنی حماقت کی بنا پر جہانگیر سمجھ بیٹھا تھا' کسی نہ کسی طرح زیر کرنے کی اہلیت رکھتا ہوں۔

میں نے دروازہ بند کر کے بولٹ چڑھایا اور اس کی طرف پلٹ آیا۔

"تم کون ہو اور تمہارے اس طرح یہاں آنے کا کیا مقصد ہے؟" اس کی ہدایت پر عمل کرنے کے بعد' میں نے اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر سوال کیا "میرا چوکیدار کہاں اور کس حال میں ہے؟"

"چوکیدار خیریت سے ہے۔ تم کو اس کے بارے میں پریشان ہونے کی ضرورت نہیں۔ اسی کے ساتھ یہ بھی بتا دوں کہ مجھے تم سے کوئی پرخاش نہیں ہے۔ اگر تم نے میرے چند سوالات کے سیدھے سیدھے جوابات دے دیئے تو میں جس خاموشی کے ساتھ یہاں آیا تھا اسی خاموشی کے ساتھ واپس چلا جاؤں گا۔ تم نے مجھ سے چالاکی کرنے کی کوشش کی تو مجھے تم پر گولی چلاتے ہوئے ذرا بھی افسوس نہیں ہو گا۔"

وہ ایک آرام دہ کرسی پر دراز ہو گیا۔ اس کے ریوالور کی نال بدستور میری طرف اٹھی ہوئی تھی۔

"بولتے رہو۔ میں تمہارے سوالات کا منتظر ہوں۔" اسے خاموش پا کر میں نے لقمہ دیا۔

"ڈینی آج کل کہاں ہوتا ہے؟" اُس نے گمبھیر لہجے میں سوال کیا تو میرا دل چاہا کہ ایک قہقہہ مار کر اُس سے اپنا تعارف کرا دوں اور پھر اُس کے بے ساختہ ردعمل کو دیکھتے ہی اس پر وار کر دوں۔

"کچھ عرصہ پہلے تک وہ کراچی میں تھا پھر راولپنڈی چلا گیا تھا۔ اس کے بعد میرا اس سے کوئی رابطہ نہیں ہوا۔" میں نے جواب دیا "وہ ویسے بھی ایک جگہ ٹک کر نہیں رہتا۔ ٹھکانے بدلتا رہتا ہے۔"

"اور تم اس کے کسی ٹھکانے سے واقف نہیں ہو۔" اس نے غراتے ہوئے پوچھا۔

"کمال ہے تم تو خود ہی ہر بات سمجھ جاتے ہو۔ دراصل اسے وہم ہو گیا ہے کہ وہ ہر وقت اپنے دشمنوں کی آنکھوں میں کانٹے کی طرح کھٹکتا رہتا ہے۔ اسی لیے کبھی وہ غیر معروف ہوٹلوں اور کبھی گنجان آبادیوں میں رہائش اختیار کرتا رہتا ہے۔ ایسی جگہوں پر وہ مجھے بلانا پسند نہیں کرتا۔ جب دل چاہتا ہے خود ہی ملنے کے لیے چلا آتا ہے۔ بُرا نہ مانو تو مجھے بتا دو کہ تمہیں اس سے کیا کام ہے۔ اگر وہ تمہارا مقروض ہے تو میں حساب بے باق کرنے کے لیے تیار ہوں۔"

"تمہارا قرض ڈینی خود ہی چکائے گا۔ اب وہ زمانہ نہیں رہا جب ہر طرف تم دونوں کی دھاک تھی۔ تمہارے آدمی شہر کے جس علاقے میں قدم رکھ دیتے تھے وہاں سے ہم جیسے لوگ اپنا بستر بوریا لپیٹ کر خوف زدہ بھیڑوں کی طرح بھاگ نکلتے تھے۔ اب ہم اسے گھر میں گھس کر ماریں گے۔ یہ چرس اور ہیروئن کا لین دین نہیں' مرنے مارنے کا کھیل ہے۔ بکری کی ماں کب تک خیر منائے گی۔" اس کے تیور بہت خطرناک اور جارحانہ نظر آرہے تھے "میرا بھی نام شیدا خونی ہے۔"

"اگر تم ہم دونوں کے ماضی سے اس حد تک واقف ہو تو تمہیں یہ بھی معلوم ہو گا کہ میں اب پرانے دھندوں سے تائب ہو چکا ہوں۔ میرا بہت صاف ستھرا کاروبار ہے......" اس نے ہنس کر میری بات اڑا دی۔

"ہر سیانا بدمعاش یہی کرتا ہے۔ جب کالا دھن تجوریوں میں جام ہونے لگے گا تو ہم بھی کوئی صاف ستھرا کام کر لیں گے۔ مقدر نے ساتھ دیا تو کوئی الیکشن وغیرہ بھی جیت لیں گے۔ جیب میں مال موجود ہو تو ہر کام آسان ہوتا چلا جاتا ہے۔ فی الحال تم یہ بتاؤ کہ ڈینی کی وہ لونڈیا کہاں ہے جس سے اس نے مکاؤ میں شادی کی تھی؟"

اُس کی زبان سے غزالہ کے لیے لونڈیا کا لفظ سن کر میری کھوپڑی سلگ اٹھی مگر اس وقت میں غصہ پی گیا۔ میں نے اپنے دل میں فیصلہ کر لیا تھا کہ اس لفنگے کو میں اس کی بدزبانی کا مزہ ضرور چکھاؤں گا۔

"شاید تم اس کی بیوی کی بات کر رہے ہو۔" میں نے بظاہر بے پروائی اختیار کرتے ہوئے کہا "اس کے بارے میں مجھے کچھ علم نہیں۔ وہ جب بھی میرے پاس آتا ہے اکیلا ہی آتا ہے۔ شاید وہ اس سے الگ رہتی ہے۔ تمہیں کس نے بتایا کہ اس نے مکاؤ میں شادی کی تھی؟"

"ہم لوگوں کو سب معلوم ہے۔" وہ اکڑ کر بولا "اگر تمہارے پاس میرے سوالوں کے جواب نہیں تو تمہیں میرے ساتھ چلنا ہو گا۔ وہ لوگ ڈینی اور اس سے تعلق رکھنے والوں کو پکڑنے کے لیے بہت بے چین ہیں۔"

اس کی گفتگو سے ظاہر ہو رہا تھا کہ وہ کسی نہ کسی طرح ڈون کوانگ فو سے منسلک تھا۔ شاید اس کے آدمیوں نے کراچی پہنچنے کے بعد میری تلاش کے لیے مقامی بدمعاشوں کی خدمات حاصل کر لی تھیں اور وہ ان ہی میں سے ایک معلوم ہوتا تھا۔ دوسری صورت میں اس کی زبان سے مکاؤ اور کچھ لوگوں کے ذکر کا کوئی جواز نہیں تھا۔

"تم کن لوگوں کی بات کر رہے ہو؟ انہیں مجھ سے کیا دشمنی ہے؟" میں نے رسانیت سے پوچھا۔

"یہ سب ان ہی سے پوچھ لینا۔ اگر تم نے خاموشی سے میرے ساتھ چلنے میں ہچر مچر کی تو میں یہیں تمہاری درگت بنا ڈالوں گا۔ میرے دو چار ہی کے تمہیں دوسرے جہان کی سیر کرانے کے لیے کافی ہوں گے۔"

"میں تمہیں ان سے زیادہ معاوضہ دینے کو تیار ہوں۔" میں

نے قدرے خوف زدہ ہونے کی اداکاری کرتے ہوئی کہا "تم کہہ سکتے ہو کہ تمہیں میرا سراغ نہیں ملا۔ میں کچھ عرصے کے لیے روپوش ہوجاؤں گا۔"

اس کی آنکھوں میں حریصانہ چمک ابھر آئی اور وہ بولا "تمہاری پیشکش جاندار ہے مگر وہ لوگ کچی گولیاں نہیں کھیلے ہوئے ہیں۔ ان میں سے ایک سور جیسا چینی باہر پھاٹک پر موجود ہے۔ تمہارے چوکیدار کو اسی نے قابو میں کیا ہوا ہے۔ ایسی صورت میں‘ میں تم سے کوئی سودے بازی نہیں کرسکتا۔ اس وقت تو تمہیں میرے ساتھ چلنا ہی ہوگا۔ بعد میں دیکھا جائے گا کہ میں تمہارے لیے کیا کرسکتا ہوں۔" یہ کہتے ہوئے وہ اپنی جگہ سے اٹھ گیا۔

"ابھی ٹھہرو!" میں نے اچانک اس کے عقب میں دیکھتے ہوئے اضطراری انداز میں کہا "ابھی ہماری بات چیت ختم نہیں ہوئی ہے۔ مذاکرات جاری ہیں۔"

وہ وہی سمجھا جو میں اسے سمجھانا چاہ رہا تھا۔ وہ اپنے عقب میں موجود‘ میرے کسی ساتھی کا مقابلہ کرنے کے لیے‘ بجلی کی سی سرعت کے ساتھ پلٹا اور میں نے کسی چیتے کی طرح اس پر چھلانگ لگادی۔ میں اسے لیتا ہوا قالین پر گرا تو ریوالور اس کے ہاتھ سے نکل چکا تھا۔

اس کی توجہ ہٹانے کے لیے استعمال کی جانے والی میری ترکیب بہت فرسودہ لیکن فطری تھی۔ لمحہ بھر کی غفلت میں بازی اس کے ہاتھ سے نکل گئی تھی۔ میں نے اس کے چہرے اور پیشانی پر پے در پے ٹکروں کی بھرمار کردی۔ اس ناگہانی آفت نے اسے سنبھلنے سے پہلے ہی بدحواس کردیا۔ اس کے حلق سے گھٹی گھٹی آوازیں نکل رہی تھیں۔ پھر میرے دونوں ہاتھ بھی بیک وقت حرکت میں آگئے اور اس کا چہرہ بہت تیزی کے ساتھ بگڑنے لگا۔ اس نے میرے چہرے پر جوابی وار کرنے کی کئی کوششیں کیں لیکن اچٹتی ہوئی بے سود ضربات کے علاوہ وہ میرا کچھ نہیں بگاڑ سکا۔

اس وقت ہم دونوں ہی نہتے اور ایک پر ایک کے اصول پر لڑ رہے تھے۔ میرا خیال تھا کہ میں اس کا بھرکس نکالنے کی پوزیشن میں آچکا تھا لیکن وہ اپنی اضطراری چیخوں کو غراہٹوں تک محدود رکھنے کے جتن کررہا تھا۔ شاید اسے ڈر تھا کہ اس کی آوازیں سن کر ملازمین وغیرہ اِدھر نکل آئے تو اس کے بچ نکلنے کی رہی سہی امیدیں بھی معدوم ہوجائیں گی۔

آخر کار اس کی داہنی کنپٹی میرے مکے کی زد میں آ ہی گئی۔ ضرب لگتے ہی اسے تارے نظر آگئے۔ ایک جھٹکے کے ساتھ اس کا بدن ساکت ہوگیا۔ مجھے اندازہ تھا کہ اس کی وہ بے ہوشی چند منٹ سے زیادہ طویل ثابت نہیں ہوگی۔ مجھے جو کچھ کرنا تھا اسی قلیل سی مدت میں کرنا تھا۔

اُس نے غزالہ کے لیے تحقیر آمیز انداز میں لونڈیا کا لفظ استعمال کیا تھا جس پر وہ عبرتناک سزا کا حق دار بن چکا تھا۔ میں ڈرائنگ روم کے بند دروازے کا بولٹ گرا کر تقریباً دوڑتا ہوا [illegible] گیا اور کچن سے سبزی کاٹنے والی چھری اٹھا کر واپس بھاگا تو وہاں مصروف خانساماں میرے تیوروں سے دہشت زدہ ہو کر کچن سے نکل گیا۔

میں نے بائیں ہاتھ کے انگوٹھے اور اس کے برابر والی انگلی سے اپنے بے ہوش حریف کے رخساروں میں پورا دباؤ ڈال کر اسے بے ہوشی کے عالم میں منہ کھولنے پر مجبور کردیا جوں ہی اس کی زبان تڑپ کر دہانے سے باہر آئی۔ میں نے بائیں ہاتھ کی ان ہی دو انگلیوں کے ناخن‘ اس کی نرم‘ گرم اور لجلجی زبان میں گاڑ دیے۔ اگلے ہی لمحہ میں نے اپنے داہنے ہاتھ میں دبی ہوئی چھری کی تیز دھار سے‘ کسی پیشہ ور قصاب کی سی سرد مہری کے ساتھ‘ اس کی زبان باہر کھینچ کر کاٹ دی۔ اس کی کٹی ہوئی زبان سے خون کا فوارہ ابلا لیکن پل بھر میں زبان اس کے دہانہ میں غائب ہوگئی۔ اذیت کے باعث اس کے بے ہوش بدن نے ایک تیز جھٹکا لیا۔ میں نے اس کی کٹی ہوئی زبان کا بے جان لوتھڑا اس کی جیب میں ڈال کر‘ اسی کے دامن سے اپنے ہاتھ اور چھری کا پھل صاف کیا اور ایک طرف ہٹ گیا۔

اس کی بے ہوشی کا تسلسل میرے لیے حیرت انگیز تھا۔ میرا خیال تھا کہ زبان کٹتے ہی وہ اذیت سے بلبلا کر ہوش میں آجائے گا لیکن اس کا جسم متحرک ہونے کے باوجود‘ اس کی بے ہوشی میں فرق نہیں آیا تھا۔ اس کے دہانے میں خون بھرنے کے بعد‘ اس کی دھاریں اس کی باچھوں سے بہنے لگی تھیں۔ میں نے اس کے ریوالور پر قبضہ کیا اور اس کے ہوش میں آنے کے انتظار میں ایک طرف کھڑا ہوگیا۔

اس کے دہانے سے خون بہنے کی رفتار بھی میرے قیاس سے کم تھی۔ پتا نہیں اس کے خون میں تیزی سے جمنے کی صلاحیت تھی یا پھر لعاب دہن کے طلسماتی اثر نے اس کی کٹی ہوئی زبان سے خون بہنے کی رفتار کم کردی تھی۔ میں پورے انہماک سے اس کی طرف متوجہ تھا کہ اندرونی سمت سے بلند ہونے والی ایک اضطراری‘ نسوانی چیخ پر اچھل پڑا۔

دروازے کے وسط میں سلمیٰ پھٹی پھٹی آنکھوں کے ساتھ اپنے منہ میں دوپٹہ دبائے کھڑی تھی۔ شاید کچن سے بھاگنے والے خانساماں نے اُسے میرے وحشیانہ تیوروں کی خبر پہنچادی تھی اور وہ اپنے ڈرائنگ روم کے قالین پر خون آلود دہانے والے ایک انسانی وجود کو پڑا ہوا دیکھ کر بری طرح دہشت زدہ ہوگئی تھی۔

"ڈرو نہیں!" میں نے اس سے تشفی آمیز لہجے میں کہا تو مجھے خود اپنی آواز اجنبی سی محسوس ہوئی "یہ مرا نہیں بلکہ بے ہوش اور زخمی ہے۔ یہ جہانگیر کو اغوا یا قتل کرنے کے مذموم ارادے سے یہاں آیا تھا۔ تم یخ بستہ پانی میں نمکین بنا کر جہانگیر کو پلاؤ تاکہ وہ جلد از جلد اپنے ہوش و حواس میں آسکے۔ ہمیں مل بیٹھ کر فوری طور پر کچھ اہم فیصلے کرنے ہوں گے۔ اچھا ہی ہوا کہ اس وقت میں یہاں موجود تھا۔ خود پر قابو رکھو اور اندر واپس چلی جاؤ۔"

اس نے بے ہوش شخص کی طرف سے سر گھما کر‘ پھٹی پھٹی‘ دہشت زدہ اور ویران آنکھوں سے میری طرف دیکھا اور فوراً ہی کانپتی ہوئی اندر کی طرف چل دی۔ مجھے امید تھی کہ اس نے میری بات سمجھ لی ہوگی اور میری ہدایت پر فوری عمل شروع کردے گی تاکہ میں انتظار میں وقت برباد کیے بغیر جہانگیر سے اس صورت حال پر مشورہ کرسکوں۔

اچانک شیدا خونی کے جسم میں تیز حرکت پیدا ہوئی۔ اسی کے ساتھ اُس کے دہانے میں بھرا ہوا خون ایک ابکائی کی صورت میں اس کے کالر‘ سینے اور گریبان کو رنگتا چلا گیا۔ لمحہ بھر بعد ہی وہ غرغراتا ہوا اپنے قدموں پر اٹھ کھڑا ہوا۔ وہ یقینی طور پر کچھ بولنے کی کوشش کررہا تھا لیکن اس کے حلق سے ہوا خارج ہونے کی لایعنی آوازوں کے ساتھ ہی فضا میں خون کی کچھ چھینٹیں اڑ کر رہ گئیں۔

قوت گویائی یا زبان سے محرومی کا پہلا احساس ہوتے ہی اس نے دونوں ہاتھوں سے دیوانہ وار اپنی زبان کو محسوس کرنا چاہا پھر حقیقت کا ادراک ہوتے ہی اس کا چہرہ یکلخت تاریک ہوگیا۔

"میں جہانگیر نہیں‘ ڈینی ہوں۔" میں نے اس کے ریوالور کی نال اس کی طرف لہراتے ہوئے کہا "اور میری بیوی لونڈیا نہیں‘ مادام غزالہ ہے۔ شہر کے بدمعاشوں کو کسی طرح بتادینا کہ میں ان کے لیے اب بھی پرانا ڈینی ہوں جو اپنی طرف اٹھنے والے ہر ہاتھ کو توڑ دینے کا عادی تھا۔ میں نے تمہیں عبرت کا نمونہ بنانے کے لیے زندہ رکھا ہے۔ اب یہاں سے نکلو اور دفع ہوجاؤ۔ آئندہ تمہاری منحوس صورت نظر آئی تو اسے دھڑ سے الگ کردوں گا۔"

وہ دہشت زدہ انداز میں‘ سہمے سہمے قدموں سے نکاسی کے راستے کی طرف بڑھا تو میرا خون ایک بار پھر کھول اٹھا۔ میں نے غیر ارادی طور پر اپنے ایک پیر سے جوتا اتارا اور تیزی سے آگے بڑھ کر اس کے سر پر جوتے مارنے شروع کردیے۔ وہ کوئی مزاحمت کیے بغیر‘ صرف اپنے سر کو بچانے کی ناکام کوشش کرتا ہوا‘ دروازے کے قریب سرکتا رہا۔ میں اسے اسی طرح جوتے مارتا ہوا باہر برآمدے تک لایا۔ کھلی جگہ میں آتے ہی اس نے بگٹٹ پھاٹک کی طرف دوڑ لگادی۔

میں نے اس کے پیچھے پھاٹک تک جانے کا ارادہ کرکے فوراً ہی منسوخ کردیا۔ مجھے یاد آگیا تھا کہ شیدا خونی کے ساتھ کم از کم ایک مسلح چینی بھی باہر موجود تھا جو میرے لیے خطرناک ثابت ہوسکتا تھا۔

شیدا خونی کے باہر نکلتے ہی‘ فضا میں کسی کار کا انجن اسٹارٹ ہونے کی آواز گونجی پھر چند ثانیوں بعد ہی انجن کی تیز ہوتی ہوئی آواز دور ہوتی چلی گئی۔ غالباً وہ لوگ بدحواسی کے عالم میں فرار ہوئے تھے۔ پھر باہر سے چوکیدار چیختا ہوا اندر داخل ہوا اور مجھے دیکھتے ہی گرتا پڑتا میری طرف ہولیا۔

چوکیدار کے آتے ہی اِدھر اُدھر سے کئی ملازمین بھی نکل پڑے۔ شاید خانساماں نے ان سب کو سنگین صورت حال سے آگاہ کردیا تھا اور وہ سب مختلف مقامات پر چھپ کر باہر نکلنے کے موقع کا انتظار کررہے تھے۔ ان میں سے ہر ایک کے ہاتھ میں پائپ یا ڈنڈے جیسی کوئی نہ کوئی چیز موجود تھی۔ خوف‘ سنسنی اور ہیجان سے ان سب کی حالت غیر ہورہی تھی مگر یہ بات قابل تعریف تھی کہ وہ راہ فرار اختیار کرنے کے بجائے میرے قرب و جوار ہی میں منڈلا رہے تھے تاکہ کسی بُرے لمحے میں میری مدد کو آسکیں۔ اس بھیڑ میں خانساماں کا پتا نہیں تھا۔

ادھیڑ عمر چوکیدار اس قدر ڈرا ہوا تھا کہ اس سے بولا ہی نہیں جارہا تھا۔ میں نے اس کے شانے پر ہاتھ رکھ کر‘ اسے اپنے قریب کرتے ہوئے دوسرے ملازمین کو ہدایت کی وہ فوری طور پر پھاٹک بند کرکے اندر سے مقفل کرلیں اور احاطے میں موجود رہ کر نگرانی کرتے رہیں تاکہ کہیں سے کوئی اندر نہ کود سکے۔ میں نے انہیں سختی سے حکم دیا کہ میری اجازت کے بغیر کسی بھی حالت میں پھاٹک نہ کھولا جائے۔

وہ ایک ٹولی کی صورت میں یکجا ہو کر‘ اس انداز میں پھاٹک کی طرف بڑھنے لگے جیسے انہیں وہاں دشمن کے کسی آدمی کی موجودگی کا خطرہ ہو۔ وہ منظر دیکھ کر پیشہ ور چوکیدار خود پر قابو نہ رکھ سکا۔ اس نے مجھ سے کچھ کہنا چاہا لیکن اس کا منہ خشک ہورہا تھا۔ وہ بول ہی نہ سکا۔ اس کوشش میں ناکامی کے بعد وہ تقریباً دوڑتا ہوا اس محتاط ٹولی سے آگے نکلتا چلا گیا۔ اس نے پرشور آوازوں کے ساتھ آہنی پھاٹک کے بولٹ اور کنڈے لگا کر انہیں مقفل کیا اور دوبارہ دوڑتا ہوا میرے پاس لوٹ آیا۔ وہ بہت تیزی کے ساتھ خوف اور صدمے کے ابتدائی اثرات سے باہر آرہا تھا۔

اس نے منتشر اور بے ربط فقروں میں جو کہانی سنائی اس کا خلاصہ یہ تھا کہ آنے والوں کی تعداد تین تھی۔ ان میں سے دو مقامی اور ایک چینی تھا۔ شیدا خونی نے جب گیٹ پر گھنٹی بجائی تو چوکیدار نے پھاٹک کھولنے سے پہلے ہی باہر کھڑی ہوئی ٹیکسی دیکھ لی تھی جس میں ڈرائیونگ سیٹ پر ایک مقامی شخص اور پچھلی نشست پر ایک موٹا اور زرد رو چینی براجمان تھا۔ جب شیدا خونی نے جہانگیر سے ملاقات کی خواہش ظاہر کی تو اس نے اپنے دونوں ساتھیوں کا کوئی ذکر نہیں کیا جس پر چوکیدار کا ماتھا ٹھنکا مگر اس نے انٹرکام پر مجھے متذبذب انداز میں مطلع کردیا۔ میری ہدایت پر وہ شیدا خونی کو ڈرائنگ روم میں بٹھا کر آیا تو اس کے کیبن میں موٹا چینی موجود تھا۔ جب وہ چیں چاں کرنے کے باوجود چوکیدار کو اپنی کوئی بات نہ سمجھا سکا تو اس کا ہاتھ تھام کر اسے باہر ٹیکسی تک لے گیا جہاں دوسرے مقامی نے ریوالور کے زور پر‘ اسے اپنے برابر میں بٹھالیا۔

اُس کا کہنا تھا کہ جب تک اس کا ساتھی اندر سے نہیں لوٹ آتا' اسے ٹیکسی میں بیٹھنا پڑے گا۔ اس دوران میں وہ دونوں انگریزی میں بات کرتے رہے جس کے صرف اکا دکا الفاظ ہی چوکیدار کے پلے پڑسکے لیکن ان سے وہ کوئی نتیجہ اخذ نہیں کرسکا۔ پھر جب شیدا خونی اپنے خون آلود دہانے اور لباس کے ساتھ دوڑتا ہوا نمودار ہوا تو اس کے دونوں ساتھی بوکھلا گئے۔ جب وہ شیدا خونی کو پچھلی نشست پر بٹھا رہے تھے تو چوکیدار اپنی سمت کا دروازہ کھول کر ٹیکسی میں سے بھاگ نکلا۔ ٹیکسی والے اس قدر عجلت میں تھے کہ اس کی پروا کیے بغیر تیز رفتاری کے ساتھ وہاں سے فرار ہوگئے۔

میرے لیے وہ معلومات یہ ثابت کرنے کے لیے کافی تھیں کہ جمی لائیڈ کے بیان کے مطابق' مکاؤ کے ڈون کوانگ فو کے آدمی میری تلاش میں کراچی پہنچ چکے تھے اور انہوں نے میرے لیے شہر میں جال پھیلانا شروع کردیا تھا۔ میرے لیے یہ بات حیرت انگیز تھی کہ ڈون کے پاس میرے فلیٹ کا فون نمبر موجود ہونے کے باوجود ان لوگوں نے فون کے ذریعے فلیٹ تک پہنچنے کی کوئی کوشش نہیں کی تھی۔

ڈون کے آدمی اتنے احمق نہیں ہوسکتے تھے کہ ایک یقینی سراغ کو چھوڑ کر موہوم امکانات کا پیچھا کرنا شروع کردیتے۔ ان کی اس لغزش کا صرف ایک ہی سبب میری سمجھ میں آتا تھا کہ مکاؤ سے میرے فلیٹ پر کی جانے والی دو فون کالز اور فلیٹ سے ملنے والے ٹکے سے جواب کی بنا پر انہوں نے یہ یقین کرلیا تھا کہ میں وہ جگہ چھوڑ کر کہیں جاچکا تھا اور نئے مکین میرے نئے ٹھکانے کے بارے میں کچھ نہیں جانتے تھے۔

وہ میری خوش فہمی بھی ہوسکتی تھی اس لیے ڈون کے آدمیوں سے پہلی جھڑپ کے بعد یہ لازم ہوگیا تھا کہ میں فوری طور پر غزالہ وغیرہ کو اس خطرے سے باخبر کردوں تاکہ کوئی حتمی فیصلہ ہونے تک وہ لوگ اپنی حفاظت کی طرف سے پوری طرح ہوشیار اور چوکنے رہیں۔

چوکیدار سے نمٹنے کے بعد میں اندر پہنچا تو سلمٰی اپنے خانساماں کے ساتھ جہانگیر کی خواب گاہ میں موجود تھی اور وہ بدستور اپنی پنک میں تھا۔ ایک تپائی پر لیموں کے تیز اور ٹھنڈے شربت سے بھرے ہوئے جگ کے ساتھ املی کا پانی دیکھ کر مجھے دل ہی دل میں اعتراف کرنا پڑا کہ ایک شرابی کی بیوی ہونے کے اعتبار سے سلمٰی نشہ توڑنے کے گروں سے بھی خوب واقف تھی۔ اس وقت صرف ترشی ہی جہانگیر کا نشہ تیزی سے غائب کرسکتی تھی۔

سلمٰی بہت زیادہ خوف زدہ تھی۔ اس کے چہرے کی رنگت ہلدی کی طرح زرد ہورہی تھی۔ میرے پہنچتے ہی اس نے ہاتھ پیر چھوڑ دیے اور ایک کرسی میں گر گئی۔ اس کے بدن پر اس وقت بھی خوف کی کپکپی طاری تھی۔ شاید اس نے اپنی زندگی میں پہلی بار کسی انسان کو اس قدر ابتر حالت میں دیکھا تھا۔

"میرا دل قابو میں نہیں ہے۔" وہ ہانپتے ہوئے بولی "میں انہیں سکنجبین کا ایک گلاس پلا چکی ہوں۔ اب تم ہی انہیں ہوش میں لاؤ۔ مجھے تو یہ سوچ سوچ کر ہول آرہے ہیں کہ کہیں پچھلی بار کی طرح ہمارے گھر پر مسلح دھاوا بول دیا گیا تو ہم کیا کریں گے؟ کہاں جائیں گے؟"

اس کا اشارہ اس ہولناک معرکے کی طرف تھا جو اسی مکان میں میرے اور ویرا کے درمیان برپا ہوا تھا۔ ویرا کے ساتھ معراج دین عرف ماجے کے مسلح آدمیوں کا پورا لشکر تھا جس کی کمان وہ خود کررہی تھی اور مکان کی گرد سینڈو سمیت مافیا کی بھاری نفری نے مورچے جمائے ہوئے تھے۔ اس رات فائرنگ کا اس قدر شدید تبادلہ ہوا تھا کہ سناٹا ہوجانے کے بعد بھی بہت دیر تک اس علاقے کی فضا جلے ہوئے بارود کی بو سے بوجھل رہی تھی۔ اس بار ویرا کے ساتھ ہی ماجے کے جو لوگ لہولہان ہوئے تھے یا مارے گئے تھے انہیں وہ خود اٹھا لے گئے تھے اس لیے اس گھمسان کے مقابلے میں سلمٰی کو کسی زخمی یا مُردے کا سامنا نہیں کرنا پڑا تھا۔

"موجودہ صورت حال بہت مختلف ہے۔" میں نے اسے تشفی دینے کی کوشش کی "ایسا نہیں ہوگا۔ پھر بھی میں ہر ممکن احتیاط کروں گا۔ چوری اور اغوا کرنے والوں میں اتنا حوصلہ نہیں ہوتا کہ کھل کر سامنے آسکیں۔ میں نے اسے جوتے مار کر بھگایا ہے۔"

"لیکن وہ کون ہے جو اِن کے اغوا پر تلا ہوا ہے؟" وہ بدستور ہانپے جارہی تھی "ان کے ساتھ ایسی کیا خرابی ہے کہ تھوڑے تھوڑے دنوں بعد کوئی نہ کوئی ناگہانی مصیبت آتی رہتی ہے؟"

"میں اسے یہ بتانے کی حماقت نہیں کرسکتا تھا کہ جہانگیر کے ان مصائب کی جڑ' میری اور اس کی گہری دوستی تھی۔ اس وقت اسے ٹالنا ہی سب سے بہتر تھا۔ میں نے کہا "اس پر تو جہانگیر ہی روشنی ڈال سکے گا۔ تم اپنے کمرے میں جاکر اپنے بچے کے ساتھ آرام کرو۔ جہانگیر کو میں دیکھ لوں گا۔" پھر میں خانساماں سے مخاطب ہوگیا "بیگم صاحبہ کے ساتھ جاؤ۔ انہیں کمرے میں پہنچانے کے بعد صاحب کے لیے ناشتا تیار کرلینا۔"

"چوکیدار تو خیریت سے ہے نا؟" سلمٰی نے جاتے جاتے نقاہت آلود آواز میں پوچھا۔

"خوف زدہ ہے مگر خیریت سے ہے۔ میں نے پھاٹک مقفل کرادیا ہے۔ اسے میری اجازت کے بغیر نہیں کھلوانا۔"

"تم نے اسے جوتے مار کر بھگانے کے بجائے پکڑ لیا ہوتا تو ہم اسے پولیس کے حوالے کرسکتے تھے۔" اس نے باہر نکلتے ہوئے شکوہ کیا "پولیس والے اس سے بہت کچھ اگلوا سکتے تھے۔"

"میں کہہ رہا ہوں کہ اپنے ذہن کو نہ تھکاؤ۔ وہ تین تھے۔ ان میں ایک چینی بھی تھا میں اسے نہ چھوڑتا تو وہ تمہارے چوکیدار کو جان سے مار ڈالتے۔ اب خاموشی سے جاؤ اور آرام کرو۔"

تخلیہ ہوجانے پر میں نے جہانگیر کے منہ پر ٹھنڈے پانی کا گلاس انڈیلا تو وہ پھریریاں لے کر منمنانے لگا۔ میں نے اس کے رخساروں پر پے در پے تھپڑ لگائے تو اس نے اپنی لال لال آنکھیں پھاڑنے کی کوشش کی اور میں نے سہارا دے کر اسے سیدھا بٹھادیا اور پھر املی کے پانی کا گلاس اس کے منہ سے لگادیا۔

میری کوششیں تیزی کے ساتھ بار آور ہوئیں اور اس کے خالی معدے میں اتری ہوئی اسکاچ باہر آجانے کے بعد' اس کی حالت سنبھلنے لگی۔ میں اسے پھیلی ہوئی خواب گاہ سے ڈرائنگ روم میں لے آیا۔

ناشتا شروع کرنے تک اسے علم نہیں ہوسکا کہ اس کی بے ہوشی کے دوران میں کیا حالات رونما ہوئے تھے۔ پیٹ پوجا کے بعد بھی وہ سُرور کے عالم میں تھا لیکن اس قابل ہوچکا تھا کہ اس سے کسی سنجیدہ موضوع پر کھل کر بات کی جاسکے اور وہ اس پر کوئی صائب رائے دے سکے۔

وہ ناشتے سے فارغ ہوا تو میں نے اسے آہستہ آہستہ شیدا خونی کے بارے میں بتانا شروع کردیا اور جہانگیر کی آنکھیں حیرت سے پھیلتی چلی گئیں۔ اس بار میں نے وہ باتیں بھی دہرادیں جو مجھے مافیا میں کام کرتے ہوئے سینڈو کی زبانی معلوم ہوئی تھیں۔ میں بذات خود کبھی بھی شیدا خونی سے نہیں ملا تھا لیکن سینڈو نے مجھے جو کچھ بتایا' اس کے مطابق شیدا خونی شیرشاہ کے علاقے میں رہنے والا ایک اجرتی قاتل تھا۔ مناسب معاوضہ دے کر اسے کسی بھی شخص کے قتل پر آمادہ کیا جاسکتا تھا۔ مشہور تھا کہ وہ کم و بیش بائیس خون کرچکا تھا لیکن قتل کے جرم میں کبھی پولیس کی گرفت میں نہیں آیا تھا۔ فساد اور شراب پی کر شوروغوغا کرنے کے جرم میں وہ کئی بار مختصر سزائیں ضرور کاٹ چکا تھا۔

"اب تم اِس کہانی پر غور کرو۔ میں ذرا غزالہ وغیرہ کو متوقع خطرے سے آگاہ کردوں۔" میں نے اپنی کہانی مکمل کرنے کے بعد کہا اور فون کی طرف بڑھ گیا "یہ یاد رکھنا کہ میں نے سلمٰی کو یہ نہیں بتایا کہ شیدا میری وجہ سے تمہیں اغوا کرنے آیا تھا۔"

یہ غنیمت ہوا کہ دوسری طرف سے غزالہ نے فون موصول کیا۔ اس میں خوبی یہ تھی کہ وہ مجھ سے غیر ضروری بحث میں نہیں الجھتی تھی۔ اس کی جگہ ویرا ہوتی تو فون پر ہی بال کی کھال نکالنی شروع کردیتی۔

میں نے بہت اختصار کے ساتھ اسے شیدا خونی کی آمد اور روانگی کے بارے میں آگاہ کرنے کے بعد' ڈون کوانگ فو کے آدمیوں کی طرف سے ہوشیار رہنے کی ہدایت کی اور فون بند کردیا۔

"میرے لیے یہ بات حیران کن ہے کہ وہ تمہاری تلاش میں تھا اور تمہارا صورت آشنا تک نہیں تھا۔" جہانگیر نے بہت غور و فکر کے بعد اس واردات میں وہ اہم ترین نکتہ دریافت کیا تھا۔

میں نے کرسی پر بیٹھنے کے بجائے بے چینی سے ٹہلتے ہوئے کہا "وہ لوگ تمہیں اغوا کرنے کے محدود مقصد کے ساتھ یہاں آئے تھے۔ ہوسکتا کہ میرا سراغ پالینے کے بعد ڈون کے آدمی' مجھ سے خود ہی دو دو ہاتھ کرنے کا ارادہ رکھتے ہوں۔ یہ ایک شرمناک حقیقت ہے کہ میری وجہ سے تم بار بار مشکلات کا شکار ہوتے چلے آرہے ہو۔ آج کے واقعے کے بعد میرے لیے یہ احساسِ جرم ناقابل برداشت ہوچلا ہے۔"

"بار بار کہاں؟ کبھی کبھار ایسا ہو ہی جاتا ہے......" اس نے کہنا چاہا مگر میں نے اس کی بات کاٹ دی۔

"پہلے ماجے نے ویرا کے ایما پر تمہیں اغوا کرکے میرے بارے میں تمہاری زبان کھلوانے کے لیے تمہیں وحشیانہ تشدد کا نشانہ بنایا۔ پھر اس نے بھاری مسلح نفری کے ساتھ تمہارے گھر پر چڑھائی کرڈالی۔ اس کے بعد ویرا نے انتقاماً تمہارے بیٹے کو اغوا کرلیا اور اب ڈون کوانگ فو کے آدمیوں کی نظریں بھی تم پر مرکوز ہیں۔ تم پر یہ سارے مصائب صرف اور صرف میری وجہ سے نازل ہورہے ہیں۔ میرا خیال ہے کہ موجودہ خطرہ کا مشترکہ طور پر سدباب کرنے کے بعد' میں تم سے کنارہ کشی اختیار کرلوں تاکہ میرے گناہوں کا عذاب تمہیں اور تمہاری مختصر سی فیملی کو نہ بھگتنا پڑے۔"

وہ اپنی جگہ پر پہلو بدل کر عارفانہ انداز میں ہولے سے ہنس پڑا اور پھر بولا "کمال ہے کہ بلانوشی میں نے کی ہے اور بہک تم رہے ہو۔ پہلی بات تو یہ ہے کہ میں مقدرات میں پختہ یقین رکھتا ہوں۔ تمہارا وجود تک نہ ہوتا تب بھی یہ مشکلات کسی اور بہانے سے نازل ہوسکتی تھیں۔ میرے مقدر میں جو کچھ لکھ دیا گیا ہے وہ تو ہونا ہی ہے۔ اس میں تمہارے یا کسی اور کے ہونے یا نہ ہونے سے کوئی فرق نہیں پڑے گا۔"

"تمہیں فرق پڑے یا نہ پڑے' میرے ضمیر کی خلش دور ہوجائے گی۔"

"تمہاری خلش اسی وقت کم ہوسکتی ہے جب تمہارے دشمن میرا پیچھا کرنا ترک کردیں گے اور یہ ہو ہی نہیں سکتا۔ تم مجھ سے ملو یا نہ ملو' ہمارے پرانے مراسم کی شہرت کی بنا پر تمہارے دشمن مجھے تمہارا دوست ہی تصور کرتے رہیں گے۔ یہ چھاپ اتنی گہری ہے کہ زندگی بھر ختم نہیں ہوسکتی۔ جب تم کسی کی دم مروڑو گے' وہ تم سے مار کھانے کے بعد میرے گھر پر چڑھائی کردے گا۔ اس کا بس ایک ہی علاج ہے کہ تم بھی میری طرح شریفانہ زندگی اختیار کرلو۔ تمہاری دشمنیاں ختم ہوں گی تو میں خود بخود محفوظ ہوجاؤں گا مگر یہ تو بتاؤ کہ شیدا خونی کس کے لیے کام کررہا ہے؟"

"فی الحال میں کوئی اندازہ نہیں لگا سکتا۔ یہ بعد کی باتیں ہیں اس وقت تمہیں اپنی حفاظت کی فکر کرنی چاہیے۔ شیدا خونی تمہارے لیے جلد ہی مصائب کھڑے کرنے کی کوشش کرے گا۔ اس کی خدمات کرائے پر حاصل کرنے والے بھی یہاں دوبارہ طبع آزمائی کرسکتے ہیں۔ ہوسکتا ہے کہ شیدا خونی دہشت کے باعث اِدھر

کا رخ کرنے کی ہمت نہ کرسکے لیکن بھاری معاوضے کے لالچ میں شہر کے دوسرے بدمعاش اس کام پر آمادہ ہوسکتے ہیں۔"

"میرے پاس بہت سہل ترکیب موجود ہے۔" وہ چند لمحوں تک خاموش رہنے کے بعد بولا "سلمٰی کافی دنوں سے میکے جانے کے لیے اصرار کررہی ہے۔ میں آج رات ہی اسے لاہور روانہ کردیتا ہوں۔"

میں نے غور سے اس کی طرف دیکھا پھر پوچھا "اصل خطرہ تمہیں ہوسکتا ہے۔ تم کیا کرو گے؟"

"میری فکر نہ کرو۔ میں بھی روپوش ہوجاؤں گا۔ میں نے فیکٹری میں جب سے پروڈکشن، ایکسپورٹ اور اکاؤنٹ کو کمپیوٹر پر ڈالا ہے، ہر دن کی تصویر آئینے کی طرح سامنے رہتی ہے اور سپروائزروں کو بھی معلوم ہوتا ہے کہ کس شعبے میں زیادہ توجہ کی ضرورت ہے۔ دس پانچ دن میرے بغیر بھی کام اسی طرح چلتا رہے گا۔"

اپنے بارے میں اس کا منصوبہ لاجواب تھا۔ مسز خان اپنے گھر والوں سے اپنے باس کے ساتھ بیرون شہر کے کاروباری دورے کا بہانہ کرکے اس کے پاس آجاتی اور وہ دونوں فرضی ناموں سے شہر کے کسی بڑے ہوٹل میں مقیم ہوجاتے۔ ان دونوں کے مراسم نئے نئے تھے اس لیے وہ ایک دوسرے سے اکتائے بغیر، ہفتہ عشرہ تک ہنسی خوشی ہوٹل کے کمرے تک محدود رہ سکتے تھے۔ ہوٹل کے عملے کے لیے وہ کوئی نئی بات نہ ہوتی۔ ان دونوں کی جملہ ضروریات اسی فلور بلکہ کمرے میں پوری ہوسکتی تھیں۔ میری طرف سے میدان صاف ہونے کا اشارہ ملنے کے بعد، جہانگیر اپنی سہولت کے مطابق اس فرضی دورے سے واپس آکر اپنی معمول کی ذمے داریاں سنبھال سکتا تھا۔

وہ منصوبہ بے داغ اور قابل عمل تھا۔ میں نے کہا "پھر وقت ضائع نہ کرو۔ رات کا انتظار کرنے کے بجائے پہلی پرواز سے سلمٰی کو اس کے میکے روانہ کردو۔ شیدے کی ابتر حالت کا اس نے بہت گہرا اثر لیا ہے۔ یہاں رہی تو وہ خواب میں بھی اسی کو دیکھ کر ڈرتی رہے گی۔"

فون کرنے پر معلوم ہوا کہ لاہور کے لیے اگلی براہ راست پرواز سات بجے تھی۔ اس سے پہلے پانچ بجے شام ایک اور پرواز سکھر کے راستے لاہور روانہ ہونی تھی۔ ہمارے لیے اہم مسئلہ یہ تھا کہ سلمٰی کو جلد از جلد شہر سے نکال دیا جائے پھر براہ راست کے مقابلے میں سکھر کے راستے جانے والی پرواز میں نشست بھی آسانی سے مل سکتی تھی اس لیے جہانگیر نے فون پر فیکٹری کے ایک ملازم کو سلمٰی اور اس کے شیر خوار بچے کا ٹکٹ گھر پہنچانے کی ہدایت کی پھر وہ مسز خان سے گفتگو میں مصروف ہوگیا۔ وہ فیکٹری ہی میں اپنے باس کی آمد کی منتظر تھی۔ اسے گفتگو کی آزادی فراہم کرنے کی نیت سے میں ڈرائنگ روم سے ٹل گیا۔ میں نے سوچا کہ اس مہلت سے فائدہ اٹھاتے ہوئے سلمٰی کو اس کی روانگی کے پروگرام سے باخبر کردوں تاکہ وہ فوری طور پر اپنی تیاری شروع کرسکے۔

میں نے سلمٰی کی خواب گاہ کے دروازے پر دستک دی تو اس نے یہ جانے بغیر کہ کون آیا تھا، اندر سے آجاؤ کی آواز لگائی اور میں جھجکتے ہوئے دروازہ کھول کر اندر داخل ہوگیا۔

سلمٰی ہاتھ پیر ڈھیلے چھوڑ کر مسہری پر چت لیٹی ہوئی تھی۔ اس کا بچہ قریب ہی رکھے ہوئے بے بی کاٹ میں بے خبر سو رہا تھا۔ مجھے دیکھتے ہی سلمٰی نے تیزی سے بستر سے اٹھنے کی کوشش کی تو میں وہیں رک گیا اور کہا "تم آرام کرتی رہو۔ میری وجہ سے تکلف میں پڑنے کی ضرورت نہیں، میں واپس جارہا ہوں۔"

"تم اکیلے ہی ہو؟" اس نے کمزور سی آواز میں پوچھا۔ اس کا زرد چہرہ اس وقت بھی ستا ہوا تھا۔

"ہاں، جہانگیر کچھ لوگوں کو فون کررہا ہے۔ میں تمہیں صرف یہ بتانے آیا تھا کہ جہانگیر تمہیں پانچ بجے والی پرواز سے لاہور بھیج رہا ہے۔ اپنا اور بچے کا سامان پیک کرکے روانگی کی تیاری کرلو۔"

"آجاؤ اور تھوڑی دیر کے لیے میرے پاس بیٹھو۔" وہ دوبارہ اسی انداز میں مسہری پر دراز ہوتے ہوئے بولی "میں تو یہ سوچ رہی تھی کہ جہانگیر تمہارے ساتھ ہوئے تو میرا یوں لیٹے رہنا مناسب نہیں ہوگا۔ شراب نوشی کے بعد انہیں ذرا ذرا سی باتیں بڑی ہوکر نظر آنے لگتی ہیں۔"

سلمٰی کی وہ بات سن کر میری کھوپڑی سن ہوکر رہ گئی۔ وہ حقیقت میں بہت دہشت زدہ تھی۔ اس کی حالت قابل رحم ہورہی تھی مگر اس حالت میں بھی اس کی سوچ سیدھی نہیں تھی۔ شوہر کو دکھانے کے لیے وہ مجھ سے حجاب برت سکتی تھی لیکن خلوت میں اسے مجھ سے کسی تکلف کی ضرورت نہیں تھی۔ میں اس کے وجود سے نظریں چراتے ہوئے ایک دور افتادہ کرسی پر جا بیٹھا حالانکہ مسہری کے قریب بھی دو کرسیاں موجود تھیں۔

سلمٰی نے ایک نظر میری طرف پھر خالی کرسیوں کی طرف دیکھا اور کسمسا کر اپنی پوزیشن اس طرح تبدیل کرلی کہ میری طرف دیکھتی رہے پھر اس نے پرتشویش آواز میں سوال کیا "کیا جہانگیر کے ساتھ مجھے پوری زندگی اسی خوف اور وحشت کے عالم میں گزارنی پڑے گی؟ اس کا ماضی اس کا پیچھا کیوں نہیں چھوڑتا؟"

"جرائم دو قسم کے ہوتے ہیں۔ پہلی قسم کے جرم کا ارتکاب کرنے والے کو ہر شخص مجرم سمجھتا اور اس سے نفرت کرتا ہے لیکن دوسری قسم کے جرائم ہماری معاشرتی زندگی کا حصہ بن چکے ہیں۔ اسمگلنگ، ذخیرہ اندوزی اور چور بازاری کرنے والوں کو کوئی مجرم کہنے کی جرات نہیں کرسکتا کیونکہ ان سنگین جرائم کو آج کاروباری ضروریات بلکہ لوازم کا درجہ دے دیا گیا ہے۔ جہانگیر کے بیشتر دشمنوں کا تعلق دوسری قسم کے مجرموں سے ہے۔ وہ اپنے ان زخموں کو آج تک فراموش نہیں کرسکے ہیں جو جہانگیر نے انہیں اپنی ذہانت سے لگائے تھے۔ وہ پیسے کے زور پر وقتاً فوقتاً کرائے کے آدمیوں سے اس پر وار کراتے رہتے ہیں لیکن آج میں نے شہر کے ایک نامی گرامی بدمعاش کو جس حالت میں جوتے مار کر یہاں سے نکالا ہے اس کے بعد اس برادری کے لوگ اِدھر آنے کے تصور سے کانپ اٹھیں گے لیکن پھر بھی احتیاط ضروری ہے۔ میرا خیال ہے کہ آئندہ تم بے خوف و خطر زندگی گزار سکو گی۔"

"تم نے اُس کے ساتھ کیا کیا تھا کہ اُس کے پورے جسم اور چہرے پر کوئی زخم نظر نہ آنے کے باوجود اُس کا دہانہ خون میں لتھڑا ہوا تھا؟ شاید اسے خون کی قے بھی ہوئی تھی۔" وہ جھرجھری لے کر بولی۔

"کچھ نہیں، میں نے صرف اُس کی زبان کاٹ دی تھی تاکہ آئندہ وہ ہم میں سے کسی کے نام کی تحقیر کرنے کے قابل نہ رہے۔" میں نے سپاٹ لہجے میں کہا "بائیس آدمیوں کے قاتل کی زبان کاٹ کر اُسے جوتے سے مارنا آسان کام نہیں تھا۔ اب شاید وہ زندگی بھر جرم کرنے کا تصور بھی نہیں کرسکے گا۔"

وہ پھریری لے کر رہ گئی۔ اس کی آنکھیں خوف اور بے یقینی سے کچھ اور پھیل گئی تھیں۔

"یقین نہیں آتا کہ تم جیسا نرم خو انسان ایسی درندگی بھی کرسکتا ہے۔" چند لمحوں کی خاموشی کے بعد وہ سرسراتی ہوئی پرخوف آواز میں بولی "خانساماں نے مجھے بتایا تھا کہ تم کچن سے سبزی کاٹنے والی چھری لے کر واپس بھاگے تھے۔ اس سے تو بہتر ہوتا کہ تم اسے ذبح ہی کردیتے۔ زبان کے بغیر وہ زندہ درگور ہوجائے گا۔"

"شاید مکافات عمل اسی کو کہتے ہیں۔ تم یہ کیوں بھول رہی ہو کہ وہ بائیس جیتے جاگتے انسانوں کا قاتل تھا۔ ان میں سے بیشتر ایسے تھے جنہیں وہ جانتا بھی نہیں تھا۔ اس نے معاوضہ لے کر انہیں صرف اِس لیے مارا تھا کہ معاوضہ دینے والے اُن لوگوں کو زندہ نہیں دیکھنا چاہتے تھے۔ مجھے خوشی ہے کہ آج میں نے ایک ایسے سفاک مجرم کو سزا دی ہے جو اپنی چالاکیوں کی وجہ سے قانون کی آہنی گرفت سے بچا ہوا تھا۔"

"میں اب تک کئی بار یہ سوچ کر لرز اٹھی ہوں کہ آج تم اتفاقاً اِدھر نہ آگئے ہوتے تو کیا ہوتا۔ جہانگیر نشے میں بے حال ہوتے اور وہ آسانی کے ساتھ انہیں ہانک کر اپنے ساتھ لے جاتا۔"

"ہم بہت کچھ سوچتے اور کرتے ہیں پھر اکثر اوقات اپنے کیے پر ناز بھی کرتے ہیں لیکن یہ بھول جاتے ہیں کہ ہم کٹھ پتلیوں سے زیادہ وقعت نہیں رکھتے۔ قدرت کی نادیدہ قوتیں ہمیں اس بند غار کی طرف دھکیلتی رہتی ہیں جہاں تقدیر ہماری گھات یا انتظار میں چھپی ہوئی ہوتی ہے۔ اس بند غار سے کبھی ہم پر ذلت و تباہی حملہ آور ہوتی ہے اور کبھی خوش بختی کا کمال ہمیں حیران کردیتا ہے۔ مجھے بھی کسی نادیدہ قوت نے ہی اِدھر بھیجا تھا ورنہ ابھی چند ہی روز پہلے تو میں غزالہ کے ساتھ یہاں آیا تھا۔"

اس نے ملتجیانہ نظروں سے میری طرف دیکھتے ہوئے کہا "تم اِدھر آتے رہا کرو۔ تمہارے آنے سے مجھے بہت ڈھارس ملتی ہے۔ غزالہ بہت خوش نصیب ہے کہ اسے تمہارا ساتھ میسر ہے۔ بعض مَردوں میں یہ خوبی ہوتی ہے کہ ان کی پناہ میں آیا ہوا ہر فرد خود کو ایک مضبوط سائبان کے نیچے محسوس کرتا ہے۔ میں اس آسودگی سے محروم ہوں۔ جہانگیر کے ساتھ میں خود کو ایک لق و دق صحرا میں بالکل بے سروسامان محسوس کرتی ہوں۔ مجھے دنیا کی ہر نعمت میسر ہے مگر تحفظ کا احساس ناپید ہے۔ ہر وقت یہ دھڑکا لگا رہتا ہے کہ کوئی مجھے لوٹ لے گا، اٹھا لے جائے گا یا مار ڈالے گا۔ تم آتے ہو تو میں خود کو یک بیک بہت محفوظ و مامون سمجھنے لگتی ہوں۔"

"مجھے آتے رہنے میں کوئی اعتراض نہیں لیکن جو کچھ تم بتا رہی ہو، اس میں تمہارا اپنا قصور ہے۔ جہانگیر پر اعتماد کرنا سیکھو۔ اُس سے ذہنی فاصلہ ختم کرکے اُس کے مسائل کو سمجھنے کی کوشش کرو۔ یہ جاننے کی کوشش کرو کہ وہ تم سے کیا چاہتا ہے۔ تم اُس کی توقعات کو بہتر انداز میں پورا کرنا شروع کرو گی تو اس کے رویے میں خود بخود انقلابی تبدیلی آجائے گی اور تمہیں اُس پر اعتماد ہونے لگے گا۔ مرد چونکہ مرد ہوتا ہے اس لیے وہ عمر بھر اپنی انا کا قیدی بن کر زندہ رہتا ہے۔ وہ زندگی کی بڑی سے بڑی آسائش، حتیٰ کہ گھریلو سکون کے لیے بھی ایک حد سے نیچے آنا اپنی عزت نفس کے خلاف سمجھتا ہے۔ اس کی انا کو بہتر خوراک ملتی رہے تو وہ چھوٹی چھوٹی خوشیوں کے لیے زمین پر ناک رگڑنے پر بھی آمادہ ہوجاتا ہے۔"

اس کی آنکھیں پرخیال انداز میں چھت پر مرکوز ہوگئیں اور وہ کمزور آواز میں بولی "آج مجھے اندازہ ہورہا ہے کہ تم جہانگیر کے سچے اور مخلص دوست ہو۔ میں ہمیشہ سے تمہارے لیے آسان چارا رہی ہوں۔ تم چاہتے تو میری کمزوریوں سے فائدہ اٹھا کر مجھے اپنی خواہشات کا غلام بنا سکتے تھے لیکن تم اس راستے سے ہمیشہ گریز کرتے رہے۔ میں تمہاری احسان مند ہوں کہ آج تم نے میری آنکھیں کھول دیں، مجھے میری غلطیوں کا احساس دلادیا۔ شاید تم سچ ہی کہہ رہے ہو کہ ہم دونوں کے درمیان صرف انا کی جنگ ہے جو اعتماد کی دیوار کو دیمک کی طرح چاٹے جارہی ہے۔ میں آج کے بعد کوشش کروں گی کہ جہانگیر سے میرا ذہنی سمجھوتا ہوسکے۔ یہی ہم دونوں کے حق میں بہتر ہوگا۔"

سلمٰی کی وہ باتیں سُن کر مجھے جو خوشی ہوئی، اس کا اندازہ میں ہی لگا سکتا ہوں۔ بات صرف اتنی سی تھی کہ ٹھنڈے لوہے پر ہزار چوٹیں بھی اس کی شکل میں کوئی نمایاں تبدیلی نہیں لاسکتیں۔ لوہا ٹوٹ جائے گا مگر کسی نئے سانچے میں نہیں ڈھل سکے گا۔ ہاں جب لوہا گرم ہو تو چند ہلکی ہلکی چوٹیں بھی اسے موم کی طرح کسی بھی طرف موڑ سکتی ہیں۔ اس وقت کے مخصوص حالات میں سلمٰی

دہشت اور خوف سے بے حال ہو رہی تھی۔ اُس کی ذات پر سے انا پرستی کا خول اتر چکا تھا اور شاید وہ ذکی الحس بھی ہوگئی تھی جب ہی اس نے میری باتوں کا بھرپور اثر قبول کرلیا تھا۔ مجھے خوشی اس بات کی تھی کہ سلمیٰ کے طور طریقوں میں تبدیلی آنے کے بعد، میں اپنے دل میں کوئی چور محسوس کیے بغیر، بے دھڑک اس گھر میں آمدورفت جاری رکھ سکتا تھا۔

میں نے مسکرا کر ستائشی نظروں سے اس کی طرف دیکھا پھر اس کمرے سے نکلتا چلا گیا۔

میں چاہتا تو جہانگیر کا پروگرام طے ہوجانے کے بعد وہاں سے رخصت ہوسکتا تھا لیکن میرے دل نے یہ گوارا نہیں کیا۔ ان کے مصائب کا سبب میری ذات تھی اس لیے آخر تک ان کا ساتھ دینا میرا فرض بنتا تھا۔

جہانگیر نے گھریلو ملازمین کو ہدایات دینے کے بعد مجھ سے کوئی بھی گاڑی پسند کرنے کے لیے کہا تو مجھے حیرت ہوئی کہ نشے کی حالت میں کہی ہوئی وہ بات بدستور اس کے ذہن میں اٹکی ہوئی تھی۔ اس بار میں نے اس کی پیشکش سختی کے ساتھ مسترد کردی۔ شہر میں ڈون کوانگ فو کے آدمیوں کے سرگرم عمل ہونے کا بین ثبوت سامنے آجانے کے بعد میں جہانگیر کی کوئی بھی گاڑی استعمال کرنے کا خطرہ مول نہیں لے سکتا تھا۔

میرا سراغ لگانے کے لیے، اُن لوگوں نے اپنی مہم جوئی کی ابتدا جہانگیر کی ذات سے کی تھی۔ اس کے روپوش ہونے کے بعد، اس کی کوئی گاڑی میرے زیرِ استعمال ہوتی اور پہچان لی جاتی تو میں اس کی وجہ سے مشکلات میں پھنس سکتا تھا۔ اس کی گاڑی لینے سے انکار کرنے کے ساتھ ہی میں نے سلمیٰ سے رقم لے کر دوسری کار خریدنے کا ارادہ بھی ترک کردیا۔ خطرناک حالات میں مسلسل ایک کار کو زیرِ استعمال رکھنے کے بجائے ہر بار نئی ٹیکسی میں سفر کرنے سے بہت سے ان دیکھے خطرات خود بخود ٹل سکتے تھے۔

وہ مجھے بتا چکا تھا کہ اُس کا ارادہ ائرپورٹ سے براہ راست ایک مشہور ہوٹل میں جانے کا تھا۔ مسز خان مقررہ وقت پر اس سے وہیں ملنے پہنچ جاتی۔ میں نے اسے مشورہ دیا کہ وہ سلمیٰ کو ائرپورٹ چھوڑنے کے لیے اپنی کار کے بجائے ٹیکسی استعمال کرے تاکہ وہ واپسی میں کار کی فکر سے آزاد رہے مگر اس معاملے میں وہ مجھ سے زیادہ چالاک ثابت ہوا۔ اس نے اپنی کار ائرپورٹ کی پارکنگ لاٹ میں ہی چھوڑنے کا فیصلہ کرلیا تھا۔ اگر اُس کی کار وہاں پہچان لی جاتی تو اس کا پیچھا کرنے والے یہی سمجھتے کہ وہ اپنی کار ائرپورٹ پر چھوڑ کر شہر سے فرار ہوگیا ہے۔

ائرپورٹ کے سفر میں، میں ان لوگوں کے ساتھ تھا۔ جہانگیر نے منزل آنے سے پہلے ہی، سلمیٰ اور اپنے شیرخوار بیٹے کو گاڑی ہی میں الوداع کیا پھر ہم تینوں کو اکلوتے سوٹ کیس کے ساتھ، لاؤنج کے سامنے اتار کر گاڑی پارکنگ لاٹ کی طرف لے گیا۔ اس کا ارادہ وہیں رک کر میرا انتظار کرنے کا تھا۔

میں نے سوٹ کیس ایک ٹرالی بردار قلی کے سپرد کرکے سلمیٰ کو اندر روانہ کیا اور اس وقت تک شیشوں میں سے اسے دیکھتا رہا جب تک وہ بورڈنگ کارڈ لے کر سیکیورٹی چیک پوسٹ میں غائب نہ ہوگئی۔ میں گردوپیش کا جائزہ لیتے ہوئے پارکنگ لاٹ کی طرف چل دیا۔

"فون پر مجھے اپنی خیریت سے باخبر کرتے رہنا۔" جہانگیر نے پارکنگ لاٹ سے ٹیکسی اسٹینڈ کی طرف جاتے ہوئے کہا "میں وہاں علی نواز خان کے نام سے قیام کروں گا۔ مسٹر اور مسز علی نواز یاد رکھنا۔ اور ہاں، یہ تجوری کی چابی بھی رکھ لو۔ اس میں میری بھی تھوڑی سی رقم پڑی ہوئی ہے جو مقامی کرنسی میں ہے۔ ہوسکتا ہے کہ یہ مشق طول پکڑ جائے اور تمہیں رقم کی ضرورت پیش آجائے تو پریشانی نہیں ہونی چاہیے۔"

اس کے ہاتھ سے تجوری کی چابی لیتے ہوئے، مجھے اس پر بے اختیار ترس آنے لگا۔ ڈون کوانگ فو کے خونخوار شکاری کتے اس کی بو کا پیچھا کر رہے تھے۔ وہ میری خاطر بلکہ میری وجہ سے خانہ بدوشی اختیار کرنے پر مجبور ہوگیا تھا لیکن پھر بھی وہ مطمئن اور خوش تھا کیونکہ اس طرح اسے مسز خان سے بھرپور مراسم استوار کرنے کا ایک نادر موقع میسر آرہا تھا۔

ہم ائرپورٹ سے ٹیکسی میں روانہ ہوئے تو میرا ارادہ تھا کہ میں جہانگیر کو ہوٹل چھوڑتا ہوا اسی ٹیکسی سے شرف آباد نکل جاؤں گا لیکن اسے اتارنے کے بعد میں نے اپنا ارادہ بدل دیا۔ صدر کے پُرہجوم علاقے میں اس ٹیکسی کو فارغ کرکے میں نے دوسری ٹیکسی پکڑی اور گھر روانہ ہوگیا۔



اِن تینوں کی رائے میرے فیصلے سے متصادم تھی۔ میں فلیٹ کو خیرباد کہہ کر ہوٹل بلکہ دو ہوٹلوں میں منتقل ہونا چاہتا تھا۔ ان کا کہنا تھا کہ اس کی سرے سے ضرورت ہی نہیں تھی۔ ویرا نے ان کی ترجمانی کے فرائض سنبھالے ہوئے تھے۔ اس کا کہنا تھا کہ اگر اُن لوگوں کو فلیٹ کا موہوم سا بھی خیال ہوتا تو وہ جہانگیر پر ہاتھ ڈالنے سے پہلے ہی وہاں طبع آزمائی کرتے۔ میں شہر کے ایک خطرناک قاتل کی زبان کاٹ کر اسے زندہ چھوڑ آیا تھا اس لیے اس کی طرف سے کسی متوقع انتقامی کارروائی کا خوف میرے ذہن میں جاگزیں ہوچکا تھا جو مجھے محفوظ اور آرام دہ فلیٹ سے نکل بھاگنے پر اکسا رہا تھا۔

بالفرض انہیں ڈون کو دیے ہوئے نمبر کا خیال آبھی جاتا تو وہ محض فون نمبر کے سہارے فلیٹ کا پتا نہیں لگا سکتے تھے۔ عام ڈائریکٹری سے یہ کام لینا ناممکن تھا۔ پھر کراچی میں ٹیلی فون کے محکمے کی کارکردگی اس قدر ناقص تھی کہ صارفین کے لیے ڈائریکٹری کئی سال کے وقفے سے چھاپی جاتی تھی۔ نمبروں کی ترتیب سے صارفین کے پتے فراہم کرنے والی خصوصی نیومیریکل ڈائریکٹری تو دس برس سے چھاپی ہی نہیں گئی تھی۔ اس میں جہانگیر کے اس فلیٹ کا نمبر اور پتا درج ہونے کا امکان ہی نہیں تھا کیونکہ وہ پاکستان میں ٹی کے فعال ہونے سے پہلے کا وقت تھا۔ اس وقت ہم لوگ دو وقت کی روٹی بھی بڑی محنت سے حاصل کیا کرتے تھے اور ہمارے لیے فون جیسی عیاشی کا تصور کرنا گناہ سے کم نہیں تھا۔ ڈون کے آدمیوں کو فون نمبر کے سہارے آگے بڑھنے کے لیے دو کام کرنے پڑتے۔ اول یہ کہ وہ اسی نمبر پر فون کرکے معلومات حاصل کرنے کی کوشش کرتے۔ ویرا کے پاس اس کا توڑ یہ تھا کہ فلیٹ پر آنے والی ہر فون کال غزالہ ریسیو کرے اور کسی بھی اجنبی کال کے جواب میں وہی رٹا رٹایا سبق دہراوے جو وہ مکاؤ سے آنے والی کال کے جواب میں سنا چکی تھی۔ ان لوگوں کے لیے دوسرا راستہ طویل تھا۔ اگر وہ فون نمبر کے ذریعے پتا معلوم کرنے کے لیے محکمے کے کسی آدمی پر جال ڈالتے تو اس میں کامیابی کے لیے وقت درکار ہوتا۔

ان تینوں نے اس تجزیے کے بعد یہ فیصلہ کیا تھا کہ ہمیں فوری طور پر فلیٹ چھوڑ کر فرار ہونے کی ضرورت نہیں تھی۔ ایک دو روز میں حالات بگڑتے تو اس فیصلے پر نظرثانی کی جاسکتی تھی۔ میرے پاس اس کے مربوط دلائل کا کوئی مثبت جواب نہیں تھا لیکن میری چھٹی حس مجھے ان سے اختلاف رائے پر مجبور کر رہی تھی۔

ویرا نے میری یہ بات سنتے ہی میرا مضحکہ اڑانا شروع کردیا "چھٹی حس کا تعلق لاشعور سے ہوتا ہے اور میں پہلے ہی بتا چکی ہوں کہ تمہارے لاشعور میں شیدے کا خوف گھسا ہوا ہے۔ تم سے کس حکیم نے کہا تھا کہ اسے زندہ جانے دو۔ اسے مار ڈالنے کے بعد شاید تم اپنی فطری مکاری کے ذریعے اس کے دونوں ساتھیوں کو بھی مار لیتے لیکن تم نے وہ موقع گنوا دیا۔ اب بلاوجہ چھٹی اور ساتویں حس کی باتیں کرکے اپنی کمزوری پر پردہ ڈالنے کی کوشش نہ کرو۔ یہ مان لو کہ اس کے منہ سے غزالہ کے لیے ایک تحقیر آمیز لفظ سن کر تمہاری کھوپڑی الٹ گئی تھی اور تم بدترین اشتعال کے عالم میں صحیح ترین فیصلہ کرنے کی اپنی سدابہار صلاحیت سے محروم ہوگئے تھے۔"

میں نے تنگ آکر ہتھیار ڈال دیے۔ "سمجھانا میرا فرض تھا۔ تم تینوں ہی یک زبان ہوگئے ہو تو میں خاموش ہوا جاتا ہوں۔ میں مانتا ہوں کہ شیدے کو زبان سے محروم کرتے ہوئے، شاید میرا دماغ الٹ گیا ہو مگر میں اپنے اس فعل پر نادم ہوں نہ اس کے نتائج سے خوف زدہ۔ خوف تو برسوں سے میرے خواب و خیال میں بھی نہیں پھٹک سکا ہے۔"

میں نے ان سے جو کچھ کہا اس میں تصنع کا کوئی دخل نہیں تھا۔ میں مکاؤ سے آئے ہوئے، ڈون کوانگ فو کے آدمیوں سے خوف زدہ تھا نہ مجھے شیدے کی طرف سے کوئی فکر لاحق تھی۔ ڈون کے آدمیوں کا سب سے بڑا مسئلہ یہ تھا کہ کراچی ان کے لیے ایک اجنبی شہر تھا اور ہر بڑے شہر کی طرح، ان کے لیے مشکلات پیدا کرنے کا سبب بن سکتا تھا۔ میری نظروں میں یہ اُن کی بہت بڑی کامیابی تھی کہ انہوں نے میرے اغوا کا مقصد حاصل کرنے کے لیے شیدے اور دوسرے جرائم پیشہ لوگوں تک رسائی حاصل کرلی تھی مگر میں اچھی طرح جانتا تھا کہ میرے ہاتھوں اپنی مٹی پلید ہونے کے بعد شیدا مجھ سے دوسرا تصادم مول لینے کی جرأت نہیں کرسکے گا۔ بڑے شکار پر منہ مارنے والے درندے کے جبڑے عین وقت پر اپنے شکار کو نگلنے کے لیے چھوٹے پڑ جائیں تو پھر وہ اس شکار سے زندگی بھر خوف زدہ رہتا ہے۔ اُس سے کہیں اتفاقاً بھی سامنا ہوجائے تو دُم دبا کر بھاگ نکلتا ہے۔ مجھے شیدے خونی سے اسی ردعمل کی توقع تھی پھر کراچی کی زیرِ زمین دنیا میں چلنے والے مقامی ضابطے بھی تھے۔ بڑے مجرموں کے بنائے ہوئے ان ضابطوں سے چھوٹے موٹے اور غیر معروف مجرم بھی خائف رہتے تھے اور اپنی بساط کے مطابق، ان کا پاس رکھنے کی پوری پوری کوشش کرتے تھے۔ اِن میں سب سے اہم اصول یہ تھا کہ باہر کے کسی آدمی کے ایما پر کوئی بھی ایک دوسرے کے خلاف کام نہیں کرتا تھا۔ باہمی بغض و عناد اور علاقوں کی تقسیم پر ہونے والے، آپس کے جھگڑوں میں عموماً طاقتور حریف فتح مند رہتا تھا۔ مقابلہ ٹکر کا ہو تو برادری کے مفاد میں چند "ثقہ" اور مستند مجرم درمیان میں ثالث کا کردار ادا کرکے فیصلہ کرا دیا کرتے تھے جسے ماننا دونوں فریقوں پر لازم ہوتا تھا۔ کافی عرصے سے یہ روایت چلی آرہی تھی کہ دو متحارب افراد یا گروہوں میں ایک سے زیادہ تصادم نہیں ہوتے تھے۔ پہلے ہی ٹکراؤ میں دونوں فریقوں کو اپنی اپنی حقیقی طاقت کا اندازہ ہوجاتا تھا اور کمزور ثابت ہونے والا فریق فی الفور اپنے دعوے سے دستبردار ہوجاتا تھا۔

میں بہت عرصے سے جرائم کی مقامی دنیا سے باہر تھا لیکن پچھلے دنوں میں مجھے اندازہ ہوچکا تھا کہ لوگ میرا نام نہیں بھولے تھے۔ وہ یہ بھی جانتے تھے کہ میں نے اگر کچھ ذاتی مصلحتوں کی بنا پر اپنی سرگرمیاں محدود یا موقوف کی ہوئی تھیں تو دوسری طرف میں نے تائب ہونے کا کوئی اعلان یا ارادہ نہیں کیا تھا۔ گو مافیا کی سرگرمیاں

بہت رازدارانہ ہوتی تھیں لیکن سینڈو اور اس کے بعد شیر شاہ خان کے آدمیوں کے ذریعے شہر کے محدود اور باخبر حلقوں میں یہ بات پھیل چکی تھی کہ میں ایک بار پھر ہیروئن کی لائن میں آگیا تھا۔

میرے لیے وہ نیک نامی یا اعزاز کی بات نہیں تھی لیکن اِس کا فائدہ یہ تھا کہ میں جرائم سے کنارہ کش ہوجانے کے باوجود، مجرموں کی برادری کا رکن تھا اور اگر شیدا اپنے معاملے میں کچھ لوگوں سے میرے خلاف مدد طلب کرتا تو اسے ناکامی کا منہ دیکھنا پڑتا۔ برادری کے ایک آدمی سے زبان کٹوانے اور جوتے کھانے کے بعد، دوبارہ اُدھر کا رخ کرنے کا ارادہ چھوٹے جبڑوں کے ساتھ بڑا شکار کرنے کی کوشش پر محمول کیا جاتا اور کوئی بھی اس کا ساتھ نہیں دیتا۔

شیدے کی زبان تراشی کا معاملہ معمولی نہیں تھا۔ میں جانتا تھا کہ اس کے ساتھ ہونٹوں چلی، کوٹھوں چڑھی والا قصہ ہوگا۔ شام ہونے سے پہلے پورے شہر کے بدمعاشوں کو معلوم ہوجائے گا کہ شیدا خونی اپنے زعم میں ڈپی کے ایک دوست کو اغوا کرنے گیا تھا اور وہاں سے اپنی زبان گنوا کر لوٹ آیا ہے۔ نام جہانگیر کا ضرور آتا لیکن یہ کوئی راز کی بات نہیں تھی کہ جہانگیر کو میری مکمل پشت پناہی حاصل تھی۔ اسے للکارنے کا مطلب میرے قہر و غضب کو للکارنے کے مترادف تھا۔ معراج دین عرف ماجے اور اس کے اڈے کی عبرتناک تباہی کے بعد سب جان گئے تھے کہ میں گوشہ نشین ہوجانے کے بعد بھی اتنی طاقت ضرور رکھتا تھا کہ اپنے اور اپنے جگری دوستوں کے بدخواہوں کے حلق میں ہاتھ ڈال کر، ان کی آنتیں باہر کھینچ سکوں۔

اس تشہیر کے بعد ڈون کوانگ فو کے آدمیوں کا کام بہت مشکل ہوجاتا۔ شیدا پسپائی اختیار کرلیتا اور دوسرے لوگ ان کے لیے کام کرنے پر آمادہ نہ ہوتے۔ جو حریص یا بدطینت لوگ کسی آمادگی کا اظہار کرتے وہ بھاری معاوضہ طلب کرنے کے ساتھ ہی من مانی شرائط بھی پیش کرتے، جن کا پورا کرنا آسان نہ ہوتا۔

یہ سب جانتے بوجھتے ہوئے، مجھے ڈون کوانگ فو کے آدمیوں یا شیدے سے خوف زدہ ہونے کی ضرورت ہی نہیں تھی مگر پھر بھی میں جہانگیر کے فلیٹ پر اپنا تصرف جاری رکھنے کے حق میں نہیں تھا۔

پچھلے کئی دنوں سے ہمارے معمولات بہت خراب نہج پر چل رہے تھے جس کے نتیجے میں ہماری نیندیں پوری نہیں ہو رہی تھیں۔ اس لیے یہ طے کیا گیا کہ دوپہر اور شام کے کھانے کی تیاری اسی وقت شروع کردی جائے تاکہ ہم رات کا کھانا جلدی کھا کر، اپنے اپنے ٹھکانوں پر آرام کرسکیں۔

غزالہ نے کھانا تیار کرنے کے ارادے سے کچن کا رخ کیا تو سلطان شاہ بھی اس کی مدد کرنے کے لیے اس کے ساتھ ہولیا۔ وہ غزالہ کے ساتھ عملی ہمدردی کا کوئی موقع ہاتھ سے نہیں جانے دیتا تھا۔

میدان صاف ہوتے ہی ویرا پرشوق انداز میں میرے قریب سرک آئی اور سرگوشیانہ لہجے میں بولی۔ "بوتل وغیرہ نکال لوں؟ اسکاچ پیو گے؟" اس وقت اس کی آنکھوں میں حریصانہ چمک موجود تھی۔

اس کے سوال کرنے کے انداز سے ظاہر ہو رہا تھا کہ اسے پوری امید تھی کہ اس کی پیشکش سنتے ہی میری رال ٹپک پڑے گی مگر جب میں نے اسے تیز نظروں سے گھورا تو وہ خاصی بوکھلائی ہوئی نظر آنے لگی۔

"ابھی دوپہر ہوئی ہے۔ تم نے ابھی سے پینی شروع کی تو رات تک پیتی رہو گی اور پھر بدحال ہو جاؤ گی۔" میں نے کہا۔ "اس وقت تم شراب کو ہاتھ بھی نہیں لگاؤ گی۔ سورج ڈوبنے کے بعد تم اپنا شوق پورا کرسکتی ہو۔"

"میرے محتسب اور بزرگ بننے کی کوشش نہ کرو۔" وہ منہ بنا کر بولی۔ "مجھے اپنے کسی بھی قول و فعل کے لیے تمہارے مشورے کی ضرورت نہیں ہے۔ میں عاقل و بالغ ہوں اور خوب اچھی طرح سمجھتی ہوں کہ مجھے کس وقت کیا کرنا چاہیے۔ میں نے صرف یہ پوچھا تھا کہ تم پیو گے یا نہیں؟ اس میں میرا سوال ہی نہیں تھا۔ جو کچھ بتانا ہے، اپنے بارے میں بتاؤ۔"

"صبح میں نے جہانگیر کو بلانوشی کے بعد جس بری حالت میں دیکھا ہے، اس کے بعد شراب سے کراہیت سی آرہی ہے۔ میں اس وقت گلاس کو منہ لگانا بھی پسند نہیں کروں گا۔" میں نے جواب دیا۔

"خواہ گلاس میں یخ بستہ پانی ہی کیوں نہ ہو؟" اس نے طنز سے پوچھا۔

"ڈُلکی چلتے چلتے سرپٹ نہ ہوا کرو۔ اس وقت پانی کی بات کہاں سے آگئی؟"

"خرابی شراب کی نہیں، نا ہمنگ کی تھی۔ اگر تم بھی جہانگیر کے ساتھ صبح سات بجے سے پی رہے ہوتے تو تمہیں اس میں کوئی خرابی نظر نہ آتی۔ اول تو تم اسے اتنی تیزی سے نہ پینے دیتے یا پھر تم خود بھی اس کے ساتھ ڈاؤن ہوجاتے۔ خرابی یہ ہوئی کہ تم درمیان میں پہنچے۔ تم ہوش مند تھے اور وہ مدہوش۔ اسی لیے تو رندوں کی محفل میں واعظ و شیخ کے داخلے پر کڑی پابندی عائد ہے۔ وہ آتے ہی رنگ میں بھنگ ڈال دیتے ہیں۔"

"معلوم ہوتا ہے کہ تم نے حال ہی میں منی بیگم کی گائی ہوئی کوئی غزل سن لی ہے۔ انہیں واعظ، شیخ اور رندوں کے معمولات سے گہری دلچسپی معلوم ہوتی ہے۔" میں نے سنجیدگی کو خیرباد کہتے ہوئے کہا۔

"کسی کی غزلیں سنے بغیر بھی میں ان باتوں پر دسترس رکھتی ہوں جو اردو کے بیشتر شاعروں کو پریشان کیے رہتی ہیں۔ میں تم کو صرف یہ بتانا چاہ رہی تھی کہ ہوش اور عقل شراب کی غذا ہیں۔ شراب پی ہی اس لیے جاتی ہے کہ انسان اپنے ہوش و حواس سے کسی حد تک بے بہرہ ہو کر، اپنے ماحول یا مسائل سے فرار حاصل کرنا چاہتا ہے۔ اب اگر ایسی نادر چیز پر عقل اور شعور کا اطلاق کیا جانے لگے تو اس سے بڑی زیادتی کیا ہوگی؟"

"زیادتی نہیں، یہ سیدھی سیدھی سانپ اور نیولے کی لڑائی ہے۔ دونوں ایک دوسرے کے ازلی اور جانی دشمن ہیں۔ عقل ماری جائے تو انسان، جہانگیر کی طرح، بستر سے اٹھتے ہی شراب نوشی شروع کردیتا ہے اور عقل جیت جائے تو آدمی میری طرح مزید محتاط ہوجاتا ہے۔ سوری! اس وقت میں کسی طرح تمہارا ساتھ نہیں دوں گا۔"

"معلوم ہوتا ہے کہ تم بھی زاہد بننے کی تیاریاں کررہے ہو۔" وہ اٹھتے ہوئے بولی۔ "اگر تم بھی اسی طرح ساغر و مینا پر عقل کے پیمانے لاگو کرتے رہے تو میری بددعا ہے کہ تم جلد از جلد زاہد خشک بن جاؤ۔" وہ تیزی سے مڑی اور اپنے مطلوبہ لوازم اکٹھے کرنے کے لیے اندر چلی گئی۔ اپنی برہمی کا اظہار کرنے کے لیے وہ فرش پر زور زور سے پیر مار کر چل رہی تھی۔

تنہائی میسر آنے پر، میں نے اپنے ذہن کو ٹٹولنا شروع کردیا۔ میں فلیٹ سے کیوں نکل جانا چاہ رہا تھا؟ وہاں ہمیں کیا خطرہ لاحق ہوسکتا تھا؟ لیکن مجھے اپنے ان سوالات کا کوئی مضبوط جواب نہیں مل سکا جو ان تینوں کو قائل کردیتا۔

پہلے سے طے شدہ پروگرام کے مطابق ہم چاروں نے سرِشام ہی رات کا کھانا کھالیا اور آٹھ بجے کے قریب سونے کے لیے چلے گئے۔ میرے اور غزالہ کے لیے ایک خوابگاہ مخصوص تھی۔ مکاؤ میں جبری شادی کے بعد، واپسی پر ویرا نے ہم دونوں کو یہ رعایت دے دی تھی ورنہ ایک کمرا اس کے اور غزالہ کے تصرف میں رہتا تھا۔ دوسری خوابگاہ میرے اور سلطان شاہ کے مشترکہ استعمال میں رہتی تھی۔ غزالہ نے جب بھی سلطان شاہ کی بے آرامی کے بارے میں فکرمندی کا اظہار کیا تو ویرا نے ہمیشہ نہایت فراخ دلی کے ساتھ پیشکش کی کہ سلطان شاہ اس کے ساتھ دوسری خوابگاہ میں سو سکتا تھا جہاں ایک ڈبل بیڈ کے بجائے دو عدد سنگل بیڈ موجود تھے لیکن سلطان شاہ ہمیشہ بھڑک اٹھتا تھا۔ وہ لاکھ دلیر اور بے خوف سہی لیکن اس معاملے میں اس میں مردانگی مفقود تھی۔ وہ ویرا کے ساتھ ایک کمرے میں مقید ہونے کے ذکر سے ہی وحشت زدہ ہوجاتا تھا۔

اس روز ویرا ویسے بھی سرور میں تھی۔ مجھے سلگانے کے لیے اس نے دوپہر ہی سے شراب نوشی کا آغاز کردیا تھا۔ پھر وہ وقفے وقفے سے ہلکے پیگ لیتی رہی۔ اس کا خیال تھا کہ میں اسے ٹوکنے یا اس کے ساتھ الجھنے کی کوشش کروں گا لیکن میں نے اسے بری طرح نظرانداز کرنے کا فیصلہ کیا ہوا تھا۔ وہ ہمیشہ کی ضدی تھی اور نشے میں آکر کچھ بھی کرسکتی تھی لیکن غنیمت یہ تھا کہ وہ پی کر آپے سے باہر نہیں ہوئی تھی۔ جب اس نے سلطان شاہ کو سونے کے لیے ڈرائنگ روم کا رخ کرتے ہوئے دیکھا تو مسکرا کر اسے اپنے

کمرے میں آنے کی دعوت دی جو اس نے نہایت خشک لہجے میں مسترد کردی۔

"اکیلے کمرے میں سوئے تو میں رات بھر تمہیں خواب میں ڈراتی رہوں گی۔" ویرا نے بوجھل ہنسی کے ساتھ کہا۔

"تم سے اس کے علاوہ اور کیا امید کی جاسکتی ہے؟" سلطان شاہ نے ترکی بہ ترکی جواب دیا "میری ماں لڑکپن میں مجھ سے کہا کرتی تھی کہ آدھی رات کے بعد چڑیلیں' خوبصورت عورتوں کا روپ دھار کر مَردوں کو پھنسانے کے لیے نکلتی ہیں۔ اس بے چاری کو اُلٹی ہی بات بتائی گئی تھی۔ روپ بدلنا چڑیلوں کے بس سے باہر کی بات ہے۔ ہاں' تم ضرور آدھی رات کے بعد چڑیل کا روپ دھار سکتی ہو۔ اسی لیے میں رات کو تمہارے قریب رہتے ہوئے ڈرتا ہوں۔"

"یہ چڑیل کیا ہوتی ہے؟" ویرا نے مجھ سے پوچھا۔ غزالہ اپنے کمرے میں جاچکی تھی۔

ویرا کے اس سوال پر مجھے نہایت خوشگوار حیرت ہوئی۔ اردو زبان کا وہ پہلا لفظ تھا جو اس کے سر پر سے گزر گیا تھا ورنہ وہ خاصے ثقیل الفاظ بامحاورہ انداز میں بول اور سمجھ لیتی تھی۔ اردو پر اس کی دسترس قابل رشک تھی۔

"مزاج میں تم جیسی ہوتی ہے البتہ تمہاری جیسی شکل و صورت تھوڑی دیر کے لیے ہی اپنا سکتی ہے۔ عام طور پر کریہہ اور بدصورت نظر آتی ہے۔ انگریزی میں اسے وِچ کہتے ہیں۔" میں نے بے پروایانہ انداز میں کہا۔

وہ مُکا تان کر میری طرف جھپٹی اور میں تیزی کے ساتھ اپنے کمرے میں داخل ہوگیا۔

فلیٹ کی روشنیاں وغیرہ گل ہونے کے بعد نیند نے مجھے جلد ہی آلیا۔ مجھے نہیں معلوم کہ میں کتنی دیر تک سویا ہوں گا۔ گھٹن کے ایک عجیب سے احساس کے ساتھ میری آنکھ کھلی تو میں ہڑبڑا کر رہ گیا۔ تاریکی میں میرے اوپر ایک بھاری بھرکم ہیولا جھکا ہوا تھا۔ اُس کا ایک ہاتھ بہت سختی کے ساتھ میری ناک اور دہانے پر جما ہوا تھا۔ اس کی ہتھیلی میں کوئی نم آلود چیز بھی موجود تھی جسے مستقل طور پر میری ناک سے چپکائے رکھنے کے لیے وہ سخت محنت کررہا تھا۔

میں نے پوری قوت صرف کرکے غزالہ کو پکارنے کی کوشش کی لیکن میرا دہانہ اتنی مضبوطی کے ساتھ بند کیا گیا تھا کہ میرے ہونٹوں سے خفیف سی آواز بھی نہیں نکل سکی۔ میں نے بستر سے ٹانگیں اٹھا کر' اس کے جھکے ہوئے سر پر قینچی لگانے کا ارادہ کیا لیکن اپنے بوجھل پیروں کو جنبش دے کر رہ گیا اور اسی لمحے میں نے اس شخص کی ہتھیلی سے خارج ہونے والی' کلوروفارم کی تیز اور مخصوص بو پہچان لی۔ میں نے اپنے وجود میں پیدا ہوجانے والے ہیجان اور بدحواسی کے باوجود' فوراً ہی اپنا سانس روک لیا مگر مجھے دیر ہوچکی تھی۔ میرے نظام تنفس کے ذریعے' بدن میں داخل ہوجانے والی گیس نے اپنا کام دکھانا شروع کردیا تھا۔ میں نے دونوں ہاتھوں سے اس کی کلائی پکڑ کر خود کو آزاد کرانا چاہا لیکن کامیاب نہ ہوسکا۔ اپنی دھندلاتی ہوئی نگاہوں سے میں نے دیکھا کہ دوسرا سایہ' میرے پہلو میں سوئی ہوئی غزالہ پر جھکا ہوا تھا۔ میں نے سوچا کہ کیا وہ حقیقت تھی یا مجھے ایک کے دو نظر آرہے تھے؟ اس سے آگے میرا ذہن تاریکی کی اتھاہ دلدلوں میں ڈوبتا چلا گیا۔

دوبارہ آنکھ کھلی تو میرے چاروں طرف اندھیرا تھا۔ میرا پورا بدن کسی پھوڑے کی طرح دکھ رہا تھا اور منہ کا ذائقہ بگڑا ہوا تھا۔ وہ عجیب سی کیفیت تھی۔ مجھے اندازہ نہیں ہوپا رہا تھا کہ میں واقعی ہوش میں آرہا تھا یا پھر کوئی ڈراؤنا خواب دیکھ رہا تھا۔ میں نے ہاتھ پیر ہلانے کی کوشش کی تو پتا چلا کہ میرے دونوں ہاتھ پشت پر لے جاکر باندھ دیے گئے تھے۔ اسی طرح پیر بھی بندھے ہوئے تھے۔ جسم کے نیچے سخت اور پختہ فرش تھا جس کی سیلن میں اپنی جلد پر محسوس کررہا تھا۔

پچھلی رات کے آخری واقعات یاد آتے ہی مجھ پر اضطراب طاری ہوگیا۔ فلیٹ سے منتقل ہونے کے بارے میں مجھے اپنی چھٹی حِس کی تنبیہہ کا سبب معلوم ہوچکا تھا لیکن اس وقت بھی میں یہ سمجھنے سے قاصر تھا کہ مجھے کس قسم کا خطرہ تھا؟ میں کہاں قید تھا؟ مجھے فلیٹ سے بے ہوش کرکے اس مقام تک لانے والے کون تھے؟ غزالہ کہاں تھی؟ بقیہ لوگ کہاں اور کس حال میں تھے؟ میں نے اضطراری طور پر غزالہ کو آواز دی تو اپنی کمزور آواز کی بازگشت سے مجھے اندازہ ہوا کہ میں کسی بڑے کمرے میں قید تھا۔ میرے پکارنے پر کوئی جواب نہیں آیا تو میں نے اپنی تمام تر توجہ کسی بھی قسم کی کوئی آواز یا آہٹ سننے پر مرکوز کردی۔

اس وقت میرا دل اتنی تیزی کے ساتھ دھڑک رہا تھا کہ میں اس کی آوازیں سن رہا تھا۔ پھر مجھے اپنے قریب ہی سے کسی کے لمبے لمبے اور گہرے گہرے سانسوں کی آوازیں آئیں تو میں نے غیر ارادی طور پر ان آوازوں کی طرف کھسکنا شروع کردیا۔ میں نے چند سیکنڈ میں ہی اندازہ لگالیا کہ ایک ایڑی اور پنجے کے زور پر کھُردرُے فرش پر گھسٹنے کے نتیجے میں میں خود کو لہولہان کرلوں گا اس لیے میں نے وہ سلسلہ موقوف کرکے لڑھکنا شروع کیا اور پھر زمین پر پڑے ہوئے کسی اور وجود سے ٹکرا کر رک گیا۔ بدن کی مانوس بو اور جائزہ سے اندازہ ہوا کہ وہ سلطان شاہ تھا جو میری ہی طرح بے ہوش اور بے دست و پا تھا۔

میں سلطان شاہ کی دیکھ بھال کر ہی رہا تھا کہ اِس کمرے کی محدود فضا کسی کے کراہنے کی ہلکی سی آواز سے گونج اٹھی۔

"کون ہے؟" میں نے قدرے بلند آواز میں پوچھا۔ "یہاں دو آدمی اور بھی ہیں۔"

"میں کہاں ہوں؟ میرا ہاتھ چھوڑو!" اچانک ویرا کی غنودہ سی منمناہٹ سنائی دی۔ شاید وہ بھی وہیں تھی اور اس وقت ہوش میں ...زری تھی۔ میں سلطان شاہ کو چھوڑ کر' اس کی طرف لڑھکنے لگا۔

...رفتہ رفتہ ویرا ہوش میں آگئی۔ وہ بھی بندھی ہوئی تھی۔ چند ...ٹوں تک وہ اول فول بکتی رہی پھر اعتدال پر آنے کے ساتھ ہی ...یرت اور تشویش میں مبتلا ہوتی چلی گئی۔ اسے اندازہ بھی نہیں ہوسکا تھا کہ اسے کب اور کس طرح بے ہوش کرکے اس تاریک ...ید خانے میں پہنچایا گیا تھا۔ بستر پر سونے کے بعد اسے دوبارہ اسی ...قت ہوش آیا تھا۔

سلطان شاہ کو میں دیکھ چکا تھا۔ ویرا کو پوری طرح ہوش میں لانے کے بعد' میں نے اس کے ساتھ غزالہ کی تلاش شروع کردی اور وہ بھی ہمیں ایک دیوار کی جڑ میں بے ہوش پڑی ہوئی مل گئی۔ ہمارے چھیڑ چھاڑ کرتے ہی اس نے بھی ہوش میں آنا شروع کردیا۔ چند منٹ کے عرصے میں ہم چاروں پوری طرح اپنے ہوش و حواس میں آچکے تھے۔

"میرے قریب رہو!" غزالہ نے سرسراتی ہوئی' خوف زدہ آواز میں مجھ سے کہا۔ "اس اندھیرے ماحول سے میرا دم گھُٹ رہا ہے۔ پتا نہیں ہم چاروں کو یہاں لانے والے کون لوگ ہیں اور ہم سے کیا چاہتے ہیں؟"

"اس وقت تمہاری کانپتی ہوئی آواز سن کر مجھے یقین نہیں آرہا کہ تم وہی غزالہ ہو جس نے انگلینڈ میں بدمعاشوں کے چھکے چھڑا دیے تھے اور کسی چکنی مچھلی کی طرح ہر بار ان کی گرفت سے پھسلتی چلی گئی تھی۔" ویرا کی متحیرانہ آواز ابھری۔ "یہ لوگ جو بھی ہوں' ہمارے دوست نہیں ہوسکتے اور دشمنوں کی فہرست میں فی الحال ڈون کوانگ فو کا نام سب سے اوپر ہے۔ یہ ساری نحوست زیبی کی چھٹی حِس کی لائی ہوئی ہے....."

"میں نے ڈون کے آدمیوں کی وجہ سے فلیٹ چھوڑنے کی تجویز پیش نہیں کی تھی!" میں نے احتجاج کیا۔

"وجہ کچھ بھی رہی ہو۔ اصل بات یہ ہے کہ تم نے ایک تجویز پیش کی جسے ہم تینوں نے مسترد کردیا اور اب ہم چاروں اس کی سزا بھگت رہے ہیں۔ اگر اب بھی تمہیں اپنی تجویز کا سبب معلوم نہیں ہوسکا تو اللہ تم پر اپنا رحم کرے۔ میں تو یہی کہوں گی کہ تم درویش یا ولی اللہ ہوگئے ہو۔ جو بات کہتے ہو' وہ انہونی ہونے کے باوجود ہوکر رہتی ہے۔ اب ہمارے حق میں خیر کی بھی کوئی بات کہو تاکہ وہ بھی پوری ہوسکے اور ہمیں اس ناگہانی عذاب سے جلد از جلد نجات مل سکے۔"

"اس کمرے میں کہیں بھی کسی دراڑ یا جھری سے روشنی کی کوئی کرن نہیں آرہی۔ معلوم ہوتا ہے کہ باہر رات ہوگئی ہے۔" سلطان شاہ کی پُرتشویش آواز ابھری۔ "کیا ہم چوبیس گھنٹے بے ہوش رہے ہیں۔"

"بہت دور کی کوڑی لائے ہو۔" ویرا کی آواز میں خوف کا شائبہ تک نہیں تھا۔ "تمہاری بات قابل غور ہے۔ کلوروفارم کی بہت زیادہ مقدار بیک وقت دی جائے تو مہلک بھی ثابت ہوسکتی ہے۔ ہماری بے ہوشی کی مدت کو طول دینے کے لیے یقیناً ہمیں کئی بار ڈوز دیے گئے ہوں گے۔ اس کا مطلب ہے کہ یہ لوگ ہمیں مارنا نہیں چاہتے جب ہی اتنی مدت سے بے ہوش رکھا ہوا ہے۔"

"مارنا ہوتا تو فلیٹ ہی میں مار دیتے۔ یہ بگلے کے سر پر موم بتی جلا کر' اسے پکڑنے والے لوگ معلوم نہیں ہوتے۔" میں نے کہا۔

"یہ بھی تو ہوسکتا ہے کہ باہر رات نہ ہو۔ اس قید خانے کی دیواروں اور دروازوں میں کوئی دراڑ یا جھری ہی نہ ہو جس میں سے روشنی کی کوئی کرن اندر آسکے۔" غزالہ کی سوچ میں ڈوبی ہوئی آواز سنائی دی۔

اس کے جواب میں ویرا نے کچھ بولنے کی ابتدا ہی کی تھی کہ غزالہ کی پرجوش سرگوشیانہ آواز نے ہم سب کو چونکا دیا۔ "اُدھر بائیں طرف دیکھو' ابھی ابھی باہر روشنی ہوئی ہے۔ شاید کوئی آرہا ہے۔"

ہم سب کے سر اسی طرف گھوم گئے۔ وہاں کسی بند دروازے کی نچلی جھری میں روشنی کا ایک پتلا سا مستطیل نظر آرہا تھا۔ اسی کے ساتھ دروازے پر کچھ آہٹیں بھی سنائی دے رہی تھیں۔

ہم چاروں دیوار کے سہارے ایک ہی جگہ بیٹھے ہوئے تھے۔ ہم نے پوری توجہ دروازے پر مبذول کردی۔

"کاش! ہم آنے والے کو بے بس کرنے کی پوزیشن میں ہوتے۔" ویرا حسرت سے بولی۔

"آنکھ مار دینا۔ وہ خود ہی مرجائے گا۔" میں نے کہا۔ "اِدھر کے مرد خوبصورت عورتوں' خاص طور پر سفید چمڑی والیوں کا دل رکھنے کے لیے اس سے بھی زیادہ بودے بن جاتے ہیں۔ تمہارا وار کارگر رہے گا۔"

"تم بھول رہے ہو کہ یہ لوگ مجھے اور غزالہ کو بے ہوشی کی حالت میں یہاں لائے ہیں۔ یہ اتنے ندیدے ہوتے تو ہماری بے ہوشی ان کے لیے نعمت غیر مترقبہ ہوتی مگر میں اپنی حد تک یہ دعویٰ کرسکتی ہوں کہ ان لوگوں نے یہاں لانے کے علاوہ' میرے ساتھ کوئی زیادتی نہیں کی۔ یہ عورتوں کے معاملے میں شریف معلوم ہوتے ہیں۔"

"تم ٹھیک کہہ رہی ہو۔" غزالہ نے اس کی تائید کی۔ "لیکن یہ شرافت عارضی بھی ثابت ہوسکتی ہے۔"

آہٹوں کے بعد دروازہ کھل گیا۔ باہر کسی بلب کی روشنی میں دو آدمی نظر آئے۔ پہلے ان میں سے ایک نے اندر قدم رکھا اور بائیں طرف والی دیوار پر ایک سوئچ آن کردیا۔ کمرا روشنی سے بھر گیا۔ گہری تاریکی کی عادی ہونے کے بعد' میری آنکھیں تیز روشنی کو فوری طور پر نہ سہار سکیں۔ میں نے اضطراری طور پر آنکھیں بند کرلیں۔

"یہ چاروں ہی ہوش میں آچکے ہیں۔" آنے والوں میں سے

کسی نے کہا۔ "جلدی جان چھوٹ جائے گی۔"

میں نے آہستہ آہستہ اپنی آنکھیں کھول دیں۔ وہ دونوں اپنے ہاتھوں میں کچھ سامان لیے اندر آرہے تھے۔

وہ دونوں میلے اور ڈھیلے ڈھالے کپڑوں میں ملبوس تھے۔ ان کے سنگلاخ چہروں کے نقوش سے ظاہر ہو رہا تھا کہ وہ کڑی مشقت کی زندگی گزارنے کے عادی تھے۔ ان میں سے مونچھوں والا دراز قامت تھا جبکہ کلین شیو آدمی پستہ قد نہ ہونے کے باوجود اپنے ساتھی سے ایک ڈیڑھ انچ دبا ہوا نظر آرہا تھا۔

وہ کمرا بالکل خالی تھا۔ اپنی چوڑائی سے کافی زیادہ گہرائی کی وجہ سے وہ کوئی متروک گودام معلوم ہو رہا تھا۔ اس کی چاروں دیواروں میں ایک دروازے کے علاوہ کوئی کھڑکی یا روشن دان نہیں تھا جو کسی بھی دکان یا قیامگاہ کے لیے ضروری ہوتا ہے۔ فرش پختہ ضرور تھا لیکن جگہ جگہ سے ٹوٹا ہوا تھا۔ فرش پر گرد و غبار کے ساتھ ہی پیٹیوں وغیرہ کے ٹوٹے ہوئے چوبی تختے‘ پرانی بوریاں ٹاٹ اور پتی کے ٹکڑے اور ستلیاں پھیلی ہوئی تھیں۔ ہم لوگ اس گہرے گودام کے آخری حصے میں تھے۔ شاید ہمیں وہاں ڈالنے سے قبل‘ اس حصے کی سرسری سی صفائی کی گئی تھی۔ یہی وجہ تھی کہ رینگنے یا لڑھکنے کے دوران میں کوئی کوڑا کرکٹ میری راہ میں حائل نہیں ہوا تھا۔ دوسری صورت میں‘ کیلوں والا کوئی تختہ مجھے زخمی بھی کرسکتا تھا۔ ہمارے گرد و پیش سے ہٹایا جانے والا کوڑا‘ چھوٹے سے ڈھیر کی صورت میں ایک جگہ موجود تھا۔

آنے والوں میں سے ایک کے ہاتھ میں ڈونگا تھا۔ دوسرے کے ایک ہاتھ میں بالٹی اور دوسرے میں پلاسٹک کی بڑی اور وزنی تھیلی جھول رہی تھی۔ یہ خوشی کی بات تھی کہ ان دونوں میں سے کسی کے ہاتھ میں کوئی ہتھیار نظر نہیں آرہا تھا لیکن میں نے اُن کی قمیصوں کے جھول سے اندازہ لگایا کہ مونچھوں والے کی داہنی بغلی جیب میں کوئی وزنی چیز موجود تھی۔

"کیا وقت ہوا ہوگا؟" سکوت توڑنے کی نیت سے میں نے آنے والوں سے پوچھا۔

"ایسے پوچھ رہا ہے جیسے اس کو ابھی ڈیوٹی پر جانا ہے۔" دراز قامت نے ہنس کر اپنے ساتھی سے کہا۔ وہ بھی ہنسنے لگا۔ وہ دوبارہ ہم سے مخاطب ہو کر بولا۔ "جلدی سے کھانا کھالو۔ پھر ہمیں اپنا کام کرکے سونا بھی ہے۔"

میں نے یہ بات خاص طور پر نوٹ کی کہ انہوں نے قیدی عورتوں پر گہری توجہ نہیں دی تھی۔

انہوں نے برتن ہمارے سامنے رکھ دیے۔ ڈونگے میں شوربے والا کوئی سالن تھا۔ شوربے پر روپ تھا۔ اس میں گوشت یا سبزی موجود تھی تو وہ شوربے کی سطح سے نیچی تھی۔ پلاسٹک کی بالٹی میں پانی اور مگ موجود تھا۔ پلاسٹک کی تھیلی میں دس پندرہ تندوری روٹیاں تھیں۔ کھانے کی بو سے یک بیک میری بھوک چمک اٹھی۔

"کھانا ہم کیسے کھائیں گے؟ ہمارے ہاتھ تو پشت پر بندھے ہوئے ہیں۔" سلطان شاہ بولا۔

"باری باری ایک ایک آدمی کے ہاتھ کھولے جائیں گے۔" ایک نے کہا۔ "زیادہ بھوکا کون ہے؟"

ہم میں سے کوئی کچھ نہ بولا۔ اس وقت میرا ذہن تیزی کے ساتھ سوچنے میں مصروف تھا۔

جواب نہ ملنے پر دراز قامت خود ہی ویرا کی طرف بڑھا اور اس کے ہاتھوں کی بندشیں کھولنے لگا۔

"تھوڑی دیر کے لیے میرے پیر بھی کھول دو۔ میں باہر جانا چاہتی ہوں۔" ویرا نے لجلجا کر کہا۔

ان دونوں کے دہانے حیرت سے کھل گئے۔ مونچھوں والا اپنا کام بھول کر ویرا کو تکنے لگا۔ پھر اپنے ساتھی سے بولا۔ "ابے یہ میم کتنی اچھی اردو بول رہی ہے۔ یہ تو یہیں کی معلوم ہوتی ہے۔"

"میں غیر ملکی ہوں اور تمہاری زبان کی ترقی پر کام کرنے کے لیے یہاں آئی ہوں۔" ویرا نے ان کی ہمدردیاں حاصل کرنے کی نیت سے کہا۔ "ذرا جلدی سے میرے پیر کھول دو....."

"نہیں‘ پیر نہیں کھل سکتے۔" کلین شیو غرایا۔ "باہر کیا کام ہے تمہیں؟"

"پیشاب کرنا ہے۔ تمہاری مہربانی ہوگی۔ بس دو منٹ میں آجاؤں گی۔" ویرا نے خوشامد کی۔

ان دونوں نے استفہامیہ نظروں سے ایک دوسرے کی طرف دیکھا۔ میرے دل کی دھڑکنیں تیز ہوگئیں۔ ویرا نے بہت معقول عذر پیش کیا تھا۔ مجھے پورا یقین تھا کہ اسے ایک بار اپنے پیروں پر کھڑے ہونے کا موقع مل جاتا تو وہ اپنے مارشل آرٹس کے سہارے ان دونوں کو بہ آسانی زیر کرسکتی تھی۔ وہ توانا ہونے کے باوجود ویرا کی برق رفتاری کا مقابلہ نہیں کرسکتے تھے۔

"نہیں‘ یہ ناممکن ہے۔" مونچھوں والے نے کمزور لہجے میں کہا۔ "استاد کو پتا چل گیا تو وہ ہماری چمڑی گرا دے گا۔"

میری امیدوں پر اوس پڑگئی۔ وہ ویرا کی مدد کی خواہش رکھنے کے باوجود اپنے استاد سے خوفزدہ تھے۔

ویرا نے ہمت نہیں ہاری بلکہ وہ ان دونوں کی خوشامد میں لگی رہی۔ مدافعانہ انکار کا تسلسل جاری رہا اور ویرا کے دونوں ہاتھ آزاد کردیے گئے۔ مونچھوں والے نے سامنے آکر نیم دلی کے ساتھ اپنی داہنی جیب میں سے ریوالور نکال لیا۔

"کیا کھلا پلا کر گولی مارنے کا ارادہ ہے؟" ویرا نے معصومانہ حیرت سے پوچھا۔

"دیکھو میم صاحب! ہم ملازم لوگ ہیں۔ وہی کر رہے ہیں جو استاد نے کہا ہے....."

"تمہارا استاد کون ہے؟" ویرا نے پہلا لقمہ اپنے منہ میں رکھنے کے بعد‘ اس کی بات کاٹ کر پوچھا۔

"ہمیں تمہاری باتوں کا جواب دینے سے منع کردیا گیا ہے۔ اُن لوگوں نے یہ بھی کہا تھا کہ تم چاروں بہت مکار اور خطرناک ہو اس لیے کھانا وغیرہ کھلاتے ہوئے ہتھیار تیار رکھے جائیں۔ تم بے فکر ہو کر کھانا کھالو۔ ہم تمہیں گولی نہیں ماریں گے۔ تم چاروں کو باری باری کھانا کھلانے کے بعد انجکشن لگائیں گے اور لوٹ جائیں گے۔"

"کیسے انجکشن؟" ویرا کے منہ میں لقمہ تھا اس لیے وہ سوال میں نے کیا تھا۔

"بے ہوشی کے۔" مجھے جواب دے کر وہ پھر ویرا سے مخاطب ہوگیا۔ "میم صاحب! پیٹ بھر کر کھانا۔ اب تمہیں کل رات سے پہلے کھانا نہیں ملے گا۔ اس وقت تک تم چاروں بے ہوش رہو گے۔"

"شکریہ۔" ویرا نے نیم وا آنکھوں سے اس کی طرف دیکھتے ہوئے' اپنائیت سے کہا۔ "اتنی ہمدردی کررہے ہو لیکن میری الجھن دور نہیں کرتے۔ کم از کم مجھے اتنا تو معلوم ہونا چاہیے کہ ہم لوگوں کو کس قصور میں یہاں قید کیا گیا ہے؟ کن لوگوں نے ہمیں اپنا قیدی بنایا ہے؟ تم لوگ پولیس والے تو نہیں معلوم ہوتے۔ ان کا کوئی استاد بھی نہیں ہوتا۔"

"ہم دونوں مجبور ہیں' میم صاحب!" کلین شیو آدمی کھسیس نکال کر بولا۔ "ہمیں خود بھی کچھ معلوم نہیں ہے۔ تمہیں لانے والے برابر والے کمرے میں پڑے سو رہے ہیں۔ استاد کا حکم تھا کہ ہم ان کی ہر بات پر عمل کریں۔ ہم استاد کی اور ان کی ہر بات پر عمل کررہے ہیں لیکن کل تک تمہیں کوئی تکلیف نہیں ہونے دیں گے۔"

"کل کیا ہوجائے گا؟" ویرا نے چونک کر سوال کیا۔ "کیا تمہاری جگہ دوسرے آدمی آجائیں گے؟"

"کل تمہیں آگے بھیج دیا جائے گا۔ ہماری ذمے داری ختم ہوجائے گی۔" اسی نے کہا۔

وہ ویرا سے بات کرنے میں خوشی محسوس کررہے تھے اس لیے میں نے دخل انداز ہونے کا ارادہ ترک کردیا لیکن ویرا شاید میرا ذہن پڑھ رہی تھی۔ اس نے فوراً ہی شکوہ کردیا۔ "تکلیف تو مجھے اب بھی ہے۔ تم نے مجھے پیشاب جیسی ضرورت سے روکا ہوا ہے۔ میں گُردوں کی مریضہ ہوں۔ اپنے اوپر جبر کرتی رہی تو گُردوں پر وَرم آجائے گا۔"

"مجبوری ہے' میم صاحب!" بغیر مونچھوں والے کی آواز میں بے چارگی اُمڈ آئی۔ میں دیکھ رہا تھا کہ ویرا کے لیے' ان دونوں کی نگاہوں میں ترحم کا جذبہ موجود تھا لیکن وہ دوسروں سے خائف اور مجبور تھے۔

"یار' ایسا نہ ہو کہ ورم سے اس بے چاری کے گردے پھٹ جائیں۔" مونچھوں والے نے اپنے ساتھی سے کہا۔ "گردوں میں ہوتا ہی کیا ہے؟"

"مجھے سارا ڈر تو اسی بات کا ہے۔" ویرا نے لوہا گرم دیکھ کر سادگی سے ایک اور چوٹ لگائی۔ "ایک گردہ بھی پھٹ جائے تو سارا زہر خون میں مل جاتا ہے اور پھر آدمی کو بچانا ناممکن ہوجاتا ہے۔"

"اس قدر خطرہ ہے تو پھر چل کر ان لوگوں سے بات کرلیتے ہیں۔" مونچھوں والے نے اپنے ساتھی سے کہا اور اس نے اثبات میں سرہلادیا۔ اس وقت ان دونوں کا بس چلتا تو اپنے گردے ویرا کو دان کردیتے۔

"تم کن لوگوں سے بات کرنے کا ارادہ کررہے ہو؟" ویرا نے ان سے پوچھا۔

"تمہیں لانے والوں سے۔ وہ برابر والے کمرے میں سو رہے ہیں۔ انہیں اٹھالیں گے۔"

"تم ان کے بارے میں کچھ بھی نہیں بتارہے۔ کم از کم ان کی تعداد ہی بتادو۔"

"وہ چھ ہیں۔" اس نے جھجکتے ہوئے کہا۔ "سب سانڈ کی طرح مضبوط اور خردماغ ہیں۔"

"پھر انہیں نہ چھیڑنا۔" ویرا نے ان کی تعداد معلوم ہوتے ہی ہدایت جاری کردی۔ "نیند خراب ہونے پر وہ بھڑک اٹھے تو ہمارے ساتھ تمہاری مٹی بھی پلید کر ڈالیں گے۔ ہوسکتا ہے کہ استاد سے تمہاری شکایت بھی کردیں۔"

وہ بات ان دونوں کی سمجھ میں آگئی لیکن ویرا کو ان کے انجام سے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ وہ اپنے بل بوتے پر دو آدمیوں کو زیر کرنے کا منصوبہ تو بنا سکتی تھی لیکن آٹھ آدمیوں کو بیک وقت سنبھالنا اس کے بس کا روگ نہیں تھا۔ سب سے بڑی بات یہ تھی کہ وہ دونوں ہم لوگوں سے ناواقف تھے جب کہ ہمیں لانے والے ہمارے اصل دشمن تھے۔ انہیں بچہ دینا آسان کام نہیں تھا۔ وہ ویرا کا بہانہ سنتے ہی اس کے عزائم کا اندازہ لگا سکتے تھے۔

ان دونوں کی باتوں سے میں نے جو نتائج اخذ کیے وہ بہت اعصاب شکن تھے۔ غالباً فلیٹ میں ہم چاروں کو بیک وقت بے ہوش کیا گیا تھا۔ ہم میں سے اگر ایک کو بھی ذرا سی مہلت مل جاتی یا اسے دوسروں کے حشر کا علم ہوجاتا تو وہ کم از کم ہڑبونگ اور شوروغوغا کے ذریعے حریف کے قدم اکھاڑ کر' اسے فرار کی راہ اختیار کرنے پر مجبور کرسکتا تھا۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ چار افراد ہمیں انفرادی طور پر بے ہوش کرنے پر مامور تھے تو کم از کم دو' ان کی مدد اور دیکھ بھال کے لیے موجود رہے ہوں گے۔ وہ چھ کے چھ آدمی برابر والے کمرے میں سو رہے تھے۔ مجھے حیرت تھی کہ ایک نہ دو' پورے چھ آدمی ہمارے فلیٹ کا مقفل دروازہ کھول کر اندر گھس آئے اور ہمارے فرشتوں کو بھی کسی کھٹ پٹ کا علم نہیں ہوسکا۔ اسی طرح اس جلوس کے بارے میں عمارت کے چوکیدار کی بے خبری بھی حیرتناک تھی۔ وہ چھ افراد زینے طے کرکے اوپر آئے پھر چار بے ہوش افراد کو اپنے کندھوں پر لاد کر اپنے ساتھ لے گئے۔ پوری واردات اس قدر مہارت اور صفائی کے ساتھ عمل میں لائی گئی کہ شاید کسی کو کانوں کان بھی اس واقعے کا علم نہیں ہوسکا تھا اور ہم خاموشی کے ساتھ قیدی بنالیے گئے تھے۔

میں اپنی دانست میں مطمئن تھا کہ ڈون کوانگ فو کے آدمی فوری طور پر کوئی جوابی کارروائی نہیں کرسکیں گے لیکن وہ میری بھول تھی۔ وہ بارہ گھنٹے کی مدت میں دوبارہ بھرپور وار کرنے کے قابل ہوگئے تھے۔ شاید ان چھ افراد میں' ان میں سے ایک دو بھی ضرور شامل تھے اور ان ہی کی پیشہ ورانہ مہارت اور رہنمائی کے باعث انہیں اتنی بڑی کامیابی نصیب ہوئی تھی۔ انہوں نے ہمیں اس گودام میں بند کرکے 'وہیں پڑاؤ ڈالا ہوا تھا اور تیاریاں مکمل ہونے کے بعد ہمیں کراچی سے مکاؤ لے جانے کا ارادہ کررہے تھے۔ بیک وقت چار افراد کو ہوش یا بے ہوشی کے عالم میں' قانونی ذرائع سے بیرون ملک لے جانا' ناممکنات میں سے تھا۔ اس لیے آثار و قرائن یہی بتارہے تھے کہ سردار پائندہ گل کے بھانجے' عبدالرحیم خان کے کوچی کیمپ والے کنٹینر سے آزادی حاصل کرنے کے بعد مجھے ایک بار پھر اسی تکلیف دہ مرحلے سے گزرنا تھا۔ ان لوگوں نے ہمیں جس تسلسل کے ساتھ بے ہوشی میں مبتلا کیے رکھا تھا اس سے یہ اندازہ ہوتا تھا کہ ہمیں بے ہوش کرکے کسی کنٹینر کے پچھلے حصے میں ڈال دیا جاتا پھر آگے سامان بھردیا جاتا۔ کسٹم وغیرہ کے سرسری مراحل سے گزارنے کے بعد' برآمدی سامان کے اس کنٹینر کو گودی پر اور پھر کسی مال بردار جہاز میں پہنچادیا جاتا۔ جہاز سے ہانگ کانگ ہاربر پر اتارے جانے کے بعد' اس کنٹینر سے قانونی مال نکال کر ہمیں غیرقانونی طریقے سے مکاؤ میں ڈون کوانگ فو کے حضور پیش کردیا جاتا۔

ہم چاروں باری باری کھانا کھاتے رہے۔ ویرا نے اپنے فدائیوں کے مخلصانہ مشورے پر کھل کر خوش خوراکی کا مظاہرہ کیا تھا۔ اس کے بعد غزالہ نے کھانا کھایا۔ تیسری باری پر میں نے سلطان شاہ کی طرف گردن ہلا کر اشارہ کردیا۔ اس دوران میں میرا ذہن مسلسل اپنے مسائل میں الجھا رہا۔

ہم لوگ بے خبری میں بہت سنگین مسائل سے دوچار ہوچکے تھے۔ ہمیں ایک بار پاکستان کی بحری حدود سے باہر نکال لیا جاتا تو دنیا کی کوئی طاقت ہمیں ڈون کوانگ فو کے وحشیانہ چنگل سے نہیں بچا سکتی تھی۔ بحری جہازوں میں لادے جانے والے کنٹینر کے ذریعے ہماری اسمگلنگ کے بارے میں' میرے ذہن میں کئی پیچیدہ نکات نے سر ابھارا۔ ان میں' دورانِ سفر ہماری خوراک اور جانوں کے تحفظ کا معاملہ سرفہرست تھا لیکن میں نے خود ہی ان سوالات کے حل بھی تلاش کرلیے جو بہت زیادہ گنجلک نہیں تھے۔ ذرا سی منصوبہ بندی سے ان مسائل کا تدارک کیا جاسکتا تھا۔

کنٹینر کے عقبی حصے میں ہمارے ساتھ ہی' ان کا کوئی تربیت یافتہ آدمی ضروری ادویات اور اپنی غذائی ضروریات کے ساتھ بند ہوسکتا تھا۔ وہ ہم کو حسب ضرورت بے ہوشی اور طاقت بخش ادویات کے انجکشن دے کر' آٹھ دس روز کے لیے باآسانی زندہ رکھ سکتا تھا۔ وہ اپنی نقل و حرکت میں محتاط رہتا۔ اس طرح کنٹینر لے جانے والے جہاز کے کپتان اور عملے کو بھی جہاز پر مغویوں کی موجودگی کا علم نہیں ہوسکتا تھا۔

"مجھے ایک سوال کا جواب دے سکو تو تمہاری مہربانی ہوگی۔" میں نے کچھ دیر بعد ان سے کہا۔

"ان چھ میں کوئی غیرملکی بھی ہے؟" اجازت مل جانے پر میں نے سوال کیا۔

دونوں نے مشورہ طلب نگاہوں سے ایک دوسرے کی طرف دیکھا پھر اپنے ساتھی سے اشارہ مل جانے پر' دراز قامت نے کہا "وہ سب ہی غیرملکی ہیں۔ اب آگے کوئی اور سوال نہ کرنا۔ میم صاحب کی اور بات ہے۔ تمہارے ساتھ ہم کوئی رورعایت نہیں کریں گے۔" پھر وہ سلطان شاہ کے ہاتھ باندھنے کے لیے بڑھ گیا کیونکہ وہ کھانے سے فارغ ہوکر پانی پی چکا تھا۔

وہ دونوں بظاہر غیرتعلیم یافتہ نظر آتے تھے لیکن انہیں اپنے کام کے بارے میں ہر ضروری بات معلوم تھی۔ میرا خیال تھا کہ میرے فارغ ہوتے ہی وہ ہم لوگوں کو انجکشن لگا کر بے ہوش کرنا شروع کردیں گے لیکن انہوں نے نصف گھنٹے کی مہلت دیتے ہوئے تاکید کی کہ ہم نے ذرا بھی اونچی آواز نکالی تو وہ ہمیں فوری طور پر انجکشن لگادیں گے اور نتائج کی ذمے داری خود ہم پر ہوگی۔ ویرا کو وہ دونوں مراعات یافتہ قیدی کا درجہ دے چکے تھے اس لیے اس کے سوالات کے جواب میں انہوں نے جو کچھ بتایا وہ بہت دلچسپ تھا۔

ان کے بیان کے مطابق' بے ہوشی کی روایتی ادویات جن میں انجکشن بھی شامل ہیں' خالی معدے میں دی جاتی ہیں تاکہ بے ہوشی کی حالت میں قے کی نوبت نہ آئے۔ بے ہوشی کی وجہ سے جسم کے تمام عضلات کی کارکردگی بہت سست ہوجاتی ہے اس لیے قے کی صورت میں یہ خطرہ ہوتا ہے کہ سانس کی نالی کا منہ بروقت بند نہ ہو تو معدے سے باہر آنے والی آلائشیں اس میں داخل ہوکر' سانس کی آمدورفت کا راستہ بند کرکے اس شخص کو موت کے منہ میں دھکیل دیتی ہیں۔ ہمارے لیے جو انجکشن فراہم کیے گئے تھے وہ جدید ترین تھے۔ وہ بے ہوش کرنے کے ساتھ ہی قے کو بھی روکتے تھے۔ شرط یہ تھی کہ انجکشن خوردونوش کے کم از کم بیس منٹ بعد لگائے جائیں تاکہ خوراک معدے میں اپنی جگہ لے چکی ہو۔ انہوں نے احتیاطاً اس وقفے کو آدھے گھنٹے تک بڑھادیا تھا۔ اس سے پہلے استعمال کی صورت میں' آنتوں میں ادھر اُدھر رکی ہوئی غذا مہلک قے کا سبب بن سکتی تھی۔

ان باریکیوں سے ویرا بھی لاعلم تھی۔ اس نے ان کی اپنی

زبان میں جو کچھ سنا' وہ اس کے لیے حیرت ناک ثابت ہوا۔ اس نے انہیں بتایا کہ اس کے اپنڈکس کے آپریشن میں اسے بھی بارہ گھنٹے پہلے خوردونوش ترک کرنے کی سخت ہدایت کی گئی تھی جسے وہ ایک طبی ضرورت سمجھی تھی۔ اسے یہ اندازہ نہیں ہوسکا تھا کہ وہ احتیاط خود اس کی سلامتی کے لیے کس قدر ضروری تھی میں اس بارے میں سرے سے کچھ نہیں جانتا تھا۔

آخر میں میرے ہاتھ پشت پر باندھنے کے بعد وہ باہر کی طرف چل دیے۔ جاتے جاتے ان میں سے ایک واپس آیا اور اپنا منہ ویرا کے کان کے قریب لے جاکر کچھ کہنے لگا۔ اس کی بات پوری ہونے سے پہلے ہی ویرا نے تیزی کے ساتھ اپنے سر کو نفی میں ہلانا شروع کردیا۔ اس نے اصرار کیا پھر ویرا کے مسلسل انکار سے مایوس ہوکر اپنے ساتھی کی طرف چل دیا جو کمرے کے وسط میں رک کر اُس کی واپسی کا انتظار کررہا تھا۔

ہم چاروں بے دست و پا تھے۔ برابر والے کمرے میں ہمارے چھ وحشی اور خونخوار' غیرملکی دشمن سو رہے تھے۔ اس لیے وہ دونوں دروازہ بند یا مقفل کیے بغیر باہر چلے گئے۔ ان کے جاتے ہی ہم چاروں نے بیک وقت دھیمی آوازوں میں بولنا شروع کیا پھر چاروں ہی دوسروں کو موقع دینے کے لیے بیک وقت خاموش ہوکر احمقانہ انداز میں ایک دوسرے کا منہ دیکھنے لگے۔ وہ صورت حال اتنی مضحکہ خیز تھی کہ غزالہ اپنی تمام تر تشویش اور پریشانی کے باوجود' بے ساختہ انداز میں ہنسے بغیر نہ رہ سکی۔ اس کی دیکھا دیکھی دوسرے بھی ہنسنے لگے لیکن فضا اس کے باوجود بوجھل رہی۔

اغوا کرنے والوں کے بارے میں جو کچھ میں نے سوچا ہوا تھا' وہی ان تینوں کے ذہنوں میں بھی موجود تھا۔ سب کی متفقہ رائے تھی کہ ڈون کوانگ فو کے خطرناک آدمیوں نے ہم سب کے اندازوں کو مات دے کر نہایت سرعت اور چابک دستی کے ساتھ اپنا کاری وار کیا تھا جس کا توڑ کرنا ناممکن نہیں تو بہت زیادہ مشکل ضرور تھا۔

"انہوں نے ہمیں ہمارے بستروں سے اٹھا ضرور لیا ہے لیکن وہ ہمارا کیا کریں گے؟ ہمیں لانے والے بے فکری سے سو رہے ہیں۔ ہمیں مستقل طور پر بے ہوش رکھا جارہا ہے کیا وہ ہمارا اچار ڈالنے کا ارادہ رکھتے ہیں؟" سلطان شاہ کی آنکھوں سے گہری تشویش ٹپک رہی تھی لیکن وہ خوف زدہ نہیں تھا۔

"تم نے سنا نہیں کہ مونچھوں والا کیا کہہ رہا تھا۔ کل ہمیں یہاں سے روانہ کرنے کی تیاریاں کی جارہی ہیں۔ یہ لوگ پوچھ گچھ کرکے کیا کریں گے؟ ہمارا اصل سامنا ڈون کوانگ فو سے ہوگا۔ اس کا چارا بنانے کے لیے ہمیں کھلایا پلایا اور پالا جارہا ہے ورنہ وہ ہمیں بے آواز گولیوں یا پوٹاشیم سائینائیڈ کا نشانہ بناکر چند منٹ میں ختم کرسکتے تھے۔ ڈون جیسے لوگوں کی انا بہت بلند ہوتی ہے۔ وہ اپنے حریف کو جب تک اپنی ایڑیوں سے نہ کچل لیں' انہیں قرار نہیں آسکتا۔" میں نے صورتِ حال کو واضح کرتے ہوئے کہا "وہ ہر قیمت پر ہمیں زندہ حالت میں اپنے سامنے دیکھنا چاہتا ہے۔"

ہماری کراچی سے مکاؤ منتقلی کے ذرائع کے بارے میں سوالات اٹھائے گئے تو میرے پاس ان کے جوابات موجود تھے۔ ان پر کوئی اعتراض نہیں کیا جاسکا اور چاروں ہی اپنی اپنی جگہ پر سوچ میں ڈوب گئے۔

ہمارے پاس گفتگو کے لیے خاصا وقت تھا لیکن اپنی منزل نظر آجانے کے بعد' ہم سے کسی کے پاس کہنے کے لیے کچھ بھی باقی نہیں رہا تھا۔ ہر شخص کو اپنا انجام بہت واضح نظر آنے لگا تھا اور ہر چہرے پر تشویش کے گمبھیر سایوں نے اپنے ڈیرے جمالیے تھے۔ لٹکے ہوئے متفکر چہروں کے ساتھ ہم سب ہی مریض نظر آنے لگے تھے۔

"ایک بات سمجھ میں نہیں آئی۔" طویل ہوتے ہوئے اس اعصاب شکن سکوت کو غزالہ کی دھیمی آواز نے توڑا "جب تم نے جہانگیر بن کرشیدے کا سامنا کیا تو اس نے تم سے صرف ڈیڈی کے بارے میں بازپرس کی تھی۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ ڈون کوانگ فو کے آدمیوں کو صرف تمہاری تلاش تھی لیکن اب انہوں نے ہم چاروں کو پکڑلیا ہے۔ یہ بھی تو ہوسکتا تھا کہ وہ ہم سب کو بے ہوش کرکے صرف تمہیں اٹھالے جاتے۔ ایک کے مقابلے میں چار آدمیوں کا یہاں سے اسمگل کرنا مشکل اور خطرناک کام ہے۔ آخر انہوں نے اصل ٹارگٹ سے ہٹ کر کام کیوں کیا؟"

"یہ واقعی اہم سوال ہے۔" ویرا نے تحسین آمیز لہجے میں اعتراف کیا "کمال ہے کہ ہم میں سے کسی نے اس بارے میں سوچنے کی زحمت نہیں کی۔ میرا تو ڈون کچھ بھی نہیں بگاڑ سکے گا۔ وہ میرا منہ بولا باپ ہے اور اچھی طرح میرے اور جمی لائیڈ کے رشتے سے واقف ہے۔ وہ مجھے زیادہ سے زیادہ شرمندہ ہی کرسکتا ہے۔"

"اس کے پسِ پشت ڈون کی مشرقی نفسیات کارفرما معلوم ہوتی ہے۔" میں نے سوچتے ہوئے کہا "اس کے ذہن میں بھی نہیں ہوگا کہ تم میری قیام گاہ سے پکڑی جاؤگی۔ اس نے میرے ساتھ رہنے والوں کو اغوا کرنے کا حکم دیا ہوگا۔ مشرق میں رشتوں کا تعلق بہت گہرا ہوتا ہے۔ کسی کو دکھ یا سُکھ پہنچانا ہو تو اس کے عزیز ترین لوگوں کو اذیت یا راحت پہنچاؤ۔ اثرات خاطر خواہ ہوں گے بلکہ توقع سے زیادہ بھی ہوسکتے ہیں۔ اب تو کراچی کے چور ڈاکو بھی یہ نسخہ سمجھ گئے ہیں۔ جس گھر میں جاتے ہیں' زیورات اور نقدی کا سراغ لگانے کے لیے بچوں کو مارنے کی دھمکی دیتے ہیں جو سو فیصد کارگر رہتی ہے۔ چور درازوں اور باورچی خانوں میں چھپائے ہوئے اثاثے تک ان کے قدموں میں آجاتے ہیں۔"

"تمہاری بات دل کو لگتی ہے۔" ویرا سہلاتے ہوئے بولی۔ "ظاہر ہے کہ تمہارے گھر میں وہی لوگ رہ سکتے ہیں جو تم سے بہت قریب ہوں۔ مشرق اور اس کے جذباتی رشتوں کو میں خوب سمجھتی

ہوں۔"

"اس بہانے سے ڈیڈی کے ساتھ اپنی قربت جتارہی ہو؟" سلطان شاہ طنز سے بولا "تم بھی تو وہیں سے پکڑی گئی ہو۔ اب یہ دعویٰ نہ کردینا کہ غزالہ میں اور تم میں کوئی زیادہ فرق نہیں ہے۔"

"کیا بے وقت کی راگنی الاپ رہے ہو؟" میں نے جھڑک کر اسے جھاڑ دیا "شاید تمہیں احساس نہیں ہے کہ اس وقت ہم سب ایک ہی کشتی کے سوار ہیں اور یہ ہماری زندگی کے فیصلہ کن لمحات بھی ثابت ہوسکتے ہیں۔"

"ہم چاروں کے یکجا ہونے کی وجہ سے خوف اور خطرے کا احساس بہت کم ہوگیا ہے۔" غزالہ نے کہا "میں تو یہ بھی بھول گئی تھی کہ میرے ہاتھ بندھے ہوئے ہیں۔ کان سہلانے کے لیے ہاتھ ہلایا تو مجبوری کا احساس ہوا۔"

"وہ آدمی جاتے جاتے لوٹ کر' تمہارے کان میں کیا کہنے آیا تھا؟" غزالہ کو تقریباً فوراً ہی وہ بات یاد آگئی۔

"بے ہودہ آدمی بکواس کررہا تھا۔" ویرا خفت آمیز ہنسی کے ساتھ بولی۔

"پھر بھی پتا تو چلے کہ کیا بات تھی؟" غزالہ کا تجسس بڑھ گیا۔ "تم نے اردو کے لیے اپنے ترقیاتی کام کا برمحل ذکر کرکے ان دونوں کے دلوں میں اپنے لیے بہت جگہ پیدا کرلی ہے۔"

"وہ مجھے گُردوں کو ورم سے بچائے رکھنے کی ترکیب بتا رہا تھا جس پر میں بقائمی ہوش و حواس تو عمل نہیں کرسکتی۔" ویرا نے اپنا سر جھٹک کر کہا "خوف یا بے ہوشی کی اور بات ہے۔ میں نے موقع حاصل کرنے کے لیے وہ کہانی شروع کی تھی ورنہ مجھے کسی قسم کی کوئی حاجت نہیں تھی۔"

"صفائی پیش نہ کرو۔ یہ بات ہم سب سمجھ رہے تھے۔" میں نے اسے ٹوک دیا۔

آدھے گھنٹے کی اس مہلت کو بارآور بنانے کے لیے ہم اس معاملے کے ہر پہلو پر مغززنی کرتے رہے لیکن نتائج میں کوئی تبدیلی آسکی نہ اس بند گلی سے فرار کی کوئی راہ سامنے آسکی۔ ہم اپنی گھڑیاں دیکھنے سے قاصر تھے لیکن اندازاً نصف گھنٹا گزرنے کے بعد وہ دونوں اندر آگئے۔ اس بار اُن میں سے ایک کے ہاتھ میں سرنج اور ایک شیشی موجود تھی۔ اس نے ہمارے سامنے ہی ڈسپوزیبل سرنج کی سوئی ربرکیپ میں داخل کرکے شفاف سیال کی مقررہ مقدار لی اور اس میں سے ہوا کے بلبلے خارج کرتا ہوا سلطان شاہ کی طرف بڑھ گیا۔

اعتراض' احتجاج یا مزاحمت کا کوئی موقع نہیں تھا۔ سرنج آہستگی کے ساتھ اس کے بازو میں خالی ہوتی رہی اور دوسرا انجکشن تیار ہونے سے پہلے سلطان شاہ فرش پر لڑھک کر بے حس و حرکت ہوگیا۔ جب وہ دوسرا انجکشن لے کر غزالہ کی طرف بڑھا تو ویرا نے فوراً ہی اعتراض کردیا "یہ کیا کررہے ہو۔ ہر ایک کو الگ الگ اور نئی سرنج سے انجکشن لگاؤ۔ اس طرح ایک آدمی کی بیماریاں دوسرے کو لگ جائیں گی۔ یہ حرکت جان لیوا بھی ثابت ہوسکتی ہے۔"

"ہمارے پاس بس یہی ایک سرنج ہے۔" ویرا کے لیے اپنی پسندیدگی کی بنا پر اس نے عاجزی سے کہا۔

"کوئی فرق نہیں پڑتا۔ اسی سرنج سے انجکشن لگادو۔" غزالہ نے بے ہوش ہوکر بے طرح فرش پر گرنے کے بجائے ایک پہلو کے بل لیٹتے ہوئے کہا "ہمارے جراثیم ایک دوسرے کا کچھ نہیں بگاڑیں گے۔"

"اسے لگادو" ویرا پہلی بار اُس سے تلخ لہجے میں بولی "یہ تو بے ہوشی کے لیے ہے۔ میں مرنے کے لیے بھی جھوٹی سرنج سے انجکشن نہیں لگواسکتی اور پھر یہ تو سرنج ہی ڈسپوزیبل ہے۔"

"میم صاحب! ہمارے پاس کل رات سے یہی سرنج ہے اور ہم ہر پانچ گھنٹے بعد اسی سے تم سب کو انجکشن لگاتے رہے ہیں۔" اس نے فخر کے ساتھ کہا "تم خود ہی بتاؤ کہ اب تک تمہیں کچھ ہوا؟ ہم لوگ پھینکنے والی چیزوں سے بھی بڑے بڑے کام لے لیتے ہیں۔ ہاں میں یہ احتیاط ضرور کرتا ہوں کہ انجکشن بنانے سے پہلے سوئی کو اپنی انگلیوں سے اچھی طرح صاف کرلیتا ہوں۔ اس سے زیادہ کچھ کرنا میرے بس سے باہر ہے۔"

"تم سوئی پر اپنی انگلیاں بھی پھیرتے ہو؟" ویرا کے لیے وہ دوسرا صدمہ تھا۔

"اور کیا کروں؟ کپڑے میلے ہیں ورنہ اپنی قمیص کے دامن سے پونچھ لیتا۔"

اس کے جواب پر ویرا جھرجھری لے کر رہ گئی۔ غنیمت ہی تھا کہ اس کے کپڑے میلے تھے ورنہ وہ سوئی کے تیز کناروں میں پھنسا کر باریک سوتی ذرّات ہمارے جسموں میں اتارتا رہتا۔

ویرا کو تیسرا صدمہ اس وقت پہنچا جب اس نے غزالہ کے بازو پر سے آستین اوپر سرکائے بغیر سوئی اس کے بازو میں داخل کردی اور غزالہ نے اس پر کوئی احتجاج نہیں کیا۔

"تم میری بھی آستین پر سے انجکشن لگاتے رہے ہو؟" ویرا نے اس سے پوچھا۔

"پھر کیا کرتا؟" اس نے سیّال غزالہ کے بازو میں اتارتے ہوئے کہا "تمہاری لمبی آستین ہاتھوں کے ساتھ رسّی میں بندھی ہوئی تھی۔ تم فکر نہ کرو یہاں کی آب و ہوا میں کسی کو کچھ نہیں ہوتا۔"

غزالہ کو بے ہوش کرنے کے بعد اس نے بائیں ہاتھ کے انگوٹھے اور اس کے برابر والی انگلی سے سوئی کو صاف کیا پھر تیسرا ڈوز لینے لگا۔ وہ اپنے فرض سے کسی غفلت کا ارتکاب کیے بغیر اپنا شوق پورا کرنے کے موڈ میں تھا۔ اس لیے اس نے سرنج سے ہوا خارج کرتے ہوئے میرا رخ کیا۔ ویرا کو اس نے آخر کے لیے بچایا

ہوا تھا۔ عین ممکن ہے کہ ہم تینوں سے نجات حاصل کرلینے کے بعد وہ دونوں ویرا سے اس کے گردوں کے ورم کے موضوع پر آخری تبادلۂ خیال کرنے کا ارادہ رکھتے ہوں۔ اسے اپنی طرف آتا ہوا دیکھ کر میں غزالہ کی تقلید میں فرش پر دراز ہوگیا۔

سرنج میں بھرا ہوا سیال واقعی کوئی جدید ترین اور بہت زیادہ مؤثر محلول تھا۔ سوئی نرم ریشوں میں پیوست ہوتے ہی میرے ذہن پر ہلکے سے سُرور کا حملہ ہوا۔ وہ سرور نہایت سرعت کے ساتھ خمار، نشے، مدہوشی اور بے ہوشی میں تبدیل ہوتا چلا گیا۔ مجھے علم ہی نہیں ہوسکا کہ سوئی میری جلد سے کب نکالی گئی۔ سر گھمانے کی کوشش کی تو وہ منوں وزنی ہوچکا تھا۔ اس کے بعد چراغوں میں روشنی نہ رہی۔

تاریکیوں کا وہ سُرور آمیز سفر کتنی دیر جاری رہا اس کا مجھے کوئی اندازہ یا ادراک نہیں ہوسکا۔ میرے دھند میں لپٹے ہوئے ذہن کو احساس ہوا کہ آسمان سے سفید پروں والی پریاں، والہانہ انداز میں مجھے پکارتی ہوئی اتری چلی آرہی ہیں۔ ایک آواز کی بازگشت ختم ہونے سے پہلے ہی دوسری آواز ابھرنے لگتی تھی۔ وہ ہزاروں آوازیں، نہ ختم ہونے والے لاہوتی تسلسل کے ساتھ بس مجھے پکارے جارہی تھیں۔ میں زیادہ دیر تک ان مترنم، رسیلی اور دبدھر آوازوں کی نغمگی سے محظوظ نہ ہوسکا کیونکہ میرے گالوں پر تھپّڑ برسنے لگے تھے۔ میں نے کسل مندانہ آواز میں اپنے وزنی پپوٹوں کو بدقّت تمام اوپر اٹھایا تو خواب کا سا، سارا طلسم آنِ واحد میں ٹوٹ گیا۔ وہاں سفید پروں والی پریاں تھیں نہ ان کی ملکوتی آوازیں۔ گھور اندھیرے میں ویرا میرے قریب بیٹھی ہوئی مجھے پیر سے جھنجوڑ کر، دھیمی آواز میں پکارے جارہی تھی۔ اندھیرے میں، میں اسے نہیں دیکھ سکا لیکن اس کے دلکش وجود کی مہک میں ہزاروں کی بھیڑ میں بھی، آنکھیں بند کرکے پہچان سکتا تھا۔ ہم دونوں شاید کسی پالکی میں سوار تھے جسے کہار اپنے کندھوں پر اٹھائے بہت تیزی کے ساتھ کسی طرف دوڑے چلے جارہے تھے کیونکہ میرا بدن ساکت نہیں تھا بلکہ اپنی ہی جگہ پڑے پڑے خود بخود ہل رہا تھا۔

کئی منٹ کے طویل وقفے اور سرتوڑ شعوری کوشش کے بعد، میں اپنے ذہن کو اس ہوش ربا طلسم سے باہر لانے میں کامیاب ہوا تو میرے کانوں نے سب سے پہلے جو غیر مانوس شور محسوس کیا وہ کسی طاقتور انجن کا تھا۔ ہم چاروں بہت تنگ جگہ پر پڑے ہوئے تھے۔ ہمارے نیچے آہنی فرش تھا۔ تنگ فضا میں عجیب سی تیز بو پھیلی ہوئی تھی اور ہمارا وہ تنگ مقبرے جیسا قید خانہ ہلکے جھٹکوں کے ساتھ متحرک تھا۔

ویرا سب سے پہلے ہوش میں آئی تھی۔ غزالہ اور سلطان شاہ پر بدستور بے ہوشی طاری تھی۔

"تم ٹرک کے انجن کی آواز سن رہے ہو۔" اس نے ہذیانی آواز میں سرگوشی کی "وہ لوگ ہمیں ٹرک کے ذریعے غالباً کسی ویران ساحلی علاقے کی طرف لے جارہے ہیں۔ شاید یہ لوگ کسٹمز وغیرہ کے چکر میں پڑنے کے بجائے ہمیں کسی لانچ سے مکاؤ لے جانے کا ارادہ رکھتے ہیں۔ ٹرک سے اتارے جانے کے وقت ہمیں اپنی آخری کوشش میں سردھڑ کی بازی لگانی ہوگی ورنہ تم لوگ بے موت مارے جاؤ گے۔"

"تم لوگ؟" میں نے حیرت سے اس کی بات دہرائی "کیا تم نے ہم سے الگ ہوجانے کا فیصلہ کرلیا ہے؟"

"اپنے ذہن میں زہریلے شبہات کو پروان نہ چڑھاؤ۔" وہ روہانسی آواز میں بولی "میں پوری طرح تمہارے ساتھ ہوں مگر یہ بھی جانتی ہوں کہ ڈون مجھے ہاتھ بھی نہیں لگائے گا لیکن تم لوگ...." اس نے حسرت زدہ اور گہرے سانس کے ساتھ اپنی بات ادھوری چھوڑ دی لیکن اس کے لب و لہجے نے اس کا مدعا ظاہر کردیا تھا۔

میں نے چند ثانیوں تک اس خوف ناک صورتِ حال پر غور کیا اور اس نتیجے پر پہنچا کہ بدقسمتی نے چاروں طرف سے ہمارا محاصرہ کرلیا تھا۔ ہمارے ہاتھ پیر بدستور بندھے ہوئے تھے اور ہم پوری طرح اپنے دشمنوں کے رحم و کرم پر تھے۔ اس بارے میں زیادہ سوچنا خود کو تھکانے کے علاوہ اور کچھ نہیں تھا۔ میں نے خود کو پوری طرح حالات کے دھارے پر چھوڑ دینے اور کسی مناسب لمحے کا انتظار کرنے کا فیصلہ کرلیا۔

"یہ بتاؤ کہ تمہارے گُردوں کا کیا حال ہے؟" ایک فیصلہ کرلینے کے بعد میں نے شوخ لہجے میں ویرا سے پوچھا۔

"معلوم ہوتا ہے کہ تمہارا دماغ چل گیا ہے۔" ٹرک کے انجن کے یکساں شور میں، اس کی جھلّائی ہوئی آواز ابھری "تم لوگوں کو موت کے جبڑوں میں لے جایا جارہا ہے اور تمہیں مذاق سوجھ رہا ہے۔"

"اس اندھیرے میں مذاق تو کیا، تم بھی نہیں سوجھ رہی ہو۔ اپنے ننھے سے ذہن پر زیادہ زور نہ ڈالو۔ ہلکی پھلکی باتوں میں وقت گزارو اور تن بہ تقدیر رہو۔ سوچنے سمجھنے کا کام مکاؤ پہنچنے کے بعد کریں گے۔ تمہیں ہنی مون آن دی راک والے گانے کی دُھن یاد ہو تو سیٹی پر اسے گنگنانا شروع کردو، میں تمہارا ساتھ دوں گا۔"

"خدا تم سے سمجھے۔" وہ یقیناً دانت پیس کر بولی تھی "شاید مایوسی نے تمہارا دماغ الٹ دیا ہے۔"

"اس وقت خدا ہی مجھ سے سمجھ رہا ہے جو اس حال میں سفر کرنا پڑ رہا ہے۔ ذرا دوسروں کی خبر لو۔ وہ دونوں بھی ہوش میں آجائیں تو انہیں تم سے لڑانے میں اچھا وقت گزرے گا۔ میرا خیال ہے کہ ہماری مسلسل بے ہوشی کے چوبیس گھنٹے پورے ہوچکے ہیں اسی لیے ہمیں نیا انجکشن نہیں دیا گیا۔ اگر میرا اندازہ غلط نہیں تو جلد ہی سفر کا سلسلہ ٹوٹنے والا ہے۔ ہوسکتا ہے کہ ہماری شکم پُری کا بندوبست کیا جائے۔ مجھے بہت بھوک لگ رہی ہے۔"

"کسی ویران ساحل پر ہمارا انتظار کرتی ہوئی لانچ کے بارے میں تمہارا کیا خیال ہے؟"

"خاصا رومانی منظر ہوگا۔ جب وہ تمہیں اس پر لے جائیں گے تو میں اکیلے نہ جانا کی مدھ بھری تان لگا کر، ریتیلے یا پتھریلے ساحل سے تمہاری طرف دوڑ لگادوں گا لیکن یہ سب اسی وقت ممکن ہے جب میرے پیٹ میں کچھ پڑ چکا ہو۔ مجھے حیرت ہے کہ بے ہوشی کی حالت میں بھی کھانا اتنی تیزی کے ساتھ ہضم ہوتا ہے۔"

"خالی معدے کی حالت میں تمہیں بولنے کا ہیضہ ہورہا ہے تو پیٹ بھرنے کے بعد کیا ہوگا؟"

"بولنے کا ہیضہ خود بخود ختم ہوجائے گا۔ آزمائش شرط ہے۔ میرا پیٹ زیادہ دیر تک خالی رہا تو نقاہت کے نتیجے میں میرے گردے بھی ورم میں مبتلا ہونے لگیں گے۔ یہ مذاق نہیں، حقیقت ہے۔"

"بھاڑ میں جاؤ۔" اس کی بھنّائی ہوئی آواز سنائی دی اور وہ مجھ سے دور سرک گئی۔

میں اندھیرے میں خود بخود مسکرادیا۔ بعض اوقات دوسروں کا خون سلگا کر کتنی راحت ملتی ہے۔ اس کا اندازہ وہی لوگ لگا سکتے ہیں جو خود ایسے کسی تجربے سے گزر چکے ہوں۔

"اس وقت تم ایسی کسی بھٹیارن کی طرح کلکلا رہی ہو جو اپنے شوہر کی انتھک محنت اور بچوں کی اسی قدر کثرت سے عاجز آئی ہوئی ہو۔" میں نے اسے مزید برافروختہ کرنے کی نیت سے کہا۔

"بکے جاؤ۔ میں نے اپنے دونوں کان بند کرلیے ہیں۔" اس کی آواز غصے سے کھسیائی ہوئی تھی۔

"کاش، اس وقت اجالا ہوتا اور میں تمہیں دیکھ سکتا۔ کان بند کرلینے کا دعویٰ کررہی ہو اور میری بات کا سرتوڑ، بلکہ پتھر پھوڑ جواب بھی دے رہی ہو۔ ایسی حرکتیں تم ہی کرسکتی ہو۔" میں نے کہا۔

"خدا کے لیے چپ ہوجاؤ اور مجھے ان دونوں کو ہوش میں لانے دو۔" وہ عاجز آکر بولی "تم اسی طرح بولتے رہے تو میں پاگل ہوکر اپنا سر ٹرک کی کسی دیوار سے دے ماروں گی۔"

"میں چپ ہوا جاتا ہوں۔ ویسے جب بھی سر مارو تو ذرا احتیاط سے مارنا۔ ٹرک کی باڈی کمزور معلوم ہوتی ہے۔ یہ حصہ تو شاید عارضی طور پر ہمارے ہی لیے بنایا گیا ہے۔ اس کی چھت بہت نیچی ہے۔"

"میں بھی یہی سوچ رہی تھی۔" ویرا نے اضطراری کیفیت میں کہا "بیٹھنے کے بعد میرا سر بار بار چوبی چھت سے ٹکرا رہا ہے۔ شاید انہوں نے ٹرک کی باڈی کے پچھلے حصے میں یہ پارٹیشن تیار کیا ہے۔"

"میں اس وقت سنجیدہ باتیں سوچنے کے موڈ میں نہیں ہوں۔" میں نے رُکھائی سے کہا "میں نے صرف باڈی کی کمزوری کا احساس دلانے کی کوشش کی تھی۔ مجھے معلوم ہے کہ تمہارا سر بہت مضبوط ہے۔"

"مجھے کیا معلوم تھا کہ بے تکان بکواس کرتے ہوئے بھی تمہارا دماغ کام کررہا ہے۔ کیا باڈی کو توڑ کر باہر نکلنے کے کسی منصوبے پر غور کررہے ہو؟ میں یہی تو چاہ رہی تھی کہ وقت ضائع کرنے کے بجائے کچھ سوچو۔"

"زیادہ سوچنے سے میرے ٹخنوں میں درد ہونے لگتا ہے۔" میں نے بے پروائی سے کہا۔

"پھر بہکنے لگے۔ ایسی اول فول باتوں سے تم مجھے بلاوجہ غصہ دلادیتے ہو۔"

"یہ اول فول نہیں، حقیقت ہے۔ لوگ کہتے ہیں کہ لمبے آدمی کی عقل پھسل کر اُس کے ٹخنوں میں آجاتی ہے۔ ابھی ابھی چھت سے سر ٹکرانے کے بعد مجھے اندازہ ہوا ہے کہ میں بھی لمبوں کی صف میں شامل ہوں۔"

"کہاوتوں پر جاتے ہو تو پھر سردار پائندہ گل کے بارے میں کیا کہو گے۔ سر بڑا ہونے کے ساتھ اس کے پاؤں بھی پھاوڑوں کی طرح لمبے چوڑے ہیں۔" یک بیک اس کا لب و لہجہ تبدیل ہوگیا۔ وہ مجھے گِھنے پر مائل ہوتی ہوئی نظر آرہی تھی۔

"بات سمجھ میں نہیں آئی۔ میرے ٹخنوں سے سردار پائندہ گل کا کیا تعلق نکل آیا؟"

"سر بڑا سرداروں کا، پیر بڑا گنواروں کا۔ یہ تمہاری ہی کہاوت ہے نا؟"

"اوہ! اس میں دونوں خواص یکجا ہیں اسی لیے وہ گنواروں کا سردار ہے۔ مُردوں پر گریہ و ماتم کرنے والی عورتوں کے سر منڈوا کر ان کی چھاتیاں برہنہ کروادینے والے گنوار ہی نہیں جاہل بھی کہے جاسکتے ہیں۔ تنکارا ویلی میں یہ ہوتا چلا آیا ہے اور سردار پائندہ گل عملاً ان گنواروں کا سردار بنا ہوا ہے۔"

"معلوم ہوتا ہے کہ اس وقت تمہاری عقل ٹخنوں سے اوپر چڑھی ہوئی ہے۔" اس کی آواز سے بے بسی جھلک رہی تھی "تم سے بحث کرنی بے سود ہے۔ کوئی ڈھنگ کی بات سوچو تو مجھے مخاطب کرلینا۔"

"میں اس وقت بلند آواز میں سوچ رہا ہوں۔ تم کسی بات میں ڈھنگ محسوس کرو تو خود ہی ٹانگ اڑا دینا۔ انڈوں پر بیٹھی ہوئی کُڑک مرغی کی طرح، بات بات پر پھول جانا اب تمہاری عادت میں شامل ہوتا جارہا ہے۔ یہ اور بات ہے کہ تم ایک لمبی مدت گزارنے کے باوجود، ان انڈوں میں سے کوئی چوزا تک برآمد نہیں کرسکی ہو۔ تمہارا باپ نانا بننے کے لیے مرا جارہا ہے۔ زرخیز داماد کی جستجو میں بِل جونز اس کے ہاتھ آیا تو تم نے اسے بھی میرے ہاتھوں مروادیا۔ تمہارے بطن سے اس کے تمام نازائیدہ بچوں کا وبال تمہاری گردن پر ہوگا اور نانا جان....."

"شٹ اَپ!" اس کے صبر کا پیمانہ لبریز ہوگیا "میں نے اس کی

صورت تک نہیں دیکھی اور تم مجھے اس کے نوزائیدہ بچوں کی ماں بنارہے ہیں۔ مذاق اور بے ہودگی میں فرق ہوتا ہے۔ مجھے تم سے یہ امید نہیں تھی۔“

”یہ بہت اچھی بات ہے۔ مشرق میں غیرشادی شدہ عورتوں کا امید سے ہونا معیوب ہی نہیں شرمناک بھی سمجھا جاتا ہے۔ تمہیں یہ جان کر خوشی نہیں ہوگی کہ اہلِ زبان نہ ہونے کی وجہ سے تم بھی البرٹو ویلیسا کی طرح' کہیں کہیں مار کھاجاتی ہو۔ میں نے نازائیدہ بچوں کی بات کی تھی۔ وہ غنچے جو بن کِھلے مرجھا گئے اور تم غصے میں نوزائیدہ یعنی تازہ پیداوار کو لے دوڑیں۔ جو بچے پیدا ہی نہیں ہوئے ہوں ان کا ذکر کرنا بے ہودگی کیسے ہوسکتا ہے؟ برا نہ مانو تو یہ بتادو کہ تم نے اپنے کان کس لیے کھولے ہیں۔ کھانا میسر آنے تک انہیں بند رکھنے میں تمہارا کیا حرج تھا؟“

میری توقع کے عین مطابق اس نے سختی کے ساتھ اپنی زبان بند کرلی۔

غزالہ ہوش میں آئی ہی تھی کہ ٹرک کے انجن کی آواز یک بیک دھیمی ہوگئی۔ انجن کی طاقتور غراہٹیں معدوم ہونے کے باوجود ٹرک رواں تھا مگر اس کی رفتار ٹوٹتی ہوئی محسوس ہورہی تھی۔ شاید ڈرائیور نے انجن نیوٹرل کرکے' کلچ اور... ایکسیلریٹر کو پوری طرح آزاد کردیا تھا تاکہ مقررہ مقام پر ہلکے بریک لگاکر ٹرک کو روکا جاسکے۔

میں نے ہوش میں آتے ہی سمجھ لیا تھا کہ ہماری بے ہوشی کا تسلسل ٹوٹنے کے نتیجے میں ہمارا سفر بھی کسی طویل یا مختصر قیام پر منتج ہونے والا تھا۔ ہمیں پکڑنے والوں کا حساب اتنا درست تھا کہ ہم چاروں کے پوری طرح ہوش میں آنے کے ساتھ ہی ٹرک رکنے کے آثار پیدا ہوچلے تھے۔

”پڑاؤ کے آثار نظر آرہے ہیں۔ تم نے کیا سوچا ہے؟“ ویرا نے مجھ سے پوچھا۔

”میری عقل ٹخنوں میں اتری ہوئی ہے۔ تم نے کچھ سوچا ہو تو بتاؤ۔ میں آنکھیں بند کرکے اس پر عمل کر گزروں گا“ میں نے کہا۔ حقیقت یہ تھی کہ ہر طرح سوچنے کے باوجود مجھے گلوخلاصی کی کوئی راہ نظر نہیں آرہی تھی۔ اگر میں اکیلا ہوتا تو فرار کے کسی نہ کسی امکان پر غور کرسکتا تھا مگر وہاں چار افراد کا معاملہ درپیش تھا۔ ہم میں سے ایک دو بھاگ بھی نکلتے تو باقی رہ جانے والوں کو ان کے فرار کا خمیازہ بھگتنا پڑتا۔ میرے لیے یہی کافی تھا کہ ہمارے ساتھ ان لوگوں کا مجموعی رویّہ خاصا بہتر تھا۔ ہماری کوئی مزاحمانہ کارروائی انہیں ایک بار تشدد پر مجبور کردیتی تو ان کا سلوک ناخوش گوار تبدیلیوں کی زد میں آسکتا تھا اور ہمارا پورا سفر بدمزگی کا شکار ہوکر رہ جاتا۔

ہم تشویش اور بے یقینی کے عالم میں ٹرک کے انجن کی آواز پر کان لگائے بیٹھے رہے۔ آخر کار بریک لگائے گئے اور ٹرک رک گیا۔ اس کا انجن چلتا رہا۔ تھوڑی دیر بعد ٹرک کو الٹا چلاتے ہوئے' بائیں طرف موڑا گیا۔ جھٹکوں کے ساتھ لوہے سے لوہا ٹکرانے کی پُرشور آوازیں پیدا ہوئیں۔ شاید ٹرک کو ہموار اور پختہ سڑک سے کچے میں اتارا جارہا تھا۔ وہ کارروائی قلیل سی مدت میں مکمل ہوگئی اور ٹرک روک کر انجن بند کردیا گیا۔

انجن کا شور معدوم ہوتے ہی باہر سے کئی ملی جلی آوازیں سنائی دینے لگیں۔ وہ لوگ اونچی آوازوں میں فارسی یا پشتو میں باتیں کررہے تھے۔ وہ نکتہ چونکا دینے والا تھا مگر میں نے اپنی زبان بند ہی رکھی پھر باہر سے ایسی آوازیں آنے لگیں جیسے لوہے کے خالی ڈرم زمین پر پٹخے جارہے ہوں۔ ٹرک پر انسانی نقل وحرکت کے ساتھ چیزوں کے گھسیٹے جانے کی آوازیں بھی آرہی تھیں۔ یوں معلوم ہورہا تھا جیسے وہ ڈرم ٹرک پر سے اتارے جارہے ہوں۔ چند منٹ بعد وہ سلسلہ موقوف ہوگیا اور ہماری توجہ اس عمودی چوبی پارٹیشن پر مرکوز ہوگئیں جس نے ہمارے حصے کو باقی ٹرک سے الگ کیا ہوا تھا۔ چند آوازوں کے بعد اس چوبی دیوار کا ایک حصہ الگ ہوگیا اور اس چوکور خلا میں سے کسی ٹارچ کی تیز روشنی ہمارے تنگ وتاریک قید خانے میں رینگ آئی۔

خلا کے پار موجود شخص نے باری باری ہم چاروں کو براہ راست روشنی کی زد میں لے کر ہمارا جائزہ لیا پھر اپنی روشن ٹارچ سمیت ہماری طرف رینگ آیا۔ میں نے اس خلا میں سے باہر کا جائزہ لینے کی کوشش کی تو وہاں گہری تاریکی کے سوا کچھ نظر نہیں آیا۔ معًا اسی طرف سے میری آنکھوں پر تیز روشنی پڑی اور میں نے بوکھلا کر اپنی آنکھیں بند کرلیں۔ اندر آنے والے کا ایک اور ساتھی ٹرک کے پچھلے حصے میں موجود تھا جو دیوار کے پیچھے سے روشنی ڈال کر اندر والے کی مدد کررہا تھا اور خود ٹارچ کی تیز روشنی کے پیچھے چھپا ہوا تھا۔

دوبارہ آنکھیں کھولنے پر میں نے اندر والے کا جائزہ لیا تو چونک پڑا۔ وہ ایک تنومند اور باریش نوجوان تھا۔ اس کی سیاہ اور گھنی داڑھی بے ترتیبی سے اس کے سینے پر لہرا رہی تھی۔ اس کی بے چین اور چمک دار نگاہیں ہر طرف چکرا رہی تھیں اور ہاتھ ویرا کی رسیّوں کی گرہوں سے الجھ رہے تھے۔

”تم کون ہو اور ہمیں کہاں لے جارہے ہو؟“ میں نے اپنی آواز میں نقاہت پیدا کرتے ہوئے' اس سے پوچھا۔

”خاموش بیٹھو!“ اس نے مجھے بری طرح جھڑک دیا ”تمہیں جلد ہی سب معلوم ہوجائے گا“ اس کے تند لب ولہجے میں قبائلی خُوبُو بہت زیادہ واضح تھی۔ اس کی وضع قطع اور پوشاک بھی ایک مخصوص سمت میں رہنمائی کررہی تھی۔

مجھے اس وقت شدید حیرت ہوئی جب اس نے ہاتھوں کے بعد ویرا کے پیر بھی آزاد کردیے۔

”باہر نکلو!“ اس نے ویرا کی پشت پر ہاتھ مار کر اسے کسی مویشی کی طرح ہانکا۔ ویرا چاروں ہاتھ پیروں پر چلتی ہوئی چوبی خلا سے گزری پھر صرف اس کی پنڈلیاں نظر آنے لگیں۔ آہنی ڈرموں اور ٹرک کی داہنی دیوار کے درمیان بنائی جانے والی تنگ گزرگاہ شاید اوپر تک کھلی ہوئی تھی اور ویرا موقع میسر آتے ہی اپنے قدموں پر کھڑی ہوگئی تھی۔ وہ چلتی ہوئی آگے بڑھی تو اسے آزاد کرنے والا بھی ہماری طرف سے نکل گیا۔

”وہ ویرا کو کہاں لے گئے ہیں؟“ غزالہ نے پُرتشویش آواز میں پوچھا۔

”فکر نہ کرو۔ وہ اسے قتل کرنہیں کھائیں گے۔ پریشانی کی بات یہ ہے کہ مجھے یہ لوگ ڈون کوانگ فو کے بجائے سردار پائندہ گل کے آدمی معلوم ہورہے ہیں۔ اگر میرا قیاس درست ہے تو ہمیں شنگار اویلی لے جایا جارہا ہے۔“

”سردار پائندہ گل؟“ سلطان شاہ نے حیرت اور خوف سے دہرایا ”وہ اچانک ہمارا دشمن کیوں ہوگیا؟ تم سے ملاقات کے بعد تو وہ اچھے موڈ میں رخصت ہوا تھا۔ تم اس ملاقات سے خاصے مطمئن نظر آرہے تھے۔“

میں نے اسے یاد دلانا ضروری نہیں سمجھا کہ سردار پائندہ گل نے دوستی یا دشمنی کا معاملہ معلق چھوڑ کر بس یہ کہا تھا کہ جنت گل میرے اور اپنے خفیہ تعلق کے بارے میں زبان بند رکھے گی تو خیر ہوگی ورنہ کچھ پتا نہیں تھا۔

میرے ذہن میں ایک دھماکا سا ہوا۔ توکیا جنت گل نے سردار پائندہ گل کے شناساؤں کی محفلوں میں اپنی قصہ گوئی کا آغاز کردیا تھا؟ کیا سردار کو اس تشہیر کی اطلاع مل چکی تھی؟

اگر ان دو سوالات کے جوابات اثبات میں تھے تو میری پوزیشن بہت مخدوش ہوچکی تھی۔ ایک طرف سردار پائندہ گل مجھے جنت گل سے زیادتی کا مجرم ٹھہرا کر' کوئی بھی بدترین فیصلہ صادر کرسکتا تھا اور دوسری طرف یہ بات یقینی نظر آنے لگی تھی کہ شنگار اویلی پہنچنے کے بعد غزالہ کو معلوم ہوجائے گا کہ چھوٹے خان کی قید کے دوران میں' مَیں جنت گل کے دلفریب پیکر میں الجھ کر اُس سے بے وفائی کا مرتکب ہوا تھا۔ اس غیر متوقع انکشاف سے غزالہ کے دل پر کیا گزرتی اور اس کی نظروں میں میری کیا وقعت رہ جاتی' اس کا اندازہ لگانا دشوار نہیں تھا۔

”ان ضدی اور خودسر لوگوں کے موڈ اور مزاج کا کوئی اندازہ نہیں ہوتا“ غزالہ کہہ رہی تھی ”اس بار انہوں نے جس قدر خاموشی اور رازداری کے ساتھ شب خون مار کر ہمیں پکڑا ہے' وہ دہشت ناک ہے۔ اول خان یا ہمارے کسی اور ہمدرد کو علم ہی نہیں ہوسکے گا کہ ہم کہاں اور کس حال میں ہیں؟“

”اول خان بھی ہم جیسا ایک آدمی ہی ہے“ میں نے کہا ”فرق اتنا ہے کہ ہم صرف چار ہیں اور اس کے ایک اشارے پر چار سو مسلح گوریلوں کا ایک جتھا جمع ہوسکتا ہے۔ موجودہ حالات میں ہمیں اپنی عقل اور اپنے زوربازو پر انحصار کرنا پڑے گا۔ ہم واقعی بہت بری طرح پائندہ گل کے شکنجے میں آئے ہیں۔“

سردار پائندہ گل کتنا ہی متلون مزاج اور غصہ ور رہا ہو' آدمی اصول پرست معلوم ہوتا تھا۔ اس کا سب سے بڑا ثبوت یہ تھا کہ ہمیں اس کے آدمیوں کے قبضے میں آئے ہوئے' کم وبیش دو دن ہوچکے تھے لیکن اس دوران میں دونوں عورتوں کے ساتھ کوئی بدتمیزی یا چھیڑ چھاڑ نہیں کی گئی تھی حالانکہ ایسے حالات میں ہر جرائم پیشہ شخص بہتی گنگا میں ہاتھ دھونا اپنے فرائضِ منصبی میں شامل سمجھتا ہے۔ اس اصول پرستی کی روشنی میں' میں یہ سمجھنے سے قاصر تھا کہ اگر سردار پائندہ گل کی دشمنی ہوسکتی تھی تو صرف مجھ سے ہوسکتی تھی۔ اسے اپنے مجرم کو اٹھوانا چاہیے تھا۔ میرے ساتھ ان تینوں کو قید بلکہ اغوا کرنے کا کوئی جواز میری سمجھ میں نہیں آرہا تھا۔

ویرا تھوڑی دیر بعد واپس آئی تو پہلے والے دونوں آدمی اس کے آگے پیچھے اپنی اپنی جگہوں پر موجود تھے۔ ان کی وجہ سے وہ کچھ بتا نہیں سکی لیکن اس کی آنکھوں میں پُرجوش چمک نظر آرہی تھی۔

ویرا کو دوبارہ بے دست وپا کرنے کے بعد وہ شخص میری طرف متوجہ ہوا اور نہایت پھرتی کے ساتھ مجھے آزاد کردیا۔ میں چوبی دیوار والے خلا میں سے رینگ کر دوسری طرف نکلا اور کھلی فضا میں گہرے گہرے سانس لیتا ہوا' سیدھا کھڑا ہوگیا۔ اٹھتے ہوئے میں نے اپنی داہنی طرف موجود ڈرموں پر ہاتھ مار کر یہ اندازہ کرلیا تھا کہ وہ پوری طرح بھرے ہوئے تھے۔ شاید خالی ڈرم اتنی ہی جگہ میں لادے گئے تھے جو ہمارے حصے میں آمدورفت کے لیے استعمال ہورہا تھا۔ اس وقت وہی خالی ڈرم اتار کر ٹرک میں ہماری گزرگاہ بنائی گئی تھی جو ایک آدمی کے لیے بہت کافی تھی۔

میں ٹرک سے نیچے اترا تو اندھیرے میں مزید تین مسلح افراد نظر آئے۔ بائیں طرف ایک کچی نہر تھی جس میں اوپر تک پانی بہہ رہا تھا اور قرب وجوار میں درخت ہی درخت پھیلے ہوئے تھے۔

”جنگل پانی سے فارغ ہوکر ادھر جاؤ اور کھانا کھالو“ ایک قوی ہیکل شخص نے درشت لہجے میں مجھے ہدایت کی ”تم نے کوئی بھی گڑبڑ کی یا بھاگنے کی کوشش کی تو تمہارے علاوہ تمہارے ساتھیوں کو بھی گولی ماردی جائے گی۔“

”تم خانِ اعظم' سردار پائندہ گل کے آدمی ہو نا؟“ میں نے اس سے سوال کیا لیکن اس کے جواب دینے سے پہلے ہی کسی نے مجھے آگے دھکیل دیا۔ ان میں سے کوئی بھی غیر ضروری بات سننے یا کرنے کے لیے تیار نہیں تھا۔

ایک مسلح آدمی نے اپنی نگرانی میں مجھے ایک تناور درخت کی اوٹ میں بھیجا۔ پانی کے لیے اس نے وہیں رکھی ہوئی' منرل واٹر کی خالی بوتل کی طرف اشارہ کیا اور میں نے اسے ندی میں سے بھرلیا۔ ان کا مجموعی رویّہ مناسب ہی نہیں' ہر اعتبار سے مہذب اور قابلِ

تعریف تھا۔ خرابی صرف یہ تھی کہ انہوں نے ضرورت سے زیادہ نہ بولنے کی گویا قسم کھائی ہوئی تھی اور ان کی وہی خاموشی مجھے ڈس رہی تھی۔

اگلے مرحلے میں وہی مسلح شخص مجھے ایک گنجان کنج کے پیچھے لے گیا تو میں وہاں موجود لینڈ کروزر کو دیکھ کر حیران رہ گیا۔ وہاں تین آدمی کھانے کے سازو سامان کے ساتھ موجود تھے۔ ان میں سے ایک کی وضع قطع مسلح آدمیوں سے مشابہ تھی۔ بقیہ دو چہرے میرے لیے شناسا تھے۔ وہ وہی تھے جنہوں نے پچھلی رات ہمیں کھانا کھلایا تھا۔ مجھے لانے والا فوراً لوٹ گیا تھا۔ کھلی فضا میں تاریکی کے اثرات بہت گہرے اور گھمبیر نہیں تھے۔ مطلع صاف تھا اور تاروں بھرے آسمان کی چھاؤں میں نظر خاصے فاصلے تک کام کر رہی تھی۔ کراچی والے متروک گودام کے مقابلے میں، اس ویرانے میں ان دونوں کا رویّہ قدرے مفاہمانہ تھا۔ مجھے دیکھتے ہی ان کے ہونٹوں پر ہلکی سی مسکراہٹ نمودار ہوئی۔ شاید اس کا سبب یہ رہا ہو کہ کراچی میں وہ اپنے ٹھکانے پر شیر تھے اور اس ویرانے میں میرے طرح وہ دونوں بھی دوسروں کے رحم و کرم پر تھے۔ دوسروں کا دست نگر ہونے کے اس مشترکہ احساس نے انہیں مجھ سے یگانگی کے اظہار پر مجبور کر دیا تھا۔

مجھے مونچھوں والے نے کھانا دیا تو میں نے اس کے قریب ہی ایک پتھر پر جگہ سنبھالنے کے بعد پوچھا "اب تو بتا دو کہ یہ لوگ ہمیں کہاں لے جا رہے ہیں؟ منزل کا علم ہو تو دل کو تھوڑا سا سکون رہتا ہے۔"

"صندل خان! یہ منزل کے بارے میں پوچھ رہا ہے" مونچھوں والے نے مسلح آدمی سے کہا۔ "وہ میم بھی بار بار یہی پوچھ رہی تھی لیکن اس وقت صبغت اللہ یہاں تھا اور وہ غصے میں تھا۔ میں نے جواب دیئے بغیر میم کو لوٹا دیا تھا۔"

"بتا دو، بتا دو!" اس نے اپنی کلاشنکوف رائفل سمیت اپنے دونوں ہاتھ لہراتے ہوئے کہا "اب کراچی سے ان کا ہر رابطہ کٹ چکا ہے۔ انہیں سب کچھ معلوم ہو جائے تب بھی یہ اپنے مقدر کو نہیں ٹال سکتے" پھر وہ براہِ راست میری طرف متوجہ ہو گیا۔ "ہم لوگ سردار پائندہ گل کے جاں نثار ہیں اور تم لوگوں کو شنگارا ویلی لے جا رہے ہیں۔"

"لیکن کیوں؟ ہمارا قصور کیا ہے؟" میں نے کھانے کا آغاز کرتے ہوئے پوچھا۔

"سردار بابا کا حکم۔ اس سے زیادہ ہمیں نہیں معلوم۔ شنگارا ویلی میں پہنچتے ہی تمہیں سب کچھ معلوم ہو جائے گا۔ وہ مارنے سے پہلے تمہیں ایک ایک بات بتا دے گا۔ اپنے دشمنوں کو وہ ان کا ہر قصور بتا دیتا ہے۔"

"تو کیا وہ ہمیں قتل کرنے کا ارادہ رکھتا ہے؟" میں نے بوکھلا کر پوچھا۔

"خدا معلوم" صندل خان شانے اچکا کر بولا "سردار کے دل کی بات وہ خود جانتا ہے یا خدا جانتا ہے۔ میرا خیال ہے کہ سردار بابا اپنے چھوٹے موٹے دشمنوں پر زیادہ محنت نہیں کرتا۔ یہ تمہاری عزت افزائی ہوگی کہ وہ تمہیں کراچی سے اٹھوا کر شنگارا کے پہاڑوں میں اپنے ہاتھ سے مارے۔ سردار بابا جیسے بڑے آدمی کے ہاتھ سے مرنے والوں کی اولادیں اس بات پر ناز کرتی ہیں کہ ان کے بڑوں کا خون کرنے والا کوئی عام آدمی نہیں تھا۔" وہ اپنی جیب میں سے نسوار کی ڈبیا نکال کر اپنی خوراک لینے کی تیاری کرتا ہوا وہاں سے چند قدم آگے چلا گیا۔

"اور تمہارا استاد بھی پائندہ گل کا آدمی ہے؟" میں نے مونچھوں والے سے پوچھا۔

"استاد اس کا ملازم نہیں، دوست ہے۔ پائندہ گل کی خواہش پر اس نے ہمیں ان لوگوں کے حوالے کر دیا ہے۔" وہ کہنے لگا "اس نے تم لوگوں کو دیکھا تک نہیں ہے لیکن ہمیں ہدایت کی ہے کہ سردار پائندہ گل کے قیدیوں کو دن رات سفر کر کے جلد از جلد شنگارا ویلی پہنچانا ہے۔ ہمارا تیسرا ساتھی ٹرک پر سو رہا ہے۔ وہ اٹھ کر گاڑی سنبھالے گا تو میں آرام کرنے کے لیے کیبن کے اوپر چلا جاؤں گا۔ یہ ٹرک ضرورت کے بغیر کہیں نہیں روکا جائے گا۔"

اچانک مجھے بدرو دادا کا خیال آیا۔ میں نے جہانگیر سے اس کے فون نمبر بھی لیے تھے لیکن مصروفیات میں الجھنے کی وجہ سے اس سے بات نہیں کر سکا تھا۔ وہ بھی سردار پائندہ گل سے بہت قریب تھا۔ میں نے مونچھوں والے سے پوچھا "تمہارا استاد بدرو دادا کو تو جانتا ہوگا۔ وہ بھی سردار پائندہ گل کے لیے کام کرتا رہتا ہے۔"

مونچھوں والے کی آنکھیں حیرت سے پھیل گئیں پھر اس نے بے یقینی کے ساتھ پوچھا "تم بدرو دادا کو اس کے پرانے نام سے کیسے جانتے ہو؟ آج کل وہ اس نام سے کہاں پہچانا جاتا ہے؟"

"وہ میرا بہت پرانا اور جگری دوست ہے۔ ایک زمانے میں ہم دونوں اکٹھے کام کرتے تھے۔"

"مارے گئے!" وہ بے ساختہ کراہ اٹھا "یہ بات تم نے پہلے کیوں نہیں بتائی۔ پرانے دنوں کا بدرو دادا ہی تو ٹرانسپورٹ کی لائن میں استاد کہلاتا ہے۔ کیسا اندھیر ہے کہ اس کے آدمی تمہیں اسی کے ٹرک میں بند کر کے شنگارا ویلی لے جا رہے ہیں اور اس کے فرشتوں کو بھی اصلیت کا علم نہیں ہے۔ سردار پائندہ گل بہت خطرناک آدمی ہے۔ اس نے دعوت کھلانے کے لیے تم کو نہیں اٹھوایا ہوگا۔ جب استاد کو تمہارے حشر کا علم ہوگا تو وہ پاگلوں کی طرح اپنا منہ نوچ لے گا۔ وہ یاروں کا یار ہے اور پرانے دوستوں کی بڑی قدر کرتا ہے۔"

اس انکشاف پر میں بھونچکا رہ گیا۔ بدرو تو بعد میں جو کرتا سو کرتا۔ اس وقت میرا دل چاہ رہا تھا کہ میں کسی بڑے سے پتھر سے اپنا سر پھوڑ لوں۔ اگر میں نے بے پروائی سے وقت گزارنے کے

بجائے، بدرو دادا سے فوری طور پر اپنے پرانے مراسم کی تجدید کر لی ہوتی تو سردار پائندہ گل کا ذکر آتے ہی وہ اگل بیٹھتا کہ وہ سردار پائندہ گل کے لیے کیا گل کھلانے کا ارادہ رکھتا ہے۔ اس کے بعد دو اور دو چار کر لینا مشکل نہ ہوتا لیکن میں نے اپنی حماقت یا غفلت سے وہ نادر موقع گنوا دیا تھا۔ اس غفلت کے سنگین نتائج ہم سب کے سامنے تھے۔

"تم ٹرک کراچی واپس لے چلو یا کسی طرح اپنے استاد سے میری بات کرا دو۔ ہم چاروں کی زندگی کے لیے یہ ہونا بہت ضروری ہے۔ میں تمہیں اتنا انعام دوں گا کہ تم دوسروں کی نوکری چاکری بھول جاؤ گے" میں نے سرگوشیانہ لہجے میں اس کو خوشامد اور لالچ کے آئینے میں اتارنے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔

"ان میں سے ایک ہمارے ساتھ ٹرک پر سفر کر رہا ہے۔ باقی پانچ آدمی اس جیپ میں تھوڑے فاصلے سے چل رہے ہیں۔ صندل خان ان کا سربراہ ہے۔ وہ مجھے ہرگز واپس نہیں لوٹنے دیں گے۔ تمہارا استاد تو کیا، کسی سے بھی رابطہ ہونے کی کوئی صورت نہیں ہے۔ یہ لوگ تم چاروں سے بری طرح خائف ہیں اسی لیے تمہیں پورے سفر میں مسلسل بے ہوش رکھنے کا فیصلہ کیا گیا ہے۔ تمہاری دونوں ہی باتیں ناقابلِ عمل ہیں۔"

"اس وقت ہم کراچی سے کتنی دور ہیں؟" میں نے پوچھا۔

"ہم صادق آباد سے چالیس پچاس کلومیٹر آگے، پنجاب کے علاقے میں ہیں۔ اب تو کراچی کے بجائے آگے کی سوچو۔ ہمارے دلوں میں تمہارے لیے ہمدردی پیدا ہو گئی ہے لیکن ہم استاد کے حکم کے بغیر کچھ نہیں کر سکتے۔ زیادہ سے زیادہ یہ ہو سکتا ہے کہ کراچی واپسی کا انتظار کرنے کے بجائے ہم ٹرک خالی ہوتے ہی اسے فون پر پوری بات بتا دیں۔ تمہیں ایک بار تو شنگارا ویلی جانا ہی پڑے گا۔ ویسے نام کیا ہے تمہارا؟"

"ڈینی!" میں نے سوچتے ہوئے کہا "تم صندل خان سے بات کیوں نہیں کرتے؟ ہو سکتا ہے کہ اس کے دل میں نیکی آ جائے اور وہ اس مسئلے کا کوئی حل نکال لے۔ اس سے تمہاری بے تکلفی بھی معلوم ہوتی ہے۔"

"مشکل ہے، یہ لوگ سردار کے غلام بنے ہوئے ہیں۔ اس کی کہی ہوئی ہر بات کو پتھر کی لکیر سمجھتے ہیں۔ وہ تمہیں شنگارا ویلی لے جانے پر ہی اصرار کرے گا۔ یہ سب تندخو اور بددماغ ہونے کے ساتھ بدزبان بھی ہیں۔"

ہیروئن کی غیر قانونی تجارت میں ان لوگوں کی حیثیت کلیدی تھی۔ بظاہر وہ سردار پائندہ گل کے ملازم اور نمک خوار تھے لیکن ان ہی کی ناقابلِ تسخیر قوت نے سردار پائندہ گل جیسے پُرنور اور باریش چہرے والے شخص کو موت کا سوداگر بنایا ہوا تھا۔ اپنی اپنی جگہ وہ سب بھی موت کے سوداگر ہی تھے اور انہیں اپنی خصلتوں کے اعتبار سے ویسا ہی ہونا چاہیے تھا، جیسے وہ تھے۔ تندخو، بددماغ، بدزبان، سفاک اور بے مہر۔ موت بلکہ سسکتی ہوئی بھیانک ترین موت کی سوداگری سے حاصل ہونے والے بھاری منافع پر پلنے والوں کے لہو میں ان سب کے سوا اور کیا ہو سکتا تھا؟

"زیادہ سے زیادہ یہی ہوگا کہ صندل خان تمہاری کوئی بھی بات ماننے سے انکار کر کے، ہمیں شنگارا ویلی لے جانے پر اصرار کرے گا۔ اس سے صورتِ حال نہیں بدلے گی۔ تم ویسے بھی شنگارا ویلی کا سفر کرنے پر مجبور ہو۔ وہ مان گیا تو ہماری مشکلات حل ہو جائیں گی۔ میں اس امکان کو ضائع کرنے کے حق میں نہیں ہوں۔"

"ڈینی ٹھیک کہہ رہا ہے" اس کے ساتھی نے میری تائید میں کہا "تم صندل خان سے ضرور بات کرو۔"

"کیا سب لوگوں کا کھانا یہ اکیلا ہی کھا جائے گا۔" اچانک صندل خان نے اپنی جگہ کھڑے کھڑے آواز لگائی "اسے جلدی فارغ کرو۔ ہم نے یہاں اتنا وقت برباد کیا تو لاہور میں پھنس جائیں گے۔"

"اسے بلا کر ابھی بات کر لو" میں نے سرگوشیانہ لہجے میں کہا۔
"مجھے بھی اس کے عزائم معلوم ہو جائیں گے۔"

"نہیں!" مونچھوں والے نے سختی سے انکار کر دیا "وہ سالا نیم پاگل ہے۔ تمہارے سامنے بات کی تو وہ سمجھے گا کہ تم نے کسی قسم کی رشوت وغیرہ کی پیش کش کر کے ہمیں خرید لیا ہے۔ اب یہ کام مجھ پر چھوڑ دو۔ یہاں سے میں اسے ٹرک پر بٹھا لوں گا پھر راستے میں موقع نکال کر بات کروں گا۔ تم جلدی سے اپنا کھانا ختم کرو۔"

"تم ٹرک میں کسی خرابی کا بہانہ کر کے سفر میں رکاوٹ بھی ڈال سکتے ہو" میں نے آخری لقمہ نگلنے کے بعد اسے اسانی کی

ایک اور کوشش کی "انہیں ہم کو ٹرک سے نکالنا..."

"نہیں‘ یہ نہیں ہو سکتا" اس نے مجھے مزید بولنے سے روک دیا "میں اپنے آپ اتنا بڑا فیصلہ نہیں کر سکتا۔ ابھی تو میں نے صرف تمہاری بات سنی ہے۔ یہ استاد کے لیے کڑا امتحان بھی ثابت ہو سکتا ہے۔ اگر اس کے اور سردار پائندہ گل کے تعلقات زیادہ گہرے ہوئے تو وہ تم سے نظریں بھی پھیر سکتا ہے۔ اس کے علاوہ ان لوگوں میں بھی ایک ٹرک ڈرائیور شامل ہے۔ وہ لینڈ کروزر چلا رہا ہے۔ وہ مکینک کا کام بھی جانتا ہے۔ اس نے میری چالاکی پکڑلی تو یہ لوگ مجھے گولی ہی ماردیں گے۔ یہ ذرا ذرا سی بات پر آپس میں لڑ مرتے ہیں‘ میں تو پھر غیر ہوں۔"

"آدھے گھنٹے بعد ہمیں بے ہوشی کے انجکشن کون لگائے گا؟" میں نے پانی پی کر اٹھتے ہوئے پوچھا۔

"میں آؤں گا" دوسرے نے کہا "ہو سکتا ہے کہ یہاں رک کر آدھا گھنٹا ضائع کرنے کے بجائے مجھے بھی تمہارے ساتھ بند کردیا جائے۔ خالی ڈرم ہٹا کر راستہ بنانے اور پھر بند کرنے میں کافی وقت برباد ہو رہا ہے۔"

"ہو سکتا ہے کہ ہمیں دوبارہ بات کرنے کا موقع نہ ملے۔ کچھ بھی نہ ہو سکے، تو ٹرک خالی ہوتے ہی بدرو دادا کو فون پر ساری بات ضرور بتادینا۔ مجھے یقین ہے کہ وہ مجھ پر سردار پائندہ گل کو ترجیح نہیں دے گا۔"

"ایک بات باربار مت دہراؤ۔ میں نے جو کہہ دیا ہے‘ وہ کروں گا۔ ویسے یار‘ اگر تم سچ بول رہے ہو تو وہ سالی میم جھوٹی ہے۔ وہ تو اردو کے لیے کام وام کی بکواس کررہی تھی" وہ اچانک سوچ میں پڑگیا تھا۔ ویرا اس کے دماغ کی جڑوں تک میں بیٹھ چکی تھی جو ایک اچھی علامت تھی۔

"وہ ٹھیک کہہ رہی تھی۔ ولایتی عورتیں دوچار مردوں سے دوستی رکھنے کو برا نہیں سمجھتیں۔ میں نے اسے اپنے مطلب سے پھانس کر فلیٹ پر بلایا تھا۔ وہ مفت میں ماری گئی ہے۔ تم سے بہت متاثر ہے۔ کہہ رہی تھی کہ اتنا شریف بدمعاش روئے زمین پر ملنا مشکل ہے۔ زندگی رہی تو اس سے تمہاری بھی دوستی کرادوں گا۔"

"اللہ مالک ہے" اس نے سینہ پھلا کر حلق کے بل کہا "میں نے صرف اس کی وجہ سے صندل خان سے بات کرکے یہاں تم لوگوں کے جنگل پانی کا بندوبست کرایا ہے۔ وہ باربار میرا شکریہ ادا کررہی تھی۔"

میں دل ہی دل میں اس کی کج فہمی پر ہنستا ہوا وہاں سے واپس چل دیا۔ ویرا اسے کھڑے کھڑے دس دفعہ بھی نیلام کردیتی تو اس کے فرشتوں تک کو علم نہ ہو پاتا کہ اس کی بولی لگوانے والی کون تھی۔ اور وہ اس کے مکروفریب میں الجھ رہا تھا۔ آخری نتائج سے قطع نظر ہمارے لیے وہ ایک نیک شگون تھا۔

واپسی میں‘ مَیں نے یہ بات خاص طور پر نوٹ کی کہ ان لوگوں نے ڈرموں سے بھرے ہوئے ٹرک اور لینڈ کروزر کو ہائی وے سے اتار کر اس طرح کھڑا کیا تھا کہ لینڈ کروزر سڑک پر سے دیکھی ہی نہیں جاسکتی تھی۔ ٹرک بھی نہر کے کنارے‘ درختوں کے درمیان روکا گیا تھا۔ اس کا اگلا حصہ سڑک کی طرف تھا۔ اس مقام پر ٹرک آنے جانے والی گاڑیوں کی تیز روشنیوں سے بالکل محفوظ تھا۔ کسی کو علم ہی نہیں ہو سکتا تھا کہ ٹرک کے عقب میں کتنے بڑے پیمانے پر متفرق سرگرمیاں جاری تھیں۔ شاید ان ہی خوبیوں کی بنا پر پڑاؤ کے لیے اس مقام کا انتخاب کیا گیا تھا۔

مجھے اندر لے جاکر باندھنے کے بعد غزالہ کو آزاد کردیا گیا۔ ان لوگوں کے جاتے ہی ویرا نے مجھے اپنے تجربات سے آگاہ کرنا شروع کردیا۔ وہ غزالہ اور سلطان شاہ کو پہلے ہی ان باتوں سے آگاہ کرچکی تھی جو میرے لیے بالکل بے جان اور پھُسپھُسی تھیں۔ اس کا سارا زور اس بات پر تھا کہ ہم ڈون کوانگ فو کے آدمیوں پر بلاوجہ ہی اپنے سر کھپاتے رہے تھے۔

اس کے خاموش ہو جانے پر جب میں نے افسردگی کے ساتھ بدرو دادا کا ذکر چھیڑا‘ تو دونوں ہی حیران رہ گئے۔ اندھیرے کی وجہ سے میں ان کے چہروں کے تاثرات تو نہیں دیکھ سکا لیکن ان کی تحیر زدہ سرگوشیوں سے مجھے ان کی حیرت اور پھر ملال کا اندازہ لگانا دشوار نہیں تھا۔ ویرا نے لگی لپٹی رکھے بغیر صاف کہہ دیا کہ میری غیر ذمے داری اور بے پروائی کے نتیجے میں ہم اس حال کو پہنچے تھے اور اس کا سدِباب کرنے کی بھاری ذمے داری میرے سر عائد ہوتی تھی۔

غزالہ کے بے دست وپا کیے جانے کے بعد سلطان شاہ کو عارضی آزادی نصیب ہوئی پھر وہ بھی باندھ دیا گیا۔ بدرو دادا کا کلین شیو ملازم اپنے قیاس کے عین مطابق ہمارے پاس پہنچا دیا گیا۔ اس کے پاس انجکشن اور سرنج کے علاوہ چائے سے بھرا ہوا تھرماس اور ٹارچ بھی موجود تھی۔ چوبی پارٹیشن والی کھڑکی غائب ہوتے ہی خالی ڈرم تیزی کے ساتھ ٹرک پر لادے جانے لگے پھر ٹرک کا انجن بیدار ہوا اور وہ کچی زمین پر ہچکولے لینے کے بعد سبک رفتاری کے ساتھ ہائی وے پر رواں ہوگیا۔ سب کچھ اسی طرح ہو رہا تھا جیسا میں نے سوچا تھا‘ بس کنٹینر اس ٹرک سے بدل چکا تھا۔

اپنے تازہ ترین مشاہدات و تجربات کے بعد ہمارے پاس موضوعات کی کمی نہیں تھی۔ گفتگو کرنے کے لیے اس حد تک تحفظ بھی میسر آچکا تھا کہ بدرو دادا کا آدمی ہمارا ہمدرد بن چکا تھا لیکن اس کے باوجود ہم پانچوں خاموشی اور گہری سوچوں میں کھوئے ہوئے تھے۔ تھوڑی سی مثبت پیش رفت ہونے کے باوجود آنے والے دنوں کا نقشہ اچھا نظر نہیں آرہا تھا۔

ٹرک رفتار پکڑ چکا تھا اور فضا میں صرف اس کے انجن کی ہموار اور یکساں گھوں گھوں گونج رہی تھی۔

اس کا نام عبداللہ تھا لیکن اس کے ساتھی اسے عبدل کے نام سے پکارتے تھے۔ مونچھوں والے دراز قامت شخص کو ولی کہا جاتا تھا۔ اس کے اصل یا پورے نام سے عبداللہ بھی لاعلم تھا۔

عبدل کو اس بات کا بہت قلق تھا کہ ہم لوگوں کی کراچی سے روانگی سے پہلے کوئی ایسا موقع کیوں نہیں پیش آیا کہ ہمیں بدرو دادا سے اپنے مراسم کے اظہار کا موقع مل سکتا۔ ہمارے ساتھ پیش آنے والے واقعات کو وہ صرف اور صرف مقدر کا نام دے رہا تھا۔ ہمارے مقدر میں قید ہوکر شنگارا ویلی لے جایا جانا لکھ دیا گیا تھا اس لیے ہمارے فرشتوں کو بھی علم نہیں ہو سکا کہ ہم بدرو دادا کے آدمیوں کی قید میں ہیں۔

اس کے دل میں اپنے لیے نرم گوشہ محسوس کرنے کے بعد میں نے اس پر تھوڑی سی محنت کرنے کا فیصلہ کرلیا۔ اگر میری وہ محنت بار آور ثابت ہوتی تو ہمیں اس قید سے بہ آسانی نجات مل سکتی تھی۔

"اگر ایک مجبوری آڑے نہ آتی تو ہمیں راستے میں ہی رہائی مل سکتی تھی" میں نے اِدھر اُدھر کی باتوں میں راہ پاتے ہی اپنی بات چھیڑ دی "ولی پورے خلوص کے ساتھ ہماری مدد کرنی چاہ رہا ہے۔"

"اوں.... ہوں" اندھیرے میں اس کی آواز اُبھری "میں تم دونوں کی باتیں سُن رہا تھا۔ اس نے اپنی طرف سے کچھ نہیں کہا تھا۔ وہ تمہاری تجویز تھی جس پر اس نے تمہیں بتادیا تھا کہ ٹرک کے انجن یا کسی اور حصے میں خرابی کا بہانہ نہیں چل سکے گا۔ صندل خان کے آدمیوں میں ایک اچھا خاصا مکینک بھی شامل ہے۔"

"وہ مجبوری قابلِ فہم تھی لیکن تمہارا معاملہ بہت مختلف ہے" میں نے معنی خیز لہجے میں کہا۔

"کیوں؟ میرا معاملہ مختلف کیوں ہے؟" اس کی آواز سے خالی الذہنی عیاں تھی۔

"تم چاہو تو ہمیں اس عذاب سے نجات دلا سکتے ہو" میں نے امید کے ساتھ کہا "ان لوگوں نے تمہیں ہمارے ساتھ بند کرکے ایک سنہرا موقع فراہم کیا ہے۔ ہمیں اس سے فائدہ اُٹھانا چاہیے۔"

"میں حکم کا غلام ہوں۔ بھلا میں تمہیں کیسے آزادی دلا سکتا ہوں؟"

میں نے سمجھا کہ وہ انکسار سے کام لے رہا ہے اس لیے اسے بتانے لگا "تم ہم میں سے کسی ایک کے ہاتھ کھول دو۔ باقی کام ہم خود کرلیں گے۔ ایک مرتبہ ہم چاروں کے ہاتھ پیر آزاد ہوگئے تو ہم خالی ڈرموں کو اندر لاکر یا باہر دھکیل کر اپنا راستہ بنالیں گے اور چلتے ٹرک سے کہیں بھی کود جائیں گے..."

میری بات مکمل ہونے سے پہلے‘ وہ استہزائیہ انداز میں ہنس پڑا۔ "یہ اتنا آسان نہیں ہوگا۔ ڈرموں کے ہلنے جلنے سے جو شور پیدا ہوگا وہ انہیں چوکنا کردے گا۔ اگر ٹرک پر موجود آدمی غافل رہا تو دوسروں کو گڑبڑ کا اندازہ ہو جائے گا۔ تم بھول رہے ہو کہ کچھ آدمی لینڈ کروزر میں سفر کررہے ہیں۔ وہ جیپ کبھی ٹرک سے آگے دوڑتی رہتی ہے اور کبھی پیچھے ہو لیتی ہے۔ گڑبڑ کا اندازہ کرلینے کے بعد وہ تمہارے ساتھ جو سلوک چاہیں گے‘ کریں گے لیکن مجھے براہِ راست گولی ماردیں گے۔ ولی تمہیں ان کے بارے میں بتا ہی چکا ہے۔"

اس کی وضاحت میرے لیے حوصلہ افزا ثابت ہوئی۔ میں نے سوچا کہ وہ میری بلکہ ہم چاروں کی مدد کرنے پر آمادہ تھا لیکن اپنے تحفظ کی طرف سے فکرمند تھا۔ اگر اسے کسی طرح قائل کردیا جاتا کہ منصوبہ ناکام ہونے کی صورت میں اس پر کوئی آنچ نہیں آئے گی تو وہ ہماری مدد کرنے پر رضامند ہو سکتا تھا۔

"ہمارے ہاتھ پیر صندل خان کے آدمی نے باندھے ہیں۔ تم کہہ سکتے ہو کہ ہم میں سے کسی کی بندشیں ڈھیلی رہ گئی تھیں اور اس نے بے ہوشی کا انجکشن لگانے کا وقت ہونے سے پہلے آزادی حاصل کرکے تم پر حملہ کیا اور تم بے ہوش ہوگئے۔ ہمارے کامیاب فرار کے بعد بھی یہ کہانی تمہارا بھرپور دفاع کرسکے گی۔ اس میں جان پیدا کرنے کے لیے میں کنپٹی پر ہلکی سی ضرب لگا کر تمہیں تھوڑی دیر کے لیے بے ہوش کردوں گا۔"

وہ میری بات خاموشی سے سنتا رہا پھر میرے خاموش ہونے پر بولا "تم بلاوجہ اپنا سر کھپا رہے ہو۔ میرا دماغ خراب ہوا ہے جو میں تمہارے لیے اتنے پاپڑ بیلوں۔ ہمارے استاد سے دوستی کے بارے میں تمہارا دعویٰ اپنی جگہ ہے لیکن ہم اس پر کیسے بھروسا کرسکتے ہیں؟ ہمیں بس اتنا سا قلق ہے کہ یہ بات کراچی میں ہی صاف ہو جاتی تو تم بے یقینی کا شکار ہونے سے بچ سکتے تھے۔ استاد پرانی دوستی کی بنا پر تمہیں‘ سردار پائندہ گل کے آدمیوں سے نجات دلوا دیتا تو تم کو یہ وقت نہ دیکھنا پڑتا۔ دوسری صورت یہ بھی ہو سکتی تھی کہ بدرو دادا تمہیں پہچان لینے کے باوجود سردار پائندہ گل کے منصوبے کو پورا ہونے دیتا۔ ان دونوں باتوں کا انحصار اس بات پر ہوتا کہ بدرو دادا سے تمہاری دوستی کتنی گہری رہی ہے۔ مگر اب میں یہ بھی سوچ رہا ہوں کہ تم ہمارے ساتھ فراڈ تو نہیں کررہے؟ ہو سکتا ہے کہ تم نے اتفاق سے بدرو دادا کے بارے میں کچھ سُن لیا ہو اور اب اچانک ہی اس سے دوستی کا دعویٰ کرنا شروع کردیا ہے۔ تم جانتے ہو کہ ہم لوگ تمہارے دعوے کی تصدیق یا تردید حاصل نہیں کرسکتے۔ یہ تمہارا فلوک بھی ہو سکتا ہے جو چل جاتا تو تمہیں آزادی مل سکتی تھی۔"

"تمہاری تیسری بات بالکل بے سروپا ہے" اس بار میں اپنے لہجے کی تلخی پر قابو نہ رکھ سکا "ہم جب سے تمہاری تحویل میں آئے ہیں‘ مسلسل بے ہوش ہیں۔ ہم بدرو دادا کے بارے میں کہاں اور کس سے سُن سکتے تھے؟ میں نے تو تم سے یہ پوچھا تھا کہ تمہارا استاد شاید بدرو دادا کا شناسا ہو لیکن تم نے یہ انکشاف کرکے مجھے حیران

کردیا تھا کہ ماضی کا بدرو دادا ہی تمہارا استاد ہے۔ میرے دعوے میں جھوٹ کا شائبہ تک نہیں ہے۔ مجھے تو یہاں تک معلوم ہے کہ چند روز پہلے' سردار پائندہ گل کے بھانجے کو کراچی میں قتل کردیا گیا تھا تو بدرو دادا ہی اپنے ایک ٹرک پر اس کی لاش لے کر شنگارا ویلی گیا تھا اور عبدالرحیم خان کی تدفین کے بعد واپس آیا تھا۔"

"اب مجھے یقین آگیا کہ تم ہمارے ساتھ کوئی فلوک نہیں چل رہے" وہ میرے تلخ لہجے پر ذرا بھی مشتعل ہوئے بغیر' دھیمی آواز میں بولا "اگر تمہیں چھوٹے خان کی لاش کے ساتھ استاد کے شنگارا ویلی تک جانے کے بارے میں معلوم ہے تو تم جھوٹے نہیں ہوسکتے لیکن بات پھر وہیں آجاتی ہے کہ استاد سردار پائندہ گل کے مقابلے میں تمہیں کتنی اہمیت دیتا ہے؟ اور اب تو کچھ ہو ہی نہیں سکتا۔ ہم دونوں' سردار پائندہ گل کے آدمیوں کی بات ماننے پر مجبور ہیں اور وہ تم لوگوں کو اپنا خطرناک دشمن قرار دے رہے ہیں۔ ہم نے تمہارے حق میں ان سے ایک لفظ بھی کہا تو وہ ہمارے خون کے پیاسے ہوجائیں گے۔"

"تم ہمارے ساتھ اسی پارٹیشن میں بند ہو اس لیے کم از کم اتنا تو کرہی سکتے ہو کہ آدھے گھنٹے کی مدت گزرنے کے بعد ہمیں بے ہوشی کے انجکشن نہ لگاؤ" اسے کھلی حمایت سے گریزاں دیکھتے ہوئے میں نے پینترا بدل کر بات شروع کردی۔

"یہ بھی ناممکن ہے..." اس نے دو ٹوک لہجے میں اپنی بات شروع کی ہی تھی کہ میں نے اسے روک دیا اور فوراً ہی اپنی بات کی وضاحت شروع کردی۔

"میرا یہ مطلب نہیں تھا کہ تم شنگارا ویلی تک ہمیں انجکشن ہی نہ لگاؤ۔ مجھے تمہاری مخدوش پوزیشن کا پورا پورا اندازہ ہے۔ تمہارے انجکشن کے ذریعے جسم میں داخل ہونے والی دوا بہت تیزی کے ساتھ اپنا اثر دکھاتی ہے۔ ٹرک کے رُکنے کے آثار پیدا ہوتے ہی تم ہمیں بے ہوش کردینا۔ تمہارے اس تعاون کی وجہ سے ہمیں اپنے گمبھیر مستقبل پر غور کرنے کا موقع مل سکے گا۔"

"تم اپنی عقل کے لحاظ سے ٹھیک بات کہہ رہے ہو لیکن یہ تمہارے حق میں مہلک ثابت ہوسکتی ہے" اندھیرے میں اس کی ناصحانہ آواز اُبھری "میری وجہ سے تمہارے ساتھ کوئی اونچ نیچ ہوگئی تو میں عمر بھر اس پچھتاوے سے نجات حاصل نہیں کرسکوں گا۔ ہم لوگ اسمگلنگ وغیرہ جیسے چھوٹے موٹے جرائم ضرور کرتے ہیں لیکن یہ جرائم اب کاروبار کا ایک لازمی حصہ بن گئے ہیں۔ کوئی چھوٹا بڑا بیوپاری ایسے ہیر پھیر کے بغیر اپنا پیٹ بھی نہیں بھر سکتا۔ جو سرکاری ٹیکسوں میں جتنا زیادہ گھپلا کرتا ہے' اس کی آمدنی اسی قدر زیادہ ہوجاتی ہے۔ میرا مطلب یہ ہے کہ ہمارے جرائم بھی ایسے نہیں ہوتے جنہیں قابلِ نفرت یا گھناؤنا سمجھا جاتا ہو۔ ڈرانے دھمکانے کی اور بات ہے لیکن میں کسی انسان کا خون کرنے والے کو بہت بُرا سمجھتا ہوں۔ تمہاری بات مان لینے کے بعد میں اپنے کسی ارادے کے بغیر' تمہارا قاتل بھی بن سکتا ہوں۔"

"تمہاری یہ منطق ہماری سمجھ سے باہر ہے" ویرا کی آواز اُبھری۔

"تمہیں معلوم ہے کہ بے ہوشی والی دوا کی مقررہ مقدار ہر پانچ گھنٹے بعد تمہیں دی جارہی ہے۔ اگر میں نے تمہاری فرمائش کے مطابق دو چار گھنٹے کی تاخیر سے انجکشن لگایا تو ہوسکتا ہے کہ وہ لوگ دوسرا انجکشن اپنی نگرانی میں لگوائیں۔ اگر تمہارے خون میں اس دوا کی مقدار بڑھ گئی تو تمہاری بے ہوشی کا سلسلہ بے آواز موت پر ختم ہوگا۔ یہ دوا بہت زود اثر اور تیز ہے۔ تمہیں زندہ رکھنے کے لیے یہ ضروری ہے کہ کسی بھی دو انجکشنوں میں کم از کم پانچ گھنٹے کا وقفہ ہو۔ یہ مجبوری نہ ہوتی تو ہم تمہیں ایک ہی بار زیادہ مقدار میں دوا دے کر بیس یا چالیس گھنٹوں کے لیے بے ہوش کرسکتے تھے۔"

"تمہیں یہ خیال کیوں آیا کہ اگلا انجکشن وہ اپنی نگرانی میں بھی لگوا سکتے ہیں؟" میں نے پوچھا۔

"میری شیشی میں صرف چار ڈوز کی جگہ باقی رہ گئی ہے۔ اگلا انجکشن لگانے کے لیے مجھے نئی شیشی کی ضرورت ہوگی۔ ہوسکتا ہے کہ وہ صبح سویرے بھی تمہیں باہر نکالنے کا ارادہ رکھتے ہوں۔ ان غیر یقینی حالات میں' میں کوئی بھیانک خطرہ مول نہیں لے سکتا" اس نے خاموش ہوکر اپنی ٹارچ روشن کی اور اس کی روشنی میں اپنی رسٹ واچ کا جائزہ لیتے ہوئے بولا "تمہارے پاس صرف پندرہ منٹ باقی رہ گئے ہیں۔ وقت پورا ہوتے ہی میں اپنا کام شروع کردوں گا۔ اس دوران میں تم دل کھول کر تبادلۂ خیال کرسکتے ہو۔ میں اپنے کان بند کرلوں گا۔ یہ میرا وعدہ ہے کہ میں ان سے تمہاری مخبری نہیں کروں گا۔"

"یہ واقعی ہمارا ہمدرد ہے" ویرا بولی "اس کی باتیں میری سمجھ میں آرہی ہیں۔ دوا کے اثر سے کسی کو بے ہوش کرنا کمال نہیں ہوتا' اصل کام اسے دوبارہ ہوش میں لانا ہوتا ہے۔ بے ہوشی کی دوا کی مقدار یا قسم کے تعین میں ذرا سی بھی گڑبڑ ہوجائے تو آپریشن ٹیبل سے مریض کی لاش ہی جاتی ہے۔ میں کئی مواقع پر عارضی بے ہوشی کو لامتناہی موت میں بدلتے ہوئے دیکھ چکی ہوں۔ مجھے خوشی ہے کہ عبدل کوئی پیشہ ور ماہر نہ ہونے کے باوجود ان تمام باتوں سے واقف ہے۔"

"تو کیا تمہارا خیال ہے کہ شنگارا ویلی کا سفر ہماری اس پُرسکون اور آرام دہ موت سے بہتر ثابت ہوگا؟" اس بار سلطان شاہ کی جلی کٹی آواز سُنائی دی تھی "تم سُن ہی چکی ہو کہ سردار پائندہ گل نے ہمیں ریوڑیاں دینے کے لیے شنگارا ویلی نہیں بُلایا ہے۔ وہاں قتل و جدل اور خوں ریزی کے علاوہ اور کچھ نہیں ہوگا۔"

"میری عقل ماؤف ہوکر رہ گئی ہے" غزالہ کی کمزوری آواز اُبھری "تھوڑی دیر پہلے تک ہم یہ سمجھ رہے تھے کہ ڈونا کے آدمیوں نے ہمیں اغوا کیا ہے لیکن اب عمر عیار کی زنبیل سے اچانک سردار پائندہ گل نکل پڑا ہے۔ یہ کیا ہورہا ہے؟ اس کا کیا مقصد ہے؟ میں سمجھنے سے قاصر ہوں۔"

"یہ ڈون کون ہے؟" اچانک عبدل اضطراری لہجے میں سوال کر بیٹھا۔

"تم اپنے کان بند رکھنے اور ہماری مخبری نہ کرنے کا وعدہ کرچکے ہو" میں نے ترش لہجے میں اسے یاد دلایا "تم کو ہماری آپس کی باتوں میں دخل نہیں دینا چاہیے۔ ڈون کوئی بھی ہو' تمہیں اس سے کیا لینا ہے؟ تم اپنے وعدے پر قائم نہیں رہ سکتے تو ہم اپنی زبانیں بند کیے لیتے ہیں۔"

"نہیں' تم اپنی باتیں کرتے رہو" اس نے معذرت خواہانہ لہجے میں کہا "کان بند کرلینے والی بات میں نے محاورتاً کی تھی۔ اس مختصر سی جگہ میں یہ کیسے ممکن ہے کہ میں کچھ نہ سُنوں۔ تمہاری زبان سے ایک اور دشمن کا ذکر سُن کر میرا تجسس جاگ اٹھا تھا اور میں اضطراری طور پر بول پڑا ورنہ مجھے ڈون یا کسی اور سے کوئی دلچسپی نہیں ہے۔ یہ تمہارے آپس کے معاملات ہیں۔ اب میں ان میں دخل نہیں دوں گا۔"

غزالہ کی الجھن اپنی جگہ پر بالکل بجا تھی۔ واقعات کا تسلسل حیران کن حد تک دھوکا دینے والا تھا۔ سردار پائندہ گل' ہمارے اغوا سے ایک رات پہلے ہی مجھ سے مل کر گیا تھا۔ اگرچہ اس نے میرے ساتھ دوستی یا خیرسگالی کا رویّہ اختیار نہیں کیا تھا لیکن اس کے تیوروں سے کسی دشمنی کا اظہار بھی نہیں ہوا تھا۔ اس کی مبہم باتوں کا نچوڑ صرف یہ تھا کہ جنت گل نے اپنے تجربے کو اپنی ذات تک محدود رکھا تو سردار پائندہ گل بھی مجھے فراموش کرکے محض اپنے زورِ بازو سے اس سرکش حسینہ کو اس کی سنگین و رنگین جسارت کی سزا دے گا لیکن اس نے سردار پائندہ گل کو' اس کے قبیلے اور برادری میں ذلیل و رسوا کرنے کے لیے ایک مغوی کے ساتھ منہ زور حیوانی جذبوں کی جسمانی پیکار کی کہانی مجلسوں اور چوپالوں میں پھیلانی شروع کردی تو پھر سردار پائندہ گل مجھے ہرگز نہیں بھول سکے گا۔ وہ ہمارے فلیٹ پر خالی ہاتھ اور اکیلا آیا تھا اور اپنی باتیں کرکے چلا گیا تھا۔ میرے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا کہ وہ چوبیس گھنٹوں کی قلیل سی مدت میں کسی فیصلے پر پہنچ کر ہمارے خلاف طبلِ جنگ بجا دے گا۔ وہ ہم سب پر اپنے کردار اور گفتار کے بھرپور تاثرات چھوڑ کر چلا گیا تھا لیکن میں نے اس کی طرف سے فوری طور پر کوئی خطرہ محسوس نہیں کیا تھا۔

رات کو میں سردار پائندہ گل سے فارغ ہوا تو اگلی صبح ہی' جہانگیر کے گھر پر شیدا خونی مجھ سے آٹکرایا۔ یہ میری خوش قسمتی اور اس کی بدبختی تھی کہ وہ مجھے نہیں پہچانتا تھا۔ مجھے جہانگیر سمجھتے ہوئے اس نے جو بات چیت کی' وہ مجھے حیران کرنے کے لیے کافی تھی۔ وہ ڈون کوانگ فو کے ایک آدمی کی نگرانی میں' مجھے ڈھونڈتا ہوا جہانگیر کے گھر آپہنچا تھا لیکن میرے ستارے یاور تھے۔ وہ میرے ہاتھوں اپنی زبان کٹوا کر فرار ہوا تو میرے ذہن پر ڈون کوانگ فو کے آدمیوں سے نمٹنے کا جنون اس حد تک سوار ہوچکا تھا کہ میں عارضی طور پر سردار پائندہ گل اور اس کی طرف سے لاحق خطرات کو یکسر فراموش کر بیٹھا تھا۔

ان حالات میں ہم چاروں کو گہری نیند کی حالت میں بے ہوش کرکے اغوا کیا گیا تو ہوش میں آنے کے بعد ہم سب کے ذہنوں میں ڈون کوانگ فو کے آدمیوں کی جوابی کارروائی کا خوف گھسا ہوا تھا اور ہم چاروں اسی ایک راہ پر سوچ رہے تھے۔ اگر اس قافلے نے راستے میں پڑاؤ نہ کیا ہوتا تو شاید آخر تک بھی ہماری وہ سنگین غلط فہمی دور نہ ہوپاتی کہ ہم مکاؤ کے ڈون کے قیدی تھے۔

حالات کے حیرت ناک تسلسل نے ہمیں اس غلط فہمی میں مبتلا کیا تھا اور پھر وہ غلط فہمی اچانک ہی دور ہوئی تھی۔ اس وقت صورت حال بہت پیچیدہ تھی اور ہمیں ان لوگوں کے آہنی چنگل سے نجات ملنے کی کوئی امید نظر نہیں آرہی تھی۔ شنگارا ویلی کا سفر ہمارے لیے نوشتۂ دیوار بنتا محسوس ہورہا تھا اور ایک بار ہم ان سنگلاخ پہاڑوں میں سردار پائندہ گل کی قید میں پہنچ جاتے تو وہاں سے آزادی حاصل کرنا آسان کام ثابت نہ ہوتا۔

اپنے فلیٹ سے اغوا کیے جانے کے بعد ہم چاروں قلیل وقفوں کے لیے ہوش میں آئے تھے۔ اس دوران میں بھوک اور بے ہوشی کے انجکشن کے اثرات کی وجہ سے ہم کسی بات پر اپنی توجہ مرکوز نہیں کرسکے تھے۔ سب سے بڑھ کر خرابی یہ تھی کہ ہم خود کو ڈون کوانگ فو کے آدمیوں کی قید میں سمجھ رہے تھے۔ یہ راز پچھلے پڑاؤ پر ہی فاش ہوا تھا کہ ہمیں قید کرنے والے دوسرے لوگ تھے اور اسی طرح ان کی منزل بھی کچھ اور تھی۔ اس بارے میں میرا ذہن بدترین اُلجھاؤ کا شکار ہوچکا تھا۔ سردار پائندہ گل اگر میری طرف سے بھڑک ہی اٹھا تھا تو اس کے لیے آسان راہ یہ ہوتی کہ وہ اپنے کسی آدمی کے ذریعے مجھے کراچی ہی میں ٹھکانے لگوا دیتا۔ ہمارے چار نفری جلوس کو اغوا کرکے' پوری حفاظت اور احتیاط کے ساتھ سرحد پار' پہاڑوں میں لے جانا بہت کٹھن کام تھا اگر اس نے صرف مجھے یا ہم چاروں کو شنگارا ویلی بُلا کر' اپنے قبیلے کے لوگوں کے سامنے قتل کرنے کا فیصلہ کیا تھا تو اس کا سنکی پن ہر شک و شبے سے بالاتر تھا اور اگر وہ ہمیں اس وادی میں قید کرکے اپنا کوئی مقصد حاصل کرنا چاہتا تھا تو میں وہ مقصد سمجھنے سے قاصر تھا۔

ہم سب بے دست و پا تھے۔ عبدل ہمارے سروں پر مسلط تھا۔ ہم اپنی فوری آزادی کے لیے جو بھی منصوبہ بناتے' اس کی کامیابی کے لیے عبدل کو جسمانی نقصان پہنچا کر بے بس کرنا ناگزیر ہوتا لیکن اس معاملے پر ہم اس کے سامنے تبادلۂ خیال نہیں کرسکتے تھے۔ مجھے پورا یقین تھا کہ ہم میں سے ہر ایک اس وقت عبداللہ سے نجات حاصل کرنے کی ترکیبوں پر غور کررہا ہوگا لیکن اس انفرادی

غور و فکر کا نتیجہ صفر سے زیادہ نہیں ہو سکتا تھا۔

"تم لوگ تو خاموش ہی ہو گئے" ایک ڈیڑھ منٹ کے انتظار کے بعد عبدل ہمارے سکوت سے بوکھلا کر بول پڑا۔ "میں وعدہ کر چکا ہوں کہ اب تمہاری باتوں میں دخل نہیں دوں گا۔"

"اتنا بڑا دعویٰ نہ کرو" میں نے دھیمی آواز میں کہا "میں اپنے بارے میں یہ کہہ سکتا ہوں کہ میں نے زبان کھولی تو تم ایک لمحے کے لیے بھی خود پر قابو نہیں رکھ سکو گے اور دخل انداز ہو بیٹھو گے۔"

"اوہ!" اس کی غراتی ہوئی آواز اُبھری "تو تم مجھے نقصان پہنچانے کی منصوبہ بندی کر رہے ہو؟"

"تم بلاوجہ غصہ نہ کرو۔ ہم مجبور قیدی تمہیں کیا نقصان پہنچا سکتے ہیں؟" میں نے اس کے بھڑنے سے پہلے ہی نرمی کے ساتھ وضاحت کرنی شروع کر دی "دراصل میں یہ سوچ رہا تھا کہ دس، پندرہ منٹ بعد بے ہوش ہو کر ہم سب ناکارہ ہو جائیں گے۔ اپنی آزادی کے لیے اس سے پہلے ہی کچھ کیا جا سکتا ہے۔ ہم جو قدم بھی اُٹھانا چاہیں گے، اس کے لیے تمہارا تعاون یا پھر بے بس کیا جانا ضروری ہو گا۔ یہ ہمارے بس سے باہر کی بات ہے۔ اس کا ذکر کر کے ہم تمہاری زبانی ہمدردی سے بھی محروم ہو سکتے ہیں۔ اس لیے خاموشی ہی بہتر ہے۔"

اندھیرے میں اس کی ہلکی سی پُر غرور ہنسی سنائی دی پھر وہ بولا "تم مجھ سے ڈر رہے ہو۔ میں سمجھا کہ تم مجھ سے ٹکرانے کے لیے پَر تول رہے ہو۔"

"ہمارے پَر تو پہلے ہی قینچ کر دیئے گئے ہیں" اس بار ایک گہرے سانس کے بعد ویرا کی حسرت زدہ آواز ابھری۔ "بندھے ہوئے ہاتھ پیروں کے ساتھ ہم کیا کر سکتے ہیں؟ تم بہت آسانی کے ساتھ ہمیں رگید کر رکھ دو گے؟"

"ان لوگوں کی اور بات ہے۔ میں تمہارے ساتھ ایسی زیادتی نہیں کر سکتا" ویرا کی پُر تشویش آواز سنتے ہی عبدل کی آواز میں ندیدہ پن اُتر آیا "تم جیسی نازک اور خوب صورت میم کو تو کشتی لڑ کر ہرانے میں لطف آئے گا۔ میں نے گوری عورتوں اور مردوں کی ریسلنگ کی کئی فلمیں دیکھی ہیں۔ میں وعدہ کرتا ہوں کہ میرا تم سے ایسا مقابلہ ہوا تو میں کسی کو تمہارے اوپر گولی نہیں چلانے دوں گا۔ تمہیں اپنے داؤ سے ماروں گا۔"

"بے ہوشی کی حالت میں، جانوروں کی طرح سفر کرنے سے تو یہ بہتر ہو گا کہ تم ابھی اپنے دل کی بھڑاس نکال لو۔" ویرا نے اپنے لب و لہجے میں سخت بیزاری پیدا کر کے اسے اُکسانے کی کوشش کی "میں ایک امن پسند عورت ہوں۔ میرا ان جھگڑے جھمیلوں سے کوئی واسطہ نہیں ہے۔ ڈینی کے دشمنوں کو اس سے نمٹنا چاہیے۔ مجھے پرائی آگ کا ایندھن کیوں بنایا جا رہا ہے؟"

"تم صبر سے کام لو۔ میں تمہارے بارے میں صندل خان سے بات کروں گا۔"

"پھر وہی صندل خان اور پائندہ خان!" ویرا نے اپنی بے ساختہ صداکاری میں جھلاہٹ کے سارے جوہر بکھیر دیے اور اونچی آواز میں بولی "اس وقت تم ہم چاروں کے مالک اور مختار ہو، تمہیں فیصلہ کرنا چاہیے۔ ان تینوں کی ہڈیاں بھی توڑ دو تو مجھے کوئی اعتراض نہیں ہو گا مگر یہ غیر انسانی سلوک میرے لیے ناقابل برداشت ہے۔ ابھی اور اسی وقت میرے ہاتھ پیر کھولو یا مجھے ڈبل ڈوز کا انجکشن لگا کر ابھی ختم کر دو۔ میں اس طرح سسک سسک کر جینا نہیں چاہتی۔ میں سمجھ لوں گی کہ میرے باپ کے سارے ہم وطن ایسے ہی ذلیل اور خود غرض ہوتے ہیں جو مہمان عورتوں کی قدر بھی کرنی نہیں جانتے" ویرا نے اپنی وہ جذباتی تقریر ختم کر کے دھیمی آواز میں رونا شروع کر دیا اور عبدل شاید بوکھلاہٹ میں اس کے قریب پہنچ گیا۔

"تم میری پوزیشن سمجھنے کی کوشش کرو" عبدل مدافعانہ انداز میں اسے سمجھا رہا تھا۔ "میں کچھ بھی نہیں کر سکتا۔ وہ لوگ میری چمڑی گرا دیں گے۔ لیکن تم نے ابھی ابھی اپنے باپ کے بارے میں کیا کہا تھا؟ وہ بات میرے پلّے نہیں پڑی۔ ذرا اسے دوبارہ دُہرا دو۔ یقین نہیں آتا کہ تمہارے خون میں پاکستانی ملاوٹ بھی ہو سکتی ہے۔"

"میرا باپ پاکستانی اور ماں امریکن تھی" ویرا دبی دبی سسکیوں کے درمیان بولی "میرا باپ ایک نیک آدمی تھا۔ میں یہاں والوں کو اس جیسا سمجھ کر پاکستان آئی تھی لیکن تم سب نے مجھے مایوس کیا ہے۔ سب کو اپنی اپنی فکر پڑی ہوئی ہے۔ کسی کو یہ شرمندگی نہیں ہے کہ میں بلاوجہ اس چکر میں پھانس لی گئی ہوں۔"

"میں تمہارے لیے باپ تو نہیں بن سکتا لیکن بہترین دوست ضرور بن سکتا ہوں" بوکھلاہٹ کے عالم میں بھی عبدل نے کار آمد رشتہ اپناتے ہوئے، بے فیض رشتے سے انکار کر دیا "پہلا موقع میسر آتے ہی، میں ان لوگوں سے تم کو رعایتیں دلوانے کی کوشش کروں گا۔ میں انہیں پہلے ہی بتا چکا ہوں کہ تم گُردوں کی مریضہ ہو۔ میرا خیال ہے کہ تم جیسی بے ضرر سی عورت کو وہ آزادی کے ساتھ سفر کرنے کی اجازت دینے پر آمادہ ہو جائیں گے۔ ضرورت پیش آئی تو میں تمہاری نگرانی کی ذمّے داری اپنے سر لے لوں گا۔"

"پھر وہی رعایتیں؟" ویرا کی آواز میں جھلاہٹ اور بے بسی نمایاں تھی "تم یہ کیوں نہیں سوچتے کہ میں کوئی مجرم نہیں ہوں جو مجھے صرف رعایتیں دلوا کر ٹرخانے کی کوشش کی جائے۔ آزادی میرا حق ہے، تم ان سے کیوں نہیں کہتے کہ وہ کم از کم مجھے آزاد کر دیں۔ اس معاملے سے میرا کیا تعلق ہے؟"

"اچھا، اچھا! میں کوشش کروں گا۔" تیز تیز سانسوں کے درمیان میں عبدل کی آواز سنائی دی "ماننا یا نہ ماننا ان کے اختیار میں ہے مگر میں بات ضرور کروں گا۔"

"اوہ!" ویرا کی اضطراری آواز اُبھری "ان سے بات کر لینا لیکن میرے اوپر کیوں چڑھے آ رہے ہو؟ ذرا دور ہو کر بیٹھو۔ تمہارے گرم گرم سانسوں سے میری گردن کی جلد جلی جا رہی ہے۔"

"معاف کرنا" عبدل کی آواز سخت کھسیائی ہوئی اور خفت آمیز تھی۔ "اندھیرے میں اندازہ ہی نہیں ہو سکا کہ میں باتیں کرتے کرتے تمہارے اتنے نزدیک پہنچ گیا ہوں۔"

"اندھیرے میں سب سے بڑی یہی خرابی ہوتی ہے کہ کسی بات کا پتا نہیں چلتا" میں نے ویرا کی بے زاری اور جھلاہٹ کا اندازہ لگایا، وہ کہہ رہی تھی "تمہاری انگلیاں میرے بازو میں چبھ رہی ہیں۔ اب ذرا میرا بازو بھی چھوڑ دو تو تمہاری بہت مہربانی ہو گی۔ تم لوگ تو عورتوں کو چھونے چھانے میں اتنے آزاد خیال نہیں ہوتے۔"

عبدل کی غصیلی غراہٹ کے ساتھ کسی کے لڑھکنے کی سی آواز پیدا ہوئی۔ شاید ویرا اسے اپنے جال میں پھانس لینے کی امید میں اسے ناروا ڈھیل دیتی رہی تھی۔ ولی کی طرح عبدل کے دل و دماغ پر بھی اس میم کے حسن و جمال کا بھوت سوار تھا۔ وہ احمق ویرا کی مصلحت آمیز خاموشی کو اس کی دعوت آمیز رضامندی تصور کرتے ہوئے، اس سے کسی جونک کی طرح چمٹ کر بیٹھ گیا تھا۔ ویرا نے جب اچھی طرح یہ اندازہ لگا لیا کہ عبدل کسی بھی طرح اس کے ڈھب پر آنے والا نہیں تھا تو اس نے رکھائی کے ساتھ اسے اپنے وجود سے الگ ہو کر بیٹھنے اور جوش کے ساتھ دبوچے ہوئے بازو کو آزاد کرنے کے مشورے دے کر شرمندہ کر دیا۔ اندھیرے میں اپنے کھلائے ہوئے گلُوں کا بھانڈا پھوٹنے پر عبدل نے برہمی کے عالم میں ویرا کو دھکا دے دیا تھا اور وہ متحرک ٹرک کے آہنی فرش پر کسی گٹھری کی طرح لڑھک کر رہ گئی تھی۔

"سالی بازو پکڑنے کا الزام لگا رہی ہے" عبدل اپنی جھینپ مٹانے کے لیے اس پر برس پڑا "میں آرام سے سمجھا کر بات کر رہا تھا اور تو الزام تراشی پر اُتر آئی۔ ولایت میں سالیاں ہر وقت مردوں میں پھنسی رہتی ہیں اور یہاں پاکیزہ خانم بنتی ہیں!"

"تم بلاوجہ ناراض ہو رہے ہو، عبدل ڈارلنگ!" اسے ایک بدترین ذہنی جھٹکا لگانے کے بعد ویرا فوراً ہی سنبھل گئی۔ "مجھے تمہارے کسی رویّے سے شکایت ہے، نہ میں نے تم پر الزام تراشی کی ہے۔ شاید تمہیں اندازہ نہیں ہو سکا کہ تم نے بے دھیانی میں میرا بازو کتنی طاقت سے بھینچ لیا تھا۔ تم چاہو تو اپنی ٹارچ روشن کر کے میری جلد پر نیل کا نشان بھی دیکھ سکتے ہو۔ تم دوبارہ میرے قریب بیٹھ جاؤ۔ میں کوئی اعتراض نہیں کروں گی۔"

ویرا ایسے معاملات میں مردوں کی نفسیات کو بہت اچھی طرح سمجھتی تھی۔ اسے بخوبی اندازہ تھا کہ ناند پر منہ مارنے والے سانڈ کے جبڑے پر ایک بار ڈنڈا بجا دیا جائے تو وہ دوبارہ پچکارنے کے باوجود چارے سے بھری ہوئی اس ناند کا رخ نہیں کرتا جو اس کی ذلت کا سبب بنی تھی۔

"تم منہ لگانے کے قابل نہیں ہو" عبدل قدرے ٹھنڈا ہونے کے باوجود برہم تھا۔ "سردار پائندہ گل نے کچھ دیکھ کر ہی تمہیں اغوا کرایا ہو گا۔ اب تو میں پیغا سرائے میں تمہاری آخری مزاج پرسی کروں گا۔"

"یہ پیغا سرائے کیا بلا ہے؟ کیا ہمیں شنگارا ویلی نہیں لے جایا جا رہا؟" ویرا نے تعجب سے پوچھا۔

"پیغا سرائے؟" اس نے استہزائیہ لہجے میں دُہرایا "تمہاری بدتمیزی کا جواب تو یہ ہے کہ تمہاری کسی بات کا بھی جواب نہ دیا جائے مگر میں اتنا بے مروت نہیں ہوں کہ تم سے ایک دم آنکھیں پھیر لوں۔ درۂ خیبر کے راستے طورخم کی سرحد پار کرنے کے بعد ہم جلال آباد تک سیدھے جائیں گے۔ دریائے کنار اور دریائے کابل کے سنگم سے بیس، پچیس میل آگے ہم دریائے کابل کو عبور کر کے دریائے کنار کے ساتھ ساتھ، سڑک پر سفر کرتے ہوئے پیغا سرائے پہنچ جائیں گے۔ وہاں سے سڑک واما کی طرف مڑ جاتی ہے۔ وہاں سے شنگارا ویلی تک کا پینتالیس میل کا سفر صرف طاقت ور جیپ میں ہی طے کیا جا سکتا ہے۔ ٹرک کا سفر پیغا سرائے پر ختم ہو جائے گا۔"

"شاید پیغا سرائے پر ہمیں ٹرک سے اتار کر لینڈ کروزر پر سوار کرا دیا جائے گا؟" میں نے پوچھا۔

"قیدیوں کے لیے سردار پائندہ گل کے آدمی پہاڑوں میں پیدل نہیں چلیں گے" اس کی آواز دوبارہ تلخ ہو گئی "ایک بار تم پیغا سرائے پہنچ گئے تو پھر تم ہوش میں رہتے ہوئے بھی ان کی نگاہوں سے اوجھل نہیں ہو سکو گے۔ وہ تم سب کو مویشیوں کے ریوڑ کی طرح ہانکتے ہوئے شنگارا ویلی کی بلندیوں کی طرف لے جائیں گے۔"

اس کے لہجے میں لوٹنے والی تلخی کو محسوس کرتے ہی، میں نے سختی کے ساتھ اپنی زبان بند رکھنے کا فیصلہ کر لیا۔ وہ ہم تینوں کی آواز سے چڑ رہا تھا۔ جب کہ ویرا کے معاملے میں وہ "گالیاں کھا کے بے مزہ نہ ہوا" کی عملی تفسیر بنا ہوا تھا۔ ویرا سے اپنی ڈھکی چھپی بے عزتی کروانے کے باوجود، وہ کسی بھلی گھڑی کی اُمید میں اس کے ساتھ اپنی برہمی کو بھولنے پر آمادہ تھا اور پھر ایک اور ہی خیال نے مجھے لرزا کر رکھ دیا۔

اغوا کیے جانے کے بعد سے ہم سب مسلسل ایک سے زیادہ افراد کی نگرانی میں رہے تھے۔ غزالہ اور ویرا کے ساتھ کوئی چھیڑ چھاڑ نہ ہونے پر ہم سب نے ان لوگوں کی اصول پرستی اور صرف کام سے لگن کی تعریف کی تھی لیکن اس وقت مجھے خیال آ رہا تھا کہ وہ سب فرشتہ صفت نہیں تھے۔ ان کے دلوں میں بھی بھیڑیے اور ہوسناک درندے چھپے ہوئے تھے جو صرف ایک دوسرے کے خوف سے اپنے اپنے خول میں دبکے ہوئے تھے لیکن تیزی سے سفر کرتے ہوئے ٹرک کے اس حصے میں ہم صرف اور صرف عبدل کے رحم

دکرم پر تھے۔ شاید یہ اسی مطلق العنانی کا گھمنڈ تھا کہ وہ ویرا کے ساتھ خطرناک حد تک بے تکلف ہونے کی کوشش کررہا تھا۔ اس وقت اس کے خلاف کوئی گواہ نہیں تھا۔

ویرا سے جھاڑ کھانے کے بعد وہ فوری طور پر بہت مشتعل ضرور ہوا تھا لیکن پھر اس کے لب ولہجے میں نرمی آگئی تھی۔ وہ ہم تینوں کو بے ہوش کرنے کے بعد ویرا کو بہ آسانی زیادتی کا نشانہ بنا سکتا تھا۔ ویرا ناقابلِ برداشت مزاحمت کا مظاہرہ کرتی تو وہ اسے بھی بے ہوش کردیتا۔ ہم چاروں کی گہری بے ہوشی کے بعد اس کے اندر کا حیوان ایک نئی طاقت اور بربریت کے ساتھ بیدار ہوسکتا تھا۔ اس عالم میں عبدل' ویرا کے ساتھ غزالہ کے لیے بھی بھیانک خطرہ ثابت ہوسکتا تھا۔ اگر اس کے ذہن پر شیطان سوار ہوجاتا تو وہ ہماری بے ہوشی کے دوران ہی اپنی من مانی کرسکتا تھا۔ اس کی ایسی حرکت کا امکان روشن تھا۔ میری نگاہ میں آبرو کا گوہرِ آب دار ایک بار داغ دار ہوجائے تو مجرم کو ہزار بار سنگ سار کرکے بھی اس موتی کو اس کی اصل چمک دمک نہیں لوٹائی جاسکتی۔ ویرا ایسے حادثات کی عادی تھی۔ وہ ہر بار اپنے بدن کی دھول جھاڑ کر اپنے ناز کو برقرار رکھتی تھی لیکن غزالہ کا معاملہ اس سے یکسر مختلف تھا۔ اس پر بعد کی آہ وفغاں بے سود ہوتی۔ وہ خود ہی پہاڑوں کی کسی چوٹی سے کسی اندھی گھاٹی میں چھلانگ لگا کر اپنے دشمن کے پیچھے روانہ ہوجاتی۔

وہ خیال میرے لیے سوہانِ روح بن کر رہ گیا۔ وقت تیزی سے گزر رہا تھا۔ انجکشن لگائے جانے کا وقت قریب سے قریب تر آتا جارہا تھا۔ عبدل ایک دردناک بوجھ بن کر ہمارے اوپر مسلط تھا۔ ہر گزرتے ہوئے لمحے کے ساتھ' اس خیال کی چبھن مزید گہری ہوتی جارہی تھی لیکن مجھے اس سے نجات کی کوئی راہ نہیں سوجھ رہی تھی کیونکہ عبدل مجھ سے سیدھے منہ بات کرنے پر بھی آمادہ نہیں تھا۔

مجھے کچھ نہیں معلوم کہ میرے ذہن میں کیا رو اُبھری کہ میں نے اچانک ہی اضطراری انداز میں اپنے حلق سے خرخراہٹ کی دھیمی مگر خوفناک آوازیں پیدا کرنی شروع کردیں۔ فوراً ہی تاریک فضا میں چار تحیّر زدہ اور استفسار طلب آوازیں ابھریں۔ ان میں عبدل کی گھبرائی ہوئی آواز بھی شامل تھی۔ شاید ان چاروں نے ہی اندازہ لگالیا کہ ان کی آوازوں میں میری آواز شامل نہیں تھی لیکن ویرا کے علاوہ کوئی اس معاملے کی تہ کو نہیں پہنچ سکا۔

"اوہ! شاید ڈینی کو مرگی کا دورہ پڑگیا!" ویرا کی بے ساختہ آواز میں ایسی لرزش تھی جیسے وہ میرے اس روگ سے یقینی طور پر واقف رہی ہو "جلدی اس کی خبرلو۔ وہ تو بندھا ہوا ہے۔"

وہ سب پے درپے واقعات چند سیکنڈ کی قلیل سی مدت میں رونما ہوتے چلے گئے اور میں دل ہی دل میں ویرا کی ذہانت کا اعتراف کیے بغیر نہ رہ سکا۔ اس نے میری طرف سے کسی سازش کی پہلی علامت ظاہر ہوتے ہی نہایت ہوشیاری کے ساتھ مجھے اس طرح ایک راہ سُجھادی تھی کہ عبدل کے فرشتوں کو بھی اس کے بے ساختہ تبصروں پر کوئی شبہ نہیں ہوسکا تھا۔

میں مرگی کے مرض اور اس کی علامات سے بالکل بے خبر تو ویرا سے اشارہ ملتے ہی میں نے ایک سیکنڈ کے ہزارویں حصے پر اپنے ذہن پر زور ڈالا تو مجھے سنی سنائی دو باتیں یاد آگئیں کہ مریض کے بدن پر تشنج طاری ہوجاتا ہے اور عام طور پر اس کی زبان دانتوں کے درمیان دب جاتی ہے۔ وہ دو باتیں یاد آتے ہی' میں نے آؤ دیکھا نہ تاؤ' اپنی زبان دہانے سے قدرے باہر نکال کر اپنے دانتوں میں دبائی اور اپنے دھڑ کو پورے زور سے' ٹرک کے آہنی فرش پر گرادیا۔ اس بار غزالہ اور سلطان شاہ کی غم ناک آوازیں قابلِ رحم تھیں۔

عبدل نے جتنی دیر میں ٹارچ روشن کی' میں اپنی کارروائی خاصی آگے بڑھا چکا تھا۔ مجھے صحیح اندازہ تو نہیں تھا لیکن میں نے حتی الامکان حد تک اپنا چہرہ مسخ کرلیا تھا۔ زبان پہلے ہی دانتوں میں دبالی تھی۔ دائیں پہلو کے بل گرے ہوئے جسم پر ہلکا سا تشنج بھی طاری کرلیا تھا اور ارادہ تھا کہ قلیل سے وقفوں سے ذرا تیز جھرجھریاں بھی لیتا رہوں گا تاکہ عبدل کی بدحواسی میں خاطر خواہ اضافہ ہوسکے۔

"اس کا تو چہرہ ہی بگڑ گیا ہے۔ یہ مرنے کے قریب معلوم ہوتا ہے" میرے چہرے پر روشنی ڈالتے ہی عبدل ہذیانی آواز میں بول پڑا "مرگی کے دورے میں ایسی خراب حالت' میں نے کبھی...."

"فوراً اس کے ہاتھ پیر کھول دو" ویرا اس کی بات کاٹ کر تیزی سے بولی "مرگی کا دورہ دم گھٹنے سے پڑتا ہے۔ اسے ہاتھ پیر پھیلا کر آزادی سے سانس لینے کا موقع نہ ملا تو یہ دیکھتے ہی دیکھتے مرجائے گا اور ہم سب سردار پائندہ گل کے عتاب میں آجائیں گے۔"

"مرتا ہے تو مرنے دو۔ میں اجازت کے بغیر اس کے ہاتھ پیر نہیں کھول سکتا۔ میں نے اسے مارا پیٹا ہے جو سردار پائندہ گل مجھ سے ناراض ہوجائے گا؟" اس نے ایک لحظے کی خاموشی کے بعد کہا۔

میں نے ایک تیز جھرجھری لی اور ویرا بول پڑی "وہ دیکھو۔ دیکھو.... شاید اس کا دم نکل رہا ہے۔ تم بھول رہے ہو کہ سردار پائندہ گل کا اصل مجرم یہی ہے۔ اسی کی وجہ سے سردار نے اتنا لمبا چکر چلایا ہے اور ہم تینوں بھی مصیبت میں پڑے ہیں۔ اگر یہ مرگیا تو سردار اپنا سارا غصہ ہم پر نکالے گا۔ تم بھی اس کے عتاب سے محفوظ نہیں رہوگے۔ میرا کام مشورہ دینا تھا' وہ میں نے دے دیا۔ اب تمہاری مرضی ہے کہ خود فیصلہ کرو یا ٹرک رکواؤ۔"

مجھے حیرت ہوئی کہ ویرا کی طرف سے میرا دم نکلنے کے اعلان پر غزالہ نے اس پر برسنے کی حماقت نہیں کی۔ ٹارچ کی تیز روشنی کی وجہ سے وہ تنگ سی جگہ روشنی سے بھرگئی تھی اور وہ سب ہی ایک دوسرے کو دیکھ سکتے تھے۔ عبدل میری طرف متوجہ تھا۔ شاید ویرا نے اس کی آنکھ بچا کر غزالہ کو خاموش رہنے کا کوئی مؤثر اشارہ دے دیا تھا۔ میری طرح ویرا بھی بدترین حالات میں صورتِ حال کو قابو میں رکھنے کے فن میں طاق تھی۔

عبدل چند ثانیوں تک خاموش رہا۔ شاید وہ تذبذب میں مبتلا ہوگیا تھا۔ میری بروقت جھرجھری اور پھر ویرا کے وضاحتی بیان نے اس کا ذہن ماؤف کرکے رکھ دیا تھا۔

"مجھے معلوم ہے کہ تم سردار کے آدمیوں سے ڈرے ہوئے ہو" ویرا نے اسے خاموش پاکر اس کی انا پر ایک کاری ضرب لگائی "تم اپنے طور پر صحیح یا غلط ہونے کا فیصلہ بھی نہیں کرسکتے۔ میری مانو تو ٹرک رکوا کر صندل خان یا اس کے کسی آدمی کو بُلالو۔ وہ بتادے گا کہ ڈینی کا زندہ حالت میں سردار کے سامنے پہنچایا جانا کس قدر ضروری ہے۔ اس طرح تم ذمے داری سے صاف بچ جاؤگے۔"

وہاں کھڑا ہونے کی جگہ نہیں تھی۔ عبدل نے اپنے پیر گھما کر اپنے جوتے کی نوک سے میرا چہرہ ہلانے کی کوشش کی تو غزالہ سے ضبط نہ ہوسکا اور وہ غراتے ہوئے بولی "ہوش میں رہو۔ ایک بیمار آدمی کے ساتھ ایسی حرکت کرتے ہوئے تمہیں شرم آنی چاہیے۔ یہ ہم سب کے لیے...."

"دو مُردوں کے درمیان شرم وحیا والی کوئی بات نہیں ہوتی" وہ تلخی سے بولا "میں اس کا علاج کررہا ہوں۔ اس کا مرض ہی اتنا خبیث ہے کہ دورہ جوتا سنگھانے سے ختم ہوتا ہے۔"

"جہالت کی باتیں مت کرو" اس بار ویرا برس پڑی "کھلی ہوا اور بدن کو مکمل آرام دیے بغیر کچھ نہیں ہوسکتا۔ اگر تم اس منحوس جگہ کی گھٹن دور نہیں کرسکتے تو اسے آزاد تو کرسکتے ہو؟"

وہ چند ثانیوں تک اپنا جوتا میرے دہانے اور ناک کے قریب ہلاتا رہا مگر میری حالت میں کوئی فرق نہیں آیا۔

"اس کا دورہ کچھ لمبا ہی ہوگیا ہے" آخر کار عبدل کے ہونٹوں سے پُرتشویش بڑبڑاہٹ آزاد ہوئی "بس میں اس کے ہاتھ کھولے دیتا ہوں تاکہ سینے کا کھچاؤ کم ہوسکے۔ اس کے بعد بھی یہ مرتا ہے تو میری طرف سے جہنم میں جائے۔ میں اسے زندہ رکھنے کا ٹھیکے دار نہیں ہوں۔"

وہ ٹرک کے فرش پر بیٹھے بیٹھے' میری پشت کی طرف آیا تو میں نے ارادہ کیا کہ اپنے ہاتھوں کو رسی کی سخت بندش سے نجات ملتے ہی اسے جکڑلوں لیکن مجھے فوراً ہی اندازہ ہوگیا کہ پیچھے کی طرف مڑا اور بدن کے بوجھ میں دبا ہوا' میرا داہنا بازو فوری طور پر نقل وحرکت کے قابل نہیں ہوسکتا تھا۔ عبدل نے گرہیں کھولنے کے لیے میری کلائیوں کو جنبش دی تو میرے داہنے بازو میں درد کی ہلکی ہلکی ٹیسیں شروع ہوگئیں۔ شاید میں نے ٹرک کے فرش پر گرنے میں زیادہ ہی جوش سے کام لیا تھا جس کے نتیجے میں کسی رگ یا پٹھے پر ضرب آگئی تھی۔

میں نے فوری طور پر عبدل سے بھڑ جانے کا ارادہ ملتوی کردیا۔ جوں ہی میری کلائیوں کو رسی کی بے رحمانہ بندشوں سے نجات ملی' میں نے تیز آوازوں کے ساتھ اپنے منہ سے سانس لیتے ہوئے ایک جھرجھری لے کر اپنے جسم کو سیدھا کرلیا۔ مجھے غیر متوقع طور پر حرکت میں آتا ہوا دیکھ کر عبدل کے منہ سے ایک اضطراری مگر بے معنی آواز پیدا ہوئی اور وہ خوف زدہ ہوکر عقبی دیوار سے جا ٹکرایا کیونکہ ادھر سے دھماکے کی ہلکی سی آواز سنائی دی تھی۔

میں آہنی فرش پر چت لیٹا ہوا تھا۔ زبان بدستور دانتوں میں دبی ہوئی تھی اور چہرے کے نقوش بھی میں نے مسخ کیے ہوئے تھے۔ جسم کو سیدھا کرنے کی کوشش میں میری گردن اسی طرف ڈھلک گئی تھی جدھر میرے تینوں ساتھی موجود تھے۔ میں نے اپنی ایک آنکھ میں خفیف سی جھری پیدا کی تو ان تینوں کے چہرے تاریک اور پُرتشویش نظر آئے۔ پھر غزالہ نے اپنی جگہ سے میری طرف سرکنے کی کوشش ہی کی تھی کہ عبدل کی تیز آواز گونج اٹھی "نہیں' تم میں سے کوئی اس کے قریب نہیں آئے گا۔ انجکشن کا وقت ہوچکا ہے۔ اب میں باری باری تم کو بے ہوش کردوں گا۔ ڈینی کے ہوش میں آنے کا انتظار کیا جائے گا۔"

وہ میرے پیروں کی طرف سے سرکتا ہوا' ان تینوں کے قریب پہنچ گیا۔

ویرا نے احتجاج کیا کہ میری حالت سنبھلنے تک ان لوگوں کو انجکشن لگانے کا پروگرام ملتوی رکھا جائے لیکن عبدل نے اس کی ایک نہ سُنی اور ٹارچ کی روشنی میں پہلی سرنج تیار کرکے دوا ویرا کے بازو میں اُتار دی۔ وہ لحظہ بھر میں اپنی جگہ پر ڈھیر ہوگئی۔

ویرا کا انجام دیکھ لینے کے بعد غزالہ اور سلطان شاہ نے اندازہ لگالیا تھا کہ عبدل کے ساتھ مغز زنی کرنے کا کوئی فائدہ نہیں تھا۔ میرے بارے میں کئی ذہنی جھٹکوں سے دوچار ہونے کے بعد وہ کوئی نئی مصیبت مول نہیں لینا چاہتا تھا۔ اس سے پہلے کہ وہ دوسری سرنج تیار کرتا' وہ دونوں آہنی فرش پر اپنی جگہ بنا کر دراز ہوگئے۔

ان دونوں کو بے ہوش کردینے کے بعد عبدل سرک کر اس گوشے میں چلا گیا جہاں اس کا تھرماس رکھا ہوا تھا۔ اس دوران میں اس نے ایک لمحے کے لیے بھی مجھے اپنی نظروں سے اوجھل نہیں ہونے دیا تھا جب کہ میں اس گھات میں تھا کہ وہ میری طرف سے ذرا بھی غافل ہو تو میں اس پر ٹوٹ پڑوں۔ جب تک میرے ہاتھوں کو آزادی نہیں ملی تھی' میں پوری محنت اور لگن کے ساتھ دورے میں مبتلا مریض کی اداکاری کرتا رہا تھا لیکن ادھوری آزادی ملنے کے بعد مجھے اپنی زبان کو دانتوں میں دبائے رکھنا اور چہرے کو بگاڑے رکھنا دشوار معلوم ہونے لگا تھا۔ میں جلد از جلد اس حالت سے نجات حاصل کرنے کی فکر میں تھا۔

عبدل نے اپنی روشن ٹارچ فرش پر اس زاویے سے رکھ دی

کہ روشنی کی براہِ راست کرنیں میرے پیٹ پر آنے لگیں۔ اس صورت میں میرا چہرہ تیز روشنی سے محفوظ تھا اور میں اپنی داہنی آنکھ کی جھری سے عبدل کی نقل و حرکت کا بخوبی جائزہ لے سکتا تھا۔ اس نے ٹرک کی دیوار سے ٹیک لگا کر تھکے ہوئے انداز میں تھرماس سے گرم گرم چائے اس کے ڈھکن میں انڈیلی اور چائے نوشی میں مصروف ہوگیا۔

اس کے ساتھ فیصلہ کن زور آزمائی کے لیے میرے پاس کافی وقت تھا۔ اس نے ان تینوں کو انجکشن لگا کر بے ہوش کردیا تھا اور اگلا انجکشن پورے پانچ گھنٹے بعد لگایا جانا تھا۔ اس امر سے اس کے دوسرے ساتھی بھی بخوبی واقف تھے۔ اس کا مطلب تھا کہ کوئی ناگہانی رکاوٹ پیش نہ آتی تو اگلے چار، پانچ گھنٹوں سے پہلے ٹرک کے رکنے یا صورتِ حال میں تبدیلی رونما ہونے کے کوئی آثار نہیں تھے۔

عبدل نے چائے کی پیالی فرش پر رکھ کر سگریٹ سُلگائی تو دھوئیں کی مانوس بو نے مجھے بے چین کردیا۔

میں نے اپنی حالت سنبھلنے کی اداکاری کرتے ہوئے، ہولے سے کراہ کر اپنے بدن کو ڈھیلا چھوڑ دیا۔ اسی کے ساتھ دانتوں میں دبی ہوئی زبان کو آزاد کرکے دہانے میں سمیٹ لیا۔

میرے بدن کی پہلی ہی جنبش پر عبدل بھڑک اُٹھا اور اپنی چائے چھوڑ چھاڑ کر تیزی سے میرے قریب سرک آیا۔ اس بار وہ میری نگاہوں کی دسترس سے باہر میرے سرہانے آبیٹھا تھا۔

جسمانی طور پر وہ مجھ سے کم تر نہیں تو برتر بھی نہیں تھا۔ اسے صرف ایک فائدہ حاصل تھا کہ اس کے ہاتھ پیر بالکل آزاد تھے جبکہ میرے پیر بندھے ہوئے تھے لیکن ٹرک کے اس حصے کی اونچائی اتنی کم تھی کہ محاذ آرائی کی صورت میں وہاں قدموں کے استعمال کی گنجائش ہی نہیں تھی۔ ویسے بھی جگہ اتنی کم تھی کہ ہم دونوں ایک بار گتھم گتھا ہوجاتے تو وحشیانہ زور آزمائی کا آخری فیصلہ ہونے تک الگ ہونے کی نوبت ہی نہ آتی۔ مجھے اس مقابلے میں پہل کرنے کا فائدہ حاصل ہوتا جب کہ وہ بے خبری میں دھر لیا جاتا۔

میں ٹرک کے فرش پر بے حس و حرکت پڑا اس کی جسمانی پوزیشن کا اندازہ لگانے کی کوشش کرتا رہا۔ پھر اس کی شامت نے دھکا دیا اور اس نے میرے چہرے پر جھک کر ٹارچ کی تیز روشنی براہِ راست میری آنکھوں پر ڈال دی۔

پپوٹے بند ہونے کے باوجود وہ روشنی میرے لیے ناقابلِ برداشت تھی۔ میں نے اس کے گرم گرم سانسوں کا لمس اپنے چہرے پر محسوس کرتے ہی آنکھیں کھولنی چاہیں جو تیز روشنی سے چندھیا گئیں لیکن میں ان چند ثانیوں میں اس کی پوزیشن دیکھ چکا تھا۔ میں نے بجلی کی سی سرعت سے ہاتھ اٹھا کر اس کی گردن دبوچی اور پوری قوت سے اسے اپنے برابر میں گرالیا۔

عبدل کے حلق سے اضطراری غراہٹ کے بعد غلیظ گالیوں کا طوفان امڈ پڑا لیکن وہ پوری کوشش کے باوجود میری بے رحمانہ گرفت سے آزاد ہونے میں کامیاب نہیں ہوسکا اور میں نے اس کے اوپر سوار ہوکر اس کے چہرے کو اپنی ٹکروں کا نشانہ بنانا شروع کردیا۔ اس تنگ اور محدود جگہ میں وہ ایک ہولناک جنگ تھی۔ میرے تینوں ساتھی اس مقابلے میں کوئی کردار ادا کرنے سے قاصر تھے، آخری فیصلہ ہم دونوں کے زورِ بازو سے ہی ہونا تھا۔ میرے لیے وہ زندگی اور موت کا معاملہ تھا اس لیے جلد ہی عبدل کے ہاتھ پیر ڈھیلے پڑنے شروع ہوگئے۔ اس کے ہاتھ سے نکل کر ایک طرف گرنے والی ٹارچ بدستور روشن تھی۔ اس کا رخ مخالف سمت میں تھا لیکن میں اس کی پھیلائی ہوئی روشنی میں بخوبی دیکھ سکتا تھا کہ اس کا چہرہ کئی جگہ سے زخمی ہوچکا تھا۔ میرا ارادہ اسے ہلاک کرنے کا نہیں تھا اس لیے میں نے اس کی کنپٹیوں پر تابڑتوڑ کئی مُکے رسید کیے اور آخر اس کی ساری مزاحمت دم توڑ گئی۔ میں اس سے الگ ہوا تو اس کا جسم ساکت ہوچکا تھا۔

میں نے تیزی کے ساتھ اس کی جیبوں کی تلاشی لی تو سرنج اور بے ہوشی کے محلول کی شیشی کے علاوہ ایک بھرا ہوا اعشاریہ دو دو کا پستول بھی برآمد ہوا۔ اس کے علاوہ رقم سے بھرا ہوا بٹوا تھا جو میں نے تلاشی مکمل کرنے کے بعد اس کی جیب میں واپس رکھ دیا۔

میں نے اپنی اضطراری چیخ سے جس ڈرامے کا آغاز کیا تھا، ویرانے مجھے مرگی کے دورے کی اداکاری شروع کرنے کا اشارہ دے کر اس میں ایک نیا رنگ بھر دیا تھا۔ میں نے جو کچھ کیا اس کے آخری نتائج کے بارے میں میرا ذہن واضح نہیں تھا۔ دوسری طرف ویرا بے ہوش تھی۔ مجھے یہ بھی نہیں معلوم تھا کہ وہ عبدل کو دھوکے میں مبتلا کرکے کس قسم کے نتائج حاصل کرنا چاہتی تھی۔ اس وقت میرے پاس زیادہ وقت نہیں تھا۔ ضربات کے نتیجے میں طاری ہونے والی بے ہوشی کسی بھی لمحے ختم ہوسکتی تھی۔ اس کے ہوش میں آنے سے پہلے مجھے اس کے بارے میں کوئی نہ کوئی حتمی فیصلہ کرکے اسے عملی جامہ پہنا دینا چاہیے تھا۔

میرے پاس اسے کم از کم پانچ گھنٹے تک بے ہوش رکھنے کے لیے دوا اور سرنج بھی موجود تھی اور اسے ہمیشہ کے لیے خاموش کرنے کے لیے بھرا ہوا پستول بھی۔ میں نے چند ثانیوں تک اس صورتِ حال پر غور کیا اور اس نتیجے پر پہنچا کہ عبدل کو بے ہوش کردینے کے باوجود میں مخدوش صورتِ حال سے دوچار تھا اور میرے لیے یہی بہتر تھا کہ فوری طور پر اس کی بے ہوشی کی مدت میں پانچ گھنٹے کی توسیع کرکے اگلا فیصلہ کرنے کے لیے وقت حاصل کرلوں۔ جہاں تک اسے ختم کرنے کا معاملہ تھا تو اس پر کسی بھی وقت عمل کیا جاسکتا تھا۔

میں نے سرنج تیار کرکے بے ہوشی کا محلول اس کے بازو میں اُتار دیا۔ اس وقت مجھے خیال آیا کہ میرے پیر بدستور بندھے ہوئے تھے۔ میں نے پھرتی کے ساتھ اپنے پیروں کو آزاد کیا اور ٹارچ لے کر اس گوشے میں سرک گیا جہاں عبدل کا تھرماس وغیرہ رکھا ہوا تھا۔

میں نے اس کی چھوڑی ہوئی چائے پھینک کر تھرماس سے تازہ چائے انڈیلی اور سگریٹ سُلگا کر اس آزادی سے لطف اندوز ہونے لگا جو ایک طویل قید اور بے ہوشی کے بعد میسر آئی تھی۔

میں آزاد ضرور ہوچکا تھا اور چاہتا تو تھوڑی ہی دیر میں اپنے ساتھیوں کے ہاتھ پیر آزاد کرسکتا تھا لیکن اس کا کوئی فوری فائدہ نہیں تھا۔ وہ تینوں دوا کے زیرِ اثر بے ہوش تھے اور ہم سب کا ٹرک کا سفر جاری تھا۔ جب تک ٹرک نہ رکتا کوئی تبدیلی رونما نہیں ہوسکتی تھی۔ ٹرک رکنے کے بعد جب سردار پائندہ گل کے آدمیوں کو یہ اندازہ ہوتا کہ ہم عبدل کو زیر کرچکے ہیں تو معاملات سنگین رخ اختیار کرسکتے تھے۔ اگر ہم کامیاب ہوکر ان کے چنگل سے آزاد ہوجاتے تو اس بات کی کوئی اہمیت نہ ہوتی کہ عبدل زندہ تھا یا ہمارے ہاتھوں مارا گیا تھا لیکن ہماری ناکامی کی صورت میں وہ معاملہ بہت اہم ثابت ہوسکتا تھا۔ عبدل کے قتل کے جرم کو وہ لوگ کسی بھی قیمت پر معاف نہ کرتے۔ اس کو زندہ رکھ کر ہم یہ دعویٰ کرسکتے تھے کہ ہمارا ارادہ ان لوگوں کو جسمانی یا جانی نقصان پہنچائے بغیر آزادی حاصل کرنے کا تھا۔ اس رویّے کی روشنی میں وہ شاید ہمارے ساتھ نرمی اختیار کرنے پر آمادہ ہوجاتے۔

عبدل کو انجکشن لگ ہی چکا تھا۔ میں نے ٹرک کی دیوار سے ٹیک لگا کر چائے کی پیالی ختم کی۔ دو سگریٹیں پھونکنے کے بعد دیگرے تمام کیس پھر حرکت میں آگیا۔ بے کار بیٹھ کر خود کو حالات کے رحم و کرم پر چھوڑ دینے کے بجائے، ہاتھ پیر چلاتے رہنا میرے حق میں بہتر تھا ورنہ ٹرک کے انجن کی یکساں آواز مجھے غنودگی میں مبتلا کرسکتی تھی۔

پشت پر ہاتھ بندھے ہوئے ہونے کی وجہ سے وہ تینوں ہی بے طرح پڑے ہوئے تھے۔ مجھے بذاتِ خود یہ تجربہ حاصل ہوچکا تھا کہ ہوش میں آنے پر ان کے ہاتھ بُری طرح اکڑ چکے ہوں گے۔ میں نے باری باری ان کے ہاتھ پیر آزاد کرکے انہیں آرام سے لٹا دیا اس کے بعد میں نے عبدل کے ہاتھ پیر باندھ دیے۔ اپنے غیر جارحانہ عزائم کی ایک علامت کے طور پر میں نے اس کے ہاتھ پشت پر لے جاکر نہیں باندھے کیونکہ وہ طریقہ بہت تکلیف دہ تھا۔ اس کے ہاتھ سامنے باندھنے کے بعد میں نے یہ احتیاط ضرور کی کہ فاضل رسّی سے اس کے بندھے ہوئے ہاتھ پیٹ پر جما کر جسم کے ساتھ یوں جکڑ دیے کہ وہ ہوش میں آنے کے بعد ان ہاتھوں کو کسی بھی طرح اپنے پیروں تک نہ لے جاسکے۔ جگہ کی تنگی اور خصوصاً کم بلندی کی وجہ سے میرا سر بار بار چوبی چھت سے ٹکراتا رہا لیکن اس وقت میرے لیے وہ باتیں بہت معمولی اور غیر اہم تھیں۔ اصل اہمیت اس بات کی تھی کہ ہم سرحد پار لے جائے جانے سے قبل اپنے دشمنوں کی قید سے رہائی حاصل کرلیں۔

ان مراحل سے فارغ ہونے کے بعد میں چوبی پارٹیشن کے اس حصے کی طرف متوجہ ہوگیا جہاں کھڑکی بنا کر باہر والوں نے ہم تک رسائی حاصل کی تھی۔ وہ تختہ باہر سے اس طرح پھنسایا گیا تھا کہ اندر سے دیوار بالکل ہموار نظر آرہی تھی لیکن تختے کو اس کی جگہ پر روکے رکھنے کے لیے پٹیاں لگائی گئی تھیں جن کی وجہ سے اس تختے کو اندر گرانا ممکن نہیں ہوسکا۔ باہر کی طرف خالی اور بھرے ہوئے ڈرم لدے ہوئے تھے اس لیے زور لگا کر اسے باہر بھی نہیں نکالا جاسکا۔ آخر کار میں نے اس کھڑکی کو بھول کر اپنی جگہ بنائی اور دونوں ٹانگوں کی مدد سے تختے پر زور آزمائی شروع کردی۔ میرا خیال تھا کہ میری کوششوں کے نتیجے میں خالی ڈرم اپنی جگہ چھوڑ دیں گے اور ٹرک سے نیچے جاگریں گے۔ اس طرف ذرا سی بھی جگہ پیدا ہوجاتی تو میں کھڑکی کھول کر تیزی کے ساتھ راہ داری کو صاف کرسکتا تھا۔

چلتے ہوئے ٹرک سے خالی ڈرم گرنے کی پُرشور آوازوں سے ان لوگوں کا ہوشیار ہونا یقینی تھا۔ وہ فوری طور پر سفر کا سلسلہ منقطع کرکے ادھر کی خبر لینے پر مجبور ہوجاتے۔ وہ لوگ اپنے پروگرام کے مطابق جہاں بھی رکتے وہاں وہ حفاظت اور عام لوگوں کی نگاہوں سے محفوظ رہنے کا دھیان ضرور رکھتے جیسا کہ پچھلے پڑاؤ پر دیکھنے میں آیا تھا۔ اگر میں ان کو کسی بھی طرح چوکنا کرنے میں کامیاب ہوجاتا اور انہیں ہنگامی طور پر سفر روکنا پڑتا تو اس امر کے قوی امکانات تھے کہ نہ صرف اس شاہراہ کا عام ٹریفک ان کی طرف متوجہ ہوسکتا تھا بلکہ قومی شاہراہوں کے پُرخطر ہوجانے کی وجہ سے رات میں گشت کرنے والے فوجی، نیم فوجی یا پولیس کی کوئی مسلح پارٹی بھی دخل انداز ہوسکتی تھی جس کا تمام تر فائدہ ہم کو حاصل ہوتا۔

یہ سب سوچتے ہوئے، میں نے اس قدر زور آزمائی کی کہ میرا بدن پسینے... میں شرابور ہونے لگا لیکن کہیں بھی کوئی چیز اپنی جگہ سے ٹس سے مس نہ ہوئی اور میں تھک ہار کر ایک طرف بیٹھ گیا۔

مجھ پر یہ واضح ہوگیا کہ ہمارے حصے میں آمدورفت کے راستے میں صرف خالی ڈرموں کے انبار نہیں تھے بلکہ کسی ناگہانی چیکنگ کی صورت میں ان کو چھپائے رکھنے کے لیے آخر میں بھرے ہوئے ڈرم لگائے گئے تھے جن کا وزن میری کامیابی کی راہ میں رکاوٹ بن گیا تھا۔

اس طرف سے مایوس ہوکر میں نے ٹرک کی بغلی دیواروں کا جائزہ لیا لیکن ادھر مضبوط آہنی فریم میں موٹے موٹے تختے اتنی مضبوطی کے ساتھ جڑے ہوئے تھے کہ خاص اوزاروں سے مدد لیے بغیر انہیں ان کی جگہ سے ہلانا ناممکن تھا۔ ٹرکوں کی باڈی اتنی مضبوط نہ ہوتی تو ان کے لیے ٹنوں وزنی سامان کے ساتھ ناہموار اور دور افتادہ راستوں پر سفر کرنا ہی ممکن نہ ہوتا۔ اس حصار کو توڑ کر باہر نکلنا میرے بس سے باہر تھا۔

مخالف سمت سے قریب آنے اور پھر زناٹے کے ساتھ دور نکل جانے والے ٹریفک کی آوازیں مجھے ہر لمحہ کچھ کرگزرنے پر اُکسارہی تھیں۔ شاید ہم قومی شاہراہ کے کسی مصروف حصے پر محوِ سفر تھے اور وہ وقت بھی مال بردار گاڑیوں کے چلنے کا تھا۔ طویل راستوں پر سفر کے عادی ڈرائیور موسم کے مطابق اپنے آرام اور سفر کے اوقات بدلتے رہتے ہیں۔ گرمیوں کی تپتی ہوئی دوپہر میں وہ کسی نہر وغیرہ کے کنارے، گھنے درختوں کی ٹھنڈی چھاؤں میں رک کر اپنے جسموں اور گاڑیوں کے انجنوں کو آرام دیتے ہیں اور اس کمی کو رات کے سفر میں پورا کرتے ہیں جب ہوا کی گرمی اور ٹریفک کی زیادتی دم توڑ چکی ہوتی ہے کیونکہ طویل ڈرائیونگ کے روایتی آداب سے ناواقف لوگ اور شوقین ڈرائیور بھی رات کے سفر کو خطرناک سمجھتے ہوئے کسی ہوٹل یا سرائے میں پڑ رہنے کو ترجیح دیتے ہیں۔

میں نے ٹرک سے داہنی طرف فائر کرکے ڈرائیور کو خوف زدہ کرنے کے امکان پر غور کیا لیکن اسے فوراً ہی مسترد کردیا۔ انجن کے شور اور ہوا کی سنسناہٹ کی وجہ سے اس امر کا امکان بہت کم تھا کہ ڈرائیور عقبی حصے سے کیے جانے والے پہلے ہی فائر کی آواز سُن لیتا۔ وہ لوگ نفسیاتی طور پر مطمئن تھے کہ ان کے قیدی بے ہوش تھے اور ان کے سروں پر ایک مسلح آدمی مامور تھا۔ اس لیے کوئی بہت ہی غیر معمولی حربہ ان کے اطمینان میں خلل انداز ہوسکتا تھا۔ دوسری بات یہ تھی کہ تصادم سے نمٹنے کے لیے میرے پاس صرف وہی چھ گولیاں تھیں جو عبدل سے حاصل کیے ہوئے پستول چیمبر میں موجود تھیں۔ میرا ہر فائر میری اس مدافعانہ قوت میں کمی کا سبب ہوتا اور میں اس عیاشی کا متحمل نہیں ہوسکتا تھا کہ اپنے فائر کی کامیابی کا بھرپور یقین کیے بغیر گولیاں داغ کر خود کو کمزور کرتا چلا جاؤں۔ سارے امکانات مسدود تھے۔ مجھے اپنی آزادی کا کوئی فوری فائدہ نہیں سوجھ رہا تھا۔ اتنا ضرور تھا کہ میں اپنے ہوش وحواس میں تھا، تھرماس سے چائے اور عبدل کے پیکٹ سے سگریٹ پی سکتا تھا۔ میں نے وقت گزارنے کے لیے ان دونوں عیاشیوں سے بیک وقت لطف اندوز ہونا شروع کردیا۔

وقت دھیمے دھیمے گزرتا رہا۔ کئی گھنٹوں پر محیط، وہ مدت بہت طویل تھی لیکن ٹرک جناتی انداز میں یکساں رفتار اور آواز کے ساتھ اپنی خوف آور منزل کی طرف بڑھتا رہا۔ ساڑھے چار گھنٹے سے زیادہ کے مسلسل اور اُکتادینے والے سفر کے بعد مجھے ٹرک کی رفتار ٹوٹنے کا احساس ہوا اور میں سنبھل کر بیٹھ گیا۔

ٹرک کی رفتار بتدریج کم ہوتی رہی حتیٰ کہ ڈرائیور کو گیئر بدلنے کی ضرورت پیش آنے لگی آخر کار ٹرک رینگتا ہوا بائیں طرف گھوما اور پھر شدید ہچکولوں کا آغاز ہوگیا۔ ٹرک کو پختہ سڑک سے کچے راستے پر اُتار دیا گیا تھا اور کسی بھی لمحے اس کا سفر عارضی طور پر رک سکتا تھا۔

میرے پچھلے تجربے کے برعکس، اس بار ٹرک کچے راستے پر کافی دیر تک سفر کرتا رہا۔ اسی دوران میں اس نے کئی موڑ بھی کاٹے پھر اسے روک کر انجن بند کردیا گیا۔ انجن بند ہوتے ہی میرے دل کی دھڑکنیں تیز ہوگئیں۔ اسی کے ساتھ باہر سے کئی آدمیوں کے زور زور سے بولنے کی آوازیں آنے لگیں۔ پھر سناٹے میں ڈرموں کے اتارے جانے کی پُرشور آوازیں گونجنے لگیں۔ ہم لوگوں تک پہنچنے کے لیے راستہ بنایا جارہا تھا اور اس وقت میرے علاوہ سب ہی لاشوں کی طرح بے حس وحرکت پڑے ہوئے تھے۔

”عبدل! کیا ہورہا ہے؟“ باہر سے ایک دوستانہ آواز اُبھری جو یقینی طور پر ولی کی تھی۔

میری طرف سے خاموشی، ان لوگوں کو پہلے سے شبہات میں ڈال سکتی تھی۔ میں نے اپنی آواز بدلنے کی کوشش کرتے ہوئے، بھرائی ہوئی آواز میں جواب دیا ”بے ہوشوں کو دیکھتے دیکھتے میں بھی اونگھنے لگا ہوں۔ اب میں اِدھر سفر نہیں کرسکوں گا۔“

”تمہاری آواز کو کیا ہوا ہے؟“ لمحہ بھر کے غیر فطری سکوت کے بعد ولی کی آواز آئی۔

”گلا خراب ہوگیا ہے“ اس بار میں نے کھانستے ہوئے جواب دیا۔

اس دوران میں ٹرک سے ڈرم اُتارنے کا عمل زور و شور سے جاری رہا۔ میں نے حسرت بھری نظروں سے اپنے تینوں ساتھیوں کی طرف دیکھا لیکن وہ بے سدھ پڑے ہوئے تھے۔ ان میں سے کسی کے ہوش میں آنے کے آثار نظر نہیں آرہے تھے۔ مجھے اپنی محنت رائیگاں جاتی نظر آنے لگی۔

میں چوبی دیوار کے کھڑکی والے حصے کے بالکل برابر میں لگا ہوا بیٹھا تھا تاکہ اس راہ سے اندر آنے والے کسی بھی شخص کی گردن ناپ سکوں لیکن اپنے ساتھیوں کی مسلسل بے ہوشی کی وجہ سے میں نے آخری لمحات پر مقابلہ کرنے کا ارادہ ترک کردیا۔ پستول کی چھ گولیوں کے ساتھ میں یکہ وتنہا مقابلہ کر بھی لیتا تو ان تینوں کو اپنے کندھوں پر لاد کر وہاں سے بھاگ نکلنا میرے بس سے باہر تھا۔

اچانک میرے کانوں میں کسی کے کراہنے کی آواز آئی اور میں اضطراری حالت میں، سرک کر اُدھر پہنچ گیا۔ اس بار بھی حسبِ معمول ویرا ہی سب سے پہلے حرکت میں آئی تھی۔ یہ اس کی قوتِ برداشت کا کمال تھا یا پھر سب سے پہلے انجکشن کا نشانہ بننے کے باعث وہ سب سے پہلے ہوش میں آرہی تھی۔

”ویرا.... ویرا! ہوش میں آؤ۔ آنکھیں کھولو“ میں نے اس کے رخساروں پر زور زور سے تھپڑ رسید کرتے ہوئے سرگوشیانہ لہجے میں کہا ”وہ کسی بھی لمحے اندر آنے والے ہیں۔“

ویرا میں یہ بہت بڑی خوبی تھی کہ وہ ہر حال میں خطرات کا فوراً ہی ادراک کرلیتی تھی۔ اس وقت گو وہ آہستگی سے ہوش میں آرہی تھی لیکن میری حرکات نے اس کی چھٹی حس کو جھنجوڑ کر رکھ دیا اور وہ کسی سحر زدہ معمول کی طرح فرش سے اُٹھتی چلی گئی۔ اس کے دہانے سے گھبرائی ہوئی، بے معنی آوازیں برآمد ہورہی تھیں۔

پھر چوبی پارٹیشن میں کھڑکی کا چوکور خلا نمودار ہوگیا۔ میں ویرا کو آخری بار جھنجوڑ کر، پھرتی سے اس خلا کے قریب پہنچ گیا۔ میں نے ٹارچ فوراً ہی بجھادی تھی۔ اندر پھیلے ہوئے گھور اندھیرے کے مقابلے میں اس کھڑکی سے باہر سرمئی اندھیرا پھیلا ہوا تھا اور اس میں دو ٹانگیں نمایاں نظر آرہی تھیں۔

”عبدل، باہر آؤ!“ باہر سے ولی کی آواز گونجی۔ اس بار میں خاموش رہا۔

پھر ٹرک میں بنائی ہوئی خالی جگہ میں موجود ولی نے اپنی دستی سرچ لائٹ روشن کرکے اندر کا جائزہ لینے کی کوشش کی۔ میں چیتے کی طرح اپنی جگہ دبکا رہا۔ جوں ہی وہ کلائی کھڑکی میں قدرے اندر داخل ہوئی۔ میں نے دونوں ہاتھوں سے وہ کلائی تھام کر اسے اندر گھسیٹنے کی کوشش شروع کردی۔ میرے اس ناگہانی حملے کی وجہ سے اس کے حلق سے ایک تیز آواز برآمد ہوئی اور ٹارچ اس کے ہاتھ سے نکل گئی۔ اس لمحے میرے عقب سے ایک سایہ نمودار ہوا اور کسی جونک کی طرح ولی کی گردن سے لپٹ گیا۔ اس کے جسم سے پھوٹنے والی مہکار سے ظاہر ہورہا تھا کہ وہ ویرا کے علاوہ کوئی اور نہیں تھا۔

وہ باہر گھٹنوں کے بل جھک کر اندر کا جائزہ لینے کی کوشش کررہا تھا اس لیے ... مدافعت نہیں کرسکا اور ہم دونوں نے مل کر اسے اندر گھسیٹ لیا۔ اس کے سنبھلنے سے پہلے ہی ویرا نے اس کی کھوپڑی پر کراٹے کے کئی نپے تُلے وار کیے اور وہ فی الفور بے ہوشی کی آغوش میں ڈوبتا چلا گیا۔

”میرے پاس بھرا ہوا پستول ہے“ میں نے تیز سرگوشی میں ویرا سے کہا ”اسے ایک طرف گھسیٹ کر اس کی جامہ تلاشی لے لو۔ اس کے پاس بھی کوئی نہ کوئی کار آمد ہتھیار موجود ہوگا۔“

ویرا اس مرتبہ حیرت ناک سرعت کے ساتھ اپنے ہوش وحواس بحال کرنے میں کامیاب ہوئی تھی، جس کے نتیجے میں پوری صورتِ حال یکسر تبدیل ہوکر رہ گئی تھی اور میں نے ہتھیار ڈالتے ڈالتے ان لوگوں کے مقابلے پر جم جانے کا فیصلہ کرلیا تھا۔

”کون ہے؟ اندر کیا ہورہا ہے؟“ باہر سے کسی نے گرج کر پوچھا۔ وہ آواز بہت کرخت اور لب ولہجہ نامانوس تھا جس کا مطلب تھا کہ وہ سردار پائندہ گل کے آدمیوں میں سے کوئی تھا۔ ویسے بھی اب باہر وہی لوگ رہ گئے تھے اور ان کی تعداد چھ ہونی چاہیے تھی۔ ساتواں عبدل وغیرہ کا تیسرا ساتھی تھا جو فاضل ڈرائیور کے طور پر ٹرک کے ساتھ سفر کررہا تھا۔

اندر ہم چھ نفوس تھے جن میں دو قیدی تھے۔ بدقسمتی یہ تھی کہ اس وقت تک صرف ہم دو افراد ہی ہوش میں تھے۔ غزالہ اور سلطان شاہ کا جلد از جلد ہوش میں آنا بہت ضروری تھا۔ دوسری صورت میں حالات ہمارے قابو سے باہر ہوسکتے تھے۔

”یہاں گڑبڑ ہوگئی ہے“ میں نے بھرائی ہوئی اونچی آواز میں باہر والے کو جواب دیا ”تمہارے ایک آدمی کا دماغ اُلٹ گیا ہے اور وہ ہر ایک کے ساتھ تشدد کا برتاؤ کررہا ہے۔ ابھی ابھی وہ اپنے ساتھی سے مار کھاکر بے ہوش ہوا ہے۔ یہ اس پر قابو پانے کا بہترین موقع ہے۔“

”تم کیوں بکواس کررہے ہو؟“ اس بار اسے غصہ آگیا۔ ”اگر ولی نے عبدل کو بے ہوش کردیا ہے تو وہ خود کہاں ہے؟ اس نے تمہیں زبان درازی کی چُھوٹ کیوں دے رکھی ہے؟“

”شاید وہ بھی بے ہوش ہوگیا ہے“ میں نے اسی لہجے میں جواب دیا ”وہ دونوں ہی خاموش اور بے حس وحرکت پڑے ہوئے ہیں۔ میرے ہاتھ پیر بندھے ہوئے ہیں ورنہ میں ہی انہیں دیکھ لیتا...“

”یہ خنزیر کا بچہ جھوٹ بول رہا ہے“ باہر سے ایک اور مشتعل آواز سنائی دی پھر اس نے اپنی مادری زبان میں کچھ بولنا شروع کردیا اور میرے کان غزالہ کی کراہوں پر مرکوز ہوگئے۔

میں نے اپنے ذہن پر زور دے کر پہلی آواز کو پہچان لیا تھا۔ وہ یقینی طور پر صندل خان تھا۔ دوسرے کی بدمزاجی کی بنا پر میں نے رائے قائم کی کہ وہ صبغت اللہ ہوسکتا تھا۔

باہر وہ دونوں اپنی مادری زبان میں تبادلۂ خیال کرتے رہے۔ پھر ان میں کچھ نئی آوازیں بھی شامل ہوگئیں۔ اندر کی پُراسرار صورتِ حال نے ان سب کو چکرا کر رکھ دیا تھا لیکن یہ بات یقینی نظر آرہی تھی کہ ان میں سے کوئی بھی ولی کی طرح اپنی گردن ہمارے حوالے کرنے والا نہیں تھا۔

بے ہوش عبدل کو میں پہلے ہی باندھ چکا تھا۔ میں نے ویرا کو ہدایت کی کہ وہ ولی کے ہاتھ پیر بھی جکڑ دے تاکہ وہ ہوش میں آنے کے بعد ہمارے لیے کوئی دشواری پیدا نہ کرسکے۔ اس نے مجھے مطلع کیا کہ وہ اس احتیاطی تدبیر پر پہلے ہی عمل کرچکی تھی اور اس وقت غزالہ کو ہوش میں لانے کی تدابیر کررہی تھی۔

”تم شرافت سے کھڑکی کے راستہ باہر نکل آؤ ورنہ ہم تمہارا حشر خراب کردیں گے“ کچھ دیر کے بعد، صندل خان کی تحکمانہ آواز گونجی ”ہم سمجھ گئے ہیں کہ تم نے اندر کوئی گڑبڑ کی ہوئی ہے۔“

”میرے ہاتھ پیر بندھے ہوئے ہیں...“ میں نے کہنا چاہا لیکن میری بات کاٹ دی گئی۔

”تم کھونٹے سے نہیں باندھے گئے ہو۔ پیندے کے بل فرش پر کھسک کر باہر آسکتے ہو۔“

”تم اندر آکر خود دیکھ سکتے ہو کہ اس تنگ جگہ میں ایسا کرنا ممکن نہیں ہے۔“

جواب میں اس نے پے در پے کئی موٹی موٹی گالیاں دیں پھر

باہر مشاورت کا سلسلہ دوبارہ شروع ہوگیا۔ اس بار ان کی آوازیں نیچی تھیں لیکن وہ پُرجوش بھنبھناہٹیں اتنی بلند آہنگ ضرور تھیں کہ یہ تمیز کی جاسکتی تھی کہ وہ سب اپنی زبان میں باتیں کررہے تھے۔

کچھ دیر بعد فضا میں ایک انجن اسٹارٹ ہونے کا شور سنائی دیا۔ لینڈ کروزر تیزی کے ساتھ حرکت میں آئی پھر اس کے رکنے سے پہلے ہی کھڑکی سے تیز روشنی اندر آنے لگی۔ انجن دوبارہ بند ہوگیا۔ انہوں نے ٹرک میں بنی ہوئی راہداری اور ہمارے قید خانے کو روشن کرنے کے لیے شاید لینڈ کروزر ٹرک کے پیچھے لگا کر اس کے ہیڈ لیمپس روشن کردیے تھے۔

"اگر تم فوراً باہر نہیں آئے تو ہم ٹرک کی باڈی چھلنی کرکے تمہیں اور تمہارے ساتھیوں کو بھون ڈالیں گے" آخر کار صندل خان کے بدمزاج ساتھی کی وحشیانہ آواز سنائی دی۔

میں اپنے شانے پر ویرا کے ہاتھ کا نرم دباؤ محسوس کرکے خاموش رہا اس بار ویرا نے جواب دیا "تم نے کوئی بھی غلط حرکت کی تو ہم ولی اور عبدل کی کھوپڑیوں میں سوراخ کردیں گے۔ ان کی موت کی ذمّے داری تم پر ہوگی۔ مگر ہم جانتے ہیں کہ تم ایسا نہیں کروگے۔ تم سردار پائندہ گل کے حکم کے غلام ہو اور وہ ہمیں زندہ حالت میں شنگار اویلی میں دیکھنا چاہتا ہے۔"

"ہاں، ہم سب خان بابا کے غلام ہی نہیں، کُتّے بھی ہیں۔ ہم مارے بغیر تمہاری حالت مُردوں سے بدتر کرسکتے ہیں۔ تمہاری چھت توڑ کر منوں وزنی ڈرم تمہارے اوپر گرادیے جائیں گے اور تم سب عمر بھر کے لیے معذور ہوکر رہ جاؤ گے۔ اس ویرانے میں کوئی تمہاری مدد کو نہیں آئے گا۔"

"تم مونچھ دار مرد ہوکر بار بار اپنی زبان بدل رہے ہو" ویرا نے اس کا مضحکہ اُڑاتے ہوئے کہا "کوئی ایک فیصلہ کرلو تاکہ ہم تمہیں اس کا منہ توڑ جواب دے سکیں۔"

ویرا کی اس ہرزہ سرائی نے ان میں سے کسی کا دماغ اُلٹ دیا۔ باہر سے تڑاتڑ کی آواز کے ساتھ کسی خودکار رائفل کا برسٹ مارا گیا اور متعدد گولیاں روشن چوبی کھڑکی سے گزر کر ٹرک کی اس دیوار میں پیوست ہوگئیں جس نے ہمارے قید خانے اور ڈرائیونگ کیبن کو ایک دوسرے سے الگ کیا ہوا تھا۔ ہم سب اس خلا سے دور تھے اس لیے کسی کا بال بھی بیکا نہ ہوسکا۔

میں اس موقعے کی تلاش میں تھا۔ کھڑکی سے گزر کر گولیاں سیدھی اندر آئی تھیں جس کا مطلب تھا کہ فائر کرنے والا، لینڈ کروزر کے ہیڈ لیمپس کے پیچھے کھڑکی کی سیدھ میں تھا۔ باہر سے فائرنگ موقوف ہوتے ہی میں نے باہر کی طرف سیدھا فائر کردیا۔ گولی کسی آہنی چادر میں پیوست ہونے کی آواز آئی لیکن میں کسی کو نشانہ بنانے میں کامیاب نہ ہوسکا۔ اسی کے ساتھ ہیڈ لیمپس بُجھادیے گئے۔

وہ جمود اور تعطل کی کیفیت تھی، غزالہ ہوش میں آچکی تھی مگر خوف زدہ تھی۔ اس کے ذہن سے بے ہوشی کی دُھند اس وقت صاف ہوئی جب باہر سے گولیوں کا برسٹ مارا گیا۔ تھوڑی دیر بعد سلطان شاہ بھی پوری طرح ہوش میں آگیا لیکن ہم سب مل کر بھی اس جمود کو توڑنے کی کوئی راہ تلاش نہیں کرسکے۔ دونوں فریق اپنی اپنی جگہ آزاد اور مسلح تھے لیکن وہ اپنی جانیں ہتھیلی پر رکھ کر ٹرک پر چڑھ آنے کی ہمت کرسکتے تھے، نہ ہم لوگ اپنی کمین گاہ سے باہر نکلنے کا خطرہ مول لے سکتے تھے۔

ہم نے بے ہوشی اور رسیوں کی بندشوں سے نجات پاکر ایک بڑی کامیابی حاصل کی تھی اس لیے ہم اپنی جگہ پر قدرے مطمئن تھے لیکن باہر والے بازی ہاتھ سے نکلنے پر بُری طرح جھلاّئے ہوئے تھے۔ اس کا ایک سبب یہ تھا کہ وہ سب مغلوب الغضب واقع ہوئے تھے اور ان کا سربراہ کچھ زیادہ ہی سیماب صفت واقع ہوا تھا۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ ہم مزید کوئی فائر کیے بغیر وقفے وقفے سے انہیں چڑاتے رہے اور وہ بار بار فائر کرکے اپنا اسلحہ اور ٹرک کی باڈی برباد کرتے رہے۔

"تم لوگ کیا چاہتے ہو؟" آخر کار صندل خان نے اپنے گروہ کی قیادت سنبھالتے ہوئے باہر سے سوال کیا "تم زیادہ دیر تک خود کو نہیں سنبھال سکو گے۔"

"ہم صرف اور صرف آزادی چاہتے ہیں۔ اب ہمیں ہماری مرضی کے خلاف ایک گز بھی نہیں لے جایا جاسکے گا۔" میں نے مضبوط لہجے میں جواب دیا "ہم ہتھیار نہیں ڈالیں گے۔"

"تم آزاد ہو۔ ایک ایک کرکے باہر آجاؤ۔ میں وعدہ کرتا ہوں کہ تم پر فائر نہیں کیا جائے گا، نہ تمہیں کسی انتقامی تشدّد کا نشانہ بنایا جائے گا۔ تمہارے پاس اس کے علاوہ کوئی راستہ نہیں ہے۔"

"تم پھر بہک رہے ہو۔ باہر اُجالا پھیلنے کے آثار نمودار ہوچلے ہیں۔ تم خالی ڈرموں کو دوبارہ ٹرک پر لادے بغیر سڑک کی طرف سفر شروع کرو اور شاہراہ کے کسی مصروف حصے میں ٹرک روک دو۔ ایسے کسی بھی مقام پر ہم ٹرک سے نکل آئیں گے۔ وہاں سے ہمارے راستے جدا ہوں گے۔"

"ٹرک یہاں سے نہیں ہلے گا۔ اس وقت ہم جنگل کے ایک ایسے حصے میں ہیں جہاں ہم دس دن تک بھی رکے رہیں تو کوئی ہماری طرف متوجہ نہیں ہوسکے گا۔ بھوک اور پیاس تم کو خود ہی ہتھیار ڈالنے پر مجبور کردے گی۔ تمہیں چھوڑنے کے مقابلے میں ہم ایسے وقت کا انتظار کرنے کو ترجیح دیں گے۔"

"پھر خاموشی سے انتظار کرتے رہو۔" میں نے طنز سے کہا "وہ وقت آنے سے پہلے ہی ہماری گولیاں تم سب کو چاٹ جائیں گی۔ ہوسکتا ہے کہ اس سے پہلے ہی ہمارے ہمدرد تمہارے سروں پر پہنچ جائیں۔"

"جہنم میں جاؤ۔ اب وہاں کی آگ ہی تمہارے جسموں کو چاٹے گی۔"

"تمہارا پیچھا کرتے ہوئے ہمیں وہاں بھی جانا پڑا تو اس سے گریز نہیں کریں گے۔"

"اب خاموش ہی رہو!" ویرا نے سرگوشی میں کہا "اُدھر دیکھو ولی ہوش میں آرہا ہے۔"

ولی، ویرا کی لگائی ہوئی ضربات کے نتیجے میں بے ہوش ہوا تھا اس لیے وہ تیزی کے ساتھ ہوش میں آتا چلا گیا۔ اُس کے بے دست وپا ہونے کی وجہ سے ہم دور سے اسے دیکھتے رہے۔ باہر اُجالا ہوجانے کی وجہ سے اندر چھائے ہوئے گھور اندھیرے میں بھی کمی واقع ہوتی جارہی تھی جس کی وجہ سے ہم مصنوعی روشنی سے مدد لیے بغیر بھی ایک دوسرے کو خاصی حد تک دیکھ رہے تھے۔

"تو تم نے مجھے باندھ لیا ہے" پوری طرح ہوش میں آنے کے بعد ولی نے چند گالیاں بکتے ہوئے کہا "معلوم ہوتا ہے کہ تم پر واقعی برا وقت آکر رہے گا۔"

"ابھی تک تو نہیں آیا" ویرا استہزائیہ لہجے میں بولی "تم آواز دے کر بلالو۔"

"صندل خان! اِن کے کسی فریب میں نہ آنا" وہ اچانک حلق کے بل چیخنے لگا۔ میرے نزدیک وہ ایک شکستہ قیدی کی فریاد تھی اس لیے میں اسے روکنے کی کوشش کیے بغیر اس کی حالت سے محظوظ ہوتا رہا۔ دوسروں نے بھی اس بارے میں میری تقلید کی اور خاموشی سے بیٹھے رہے۔

"ان حرام زادوں نے مجھے دھوکے سے پکڑا ہے" وہ بدستور چیخ چیخ کر باہر والوں کو بتارہا تھا "میرے ہاتھ پیر باندھ دیے گئے ہیں لیکن یہ اپنے انجام سے نہیں بچ سکیں گے۔ استاد نے ٹرک پر ہر طرح کا بندوبست کروایا ہوا ہے۔ صفدر سے کہو کہ وہ تین نمبر کھول دے اور....."

وہ ہمیں بے بس کرنے کی کسی تدبیر کے بارے میں باہر والوں کی رہنمائی کرنے کی کوشش کررہا تھا جس پر میں نے چونک کر اپنی جگہ چھوڑی اور اس کے دہانے پر پوری قوت سے اپنا ہاتھ رکھ دیا۔

اس کی بات ادھوری رہ گئی۔ اس نے میری ہتھیلی پر کاٹنے کی کوشش کی۔ اس جدوجہد میں جب بھی میری گرفت کمزور پڑتی، وہ اونچی آواز میں بولنے کی کوشش شروع کردیتا مگر میں دوبارہ اس کا منہ دبوچ لیتا مگر پھر بھی وہ گیس کا لفظ باہر والوں تک پہنچانے میں کامیاب ہوگیا۔ اس دوران میں سلطان شاہ میری مدد کو آچکا تھا۔ اس نے ولی کی دونوں کنپٹیوں پر بیک وقت اپنی ہتھیلیوں کی کھڑی ضرب لگائی اور اسے دوبارہ بے ہوش ہونے پر مجبور کردیا۔

اُس سے الگ ہوتے ہوئے، میرے ذہن پر تشویش سوار ہوچکی تھی۔ مجھے محسوس ہورہا تھا کہ ہم نے باہر والوں سے اس کی گفتگو کو نظرانداز کرکے شدید غلطی کی تھی جو ہمیں مہنگی پڑسکتی تھی۔ شاید صفدر ان کے تیسرے ساتھی کا نام تھا۔ اس کے لیے تین نمبر اور گیس کے الفاظ پر مشتمل پیغام میں یقیناً کوئی بات پوشیدہ تھی۔ میں دل ہی دل میں بس یہ امید کرتا رہا کہ کاش صفدر کے لیے وہ پیغام ادھورا ثابت ہو اور وہ ولی کی مجوزہ تدبیر پر عمل پیرا ہونے میں کامیاب نہ ہوسکے۔

بے ہوش کیے جانے سے قبل، ولی کی زبان سے ادا ہونے والے ادھورے الفاظ نے باہر والوں کو احساس دلادیا تھا کہ اسے عین موقعے پر دوبارہ پکڑلیا گیا تھا۔ جب کئی منٹ گزر گئے تو باہر سے صندل خان نے براہ راست ولی کو آواز دیتے ہوئے آگاہ کیا کہ صفدر اس کی بقیہ ہدایات کا منتظر تھا لیکن ولی اس کا جواب دینے کی پوزیشن میں نہیں تھا۔ ہم لوگ بھی چپ سادھے بیٹھے رہے۔

باہر دن طلوع ہورہا تھا۔ جب روشنی کے انعکاس میں مزید اضافہ ہوا تو ویرا کو تھرماس نظر آگیا۔ اس میں چائے باقی تھی لیکن وہ ان تینوں کے لیے ناکافی تھی۔ ویرا نے تھوڑی تھوڑی مقدار غزالہ اور سلطان شاہ کو پلائی اور بقیہ خود پینے لگی۔ میں نے اپنے لیے سگریٹ سلگالی لیکن اس دوران میں ہم میں سے کوئی بھی ایک لمحے کے لیے بھی غافل نہیں ہوا تھا۔ ہم سب بھیڑیوں کے غول میں گھرے ہوئے ہرنوں کی طرح چوکنے تھے۔

"ولی تین نمبر کھولنے کے بارے میں کیا بکواس کررہا تھا؟" طویل خاموشی کے بعد غزالہ نے سرسراتی ہوئی خوف زدہ آواز میں مجھ سے سوال کیا۔

"ہوگا کچھ!" ویرا مجھ سے پہلے بول پڑی "اپنے ذہن پر زیادہ زور نہ دو اور آنے والے بُرے وقت کے لیے تیار رہو۔ جو ہوگا وہ دیکھا جائے گا۔ اب لکیر کو پیٹنے کا کوئی فائدہ نہیں۔"

"مجھے شبہ ہورہا ہے کہ ٹرک پر کہیں ایسی گیس موجود ہے جو ہم لوگوں کو ہلاک، بے ہوش یا مفلوج کرسکتی ہے" میں نے سرگوشی میں کہا "گیس کی نلکی کو ٹرک کے اس حصے سے ملانے والے والو یا گھنڈی کو ہی تین نمبر کا نام دیا گیا ہے۔ شاید ولی کے علاوہ کسی اور کو تین نمبر کی اصل اہمیت کا علم نہیں ہے۔"

"تو وہ اب ہوجائے گا" ویرا بے فکری سے بولی "اس میں کون سی....."

"پھر وہی منحوس کلمات؟" سلطان شاہ اضطراب کے عالم میں دھیرے سے منمنایا "معلوم ہے کہ ہم بہت بڑے پھنسے ہوئے ہیں مگر تم کبھی تو خیر کی بات بھی کرلیا کرو۔"

"شترمرغ کی طرح گردن ریت میں چھپا لینے سے طوفان نہیں ٹلا کرتے" ویرا کی بہت دھیمی آواز سے برہمی ٹپک رہی تھی "نرغے شر میں بھی خیر کی امید رکھنے والوں کی کھوپڑی پر جب حقیقت کا گرز پڑتا ہے تو اُن پر چودہ طبق روشن ہوجاتے ہیں۔ تم خیر کی باتیں سوچتے رہو۔"

"خدا کا خوف کرو" میں نے ان دونوں کو ملامت کرتے ہوئے کہا "تم لوگ ایسے خوفناک حالات میں بھی ایک دوسرے کے ساتھ نوک جھونک میں اُلجھے ہوئے ہو؟ یہ شرم کا مقام ہے۔"

"تو ک جھونک نہیں ہو رہی۔ تم سن رہے ہو کہ یہ نحوست پھیلا رہی ہے" سلطان شاہ نے احتجاج کیا۔

"جو بات ڈینی سمجھ رہا ہے' وہ صفدر کی سمجھ میں نہیں آئے گی' سبحان اللہ!" ویرا کی جلی کٹی آواز ابھری "معلوم ہوتا ہے کہ تمہارے مغز میں صرف کدو کے بیج بھرے ہوئے ہیں۔"

ویرا نے لمحے بھر کے لیے خاموش ہو کر ایک گہرا سانس لیا پھر ہیجان آمیز سرگوشی کرتے ہوئے بولی "لو! شاید اُس مردود نے تین نمبر کھول دیا ہے۔ کسی گیس کی بو آرہی ہے۔ تم اسے کسی کے معدے کا قصور سمجھتے رہو' میں اپنا سانس روک رہی ہوں۔ لکھ لو کہ اب وہی بچے گا جو سانس روک سکے گا۔"

اسی وقت میرے نتھنوں سے کسی قسم کی تیز اور میٹھی میٹھی بو ٹکرائی اور میں نے اپنا سانس روک لیا۔ اسی وقت عبدل نے ہولے ہولے کراہنا شروع کردیا۔ وہ انجکشن کے اثر سے باہر آرہا تھا لیکن اس کے استقبال کے لیے وہاں گیس کا اخراج شروع ہوچکا تھا۔ اِس وقت مجھے اُس کے بجائے اپنی فکر پڑ گئی تھی۔

غزالہ قریب آکر میرے بدن سے بری طرح چپک گئی اور میرا بازو پکڑ کر بولی "وہ وحشی ہماری ناکام بغاوت کو معاف نہیں کریں گے۔ اس زہریلی گیس کی مدد سے ہمیں مار ڈالیں گے۔"

"سانس روکنے کی کوشش کرو" میں نے اپنے سینے میں رکا ہوا سانس خارج کرتے ہوئے کہا "کھڑکی سے آنے والی ہوا گیس کو جلد ہی صاف کردے گی" غزالہ کو وہ ہدایت دیتے ہوئے مجھے یہ امید بھی تھی کہ وہ جیسی بھی گیس ہو' اس کا ذخیرہ بہت محدود ہوگا۔ ایک بار وہ ذخیرہ خالی ہونے کے بعد تازہ ہوا بہت تیزی کے ساتھ اپنا کام دکھانا شروع کردیتی۔ وہ تکلیف بس چند منٹ کی تھی۔

میں نے سانس روکنے سے پہلے اپنے خالی پھیپھڑوں کو ہوا سے بھرنے کی کوشش کی اور میری آنکھوں کے سامنے تاریکی ناچنے لگی۔ غزالہ کے بدن کا سارا بوجھ میرے اوپر آگیا۔ اس کے بعد مجھے گردوپیش کی کسی چیز کا کوئی ہوش نہیں رہا۔ ولی کی دی ہوئی ادھوری ہدایات اپنا رنگ دکھا چکی تھیں۔

میرے ذہن میں بھولی بھولی سی آخری امید یہ تھی کہ وہ کوئی زہریلی گیس نہیں تھی۔ اس کے اثرات مہلک ہوتے تو ولی کبھی بھی صفدر کو تین نمبر کھولنے کا مشورہ نہیں دیتا۔ وہ خود ہمارا قیدی تھا' اس کے ہاتھ پیر بھی بندھے ہوئے تھے۔ اُس سے یہ توقع نہیں کی جاسکتی تھی کہ سردار پائندہ گل کے آدمیوں کی سرخروئی اور سربلندی کے لیے وہ ہمارے ساتھ اپنی موت کا بھی بندوبست کرلے گا۔

○☆○

مجھے دوبارہ ہوش آنا شروع ہوا تو مجھے اپنے پپوٹے اٹھانے میں بھی شدید دشواری ہو رہی تھی۔ پھر میرے کانوں میں غزالہ کی مسرت آمیز آواز آئی "دیکھو' انہیں بھی ہوش آنا شروع ہوگیا ہے۔"

"اپنی جگہ پڑی رہو۔ وہ بھی ہوش میں آہی جائے گا" ویرا کی کمزور آواز تھی "خدا کا شکر ہے کہ وہ زہریلی گیس نہیں تھی۔ ہم چاروں زندہ ہیں لیکن ایک دوسرے کے لیے اپنی توانائی ضائع نہیں کرسکتے۔"

"ہمیں دوبارہ زندگی ملی ہے" اس بار غزالہ کی آواز بھی ارتعاش آمیز تھی "میں سوچ رہی تھی کہ گیس مہلک نہ بھی ہوئی تو وہ وحشی ہمیں بے بس کرتے ہی ہلاک کردیں گے۔"

"میں اتنی ناامید نہیں تھی۔ جسے سردار پائندہ گل زندہ دیکھنا چاہتا ہو' اسے وہ کسی بھی صورت میں نہیں مار سکتے تھے۔ مجھے اس بات کا افسوس ہے کہ میں کافی دیر تک حبس دم کیے رکھنے کے باوجود اس سریع الاثر گیس کا شکار ہونے سے نہیں بچ سکی" ویرا کی آواز سنائی دی۔

میں نے محسوس کیا کہ میں جس چیز پر دراز تھا وہ متحرک نہیں تھی اور نہ ہی فضا میں ٹرک کے انجن کا وہ آسیبی شور سنائی دے رہا تھا جو پچھلے دنوں کے سفر میں ہمارے دماغوں میں رچ بس گیا تھا۔ میں نے پوری کوشش کرکے اپنی آنکھیں کھول دیں۔ سر پر خاکی سائبان پھیلا ہوا تھا۔ جسم کے نیچے کوئی نرم پیال تھا اور فضا میں شام کا ملگجا اجالا پھیلا ہوا تھا۔ میں نے بدقت تمام سر گھمایا تو معلوم ہوا کہ ٹرک کے سفر کا سلسلہ ختم ہوچکا تھا اور اس وقت ہم چاروں ایک ایسے کمرے میں الگ الگ پیال پر پڑے ہوئے تھے جس کی دیواریں پہاڑی پتھروں کو مہارت سے ایک دوسرے پر جما کر اٹھائی گئی تھیں۔ اوپر درخت کے ناتراشیدہ تنے پر رکی ہوئی پھوس کی چھت تھی جس کے اوپر کچھ بھی ہوسکتا تھا۔ مجھے پہلا خیال یہی آیا کہ ہم شنگا راولی پہنچ چکے تھے۔

"سلطان شاہ تو نقاہت سے گونگا ہوچکا ہے۔ تمہارا کیا حال ہے؟" نگاہیں چار ہونے پر ویرا نے کمزور آواز میں کہا۔ اس حال میں بھی اس کی زندہ دلی برقرار تھی۔

"نقاہت!" میں نے بدقت تمام کہا "گیس کے یہ اثرات شاید رفتہ رفتہ ہی جائیں گے۔"

"گیس کے اثرات نہیں' یہ بھوک اور پیاس کی کمزوری ہے جس نے ہم چاروں کو لٹایا ہوا ہے۔ وہ لوگ ہمارا کچھ اور تو بگاڑ نہیں سکے' بس سزا میں کھانا پینا بند کردیا تھا۔ اب شنگا راولی تک ہمیں یہی سزا بھگتنی ہوگی۔ اس میں کوئی رعایت نہیں ملے گی۔"

"تو کیا ہم شنگا راولی میں نہیں ہیں؟" سلطان شاہ کی تیز زدہ مگر کمزور آواز ابھری۔

"میں تقریباً چالیس منٹ سے ہوش میں ہوں۔ صندل خان ہماری خیر خبر لینے آیا تھا۔ اس سے میری بات ہوئی ہے" ویرا رک رک کر بتانے لگی "ہمیں لانے والوں میں سے صندل خان کے علاوہ سب لوگ واپس جاچکے ہیں۔ ٹرک والے واپس پاکستان چلے گئے صفت اللہ کے انتظار میں بیس آدمیوں کا ایک لشکر یہاں موجود تھا۔ وہ انہیں لے کر جلال آباد کی طرف لوٹ گیا ہے جہاں وہ فوجی رسد کے ایک روسی کانوائے پر شب خون ماریں گے۔ ہمیں کوئی بندوبست ہونے تک یہاں رکھا گیا ہے۔ صندل خان کے علاوہ یہاں کئی مقامی محافظ بھی ہیں جو بالکل ہوش ہیں۔ اپنی مقامی بولی کے علاوہ کوئی زبان نہیں جانتے..."

"مگر اِس جگہ کا نام کیا ہے؟" میں نے اُس کی بات کاٹ کر پوچھا۔

"یہ چینا سرائے کا کوئی مضافاتی ویرانہ ہے جہاں ان لوگوں کا مستقل کیمپ قائم ہے۔ شاید ہیروئن اور انسانوں کی اسمگلنگ میں اس اڈے کو ٹرانزٹ کیمپ کے طور پر استعمال کیا جاتا ہے۔"

"اور باہر کا کیا حال ہے؟" میں نے متجسس ہو کر سوال کیا۔

"بستر سے اٹھنے کا دم ہی نہیں ہے۔ زندگی کے احساس کے لیے اتنا کافی ہے کہ زبان چل رہی ہے۔"

"جن لوگوں کو بولنے کا ہیضہ ہوتا ہے وہ قبر میں بھی بولتے رہتے ہیں۔" سلطان شاہ زہریلی ہنسی کے ساتھ بولا۔ "دیکھنا پڑے گا کہ تم زندوں میں ہو یا مر کر بول رہی ہو۔"

"اخاہ! ڈینی کے ہوش میں آتے ہی گونگا بھی بولنے لگا" ویرا بُرا مانے بغیر بولی "میں تو تمہیں لخلخہ سنگھانے کے بارے میں سوچ رہی تھی۔ ڈینی نے تمہیں کسی لاڈلے بچے کی طرح بگاڑا ہوا ہے۔"

"کھانے پینے کے بارے میں کچھ سوچو" سلطان شاہ یک بیک سنجیدہ ہوگیا "اس حالت میں تو ہم مُردوں سے بھی بدتر ہو کر رہ گئے ہیں۔ یہی حال رہا تو رفتہ رفتہ زبان بھی جواب دے جائے گی۔"

میں نے بستر سے اٹھنے کی کوشش کی اور اس میں کامیاب بھی ہوگیا مگر اس مشقت کے نتیجے میں چند لمحوں کے لیے آنکھوں میں اندھیرا سا ناچ کر رہ گیا۔

"فی الحال دیواروں میں چُنے ہوئے پتھر چبا سکتے ہو" ویرا' سلطان شاہ سے کہہ رہی تھی "میں نے صندل خان کی بہت خوشامدیں کیں لیکن وہ بالکل بھی نہ پسیجا۔ وہ تھوڑی دیر بعد دوبارہ آئے تو تم بھی بات کرلینا۔"

اس کمرے میں کوئی کھڑکی نہیں تھی۔ ایک دور افتادہ دیوار میں گزرنے کا راستہ چھوڑ دیا گیا تھا جس پر ٹاٹ کا پردہ لہرا رہا تھا۔ اس وقت مجھے احساس ہوا کہ فضا میں خنکی کافی بڑھی ہوئی تھی۔ سورج غروب ہونے کے بعد وہ خنکی ہمارے لیے ناقابل برداشت بھی ثابت ہوسکتی تھی مگر اس کے مقابلے کے لیے وہاں کمبل یا اسی قسم کی کوئی اور چیز نظر نہیں آرہی تھی۔ کمرے میں تھوں کی ایک بڑی سی چٹائی اور مٹکے کے علاوہ کچھ بھی نہیں تھا۔ مٹکے پر نگاہ پڑتے ہی میرے جسم میں توانائی کی ایک نئی لہر دوڑ گئی۔ اس عالم میں پانی کی تھوڑی سی مقدار بھی ہمیں بہت بڑا سہارا دے سکتی تھی۔ میں اٹھا اور تقریباً جھومتا ہوا مٹکے کی طرف چل دیا۔ میری پیش قدمی پر وہ تینوں ہی حیران رہ گئے پھر انہوں نے بھی اپنی اپنی جگہ چھوڑنے کی کوششیں شروع کردیں۔

میں لڑکھڑاتا اور سنبھلتا ہوا مٹکے کے قریب پہنچا تو اس میں پانی کی جھلک دیکھتے ہی میرا دل اچھل کر حلق میں آگیا۔ شاید صندل خان کو امید نہیں تھی کہ ہم میں سے کوئی چل کر اس مٹکے تک بھی پہنچ سکے گا ورنہ وہ لات مار کر اس مٹکے کو ہی توڑ دیتا۔ وہیں ایک پتھر پر کوزہ بھی رکھا ہوا تھا۔ میں نے صندل خان کی واپسی کے خوف سے نہایت تیزی کے ساتھ پانی نکال کر پینا شروع کردیا۔ پانی ٹھنڈا اور بہت شفاف تھا۔

پانی کا پہلا گھونٹ معدے میں پہنچتے ہی میری رگوں میں زندگی سرایت کرگئی۔ اس وقت مجھے اندازہ ہوا کہ بِن مُول اور بکثرت ملنے والا پانی بھی انسانی حیات کی نمو کے لیے کس قدر ناگزیر ہے۔ لوگ آبِ حیات کی تلاش میں بلاوجہ سرگرداں رہتے ہیں۔ پانی کا ہر وہ گھونٹ جو کئی دن کے پیاسے کو خلاف توقع مل جائے' آبِ حیات ہوتا ہے۔ مگر میں جانتا تھا کہ خالی پیٹ زیادہ پانی پینے سے ابکائیوں کا اذیت ناک سلسلہ شروع ہوسکتا تھا اس لیے میں نے ایک کوزہ پر اکتفا کرتے ہوئے' اسے دوبارہ غزالہ کے لیے بھرلیا۔ فوری طور پر باہر کا جائزہ لینے کے مقابلے میں یہ بات زیادہ اہم تھی کہ ہم صندل خان کی واپسی سے پہلے پانی کی تھوڑی بہت مقدار اپنے جسموں میں پہنچا کر اپنی کچھ توانائی بحال کرلیتے۔

قوتِ ارادی ایسی ظالم شے ہے کہ وہ تینوں جو اپنی جگہوں سے ہلنے کے قابل بھی نہیں تھے' میری دیکھا دیکھی اپنے اپنے پیال چھوڑ کر اٹھ چکے تھے۔ میں نے ان تینوں کو باری باری پانی پلایا۔ آخر میں' میں نے مزید ایک کوزہ اپنے پیٹ میں ڈالا۔ وہ تینوں بھی ندیدوں کی طرح میرے پیچھے لگے ہوئے تھے۔ پیاس سے نجات حاصل کرنے کے بعد ہم چاروں اس پتھریلے کمرے سے باہر نکلے تو ڈھلتے ہوئے سورج کی زرد کرنوں میں ہمارے سامنے سنگلاخ اور بھوری چٹانوں کا ایک لامتناہی سلسلہ پھیلا ہوا تھا جس کے آگے صرف نیلا آسمان نظر آرہا تھا۔

ہمارا کمرا ایک ٹیکرے پر بنا ہوا تھا۔ کچھ فاصلے پر ایک عجیب اور خوفناک شخص اونچی سی چٹان پر رائفل سنبھالے موجود تھا۔ اس کے سر پر بہت بڑی پگڑی اور سینے پر لمبی سی سیاہ داڑھی لہرا رہی تھی۔ ہم پر نگاہ پڑتے ہی اس نے وحشت زدہ آواز میں چیخ کر کچھ کہا۔ اس کا ایک لفظ بھی ہمارے پلے نہیں پڑسکا۔ میں نے اسے مخاطب کرنے کا ارادہ کیا ہی تھا کہ اس نے رائفل کی نال سیدھی کی اور نشانہ لینے کی زحمت کیے بغیر دھائیں کی پُرہول آواز کے ساتھ فائر کردیا۔ اس کی چلائی ہوئی گولی نے ہم سے چند گز کے فاصلے پر چٹان کے ریزے اڑا کر رکھ دیے۔ ہم بوکھلاہٹ کے عالم میں پلٹ کر اسی پتھریلے کمرے کی طرف دوڑ پڑے جہاں سے برآمد ہوئے تھے۔ ہم

چاروں کے اندر پہنچنے تک وہ شخص دوسرا فائر بھی کرچکا تھا۔ اس بار گولی ہمارے عقب میں پڑی تھی اور باریک سنگریزوں کی برسات ہمارے جسموں تک بھی پہنچی تھی۔ وہ بلاشبہ بہترین نشانہ باز تھا اور ایک لمحہ بھی ضائع کئے بغیر اپنی مرضی کے مقام پر فائر کرنے پر قادر تھا۔ اگر اس نے ہمیں خوف زدہ کرنے کے بجائے مارنے کا ارادہ کرلیا ہوتا تو آناً فاناً میں ہماری تعداد نصف ہوسکتی تھی۔ میرے لیے وہ تجربہ بہت وحشت انگیز تھا۔

"اس سے تو بہتر تھا کہ ہم ڈون کوانگ فو کے آدمیوں کے ہی ہاتھ لگ جاتے" اندر پہنچنے کے بعد ویرا نے ہانپتے ہوئے، تنفر آمیز لہجے میں کہا "یہ تو بالکل ہی اجڈ ہیں۔"

"بھول جاؤ، ان سب کو بھول جاؤ" سلطان شاہ بڑبڑایا "ہماری بداعمالیاں ہمیں ان پہاڑوں میں لائی ہیں۔ ایک دن ایسی ہی رائفلوں سے نکلی ہوئی گولیاں ہمارے بھیجے اڑادیں گی۔"

"صندل خان نے ہمیں بلاوجہ آزاد نہیں چھوڑا ہوا ہے" میں نے پرتشویش نظروں سے ان کے زرد چہروں کا جائزہ لیتے ہوئے کہا "اب وہ اپنے علاقے میں ہیں اور رازداری کی الجھن میں پڑے بغیر اپنے فیصلوں کو نافذ کرنے کا اختیار رکھتے ہیں۔ ہمیں یہاں ہر قدم پھونک کر رکھنا ہوگا۔"

"ہم نے بے نتیجہ محاذ آرائی مول لے کر بدرو کے آدمیوں کو بھی اپنا دشمن بنالیا۔ پتا نہیں وہ واپس جاکر اپنے استاد کو کچھ بتاتے بھی ہیں یا انتقاماً خاموش رہتے ہیں" غزالہ نے ایک اور کمزور پہلو پر روشنی ڈالی "یہاں کے حالات بتارہے ہیں کہ ہم اپنی مرضی سے ان پہاڑوں سے نہیں نکل سکیں گے۔"

"ناامیدی کی ضرورت نہیں" میں نے کہا "قابل غور بات یہ ہے کہ سارے مسائل اور مشکلات کے باوجود انہوں نے ہم کو زندہ رکھا ہوا ہے۔ ابھی یہ دیکھنا باقی ہے کہ سردار پائندہ گل ہم سے کیا چاہتا ہے۔"

"سیدھی سی بات ہے کہ وہ جنت گل کے معاملے میں تمہیں مجرم قرار دے چکا ہے" سلطان شاہ کے دوٹوک الفاظ نے مجھے بری طرح چونکا دیا "اب وہ تمہیں اپنے ہاتھوں سے سزا دینی چاہتا ہے۔"

میں نے پہلے سلطان شاہ پھر ویرا کی طرف دیکھا اور وہ مجرمانہ احساس کے ساتھ بولی "میں نے فلیٹ ہی میں غزالہ اور سلطان شاہ کو اس بارے میں اعتماد میں لے لیا تھا۔ مجھے واقعات کی تیز رفتاری کا اندازہ نہیں تھا کہ ہم اسی رات سردار کے قیدی بن جائیں گے لیکن میری چھٹی حس کہہ رہی تھی کہ جنت گل کا قصہ جلد یا بدیر سر ضرور اٹھائے گا اور تم خفت سے دوچار ہوجاؤ گے۔"

میں نے چور نظروں سے غزالہ کی طرف دیکھا لیکن وہ میری طرف متوجہ نہیں تھی۔ شاید وہ اس موقعے پر نظریں چار کرکے مجھے شرمندہ نہیں کرنا چاہتی تھی۔

اس بارے میں ویرا کا مجرمانہ احساس اداکاری سے زیادہ نہ نہیں تھا۔ میں نے خود ہی اس سے فرمائش کی تھی کہ وہ موقع نکا کر جنت گل کا قصہ غزالہ کے کانوں سے گزار دے اور اس نے میری فرمائش بحسن و خوبی پوری کرکے مجھے ایک بہت بڑی دشواری سے بچالیا تھا۔

میں نے اپنی پوزیشن مزید مضبوط کرنے کے لیے ویرا پر خفگی کا اظہار کرتے ہوئے کہا "کیا میں نے تمہیں اس لیے اعتماد میں لیا تھا کہ تم وہ کہانی ہر ایک کو سناتی پھرو؟"

"یہ دونوں ہر ایک کے زمرے میں نہیں آتے" ویرا نے نرمی سے کہا "اچھا ہی ہوا کہ میں نے یہ کام پہلے کرلیا۔ موجودہ حالات میں تمہاری اس کہانی پر غزالہ تک یقین نہ کرتی۔ وہ بعد میں تراشا ہوا عذر بن کر رہ جاتی۔ اور پھر سردار پائندہ گل تو وہی قصہ اٹھائے گا۔ شاید اسے یقین نہیں آسکا کہ تم جان کے خوف کی وجہ سے جنت گل کے اشاروں پر ناچنے کے لیے مجبور ہوگئے تھے۔"

"بظاہر یہی معلوم ہوتا ہے اصل بات تو شنگارا ویلی پہنچنے کے بعد ہی سامنے آسکے گی" میں نے دھیمے سے کہا۔

"ویرا! کیا ہم اس ناخوش گوار ذکر کو فی الحال بھول نہیں سکتے؟" اچانک غزالہ نے بدمزگی سے کہا "جو ہوچکا اس پر رونا بے سود ہے اور جو ہونا ہے وہ ہر حال میں ہوکر رہے گا۔"

ویرا کے جواب دینے سے پہلے ہی پتھریلے فرش پر کئی وزنی جوتوں کی دھمک سنائی دی پھر تین افراد دندناتے ہوئے ہمارے کمرے میں گھستے چلے آئے۔ وہ تینوں مسلح تھے اور ان کے تیور خراب تھے۔ ان میں صندل خان سب سے آگے تھا۔ اس کے کندھے سے سب مشین گن جھول رہی تھی جس میں بڑا میگزین چڑھا ہوا تھا۔ اس کے پیچھے آنے والے افراد کی سرخ اور وحشت زدہ آنکھوں میں اس قدر تیز چمک تھی کہ ان سے نگاہیں ملانا دشوار تھا۔ وہ دراز قامت اور سرخ و سفید قبائلی، بھڑکے ہوئے درندوں کی طرح چوکنے تھے اور ان کی رائفلیں ان کے ہاتھوں میں دبی ہوئی تھیں۔ یہ اندازہ نہیں ہوسکا کہ ہم پر دو فائر کرنے والا ان میں شامل تھا یا نہیں؟

"تم لوگ باہر کیوں گئے تھے؟" صندل خان ہمارے قریب پہنچتے ہی برہمی سے بولا۔

"تم نے ہمیں باہر جانے سے منع نہیں کیا تھا، صندل خان!" ویرا بہت سکون سے بولی۔

"میں آیا تو تم مرنے کے لیے سسک رہی تھیں" وہ دہاڑا "میں سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ تم اپنے قدموں پر چل سکو گی۔ تم سب قیدی ہو، تمہیں یہاں تفریح اور چہل قدمی کے لیے نہیں لایا گیا ہے۔"

اس سے پہلے کہ ویرا پانی کا ذکر کرتی، میں بول پڑا "اب ہم اسی کمرے میں رہیں گے لیکن ہماری ایک التجا ہے۔ بھوک سے ہمارا

بت ابتر ہورہا ہے۔ اس کا کوئی بندوبست ہونا چاہیے۔"

وہ شرربار آنکھوں سے مجھے کئی ثانیوں تک گھورتا رہا پھر ...نے ہوئے بولا "تمہیں تو مر ہی جانا چاہیے۔ عبدل کے ساتھ ...تم ہی نے کی تھی۔ اگر تم خان بابا کے بڑے قیدی نہ ہوتے تو ...تمہاری ہڈیاں توڑ دیتا۔"

"وہ میری سرزمین تھی، میں نے وہاں ہر چال چل کر دیکھ لی مگر ...کام رہا۔ اب ہم تمہاری سرزمین پر تمہارے قیدی ہیں اور خود کو ...ہارے حوالے کرچکے ہیں۔ یہاں کی سزایابی عجیب معلوم ہوتی ہے۔"

اس کی شعلے برساتی ہوئی نگاہوں میں لمحہ بھر کے لیے نرماہٹ ...دار ہوئی جو فوراً غائب ہوگئی اور وہ بپھر کر بولا "میں تمہیں کھلاؤں ...کہ تم میرے آدمیوں کو پہاڑوں میں دوڑا کر ہلکان کرتے پھرو؟"

"ہم تھک چکے ہیں۔ میں وعدہ کرتا ہوں کہ اب شنگارا ویلی ...نچے تک ہم کوئی غلط حرکت نہیں کریں گے۔ ہم نے سمجھ لیا ہے کہ ...دار پائندہ گل جسے بلانا چاہے، اسے دنیا کی کوئی طاقت نہیں ...ک سکتی۔"

"خوب!" اس بار اس کے پتلے پتلے ہونٹوں پر استہزائیہ ...راہٹ ابھر آئی "تو یہ قول ٹھیک ہی ہے کہ بھوک اور پیاس ...ل ہاتھیوں تک کا دماغ درست کردیتی ہے" پھر اس نے اچانک ایک غیر متعلقہ سوال کیا "تم مسلمان ہو؟ تم تینوں؟ یہ میم تو ...رستان ہوگی؟"

"میں بھی مسلمان ہوں" ویرا جھٹ سے بول پڑی "میرا باپ ...ستانی تھا اور میرا نام فرزانہ ہے" اُس کے دعوے میں تسلسل تھا ...ہ کہ اس نے فلیٹ پر سردار پائندہ گل کو اپنا نام فرزانہ بتایا تھا پھر ...تے میں عبدل کو اپنے پاکستانی باپ کی کہانی سنانے بیٹھ گئی تھی۔

"ہم تینوں پکے مسلمان ہیں" میں نے ویرا کی تردید کئے بغیر، ...بت سے کہا۔

"تمہیں حلف لینا ہوگا کہ تم میرے ساتھ وعدہ خلافی نہیں ...کرو گے۔ اسی کے بعد تمہارے کھانے پینے کا بندوبست کرایا جاسکے ...گا۔ میں صرف تمہاری باتوں پر آنکھیں بند کرکے اعتبار نہیں ...کرسکتا۔"

"میں تیار ہوں" میں نے آہستگی سے جواب دیا "لیکن کیا یہ ...حیرت ناک نہیں ہے کہ تم ہیروئن کا دھندا کرنے کے باوجود ...مذہب کی بات کررہے ہو؟"

"بکواس بند کرو!" وہ زمین پر زور سے پیر مار کر دہاڑا "ایک ...دھندا ہے اور دوسرا ایمان ہے۔ روزی کمانے کے لیے کوئی اپنے ...ایمان کو نہیں چھوڑ سکتا۔" پھر وہ ایک جھٹکے سے مڑ گیا "میرے ...ساتھ آؤ۔"

...وہ یک بیک جذباتی ہوگیا تھا اس لیے میں اُس سے یہ پوچھنے کی ...جرأت نہیں کرسکا کہ روزی کمانے کے لیے ایمان کو نہیں چھوڑا جاسکتا تو ایمان برقرار رکھنے کے لیے گندی روزی کو چھوڑنے میں کیا قباحت تھی؟

وہ ہمیں لے کر اس کمرے سے باہر نکلا تو ٹیکری کے سامنے والی چٹان پر موجود رائفل بردار محافظ بدستور وہیں نظر آرہا تھا۔ صندل خان نے رک کر اونچی آواز اور کسی نامانوس زبان میں سے کچھ ہدایات دیں اور وہ ناہموار پتھروں کو عبور کرتا ہوا ہمارے ساتھ آملا۔ صندل خان اس سے پہلے ہی داہنی طرف مڑچکا تھا اور ہم سب اُس کی تقلید کررہے تھے۔ تین میں سے دو محافظ ہمارے پیچھے ہولیے تھے۔ آخر میں آنے والا، ہمارے اور صندل خان کے درمیان چل رہا تھا۔ ایسا معلوم ہورہا تھا جیسے جنگ و جدل کے معاملات ان کے خمیر میں شامل ہوں۔ وہ سب کچھ کہے یا بتائے بغیر یہ جانتے تھے کہ انہیں کس وقت کیا کرنا ہے۔

جوں ہی ہم اپنے کمرے کی اوٹ سے نکل کر قدرے نشیب میں اترے تو میں یہ دیکھ کر حیران رہ گیا کہ اس سنگلاخ ویرانے میں صرف وہی ایک کمرہ نہیں تھا بلکہ اس کے پیچھے اسی قسم کا ایک وسیع سنگی احاطہ نظر آرہا تھا جس میں بڑی بڑی چھتوں والے کئی کمرے نظر آرہے تھے اور ایک طرف بنی ہوئی، گارے کی چمنی میں سے سرمئی دھواں، بل کھاتا ہوا دھیرے دھیرے وادی میں پھیل رہا تھا۔ صندل خان ہماری اس عمارت کی طرف راہنمائی کررہا تھا جو ہم کو بہت قریب نظر آرہی تھی۔

بظاہر وہ فاصلہ چند منٹ سے زیادہ کا نہیں تھا لیکن پرپیچ چٹانوں میں سے گزر کر نشیب میں اترنے کی وجہ سے دو مرتبہ ایسے مقامات بھی آئے جب وہ وسیع مکان اور اس کی چمنی سے نکلتا ہوا دھواں تک ہماری نگاہوں سے اوجھل ہوگیا۔ تقریباً پندرہ منٹ تک مسلسل چلتے رہنے کے بعد ہم ہوا کے رخ پر پہنچے تو فضا میں موجود بھنے ہوئے گوشت کی اشتہا انگیز بو نے مجھے بے چین کردیا۔

مجھے حیرت تھی کہ ہمارے کمرے سے اس وسیع و عریض ڈیرہ کا فاصلہ اتنا زیادہ تھا تو صندل خان فائر ہونے کے فوراً بعد ہی ہم تک کیسے پہنچ گیا تھا لیکن وہ سوال کرنے کا موقع نہیں تھا۔ میں خاموشی کے ساتھ صندل خان کے پیچھے چلتا رہا۔

اس احاطے کی دیوار بھی پتھروں کو ایک دوسرے پر جما کر بنائی گئی تھی۔ دیوار کی موٹائی کسی بھی طرح دو فٹ سے کم نہیں تھی۔ پتھروں کے درمیان سے جھانکتی ہوئی خالی درازیں میں اس بات کی غمازی کررہی تھیں کہ کوہستانی باشندوں نے ان پتھروں کو آپس میں جوڑنے کی کوئی ضرورت محسوس نہیں کی تھی۔

وہ ایک منزلہ حویلی قدیم اور روایتی انداز میں بنائی گئی تھی۔ اندر داخل ہوتے ہی وسیع و عریض صحن تھا۔ اُس سے آگے پھوس کے چھپروں کا دالان تھا جس کے سروں پر درختوں کے تنے گاڑ کر ستونوں کا کام لیا گیا تھا۔ اس دالان کے بعد کمرے بنے ہوئے تھے۔ احاطے کی دیوار کے ساتھ جابجا سخت جان پودے اگے ہوئے

تھے۔ ان کی ترتیب اور بعض پودوں میں کھلے ہوئے تیز رنگوں والے پھولوں کے امتزاج سے یہ ظاہر ہو رہا تھا کہ وہ خودرو نہیں تھے۔ ان کی نشوونما اور دیکھ بھال میں واضح طور پر انسانی ذوق کار فرما تھا۔

بر آمدے یا دالان میں چار بڑی بڑی چارپائیاں پڑی ہوئی تھیں۔ سفیدے یا کسی اور مضبوط درخت کے سبک اور لمبے لمبے تنوں سے تیار کی ہوئی' بان کی وہ چارپائیاں اتنی وسیع و عریض تھیں کہ ہر ایک پر بیک وقت دس بارہ آدمی آرام سے سو سکتے تھے۔ ہمارے ساتھ آنے والے محافظ وہیں رک گئے اور صندل خان ہمیں لے کر وسطی کمرے میں داخل ہو گیا۔

اس بڑے کمرے میں پتھریلے فرش پر چٹائیاں پڑی ہوئی تھیں۔ ایک گوشے میں قالین کے بجائے موٹے موٹے اونی کمبل تہ در تہ بچھا کر نشست کو بہت آرام دہ بنا لیا گیا تھا۔ تین دیواروں پر مشعلیں آویزاں تھیں۔ شام کا اجالا ہونے کی وجہ سے وہ مشعلیں گل تھیں لیکن کمرے کی فضا میں بسی ہوئی چراند سے محسوس ہو رہا تھا کہ انہیں روشن کرنے کے لیے چربی استعمال کی جاتی تھی۔

صندل خان نے ایک چوبی الماری میں سے جزدان میں لپٹا ہوا قرآن شریف نکال کر ہماری طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔ "اب باری باری اسے تھام کر وہی سب کہو جو تم مجھ سے کہہ چکے ہو۔"

"ہم سب ناپاک ہیں۔ غسل کیے بغیر شاید ہم اس مقدس کتاب کو ہاتھ نہ لگا سکیں۔ پچھلے دنوں ہم نے حیوانوں سے بدتر زندگی گزاری ہے" میں نے فکر مند لہجے میں کہا "تم یہ سب جانتے ہی ہو۔"

"تم براہ راست اسے نہیں چھو سکتے مگر یہ جزدان میں لپٹا ہوا ہے۔ تمہارے چھونے سے کوئی فرق نہیں پڑے گا۔"

"ہمیں مجبور نہ کرو۔ ہم بہت اچھے مسلمان نہیں ہیں لیکن قرآن کریم کی حرمت سے خوب واقف ہیں۔" میں نے پھر کہا۔ وہ کچھ دیر تک تکرار کرتا رہا۔ اس دوران میں سلطان شاہ نے پشتو میں اس سے کچھ مذاکرات کیے۔ ہم میں سے ایک کی زبان سے پشتو سن کر اسے خوشگوار حیرت ہوئی پھر وہ اس امر پر آمادہ ہو گیا کہ ہم قرآن شریف کی طرف ہاتھ اٹھا کر حلف لیں۔ ہم تینوں باری باری اس مرحلے سے گزرے۔ لیکن ویرا کو سلطان شاہ نے روک دیا۔ وہ بولا "اس کے مذہب کا کچھ بھروسا نہیں۔ میں اسے لامذہب سمجھتا ہوں لیکن اس کی ذمے داری لے سکتا ہوں۔ یہ بے دین ہونے کے باوجود وعدہ خلافی نہیں کرے گی۔"

"ٹھیک ہے۔" صندل خان نے بلا حیل و حجت اس کی دلیل تسلیم کرتے ہوئے کہا "یہ حلف برداری تمہیں کھانا دینے کے لیے تھی۔ یہ نہ سمجھ لینا کہ تم لوگوں کو کھلی چھوٹ مل گئی ہے۔ یہ اس علاقے کا سب سے آرام دہ کمرا ہے۔ تم سفر کی تیاری مکمل ہونے تک یہیں رہو گے۔ غسل خانے وغیرہ کی ضرورت کے علاوہ تم دالان میں بھی نہیں نکلو گے۔ یہاں کے محافظوں سے تمہیں کوئی نقصان پہنچا تو میں ذمے دار نہیں ہوں گا۔"

اس کے اشارے پر ہم پیر صاف کر کے کمبل پر بیٹھ گئے۔ وہ جگہ بہت آرام دہ ثابت ہوئی۔

"کھانا کب ملے گا؟" ویرا نے دبیز کمبلوں پر دراز ہوتے ہوئے پوچھا۔

"تنور میں مسلم دنبہ تیار ہو رہا ہے۔ کمال ہے کہ گوشت بھننے کی بو تمہیں محسوس نہیں ہو رہی۔ تم لوگ ایک ایک کر کے نہا دھو لو۔ میں بھی تھوڑی دیر میں واپس آتا ہوں۔ اس وقت تک دنبہ بھی تیار ہو جائے گا۔ اس کی لذت تمہیں دیوانہ بنا کر رکھ دے گی۔"

وہ قرآن شریف سمیت وہاں سے لوٹ گیا اور سلطان شاہ ہمیں بتانے لگا کہ مقامی محافظ پشتو یا فارسی کے بجائے کوئی اور ہی زبان بول رہے تھے جو اس کی سمجھ سے باہر تھی۔

"کیا تم لوگ سنجیدگی سے اپنے حلف پر قائم رہنے کا ارادہ رکھتے ہو؟" سلطان شاہ کی بات ختم ہو جانے پر ویرا نے رازدارانہ لہجے میں ہم سب سے مشترکہ سوال کیا۔

"اِس سے انحراف کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا" میں نے اسے گھورتے ہوئے کہا "اگر تمہارے ذہن میں کوئی منصوبہ پرورش پا رہا ہے تو شنگارا ویلی پہنچنے تک اسے بھول جاؤ۔"

"تم لوگ بھی ناقابل فہم ہو۔ ساری زندگی جھوٹ' فریب اور دغابازی میں گزار دیتے ہو لیکن کہیں کہیں رگ بھڑک جائے تو زندگیاں تک داؤ پر لگا دیتے ہو۔ کچھ سمجھ میں نہیں آتا کہ تم سچ اور جھوٹ کے درمیان کب اور کہاں لکیر کھینچتے ہو۔ میں بتائے دیتی ہوں کہ سردار پائندہ گل تمہاری گردنوں میں غلامی کا طوق ڈال دے گا۔ عافیت اسی میں ہے کہ ہتھیار نہ ڈالے جائیں۔ کھاؤ پیو اور راستہ بناتے ہی ان پر دھاوا بول دو۔"

"ہرگز نہیں" سلطان شاہ غرّا کر بولا "ایسا کیا تو تم میرے ہاتھوں ماری جاؤ گی۔"

غزالہ وہاں سے اٹھ کر باہر چل دی۔ سلطان شاہ دروازے تک اس کے ساتھ گیا اور اس وقت تک وہاں کھڑا رہا جب تک غسل خانے میں نہ چلی گئی۔ پھر وہ واپس لوٹ آیا۔

مٹکے کے پانی سے حاصل ہونے والی حیرت ناک توانائی نے ہمارے نیم مُردہ جسموں میں نئی روح پھونکی ہوئی تھی۔ باہر پانی وافر مقدار میں موجود تھی۔ لوہے کے ڈرموں میں سے ... سب تازہ دم ہو گئے۔ اپنے بستروں سے اٹھائے جانے کے بعد ... نے وہاں پہلی بار اپنے جسم پر پانی ڈالا تھا اور حوائج ضروریہ ... اپنے گرد چار دیواری موجود پائی تھی۔ ہم چاروں کو شدت سے اس بات کا احساس ہوا کہ سب کچھ میسّر آجانے کے باوجود ہم ... پیر تھے۔ ہمیں بستروں سے اغوا کیا گیا تھا اس لیے ہمارے ...

دنیا سے محروم تھے۔

پہاڑی علاقوں میں سورج بہت تیزی کے ساتھ غروب ہوتا ہے۔ ... سرائے کے اس نواحی علاقے میں بھی دیکھتے ہی دیکھتے اندھیرا پھیلتا چلا گیا لیکن دھندلکا پھیلتے ہی ایک شخص نے ہمارے کمرے میں موجود تینوں دیوار گیر شمعیں روشن کر دیں اور فضا میں جلنے کی ناگوار بو پھیلنے لگی۔ غنیمت یہ تھا کہ اس کمرے میں تازہ ہوا کے گزر کے لیے کھڑکیاں موجود تھیں' اِس لیے کمرے کی فضا بوجھل ہونے سے محفوظ رہی۔

پھر صندل خان بھی تر و تازہ ہو کر وہیں آگیا۔ دو خدمت گاروں نے فوراً ہی دبیز کمبلوں پر چند گدیاں ڈال دیں پھر روسی واڈکا کی ایک بڑی بوتل بھی دو گلاسوں سمیت آگئی۔

"دوسرا گلاس کس کے لیے ہے؟" میں نے صندل خان کو ناگوار موڈ میں دیکھ کر پوچھا۔

"فرزانہ میم ہے۔ یہ ضرور میرا ساتھ دے گی۔ مجھے اکیلے پینے میں لطف نہیں آتا۔"

"ساتھ تو میں بھی دوں گا۔ تندوری دنبہ کھانے کا مزہ آجائے گا" میں نے کہا۔

صندل خان خوش ہو گیا۔ فوراً ہی تیسرا گلاس بھی آگیا۔ ویرا نے صندل خان کے اشارے کا انتظار کیے بغیر اِن گلاسوں میں وہ سفید شراب انڈیلنی شروع کر دی۔

"تم چاروں سے ہونے والے سمجھوتے کے نام پر" صندل خان نے اپنا گلاس اٹھا کر فضا میں لہرایا۔ ہم نے اس کا ساتھ دیا۔ میں نے پہلا گھونٹ لیا تو مجھے بے اختیار جہانگیر یاد آگیا جسے میں نے مار مار کر شراب نوشی پر لتاڑنے کی کوشش کی تھی جبکہ میرا معدہ نہ جانے کب سے خالی تھا۔

"روسی فوجیوں سے ہتھیار اور راشن کا ذخیرہ ملے یا نہ ملے' واڈکا ضرور ملتی ہے" صندل خان نے سگریٹ سلگاتے ہوئے کہا "روسی واپس لوٹ گئے تب بھی یہاں واڈکا کی مانگ ختم نہیں ہوگی۔ تم خوش قسمت ہو کہ صبغت اللہ واپس چلا گیا۔ وہ موجود ہوتا تو تم سے کسی مصالحت کی نوبت ہی نہ آتی۔"

"وہ جہاد پر گیا ہوا ہے اور ہم اس کی غیر حاضری کا ثواب حاصل کر رہے ہیں" میں نے ہنس کر کہا۔ مے نوشی کی محفل جمتے ہی ماحول یک بیک دوستانہ بلکہ پُرلطف ہو گیا تھا۔ یہ محسوس ہی نہیں ہو رہا تھا کہ ہم چاروں صندل خان یا سردار پائندہ گل کے قیدی ہیں۔

میری بات سنتے ہی صندل خان خوش دلی سے ہنس پڑا اور بولا "جہاد' مولوی' ملا کر رہے ہیں' ہم لوگ تو صرف مال بنا رہے ہیں۔ جب مولویوں کی نفری کم پڑتی ہے یا انہیں مار کھانے کا ڈر ہوتا ہے تو ہمارے جیسے لوگوں سے روسیوں کی مخبری کر دیتے ہیں اور ہم انہیں ... کر کے ان کی وردیاں تک لوٹ لیتے ہیں۔ روس کی بنی ہوئی کلاشنکوفوں کی پاکستان میں بہت مانگ ہے۔ تھوک میں ایک رائفل کے چھ سات ہزار پاکستانی روپے ہر وقت مل جاتے ہیں۔ اتنی بڑی رقم ایک افغان جرنیل یا کسی بھی بڑے سے بڑے افسر کی ایک مہینے کی تنخواہ سے زیادہ ہوتی ہے۔ مجھے معلوم ہے کہ صبغت اللہ واپس آئے گا تو گولہ بارود' ہتھیاروں اور رسد کے علاوہ تیس چالیس رائفلیں بھی لائے گا جو کل ہی درہ میں بیچ دی جائیں گی۔"

"پاکستان میں یہ ہتھیار کراچی تک جاتے ہوں گے" سلطان شاہ نے پوچھا۔

"کراچی ان کی سب سے بڑی منڈی ہے۔ وہاں پہنچتے پہنچتے' سات ہزار کی کلاشنکوف چودہ ہزار کی ہو جاتی ہے۔ بیچ کے لوگ اس دھندے میں اندھا دھند مال کما رہے ہیں۔ بعض اوقات تو پیشگی آرڈر کے ہتھیاروں پر قبضہ کرنے کے لیے روسیوں پر دھاوا بولا جاتا ہے۔" وہ گلاس سے ہلکی ہلکی سی چسکیاں لیتے ہوئے بولتا رہا۔

"آج کلاشنکوف پھیل رہی ہے۔ کل پاکستان میں راکٹ اور راکٹ لانچر بھی عام ہو جائیں گے" میں نے کہا۔

وہ کسی خیال کے زیر اثر مسکراتے ہوئے بولا "ابھی اُن کی مانگ کم ہے' رفتہ رفتہ وہ بھی بڑھ جائے گی۔ سرحد سے اِدھر راکٹوں کی مارکیٹ بڑھ رہی ہے۔ شاید تم نے ملّا راکٹی کا نام سنا ہو گا۔ اس کے بارے میں مشہور ہے کہ وہ مکھی مارنے کے لیے بھی راکٹ فائر کرتا ہے۔ وہ دن رات اپنے کندھے پر لانچر اٹھائے پھرتا ہے۔ سوتے وقت بھی اس کا لانچر سرہانے رکھا رہتا ہے۔ نئے لڑکوں میں ملّا راکٹی دن بدن مقبول ہو رہا ہے۔"

"ملا راکٹی کا نام میرے لیے اجنبی ہے۔ میں ملّا سرکار کو ضرور جانتا ہوں۔" میں نے کہا۔

"اسے میں نہیں جانتا" صندل خان نے سادگی سے اعتراف کرتے ہوئے کہا "ہمارا اس جنگ سے کوئی قریبی واسطہ نہیں ہے۔ شنگارا ویلی پر ہماری اپنی حکومت ہے۔ روسی وہاں مر کر بھی نہیں پہنچ سکتے۔ ہم تو صرف لوٹ مار کے لیے ان کو گوریلا کارروائیوں کا نشانہ بناتے ہیں اور فوراً ہی اپنے ٹھکانوں کی طرف لوٹ آتے ہیں۔ اِس جنگ میں کتنے ملا اور مولوی لڑ رہے ہیں؟ اس سے ہمیں کوئی سروکار نہیں ہے۔"

"اور ہیروئن کی تجارت پر اِس بدامنی سے کیا اثر پڑ رہا ہے؟" ویرا نے پوچھا۔

"سچ پوچھو تو یہی ہماری دکھتی رگ ہے۔" وہ ایک گہرا سانس لے کر بولا "ہمارے علاقے میں صدیوں سے پوست کاشت ہوتی چلی آئی ہے۔ اس جنگ نے افیم کے خاندانی زمینداروں کی اجارہ داری کو تباہ کر ڈالا ہے۔ پوری سرحدی پٹی میں جگہ جگہ افیم کی نئی نئی زمین داریاں ابھرتی جا رہی ہیں۔ لڑنے والوں نے بھی پیسہ کمانے کے لیے زرخیز زمینوں پر زبردستی قبضہ کر کے پوست کی کاشت کر ڈالی ہے۔ یہ اناڑی لوگ ساکھ کی پروا کیے بغیر اندھا دھند مقابلے کو

فروغ دے رہے ہیں۔ اِس سے ہماری آمدنی بری طرح متاثر ہوئی ہے۔"

"لیکن تم لوگ پھر بھی پہلے سے زیادہ مضبوط اور خوش حال ہوتے جارہے ہو" ویرا بولی۔

اس نے اپنا گلاس خالی کرکے ویرا کے آگے رکھ دیا۔ ویرا اُس میں واڈکا انڈیلنے لگی تو وہ بولا "پہلے ہم افیم کی فصل نقد بیچ کر اپنا پیٹ پالتے تھے۔ اب افیم میں کچھ نہیں رکھا۔ اسی لیے ہم اُس سے ہیروئن بنانے پر مجبور ہیں۔ ہیروئن کی بہت مانگ ہے اور اسی وجہ سے ہم زور پکڑتے جارہے ہیں۔ عمدہ مال بنانے والوں کو پورے سال کی پیشگی ادائیگیاں کرکے پابند کرلیا جاتا ہے۔ اس میں بھی نئے لوگ سراٹھارہے ہیں لیکن سب مل کر بھی خریداروں کی مانگ پوری نہیں کرپارہے اس لیے یہ کام فی الحال زوروں پر ہے۔ کل گورے کوئی نئی چیز بازار میں لے آئے تو ہیروئن کی اصل لاگت ملنی بھی مشکل ہوجائے گی۔ مگر وہ وقت ابھی کچھ دور نظر آتا ہے۔"

وہ بظاہر پہاڑوں میں محصور رہنے والا ایک بے خبر قبائلی نظر آتا تھا لیکن اس کی جبلی صلاحیتیں قابل تعریف تھیں۔ ہیروئن کے بارے میں اُس کے اندیشے بالکل ہی دوراز کار نہیں تھے۔ امریکا اور لاطینی امریکا کے ممالک میں جرائم پیشہ تنظیمیں کوکین کے فروغ کے لیے دن رات کام کررہی تھیں۔ اس امر میں کوئی شبہ نہیں تھا کہ ہیروئن کے مقابلے میں کوکین ایک مہنگا نشہ تھا لیکن دولت مندوں کی دنیا میں اُس کی زبردست مانگ تھی۔ اُس کے دام گرانے کے لیے سرتوڑ کوششیں جاری تھیں تاکہ اسے ہیروئن کے مقابل صف آرا کیا جاسکے کیونکہ کوکین کے خام مال کے سلسلے میں سفید فام خود کفیل تھے۔ اس کے لیے انہیں زرد اور رنگ دار قوموں پر انحصار کرنے کی ضرورت نہیں تھی۔

میرے لیے اس کی باتیں بہت خیال انگیز تھیں۔ ہیروئن کی پیداوار اور وبائی فروغ کے بارے میں پاکستان اور سرحد پار کے قبائلی علاقوں کے کردار کے بارے میں، میں بہت کچھ سنتا رہا تھا۔ ٹی میں شمولیت کے دوران میں اور اس کے بعد میں بہتیرے تجربات سے گزرا تھا جنہوں نے ثابت کردیا تھا کہ ہمارے ملک کے شہروں اور قصبوں میں شمال مغربی سرحدوں سے ہیروئن کی یلغار ہورہی تھی مگر وہ پہلا موقع تھا کہ میں خود اُس خطہ زمین پر موجود تھا اور وہاں کے ایک باسی سے اس کی آپ بیتی سن رہا تھا۔

افغانستان میں ہونے والی لڑائی کو خواہ کوئی نام دیا جاتا، اُس کے سیاسی اور معاشی پہلوؤں پر کسی بھی انداز میں رائے زنی کی جاتی لیکن یہ ایک مسلمہ حقیقت تھی کہ اِس جنگ نے پاکستان پر خطرناک اخلاقی اور معاشرتی اثرات مرتب کئے تھے۔ ممنوعہ ہتھیاروں کو کھلے بازار کی جنس بناکر جرائم، تشدد، ہیجان پسندی، دہشت گردی اور لوٹ مار کو اتنی تیزی سے فروغ دیا تھا جو پینتیس برس سے زائد مدت گزر جانے کے باوجود چشم فلک نے نہیں دیکھی تھی۔ ہتھیاروں کے ساتھ منشیات بلکہ خاص طور پر ہیروئن نے حیران کن مقبولیت حاصل کی تھی۔ ان دونوں بربادیوں نے نوجوان اور ابھرتی ہوئی نسل کو تاک کر اپنا نشانہ بنایا تھا۔

آبادی کے بڑھتے ہوئے دباؤ اور محدود وسائل کے ضدین سے وجود میں آنے والی معاشی محرومیوں نے نوجوان طبقے کو بری طرح برباد کیا تھا۔ روزگار سے محروم نوجوانوں کی عزت نفس قدم قدم پر جراحت میں مبتلا ہورہی تھی۔ اِس جنگ نے مایوس بے مراد نوجوانوں کے بے کراں ہجوم کو دو تحفوں سے نوازا تھا جن میں معاشرے سے بغاوت کرنے اور سرکشی اپنانے کا مادہ تھا انہوں نے اپنے توانا بازوؤں میں کلاشنکوف سنبھال کر اپنا نام نہاد حق چھین لینے کا فیصلہ کرلیا تھا۔ جو بے حوصلہ تھے اور اپنے مسائل سے گریز یا فرار حاصل کرنا چاہتے تھے انہوں نے ہیروئن کے نشے میں پناہ ڈھونڈلی تھی۔ ایسے محروم اور بے عمل نوجوان جب ہیروئن کا جہنم دہکا کر اس کا دھواں اپنے پھیپھڑوں میں کھینچتے تھے تو ان کے خوابوں میں رنگ و شباب کی ہزاروں کہکشائیں جھلملانے لگتی تھیں۔ نالیوں، کوڑا گھروں اور گندی گزرگاہوں پر مدہوش پڑے ہوئے نوجوان ثروت واقتدار کے جھوٹے خوابوں میں کھوئے رہنے کو زندگی کی معراج سمجھنے لگے تھے۔ ہیروئن کا نشہ انہیں خوابوں میں وہ سب عطا کردیتا تھا جس سے وہ اپنی جیتی جاگتی زندگیوں میں سدا محروم رہے تھے۔ وہ ہیروئن پیتے تھے اور پھر پیتے ہی چلے جاتے تھے حتیٰ کہ اُن کے لاغر جسموں، استخوانی چہروں، بے نور آنکھوں، گندے ناخنوں اور خشک ہونٹوں پر موت کے سرد سائے بڑی خاموشی سے سایہ فگن ہوجاتے تھے۔

جب کہیں کوئی جنگ لڑی جاتی ہے تو وہ سب سے پہلے اپنے قُرب وجوار میں اخلاق کا خاتمہ کرتی ہے۔ کلاشنکوف چلانے والے سورما ہوں یا ہیروئن پینے والے بزدل، دونوں طبقات ہی اخلاقی بربادی کے نتیجے میں وجود میں آئے تھے اور اس اخلاق کو افغان جنگ نے نگل لیا تھا جو اِن دنوں ہماری سرحدوں پر لڑی جارہی تھی لیکن اُس نے اپنے اثرات سرحد سے سیکڑوں میل دور تک پہنچادئے تھے۔ شنگارا ویلی کا صندل خان، روسی واڈکا پیتے ہوئے صاف اور سادہ الفاظ میں ان ہی پیچیدہ حقیقتوں کی نشاندہی کررہا تھا جو روح اور جسم کی طرح ایک دوسرے میں پوری طرح پیوست تھیں لیکن بادی النظر میں ایک دوسرے سے غیر متعلق نظر آتی تھیں۔

شام رات میں ڈھل گئی۔ مشعلوں کی روشنی تیز ہوگئی۔ ہوا کے جھونکوں کے ساتھ بھڑکتے ہوئے شعلوں کی وجہ سے ہم سب کے سائے آوارہ روحوں کی طرح گھٹ بڑھ کر اِدھر اُدھر لپک رہے تھے۔ واڈکا کا دوسرا گلاس خالی کرنے کے بعد صندل خان کی آنکھوں میں خمار کے سرخ ڈورے تیرنے لگے تھے۔ اور ارادے سے زیادہ کسی حیوانی جبلت کے تحت ویرا میں بہت دلچسپی لینے لگا تھا اور ویرا اپنی مخمور آنکھیں اس کی آنکھوں میں ڈال کر پُرسرور لہجے میں باتیں کررہی تھی۔ وہ ہم لوگوں کی ساقی گری کرتے ہوئے، واڈکا کی بوتل دھیمے دھیمے خالی کرتی جارہی تھی اور کمبل پر رکھی ہوئی مٹی کی پیالی جلی ہوئی دیا سلائیوں، راکھ اور سگریٹ کے سوختہ ٹکڑوں سے بھرتی جارہی تھی اور مجھے تنور میں بھونے جانے والے گوشت کی بھینی بھینی خوشبو بے چین کرنے لگی تھی۔

"برادر صندل خان!" اچانک سلطان شاہ نے دھیمے سے پکارا "تم تو پتا نہیں کب تک یوں ہی شراب پیتے رہوگے۔ اس میں نشے کے ساتھ طاقت بھی ہوتی ہے۔ ہم دونوں بھوک سے بے حال ہوئے جارہے ہیں۔"

"تم بھی پینی شروع کردو" صندل خان مخمور ہنسی کے ساتھ بولا۔

"زیادہ دیر تک تنور میں رہنے سے گوشت سوکھ کر اکڑنا شروع ہوجائے گا" میں نے کہا "دسترخوان لگوالیا جائے تو کھانے کے ساتھ پینے کا دور بھی چلتا رہے گا۔ رات اپنی ہی ہے۔"

"خوب! تم تو خاندانی بھٹیارے معلوم ہوتے ہو" صندل خان نے جھوم کر قہقہہ لگایا پھر اونچی آواز میں کسی کو پکارا۔ دالان سے فوراً ہی ایک محافظ مودبانہ انداز میں اندر آموجود ہوا۔ صندل خان نے مقامی بولی میں اسے مختصری ہدایات دیں اور وہ تیز رفتاری کے ساتھ واپس لوٹ گیا۔

"نشے میں یہ نہ بھول جانا کہ تم چاروں میرے قیدی ہو" صندل خان تیسرے گلاس سے انصاف کرتے ہوئے بولا "پینے پلانے کے دوران میں، میں رتبوں کا خیال بالکل بھلادیتا ہوں۔"

"فکر نہ کرو۔ یہ بھول گئے تو ہم یاد دلادیں گے" سلطان شاہ نے لقمہ دیا "ہم دونوں نے شراب کی ایک بوند بھی نہیں چکھی ہے۔ ہماری انتڑیاں اب خشکی سے بل کھانے لگی ہیں۔"

اسی وقت ایک آدمی منقش چوبی چوکی لے آیا جو جگہ بناکر ہمارے درمیان رکھ دی گئی۔ ململ کے چُنے ہوئے کلف دار دوپٹوں سے ملتے جلتے رنگین کپڑے ہم پانچوں کے حوالے کئے گئے اور ہم اس گول چوکی کے گرد بیٹھ گئے۔ چند لمحوں بعد دو آدمی تانبے کے قلعی دار تھال میں سالم دنبہ لے آئے جس میں سے نکلنے والی گرم گرم بھاپ نے پورے کمرے کو اشتہا انگیز خوشبو سے بھردیا۔

اس تھال میں دنبے کے گرد پیاز کے لچھے، ٹماٹر، لیموں اور پودینے کے پتے پھیلے ہوئے تھے۔ اس میں پانچ تیز دھار چھریاں اور اتنی ہی نوکدار سلاخیں بھی تھیں جن کے دستے اخروٹ کی نقش دار لکڑی کے تھے۔

"بسم اللہ!" صندل خان نے ہماری طرف دیکھ کر داہنے ہاتھ میں چھری اور بائیں ہاتھ میں سلاخ اٹھالی۔ اس نے سلاخ کی نوک دنبے کے سینے میں پیوست کرکے چھری سے سلائیاں کاٹنے کا آغاز کردیا۔ سلطان شاہ نے اسی عمل کی ابتدا پیٹ کے پردوں سے کی پھر ان ہی دونوں نے سلائی کے دھاگے نکال کر دنبے کو درمیان سے چیردیا۔ پیٹ میں بھرے ہوئے چاولوں کی مہک نے ہم سب کو کھانے پر ٹوٹ پڑنے پر مجبور کردیا۔

ویرا کے لیے وہ ایک انوکھا اور روایتی تجربہ تھا کہ سب لوگ ایک ہی تھال میں ہاتھوں سے کھارہے تھے۔ صندل خان نے سیر چشمی کا مظاہرہ کرتے ہوئے دنبے کی چاروں ٹانگیں ہم لوگوں کے حوالے کردیں اور ہمارے اصرار کے باوجود خود بھنی ہوئی چکتی لے کر بیٹھ گیا جس میں خالص روغنی ریشوں کے علاوہ کچھ نہیں تھا۔ اس نے چکتی الگ کرنے کے بعد کلف دار دوپٹے سے ہاتھ صاف کئے تو ہمیں ان رنگین کپڑوں کا صحیح مصرف بھی معلوم ہوگیا جو بظاہر صرف آرائشی معلوم ہورہے تھے۔

گوشت اِس قدر لذیذ اور نرم تھا کہ طویل فاقہ کشی کے بعد وہ ذائقہ میسر آنے پر ہم سب ہی بے تحاشا تعریفوں پر مجبور ہوگئے۔ صندل خان نے چکتی کا ایک بڑا سا ٹکڑا منہ میں رکھ کر لمبے لمبے چاولوں کا ایک لقمہ اپنے منہ میں ڈالا پھر سہلاتے ہوئے بمشکل تمام بولا "اس پر تمہاری مہر تھی ورنہ یہ خاص کھانا ہم لوگوں نے اپنے لیے تیار کرایا تھا۔ مجھے تندوری گوشت بہت مرغوب ہے" لقمہ چبانے کے بعد اس نے گلاس منہ سے لگالیا۔

"میں نے روئے زمین پر اِس سے زیادہ لذیذ چیز آج تک نہیں کھائی" ویرا پرگوشت ران کے ایک حصے کو دانتوں سے ادھیڑنے کے بعد بولی "ہر چیز کا تناسب بے مثال ہے۔ واڈکا کے بعد اس سے زیادہ شاندار کھانا تو شاید کسی زار کو بھی نصیب نہ ہوا ہوگا۔"

ابتدا میں میرا خیال تھا کہ وہ سالم دنبہ ہم پانچوں کے لیے ضرورت سے بہت زیادہ تھا لیکن دیکھتے ہی دیکھتے اس تھال میں ہڈیوں کا ڈھیر پڑا رہ گیا۔ گوشت کا ہر ریشہ، پوری سلاد سمیت ہمارے جسموں میں اترچکا تھا۔ پیٹ بھرگیا تھا لیکن نیت نہیں بھری تھی۔ ویرا نے اس پہاڑی کھانے کی صحیح ترین تعریف کی تھی۔

میں نے چھری اور سلاخ تھال میں ڈال کر اپنا گلاس خالی کردیا۔

"صرف ایک ہی دنبہ تیار کیا گیا تھا؟" ویرا نے صندل خان کی طرف دیکھتے ہوئے، مخمور اور پُرامید آواز میں سوال کیا۔ اس کی نظروں سے ندیدہ پن صاف ظاہر ہورہا تھا۔

"آج کے لیے یہی کافی تھا" وہ قہقہہ مار کر بولا "اگلی رات یہیں بسر کرنی پڑی تو کل دو بھیڑیں پکواؤں گا۔ تندوری بھیڑ کھانے کے بعد تم آج والے دنبے کو بھی بھول جاؤگی۔ اِن پہاڑوں کی کڑی زندگی ہم گوشت کھاکر گزارتے ہیں۔ اِس ہنر میں ہم لوگ دور دور تک شہرت رکھتے ہیں۔"

غزالہ اور سلطان شاہ نے سرسبز سرسوں سے ڈھکی ہوئی، مٹی کی صراحی سے پانی پیا۔ ویرا کے لیے وہ صراحی بھی حیران کن ثابت

ہوئی۔ ململ کے رنگین دوپٹوں سے ہاتھ اور منہ صاف کرکے جب انہیں تپائی پر رکھ دیا گیا تو دو خدمت گار آئے اور چوکی کو اسی طرح اٹھا کر لے گئے۔

واڈکا نے میری کھوپڑی پر زیادہ اثر نہیں ڈالا تھا لیکن اس مرغن غذا سے شکم سیر ہونے کے بعد میرے اعصاب پر گہرا خمار طاری ہونے لگا۔ ویرا ایک گدی کو تکیہ بنا کر دبیز کمبلوں پر دراز ہوگئی۔ لیکن صندل خان پرخوری کا عادی معلوم ہوتا تھا۔ اتنا کھالینے کے بعد بھی وہ پینے پر تلا ہوا تھا۔

صندل خان کے اصرار پر مجھے اس کا ساتھ دینا پڑا۔ ویرا نے فوراً ہی کان پکڑ لیے تھے۔ چوتھا گلاس خالی ہونے تک صندل خان بھی لہرانے لگا اور اسی وقت سیاہ قہوے کی پیالیاں آگئیں۔

صندل خان پر بھی اچانک ہی گہرا نشہ سوار ہوا تھا۔ اس کی زبان لڑکھڑانے لگی تھی۔ اس نے ہمیں آگاہ کیا کہ سیاہ قہوہ مرغن دنبے کو ہضم کرنے کے لیے بہت ضروری تھا۔ سگریٹوں کا دھواں اڑاتے ہوئے ہم نے خاموشی کے ساتھ قہوے کی پیالیاں خالی کیں پھر ہر شخص کسل مند نظر آنے لگا۔ غزالہ ایک گدی لے کر کچھ فاصلے پر دراز ہوگئی۔ صندل خان نے اٹھنا چاہا لیکن اپنی جگہ پر لڑکھڑا کر رہ گیا۔

لحہ بھر کے لیے میرے دماغ میں فتور پیدا ہوا کہ اسے زیر کرنے کے لیے وہ بہترین موقع تھا لیکن فوراً ہی مجھے اپنا حلف یاد آگیا۔ پھر یہ بھی یاد آیا کہ باہر بیٹھے ہوئے رائفل بردار محافظ نشے میں نہیں تھے۔ وہ صندل خان کی حفاظت کے لیے ہماری ٹانگیں چھلنی کرسکتے تھے۔ تیسرا خیال یہ آیا کہ ہم نے دوستانہ ماحول میں بادہ نوشی کرنے کے بعد ایک ہی دسترخوان پر اس کا نمک کھایا تھا۔ اس وقت ہماری کوئی بھی شرارت نمک حرامی سے کم نہ ہوتی۔

باہر والے شاید اندر کی صورت حال سے غافل نہیں تھے۔ صندل خان کے لڑکھڑاتے ہی اِدھر سے ایک نیم وحشی شخص اندر داخل ہوا پھر وہ صندل خان کی بغلوں میں ہاتھ دے کر اسے آہستہ آہستہ اپنے ساتھ باہر لے گیا۔ اِس وقت صندل خان کی آنکھیں خمار سے بند ہوئی جارہی تھیں۔

وہ ہماری شب بسری کے بارے میں شاید پہلے ہی ہدایات دے چکا تھا کیونکہ چند منٹ بعد ایک شخص نے چار وزنی کمبل ہمیں لادیئے جو فضا میں بڑھتی ہوئی خنکی کے پیش نظر بہت ضروری تھے۔ واپسی پر وہ شخص واڈکا کی بوتل لے گیا۔ گلاسوں کے ساتھ سرسوں دار صراحی وہیں پڑی رہ گئی۔ جاتے جاتے اس نے دو دیوار گیر مشعلیں بھی بجھادی تھیں لیکن تیسری مشعل کی روشنی اس کمرے کو آرام دہ حد تک منور رکھنے کے لیے کافی تھی۔

"آج صندل خان نے ہماری مدارات کرکے پچھلے کئی دنوں کی مایوسی کو بالکل دھو ڈالا ہے۔ میں خود میں نیا حوصلہ اور تازگی محسوس کررہی ہوں" ویرا نے اپنے پیروں پر کمبل ڈالنے کے بعد کہا۔

"تازگی نہیں، یہ روسی شراب کا نشہ ہے" سلطان شاہ نے چبھتی ہوئی آواز میں کہا "صندل خان کھلا پلا کر مارنے کا قائل معلوم ہوتا ہے۔ اس نے تم دونوں کو حلق تک شراب پلادی ہے۔"

"شرابیوں کی بھی ایک برادری ہوتی ہے" غزالہ نے اس کا ساتھ دیتے ہوئے کہا "تم نے دیکھا کہ یہ تینوں کس قدر گھل مل کر باتیں کررہے تھے؟ معلوم ہی نہیں ہورہا تھا کہ ان میں سے شکار کون ہے اور شکاری کون؟"

"تم دونوں جلتے رہو۔ آج کی دعوت کے خاص مہمان ہم دونوں ہی تھے" ویرا بولی "اگر یہاں شراب نوشی میں اس کا ساتھ دینے والے موجود نہ ہوتے تو وہ اپنے محافظوں اور خدمت گاروں میں جا بیٹھتا اور ہمارے مقدر میں وہ پتلا شوربہ آتا جو آج دوسروں نے ہمیں کوس کوس کر پیا ہوگا۔"

"تمہاری سوچ پینے سے شروع ہوکر کھانے پر ختم ہوجاتی ہے" سلطان شاہ جل کر بولا "تمہیں شنگارا ویلی پہنچ کر پتا چلے گا کہ تم روس کے بادشاہوں کی کون سی نسل سے تعلق رکھتی ہو۔"

وہ دونوں الجھتے رہے لیکن میرے ذہن پر نیند کے پرسرور خمار کا غلبہ ہوچلا تھا۔ نیچے بچھے ہوئے گداز کمبلوں کے بعد جسم پر بھی لحاف اوڑھ لینے کے بعد یہ خمار بتدریج گہرا ہوتا چلا گیا اور میں تھوڑی ہی دیر میں نیند کی پرسکون وادیوں میں اترتا چلا گیا۔

اگلی صبح ہمیں جھنجھوڑ جھنجھوڑ کر گہری نیند سے بیدار کیا گیا۔ میں نے ہڑبڑا کر آنکھیں کھولیں تو باہر پھیلی ہوئی ناکافی روشنی سے اندازہ ہوا کہ سورج طلوع ہوئے زیادہ دیر نہیں ہوئی۔ رات کو ہونے والی عزت افزائی کے بعد صبح سویرے کی اس ناقدری سے طبیعت کو بہت کوفت ہوئی لیکن آنے والوں میں سے ایک نے اس افراتفری کا سبب بیان کرکے ہمیں قدرے مطمئن کردیا۔

اس نے بتایا کہ ہمیں شنگارا ویلی لے جانے کے لیے غیر متوقع طور پر گاڑیاں آپہنچی تھیں اور ہمیں جلد از جلد سفر کے لیے تیار ہوجانا تھا۔ اس کیمپ سے آدھے گھنٹے بعد روانگی عمل میں آنے کی صورت میں اسے پورا یقین تھا کہ اندھیرا پھیلنے سے پہلے وہ گاڑیاں منزل پر پہنچ جائیں گی۔ وہ اکھڑ لہجے میں ٹوٹی پھوٹی اردو میں بول رہا تھا۔

ہمیں جگانے کے بعد وہ چلا گیا اور ہم تیزی کے ساتھ منہ ہاتھ دھونے میں مصروف ہوگئے۔ چند منٹ بعد ہمارا ناشتا آگیا جس میں پھولے ہوئے گرم گرم نان، شہد کی ایک پیالی، دہی اور ٹماٹروں کا رائتہ اور چائے کے چار بڑے پیالے شامل تھے۔ وہ ناشتا لذیذ اور معیاری نہ ہونے کے باوجود شکم پُری کے لیے کافی تھا۔

ہم ان لوگوں کے بے سروسامان قیدی تھے اس لیے ہماری تیاری کا ہونا اور نہ ہونا برابر تھا۔ میں سگریٹ نوشی کرتے ہوئے اگلے امکانات پر مغز زنی میں مصروف تھا کہ صندل خان آپہنچا۔

"تم لوگ روانگی کے لیے تیار ہو؟" اس نے آتے ہی بلند آواز میں سوال کیا۔

"تم چاہتے تو ہم رات کو بھی کوچ کرسکتے تھے۔ تیاری سے ہمیں کیا لینا ہے؟" میں نے جواب دیا۔

"چلو!" اُس نے چند ثانیوں تک مجھے گھورنے کے بعد کہا۔ دالان سے کئی مسلح قبائلی بھی اُس کے ساتھ ہولیے۔ ہم اِن سب کے پیچھے رہے تھے۔

پھوس اور پتھروں پر مشتمل، اس حویلی نما عمارت کے باہر دو جیپیں کھڑی ہوئی تھیں۔ جن کی پوری باڈی لوہے کی بنی ہوئی تھی، ترپال کا نام ونشان تک نہ تھا۔ سورج آسمان کے مشرقی گوشوں سے کافی اوپر آچکا تھا۔ صندل خان نے ایک بار اپنے آدمیوں کا ناقدانہ جائزہ لیا۔ ان کی تعداد دس کے لگ بھگ تھی اور سب ہی پوری طرح مسلح تھے۔ ان میں چند کے شانوں سے لمبی نال والی دور مار رائفلیں جھول رہی تھیں۔ باقی افراد سب مشین گنوں سے لیس تھے۔ فاضل گولیوں کی چرمی پیٹیاں ان میں سے ہر ایک کے سینے پر بجی ہوئی تھیں۔

"اگلی جیپ میرا آدمی چلائے گا۔ اس میں تم چاروں سفر کروگے" صندل خان ہمیں بتانے لگا "پچھلی جیپ میں، میں اپنے ساتھیوں سمیت چلوں گا۔ تم نے راستے میں اپنے حلف سے بال برابر بھی انحراف کیا تو تمہیں عبرتناک سزا دی جائے گی۔ یہ یاد رکھنا کہ اب تم ایسے علاقے میں سفر کروگے جہاں داخل ہونے کے ہزاروں راستے ہیں لیکن واپسی کا ہر راستہ سردار پائندہ گل کے نمک خواروں کی رائفلوں کی نال میں سے ہوکر گزرتا ہے۔ بھاگنے والے ہر صورت میں پکڑے اور مار لیے جاتے ہیں۔"

"تمہیں ہم سے کوئی شکایت نہیں ہوگی" سلطان شاہ نے پورے خلوص سے کہا "رات کی شاندار ضیافت میں تم نے ہمیں اپنا گرویدہ بنالیا ہے۔ شنگارا ویلی پہنچنے کے بعد ہی ہم اپنی رہائی کے بارے میں سوچیں گے۔"

"دعوت کو بھول جاؤ۔" اس نے سختی سے کہا "رات گئی، بات گئی۔ اب اس وہم وگمان میں نہ رہنا کہ ہمارے درمیان فاصلہ کم ہوگیا ہے۔ ہمارے لیے تم اب بھی خطرناک قیدی ہو۔"

"تم ٹھیک کہہ رہے ہو...." میں نے کہنا چاہا لیکن میرے بولتے ہی وہ سب بھڑک کر متوحش نگاہوں سے اِدھر اُدھر دیکھنے لگے جیسے اپنے کسی نادیدہ دشمن کو تلاش کررہے ہوں۔ ہر ایک کا ہاتھ اپنے ہتھیار پر پہنچ گیا تھا۔ پل بھر میں وہ سب گولیاں برسانے کے لیے تیار ہوچکے تھے۔

صندل خان نے تیز اور پرجوش لہجے میں اپنے ساتھیوں سے کوئی سوال کیا۔ وہ سب بیک وقت بولنے لگے۔

"گھنٹیوں والے!" صندل خان غصیلی آواز میں غرّایا۔ اُس کا چہرہ سرخ ہوگیا تھا۔

اس کے بولنے پر میں نے اندازہ لگایا کہ وہاں دور دور تک کوئی نہیں تھا۔ بس اتنی سی تبدیلی رونما ہوئی تھی کہ فضا میں کسی گھنٹی کی ڈوبتی ابھرتی آواز سنائی دینے لگی تھی جو پہلے مفقود تھی۔

صندل خان نے اچانک ہی فضا میں گولی داغ دی اس کے ساتھ وہاں قیامت کا شور برپا ہوگیا۔ اس کے آدمیوں نے چاروں طرف اندھا دھند گولیاں چلانی شروع کردی تھیں۔ ایسا معلوم ہورہا تھا جیسے ان پر دیوانگی کا دورہ پڑگیا ہو اور وہ ہوا سے لڑنے کی کوشش کررہے ہوں۔

اچانک کافی دور واقع ایک چٹان کی اوٹ سے کوئی بھیڑ زمین کو سونگھتی ہوئی باہر نکل آئی۔ میں نے فوراً ہی اندازہ لگالیا کہ وہ آواز اسی بھیڑ کے گلے میں بندھی ہوئی گھنٹی سے نکل کر پھیل رہی تھی۔ میرے لیے حیران کن بات یہ تھی کہ ان بنجر چٹانوں میں وہ بھیڑ کہاں سے آموجود ہوئی؟ اگر وہ جنگلی تھی تو اس کے گلے میں گھنٹی کس نے باندھی؟ وہ پالتو تھی تو ان ہی لوگوں کی ہوسکتی تھی کیونکہ اس ویرانے میں دور دور تک کسی آبادی کے آثار نہیں تھے۔ پھر وہ اپنی ہی پالتو بھیڑ کی گھنٹی کی آواز پر بھڑک کر دیوانگی میں کیوں مبتلا ہوگئے تھے؟

وہ عقابوں کی طرح چاروں طرف دیکھ رہے تھے اس لیے گھنٹی والی وہ بھیڑ ایک لمحے کے لیے بھی ان کی نظروں سے اوجھل نہ رہ سکی پھر بیک وقت کئی رائفلوں نے اس بھیڑ کے چیتھڑے اڑادیے۔ بھیڑ کے پہلی گولی کھا کر فضا میں اچھلتے ہی گھنٹی کی کئی تیز اور بے ربط آوازیں پیدا ہوئیں جو یکلخت ہی معدوم ہوگئیں۔

بھیڑ کو مارتے ہی، کئی مسلح افراد نے اس طرف دوڑ لگادی۔ وہ بھیڑ کے پاس رکے بغیر اپنی رائفلیں وغیرہ تانے ہوئے اس چٹان کی اوٹ میں گھس گئے جدھر سے وہ بھیڑ برآمد ہوئی تھی۔ صندل خان نے بے چینی کے ساتھ ٹہلنا شروع کردیا۔ اس کے ساتھ رکے رہنے والے، پرامید نگاہوں سے اس کی طرف دیکھ رہے تھے جہاں ان کے ساتھی کسی کی تلاش میں غائب ہوئے تھے۔

ہمارے لیے وہ واقعہ بہت اہم اور تحیّر خیز ثابت ہوا تھا۔ صندل خان اور اس کے ساتھیوں نے جو کچھ کیا تھا، اس کی کوئی عقلی توجیہہ ہو ہی نہیں سکتی تھی۔ بظاہر یوں معلوم ہورہا تھا جیسے گھنٹی والی اس بھیڑ کا تعلق ان کی کسی اوہام پرستانہ کمزوری سے رہا ہو اور وہ روانگی سے پہلے اسے فنا کرنے پر تُل گئے ہوں۔

پُرہَول فائرنگ کے بعد فضا پر گمبھیر سناٹا چھاگیا تھا۔ بے تحاشا برسائی جانے والی گولیوں کے جلے ہوئے بارود کی بو نے آنکھوں اور نتھنوں میں سوزش سی پیدا کردی تھی لیکن ہم چاروں سمیت کسی میں بھی ہمت نہیں تھی کہ اِس بارے میں ذرا بھی لب کشائی کرسکے۔

وقت بہت دھیرے دھیرے گزرتا رہا۔ اعصاب پر چھائے ہوئے تناؤ میں لحظہ بہ لحظہ اضافہ ہوتا رہا۔ شاید جانے والے اپنے

نامعلوم شکار کی تلاش میں خاصی دور نکل گئے تھے۔ خدا خدا کرکے دس منٹ بعد اُن میں سے پہلا آدمی نمودار ہوا۔ اس کے پیچھے بقیہ آدمی بھی اس چٹان کے پیچھے سے نکل آئے۔ میں نے صاف دیکھا کہ مردہ بھیڑ کے بے جان اور لہولہان لوتھڑوں کے قریب سے گزرتے ہوئے، ان میں سے ہر ایک نے حقارت کے ساتھ اُس پر تھوکنا ضروری سمجھا تھا۔

وہ قریب آئے تو ان کے بشروں سے مایوسی اور جھلاہٹ ٹپک رہی تھی۔ انہوں نے دور ہی سے اپنی بولی میں کچھ بولنا شروع کردیا۔ قریب آنے پر سب لوگ اس پرجوش مذاکرے میں شریک ہوگئے۔ ہم چاروں الگ کھڑے لاتعلقانہ انداز میں وہ تماشا دیکھتے رہے۔

ہمیں اِس بارے میں کچھ بتانا ضروری سمجھے بغیر صندل خان نے روانگی کا حکم دیا۔ ہم چاروں مجرمانہ خاموشی کے ساتھ اگلی جیپ میں سوار ہوگئے۔ میں ڈرائیور کے ساتھ والی سیٹ پر تھا۔ ہماری جیپ کا انجن اسٹارٹ ہونے کے بعد، صندل خان پانچ آدمیوں سمیت دوسری جیپ میں سوار ہوگیا۔ ہمارا کارواں اس مقام سے روانہ ہوا تو بقیہ لوگ خاموشی کے ساتھ وہیں کھڑے ہاتھ ہلا رہے تھے۔

ابتدا میں ڈرائیور نے جیپ چلانے میں بہت جوش و خروش کا مظاہرہ کیا لیکن چند میل آگے نکلنے کے بعد اسے محتاط ہونا پڑگیا۔ جیپ جس کچے اور پرپیچ راستے پر چل رہی تھی، اس کے ایک طرف چٹانی سلسلہ پھیلا ہوا تھا اور دوسری طرف گہرے کھڈ نظر آرہے تھے۔ اوپر سے ان کھائیوں کی اصل گہرائی کا اندازہ لگانا ممکن نہیں تھا کیونکہ ان میں گھنی خودرو جھاڑیوں نے ہر چیز کو اپنی آغوش میں چھپایا ہوا تھا۔

بھوری چٹانوں اور بے برگ و بار، ڈنٹھل دار جھاڑیاں ابتدا میں بہت دل کش نظر آئیں لیکن تھوڑی دیر بعد اُن کے تواتر سے اکتاہٹ محسوس ہونے لگی۔ مجھے بیدار ہونے پر ہی معلوم ہوچکا تھا کہ ہمارے سفر کا اختتام شام ڈھلے سے پہلے ہونا ممکن نہیں تھا اس لیے میں نے مسلسل خاموشی کے جمود کو توڑنے کا فیصلہ کرلیا۔ ہوش میں رہتے ہوئے اتنی طویل مدت تک خاموش رہنا کسی عذاب سے کم نہیں ہوتا۔

"بھائی، تم اردو سمجھ سکتے ہو؟" میں نے ڈرائیور سے بہت نرمی سے سوال کیا تو وہ گردن گھما کر مجھے خشمناک نگاہوں سے گھورنے لگا اور میرا دم نکل گیا کیونکہ اس وقت جیپ ایک خطرناک موڑ طے کررہی تھی۔ ڈرائیور کی کسی بھی لغزش کے نتیجے میں جیپ چٹانوں سے ٹکرا کر پاش پاش ہوسکتی تھی۔

"سمجھ سکتا ہوں" اس نے اپنے مخصوص شکستہ لہجے میں ٹوٹے پھوٹے الفاظ میں کہا "کہو، تم مجھے کیا سمجھانا چاہتے ہو؟" غنیمت یہ ہوا کہ اس نے بات پوری کرتے ہی اپنی توجہ دوبارہ سامنے مرکوز کرلی تھی۔

"کچھ بھی نہیں" میں نے اس کی اردو دانی پر دلی مسرت محسوس کرتے ہوئے کہا "باتیں کرتے ہوئے یہ لمبا سفر آسانی سے گزر سکے گا ورنہ راستہ کی ہیبت میرا خون خشک کردے گی۔"

"میں اس راستے پر آنکھیں بند کرکے بھی گاڑی چلا سکتا ہوں۔" اس نے دوبارہ میری طرف دیکھ کر فخریہ لہجے میں کہا۔ اس کے الفاظ بدستور ٹوٹے پھوٹے اور تذکیر و تانیث سے سراسر آزاد تھے۔

میں نے بوکھلا کر اسے سامنے متوجہ رہنے کا مشورہ دینے کا ارادہ کیا لیکن بات پوری ہوتے ہی اس کی گردن خود بخود سیدھی ہوگئی۔ شاید وہ اپنے مخاطب کی طرف دیکھے بغیر بات کرنے سے قاصر تھا۔ اس کی عادت کا اندازہ لگاتے ہی میں نے فیصلہ کرلیا کہ کسی بھی نازک مقام پر اس سے بات نہیں کروں گا۔

لیکن میری اس کوشش کے بعد غزالہ، سلطان شاہ اور ویرا کو یک بیک زبان بندی سے چھوٹ مل گئی اور ان تینوں نے فوراً ہی بے ضرر موضوعات پر باتیں کرنی شروع کردیں۔ میرے لیے یہ بھی بہت کافی تھا کہ انجن کی مشینی غراہٹوں کے ساتھ میرے کانوں میں انسانی آوازیں آتی رہیں۔

وہ راستہ واقعی بہت خراب تھا۔ اس پر صرف جیپ ہی چل سکتی تھی اور وہ بھی اس صورت میں جب اسٹیئرنگ وہیل پر ایسا ڈرائیور موجود ہو جو ان راستوں سے بخوبی واقف ہو۔ کئی جگہ ایسے دشوار مقامات بھی آئے تھے جہاں پتھروں اور چٹانوں کو عبور کرنے کے لیے فور وہیل ڈرائیو کا سہارا لینا پڑا تھا۔ جیپ بس رینگ رہی تھی۔

جیپ لرزتی، ڈولتی اور اچھلتی ہوئی آگے بڑھتی رہی۔ پندرہ بیس گز کے فاصلے سے صندل خان کی جیپ بھی ہمارے پیچھے چلی آرہی تھی۔ ہم نے سفر کا آغاز کیا تو نیلے آسمان پر چمکتا ہوا سورج نظر آرہا تھا لیکن وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ مطلع ابر آلود ہوتا چلا گیا۔ مجھے ڈر تھا کہ راستہ میں برسات شروع ہوگئی تو ہم اندھیرا پھیلنے تک بھی منزل پر نہیں پہنچ سکیں گے اور پھر وہ رات ہمیں کھلے آسمان کے نیچے گزارنی پڑے گی۔

"آگے بارش کے آثار تو نہیں ہیں؟" میں نے گہرے ہوتے ہوئے بادلوں کی طرف دیکھ کر ڈرائیور سے پوچھا۔

"ان پہاڑوں میں بادل اور برسات کا کچھ پتا نہیں ہوتا" اس نے بے پروائی سے جواب دیا "تیز بارش ہونے لگے تو سفر روکنا پڑجاتا ہے۔ پانی کے کٹاؤ کی وجہ سے اوپر سے بڑی بڑی چٹانیں گرنے لگتی ہیں لیکن فکر کی کوئی بات نہیں۔ اس قافلے میں تم چاروں کے علاوہ سب لوگ تجربہ کار ہیں۔"

"ہم لوگ کچھ ڈرپوک اور وہم پرست واقع ہوئے ہیں۔" میں نے اسے بولنے پر اکسانے کی نیت سے تمہید باندھی "بھیڑ والے واقعے نے ہمیں بُری طرح خوف زدہ کیا ہوا ہے۔"

اس نے ایک دفعہ پھر مجھے گھورا۔ اس کی نگاہوں میں غصہ تھا "اب اس کا ذکر نہ کرنا۔ کوئی اور بات کرو" اس کا لہجہ درشت تھا

جس نے مجھے اِس پُراسرار واقعے پر مزید سر کھپانے پر مجبور کردیا۔

ہم پہاڑوں میں اندر ہی اندر گھس کر ایسی غیر محسوس بلندی کی طرف جارہے تھے جہاں پتھروں اور چٹانوں نے بلند و بالا پہاڑوں کی شکل اختیار کرلی تھی۔ اس کے ساتھ بادل بھی گہرے ہوتے جارہے تھے۔

"معلوم ہوتا ہے کہ کہیں نہ کہیں بارش ضرور ملے گی" پیچھے سے ویرا کی پرتشویش آواز آئی۔

"تن بہ تقدیر رہو" میں نے اسے مشورہ دیا "ڈھارس کی بات یہ ہے کہ صندل خان اور اس کے چھ آدمی ہمارے ساتھ موجود ہیں اور یہ سب ان علاقوں کے کیڑے ہیں۔"

اچانک پچھلی جیپ کے ہیڈ لیمپس ایک بار چمک کر بجھ گئے۔ میں نے غیر ارادی طور پر پیچھے دیکھا۔ اسی اثنا میں دونوں گاڑیاں رک گئیں۔ میرا دل اچھل کر حلق میں آگیا۔ نہ جانے اس ویرانے میں کیا افتاد آنے والی تھی؟

صندل خان کی جیپ سے دو مسلح محافظ اتر کر ہماری جیپ کی طرف آئے۔ شاید وہ اردو سے نابلد تھے۔ انہوں نے اپنی تیز تیز بولی میں ڈرائیور سے کچھ کہا۔ اس نے آنے والوں کی بات کا ترجمہ کرکے بتایا کہ صندل خان، ڈینی اور میم کو اپنی جیپ میں بلا رہا تھا۔ میں بے چون و چرا اپنی جگہ چھوڑ کر نیچے اتر گیا۔ ویرا بھی خاموشی سے باہر آگئی۔ آنے والے محافظوں نے فوراً ہی ہماری جگہیں سنبھال لیں اور ہم پچھلی جیپ کی طرف چل دیے۔

"یہ سفر بھی یادگار رہے گا" تنہائی میسر آتے ہی ویرا منمنائی "یہاں جو کچھ دیکھنے میں آرہا ہے وہ میرے خواب و خیال میں بھی نہیں آسکتا تھا۔ اِس ماحول میں سے صندل خان اور اس کے ساتھیوں کو نکال دیا جائے تو یہ سب کس قدر رومانٹک ہوسکتا تھا؟ ہر مہم جُو ان چیزوں کی آرزوؤں میں زندہ رہتا ہے۔"

"فکر نہ کرو۔ تم زندہ رہیں تو یہ سفر تمہیں خوابوں میں اکثر ڈراتا رہے گا۔"

ہم پچھلی جیپ کے پاس پہنچے تو وہاں کچھ بھی نہ ہوا۔ ہم دونوں صندل خان کی ہدایت پر پچھلے حصے میں سوار ہوگئے۔ جہاں دو وحشی محافظ پہلے سے موجود تھے۔ ہمارے سوار ہوتے ہی گاڑیاں چل پڑیں۔

"ان بے رحم پہاڑوں میں ایسا رنگین موسم کبھی کبھی ہی ملتا ہے۔ میں نے سوچا کہ تمہیں بھی اپنے ساتھ شریک کرلوں۔" صندل خان نے ہماری طرف مڑے بغیر کہا "ویسے بھی تم لوگ دو جگہ بٹے رہے تو کسی شرارت کے بارے میں نہیں سوچ سکو گے۔ لو، بوتل سے پینی پڑے گی" اس نے واڈکا کی بوتل ہماری طرف بڑھادی۔

اس کی سخاوت قابل داد تھی "تم بہت مہربان اور نرم دل ہو" میں نے اس کی تعریف کرتے ہوئے، وہ چھوٹی بوتل اس کے ہاتھ سے لے لی۔

وہ پون لیٹر کی معیاری بوتل تھی اور مہر بند تھی۔ پچھلی رات دو لیٹر کی بوتل کھولی گئی تھی جو آدھی کے قریب باقی تھی۔ غالباً صندل خان وہ بوتل وہیں چھوڑ آیا تھا۔ میں نے بوتل کی مہر توڑ کر وہ اسے لوٹانی چاہی تو اس نے مجھے ٹوک دیا "میں تم کو بتا چکا ہوں کہ میں پینے کے معاملے میں مراتب کا قائل نہیں ہوں۔ تم دونوں ایک ایک گھونٹ لے لو۔ میں بعد میں لے لوں گا۔ ایسے زبردست موسم سے شراب پیے بغیر لطف اٹھایا ہی نہیں جاسکتا۔"

میں نے ایک چھوٹا گھونٹ لے کر بوتل ویرا کو دی تو اس کے پہلو میں کہنی مارے بغیر اس سے واپس نہ لے سکا۔ وہ پہلے ہی گھونٹ میں سرور میں آجانے کی کوشش میں تھی۔

"گھٹائیں امڈی چلی آرہی ہیں" صندل خان اپنا کوٹا لینے کے بعد مسرت آمیز لہجے میں بولا "ہوسکتا ہے کہ اگلے ایک آدھ گھنٹے میں ہر طرف گھٹا ٹوپ اندھیرا چھا جائے۔ پھر ہلکی ہلکی ہوائیں چلیں گی اور اچانک مینہ برسنے لگے گا۔ بارش میں دھلنے کے بعد ان پہاڑوں میں انوکھا نکھار آجاتا ہے۔"

میں نے اس لمحے اچانک ہی محسوس کیا کہ صندل خان دل پھینک نہ ہونے کے باوجود جمالیاتی حس سے مالا مال تھا جب کہ اس کے ساتھی بے لوچ بلکہ کھردری طبیعتوں کے مالک تھے۔ وہ ان سے کام ضرور لے سکتا تھا لیکن ان کے ساتھ تفریح کا لطف حاصل کرنا، پتھر سے عرق کشید کرنے کے برابر تھا۔ شاید اپنی اسی اکتاہٹ کو دور کرنے کے لیے اس نے ہم دونوں کو اپنے پاس بلالیا تھا۔

"اس موسم اور ماحول میں ایک جوان آدمی کو اپنی بیوی یا محبوبہ ضرور یاد آتی ہے" میں نے کہا۔

وہ ایک گہرا سانس لے کر رہ گیا پھر چند ثانیوں کے بعد بولا "تم ٹھیک کہتے ہو لیکن اب اور کچھ نہ کہنا۔ ہم لوگ اجنبیوں سے اپنی عورتوں کے بارے میں بات کرنا معیوب سمجھتے ہیں۔ اگر یہ تینوں جنگلی اردو سے واقف ہوتے تو میں اب تک تمہارے منہ پر تھپڑ رسید کرچکا ہوتا۔"

"تمہاری نگاہیں پاکباز اور دل صاف ہے" ویرا اپنے دہانے سے واڈکا کے تیز بھبکے اڑاتے ہوئے بولی "تم نے ڈینی کو تھپڑ نہیں مارا۔ اس کا مطلب ہے کہ ڈینی نے تمہارے دل کا چور پکڑلیا ہے۔ اس موسم میں ایسی ہی باتیں ہوسکتی ہیں۔ ہم کسی کو نہیں بتائیں گے کہ تم نے اپنی عورت کے بارے میں ہم سے بات کی تھی۔"

"نہیں، یہ نہیں ہو سکتا" وہ مشتعل ہوئے بغیر سختی سے بولا "یہ بتاؤ کہ تم دونوں میں کیا رشتہ ہے؟"

"ہم صرف دوست ہیں۔ دوسری عورت ڈینی کی بیوی ہے" ویرا نے جواب دیا۔

"میں اس بکواس کو نہیں مانتا۔ مرد اور عورت ہم عمر ہوں تو ان میں سوکھی دوستی ہو ہی نہیں سکتی۔ وہ اجنبی رہتے ہیں یا پھر ایک دوسرے کے عاشق و معشوق بن جاتے ہیں۔ بیویوں والے بھی پارسا نہیں ہوتے۔ شادی شدہ مرد جب بگڑتا ہے تو وہ زیادہ گھٹیا اور مکار ہوتا ہے" اس نے دوسرا گھونٹ لے کر بوتل پھر میری طرف بڑھادی۔

صندل خان کے آخری فرمان پر ویرا نے اتنی زور سے اپنی کہنی میری پسلیوں میں ماری کہ بوتل میرے ہاتھ سے گرتے گرتے بچی۔ ویرا کہہ رہی تھی "شاید تم ٹھیک کہہ رہے ہو۔ میں جب ڈینی سے ملی تو یہ شادی شدہ تھا اور اب میں اس کے بگڑنے کا انتظار کررہی ہوں۔ یہ شرابی ہونے کے باوجود اتنا پکا زن مرید ہے کہ اس کی بیوی میری اور اس کی دوستی پر ذرا بھی اعتراض نہیں کرتی۔ رات تم نے اس کا پرسکون رویہ دیکھ ہی لیا ہوگا۔"

"میں پرائی عورتوں کو زیادہ غور سے نہیں دیکھتا" اس کا لہجہ بہت مضبوط تھا "شیر پرائے شکار پر کبھی منہ نہیں مارتا۔ اپنا مارا ہوا کھاتا ہے مگر میں اب بھی یقین نہیں کرسکتا کہ تمہارے درمیان کوئی گہرا اور خفیہ رشتہ نہیں ہے۔"

"ایسا ہی ہے" ویرا نے خواہ مخواہ اصرار کیا "میں اپنے دعوے کو کیسے ثابت کرسکتی ہوں؟"

"مجھ سے دوستی کرکے" صندل کے بے ساختہ جواب نے مجھے سن کرکے رکھ دیا۔

ویرا ایک چالاک اور مکار عورت تھی۔ شاید اس نے صندل خان کی باتوں میں کوئی ایسا رمز پالیا تھا جسے میں نہیں سمجھ سکا تھا۔ اسی وجہ سے وہ اپنی بات پر مصر بھی ہوئی تھی اور آخر کار اس نے صندل خان کو اپنے دل کی بات زبان پر لانے پر مجبور کردیا تھا۔ وہ ویرا تھی اور میں جانتا تھا کہ وہ جبلی طور پر مردوں کی شکاری تھی۔ ان کی رگ رگ کو پہچان کر ایسے رخ سے وار کرتی تھی کہ ہر سورما آن واحد میں اُس کے قدموں میں آگرتا تھا۔ یہی حشر صندل خان کا بھی ہوا تھا۔

میرے دل میں صندل خان کے خلاف رقابت کی آگ کی پہلی چنگاری بھڑک اٹھی۔

"میرے لیے اس سے بڑا اعزاز اور کیا ہوگا کہ تم ایک اجنبی عورت کو اپنا دوست بنانے پر آمادہ ہوگئے ہو۔"

"میری بات کو غلط رخ نہ دو" اس بار وہ ویرا کے ذومعنی فقرے کو سمجھ گیا "میری دوست بن جانے کے بعد بھی تم اجنبی ہی رہوگی۔ مرد اور عورت کی دوستی کے بارے میں تم میری رائے سن چکی ہو۔ یہ اسی قسم کی دوستی ہوگی۔ تمہارے ساتھ کچھ وقت گزار لینے کے بعد میں تمہیں دوست نہیں کہہ سکوں گا۔ سردار پائندہ گل کا کوئی قیدی اپنی بے گناہی ثابت کئے بغیر ہمارا دوست یا مہمان ہو ہی نہیں سکتا۔ یہ شنگار اویلی کی صدیوں پرانی ریت ہے جسے کوئی نہیں توڑ سکتا۔"

"یہ گوروں میں پلی ہوئی آزاد خیال عورت ہے۔ میرا خیال ہے کہ اسے اس کے حال پر چھوڑ دو" میں اچانک بول پڑا۔

"تم کو اس دوستی پر اعتراض ہے" وہ گونجیلا قہقہہ مار کر بولا "ہونا بھی چاہیے۔ میرا خیال ہے کہ کوئی چوہا بھی خوشی سے اپنی مادہ کو کسی دوسرے چوہے کے پاس نہیں جانے دیتا۔"

"تم غلط سمجھ رہے ہو" میں نے بوکھلا کر کہا "اب میں تم دونوں کی باتوں میں دخل نہیں دوں گا۔ اپنے معاملات تم خود ہی طے کرتے رہو۔ مجھے کسی بات پر کوئی اعتراض نہیں ہوگا۔"

"یہ اچھی بات ہے" وہ ایک ایک لفظ پر زور دے کر بولا "اب ذرا ایک ایک گھونٹ ان دونوں کو بھی دے دو جو تمہارے ساتھ بیٹھے ہوئے ہیں۔ یہ تھوڑی سی پی کر بھی بہت مست ہوجاتے ہیں" پھر وہ یکایک مقامی بولی بولنے لگا اور ہمارے ساتھ والوں کے چہرے مسرت سے دمک اٹھے۔

بوتل انہیں دینے سے پہلے میں نے ایک اور گھونٹ لے ڈالا۔ صندل خان کے مضحکہ اڑانے کے بعد میں اندر ہی اندر عجیب سی بے چینی محسوس کرنے لگا تھا جو مجھے کسی انہونی بات سے ڈرا رہی تھی۔

"تم میری ایک خلش دور کرسکو تو میں تم سے تمہاری مرضی کی دوستی بھی کرلوں گی" ویرا کے میٹھے لہجے نے میری ہڈیاں تک سلگا کر رکھ دیں۔ وہ صندل خان کے ساتھ نہ جانے کیا کھیل کھیلنا چاہ رہی تھی؟

"قید کے بارے میں، میں کسی بات کا جواب نہیں دوں گا" صندل خان نے فوراً شرط عائد کردی۔

"میری خلش کا تعلق کسی اور ہی بات سے ہے۔ میں جانتی ہوں کہ تم سردار پائندہ گل کے فیصلوں پر کوئی رائے نہیں دوگے۔ وہ صرف اسی کا حق ہے" ویرا نے صندل خان کے ساتھ مجھے بھی الجھن میں ڈال دیا۔

"پہیلیاں نہ بجھواؤ۔ بات پوری کرو" صندل خان نے کوئی وعدہ کئے بغیر کہا۔ اس کی آواز سے اضطراب مترشح تھا۔

"بھیڑ کا کیا قصہ تھا؟ گھنٹیوں والے کون ہیں؟" ویرا نے وہ سوال کرکے مجھے حیران کردیا۔ میں بلاوجہ ہی اس پر کھولتا رہا تھا۔ وہ بہت چالاکی کے ساتھ، سوچ سمجھ [illegible] بات آگے بڑھاتی رہی تھی۔

"بس، اب کچھ نہ بولنا" صندل خان غصیلی آواز میں غرایا۔ اس کا رویہ اگلی جیپ کے ڈرائیور کے ردعمل سے مختلف نہیں تھا۔ صندل خان کہہ رہا تھا "ہم لوگ اپنے اندرونی معاملات میں اجنبیوں کی مداخلت کو بالکل برداشت نہیں کرتے۔ تم دوستی کردیا نہ کرو مگر اس بارے میں اپنی زبان سی لو۔ شنگار اویلی میں یہ ممنوعہ کہانی ہے۔"

"اچھا ہوا کہ تم نے مجھے آگاہ کردیا" ویرا نے سہم جانے کی اداکاری کرتے ہوئے کہا "آگے میں محتاط رہوں گی" اس نے ہوشیاری سے کام لیتے ہوئے دوستی کا تذکرہ سرے سے گول کردیا۔

"پھر کیا کہتی ہو؟" ایک طویل اور بے معنی سکوت کے بعد صندل خان کی آواز ابھری۔

"کس بارے میں؟" ویرا نے انجان بن کر معصومیت سے سوال کیا۔

وہ اپنے شکار کو نشتر سے گھائل کرکے اس کی تڑپ سے لذت اندوز ہونا بھی خوب جانتی تھی۔ مردوں کو رجھانے، لبھانے، للچانے اور پھر یک بیک پسپا ہوکر ان کی کربناک حالت سے محظوظ ہونے کا یہ فن اُس نے ڈان مرسیانو سے سیکھا تھا جو اس کے باپ ہی کا ایک گھناؤنا روپ تھا اور اس وقت وہ اپنے اسی کمال کا مظاہرہ کررہی تھی۔

"شاید تم سوگئی ہو" وہ جھلا کر بولا "ہم دوستی اور دشمنی وغیرہ کے بارے میں باتیں کررہے تھے۔"

"اوہ!" ویرا خفت آمیز ہنسی کے ساتھ بولی "تم نے مجھے دہشت زدہ کردیا ہے۔ میں اپنی زبان تو بند رکھ سکتی ہوں کیونکہ اس پر میرا اختیار ہے لیکن میرا ذہن میرے بس سے باہر ہے۔ وہ اس ممنوعہ کہانی میں ہی الجھا ہوا ہے" اس نے ایک بار پھر صندل خان کے دل پسند موضوع کو نہایت خوب صورتی کے ساتھ ٹال دیا۔

"ذہن سلجھ جائے تو مجھے آواز دے لینا" وہ بپھر کر بولا پھر اُس نے ہاتھ پیچھے بڑھادیا۔ "لاؤ! بوتل کہاں ہے؟"

میں نے پھرتی سے بوتل اس کے ہاتھ میں دے دی۔ اس نے ڈھکن کھولا اور تلخ واڈکا کے کئی گھونٹ غٹاغٹ اپنے حلق میں انڈیلتا چلا گیا۔ ویرا کی اشتعال انگیزی اور پھر سرد مہری کے بعد اسے اتنے ہی بڑے گھونٹ کی ضرورت تھی۔ ویرا نے داد طلب نظروں سے میری طرف دیکھا اور میں سرہلا کر رہ گیا۔ ہمارے سامنے نشست پر بیٹھے ہوئے دونوں محافظ ہونقوں کی طرح اپنے ہونٹ چاٹنے میں مصروف تھے۔ واڈکا کے پہلے ہی گھونٹ نے ان کی آنکھوں میں گلابی ڈورے تیرادئے تھے۔

باہر آسمان بہت تیزی سے سیاہ ہوتا جارہا تھا۔ وہ سیاہی اس قدر گہری اور یکساں تھی کہ سارے بادل بس ایک جگہ ٹھہرے ہوئے نظر آرہے تھے لیکن ونڈ شیلڈ بالکل خشک تھی۔ آسمان سے ایک بوند بھی نہیں ٹپکی تھی۔

شیشہ ٹوٹنے کا تیز چھناکا سن کر میں چونک پڑا۔ صندل خان نے خالی بوتل چلتی جیپ سے باہر ننگی چٹانوں پر دے ماری تھی۔ محافظوں کی باری ختم ہونے کے بعد بوتل میں جو کچھ شراب رہ گئی تھی، اسے صندل خان نے ایک ہی سانس میں خالی کردیا تھا، غصہ، جھلاہٹ اور بے بسی کے عالم میں وہ خود کو مزید کمزور کرتا جارہا تھا۔

"سنو، ڈینی خان!" وہ اچانک ہی مجھے پکار بیٹھا "تمہیں پتا ہے کہ میں نے بوتل کیوں توڑی ہے؟"

"خالی ہوگئی ہوگی" میں نے پوری سنجیدگی کے ساتھ جواب دیا۔

وہ ہنس پڑا اور ہنستے ہوئے بولا "تم بہت سمجھ دار ہو۔ خالی بوتل اور بھری ہوئی عورت بیکار ہوتی ہے۔ ان دونوں کا لطف اسی وقت آتا ہے جب معاملہ اس سے الٹ ہو، تم کیا کہتے ہو؟"

"اس بارے میں تم اتنا زیادہ جانتے ہو؟" میں نے اسے خوش کرنے کے لیے حیرت ظاہر کی۔

"سردار پائندہ گل کا مرحوم بھانجا، عبدالرحیم خان مجھے گر کی باتیں بتاتا رہتا تھا۔ وہ فرنگی عورتوں کو بھی خوب سمجھتا تھا مگر اس کی عمر دغا دے گئی۔ بہت اچھا دوست تھا وہ میرا۔ اسی نے یہ بات بتائی تھی۔"

اچانک ہماری جیپ ایک شدید جھٹکے کے ساتھ رک گئی اور سب لوگ ایک دوسرے پر جاگرے۔ صندل خان کا سر اگلی ونڈ شیلڈ سے جا ٹکرایا۔ میں نے سنبھلتے سنبھلتے دیکھا کہ آگے والی جیپ بھی رکی ہوئی تھی۔ اگر ہمارا ڈرائیور تیزی سے بریک نہ لگاتا تو دونوں گاڑیوں کا ایک دوسرے سے ٹکرا جانا یقینی تھا۔

سب لوگ ایک ساتھ بولنے اور ایک دوسرے سے سوالات کرنے لگے لیکن کسی کو بھی کچھ علم نہیں تھا کہ آگے کیا ہوا تھا۔ صندل خان اپنا سر سہلاتے ہوئے شاید پشتو میں مغلظات بک رہا تھا۔

وہ سب چند ثانیوں میں ہوا پھر فضا گڑگڑاہٹ اور ہولناک دھماکوں سے لرزاٹھی۔ اگلی جیپ سے چند سو گز آگے ایک پہاڑ کی بلندی سے سیکڑوں ٹن وزنی ایک چٹان گردوغبار کے دھوئیں میں لڑھکتی ہوئی نیچے چلی آرہی تھی۔ اس کے زور میں چھوٹے بڑے ہزاروں پتھر اپنی جگہیں چھوڑ کر خس وخاشاک کی طرح کئی سمتوں سے نیچے لڑھک رہے تھے۔ سب لوگ پھٹی پھٹی اور دہشت زدہ نگاہوں سے وہ رُوح فرسا منظر دیکھتے رہے۔ آناً فاناً میں وہ چٹان اس مقام پر گری جہاں پہنچنے سے ہم رک چکے تھے۔ وہ دھماکا زمین کو دہلا گیا پھر وہ چٹان دوسری طرف کھڈ میں گرتی چلی گئی۔

"خدا کی پناہ!" ویرا کانپتی ہوئی آواز میں بولی "ہم موت کے منہ میں جانے سے بال بال بچے ہیں۔ اگلی جیپ کا ڈرائیور گردوپیش سے ذرا بھی غافل ہوتا تو اس وقت دونوں گاڑیاں اس دیوہیکل چٹان کے نیچے کچل کر رہ گئی ہوتیں۔ اس نے کمال کی حاضر دماغی کا مظاہرہ کیا ہے۔"

اس چٹان کے پیچھے آنے والا پتھروں وغیرہ کا ریلا کافی دیر تک اس راستے پر گرتا رہا۔ وہ سلسلہ ختم ہونے کے انتظار میں دونوں

گاڑیوں کے انجن بند کردئے گئے۔ صندل خان کچھ بڑبڑاتا ہوا نیچے اتر کر اپنی جیپ کی آڑ میں کھڑا ہو کر وہ نظارہ دیکھنے لگا۔ میں نے بھی ٹانگیں سیدھی کرنے کے ارادہ سے نیچے جانا چاہا لیکن ایک محافظ نے میرے شانے پر سختی سے دباؤ ڈال کر مجھے اپنی جگہ چھوڑنے سے روک دیا۔ شاید صندل خان نے انہیں بڑبڑاہٹ میں وہی ہدایت کی تھی۔

کئی سیکنڈ بعد بڑی چٹان نشیب میں لڑھکنے کی پر شور آوازوں کا خاتمہ ایک ہولناک دھماکے پر ہوا۔ غیر ارادی طور پر سب ہی چونک کر رہ گئے۔ شاید وہ چٹان کھڈ کی تہ میں پہنچ چکی تھی۔

اس وقت وادی میں سکون تھا مگر پھر اچانک ہی تیز ہوائیں چلنے لگیں۔ شاید ان ہی طوفانی جھکڑوں نے بلندی پر ٹکی ہوئی چٹان کو اس کی جگہ سے اکھاڑ پھینکا تھا۔ ہوا اور پہاڑوں کی ہیبت ناک قوتیں اس علاقے میں ایک ساتھ سرگرم عمل ہوگئی تھیں۔ تیز ہواؤں کا شور طوفانی شدت پکڑتا جارہا تھا۔ آسمان پر سیاہی اس قدر گہری ہوگئی کہ اماوس کی کسی کالی رات کا گمان ہونے لگا۔ صندل خان بوکھلا کر اپنی نشست پر آبیٹھا۔ ڈرائیوروں نے انجن چلا کر ہیڈ لیمپس روشن کردئے تاکہ گردوپیش میں رونما ہونے والی تبدیلیوں پر نگاہ رکھی جاسکے اور آخر کار صندل خان کی آخری پیش گوئی بھی پوری ہوگئی۔ آسمان سے موٹی موٹی بوندیں گرنی شروع ہوئیں جنہوں نے چند سیکنڈ کے قلیل سے وقفے میں موسلا دھار بارش کا روپ دھار لیا۔ جیپ کی ونڈ شیلڈ کے سامنے پانی کی ایک موٹی چادر پھیل گئی تھی۔

ہوا' پانی اور پہاڑ۔ قدرت کے سارے ہی سرکش عناصر اس وقت اپنی قوت کے مظاہروں پر تلے ہوئے تھے۔ یوں معلوم ہو رہا تھا جیسے طوفانی ہوائیں ہمیں اڑا کر لے جائیں گی' پانی کا ریلا ہمیں گاڑیوں سمیت اندھی کھائیوں میں دھکیل دے گا یا پھر خونی چٹانیں ہمیں پیس کر رکھ دیں گی۔

خوف اور امتحان کے اِن غیر یقینی لمحات میں مجھے اچانک وہ بھیڑ یاد آئی جسے شنگاریوں نے چیتھڑوں میں بدل ڈالا تھا۔ وہ خوف و ہراس اور اضطراب یاد آیا جو گھنٹی کی پہلی آواز سنتے ہی ان پر طاری ہوگیا تھا۔ سفر کے آغاز پر گھنٹی کی آواز اور گھنٹیوں والے کا سراغ نہ ملنا یقیناً کوئی بہت بڑی بدشگونی تھی۔ شنگاریوں کے لیے وہ قدرت کی کوئی کڑی وارننگ تھی جسے نظر انداز کر کے سفر شروع کیا گیا لیکن پہاڑوں کے بیچ میں دوسری قدرتی قوتوں نے اِس کارواں کو گھیر لیا تھا۔

صندل خان نے جس انداز میں گھنٹی والی بھیڑ کے قصے کو ممنوعہ کہانی قرار دیا تھا' اِس سے یہی ظاہر ہوتا تھا کہ وہ کوئی پُراسرار اور ماورائی معاملہ تھا جسے شنگاری اپنے قبیلے تک ہی محدود رکھنا چاہتے تھے۔

جیپ کے تمام شیشے چڑھا لیے گئے تھے۔ آہنی باڈی پر موٹی موٹی بوندیں پر شور جل ترنگ بجارہی تھیں۔ باہر دھواں دھار بارش کی دھند تھی اور اندر کی سمت میں ہم سب کے سانسوں کی وجہ سے شیشوں پر ابر آگیا تھا۔ کچھ پتا ہی نہیں چل رہا تھا کہ باہر کیا ہو رہا ہے؟ اس طوفانی موسم میں جیپ کے ہیڈ لیمپس بھی اندھے اور ناکارہ ہو کر رہ گئے تھے۔ ڈرائیور نے وائپر پوری رفتار سے چلا کر اندر سے ونڈ اسکرین پر آئے ہوئے ابر کو بھی صاف کیا لیکن بے سود۔ موسلا دھار بارش نے ہیڈ لیمپس کی تیز روشنی کو زرد دھبوں کی صورت میں کئی سطحوں پر بکھیر کر رکھ دیا تھا۔ آخر صندل خان کی ہدایت پر بیٹری اور انجن وغیرہ کو کسی نقصان سے محفوظ رکھنے کے لیے ہیڈ لیمپس بجھا کر انجن بند کردیا گیا۔

ہر شخص خاموش اور فکر مند تھا۔ پھر ہمیں اوپر سے بہہ کر آنے والے پانی کا شور بھی سنائی دینے لگا۔ پانی کے ساتھ شاید پتھروں اور روڑوں کی بڑی تعداد بھی بہہ کر آرہی تھی۔ مجھے ان تیز ریلوں کے کٹاؤ کا خوف تھا۔ اوپر سے آنے والے تیز دھار ریلے اگر جیپ کے نیچے زمین کو کاٹنا شروع کردیتے تو توازن بگڑنے کی وجہ سے جیپ کسی بھی وقت اپنا توازن کھو کر لڑھک سکتی تھی۔ صندل خان اور اس کے ساتھی ان ہی علاقوں کے باسی تھے اس لیے وہ ان امکانات سے ہم سے زیادہ باخبر تھے اور وہ فکر مندی اُن کی خاموشی میں ڈھل چکی تھی۔

پھر ہمیں باہر زرد روشنی کا ایک گول دھبا متحرک نظر آیا جو ہماری جیپ کی طرف آرہا تھا۔ اس وقت تک بادلوں کی گونج اور گڑگڑاہٹ کے علاوہ بجلی نہیں کڑکی تھی لیکن پھر زہرہ گداز کڑک کے ساتھ بجلی چمکی اور لحہ بھر کے لیے ہر طرف تیز روشنی پھیل گئی۔ اس لحاتی روشنی میں مجھے اگلی جیپ کا ڈرائیور نظر آیا جو سر سے پاؤں تک پانی میں شرابور ہونے کے باوجود اپنے ہاتھ میں سرچ لائٹ لیے باہر کچھ کرتا پھر رہا تھا۔

وہ قریب آیا تو ہمارے ڈرائیور نے اپنی سمت کا شیشہ گرا کر اس سے باتیں کرنی شروع کردیں۔ وہ اپنی طاقتور ٹارچ سے آگے کی طرف اشارہ کر کے کچھ کہتا رہا۔ صندل خان بھی ان کی گفتگو میں شامل ہوگیا۔ پھر وہ تینوں کسی فیصلے پر پہنچ گئے اور ٹارچ بردار آگے چلا گیا۔ اس کے جاتے ہی ہماری جیپ کا انجن چلا دیا گیا۔ شاید ان لوگوں نے ایک جگہ کھڑے رہ کر کسی حادثے کا شکار ہونے کے بجائے چلتے رہنے کا ارادہ کرلیا تھا مگر میں حیران تھا کہ جیپ کے آگے کچھ بھی نظر نہ آنے کی صورت میں ڈرائیور سیدھے راستے پر کیوں کر چل سکیں گے؟

پھر اُس کا حل بھی سامنے آگیا۔ اگلی جیپ کسی اور نے سنبھال لی تھی۔ اس کے ڈرائیور نے دھواں دھار بارش کی پروا کئے بغیر راستے کی نشان دہی کا فرض سنبھال لیا تھا۔ وہ باہر سے اپنی سرچ لائٹ کے اشارے کرتا رہا اور دونوں گاڑیاں جوں کی رفتار سے آگے رینگنے لگیں۔

وائپر ونڈ شیلڈ پر پڑنے والی پانی کی دبیز چادر کو ہٹانے کی ناکام کوششیں کرتے رہے۔ صندل خان ایک کپڑے سے اندرونی سطح پر آئی ہوئی کُہر صاف کرتا رہا۔ وقفے وقفے سے چمکنے والی بجلی کی تیز روشنی میں بارش کا وہ تیز رفتار پانی نظر آرہا تھا جو مٹی اور پتھروں کے ملبے سے گارے کی صورت میں بلندیوں سے نشیب کی طرف بہا جارہا تھا۔ اُس نے زمین کی دراڑیں وغیرہ صاف کر کے اپنی گزرگاہیں بنالی تھیں۔ اُن کی وجہ سے راستہ بہت زیادہ ناہموار اور تکلیف دہ ہوگیا تھا۔ اس پر مستزاد یہ تھا کہ ڈرائیور کو کچھ دیکھے بھالے بغیر' اگلی جیپ کی اندھی تقلید کرنی پڑ رہی تھی جب کہ اگلی جیپ باہر سے ہونے والے سرچ لائٹ کے اشاروں پر چل رہی تھی۔

صندل خان اپنے کام میں اتنی تیزی سے منہمک تھا کہ کافی دیر تک میں اسے مخاطب کرنے کی ہمت ہی نہ کرسکا۔ جیب اپنے وزن اور چھ آدمیوں کے بوجھ کے باوجود کسی ہلکے کھلونے کی طرح کانپ رہی تھی۔ بجلی کی کڑک میں نظر والی صورت حال سے اندازہ ہو رہا تھا کہ بارش تیز ہونے کے ساتھ ہواؤں کے جھکڑ ختم ہوچکے تھے۔ شاید اسی کے بعد اگلی جیپ کا ڈرائیور باہر نکلنے کی ہمت کرسکا تھا۔

"معلوم ہوتا ہے کہ آج ہم یہیں کسی چٹان میں دب کر رہ جائیں گے" آخر کار ویرا نے لرزتی ہوئی آواز میں بوجھل سکوت کا خاتمہ کیا "اس طوفانی برسات نے دہشت ناک زور پکڑ لیا ہے۔"

"اسے ایک دراڑ کا علم ہے" صندل خان نے خود بخود جواب دیتے ہوئے کہا "ہم کسی طرح وہاں تک پہنچنے میں کامیاب ہوگئے تو محفوظ ہوجائیں گے۔ یہ پہاڑ بہت خطرناک تھا۔ اس سے عام دنوں میں بھی بڑے بڑے پتھر ٹوٹ کر نیچے گرتے رہتے ہیں۔ بارش میں تو وہاں کچھ بھی ہوسکتا تھا۔"

مجھے اس کی باتیں طفل تسلی کی طرح محسوس ہوئیں۔ ہم ایک چٹان گرنے کی گڑگڑاہٹ اور دھماکے سن چکے تھے۔ اِس وقت بھی قرب وجوار سے ویسی ہی آوازیں سنائی دے رہی تھیں۔ خوش قسمتی کی بات یہ تھی کہ وہ ٹوٹ پھوٹ ہمارے کارواں سے دور ہو رہی تھی اور ہم اس سے محفوظ تھے۔ میں اس جغرافیائی حقیقت سے پوری طرح باخبر تھا کہ ایک ہی علاقے کے دو پہاڑوں کی ساخت میں نمایاں فرق نہیں ہوتا بلکہ دور دراز سلسلوں کے پہاڑ بھی ایک جیسے ہوتے ہیں۔ اگر ایک پہاڑ کی سطح کمزور اور خطرناک تھی تو دوسرے پہاڑ بھی کم وبیش ویسے ہی ہونے چاہئیں تھے۔ خطرات بدستور اپنی جگہ موجود تھے۔ بس صندل خان' ویرا کی دل جوئی کر رہا تھا۔

کافی دیر کے بعد وہ دونوں جیپیں یکے بعد دیگرے ایک کشادہ دراڑ میں داخل ہوئیں تو مجھے اگلی جیپ کے ڈرائیور کی باخبری کا معترف ہونا پڑا۔ وہ واقعی اس علاقے کے چپے چپے سے واقف تھا۔ شاید اسی لیے اسے آگے چلنے کا فرض سونپا گیا تھا۔ اس نے اپنی ذمے داری بہت فرض شناسی کے ساتھ پوری کی تھی۔

وہ دراڑ بہت کشادہ اور گہری تھی۔ اس میں پہنچتے ہی گاڑیوں کے ہیڈ لیمپس کام کرنے لگے' جن کی روشنی آگے پھیلی ہوئی تاریک خلا میں مدغم ہو رہی تھی۔ اس کا مطلب تھا کہ وہ مقام طوفانی بارش سے بالکل محفوظ تھا۔ سب نے فوراً ہی کھڑکیوں کے شیشے گرادئے۔ چند گز اندر پہنچنے کے بعد گاڑیاں روک کر انجن بند کردئے گئے۔

سطح زمین پر وہ دراڑ ہی معلوم ہوتی تھی لیکن اوپر سے اس کا کشاؤ بہت کم ہوگیا تھا یا سرے سے بند ہی ہوگیا تھا جس کی وجہ سے اس نے ایک وسیع اور بہت گہرے غار کی صورت اختیار کرلی تھی۔

غار میں سناٹا ہونے کے بعد آگے والوں کی آوازیں گونجنے لگیں۔ صندل خان نے روشنی کا بندوبست ہونے تک ہمیں اپنی جگہوں پر بیٹھے رہنے کی ہدایت کی اور خود نیچے اتر گیا۔ دوسرے ڈرائیور کی سرچ لائٹ نے اس تاریک غار کو کافی دور تک روشن کیا ہوا تھا۔ بھاری نقل وحرکت اور انسانی موجودگی کی وجہ سے کئی سانپ اپنے بلوں سے نکل کر اِدھر اُدھر فرار ہوتے ہوئے نظر آئے لیکن باہر موجود افراد میں سے کسی نے ان پر دھیان نہیں دیا۔

تھوڑی ہی دیر میں مناسب قوت والی ایک لائٹ جیپ کے دروازے پر لگا کر' اس کے تار بیٹری سے جوڑ دئے گئے اور اس مقام سے غار کے باہر تک خاصی روشنی پھیل گئی۔ سب لوگ جیپوں سے اتر کر اس روشنی میں آگئے اور غار یا دراڑ کے دہانے سے باہر ہونے والی موسلا دھار بارش کا منظر دیکھنے لگے۔

"بڑی بھیانک اور ڈراؤنی رات ہے" غزالہ میرے قریب آتے ہی خوف زدہ آواز میں بولی "گھنٹی کی آواز ان کے لیے کوئی بہت بُرا شگون تھی جبھی ان سب پر دیوانگی کا دورہ پڑ گیا تھا" اس کی آواز سرگوشیانہ تھی۔

"اس بارے میں زبان بند رکھو" میں نے سختی سے کہا پھر ہنستے ہوئے اونچی آواز میں بولا "رات نہیں' ابھی دن ہے۔ تم بھول رہی ہو کہ گھنگھور گھٹاؤں نے یہ تاریک سماں باندھا ہوا ہے۔"

سب لوگ چونک کر مجھے ایسی نگاہوں سے گھورنے لگے جیسے میں نے کسی میت کے سرہانے کوئی لطیفہ سنانے کی حماقت کر ڈالی ہو۔ اس طوفانی موسم میں ایک محفوظ پناہ گاہ میسر آجانے کے باوجود ان سب کے بشروں سے تشویش اور پریشانی ہویدا تھی۔ شاید وہ گھنٹی والی بھیڑ کے نحوست آمیز خوف سے نجات نہیں پا سکے تھے۔

اچانک غزالہ ایک چیخ مار کر میرے بازو سے لپٹ گئی۔ ایک سانپ اس کے پیر پر سے رینگ کر تاریکی میں چلا گیا تھا۔ اسے دوسروں کے علاوہ صندل خان نے بھی دیکھ لیا تھا۔

"بلاوجہ بھڑکنے اور دوسروں کو پریشان کرنے کی ضرورت نہیں" صندل خان نے نرمی اور سنجیدگی سے کہا "ان اطراف میں پائے جانے والے سانپ بے ضرر ہوتے ہیں۔ وہ ہماری وجہ سے

گھبرا کر اپنے بلوں سے نکل پڑے ہیں۔ تھوڑی دیر میں وہ سب نئی پناہ گاہوں میں پہنچ جائیں گے۔ ایسے ویران مقامات پر سانپ اور بچھو نکلتے ہی رہتے ہیں۔ ان سے ڈر کر ہم ایک لمحہ بھی یہاں نہیں ٹک سکتے۔"

بارش کے بعد موسم اچانک خنک ہوگیا تھا۔ ایک ڈرائیور کے علاوہ کسی اور نے کوئی غیر معمولی محنت نہیں کی تھی لیکن بدترین موسمی تبدیلی نے ہر ایک کے اعصاب کو ہلا کر رکھ دیا تھا۔ صندل خان کو اِس حقیقت کا پورا ادراک تھا۔ وہ اپنے سامان کے تھیلے سے واڈکا کی ایک اور بوتل لے آیا۔ اس بار غزالہ اور سلطان شاہ کے علاوہ سب نے ایک ایک گھونٹ لینے کی ضرورت محسوس کی اور خالی بوتل وہیں ایک گوشے میں لڑھکادی گئی۔

سب لوگ اپنی اپنی جگہیں بنا کر پتھروں پر بیٹھ گئے۔ کچھ نسوار لینے لگے۔ بعض نے سگریٹیں سلگالیں۔ صندل خان کے لیے واڈکا کا ایک گھونٹ ناکافی ثابت ہوا تھا اس لیے وہ تیسری بوتل لے کر ایک طرف جا بیٹھا تھا۔ میں غزالہ اور سلطان شاہ کو دبی آواز میں اپنی معلومات وغیرہ سے آگاہ کرنے لگا۔ ویرا سب سے الگ تھلگ' پچھلی جیپ سے ٹیک لگائے' کھوئے کھوئے انداز میں سگریٹ پی رہی تھی جیسے اگلے فیصلوں کا سارا بوجھ اسی کے سر پر آپڑا ہو۔

تھوڑی دیر بعد میری نظر غیر ارادی طور پر اٹھی تو ویرا اپنی جگہ سے غائب تھی مگر میری متجسس نگاہوں نے فوراً ہی اسے تلاش کرلیا۔ وہ تیز روشنی سے بچ کر صندل خان کے ساتھ بیٹھی ہوئی تھی۔ بوتل اسی کے ہاتھ میں تھی۔ شاید صندل خان نے اسے اپنے پاس بلالیا تھا لیکن اِس بار اُس نے مجھے مدعو کرنے کی ضرورت محسوس نہیں کی تھی۔

"کیا ویرا اس پر ڈورے ڈالنے کی کوشش کررہی ہے؟" سلطان شان نے میری نظروں کے تعاقب میں ان دونوں کی طرف دیکھتے ہوئے' متجسّسانہ لہجے میں سوال کیا "ان میں گہری گھٹتی نظر آرہی ہے۔"

"بلی اور چوہے کا کھیل ہورہا ہے" میں نے بے پروائی سے کہا "کچھ نہیں کہا جاسکتا کہ کب ویرا کا داؤ چل جائے۔"

"اس وقت وہ ہمارے ساتھ ہے" سلطان شاہ بولا "اسے عزت اور وقار کے منافی کوئی قدم نہیں اٹھانا چاہیے۔"

"میری بھی یہی آرزو ہے لیکن تم جانتے ہو کہ ہم مہذب دنیا کو کتنا پیچھے چھوڑ آئے ہیں۔ یہاں وہ اپنی مرضی کی مالک ہے۔ اپنا الو سیدھا کرنے کے لیے وہ کوئی بھی راہ اختیار کرسکتی ہے۔ اسے کون روک سکے گا؟"

"اسے بھول کر اپنی فکر کرو" غزالہ نے پُرتشویش لہجے میں کہا "اس بار آثار اچھے نہیں ہیں۔ ہمیں ایک بار تشنگارا ویلی پہنچادیا گیا تو ہم وہاں سے فرار ہونے کے بعد بھی ان پہاڑوں سے زندہ نہیں نکل سکیں گے۔"

اچانک باہر سے ایک تیز اور خوفناک گڑگڑاہٹ سنائی دی۔ آسمان پر ہولناک گرج کے ساتھ بجلی چمکی۔ گڑگڑاہٹ کی وجہ سے ہمارے پیروں کے نیچے کی زمین ہلنے لگی تھی۔ شاید ایک مرتبہ پھر کسی بڑی چٹان نے اپنی جگہ چھوڑ کر نشیب کا سفر اختیار کرلیا تھا۔ پے درپے کئی پرشور دھماکوں کا سلسلہ آخر کار بھیانک سکوت پر معدوم ہوگیا لیکن سکوت کہاں؟ باہر بارش کا طوفانی شور پوری شدت کے ساتھ جاری تھا۔

میرے اور غزالہ کے درمیان جب بھی کوئی اختلاف رائے پیدا ہوتا یا نوک جھونک کی صورت حال رونما ہوتی تو ویرا عملی طور پر بی جمالو کا کردار ادا کرنا شروع کردیتی تھی۔ اس وقت ویرا موجود نہیں تھی' اس لیے اس فرصت کو غنیمت جان کر غزالہ نے جنت گل کا ذکر چھیڑ دیا۔ تشنگارا ویلی میں ہمارے ساتھ کیا سلوک روا رکھا جاتا' اس کے بارے میں کوئی اندازہ نہیں لگایا جاسکتا تھا اس لیے میں نے اس مہلت کو غنیمت جان کر' مدافعانہ لب ولہجے میں اپنی کہانی شروع کردی جس میں بعض بنیادی حقائق کو میں نے اپنے مفاد کے مطابق توڑ مروڑ لیا تھا۔

سلطان شاہ اس موضوع کی نزاکت کو بھانپتے ہوئے وہاں سے ٹل گیا تھا تاکہ ہم دونوں کھل کر بات کرسکیں اور اگر کسی کے دل میں کوئی غبار موجود تھا تو اسے وضاحتوں سے صاف کرسکیں۔

کسی نے سچ کہا ہے کہ دنیا کی ہر عورت اپنے مرد کی کمزوریوں کو اچھی طرح جانتی ہے۔ یہ دیگر بات ہے کہ وہ مصلحت کی وجہ سے ان کمزوریوں سے چشم پوشی اختیار کرلے یا اپنی زبان بند رکھے۔ غزالہ نے پوری کہانی سننے کے بعد ابتدا میں ہی جو سوالات کیے وہ بہت نکیلے اور کاٹ دار تھے۔ میں تلخی پر اتر آیا اور ہمارے درمیان بحث کا آغاز ہوگیا۔ غزالہ کے دل کی بھڑاس نکل جانے کے بعد ماحول کا تناؤ ختم ہوگیا۔ اس کا ایک نتیجہ یہ نکلا کہ ہم بہت دیر تک گردوپیش سے بے خبر ہوکر باتوں میں الجھے رہے۔ کافی دیر بعد مجھے ویرا کا دھیان آیا تو وہ صندل خان سمیت لاپتا تھی۔ میں کوشش کے باوجود سلطان شاہ کو بھی تلاش کرنے میں کامیاب نہ ہوسکا۔

کئی گھنٹوں کے تسلسل کے بعد بارش کا زور ٹوٹنے کے آثار نظر آئے تو شنگاریوں میں زندگی کی لہر دوڑ گئی۔ باہر پھیلا ہوا اندھیرا تیزی سے کم ہونے لگا تھا۔ اس کے اثرات اس دراڑ میں بھی پڑ رہے تھے۔ رفتہ رفتہ روشنی اتنی بڑھ گئی کہ جیپ کی بیٹری سے منسلک روشنی کی ضرورت باقی نہ رہی۔ ایک آدمی اس طرف گیا تو اندھیرے میں سے ویرا کی دبی دبی اور پرشوق ہنسی کی آواز سنائی دی۔ میں نے چونک کر اُدھر دیکھا تو روشنی کے اس پار کچھ بھی نظر نہ آیا۔ روشنی کے تار الگ کیے جانے کے بعد وہ صندل خان کے ساتھ آتی ہوئی نظر آئی تو اس پر گہرا سرور طاری تھا۔ فرش کی ناہموار سطح پر بکھرے ہوئے پتھروں پر وہ صندل خان کے سہارے چل رہی تھی۔ وہ منظر دیکھ کر میری آنکھوں میں خون اتر آیا۔

صندل خان' اپنے خول سے باہر نکل کر بہت دلچسپ آدمی ثابت ہوا" وہ ہمارے قریب آکر بولی "اس کے ساتھ وقت گزرنے کا پتا ہی نہیں چلا" میں نے نفرت سے اپنا منہ دوسری طرف پھیرلیا۔

"اِس کا منہ کیوں سوجا ہوا ہے؟" اُس نے حیرت سے غزالہ سے پوچھا "تم دونوں میں لڑائی تو نہیں ہورہی تھی؟"

اس وقت مجھے ویرا کی آواز زہر لگ رہی تھی۔ میں وہاں رکتا تو اس سے بُری طرح الجھ پڑتا۔ میں نے یہی مناسب سمجھا کہ خاموشی کے ساتھ وہاں سے اٹھ کر کسی اور کے پاس چلا جاؤں۔

"ذہنی کے غصے کا سبب شاید تم خود ہی ہو" جاتے جاتے میرے کانوں میں غزالہ کی ملامت آمیز آواز آئی۔

صندل خان' ویرا سے الگ ہوکر اُس دراڑ کے دہانے پر جا کھڑا ہوا تھا اور آسمان کا جائزہ لے کر اعلان کررہا تھا کہ وہ لوگ زیادہ سے زیادہ دس پندرہ منٹ میں سفر شروع کرسکیں گے کیونکہ گھرے بادل بہت تیزی کے ساتھ چھٹ رہے تھے اور مطلع صاف ہوتا جارہا تھا۔ میں اسی کے پیچھے جا کھڑا ہوا۔

وہ میری طرف مڑا تو میرا بازو تھام کر پرجوش لہجے میں کہنے لگا "میری سمجھ میں نہیں آتا کہ فرزانہ جیسی فراخ دل لڑکی کے ساتھ ہوتے ہوئے بھی تم اس قدر اداس اور فکرمند کیوں رہتے ہو۔ اُس کے ساتھ تو ایک مرتبہ جہنم میں بھی بے خوف وخطر چھلانگ لگائی جاسکتی ہے۔ وہ بڑی زوردار فرنگن ہے۔"

لمحہ بھر کے لیے میں چکرا کر رہ گیا۔ میری سمجھ میں ہی نہیں آیا کہ وہ کس کا ذکر کررہا تھا لیکن جوں ہی مجھے یاد آیا کہ ویرا اُن لوگوں کے درمیان فرزانہ بنی ہوئی تھی' میں تلخ لہجے میں بول پڑا "میرا خیال ہے کہ تم دونوں نے کئی چھلانگیں لگائی ہوں گی۔ کافی دیر سے تم نظر نہیں آرہے تھے۔"

اِس وقت وہ خوش گوار موڈ میں تھا۔ کچھ شراب کا اثر بھی تھا اس لیے وہ میری بات پر دھیان دیے بغیر بولا "ہم دونوں پچھلی جیپ میں تھے۔ وہ پینے کے معاملے میں بھی مَردوں سے کم نہیں ہے۔"

وہ دونوں ایک دوسرے کی تعریفیں کررہے تھے۔ میرے لیے نتائج اخذ کرنا زیادہ مشکل نہیں تھا۔ اس معاملے میں زیادہ ملوث ہوکر میں اپنا خون سلگانے کے علاوہ اور کچھ نہیں کرسکتا تھا۔ میں نے وہ ناخوشگوار موضوع تبدیل کرنے کی نیّت سے پوچھا "ہمارا باقی سفر کس وقت تک ختم ہوجائے گا؟"

"بارش نے ہمیں دوبارہ رکنے پر مجبور نہ کیا تو جھٹپٹے کے وقت ہم وادی میں ہوں گے اور کل صبح تم لوگوں کو خان بابا کے روبرو پیش کردیا جائے گا۔"

"یہ بتاؤ کہ سردار پائندہ گل کا اصل لقب کیا ہے؟" میں نے اسے اسی موضوع میں الجھائے رکھنے کے لیے پوچھا "کبھی تم اسے خان بابا کہتے ہو اور کبھی سردار بابا۔"

"دونوں چلتے ہیں۔ وہ کسی کا بُرا نہیں مانتا۔ ویسے وہ شاید خان بابا کے لقب سے زیادہ خوش ہوتا ہے۔"

ویرا بدستور غزالہ کے پاس موجود تھی۔ وہ صندل خان کے دل ودماغ کو اس طرح اپنے شکنجے میں جکڑ چکی تھی کہ وہ پھر اسی کی طرف چل دیا۔ میں نے اس کا ساتھ نہیں دیا اور ایک گوشے میں بیٹھ کر سگریٹ پینے میں مصروف ہوگیا۔ اس وقت مجھے ویرا کی صورت بلکہ پورے وجود سے نفرت ہو چلی تھی۔

اچانک سلطان شاہ میرے پاس آپہنچا۔ اس کی آنکھوں میں مجرمانہ بے چینی کی جھلک دیکھ کر میں نے اُس سے بازپرس کی تو اس نے سرگوشیانہ لہجے میں مجھے مطلع کیا کہ وہ سامان کے تھیلوں میں سے ایک پستول اور فاضل راؤنڈز کا ڈبا حاصل کرنے میں کامیاب ہوچکا تھا۔

میں نے اس اطلاع پر فوراً ہی فیصلہ صادر کردیا "اس سے پہلے کہ کسی کو اِس چوری کا علم ہو' دونوں چیزیں واپس پہنچادو۔ اس بھیڑ میں وہ پستول صرف صندل خان کا ہوسکتا ہے۔ ان چیزوں کی چوری کا علم ہوتے ہی وہ بپھر جائے گا۔ ویسے ایک پستول اور چند گولیاں ہمارے لیے بے مصرف ہیں۔ مجھے حیرت ہے کہ چوری کرتے ہوئے تم کو اپنا حلف بھی یاد نہیں رہا۔"

"حلف راستے میں محاذ آرائی کے لیے لیا تھا۔ چوری چکاری کے لیے نہیں" وہ ڈھٹائی سے بولا "پستول کا کھیل تو شنگارا دیلی پہنچنے کے بعد شروع ہوتا۔ اگر صندل خان اندھیرے میں ادھر نہ آنکلتا تو شاید میں اس تھیلے میں سے گولیوں کے مزید ڈبے نکالنے میں کامیاب ہوجاتا۔"

"تو کیا صندل خان نے تمہیں دیکھ لیا تھا؟" میں نے چونک کر پوچھا۔

"سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ وہ ویرا کو لے کر پچھلی جیپ میں آیا تھا۔ وہ دونوں باتوں میں مگن تھے۔ میں ان کی نظروں میں آئے بغیر اندھیرے میں کھسک گیا۔ میں ان کی واپسی کے بعد اپنی کمین گاہ سے نکلا تھا۔"

میں نے وہ بات وہیں اڑادی "جاؤ۔ روشنی پھیلتی جارہی ہے۔ روانگی سے پہلے دونوں چیزیں اسی تھیلے میں واپس ڈال دو۔ بعد میں موقع نہیں ملے گا اور یہ گناہ بے لذت گلے پڑجائے گا۔"

وہ بے پروایانہ انداز میں ایک طرف چل دیا۔ اس کی باتوں سے ظاہر ہورہا تھا کہ وہ ویرا اور صندل خان کو کافی دیر تک دیکھتا رہا تھا۔ میں اس سے تفصیلات پوچھ کر مزید کوفت میں مبتلا نہیں ہونا چاہتا تھا۔ مجھے یہ تسلی ضرور ہوگئی تھی کہ ضرورت پیش آنے پر میں کسی بھی وقت اُس کی چشم دید گواہی سے ویرا کو شرمندہ بلکہ ذلیل کرسکتا تھا۔ میری نظروں سے گرنے کے بعد وہ کسی عزت کی حق دار نہیں رہ گئی تھی۔

آخر کار قدرت کو ہمارے کارواں کی مجبوریوں پر رحم آگیا۔

بارش تھم گئی۔ آسمان اَبر آلود ضرور تھا لیکن گہری اور سیاہ بدلیوں کی جگہ سرمئی بادلوں کی ٹکڑیاں تیرتی ہوئی نظر آ رہی تھیں۔ وہاں ہر طرف پہاڑ ہی پہاڑ تھے اس لیے برسات کے ساتھ شروع ہونے والا پانی کا تیز بہاؤ برسات رکتے ہی ختم ہوگیا تھا۔ صندل خان نے اِن سازگار حالات کا جائزہ لے کر کوچ کا اعلان کردیا۔

اس بار بھی صندل خان نے سب کو وہی ترتیب اختیار کرنے کی ہدایت کی جو طوفان بادوباراں کے وقت تھی یعنی مجھے اور ویرا کو اُس کی جیپ میں سفر کرنا تھا۔ غزالہ اور سلطان شاہ کے لیے اگلی جیپ مخصوص تھی۔ میرے لیے وہ ہدایت صبر آزما تھی۔ اس وقت میں ویرا کی صورت دیکھنے کا روادار نہیں تھا تو کئی گھنٹوں تک اس کا لمس کیسے برداشت کرسکتا تھا۔ میں اُس کے سامنے والی سیٹ پر بیٹھا تو وہ اپنی جگہ چھوڑ کر میرے برابر میں آگئی۔ میں نے اس کی جگہ لی تو وہ وہاں بھی آگئی۔

"آخر پتا تو چلے کہ تم مجھ سے برہم کیوں ہو؟" اس نے میرا بازو تقریباً نوچ کر سوال کیا۔

"دماغ خراب ہوگیا ہے" میں نے غرا کر اس کا ہاتھ جھٹک دیا اور اپنا منہ دوسری طرف پھیرلیا۔

اسی وقت ایک محافظ سوار ہوا تو میں پھرتی سے اس کے ساتھ بیٹھ گیا۔ بعد میں آنے والے محافظ نے جھجک کر خالی نشست کی طرف دیکھا پھر خوش گوار حیرت کے ساتھ ویرا کے برابر میں بیٹھ گیا۔ صندل خان نے اگلی نشست پر بیٹھنے سے پہلے ہی اس تبدیلی کو بھانپ لیا اور پوچھا "کیا تم دونوں لڑ پڑے ہو؟"

"ارے نہیں" ویرا ایک ادائے خاص سے اپنی گردن جھٹک کر معصومیت سے ہنس پڑی "ہمارے درمیان لڑنے والا کوئی رشتہ نہیں ہے۔ دراصل اپنی بیوی سے لڑنے کے بعد ڈینی ساری دنیا سے اسی طرح بے زار ہوجاتا ہے۔ وہ موجودہ مصائب پر ڈینی سے بُری طرح ناراض ہوگئی ہے۔"

"تمہیں ان کے ذاتی مسائل کا مذاق نہیں بنانا چاہیے" صندل خان نے محظوظ ہونے کے بجائے بردباری سے کہا۔

گاڑیاں حرکت میں آگئیں۔ بارش کے بعد ان وادیوں میں خنک ہوائیں چل پڑی تھیں جن میں پہاڑوں سے اٹھنے والی سوندھی سوندھی خوشبو بھی شامل تھی۔ وہاں کسی باقاعدہ سڑک کا وجود نہیں تھا۔ زمین سنگلاخ ہونے کی وجہ سے زمین پر دوسری گاڑیوں کے چھوڑے ہوئے نشانات بھی نہیں تھے۔ اس لیے سفر کی سمت کا پیشگی اندازہ لگانا ناممکن ہو کر رہ گیا تھا۔ اگلی جیپ کا ڈرائیور اپنی صوابدید کے مطابق جہاں چاہتا، گاڑی کو موڑ لیتا تھا۔ کئی مرتبہ یوں بھی ہوا کہ ہماری گاڑیاں بہتر راستے کو چھوڑ کر گڑھوں کو مڑوں میں گھس گئیں اور وہی اصل راستہ تھا۔ دونوں گاڑیوں کی رفتار سست تھی لیکن انجن کی تیز غراہٹوں سے اندازہ ہو رہا تھا کہ ہم بتدریج بلندی کی طرف جا رہے تھے۔

راستے میں کہیں بھی کھانے پینے کے لیے نہیں رکا گیا۔ شاید گاڑیوں میں خوردونوش کا سامان سرے سے نہیں تھا۔ بڑے بڑے تھیلوں میں جو بھی خشک چیزیں بھری ہوئی تھیں، وہ شنگاراویلی کے باسیوں کی ضروریات کے لیے تھیں۔ بس صندل خان اپنے لیے واڈکا کی بوتلیں بھر لایا تھا جن میں سے دو صاف ہوچکی تھیں۔ تیسری کسی بھی وقت جواب دے سکتی تھی کیونکہ صندل خان وقفے وقفے سے اسے منہ سے لگاتا جا رہا تھا۔

ویرا راستے بھر چہکتی اور صندل خان سے گھُل مل کر باتیں کرتی رہی۔ اس دوران میں وہ مجھ پر چوٹ کرنے کا کوئی موقع ضائع نہیں کررہی تھی مگر میں نے اُس کے منہ نہ لگنے کا فیصلہ کرلیا تھا۔ صندل خان نے جب بھی مجھ سے بات کرنی چاہی، میں نے کسی گرم جوشی کا مظاہرہ کیے بغیر اسے سپاٹ سے جوابات دینے پر اکتفا کیا اور آخر کار اس نے بھی اپنی ساری توجہ ویرا پر مرکوز کردی۔

سورج ہماری نظروں سے یوں اوجھل ہوا تھا کہ دوبارہ اس کی جھلک بھی نظر نہیں آئی۔ پورے وقت ہلکے اور گہرے بادل ہمارے ہم سفر رہے۔ بارش نے پورے علاقے میں زبردست توڑ پھوڑ مچائی تھی۔ راستے میں نظر آنے والے کٹاؤ تو خیر ہر جگہ موجود تھے لیکن کہیں کہیں پتھروں نے راستہ بالکل مسدود کیا ہوا تھا۔ ایسے مقامات پر صندل خان کے آدمی پتھروں کو لڑھکا کر راستہ بناتے رہے اور پھر شام کی عمل داری شروع ہوگئی۔

اَبر کی وجہ سے غروب آفتاب سے پہلے ہی ہیڈ لیمپس روشن کرنے پڑ گئے لیکن سفر میں کوئی رکاوٹ پیش نہیں آئی۔ مسلسل پہاڑ اور پتھریلے راستے دیکھتے دیکھتے میری آنکھیں تھکنے لگی تھیں۔

فضا میں گھور اندھیرا پھیلنے سے پہلے ہی ہم ایک موڑ گھومے تو صندل خان بے اختیار بول پڑا "ہم پہنچ گئے۔ وہ سامنے گالان کی پہاڑی نظر آ رہی ہے۔ بس اسی کے دامن میں آج رات بسر ہوگی۔ اس پہاڑی کا ایک سرا زرافہ کی گردن کی طرح بہت اونچا ہے۔"

اس جگہ سے گالان نامی پہاڑی کسی قدیم کلیسا کے پتلے اور اونچے مینار کی طرح چٹانوں کے درمیان سے سر نکالے نظر آ رہی تھی۔ جیپ کا رخ بدلنے کے ساتھ ساتھ اس کا پھیلاؤ بھی سامنے آتا چلا گیا۔ صندل خان، ویرا کو بتا رہا تھا کہ گالان کی پہاڑی اوپر سے مسطح اور بہت وسیع تھی۔ جس کے ایک حصے میں جنگلات اگے ہوئے تھے۔ پچھلی ڈھلانیں بھی ان ہی جنگلات سے پوری طرح ڈھکی ہوئی تھیں۔ ان ڈھلانوں کا اختتام گہری اور ناہموار کھائیوں میں ہوتا تھا جہاں سے کوئی گالان کا رخ کرنے کی ہمت نہیں کرسکتا تھا۔ شنگاری قبیلہ اسی محفوظ سطح مرتفع پر رہتا تھا۔ انہوں نے پہاڑ سے کئی سو فٹ نیچے، پیالہ نما وادی کو قابل کاشت بنایا ہوا تھا۔ وادی میں داخلے کا راستہ ایسے مقام سے تھا جہاں گالان کا پتلا سا حصہ نظر آتا تھا اور وہیں محافظ موجود رہتے تھے۔ اس درے کے بعد چاروں طرف پہاڑ تھے جن کے پیچھے صرف موت کا راج تھا۔ اس وجہ سے وادی میں داخل ہونے کے بعد کوئی بھی شخص وہاں کے محافظوں کی نظروں سے بچ کر فرار نہیں ہوسکتا تھا۔

وادی سے گالان تک پہنچنے کا راستہ بھی آسان نہیں تھا۔ شنگاری اس راستے کے عادی تھے لیکن وادی سے اوپر تک باربرداری وغیرہ کے لیے خچر استعمال کیے جاتے تھے۔

میرے لیے وہ تمام باتیں حیران کن تھیں لیکن ویرا سے اپنی برہمی کی وجہ سے میں نے ان تفصیلات میں گہری دلچسپی کا اظہار نہیں کیا۔ ویرا خود ہی صندل خان سے ایسے سوالات کررہی تھی جن کی وجہ سے مجھے بولنے یا دخل انداز ہونے کی ضرورت محسوس نہیں ہو رہی تھی۔

تھوڑی دیر بعد گالان پہاڑی نظروں سے اوجھل ہوگئی۔ مجھے امید تھی کہ وہ سفر جلد ہی ختم ہوجائے گا لیکن اندھیرا گہرا ہونے کے باوجود سفر جاری رہا۔ اچانک فضا میں ایک فائر کی تیز آواز گونجی جو پہاڑوں سے ٹکرا کر دیر تک بازگشت پیدا کرتی رہی۔ دونوں جیپوں کے ڈرائیوروں نے ہیڈ لیمپس کو متعدد بار دھیما اور تیز کیا پھر ہارن بجانے لگے۔ اس ماحول میں وہ سب بہت عجیب اور پراسرار معلوم ہو رہا تھا۔

اس شور کا سلسلہ موقوف ہوا تو ویرا نے صندل خان پر سوالات کی بھرمار کردی۔ اس نے بتایا کہ گالان کے سرے پر موجود محافظوں نے گاڑیوں کے ہیڈ لیمپس دیکھ کر فائر کی صورت میں ان سے شناخت طلب کی تھی۔ اگر شناخت نہ کرائی جاتی تو بلندی سے آنے والی بے شمار گولیاں ہر ایک کے بدن کو چھلنی کرڈالتیں۔ ڈرائیوروں نے مخصوص انداز میں ہارن بجا کر اور روشنیاں دھیمی اور تیز کرکے اپنی شناخت کرادی تھی۔ اس طرح ہمارے قافلے کی آمد کی خبر ہم سے پہلے شنگاراویلی میں پہنچ چکی تھی۔

آخر کار وہ مقام بھی آ ہی گیا جہاں دو پہاڑیوں کے درمیان ایک قدرتی گزرگاہ نظر آ رہی تھی۔ اس درے کے ایک طرف چند سو فٹ اونچا ٹیلہ تھا اور دوسری طرف کھڑی ڈھلان والا ایک پہاڑ آسمان میں پہنچتا ہوا نظر آ رہا تھا اور اسی کی چوٹی پر شنگاراویلی کے محافظ براجمان تھے۔

"اوپر بیٹھے ہوئے چند نشانچی، ہزاروں کے لشکر کو اس درے سے گزرنے سے پہلے خاک و خون میں نہلا سکتے ہیں" صندل خان پُرغرور آواز میں کہہ رہا تھا "اسی وجہ سے ہماری سرزمین کی طرف آج تک کسی نے میلی آنکھ سے دیکھنے کی جرأت نہیں کی۔ یہ زمین ہماری ہے اور ہماری ہی رہے گی۔"

"تو کیا باقی افغانستان تمہارا نہیں ہے؟" اس بار میں اپنی حیرت کے باعث خاموش نہ رہ سکا۔

"جن کا ہے، وہ اس کے لیے لڑ رہے ہیں۔ ان سے ہمارا کوئی واسطہ نہیں ہے۔"

"تم اس چھوٹی سی وادی کو اپنا کہہ رہے ہو۔ مجھے تو یاد پڑتا ہے کہ افغانستان میں بھی شنگاری پائے جاتے ہیں" میں نے کہا "ان میں اور تم میں کیا فرق ہے؟"

"پہلی بات تو یہ کہ نہ وادی چھوٹی ہے نہ گالان کی سطح مرتفع تنگ ہے۔ یہ بہت بڑا علاقہ ہے جس پر سردار بابا کی حکمرانی ہے۔ ہوسکتا ہے کہ کچھ شنگاریوں نے چوری چھپے باہر بھی شادیاں کی ہوں۔ ان کی اولاد یہاں نہیں آئی مگر وہ بھی تو شنگاری ہی کہلائیں گے یا پھر تم کسی اور قبیلے کی بات کر رہے ہوگے۔"

میں نے دوبارہ خاموشی اختیار کرلی۔ گاڑیاں بدستور گالان کے دامن میں واقع درے سے گزر رہی تھیں۔ درہ کہیں تنگ اور کہیں اتنا کشادہ تھا کہ اس میں چھ گاڑیاں ایک ساتھ گزر سکتی تھیں۔ گالان کے پرشکوہ پہاڑ نے خاموشی کے ساتھ اس راستے کو اپنی پناہ میں لیا ہوا تھا۔

گاڑیاں درے میں سے گزرنے کے بعد جوں ہی وادی میں داخل ہوئیں، اچانک کہیں کوئی گھنٹی پرشور آواز میں بجنے لگی۔ ایک مرتبہ پھر صندل خان کے آدمیوں پر جنون سوار ہوگیا۔ دونوں گاڑیوں کی کھڑکیوں سے آتشیں ہتھیاروں کی نالیں باہر نکل آئیں اور موت کے نغمے الاپنے لگیں۔ فائرنگ دونوں پہلوؤں پر کی جا رہی تھی کیونکہ آگے کچھ مکان تھے جن میں زرد روشنیاں لہراتی ہوئی نظر آ رہی تھیں۔

گھنٹی کی پراسرار آواز اور پھر فائرنگ کا سلسلہ شروع ہوتے ہی روشن مکانوں میں شوروغل برپا ہوگیا۔ ہیڈ لیمپس کی دور تک پھیلی ہوئی روشنی میں بہت سے مرد اور عورتیں چیختے چلاتے بھاگے چلے آ رہے تھے۔

گھنٹی کی آواز دور کی تھی۔ ہتھیار بارودی نغمے گاتے رہے۔ گھنٹی پر ان کا کوئی اثر نہیں ہوا۔ پھر اچانک ہی گھنٹی کی آوازیں رک گئیں جیسے اس کا وجود ہی نہ رہا ہو۔ مزید کئی راؤنڈ فائر کرنے کے بعد صندل خان کے آدمیوں کو احساس ہوا کہ وہ پراسرار آواز تھم چکی تھی اور وہ بے مقصد گولیاں برسا رہے تھے۔

ہمارے آگے والی چلتی ہوئی جیپ میں سے ایک آدمی نیچے کود پڑا۔ اس نے اپنی رائفل کو نالی سے تھاما ہوا تھا۔ وہ جارحانہ انداز میں اسے لہراتا ہوا اس غول کی طرف لپکا جو مکانوں سے برآمد ہوا تھا۔ وہ غصیلی آواز میں کچھ چیختا بھی جا رہا تھا۔ آنے والے جس طرح آئے تھے، اس سے زیادہ بدحواسی کے عالم میں، بلبلاتے ہوئے واپس دوڑ پڑے۔ میں نے دیکھا کہ وہ سب فاقہ زدہ اور بدحال نظر آ رہے تھے۔ کسی کے بدن پر صاف یا پورا لباس نہیں تھا۔ اگر وہی شنگاری تھے تو عبرت نشان تھے۔ موت کی سوداگری بھی ان میں خوش حالی نہیں لا سکی تھی۔

ایک بڑے مکان کے سامنے گاڑیاں رک گئیں اور سب اتر پڑے۔ اس وقت تک چیخنے چلانے والے دوبارہ پتھر اور گارے سے بنے ہوئے مکانوں میں گھس کر خاموش ہوچکے تھے۔ وادی میں ہر

طرف سکوت کا راج ہوگیا تھا۔

وہ ایک عام سا پہاڑی مکان تھا۔ اس کا فرش گارے سے لیپ کر ہموار کردیا گیا تھا۔ جب کیروسین لیمپ روشن کئے گئے تو میں نے وہاں چند اجنبی چہروں کو موجود پایا جو ہمارے قافلے میں شامل نہیں تھے۔ صندل خان ان پر بگڑ رہا تھا اور وہ سر جھکائے اس کی پھٹکار سن رہے تھے۔ اس وادی میں پہنچتے ہی اس کے تیور بدل گئے تھے۔ اس کے ایما پر ہم چاروں کو ایک اندرونی کمرے میں پہنچادیا گیا۔ جاتے جاتے ویرا نے صندل خان سے بات کرنے کی کوشش کی لیکن اس نے مڑ کر ویرا کی طرف دیکھنا بھی گوارا نہ کیا۔ صندل خان کی اس بے رخی پر میرے دل میں ٹھنڈک سی پڑگئی۔ اس نے ویرا سے بے توجہی برت کر اسے اس کی حیثیت یاد دلادی تھی۔

دوسرے کمرے میں ہماری شب بسری کا پیشگی اہتمام تھا۔ وہاں پورے فرش پر اکہرا کمبل بچھا ہوا تھا جس پر ایک قطار میں چار گاؤ تکئے رکھے ہوئے تھے۔ تکیوں کے پیچھے اوڑھنے کے لیے اونی کمبل موجود تھے۔ ہمیں وہاں پہنچانے والا فوراً ہی واپس لوٹ گیا اور کمرے میں صرف ہم چاروں رہ گئے۔

"معلوم ہوتا ہے کہ اب بھوکا ہی سونا پڑے گا" ویرا نے بڑبڑاتے ہوئے کہا "یہاں پہنچتے ہی ان لوگوں نے آنکھیں بدل لی ہیں۔ پتا نہیں صبح خان بابا کیا فیصلہ صادر کرتا ہے۔"

"خدا کا شکر ہے کہ سفر ختم ہوا۔" غزالہ نے گہرا سانس لے کر کہا "میں تو اِس آسیبی سفر سے اس قدر تھک گئی ہوں کہ کھانا ملے یا نہ ملے' خوب گہری نیند سوؤں گی۔"

"بھوکوں کو صندل خان اپنے ساتھ کھانا کھلائے گا۔" میں نے کسی سے مخاطب ہوئے بغیر بے پروائی سے کہا "اس نے دوسروں کو الو بنانے کے لیے آنکھیں بدلی ہیں۔ تنہائی میں سارے ناز نخرے اٹھائے گا۔"

"کیا بک رہے ہو؟" ویرا ایکا ایکی غصے میں آگئی "برداشت کی ایک حد ہوتی ہے۔ میں نے کیا کیا ہے جو تم نے مجھ سے منہ پھلایا ہوا ہے؟ زبردستی میرے منہ آنے کی کوشش کررہے ہو۔"

"میں اپنی خوش فہمی کی معافی چاہتا ہوں۔" میں نے کاٹ دار لہجے میں براہ راست اسی سے کہا "میرا خیال تھا کہ تم ہم لوگوں سے مشورہ کیے بغیر صندل خان کو ضرورت سے زیادہ ڈھیل نہیں دو گی۔"

"میں نے اسے کون سی ڈھیل دی ہے کہ آسمان ٹوٹ پڑا ہے۔ اگر تمہیں یہ بات ناگوار گزری ہے کہ میں اس سے گھل مل کر باتیں کررہی تھی تو تم کو شرم آنی چاہیے۔ میں چاروں کے مفاد کے بارے میں سوچ رہی تھی۔"

"میرا خیال ہے کہ میرے بجائے سلطان شاہ تم کو بہتر انداز میں سب کچھ بتائے گا۔" میں نے تلخی سے یہ کہہ کر سلطان شاہ کی طرف متوجہ ہوگیا "اب تم بتاؤ کہ جب تم اندھیرے میں تھے تو تم نے کیا دیکھا تھا؟"

اسے ہدایت دے کر میں اطمینان سے سگریٹ سلگانے میں مصروف ہوگیا۔ مجھے یقین تھا کہ اُس کی کہانی ویرا کو سر اٹھانے کے قابل نہیں چھوڑے گی اور میں پوری طرح اپنے دل کی بھڑاس نکال لوں گا۔

"یہ دونوں ہنس ہنس کر باتیں کرتے ہوئے اندھیرے میں آئے پھر جیپ کی اگلی نشستوں پر بیٹھ گئے۔" سلطان شاہ کہہ رہا تھا "میرا خیال ہے کہ صندل خان' ویرا سے بے تکلف ہونے کی کوشش کررہا تھا لیکن ویرا نے اس کے ساتھ کافی وقت گزارنے کے باوجود اسے حد سے تجاوز نہیں کرنے دیا۔ پھر یہ دونوں لوٹ آئے۔"

مجھے یوں محسوس ہوا جیسے کسی نے میری کھوپڑی پر اچانک لٹھ دے مارا ہو۔ یہ تو کوئی بات ہی نہیں تھی کہ تھوڑی دیر تک گپیں لڑانے کے بعد وہ دونوں واپس لوٹ آئے تھے۔

"اب بتاؤ! میرا کیا قصور ہے؟ میں نے کون سی غلطی کی تھی جس پر تمہاری تھوتھنی بگڑی ہوئی ہے۔" ویرا میرے اوپر آنکھیں نکال کر غرائی "تم سلطان شاہ سے کیا کہلوانا چاہ رہے تھے؟"

"کچھ بھی نہیں" میں نے جلدی سے پینترا بدلتے ہوئے کہا "بس اتنی ہی بات تھی کہ تم نے صندل خان کے ساتھ تخلئے میں جاکر بہت بڑا خطرہ مول لیا تھا۔ اگر وہ درندگی پر اتر آتا تو حالات قابو سے باہر ہوسکتے تھے۔"

"اور اسی لیے تم نے سلطان شاہ کو میرے پیچھے لگادیا تھا؟" وہ جلے کٹے لہجے میں بولی "تمہیں ڈر تھا کہ تنہائی میسر آتے ہی میں اس الو کے پٹھے پر عاشق ہو جاؤں گی؟"

اس کی آخری بات بالکل درست تھی لیکن میں وہ احمقانہ اعتراف نہیں کرسکتا تھا۔ میں نے جوابی برہمی اختیار کرتے ہوئے کہا "تم بلاوجہ بات بڑھا رہی ہو۔ میں نے تم پر ایسا الزام لگایا ہے' نہ میں نے سلطان شاہ کو تمہاری نگرانی پر لگایا تھا۔ یہ تمہاری اپنی دماغی اختراع ہے۔ میں الزام تراشی کو کمینگی سمجھتا ہوں۔"

"میں کسی اور ارادے سے اُدھر گیا تھا۔" سلطان شاہ نے میری تائید کی "تم دونوں اتفاقاً ادھر آنکلے تھے اور مجھے مجبوراً وہیں چھپنا پڑگیا تھا۔ مجھے تمہاری نگرانی کرنے کی کیا ضرورت تھی؟ اپنا برا بھلا تم خود سمجھتی ہو۔"

"یہ چھوٹی سی بات ڈینی کی سمجھ میں نہیں آتی۔ یہ ہر وقت میرا سرپرست بننے کی کوشش کرتا رہتا ہے......"

ویرا کی بات ادھوری رہ گئی کیونکہ دو آدمی ہمارے لیے گرم گرم کھانا لے آئے تھے۔

روٹیاں ٹھنڈی اور شوربے دار سالن بے ذائقہ تھا لیکن ہم سب کی بھوک چمکی ہوئی تھی۔ اس لیے ہم نے ڈٹ کر کھانا کھایا۔ سالن میں موجود سبزی ہمارے لیے نئی تھی لیکن جو کچھ بھی سامنے آگیا تھا ہم نے اپنا فرض سمجھتے ہوئے اس کا صفایا کرڈالا۔ کھانے کے بعد ہمیں گرم گرم قہوہ دیا گیا جو بہت لذیذ تھا۔ قہوہ پی کر ہم کھانے کی بے کیفی کو بھولنے پر مجبور ہوگئے۔ پچھلی رات کی پُر تکلف ضیافت کے بعد ویسے بھی ہماری عادتیں بگڑی ہوئی تھیں۔

کیروسین لیمپ کی لَو دھیمی کرکے ہم کمبل پر پھیل کر لیٹ گئے۔ غزالہ کے ذہن پر گھنٹی کی پُراسرار آواز اتنی شدت سے سوار تھی کہ اس نے نیچی آواز میں وہی ذکر چھیڑ دیا۔ میں نے اسے سمجھایا کہ جب تک ہم ان لوگوں کے درمیان پھنسے ہوئے تھے ہمارے لیے اس بارے میں بات کرنا سودمند نہیں تھا۔ صندل خان نے اسے اپنا اندرونی معاملہ قرار دے کر مجھے جتنی سخت تنبیہہ کی تھی' اس کے بعد گھنٹیوں کے بارے میں لب کشائی کی کوئی گنجائش نہیں رہی تھی۔

"اس وقت یہاں کوئی نہیں ہے۔ کم از کم ہم آپس میں تو بات کرسکتے ہیں۔" سلطان شاہ نے سرگوشی میں کہا۔

"یہاں داخل ہوتے وقت جو کچھ ہوا ہے اس سے تو ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے کوئی شنگاریوں کی وہم پرستی سے فائدہ اٹھا کر دور دور سے انہیں چڑاتا ہے اور جب وہ دیوانگی کی حدوں کو چھونے لگتے ہیں تو خاموشی سے فرار ہوجاتا ہے۔" ویرا نے بیٹھنے کے بعد کہا۔ "ہوسکتا ہے کہ گھنٹی کا تعلق ان کی کسی قدیم روایت سے ہو۔"

"جو کچھ بھی ہو لیکن یہ صرف چڑانے کا معاملہ نہیں ہے۔" میں نے کہا "یہ بہت منظم لوگوں کا کام معلوم ہوتا ہے۔ وہ یہاں سے چینغا سرائے تک پھیلے ہوئے ہیں۔ یہی نہیں بلکہ وہ شنگاریوں کی نقل و حرکت سے بھی باخبر رہتے ہیں۔"

"بالکل!" سلطان شاہ جوشیلے لہجے میں بولا "وہ خاص خاص مواقع پر گھنٹی بجاتے ہیں۔ ہماری روانگی کے وقت گھنٹی والی بھیڑ چھوڑدی گئی اور ہمارے یہاں پہنچتے ہی پھر گھنٹی بجادی گئی......"

"یہ سب باتیں کسی خاص رخ کی نشان دہی کررہی ہیں۔" میں نے اس کی بات کاٹ کر کہا "ان دو واقعات سے ظاہر ہو رہا ہے کہ گھنٹیوں والے ہماری آمد کو خاص اہمیت دے رہے ہیں۔ وہ جو کوئی بھی ہوں اور ان کا جو بھی مقصد رہا ہو' وہ شنگاریوں کے خیر خواہ ہرگز نہیں ہیں۔"

"تمہیں سردار پائندہ گل سے اس بارے میں بات کرنی پڑے گی...." میں ویرا کی بات پر ہنس دیا۔

"میں یہ کہنے پر مجبور ہوں کہ صندل خان نے تمہاری خاصی عقل چوس لی ہے....."

اس نے بھڑک کر میری بات کاٹ دی "یہاں اس خبیث کا ذکر کہاں سے آگیا؟"

"تم بات ہی ایسی کررہی ہو۔" میں نے ہنس کر کہا "ہم مذاکرات کرنے کے لیے یہاں نہیں آئے ہیں۔ ہمیں ہمارے فلیٹ سے اغوا کرکے زبردستی شنگارا ویلی لایا گیا ہے۔ ہمارے سامنے پہلا مسئلہ اپنی سلامتی کا ہے۔ ہمیں کس قسم کے خطرات لاحق ہیں اس کا علم سردار پائندہ گل سے ملاقات کے بعد ہی ہوسکے گا۔ تم مجھے اس طرح مشورہ دے رہی ہو جیسے ہم اپنی مرضی سے اس کوہ پیمائی پر نکلے ہوں اور اب سردار کی قدم بوسی کو جانے والے ہوں۔"

"تم ٹھیک کہہ رہے ہو۔" سلطان شاہ نے اعتراف کیا "کل رات کی دعوت کے بعد تم دونوں کی پرواز ایک دم ہی بہت بلند ہوگئی تھی۔ غنیمت ہے کہ تمہیں اس سفر کا مقصد اور انجام یاد رہ گیا ہے۔"

"ہمیں ہوشیاری سے سونا ہوگا۔" غزالہ خوف زدہ آواز میں بولی "ہوسکتا ہے کہ رات کو کسی بھی وقت اچانک گھنٹیاں بجنی شروع ہوجائیں۔ مجھے تو یہ کوئی آسیبی سلسلہ معلوم ہوتا ہے ورنہ یہ کیسے ہوسکتا ہے کہ چینغا سرائے میں بھیڑ چھوڑنے والا اس قدر خراب موسم میں ہم سے پہلے یہاں پہنچ گیا ہو جب کہ ہم جیپوں میں سفر کررہے تھے اور ہم نے راستے میں کسی کو گزرتے ہوئے بھی نہیں دیکھا....."

"تم نے زیادہ کھانا کھالیا ہے اس لیے سکون سے سوجاؤ۔" ویرا اسے پچکارتے ہوئے بولی "احمق لڑکی! یہ ایک آدمی یا کسی بدروح کا کام نہیں ہے۔ تم نے سنا نہیں کہ ڈینی کیا کہہ رہا تھا۔ گھنٹیوں والوں کا خفیہ گروہ یہاں سے چینغا سرائے تک پھیلا ہوا ہے اور وہی لوگ شنگاریوں میں دہشت پھیلا رہے ہیں۔"

"کچھ بھی ہو' ہمارا یہ سفر تحیر اور سنسنی سے بھرپور ہے۔" سلطان شاہ انگڑائی لیتے ہوئے بولا "صبح ہمارے مقدر کا فیصلہ ہونے والا ہے اور ہمیں ابھی تک اپنا جرم معلوم نہیں ہے۔ سارا کام صرف قیاس آرائیوں سے چل رہا ہے۔ میں تو کئی راتوں سے خواب میں بھی ریت کے خیالی گھروندے بناتا اور توڑتا رہتا ہوں۔"

"تم کچھ اور کر بھی نہیں سکتے۔" ویرا نے اسے وہیں پکڑلیا "کھانے اور سونے کے علاوہ تم نے اب تک اور کیا کیا ہے۔"

"تمہاری اور صندل خان کی خفیہ نگرانی۔" سلطان شاہ نے برجستہ کہا اور سب ہی بے ساختہ ہنس پڑے۔ غزالہ کے خشک ہونٹوں پر میں نے اس سفر میں پہلی بار بے ساختہ مسکراہٹ دیکھی تھی۔

ہم سب گدھے گھوڑے بیچ کر سوئے اور ایسے سوئے کہ ہمیں پکڑ پکڑ کر بیدار کیا گیا۔ ہم اپنے ذہنوں کو پوری طرح خمار کی دھند سے نکالنے بھی نہ پائے تھے کہ صندل خان ہمارے سروں پر آموجود ہوا۔

"باہر خچر تیار ہیں۔ ہمیں فوراً روانہ ہونا ہے۔ تم لوگوں کو ناشتا اوپر ہی ملے گا۔" اس نے کہا۔

"ٹرک اور جیپ کے بعد اب خچر ہی کی کسر رہ گئی تھی وہ بھی پوری ہوجائے گی۔" ویرا نے کراہتے ہوئے کہا لیکن صندل خان اس کی طرف دھیان دیے بغیر باہر چلا گیا اور اس کے آدمی ہم چاروں کو باہر ہانکنے لگے۔

ہمیں اس مکان کی دوسری سمت سے باہر نکالا گیا تو سورج کی

تیز روشنی میں ایک مسحور کن منظر ہماری نگاہوں کے سامنے پھیلا ہوا تھا۔ دور دور تک پھیلے ہوئے ہموار کھیتوں میں افیم کے سرسبز پودے لہلہا رہے تھے۔ کھیتوں میں جا بجا گھنے اور سایہ دار درخت اُگے ہوئے تھے جن کے نیچے دودھیا رنگ کی بھیڑیں بندھی ہوئی تھیں۔ کھیتوں میں بہت سے لوگ کام کر رہے تھے۔ ان میں چند عورتیں بھی تھیں۔ مجھے ایک عورت ایسی بھی نظر آئی جس کی چھاتیاں بالکل برہنہ تھیں اور سر کے بال صاف تھے۔ معاً مجھے سردار پائندہ گل کے لرزہ خیز دعوے یاد آگئے۔ اس نے بالکل یہی کہا تھا کہ شنگارا ویلی میں سورماؤں کے خون پر گریہ و ماتم کرنے والی عورتوں کے سر منڈوا کر چالیس دن تک ان کی چھاتیاں برہنہ رکھوائی جاتی ہیں۔ مجھے نظر آنے والی بدنصیب عورت شاید ان ہی میں سے ایک تھی جو اپنے باپ، شوہر یا بیٹے کی خون میں نہائی ہوئی لاش دیکھ کر بے ساختہ اندوہناک لَے میں بَین کرکے رونے لگتی ہیں۔

ان کھیتوں کے پیچھے اور داہنی جانب دھندلے پہاڑ موجود تھے۔ بائیں طرف گالان کا پُر جلال پہاڑ ایک فصیل کی طرح کھڑا ہوا تھا۔ اس کی کھڑی ڈھلانیں ناقابلِ عبور نظر آتی تھیں لیکن ہواؤں کے ساتھ اوپر سے ملی جلی آوازیں سنائی دے رہی تھیں جو گالان کی بلندی پر آبادی کی غماز تھیں۔ درّے کی طرف پہاڑ کا اٹھتا ہوا سرا واقعی زرّافے کی گردن کی طرح نظر آرہا تھا۔

اس وادی میں پتھروں اور گارے کے مکانات ایک لمبی قطار کی صورت میں اس طرح بنائے گئے تھے کہ وہ درے کو وادی سے الگ کر رہے تھے۔ ہمیں لانے والی جیپیں اس قطار کی دوسری جانب موجود تھیں اور ایک طویل چکر کاٹے بغیر اندرونی حصے میں نہیں آسکتی تھیں۔ تعمیر کا وہ انداز حربی تھا۔ دشمن کے حملہ آور ہونے کی صورت میں اوپر والے نشانچی اسے درّے میں ہی تہس نہس کرسکتے تھے۔ وادی والے، مکانوں کی اس سنگی فصیل میں قلعہ بند ہو کر، بچ نکلنے والوں کو بھون ڈالتے۔ ان دو حفاظتی مرحلوں کے بعد گالان کی بلندیاں ہر خطرے سے محفوظ نظر آتی تھیں۔

باہر دس مضبوط اور صحت مند خچر موجود تھے۔ ان میں سے چار پر ساز و سامان کے بورے لدے ہوئے تھے۔ چھ کی پشت پر زین کسی ہوئی تھی، غزالہ اور ویرا کو خچروں پر سوار کرانے کے بعد ہم دونوں بھی سوار ہوگئے۔ وہ پہاڑی خچر اتنے قد آور تھے کہ رکاب میں پیر ڈالے بغیر ان کی پشت پر سوار ہونا ممکن نہیں تھا۔

صندل خان اپنے خچر کو ایڑ لگا کر سب سے آگے نکال لے گیا۔ اس کے پیچھے سلطان شاہ، پھر دونوں عورتیں اور آخر میں، مَیں روانہ ہوا۔ میرے پیچھے باربردار خچروں کا قافلہ تھا۔ سب سے آخر میں صندل خان کا ایک مسلح ساتھی تھا جو چینغا سرائے سے ہمارے ساتھ ہی آیا تھا۔ باقی لوگ ہم سے پہلے گالان چلے گئے تھے یا پھر نیچے ہی رک گئے تھے۔

افیم کے سرسبز کھیتوں کے درمیان بنے ہوئے ہموار راستے پر وہ کارواں اسی ترتیب سے چلتا رہا۔ صندل خان ایسے موڑ لے رہا تھا کہ ہم ہر قدم کے ساتھ گالان کی عظیم الشان فصیل سے قریب تر ہوتے جارہے تھے۔ آخر کار ہم کھیتوں سے نکل آئے۔ وہاں کام کرنے والوں کے دہشت زدہ چہروں اور بے نور آنکھوں سے دن کی روشنی میں بہ آسانی اندازہ لگایا جاسکتا تھا کہ وہ سب شنگاریوں کے دشمن، مجرم یا قیدی تھے جنہیں زندہ رکھ کر اس بیگار پر لگادیا گیا تھا۔

گالان کے سائے میں پہنچنے کے بعد، خچروں کی قطار اسی کے ساتھ ساتھ ایک طرف چلتی رہی حتیٰ کہ پہاڑی جنگلات کا سلسلہ شروع ہوگیا جو وادی سے اوپر تک پھیلے ہوئے تھے اور ان ہی گنجان درختوں میں یک بیک چڑھائی کا آغاز ہوگیا جو خاصی دشوار تھی....

"لگامیں ڈھیلی چھوڑ دو۔ خچر خود چلتے رہیں گے۔" صندل خان نے چیخ کر ہدایت دی۔ میں اپنے اناڑی پن کی وجہ سے پہلے ہی اس ترکیب پر عمل کر رہا تھا۔ خچر بہت تربیت یافتہ اور مسکین تھے۔ ہر خچر سر جھکائے اگلے خچر کی دم سے مُنہ ملائے آگے بڑھ رہا تھا اس طرح پورے قافلے کی رہنمائی صندل خان کے ہاتھ آگئی تھی۔

ہم لوگ وادی کے رخ سے گالان کی کھڑی ڈھلانیں دیکھ چکے تھے اور سب کے ذہنوں پر یہ نفسیاتی خوف طاری تھا کہ ہمیں ان ڈھلانوں کو طے کرکے اوپر جانا تھا۔ صندل خان نے اوپر جانے کے لیے جو لگی بندھی راہ اختیار کی تھی وہ بظاہر زیادہ خطرناک نہیں تھی لیکن ڈھلان بتدریج بڑھتی ہی جارہی تھی۔ ہر شخص کو خچر کی پشت پر اپنا توازن برقرار رکھنے کے لیے آگے کی طرف جھکنا پڑ رہا تھا اور مجھے یوں محسوس ہو رہا تھا کہ سب لوگ اسی رفتار سے آگے کی طرف جھکتے رہے تو تھوڑی دیر بعد ہر ایک اپنے خچر کی گردن سے لپٹا ہوا نظر آئے گا۔

رفتہ رفتہ سخت جان خچر بھی ہانپنے لگے اور ان کی پیش قدمی کی رفتار بہت سست ہوگئی۔ میں نے ایک بار پلٹ کر پیچھے دیکھا تو دہشت سے رونگٹے کھڑے ہوگئے۔ وادی بہت نیچے رہ گئی تھی اور ہم تقریباً عمودی سمت میں سفر کر رہے تھے۔ ہر شخص کی زندگی کا انحصار اس کے خچر کی کارکردگی پر تھا۔ ایک بار بھی کوئی پیر غلط پڑ جاتا تو وادی سے پہلے ایسی کوئی رکاوٹ موجود نہیں تھی جو ہڈیوں کو سرمہ ہونے سے بچالیتی۔

ہم جن جنگلات سے اندر گھُسے تھے وہ پُر پیچ راستے کی وجہ سے نہ جانے کس طرف رہ گئے تھے البتہ اوپر کی طرف سبزے کے آثار نظر آنے لگے تھے۔

ویرا کا خچر میرے آگے تھا۔ وہ گردن گھما کر بولی "یہ لوگ ہیروئن سے اندھا دھند دولت کما رہے ہیں۔ انہیں یہیں رہنا ہے تو یہ اوپر آنے جانے کے لیے کیا ایک چیئر لفٹ نہیں لگوا سکتے۔ میرا تو خون آدھا رہ گیا ہے۔"

"چیئر لفٹ لگ جانے کے بعد تو یہ سفر تفریح میں بدل جائے گا۔ یہ لوگ اجنبیوں سے میل جول پسند ہی نہیں کرتے اس لیے ان طریقوں پر عمل کرتے ہیں جن پر صرف یہی لوگ قادر ہیں۔ موجودہ حالات میں اپنی خوشی سے کون یہاں آنا پسند کرے گا۔"

"پھر تو ان کے لیے ماؤنٹ ایورسٹ یا کے ٹو ہی بہتر رہے" وہ جل کر بولی۔

وادی ہماری نظروں سے اوجھل ہو چکی تھی۔ شاید ہم گالان کی اور رخ پر پہنچ چکے تھے جہاں ڈھلان کم ہونے کا احساس ہو رہا تھا۔ اوپر پھیلے ہوئے، سبزے میں جا بجا سفید دھبے نظر آنے لگے جو وقفے وقفے سے اپنی جگہیں بدل رہے تھے۔ کافی دیر کے صبر آزما سفر کے بعد ہم اس قابل ہوسکے کہ اپنے خچروں پر پشت کافی حد تک سیدھی کرکے بیٹھ سکیں۔ سفید دھبوں نے واضح طور پر ڈھلانوں پر چرنے والی بھیڑوں کا روپ اختیار کرلیا تھا اور ہم چڑھائی پر اگے ہوئے جنگل میں داخل ہوچکے تھے۔ سفر کا بدترین مرحلہ ہوچکا تھا اور آثار بتا رہے تھے کہ جلد ہی ہمارے خچر سرپٹ بھاگنے کی پوزیشن میں آجائیں گے اور ہوا بھی یہی۔ تھوڑی دیر بعد زمین ہموار نظر آنے لگی اور قافلے کی رفتار تیز ہوگئی۔ خچروں نے ہانپنے کے باوجود ہمت نہیں ہاری تھی۔

جنگل سے نکلتے ہی ہمیں گالان کا بالائی حصہ نظر آنے لگا جو حیرت ناک طور پر میدان نما تھا اور اس میدان کے ایک بڑے حصے میں شاندار آبادی کے آثار موجود تھے۔ ہم جوں جوں نشیب سے اوپر بڑھ رہے تھے وہ آثار واضح ہوتے جارہے تھے۔ اور وہی ہمارے روح فرسا سفر کی آخری منزل تھی جہاں شنگارا ویلی کا الم زدہ سردار، پائندہ گل ہمارے بارے میں اپنا آخری فیصلہ صادر کرنے والا تھا۔

آبادی سے باہر، میدان میں کھیلتے ہوئے سرخ و سفید اور صاف ستھرے بچوں نے اپنا کھیل روک کر حیرت زدہ نظروں سے ہمارے قافلے کو گزرتے ہوئے دیکھا۔ وہاں سے صندل خان نے اپنے خچر کا رخ تبدیل کرلیا اور آبادی میں داخل ہونے کے بجائے اس کے متوازی چلنے لگا۔

آبادی کے اختتام پر دوسرے مکانوں سے قدرے ہٹ کر ایک حویلی نظر آرہی تھی۔ صندل خان کے خچر کا رخ اسی خوب صورت حویلی کی طرف تھا جو دوسرے مکانوں کی طرح پتھروں ہی سے بنائی گئی تھی لیکن اس کی تعمیر میں رنگ برنگے پتھروں کے استعمال سے انوکھے نقش و نگار پیدا کردیئے گئے تھے۔

صندل خان کے خچر نے اس حویلی کی کھلی دہلیز عبور ہی کی تھی کہ بہت دور سے کسی گھنٹی کی تیز آواز گونجنے لگی اور پھر گالان کی فضا دھواں دھار فائرنگ سے لرز اٹھی۔ شاید بستی کا ہر ذی نفس دیوانہ وار گولیاں چلا رہا تھا۔ اس ناگہانی شور سے تمام خچر بدک گئے۔ بیشتر حویلی کے اندر دوڑتے چلے گئے۔ صندل خان اپنے خچر کی لگام دانتوں سے کھینچے کلاشنکوف چلا رہا تھا اس لیے اُس کا خچر حملہ پر چلا کر خوف زدہ آوازیں نکال رہا تھا۔ میرا خچر پلٹ کر پوری رفتار سے آبادی کی طرف دوڑ پڑا۔ صندل خان کے مسلح ساتھی نے فائرنگ بھول کر ناقابلِ فہم زبان میں کچھ چیخنا شروع کیا اور اپنے خچر کو میرے تعاقب میں ڈال دیا۔ مجھے خوف تھا کہ کہیں وہ پیچھے سے گولی ہی نہ چلادے۔

گھنٹی کی تیز آواز بس چند ثانیوں تک سنائی دیتی رہی پھر وہ معدوم ہوگئی اور اس کے بعد فضا میں صرف گولیوں کی گھن گرج باقی رہ گئی۔ ایسا معلوم ہو رہا تھا جیسے گھنٹی کی آواز سنتے ہی گالان کے پلیٹو پر رہنے والوں پر گولیاں برسانے کا دورہ پڑ گیا ہو۔

خاموش اور پرسکون فضا میں پیدا ہونے والا وہ شور اس قدر بھیانک اور اعصاب شکن تھا کہ اپنے خچر کی طرح میں بھی بدحواس ہو کر رہ گیا تھا۔ خچر بھڑک کر مکانوں کی طرف دوڑے جا رہا تھا۔ میری کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ میں اسے روکنے کے لیے کیا کروں۔ بس غیر ارادی طور پر میں نے خچر کے دونوں پہلوؤں پر موجود رکابوں پر اپنے پیروں کا دباؤ اس حد تک بڑھا دیا تھا کہ میں خچر کی پشت پر کسی ہوئی زین سے فضا میں تقریباً معلق ہو کر رہ گیا تھا اور رکابوں پر تقریباً کھڑا ہوا چل رہا تھا۔

پھر وہی ہوا جس کا مجھے ڈر تھا۔ میرے تعاقب میں آنے والے نے میرے خچر کی رفتار میں کوئی کمی نہ آتے دیکھ کر یکے بعد دیگرے دو گولیاں چلا دیں۔ غنیمت یہ تھا کہ وہ دونوں ہوائی فائر تھے اور بالکل بے اثر ثابت ہوئے تھے۔ اس اثنا میں گالان والوں کو شاید اپنی دیوانگی کا احساس ہو چکا تھا کہ وہ گھنٹی کی پراسرار آواز معدوم ہو جانے کے بعد بھی اپنا اسلحہ ضائع کئے جا رہے تھے۔ فائروں کی تعداد کم ہوتے ہوئے، چند ثانیوں میں صفر رہ گئی اور وہاں پھر وہی سوگواری بے کراں خاموشی چھا گئی جو فائرنگ سے پہلے موجود تھی

معاً مجھے ہوش آیا اور میں نے اپنے بھڑکے ہوئے خچر کی لگامیں کھینچ لیں۔ خچر اپنے حلق اور نتھنوں سے عجیب و غریب آوازیں نکالتا ہوا، تیزی سے رکتا چلا گیا۔ پھر میرے پیچھے آنے والا شگاری بھی اپنے خچر کو دوڑاتا ہوا میرے برابر میں آگیا اور اس نے ایک پہلو سے میرے خچر کی لگام میں ہاتھ ڈالتے ہوئے، اپنے خچر کی پیٹھ چھوڑ دی۔

غصے اور وحشت سے اس شگاری کا چہرہ بگڑا ہوا تھا۔ میرے خچر کی تھوتھنی پر دو زوردار تھپڑ لگانے کے بعد وہ تیز لب و لہجے میں مجھ سے کچھ کہنے لگا لیکن وہ بولی میری عقل سے باہر تھی۔ میں نے پلٹ کر دیکھا تو مجھے اندازہ ہوا کہ ہم لوگ خچر کے بھڑکنے کی وجہ سے سردار پائندہ گل کی حویلی سے کافی دور نکل آئے تھے۔

میرے ذہن پر تشویش اور اکتاہٹ پہلے سے طاری تھی۔ اس شگاری کے تند و ترش لہجے سے میری بھی رگ بھڑک گئی اور میں نے اسی کے لہجے میں اسے انگریزی اور اردو میں ملی جلی گالیوں سے نوازنا شروع کر دیا۔ وہ میری گالیاں سمجھتا یا نہ سمجھتا، اس فعل سے میرے دل کی بھڑاس ضرور نکل رہی تھی۔

وہ اپنی بکتا رہا، میں اپنی بولتا رہا۔ چند ہی منٹ میں اس نے اندازہ لگا لیا کہ وہ مجھ پر بلاوجہ اپنی زبان دانی کے جوہر ضائع کر رہا تھا۔ اس حقیقت کا ادراک کرتے ہی وہ اشاروں کی زبان پر اتر آیا۔ میں نے تیز نظروں سے اسے گھورتے ہوئے دو چار اختتامی گالیاں دیں پھر خاموش ہو کر بے زاری کے عالم میں، اس کے اشاروں کا مفہوم سمجھنے کی کوشش کرنے لگا۔

بلند آہنگ مناظرہ بے سود ثابت ہوا تھا۔ میرا خیال ہے جو کچھ میں نے اسے کہا تھا، اس نے بھی میرے لیے اس سے صاف ستھری زبان استعمال نہیں کی ہوگی۔ اگر ہم ایک دوسرے کی زبان کا کچھ حصہ بھی سمجھنے پر قادر ہوتے تو ایک ہی لمحے میں ایک دوسرے سے گتھم گتھا ہو کر خوں ریزی کا آغاز کر چکے ہوتے۔ دوسرے مرحلے میں ہونے والے خاموش مذاکرات نتیجہ خیز ثابت ہوئے۔ وہ واضح طور پر مجھے اپنے تمیزدار خچر کی پیش کش کر رہا تھا۔ میں اتر کر اس کی پشت پر سوار ہوگیا اور اس نے میرا سرکش خچر سنبھال لیا۔

ہم دونوں دوبارہ حویلی کی دہلیز پر پہنچے تو وہاں میدان صاف تھا۔ ہماری واپسی کا انتظار کئے بغیر وہ لوگ اندر لے جائے جا چکے تھے۔ ہم خچروں پر سوار حویلی کے وسیع و عریض صحن میں داخل ہوگئے۔ اندھیرا حیرت ناک سرعت کے ساتھ ہر طرف پھیلتا جا رہا تھا۔ میدانی علاقوں میں رفتہ رفتہ بدلیاں چھانے کا جو منظر نظر آتا رہتا ہے، وہ پہاڑوں میں بس ذرا سی دیر کے لیے نظر آتا ہے اور ہر گزرتے ہوئے لمحے کے ساتھ اندھیرا گہرا ہی گہرا ہوتا چلا جاتا ہے۔ آسمان پر ہر طرف سیاہ بادل پھیل چکے تھے اور سورج غروب ہو چکا تھا۔

ہم اپنے خچروں کو صحن میں باندھ کر دالان میں پہنچے تو وہاں سے موجود، ایک شگاری نے مجھے اپنی تحویل میں لے لیا۔ لانے والا وہاں سے اس انداز میں لوٹ گیا جیسے اسے حویلی میں جانے کا حق حاصل نہ ہو۔

حویلی میں مشعلیں روشن ہونی شروع ہوگئی تھیں۔ وہ مجھے لے کر ایک راہداری میں داخل ہوا تو مجھے اندازہ ہوا کہ تمدن اور آسائشوں سے دور رہ کر بھی انسان بہت کچھ کر گزرنے کی صلاحیت رکھتا ہے۔ حویلی کی تعمیر میں پہاڑی پتھر، گارے اور لکڑی کے علاوہ شاید کوئی چوتھی چیز استعمال نہیں کی گئی تھی لیکن عمارت ہر اعتبار سے آرام دہ اور پرشکوہ نظر آ رہی تھی۔ چھتیں اونچی اور راہداریاں کشادہ تھیں۔

آخر کار مجھے ایک بڑے کمرے میں پہنچا دیا گیا جہاں میرے تینوں ساتھی پہلے سے موجود تھے۔ مجھے لانے والا دروازے سے واپس لوٹ گیا اور فضا ویرا کی استقبالیہ چہکار سے گونج اٹھی "شکر ہے کہ تم صحیح سلامت واپس آئے ہو۔ مجھے تو ڈر تھا کہ کہیں تمہیں کھڑی ڈھلانوں سے نیچے نہ پھینک دے۔"

"ایسی باتیں منہ سے نہ نکالو" غزالہ نے سہمی ہوئی آواز میں احتجاج کیا "یہاں کسی وقت بھی کوئی واقعہ رونما ہو سکتا ہے۔ ہر وقت اچھی توقعات رکھنی چاہئیں۔"

وہ ایک بڑا کمرا تھا جس کی چھت کو سہارا دینے کے لیے فرش پر موٹے موٹے چوبی ستون گاڑے گئے تھے۔ کمرے کے چاروں کونوں میں چوبی تخت بچھے ہوئے تھے۔ ان پر موجود بستروں سے ظاہر تھا کہ ہمیں کافی عرصے تک وہاں روکے رکھنے کے انتظامات ہوئے تھے۔ ان میں سے ہر تخت اتنا کشادہ تھا کہ اس پر بیک وقت کئی افراد بیٹھ سکتے تھے۔ اس وقت وہ تینوں ایک ہی تخت پر نیم دراز تھے۔

"مجھے حیرت ہے کہ گھنٹی کی پراسرار آواز سے یہاں کے رہنے والے ہی نہیں بلکہ خچر تک بھڑکتے ہیں" ویرا کہہ رہی تھی "چوبیس گھنٹوں میں ہم نے تیسری بار گھنٹی کی آواز سنی ہے۔"

"تمہارا دماغ خراب ہے" میں نے برا سا منہ بنا کر کہا "خچر اور دوسرے جانور انسانوں کی طرح توہم پرست نہیں ہوتے۔"

"لیکن تمہارا خچر تو تھا" ویرا نے اصرار کیا "یا پھر تم نے اسے ایڑ لگائی ہوگی۔"

"وہ فائرنگ کے اچانک شور سے بدکا تھا۔ مجھے ایڑ لگانے کی کیا ضرورت تھی؟"

"ایک ہی بات ہے" وہ منہ چلاتے ہوئے بولی "گھنٹی بجنے کے بعد ہی فائرنگ ہوئی اور وہ فائرنگ سے بدکا۔ اس کا مطلب یہی ہے کہ اصل فساد گھنٹی کی آواز کا تھا۔ نہ وہ بجتی، نہ خچر بھڑکتا۔"

"یہ ریاضی کی کوئی مساوات نہیں ہے" غزالہ نے پھیکی سی مسکراہٹ کے ساتھ کہا۔

"تم لوگ فضول باتوں میں سر کھپا رہے ہو۔ ہمیں ابھی تک کھانا نہیں دیا گیا ہے" سلطان شاہ نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا "گل خان ہمیں یہاں چھوڑ کر، ہوشیاری کے ساتھ کھسک گیا ہے۔"

"مجھے اتنا یقین ہے کہ یہ لوگ ہمیں بھوکا نہیں ماریں گے۔" ویرا نے فوراً ہی جواب دینا ضروری سمجھا "پہاڑی قبائل بھینٹ چڑھانے سے پہلے، دل کھول کر اپنے شکار کی خاطر تواضع کرتے ہیں۔"

"لیکن یہ لوگ تو مسلمان معلوم ہوتے ہیں" غزالہ چونک کر بولی "یہ کس کی بھینٹ چڑھائیں گے؟"

"تھوڑی دیر بعد سب سامنے آجائے گا" ویرا مجھے آنکھ مار کر برا سا منہ کے ساتھ بولی "باہر کی دنیا سے کٹ کر رہنے والوں کے عقائد عجیب و غریب ہوتے ہیں۔ وہ خود کو مسلمان، عیسائی، یہودی یا ہندو کہتے رہیں، ان کے رسوم و رواج میں وہی پرانے رنگ باقی رہتے ہیں جو ان کے اجداد کے زمانے سے چلے آ رہے ہوں۔"

میں اس کی بات پر کوئی تبصرہ کئے بغیر تخت کے ایک سرے پر دراز ہوگیا۔

"باہر دوبارہ کالی گھٹائیں چھا چکی ہیں" سلطان شاہ بڑبڑایا "غنیمت ہے کہ راستے میں بارش شروع نہیں ہوئی ورنہ ہمارا زندہ بچنا ناممکن تھا۔ گالان کی چوٹی، اس وادی سے ڈھائی تین سو فٹ بلند ہے۔ ایسی خطرناک اور کھڑی ڈھلانیں میں نے پوری زندگی میں نہیں دیکھیں۔"

"ابھی تم نے دیکھا ہی کیا ہے؟" ویرا ہنس کر بولی "تمہاری ایک چوزے جتنی عمر ہے۔ چسنی پینا چھوڑو گے تو تجربات میں خود بخود اضافہ ہوتا چلا جائے گا۔" اس وقت ہم چاروں میں صرف وہی حالات سے بڑی حد تک بے پروا اور بشاش نظر آ رہی تھی ورنہ سب کے چہرے اترے ہوئے تھے۔ آنے والے غیر یقینی دنوں کی فکر اور تشویش ہر ایک کی آنکھوں سے جھلک رہی تھی کیونکہ گالان میں ہماری حیثیت بے دست و پا قیدیوں سے زیادہ نہیں تھی۔

اس کمرے کی ایک کھڑکی باہر کی جانب کھلتی تھی اور وہاں گہری تاریکی کا راج نظر آ رہا تھا۔ کم و بیش وہی صورتِ حال تھی جو ہمیں پچھلے روز کے سفر میں پیش آچکی تھی۔ پھر اچانک ہی باہر سے دھواں دار بارش کا شور سنائی دینے لگا۔ ہوا میں زمین سے اٹھنے والی مٹی کی سوندھی سوندھی خوشبو شامل ہوگئی۔ وہ تینوں ہی اس منظر سے لطف اندوز ہونے یا وقت گزارنے کے لیے سلاخوں والی کھڑکی کے قریب جا کھڑے ہوئے۔

میں اپنی جگہ پر پڑا، سردار پائندہ گل اور گھنٹیوں کے بارے میں سوچتا رہا۔ چھت کا سایہ اور آرام دہ بستر میسر آجانے کے بعد مجھے بارش کی شدت کی ذرا بھی پروا نہیں رہ گئی تھی۔

تھوڑی دیر بعد فضا میں پھیلنے والی اشتہا انگیز خوشبوؤں نے ہم چاروں کو بے چین کر دیا۔

"شاید کہیں کھانے کی چیزیں تیار کی جا رہی ہیں" سلطان شاہ گہرے گہرے سانس لیتا ہوا بولا۔

"بلی کو خواب میں بھی چھیچھڑے ہی نظر آتے ہیں" ویرا قہقہہ مار کر بے رحمانہ لہجے میں بولی۔

"نہار منہ خچروں کی پیٹھ پر سفر کرنے سے بھوک واقعی چمک اٹھی ہے" غزالہ نے سلطان شاہ کی تائید کی۔

"آؤ! پھر پتھروں کا قیمہ بنا کر سیخ کباب تیار کرتے ہیں۔ ویرا نے اس کا مضحکہ اڑاتے ہوئے کہا۔

وہ نوک جھونک وہیں ختم ہوگئی کیونکہ دو قوی ہیکل شگاری بڑی بڑی تھالیاں اٹھائے، ہمارے کمرے میں آپہنچے۔ دونوں قد آور اور خوفناک چہروں کے مالک تھے۔ ان کی چڑھی ہوئی سرخ آنکھوں سے ایسا معلوم ہو رہا تھا جیسے انہوں نے کوئی تیز نشہ کیا ہوا ہو۔ وہ کمبل پر تھال رکھتے ہوئے، ہم چاروں کا بغور جائزہ لے رہے تھے۔

"خان بابا تم میں سے اُس سے ملاقات کرے گا جس کا نام ڈینی ہے" تھال رکھنے کے بعد ان میں سے ایک نے لب کشائی کی تو اس کی زبان سے اردو سن کر مجھے حیرت کے ساتھ خوشی بھی ہوئی۔

"میرا نام ڈینی ہے" میں نے اس کی طرف ہاتھ بڑھاتے ہوئے نرمی سے کہا۔

"خوب!" سرہلا کر بولا پھر اس نے شگاریوں کا وہی گھسا پٹا فقرہ دُہرایا جو میں پہلے بھی کئی بار سن چکا تھا "ہم دشمنوں اور اجنبیوں سے ہاتھ نہیں ملایا کرتے۔ یہ ہماری قدیم روایت ہے۔"

"لیکن تم ہمارے ساتھ ناشتا تو کرلوگے؟" میں نے کمبل پر بیٹھتے ہوئے پوچھا۔

اس بار اس کے ساتھی نے اپنا سر نفی میں ہلاتے ہوئے کہا "جن لوگوں کے ساتھ ہم ہاتھ نہیں ملاتے' ان کے ساتھ ایک دسترخوان پر کیسے بیٹھ سکتے ہیں؟ یہ بھی ہماری روایت کے خلاف ہے۔"

"ہمیں تمہاری روایات کی کوئی فہرست مل سکے گی؟" ویرا نے گہری سنجیدگی سے پوچھا۔

"کیوں؟" اس کی بھویں کمان کی طرح تن گئیں اور لہجہ غراہٹ میں بدل گیا۔

"ہم اجنبی ہیں' ہم سے بار بار غلطیاں ہوتی رہیں گی" ویرا نے اپنی معصومانہ سنجیدگی برقرار رکھتے ہوئے کہا "ایک بار فہرست مل جائے تو ہمیں اسے یاد کرنے سے بہت آسانی ہو جائے گی۔"

"یہ منشی خانہ نہیں ہے جو یہاں فہرستیں بنتی رہیں" وہ ترش روئی سے بولا "بس ایک بار جو بات بتادی جائے' اسے یاد رکھو۔ اس ہدایت پر عمل کیا تو خان بابا کے عتاب سے بچے رہوگے۔"

ان کے لائے ہوئے تھالوں میں گرم گرم پراٹھے' ابلے ہوئے انڈے' انگاروں پر بھنی ہوئی ایک نرم سی ران' لسّی کے چار بڑے گلاس' قہوہ اور خالی پیالیاں موجود تھیں۔ اس امر میں کوئی شبہ نہیں تھا کہ وہ لوگ کھانے پینے کے شوقین تھے اور اس بارے میں اجنبیوں تک سے فیاضانہ سلوک کرنے کے عادی تھے۔

ہم چاروں شہر سے پکڑ کر ان سنگلاخ وادیوں میں لائے گئے تھے۔ ناشتے میں ہم سب کا معمول دو تین توس اور چائے یا کافی تک محدود تھا لیکن ان اطراف میں پہنچنے کے بعد ہمارے معدوں نے بھی منہ کھول دئے تھے اور وہ بھاری ناشتا ہم سب کو مرغوب نظر آرہا تھا۔

"ہم سب کو تم دونوں کی زبان سے اردو سن کر بہت خوشی ہوئی۔ شاید گالان میں اردو جاننے والوں کی تعداد بہت کم ہے" ناشتے کے دوران میں' میں نے ان کو چھیڑا۔ وہ دونوں واپس جانے کے بجائے ایک طرف بیٹھے سگریٹ نوشی میں مصروف تھے۔ ان کی نظریں ہماری ہی جانب لگی ہوئی تھیں۔

"شکارا ویلی میں بہتیرے لوگ اردو جانتے ہیں" بے پروائی کے ساتھ کہا گیا "البتہ گالان کی بستی میں گنے چنے لوگ ہی اردو جانتے ہیں کیونکہ انہیں کبھی بھی پہاڑوں سے نکل کر باہر جانے کی ضرورت پیش نہیں آتی۔"

"شکارا ویلی اور گالان میں کیا فرق ہے؟" میں نے حیرت سے پوچھا۔ "ہم تو نیچے والی وادی کو ہی شکارا ویلی سمجھ رہے تھے اور یہ پہاڑی تو خیر گالان ہی ہے۔"

"شکارا ویلی بہت بڑی ہے۔ اونٹ کی گردن والے ... سے اندر داخل ہوتے ہی شکارا ویلی شروع ہو جاتی ہے ... گالان جیسی بلکہ اس سے بڑی کئی بستیاں شامل ہیں ... بستی کا الگ نام ہے۔ یہ ساری بستیاں خان بابا کے ... ہیں۔ یہاں گالان میں خان بابا اور اس کے رشتے دار رہتے ... یوں سمجھو کہ گالان اس پوری وادی کا دارالخلافہ ہے جیسے ... افغانستان کا پایہ تخت ہے۔"

اس نے بہت خوب صورتی کے ساتھ وہ وضاحت ... تھی۔ میں نے بات بڑھاتے ہوئے کہا "شاید مجھے ناشتے کے بعد خان بابا سے ملاقات کرنے کے لیے لے جایا جائے گا؟"

"ہاں۔ تم ہمارے ساتھ ہی چلوگے۔ تمہارے ساتھی ... رہیں گے" اس نے کہا۔

"یہ میری عزت افزائی ہے کہ میں گالان میں سردار بابا کے پرنور چہرے کے زیارت کروں گا۔ لیکن میں تم سے یہ ... چاہوں گا کہ اس وقت سردار بابا کس حال میں ہے۔ مجھے اس کے جلال سے سخت خوف آتا ہے۔ میں ایسی حالت میں اس کا ... نہیں کرسکوں گا۔" میں نے عقیدت آمیز لہجے میں کہا۔

"خان بابا' اُسی دن سے غیظ و غضب کے عالم میں ہے' ... اسے چھوٹے خان کے قتل کی خبر ملی تھی۔ اس نے قسم کھائی ہے کہ جب تک وہ چھوٹے خان کے قاتل کو کیفرِ کردار تک پہنچائے گا' اس کی پشت تخت یا مسہری کے نرم بستر کو نہیں چھوئے گی۔ اس نے اپنے اوپر ہر آسائش حرام کی ہوئی ہے۔ اس کے ڈیرے میں صرف فرشی قالین باقی رہ گیا ہے جس پر وہ اپنی راتیں بھی بسر کرتا ہے۔"

میں نے تو سنا ہے کہ اس نے سوگ اور صدمے کی حالت میں اپنی رعایا کو بھی حکم دینا چھوڑ دیا ہے۔"

"یہ تم سے کس نے کہا؟" وہ میری بات کاٹ کر' کسی ... کتے کی طرح غرایا۔

"خان بابا مجھ سے ملنے کے لیے کراچی آیا تھا تو اس نے ... یہ سب بتایا تھا" میں نے اسے مرعوب کرنے کے لیے سادگی ... "ورنہ میں یہ سب باتیں جاننے کے وسائل نہیں رکھتا۔"

"خان بابا تم سے ملنے گیا تھا؟" وہ سوال کرتے ہوئے ... آنکھیں حیرت سے پھیل گئیں۔

"ہاں! عبدالرحیم خان کو دفن کرنے کے بعد وہ میرے ... تھا" میں نے گھر کا ذکر کرکے اپنی بات میں مزید زور پیدا کرنے ... کہا "مجھے حیرت ہے کہ اسے اتنی جلدی مجھ سے دوبارہ ... کیا ضرورت پیش آگئی؟"

وہ میرے دعوے کے سحر سے آزاد ہونے کے لیے ... جھٹکتے ہوئے بولا "اپنے معاملات کو وہ خود جانتا ہے لیکن ... ضرور کہہ سکتا ہوں کہ چھوٹے خان کے قتل نے اس کی ...

... زخمی کردیا ہے۔"

"چھوٹے خان کی لاش کو خچر کی پشت پر لاد کر وادی سے یہاں تک لانے میں تو بہت دقت ہوئی ہوگی" میں نے چند ثانیوں کے سکوت کے بعد سرسری لہجے میں کہا۔

"خچروں کے نخرے تم جیسے اجنبیوں کے لیے ہوتے ہیں جو پہاڑوں کو بالکل نہیں سمجھتے" وہ تحقیر آمیز لہجے میں بولا "یہاں کے شکاریوں کے بچے کھیل کھیل میں دن بھر اوپر نیچے دوڑتے بھاگتے رہتے ہیں۔"

میرے لیے اس کا وہ انکشاف بہت اہم تھا۔ صندل خان نے ہمارے دلوں پر کھڑی چڑھائیوں کی ہیبت بٹھانے کے لیے شاید دشوار گزار اور پیچیدہ راستہ اختیار کیا تھا تاکہ گالان سے اتر کر فرار ہونے کا خیال بھی ہمارے ذہنوں میں نہ آسکے۔ اگر کوئی ایسا راستہ تھا جسے شکاریوں کے بچے استعمال کرسکتے تھے تو ہمارے لیے بھی وہ راستہ ناقابلِ عبور نہیں ہونا چاہیے تھا۔ ہمارے لیے وہاں سے فرار ہونے کے امکانات موجود تھے۔ شرط صرف اتنی سی تھی کہ ہم کسی طرح کچھ ہتھیاروں اور فاضل راؤنڈز کی وافر تعداد پر قابض ہوجاتے تو گالان سے اتر کر نیچے کھڑی ہوئی کسی گاڑی پر سوار ہوکر بیفا سرائے کی طرف واپسی کا سفر اختیار کرسکتے تھے۔

ہمارے ناشتے کے لیے لائی جانے والی اشیا کی مقدار اتنی زیادہ تھی کہ ہم چاروں پوری طرح شکم سیر ہونے کے بعد بھی انہیں ختم نہیں کرسکے۔ ان دونوں نے مل کر برتن یکجا کئے۔ ایک آدمی نے وہ سامان اٹھایا اور دوسرے نے میری طرف اشارہ کیا جس کا مطلب تھا کہ مجھے پیشی کے لیے روانہ ہونا تھا۔

"اتنے شاندار ناشتے کے بعد مجھے ایک سگریٹ تو پی لینے دو" میں نے بھرائی ہوئی آواز میں درخواست کی "ہوسکتا ہے کہ خان بابا مجھے سگریٹ نوشی کی اجازت نہ دے۔"

وہ کچھ کہے بغیر بیٹھ گیا۔ اس کا ساتھی' خالی برتن لے کر روانہ ہوچکا تھا۔

آنکھیں نیم وا کرکے سگریٹ کے چند گہرے گہرے کش لینے کے بعد میں نے اچانک ہی ہڑبڑا کر آنکھیں کھول دیں اور خوف زدہ انداز میں چاروں طرف دیکھنے لگا' جیسے مجھے کسی نادیدہ گوشے سے موت کے نزول کا خوف لاحق ہوگیا ہو۔ ابتدائی ردِّ عمل میں وہ شخص بھی چونکے انداز میں ادھر ادھر دیکھنے لگا۔

"کیا بات ہے؟ تم یکایک کیوں بھڑک اٹھے ہو؟" چند لمحوں کے بعد اس نے رازدارانہ سرگوشی کے انداز میں مجھ سے سوال کیا۔ اس کی آنکھوں سے گہری تشویش جھانک رہی تھی۔

"سنو! غور سے سنو" میں نے بھی سرگوشیانہ لہجے میں کہا "پھر کوئی گھنٹی بج رہی ہے۔"

اس نے خاموش رہ کر وہ آواز سننے کی کوشش کی لیکن باہر برسنے والی بارش کے شور میں کچھ تھا ہی نہیں جو اسے سنائی دیتا۔

میں اسے وہم میں ڈال کر دل ہی دل میں اس کی حالت سے محظوظ ہو رہا تھا۔

گھنٹی کی آواز سننے میں ناکامی پر اس کے چہرے کے نقوش بگڑنے لگے پھر وہ جھلائی ہوئی آواز میں بولا "کچھ بھی نہیں ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ تمہارے کان بج رہے ہیں تمہیں وہم ہو رہا ہے۔"

"تم ٹھیک کہہ رہے ہو" اچانک ویرا بول پڑی "کل سے تین بار گھنٹیوں کی آواز پھر دھواں دھار فائرنگ کی گونج سن کر ڈینی کے دماغ میں دہشت سما گئی ہے۔ رات کو بھی یہ گہری نیند میں کئی بار ڈر کر بڑبڑانے لگا تھا۔ اس کا خیال ہے کہ کوئی بدروح گھنٹی لے کر شگارا ویلی اور اس کے باسیوں کے گرد منڈلا رہی ہے۔"

"بند کرو یہ بکواس" وہ اضطراری انداز میں ویرا پر برس پڑا۔ اس کی آواز پھنسی پھنسی تھی اور آنکھوں سے خوف جھلکنے لگا تھا۔ شاید بدروح کے ذکر نے اسے مضطرب کردیا تھا۔

"تم بتا سکتے ہو کہ وہ گھنٹی کون بجاتا ہے؟" میں نے بے چارگی سے پوچھا "اس منحوس آواز نے شاید میرے ذہن کو بیمار کردیا ہے۔ مجھے ہر وقت وہی آواز سنائی دینے لگی ہے۔"

وہ ایک جھٹکے سے اٹھ کھڑا ہوا۔ اس نے میرے ہاتھ سے جلتی ہوئی سگریٹ چھین کر فرشی کمبل سے دور اچھال دی اور غضب ناک لہجے میں بولا "بس، بہت ہوگیا۔ اب اس بارے میں ایک لفظ بھی نہ کہنا۔ تم لوگ منہ لگانے کے قابل نہیں ہو۔ چلو! خان بابا تمہارا انتظار کررہا ہوگا۔"

"د۔۔۔۔۔ دیکھو! مجھے پھر وہی آواز سنائی دینے لگی ہے۔" میں نے خوفزدہ انداز میں ہکلانے کے ساتھ، ہولے ہولے لرزنا بھی شروع کردیا "گھنٹی بجتی ہے، گولیاں چلتی ہیں لیکن گھنٹی بجانے والا نظر نہیں آتا۔ مجھے تو شگارا ویلی پر بدروحوں کا سایہ معلوم ہوتا ہے۔ خدا مجھے ان کے عذاب سے محفوظ رکھے۔"

خوف اور غصے کی ملی جلی کیفیت کے زیر اثر اس کا چہرہ مضحکہ خیز حد تک بگڑ گیا۔ وہ دانت پیستا ہوا میری طرف جھپٹا اور اس نے اپنے چوڑے ہاتھ سے میری گردن دبوچ لی۔

"جب تک شگارا ویلی پر خان بابا کا سایہ ہے، بدروحیں ادھر کا رخ بھی نہیں کرسکتیں" اس نے اتنی اونچی آواز میں چیختے ہوئے کہا جیسے میرے ساتھ بدروحوں کو بھی وہ سب سنانا چاہ رہا ہو "بدروحیں مُردوں کے پیٹ میں گھس کے دوسروں کو پریشان کرتی ہیں۔ اسی لیے ہم اپنے مردوں کے پیٹ سے ساری آلائشیں نکال کر مغرب کی ڈھلانوں میں پھینک دیتے ہیں۔ وہاں برفانی گدھ ہر ریشہ چٹ کرجاتے ہیں۔ چھوٹے خاں کے ساتھ بھی ایسا ہی کیا گیا تھا پھر شگارا ویلی میں کوئی بدروح کیسے آسکتی ہے؟ تم بدمعاش ہو اور ہمیں ڈرانا چاہ رہے ہو۔ بستی میں کسی نے بھی گھنٹی کی آواز سنی ہوتی تو اب تک ہر طرف گولیاں برس رہی ہوتیں۔۔۔" اس نے میری گردن دبوچنے پر ہی اکتفا نہیں کیا تھا بلکہ اپنی وحشیانہ قوت سے مجھے بری طرح جھنجھوڑے جارہا تھا۔ اگر اسے اپنے سردار کی خواہش کا پاس نہ ہوتا تو شاید وہ مجھے رگیدنے سے بھی گریز نہ کرتا۔ قوی الجثہ اور بے خوف ہونے کے باوجود وہ بدروحوں کے ذکر پر پریشان بلکہ اعصاب زدہ ہوگیا تھا۔

ویرا نے اس کا درشت رویّہ دیکھتے ہوئے، لپک کر اس کا ہاتھ پکڑ لیا اور اس کی بات کاٹ کر بولی "تم بلاوجہ اس کے ساتھ زیادتی کررہے ہو۔ میں تمہیں بتا چکی ہوں کہ ڈینی گھنٹیوں کی آواز سے دہشت زدہ ہے۔ اسے رات بھر گھنٹیاں سنائی دیتی رہی ہیں۔ اس کی دہشت کی ساری ذمے داری تم لوگوں پر ہے۔ ایک گھنٹی کی مترنم سی آواز پر تم سب پاگل ہوکر گولیاں برسانے لگتے ہو اور اپنے اس ردِعمل کا کوئی سبب بھی نہیں بتاتے۔ یہ صورت حال تو ہم سب کو ڈینی جیسا بنادے گی۔"

اس نے بے بسی سے میری گردن چھوڑ دی اور ویرا کو خوں خوار نظروں سے گھورتے ہوئے غرایا "دہشت سے تم سب کے کلیجے بھی پھٹ جائیں تو ہمیں ذرا بھی غم نہیں ہوگا لیکن یہ روحوں والی بکواس میری برداشت سے باہر ہے۔ ڈینی نے اب کسی بدروح کا ذکر کیا تو میں اسے گولی مار کر اپنی کھوپڑی میں بھی سوراخ کرلوں گا تاکہ مجھے خان بابا کے سامنے ندامت سے اپنا سر نہ جھکانا پڑے۔ وہ ہمیں دنیا کی ہر مصیبت سے بچا سکتا ہے لیکن بدروحوں پر کس کا بس چلتا ہے؟ اسے سمجھاؤ کہ اب یہ اپنی کالی زبان بند رکھے۔"

"میں سمجھ گیا" میں نے خوف زدہ انداز میں اپنا سر سہلاتے ہوئے، اسے آخری چرکا لگانے کی نیت سے کہا۔ "اگر تم بدروحوں کے ذکر سے اسی قدر ڈرتے ہو تو اب میں بھول کر بھی ان کا ذکر نہیں کروں گا۔ اپنے ذہن میں آنے والے ہولناک اندیشوں کو اپنے ذہن میں ہی رکھوں گا۔ ہوسکتا ہے کہ خان بابا مجھے اس بھیانک عذاب سے نجات دلا دے جو آسیب بن کر میرے دماغ میں گھس گیا ہے۔"

میری گفتگو کے دوران میں اس کے چہرے کا رنگ بار بار بدلتا رہا۔ اس کی قہربار آنکھوں میں کئی بار خوف کے سائے لہراتے ہوئے نظر آئے کیونکہ میں نے ایک ہی سانس میں بدروحوں، ہولناک اندیشوں، بھیانک عذاب اور آسیب کا ذکر کرکے اس کے قابل دماغ کی چولیں ہلادی تھیں مگر میں نے جو کچھ کہا، وہ ہر قسم کی گرفت سے محفوظ تھا۔ وہ بے بسی اور غصے کے ساتھ مجھے گھورتا رہا پھر میرے خاموش ہوتے ہی میرا داہنا بازو پکڑ کر نکاسی کے راستے کی طرف چل دیا۔

وہ حویلی وسیع رقبے پر تعمیر کی گئی تھی اور اس میں ان گنت چھوٹے بڑے کمرے تھے جنہیں راہداریوں نے ایک دوسرے سے منسلک کیا ہوا تھا۔ بعض کمرے ایسے بھی تھے جن کے دروازے راہداریوں کے بجائے دوسرے کمروں میں کھلتے تھے۔ ہم دونوں چھت کے سائے سے باہر نکلے بغیر ایک بہت بڑے ہال میں پہنچے جہاں فرش پر پڑے ہوئے کمبلوں پر بیش قیمت قالین بچھے ہوئے تھے اور ان پر متعدد مقامی لیٹے یا بیٹھے ہوئے تھے۔ اس ہال کے آخری گوشے پر ایک بڑا سا منقش دروازہ تھا جو بند تھا۔

ہم دونوں کے پہنچتے ہی تمام مقامی چونک کر ہماری طرف متوجہ ہوگئے۔ بڑی بڑی پگڑیوں کے نیچے چمکتی ہوئی تیز اور حیوانی نگاہیں میرے چہرے پر مرکوز تھیں۔ مجھے لانے والا، ان لوگوں کی سلام دعا کا سرسری جواب دیتا ہوا آگے کی طرف بڑھتا رہا۔ اس کا رخ منقش دروازے کی طرف تھا۔

میرا خیال تھا کہ وہ اس دروازے سے گزر کر دوسری طرف جائے گا لیکن وہ دروازے کے قریب پہنچ کر ٹھہر گیا۔ اس نے آہستگی سے دروازے پر دستک دی اور اندر سے ایک غراتی ہوئی زخمی آواز سنائی دی۔ اس نے جو کچھ کہا، وہ مقامی بولی میں تھا۔ مجھے لانے والے نے اسی زبان میں جواب دیا۔ اندر سے پھر کچھ کہا گیا اور میرے ساتھ والے نے دباؤ ڈال کر وہ منقش دروازہ کھول دیا۔

میرا خیال تھا کہ وہ اندر جانے میں پہل کرے گا تو میں اس کی تقلید کروں گا لیکن وہ وہیں رکا رہا۔ اس نے میری پشت پر ہاتھ رکھ کر سرگوشیانہ آواز میں کہا "ادب کے ساتھ اندر چلے جاؤ۔"

"تم میرا ساتھ نہیں دوگے؟" میں نے پلٹ کر اس سے پوچھا۔

"ہم لوگ غیر ضروری طور پر خان بابا کا سامنا کرنے سے بچتے ہیں۔ تم جاؤ۔"

"ڈینی! اندر چلے آؤ" اندر سے اُسی غراتی ہوئی، زخمی آواز نے براہِ راست مجھے مخاطب کرکے اردو میں کہا اور اس بار میں نے سردار پائندہ گل کی آواز پہچان لی "میں تمہارا انتظار کررہا ہوں۔"

"میں آرہا ہوں، خان بابا!" میں نے جلدی سے کہا اور سیڑھیاں عبور کرکے فوراً اس خلا میں داخل ہوگیا جو منقش دروازہ کھلنے سے نمودار ہوا تھا۔ اندر خاصی گہری تاریکی پھیلی ہوئی تھی۔

میرے اندر داخل ہوتے ہی کسی نے منقش دروازہ بند کردیا اور میں الجھن کے عالم میں اپنی جگہ پر کھڑا رہ گیا۔ مجھے اپنے سامنے تاریکی کے سوا کچھ نظر نہیں آرہا تھا لیکن میرے ننگے پاؤں، فرش پر بچھے قالین کا پُر آسائش لمس محسوس کررہے تھے۔

"رک کیوں گئے؟ سیدھے چلے آؤ۔ چند سیکنڈ میں تمہیں بھی تاریکی سے لطف آنے لگے گا" سردار پائندہ گل کی کرب آلود آواز ابھری "اندھیرا بہت سکون پرور ہوتا ہے۔ اپنی کوکھ میں ان گنت گناہوں کو چھپالیتا ہے۔ یہ کیسا اتفاق ہے کہ تم آئے ہو تو سورج سیاہ بدلیوں کے پیچھے چلا گیا ہے۔"

سردار پائندہ گل کے الفاظ سے دوستی نہیں تو دشمنی بھی نہیں جھلک رہی تھی۔ اس کی ہدایت پر میں نے آگے بڑھنا شروع کردیا اسی وقت باہر ہولناک کڑک کے ساتھ آسمانی بجلی کے تڑاخے گونجنے لگے اور ہر طرف تیز روشنی ہی روشنی بھر گئی۔

کئی لمحوں تک قائم رہنے والی اس تیز روشنی میں، میں نے دیکھا کہ اس بڑے کمرے کی عقبی دیوار شیشے کی تھی۔ اس سے باہر موسلا دھار مینہ برس رہا تھا اور اسی شیشے سے آسمانی روشنی نے اس کمرے کو منور کردیا تھا۔ داہنی طرف سردار پائندہ گل ایک گاؤ تکیے کے سہارے قالین پر نیم دراز تھا۔ اس کے سامنے صندل خان دوزانو ہوکر بیٹھا ہوا تھا۔ ان دونوں کے درمیان میں خور و نوش کے کچھ لوازم بھی نظر آئے تھے۔

گالان کی دشوار گزار بلندی پر واقع سردار پائندہ گل کے اس کمرے میں شیشے کی وہ دیوار کسی عجوبے سے کم نہیں تھی۔ فرش سے شاید ایک ڈیڑھ فٹ تک پتھر کی دیوار تھی۔ اس کے بعد پکی چھت تک شیشہ ہی شیشہ تھا جس کے پردے سمٹے ہوئے تھے۔ شیشے کی اس دیوار کی چوڑائی کسی بھی طرح تیس فٹ سے کم نہیں تھی۔ جدید اصطلاح میں اسے فرنچ ونڈو ہی کہا جاسکتا تھا لیکن فرنچ ونڈو کا وہ جہازی بلکہ جناتی سائز میری نظروں سے پہلے کبھی نہیں گزرا تھا۔

بجلی کی چمک معدوم ہوتے ہی وہاں اتھاہ اندھیرا چھا گیا اور میں غیر ارادی طور پر اپنی جگہ پر رک گیا۔

"ایک موٹی شمع روشن کردو" سردار پائندہ گل نے شاید صندل خان کو ہدایت کی "بجلی کی چکاچوند نے شاید ڈینی کو پریشان کردیا ہے۔ پچھلی دیوار کے پردے بھی برابر کردو تاکہ ہم یکسوئی کے ساتھ کچھ اہم باتیں کرسکیں۔ میں اب زیادہ صبر نہیں کرسکتا۔"

شمع دان ان دونوں کے قریب ہی موجود تھا۔ موٹی سی موم بتی کی لرزتی ہوئی زرد لَو نے فوراً ہی ان دونوں کے بھیانک سائے بنانے شروع کردیے۔ صندل خان شیشے کی دیوار پر پردے کھینچنے کے لیے چلا گیا اور میں تیزی سے سردار پائندہ گل کے روبرو جا پہنچا۔

ہم لوگ جس حالت میں گالان کی سطح مرتفع تک پہنچائے گئے تھے، اس کی بنا پر مجھے پورا یقین تھا کہ سردار پائندہ گل مجھ سے ہاتھ نہیں ملائے گا لیکن میں اس کے سامنے پہنچتے ہی ادب و احترام کے ساتھ جھکا اور اپنے دونوں ہاتھ مصافحے کے لیے اس کی طرف بڑھادیے۔

پائندہ گل نے اپنی بڑی بڑی اور سرخ بھبھوکا آنکھیں اٹھاکر میری طرف دیکھا پھر داہنا ہاتھ اپنی بے ترتیب داڑھی پر پھیرتے ہوئے بولا "ہاتھ واپس لے لو۔ ابھی تک میرے اور تمہارے مراسم کا تعین نہیں ہوسکا ہے۔ تم اجنبی تو نہیں رہے ہو لیکن میرے دوست بھی نہیں ہو۔ جس دن تم نے مجھ سے دوستی کا ثبوت فراہم کردیا، میں خود ہی تم سے ہاتھ ملالوں گا بلکہ تمہیں اپنے سینے سے لگالوں گا۔ آرام سے بیٹھ جاؤ۔"

میں نے سر جھکا کر اس کے حکم کی تعمیل کی۔ بیٹھتے ہوئے، میری نظر اس ٹرے پر پڑی جس میں سفید روسی شراب کی بوتل اور دو گلاسوں کے ساتھ خشک میوے رکھے ہوئے تھے۔ اس کا مطلب تھا

کہ سردار پائندہ گل کی زاہدانہ وضع قطع ایک بہروپ سے زیادہ حیثیت نہیں رکھتی تھی۔ باریش، پرنور اور متشرع نظر آنے کے باوجود وہ مے نوشی جیسی قبیح عادت میں مبتلا تھا جو شرعاً حرام تھی۔ شاید وہ عادت یا روایات کے تحت نمائشی ملائیت کی نقاب اوڑھنے پر مجبور تھا ورنہ اس کی روزی کا انحصار ہیروئن کی آمدنی پر تھا اور اس کا شوق روسی واڈکا کی صورت میں میرے سامنے موجود تھا۔

سردار پائندہ گل کا وہ خصوصی کمرا، اس وسیع و عریض حویلی کے آخری سرے پر واقع تھا اس لیے باہر ہونے والی تیز برسات کا شور وہاں واضح طور پر سنائی دے رہا تھا۔ پائندہ گل جب بھی چاہتا، شیشے کی دیوار پر سے پردے ہٹوا کر، وہیں بیٹھے بیٹھے، باہر کے مناظر سے لطف اندوز ہو سکتا تھا۔

صندل خان پردے کھینچنے کے بعد واپس لوٹا تو اس کے اور سردار کے درمیان، مقامی بولی میں مختصر سا مکالمہ ہوا اور پھر صندل خان نکاسی کے راستے کی طرف بڑھتا چلا گیا۔

تخلیہ ہوتے ہی، سردار پائندہ گل نے میری آنکھوں میں آنکھیں ڈال دیں۔ ہم کئی ثانیوں تک خاموشی سے ایک دوسرے کی آنکھوں میں جھانکتے رہے۔ میں اس کے چہرے کے تاثرات سے اس کے دل کی بات سمجھنے سے قاصر تھا اس لیے اس کی چبھتی ہوئی نگاہوں سے بے چینی محسوس کرنے لگا۔

آخر کار پائندہ گل بول ہی پڑا "وہ حرام زادی چوپالوں میں اپنی بے حیائی کا قصہ سناتی پھر رہی ہے۔ اسی لیے میں نے تم کو پکڑوا کر یہاں بلایا ہے" اس کی آواز نیچی مگر شرربار تھی۔

"لیکن اس معاملے میں میرا کیا قصور ہے، خان بابا؟" میں نے بے بسی سے احتجاج کیا "میں نے تمہیں ہر بات صاف صاف بتا دی تھی۔ اب وہ بے شرمی پر اتر آئی ہے تو میں کیا کر سکتا ہوں؟"

"ہو سکتا ہے کہ اس نے پستول کی نوک پر تمہیں اپنی خواہش کا غلام بنایا ہو مگر یہ حقیقت ہے کہ اس بے شرمی میں تم برابر کے شریک تھے۔ تم نہ ہوتے تو جنت گل کو کسی افسانہ طرازی کا موقع نہیں مل سکتا تھا۔" اس نے اپنے جذبات پر قابو رکھتے ہوئے، تحمل کے ساتھ اپنا نقطۂ نظر بیان کیا۔

"میرے وہاں ہونے میں بھی میری مرضی یا پسند کا کوئی دخل نہیں تھا" میں نے لجاجت سے کہا "چھوٹے خان نے مجھے اپنے قیدی کے طور پر کوچی کیمپ والے آہنی کنٹینر سے اس فلیٹ میں پہنچایا تھا۔"

"پرانی باتیں دُہرانے کی ضرورت نہیں۔ مجھے سب کچھ معلوم ہے لیکن یہ تمہاری بد قسمتی ہے کہ اب جنت گل نے تمہارے حوالے سے مجھے بدنام کرنا شروع کر دیا ہے۔ یہ توہین میری برداشت سے بالکل باہر ہے۔"

اس کے تیور دیکھتے ہوئے، میں نے خاموشی ہی میں اپنی عافیت سمجھی۔ اس نے بوتل سے سفید شراب ایک گلاس میں انڈیلی اور ایک بڑا گھونٹ لینے کے بعد دوبارہ بولا "تمہیں معلوم ہے کہ میں جنت گل کے خون کا پیاسا ہو رہا ہوں۔ مجھ پر عبدالرحیم خان کے قتل کا انتقام فرض ہو چکا ہے لیکن وہ بے حیا لڑکی ابھی تک میری دسترس سے باہر ہے۔ اب اس کو پکڑنے کے لیے تمہیں بھی میرا ساتھ دینا ہو گا۔ یہ میرا سوچا سمجھا فیصلہ ہے۔"

وہ ایک عجیب شرط تھی۔ میرے دل کی دھڑکنیں بے اختیار تیز ہو گئیں اور میں نے دھیمے سے پوچھا "میں ہر طرح تمہارا ساتھ دینے کے لیے تیار ہوں۔ تم مجھ سے کس قسم کا تعاون چاہتے ہو؟"

"میرے آدمی شکاری کتوں کی طرح اس کتیا کا پیچھا کر رہے ہیں لیکن وہ شہر میں لکھ پڑھ کر بہت چالاک ہو گئی ہے۔ وہ شکاریوں کو ہزاروں کی بھیڑ میں بھی پہچان لیتی ہے۔ اس لیے ان کے نرغے سے بچ نکلتی ہے۔ اب میں نے سوچا ہے کہ تم جا کر اسے گھیرو گے اور پکڑ کر میرے آدمیوں کی مدد سے یہاں لاؤ گے۔"

"اگر مجھے اس کا سراغ مل جائے تو میں یقیناً اس منصوبے پر عمل کر گزروں گا۔ لیکن اس میں میرے تین ساتھیوں کا کیا کردار ہے جو انہیں اس طویل اور تکلیف دہ سفر کی صعوبتوں سے دوچار کیا گیا ہے؟"

سردار پائندہ گل کے پتلے پتلے ہونٹوں پر استہزائیہ سا تبسم آگیا اور وہ شاطرانہ لہجے میں بولا "تم جنت گل کو تلاش کرو گے اور وہ تینوں ضمانت کے طور پر شکارا دیلی میں رہیں گے۔ تم جنت گل کو لے آئے تو تم چاروں کو انعام و اکرام کے ساتھ یہاں سے روانہ کر دیا جائے گا۔ تم نے روپوش ہونے کی کوشش کی تو ان تینوں کو ہلاک کر دیا جائے گا۔ ان کے بغیر یہ منصوبہ کامیاب ہو ہی نہیں سکتا تھا۔"

اس کی شیطانی کھوپڑی نے بہت دور کی بات سوچی تھی۔ اس کا منصوبہ بے داغ اور قابل عمل تھا۔ اس کے جواب میں میرے پاس کہنے کے لیے کچھ بھی نہیں تھا۔ پھر بھی میں نے بات بڑھانے کی نیت سے کہا "تو یوں کہو کہ تم ان تینوں کو یرغمال بنانا چاہتے ہو۔ اس کام کے لیے تم مجھے کتنی مہلت دو گے؟"

"یہ کوئی بڑا کام نہیں ہے جس کے لیے مدت مقرر کرنی پڑے" موم شمع کی گھٹتی اور بڑھتی ہوئی زرد روشنی میں سردار پائندہ گل کا چہرہ، اس وقت بہت ڈراؤنا نظر آ رہا تھا۔ وہ بے پروایانہ انداز میں کہہ رہا تھا۔ "میرے آدمی شب و روز تمہاری کارکردگی پر نظر رکھیں گے۔ تم دل و جان سے جنت گل کے کھوج میں لگے رہو گے تو تمہاری مہلت برقرار رہے گی۔ جس دن تم نے غفلت برتی یا کسی سازش کا سہارا لینا شروع کیا، سب کچھ ختم کر دیا جائے گا۔ میں اپنے فیصلوں پر عمل کروانے کی پوری طاقت رکھتا ہوں۔ چھوٹے خان کے خون کا انتقام پورا ہونے تک میں نے رسمی طور پر اپنے لوگوں کو حکم دینا بند کر دیا ہے لیکن ان کی روح بھی میری غلام ہیں۔ وہ میری پرانی ہدایتوں پر عمل کر کے انتقام چلا رہے ہیں۔ اگر تم نے جنت گل کو یہاں لانے میں کوتاہی کی تو کان کھول کر سن لو کہ پھر میں تمہارے ساتھیوں پر چھوٹے خان کے قتل کا الزام عائد کر دوں گا اور ان پہاڑوں میں بسنے والے، آناً فاناً ان تینوں کو خاک و خون میں نہلا دیں گے۔"

"مجھے حیرت ہے کہ جنت گل جیسی سبک اندام، خوب صورت اور کم سن لڑکی نے تم جیسے پر جلال سردار کے مقابلے پر آنے کی جسارت کی ہے۔ اسے تو..." پائندہ گل کی غراہٹ کی وجہ سے میری بات ادھوری رہ گئی تھی۔

"بس! میرے سامنے اس فاحشہ کے قصیدے پڑھنے کی ضرورت نہیں۔ میں اسے اچھی طرح جانتا ہوں۔ وہ مقابلے پر آئی ہے تو کسی حقیر چیونٹی کی طرح مسل بھی دی جائے گی۔"

"وہ اسی سلوک کی مستحق ہے" میں نے سر ہلاتے ہوئے اس کی تائید کی "میں تو اس کی دریدہ دہنی پر حیران رہ گیا تھا۔ وہ بہت بڑی بڑی اور کڑوی کسیلی باتیں کرتی ہے..."

"تو کیا اس نے تم سے کچھ اور باتیں بھی کی تھیں؟" پائندہ گل نے بھڑک کر پوچھا۔

"ایسی ویسی!" میں نے اپنے کانوں کو چھوتے ہوئے کہا "میں ان باتوں کو دُہرا بھی نہیں سکتا۔"

"بتاؤ، مجھے کھل کر بتاؤ کہ اس نے کیا کہا تھا؟" پائندہ گل مشتعل ہو کر بولا۔ میں کمال ہوشیاری سے اس کے دل میں تجسس کی وہ جوت جگانے میں کامیاب ہو گیا تھا جو میرے حق میں سودمند ثابت ہو سکتی تھی۔

"وہ اپنی گونگی ماں پر بہتان رکھ رہی تھی۔ وہ باتیں سن کر تمہیں تکلیف ہو گی حالانکہ تم نے بھی مجھے کچھ بتایا تھا۔"

"اچھا!" پائندہ گل نے ایک خوفناک ہُنکارا بھرا پھر زہریلی آواز میں بولا "تو وہ اب اتنی گستاخ ہو گئی ہے۔ اس نے تو تمہیں کیا بتایا ہو گا۔ اصل بات مجھ سے سنو کہ جنت گل ضیغم خان کی اولاد نہیں ہے۔"

"ضیغم خان کون؟" میں نے معصومانہ حیرت سے پوچھا "جنت نے اس کا نام نہیں لیا تھا۔ تم دوسری بار اس کا ذکر کر رہے ہو۔"

"ضیغم خان اس گونگی کا خصم ہے جس کی کوکھ میں جنت گل گندے کیڑے کی طرح پروان چڑھی" پائندہ گل کا غصہ اپنے عروج پر پہنچا ہوا تھا۔ "ضیغم خان میرا پرانا دوست تھا۔ وہ دیکھنے دکھانے کے قابل، بہت خوبرو اور تنومند نوجوان تھا۔ اس کی مردانگی کو کابل کی ہر وہ عورت سلام کرتی تھی جو اس کی خلوت آشنا تھی لیکن بدقسمتی یہ ہوئی کہ ضیغم خان اپنی بھرپور مردانگی کے باوجود اس جوہر سے محروم تھا جو نسل کو آگے بڑھاتا ہے۔ اس کے جاہل رشتے داروں میں مردانگی کی ایک ہی پڑتال تھی کہ مرد شادی کے پہلے ہی سال صاحب اولاد ہو جائے۔ جب وہ کئی برس بعد بھی باپ نہ بن سکا تو اس کے بارے میں چرچے شروع ہو گئے۔ پہلے رشتے داروں

اور دوستوں نے ہنسی مذاق میں اسے طعنے دینے شروع کئے پھر بات عورتوں میں پہنچ گئی اور جوان لڑکیوں نے اس سے پردہ کرنا ختم کردیا تو اس کی انا لہولہان ہوگئی۔ وہ ان سب کے چیتھڑے اڑا سکتا تھا لیکن اس نے ایک انوکھی تدبیر سوچی اور اس کی وہی تدبیر آج میرے لیے سوہانِ روح بن کر رہ گئی ہے۔"

وہ خاموش ہوکر شراب کے گلاس کی طرف متوجہ ہوگیا۔ جنت گل نے مجھے جو کچھ بتایا' وہ بہت مختصر تھا لیکن پائندہ گل کی وہ کہانی دلچسپ ہونے کے ساتھ ہی سنسنی خیز بھی تھی۔ میں اس کی کہانی کے اگلے حصے کے بارے میں قیاس آرائیاں کرتے ہوئے' اس کے دوبارہ بولنے کا منتظر رہا۔ اس مرحلے پر میں اس سے کوئی چھیڑ چھاڑ نہیں کرنی چاہتا تھا۔ مجھے اندیشہ تھا کہ کہیں وہ بدک کر اس موضوع کو وہیں ختم نہ کردے۔

وہ گلاس سے شراب کے چھوٹے چھوٹے گھونٹ لیتا رہا۔ اس کی سرخ آنکھیں گزرے ہوئے دنوں کے تصور میں' قالین کے کسی بے نام نقطے پر مرکوز تھیں۔ آخر کار اس نے اپنی پُرخیال نظریں میری طرف اٹھائیں اور نسبتاً پرسکون آواز میں بولا "جانتے ہو کہ ضیغم خان نے اپنی مشکل حل کرنے کے لیے کیا تدبیر سوچی تھی؟"

"میں کیا کہہ سکتا ہوں؟ اس بارے میں جنت گل نے کچھ نہیں بتایا تھا" میں نے بے چارگی سے کہا۔

"اس نے بہت سنجیدگی سے تجویز پیش کی۔ میں نے سختی سے انکار کیا تو اس نے میرے پیر تھام لیے اور میں مان گیا۔" وہ بتانے لگا "اس نے کافی افیم کھلا کر اپنی بیوی کو سلا دیا مگر میں نیم مردار شکار پر ہاتھ ڈالنے والوں میں سے نہیں تھا۔ میں بے چینی کے عالم میں کروٹیں بدلتا رہا۔ رات میں کسی وقت اس کا خمار ذرا ہلکا ہوا لیکن وہ شاید اس وقت بھی افیم کے نشے میں تھی۔ وہ تمیز نہیں کرسکی کہ اس کے قریب کون تھا۔ میں نے اسے مایوس نہیں کیا۔ صبح اس کی خوف زدہ چیخوں سے میری آنکھ کھلی تو مجھے اندازہ ہوا کہ اس کے لیے میری موجودگی ناقابلِ یقین تھی۔ ضیغم خان نے درمیان میں آکر اسے خاموش کرنا چاہا تو وہ پوری بات سمجھ گئی۔ اس نے بپھر کر کہا کہ وہ چیخ چیخ کر ہر ایک کو بتائے گی کہ ضیغم خان نے اپنے رشتے داروں کا منہ بند کرنے کے لیے اپنے منہ پر کس طرح سڑے ہوئے ببول کی راکھ مل لی تھی۔ اس نے کھل کر کہا کہ اگر اصلی اولاد اس کے مقدر میں نہیں تھی تب بھی وہ اپنے شوہر سے خوش اور تقدیر پر شاکر تھی۔ اسے نقلی اولاد کی کوئی ضرورت نہیں تھی۔ بات بڑھی تو ضیغم خان نے طیش میں آکر اسے زمین پر گرایا اور اس کی زبان کاٹ دی تاکہ وہ کسی کو کچھ بھی نہ بتاسکے۔ میں اسی وقت وہاں سے لوٹ آیا۔"

"اوہ! اب میں سمجھا کہ گونگی ماں سے اس کی کیا مراد تھی؟" اس کے خاموش ہونے پر میں نے تحیر آمیز سادگی سے کہا "شاید جنت گل کو اس معاملے میں اپنی ماں کی بے بسی کا علم نہیں ہے۔"

"وہ بتی ہے' اسے سب معلوم ہے" پائندہ گل نے حقارت سے کہا "جو کچھ ہوا' وہ غلط فہمی کی بنا پر ہوا۔ میں سمجھا کہ اس کا قصہ ختم ہوچکا ہے۔ وہ ذرا بھی مزاحمت کرتی تو میں سر جھکا کر واپس لوٹ جاتا لیکن اس رات وہ انہونی ہونے والی تھی' سو وہ ہوکر رہی۔ مقدر کی دوسری خرابی یہ ہوئی کہ گونگی کی گود میں لڑکی آئی تو اس کے خدوخال میں میری شباہت تھی اور وہیں سے ضیغم خان رسوائی کی بھیانک دلدل میں دھنستا چلا گیا۔ اس نے اپنی بیٹی کا نام جنت خانم رکھا تھا لیکن لوگ اسے جنت گل کہتے تھے کیونکہ وہ اسے میری اولاد سمجھتے تھے اور میرا نام پائندہ گل تھا۔ خاندان کی رسوائی کی وجہ سے بات زیادہ نہیں اچھالی گئی لیکن یہ قصہ سینہ بہ سینہ پھیلتا رہا۔ جوانی کی دہلیز میں قدم رکھنے تک جنت گل کو بھی اپنی ہم جولیوں سے یہ سب معلوم ہوچکا تھا۔ اس نے اپنی اصل کی طرف لوٹنے کا فیصلہ کرلیا اور پھر کسی نہ کسی طرح پشاور میں عبدالرحیم خان کو اپنے جال میں پھانسنے میں کامیاب ہوگئی۔ چھوٹے خان نے مرتے دم تک کابل نہیں دیکھا اس لیے اسے جنت گل کے بارے میں کچھ معلوم نہیں تھا۔ وہ اس کی صورت اور جوانی پر مرمٹا۔ مجھے اس کے عشق کی اڑتی اڑتی خبریں ملیں تو میں خاموش رہا۔ بہت سے تنگاری باہر والیوں سے شادی کرتے آئے ہیں۔ میرے چھوٹے بھائی نے ایک قندھاری بزاز کی لڑکی سے شادی کرکے ان پہاڑوں اور اپنی مٹی کو خیرباد کہا تو میں نے کوئی اعتراض نہیں کیا لیکن جب مجھے پتا چلا کہ عبدالرحیم خان پر جنت گل نے ڈورے ڈالے ہیں تو میں مخالف ہوگیا۔ میں چھوٹے خان کو اصلیت نہیں بتاسکا۔ وہ بے چارہ آخر وقت تک یہی سمجھتا رہا کہ اس کا ماموں ظالم اور خود غرض ہے۔ اپنے بھائی کو قندھار والوں کی برادری میں دے کر بھی خاموش رہا لیکن بھانجے کو نسب برقرار رکھنے کے لیے پسند کی شادی سے روک رہا ہے۔ خرابی یہ تھی کہ میں جنت گل کے گندے خون کو اپنے خاندان میں لا ہی نہیں سکتا تھا۔ وہ ہر وقت میرے سامنے رہتی تو گناہ کا احساس مجھے زندہ درگور کردیتا اور پھر میل جول ہونے سے ہر تنگاری کو معلوم ہوجاتا کہ اس کے سردار نے اپنی جوانی میں کیسے گھناؤنے گناہ کا ارتکاب کیا تھا۔ اس جرم میں خود اپنی زبان سے بارہ تنگاری عورتوں اور مردوں کو پہاڑ سے گھاٹیوں میں دھکیل کر قتل کرنے کے فرمان جاری کرچکا ہوں۔"

کہانی کے اختتام پر اس کا لہجہ غیر ارادی طور پر نرم اور دھیما ہوگیا تھا۔ شاید اس کے غیظ و غضب پر احساس جرم حاوی ہوچلا تھا۔ میں نے اس کے مزاج میں رونما ہونے والی تبدیلی سے فائدہ اٹھاتے ہوئے کہا "لیکن بہتیرے تنگاری باہر کی دنیا میں تمہارے لیے کام کرتے ہیں' وہ اس معاملے سے اتنے بے خبر نہیں ہوسکتے۔"

"ساکھ اور سرداری ان عورتوں سے چلتی ہے جن کی گودوں میں ہمارے بچے پلتے ہیں اور آج تک تنگار اولی سے کسی عورت نے باہر قدم نہیں نکالا ہے۔ مردوں کی اور بات ہوتی ہے۔ وہ جو بات جہاں سنتے ہیں وہیں اپنے سینوں میں دفن کرلیتے ہیں۔ پھر جو لوگ باہر جاتے ہیں' وہ باہر کے چلن سے بھی واقف ہوجاتے ہیں۔ وہ باہر کی بستیوں میں دن رات کیا کچھ نہیں ہوتا؟ وہاں بازاروں سے باہر کسی کو سزا ملتی ہے؟ بلکہ میں نے تو یہ دیکھا ہے کہ بڑے شہروں میں آوارہ عورتوں کی بہت زیادہ عزت کی جاتی ہے۔ ہر معزز آدمی ان سے دوستی کرنے میں فخر محسوس کرتا ہے۔ ان کے ایک اشارے پر ہر وہ کام ہوجاتا ہے جو لاکھوں کی رقم خرچ کرکے بھی نہیں کرایا جاسکتا۔ اس ماحول کو دیکھتے ہوئے ہر تنگاری میری اکلوتی بھول کو نظرانداز کردیتا ہوگا۔ اس بارے میں آج تک کسی نے میرے سامنے کوئی ذکر نہیں کیا۔ سب میری عزت کرتے ہیں۔"

"باہر کی دنیا سے تم اچھی طرح واقف ہو" میں نے پینترا بدل کر کہا "اس ماحول میں رہ کر جنت گل بھی بگڑ جائے گی۔ کیا یہ بہتر نہ ہوتا کہ وہ کسی حیلے بہانے سے تمہارے ہی زیرِ سایہ آجاتی؟"

"وہ نہ بگڑی ہوتی تو بہت کچھ ہوسکتا تھا" وہ تیزی سے بولا۔ "لیکن وہ بگڑ چکی ہے۔ جو لڑکی ہتھیار کی نوک پر کسی یرغمالی کو اپنے نفس کا شکار بنانے لگے' وہ اور کیا بگڑے گی؟ اس ناسور کا اب ایک ہی علاج رہ گیا ہے کہ اسے یہاں لایا جائے اور چھوٹے خان کو قتل کرنے کے جرم میں اس کا قصہ ہمیشہ کے لیے پاک کردیا جائے۔ نہ وہ رہے گی' نہ اس کی بے راہ روی کی کہانیاں سن سن کر مجھے سینہ کوبی کرنی پڑے گی۔ اس سے عجیب رشتہ ہے میرا۔ میں اسے بھول جانا چاہتا ہوں مگر اس کی آوارگی کے بارے میں سن کر میرا خون کھول اٹھتا ہے جیسے وہ میری ہی بیٹی ہو۔"

"جائز اور ناجائز کی بات دوسری ہے مگر یہ حقیقت ہے کہ وہ تمہارا ہی خون ہے۔"

"گندہ خون" وہ مُنہ بنا کر حقارت سے بولا "ایسا خون جسے فصد کھول کر بہا دیا جاتا ہے۔"

"تمہاری دوسری اولادیں اس بارے میں کیا کہتی ہیں؟" میں نے انجان بن کر پوچھا۔

"دوسری اولادیں!" اس نے اپنے سینے کی گہرائی سے ایک سانس لے کر کہا "میرے تین بیٹے تھے لیکن تینوں جائز اور نرینہ اولادیں ایک برس کی عمر کو پہنچنے سے پہلے' قدرت نے مجھ سے چھین لیں۔ اور جس ناجائز لڑکی کو پیدا ہوتے ہی مرجانا چاہیے تھا وہ میرے سینے پر مونگ دلنے کے لیے ابھی تک زندہ ہے۔ لنگڑا ضیغم خان اس کی شادی کے عوض پانچ لاکھ روپے کمانے کے خواب دیکھ رہا ہے لیکن وہ ایک پیسہ بھی حاصل نہیں کرسکے گا۔"

"لنگڑا؟" میں نے حیرت سے کہا "تم تو کہہ رہے تھے کہ وہ بہت حسین اور تنومند آدمی تھا؟"

"وہ پرانا قصہ تھا۔ جب سے اس نے اپنی عزت کو خیرباد کہا ہے' تب سے اس کے ہر نقش سے خباثت ٹپکنے لگی ہے۔ ایک بار اس کی بیوی نے مشتعل ہوکر اسے مارنے کی کوشش کی تھی۔ ضیغم خان کو دوسری منزل سے نیچے دھکا دے دیا تھا لیکن وہ بے غیرت زندہ رہا۔ بس اس کے ایک کولہے کی ہڈی ٹوٹ گئی جو علاج کے بعد جڑ چکی ہے لیکن اس چوٹ کے نتیجے میں وہ کسی مینڈک کی طرح ایک ٹانگ پر اچھل اچھل کر چلتا ہے۔ وہ اپنی بیوی کی آبرو کا محافظ تھا لیکن اس نے خود اپنی ہی سازش سے اس کا دامن تار تار کرادیا۔ اس کی پوری کہانی سے واقف لوگ کہتے ہیں کہ اب قدرت نے اسے عبرت کا شاہکار بنا کر زندہ رکھا ہوا ہے۔ اس کی بیوی غصے میں ہوتی ہے تو اسے جھاڑو اور جوتیوں سے مار مار کر گھر سے نکال دیتی ہے۔ زبان سے محروم ہوجانے کی وجہ سے اس جاہل عورت کا دکھ اندر ہی اندر پل رہا ہے۔ مجھے یقین ہے کہ لنگڑا ضیغم خان ایک دن اسی کے ہاتھوں مارا جائے گا۔"

"اس کا مطلب ہے کہ اب تم نے بھی اُس سے اپنی دوستی ختم کردی ہے؟"

"ایسے بے کردار آدمی کو کون دوست رکھے گا۔ مجھے آج بھی حیرت ہے کہ میں نے اس کی گھناؤنی تجویز کیوں قبول کی تھی۔ اپنی جوانی کے دنوں میں' میں بھی پارسا نہیں تھا۔ اس عمر میں وہی مرد متقی اور پرہیزگار ہوتے ہیں جنہیں کوئی عورت گھاس نہیں ڈالتی یا پھر وہ اللہ کے خاص بندے ہوتے ہیں۔ لیکن میں نے کبھی اپنے قبیلے' برادری اور دوستوں کی عورتوں پر بری نظر نہیں ڈالی۔ میں پرایوں میں شکار کھیلتا تھا اور میں نے زندگی بھر اس اصول پر سختی سے عمل کیا ہے مگر ضیغم خان کی خوشامدانہ باتوں نے میری عقل پر شاید پردے ڈال دئے تھے۔"

اسی وقت باہر بجلی کوندی۔ ہولناک تڑاخوں کے ساتھ' جھریوں اور دراڑوں سے نیلگوں روشنی اس کمرے میں در آئی۔ سردار پائندہ گل خاموش ہوکر شراب نوشی میں مصروف ہوگیا۔ اس نے مجھے شریک کرنے کی ضرورت محسوس نہیں کی تھی۔ میں بھی اس بارے میں بے پروائی کا مظاہرہ کرتا رہا۔

"کل میرے آدمی تمہیں واپس لے جائیں گے" گرج اور چمک ختم ہوجانے کے بعد وہ کہنے لگا "ابھی وہ کابل میں ہے۔ تمہیں کابل پہنچادیا جائے گا۔ اپنے طریقۂ کار کا انتخاب تمہیں خود ہی کرنا ہوگا۔"

"اس سفر نے میرے بدن کا جوڑ جوڑ ہلا دیا ہے" میں نے دبی زبان سے کہا "اگر سفر سے پہلے مجھے چند روز تک آرام کرنے کی مہلت مل جائے تو میں بہتر طور پر اپنے کام کا آغاز کرسکوں گا۔"

"تم دو تین دن آرام کرلو" اس نے لمحہ بھر سوچنے کے بعد کہا۔ "مگر یہ یاد رکھنا کہ ابھی تک تم ہمارے دوستوں میں ہو' نہ دشمنوں میں۔ تمہیں ایک کمرا دے دیا گیا ہے۔ کھانے پینے کی ہر چیز بھی ملتی رہے گی لیکن اگر تم نے کوئی سازش کرنے کی کوشش کی تو پھر کھلی دشمنی شروع ہوجائے گی اور تم لوگوں کو ان تمام سہولتوں سے محروم

کرکے، وادی میں بیگار پر لگادیا جائے گا۔"

"تمہیں، ہم سے کوئی شکایت نہیں ہوگی۔ بس اتنا ضرور بتادو کہ ہمیں کوئی شراب بھی مل سکے گی۔ میرے علاوہ فرزانہ بھی شراب پینے کی عادی ہے" میں نے موقع پاتے ہی اپنا وہ مطالبہ بھی پیش کردیا۔

"فی کس ایک بوتل یومیہ سے زیادہ نہیں ملے گی" اس نے سختی سے کہا اور میرا دل خوش ہوگیا۔ ہوسکتا ہے کہ بوتل سے منہ لگاکر پینے والے تننگاریوں کے لیے ایک بوتل کی کوئی وقعت ہی نہ ہو مگر ہم لوگوں کے لیے وہ مقدار کافی سے زیادہ تھی۔ سارا دن ہلکی ہلکی چسکیاں لینے کے بعد بھی رات کو آخری محفل جمانے کا سامان ہوسکتا تھا اور گالان کی سطحِ مرتفع پر ہمارے چند دن خوشگوار انداز میں گزر سکتے تھے۔

"تم بہت نرم دل اور مہمان نواز ہو" میں نے ممنونیت سے لبریز لہجے میں کہا "راستے کی قید و بند کی صعوبتوں کے بعد یہ مہربانیاں ہمیں تمہارا غلام بنادیں گی۔"

"یہ نہ سمجھنا کہ میں اپنے ڈیرے میں بند ہونے کے بعد ہر چیز سے لاتعلق ہوگیا ہوں" وہ مجھے گھورتے ہوئے ترشی سے بولا "مجھے معلوم ہے کہ تم نے راستے میں بازی الٹنے کی ناکام کوشش کی تھی پھر چیغا سرائے میں تم نے صندل خان سے معاہدہ کرکے کچھ رعایتیں حاصل کی تھیں۔ تم اور تمہارے ساتھ والی گوری عورت راستے بھر صندل خان کی سفید شراب پیتی آئی ہے۔ تمہارا سفر اتنا کٹھن اور خشک نہیں تھا۔"

"صندل خان بھی بہت نیک نفس آدمی ہے" میں نے ڈھٹائی کے ساتھ اس کے طنز کو نظرانداز کرتے ہوئے کہا "مجھے یقین ہے کہ میرے کابل چلے جانے کے بعد، میرے ساتھیوں کی اسی طرح دیکھ بھال ہوتی رہے گی۔"

"اس کا انحصار ان کے رویّے پر ہوگا" پائندہ گل نے اپنا سر جھٹک کر کہا "انہوں نے ہماری مقرر کی ہوئی حدود سے تجاوز نہ کیا تو وہ سُکھ سے رہیں گے۔ خلاف ورزی کی صورت میں ان کے ساتھ کچھ بھی ہوسکتا ہے۔ یہ تمہارا فرض ہے کہ میرا پیغام انہیں اچھی طرح ذہن نشین کرادو۔"

"کیا انہیں تم شرفِ باریابی نہیں بخشوگے؟" میں نے قدرے حیرت سے سوال کیا۔

"فی الحال میں اس کی کوئی ضرورت محسوس نہیں کرتا" اس نے بے اعتنائی سے کہا۔

"یہاں ہم لوگوں کو ایک بدترین الجھن کا سامنا ہے جسے تم ہی دور کرسکتے ہو" میں نے جھجکتے ہوئے کہا۔

"کیسی الجھن؟" اس نے اپنا گلاس خالی کرنے کے بعد تلخی سے پوچھا۔

"اس کی وجہ سے ہم لوگوں کے اعصاب متاثر ہورہے ہیں۔ میرے ساتھیوں نے بتایا ہے کہ میں رات کو سوتے سوتے بھی اس بارے میں بڑبڑاتا رہا تھا۔ لیکن تمہارے آدمیوں نے اس بارے میں سختی کے ساتھ اپنی زبانیں بند کی ہوئی ہیں۔ ہمیں کوئی کچھ بتانے کے لیے تیار نہیں ہے۔" میں نے الجھن آمیز لہجے میں کہنا شروع کیا "اچانک گھنٹی بجتی رہے اور پھر ہر شنگاری کے ہتھیار آگ اگلنے لگتے ہیں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے کوئی آسیب ہمارا پیچھا کررہا ہو۔"

"وہ کوئی آسیب نہیں ہے" پائندہ گل یک بیک بھڑک کر بولا۔ "وہ کچھ بدمعاش لوگ ہیں جو شنگاریوں میں خوف و ہراس پھیلانے کی کوشش کررہے ہیں لیکن وہ بہت جلد جہنم کا ایندھن بنادیے جائیں گے۔ وہ ہمارا اندرونی معاملہ ہے۔ تمہیں اس سے کوئی غرض نہیں ہونی چاہیے۔"

"تم ٹھیک کہتے ہو۔ ہمیں اب بھی اس سے کوئی غرض نہ ہوتی لیکن اتفاقات نے ہمیں خوف زدہ کیا ہوا ہے۔ ہم چیغا سرائے سے چلنے والے تھے تو ایک بھیڑ نکل آئی جس کے گلے میں گھنٹی بندھی ہوئی تھی۔ پھر ہم درّے سے وادی میں داخل ہوئے تو گھنٹی بجنے لگی اور آج یہاں گالان میں آتے ہی وہی منحوس آواز سنائی دینے لگی۔ ایسا معلوم ہورہا ہے کہ وہ آواز ہمارا پیچھا کررہی ہے۔ ہم جہاں بھی جاتے ہیں، وہاں گھنٹی بجنے لگتی ہے۔"

"میں اس کا مطلب سمجھتا ہوں" وہ اپنی مٹھیاں بھینچ کر بولا۔ "وہ تم لوگوں کو بھڑکانا چاہ رہے ہیں لیکن وہ اپنے بال نوچتے رہ جائیں گے۔ تم نے دیکھ ہی لیا ہوگا کہ گھنٹی کی آواز پر ہر شنگاری جہنم کا دہانہ کھول دیتا ہے۔ یہ سب میرے حامی ہیں اور ان کی طاقت گھنٹی والوں کو کچل کر رکھ دے گی۔"

"چاہو تو تم اس بارے میں ہم پر اعتماد کرسکتے ہو" میں نے معنی خیز لہجے میں کہا۔

"مگر کیوں؟ اس بارے میں بھلا تم کیا کرسکوگے؟" اس نے چونک کر پوچھا۔

"میرا اندازہ ہے کہ وہ شنگارا ولی کے کچھ سرپھرے باغی ہیں جو دور دور سے گھنٹیاں بجاکر دوسرے شنگاریوں کو یہ جتانا چاہتے ہیں کہ تمہارے نمک خوار ان کا بال بھی بیکا نہیں کرسکتے۔ ہوسکتا ہے کہ وہ اندر ہی اندر طاقت پکڑ رہے ہوں اور ایک دن تمہارا سامنا کرنے کا ارادہ رکھتے ہوں" میں نے نپے تلے الفاظ میں اپنی رائے ظاہر کی۔

سردار پائندہ گل کی آنکھیں حیرت سے پھیل گئیں اور اس نے اضطراری طور پر سرگوشیانہ لہجہ اختیار کرتے ہوئے کہا "تم بہت چالاک آدمی ہو۔ میرا بھی یہی خیال ہے کہ یہ باغیوں کی حرکت ہے مگر وہ روپوش ہیں۔ ابھی تک ان میں سے کسی کو شناخت نہیں کیا جاسکا۔ وہ گھنٹی بجاکر چھلاوے کی طرح غائب ہوجاتے ہیں۔ شناخت کیے بغیر ان کا کچھ بھی نہیں بگاڑا جاسکتا۔ تم اس بارے میں کیا کہتے ہو؟"

"ہوسکتا ہے کہ ہم ان کی نشان دہی کرنے میں کامیاب ہوجائیں" میں نے پُرامید لہجے میں کہا۔

سردار پائندہ گل بے اعتباری سے ہنس پڑا۔ اس ملاقات میں وہ پہلی بار ہنسا تھا۔ گلابی ہونٹوں کے پیچھے چمکتے ہوئے سفید دانتوں کی چمکتی ہوئی قطاروں کی وجہ سے اس کا چہرہ کسی بھیڑیے کی طرح نظر آنے لگا تھا۔ وہ کہہ رہا تھا "تم کو وہ گاجر مولی کی طرح کاٹ کر رکھ دیں گے۔ تم تو مقامی بولی بھی نہیں جانتے۔"

"اگر ہمیں نقل و حرکت کی آزادی مل جائے تو شاید ہم ان تک رسائی حاصل کرلیں۔"

"یہاں؟ گالان میں؟" پائندہ گل نے حیرت سے کہا "یہ ناممکن ہے۔ یہاں کا بچہ بچہ میرا وفادار اور جاں نثار ہے۔ گالان میں تمہیں ان کا سایہ بھی نہیں مل سکے گا۔"

"اپنے لوگوں کو تم مجھ سے زیادہ جانتے ہو" میں نے سر جھکا کر عاجزی سے کہا "لیکن میں پورے ادب اور احترام کے ساتھ کہوں گا کہ میری رائے تم سے مختلف ہے۔"

"کیا مختلف ہے۔ اب بات چھڑ ہی گئی ہے تو کھل کر بتاؤ کہ تم کہنا کیا چاہ رہے ہو؟"

"باہر سے کبھی کوئی سازش یا بغاوت کامیاب نہیں ہوتی۔ گھر کے آدمیوں اور غداروں کی مدد سے سازشیں پروان چڑھتی ہیں۔ سوچو کہ انہیں ہماری آمد یا روانگی کے بارے میں کیسے معلوم ہوا۔ یقیناً اندر کا کوئی آدمی مخبری کررہا ہے۔ ہم جہاں بھی پہنچے، ہم سے پہلے وہاں گھنٹی بجانے کا بندوبست موجود تھا۔ یہ اتفاق نہیں ہوسکتا۔"

سردار پائندہ گل کا چہرہ دھواں ہوگیا۔ وہ دھیمی آواز میں بولا۔ "ٹھیک کہتے ہو۔ یہ بات تو میں نے سوچی ہی نہیں تھی کہ میرے ساتھی بھی مجھے دغا دے سکتے ہیں۔"

"تم سوچ بھی نہیں سکتے تھے" میں نے اس کی دل جوئی کے لیے کہا "خاموشی سے مخبری کرنے کے بعد جب فضا میں گھنٹی کی آواز گونجتی ہے تو مخبر بھی تمہارے وفاداروں کے ساتھ گولیاں چلانے لگتے ہیں۔ وہ آخر وقت تک سامنے نہیں آئیں گے اور جب سامنے آئے تو تم انہیں پہچان کر شاید سکتے میں رہ جاؤ گے۔"

"اچھا ہوا کہ تم سے بات ہوگئی۔ اب میں اس طرف بھی دھیان دوں گا۔" وہ بولا۔

"اگر ہمیں تھوڑی سی آزادی دے دی جائے تو مجھے امید ہے کہ ان میں سے کوئی ہم سے مل بیٹھنے کی کوشش ضرور کرے گا۔ گالان میں آنے کے بعد چوبیس گھنٹوں میں تین بار اس آواز کا سنائی دینا اس بات کا کھلا ثبوت ہے کہ وہ لوگ کسی وجہ سے ہم چاروں میں دلچسپی لے رہے ہیں۔ ان کا ایک آدمی تمہارے ہاتھ آگیا تو تم سارے سازشیوں کی گردنیں توڑنے کے قابل ہوسکوگے ورنہ چوہے اور بلی کا یہ کھیل نہ جانے کب تک چلتا رہے گا۔"

وہ سوچ میں پڑگیا۔ چند ثانیوں کے بوجھل سکوت کے بعد اس نے فیصلہ کن آواز میں کہا "یہ نہیں ہوسکتا۔ میرے لیے جنت گل کا معاملہ بھی بہت اہم ہے۔ سب جانتے ہیں کہ میں چھوٹے خان کے خون کا انتقام لیے بغیر اپنی گوشہ نشینی ترک نہیں کروں گا۔ میری غیر حاضری میں یہ فتنہ زور پکڑتا رہے گا۔ جنت گل کو جہنم واصل کرنے کے بعد میں خود میدان میں اتروں گا اور ایک ایک کو دیکھ لوں گا۔ اس وقت میں گھنٹیوں والوں کے دباؤ کی وجہ سے تم کو ڈھیل دینے کا خطرہ مول نہیں لے سکتا۔ تم بہت چالاک اور مکار آدمی ہو۔ تم گھنٹیوں والوں سے کوئی جوڑ توڑ کرکے یہاں سے نکل بھاگے تو جنت گل کو کیفرِ کردار تک پہنچانے کا کام بہت پیچھے چلا جائے گا۔"

"میں وعدہ کرتا ہوں کہ میں صرف تمہارے لیے کام کروں گا۔ ہم چاروں کے لیے یہاں سے نکلنا اتنا آسان نہیں ہوگا۔ وہ تو چھپ کر کام کررہے ہیں۔ وہ فرار میں ہماری کوئی مدد نہیں کرسکیں گے۔"

"میں صاف گو آدمی ہوں" پائندہ گل نے میری طرف دیکھتے ہوئے کہا "سیدھی سی بات ہے کہ مجھے تم پر بھروسا نہیں ہے۔ تم اپنی مطلب برآری کے لیے کسی کو بھی داؤ پر لگاسکتے ہو۔ اس لیے اب اپنی تجویز پر اصرار نہ کرو۔ مجھے یہ اعتراف ضرور ہے کہ تمہاری باتوں نے میری آنکھیں کھول دی ہیں لیکن تم ان باتوں کا کسی سے ذکر نہ کرنا" پھر اس نے قدرے توقف کے بعد جھجکتے ہوئے کہا "صندل خان سے بھی نہیں۔ اب مجھے اپنے سائے سے بھی ہوشیار رہنا پڑے گا۔"

میں دل ہی دل میں اس کی ذہنی حالت پر ہنس کر رہ گیا۔ ایک طرف وہ کھل کر مجھ پر اپنے عدم اعتماد کا اظہار کررہا تھا دوسری طرف مجھ سے رازداری کا بھی خواہاں تھا۔

"میں تمہارا قیدی ہوں۔ جیسا تم چاہوگے، ویسا ہی ہوگا" میں نے ڈھیلی آواز میں کہا۔

باہر بارش کا زور ٹوٹ چلا تھا۔ بادلوں کی تیز گرج اور بجلی کی کڑک بھی دم توڑ گئی تھی۔ پائندہ گل نے اپنے خالی گلاس میں سفید شراب انڈیل کر، اس کا ایک گھونٹ لیا پھر منہ چلاتے ہوئے بولا۔ "اب تم دو تین دن یہاں آرام کرو پھر تمہیں کابل بھجوادیا جائے گا۔ اس دوران میں تمہارے مقدر نے یاوری کی اور میرے آدمیوں نے اس جہنم جلی کو پکڑلیا تو تمہیں اسی وقت آزادی نصیب ہوجائے گی۔"

وہ واضح طور پر پائندہ گل کے الوداعی فقرے تھے۔ میں مزید کچھ کہے بغیر وہاں سے اٹھ گیا لیکن کمرے کے وسط میں پہنچتے ہی ایک خیال کے تحت فوراً پلٹ پڑا۔ سردار پائندہ گل نے تیور چڑھاکر میری طرف دیکھا۔

"میں ایک بات کی وضاحت چاہتا ہوں" میں نے اپنا گلا صاف کرکے کہا "گھنٹی والوں کے بارے میں، میں کسی کو بھی اپنے

شبہات کی ہوا نہیں لگنے دوں گا لیکن میں یہ تو بتا سکتا ہوں نا کہ گھنٹی والے کچھ بدمعاش شنگاری ہیں جو اس وادی میں سنسنی پھیلا رہے ہیں؟"

"یہ بتانے میں کوئی حرج نہیں" اس نے کہا "لیکن بدمعاش شنگاریوں کا ذکر نہ کرنا۔ اس سے بے اعتمادی پھیل سکتی ہے۔ بس وہ کچھ بدمعاش ہیں جو شنگاری ہونے کے علاوہ باہر کے کوہستانی بھی ہوسکتے ہیں۔"

"شکریہ!" میں نے سر کو قدرے خم دے کر کہا "بعد کی کسی غلط فہمی سے بچنے کے لیے یہ وضاحت ضروری تھی۔ میرے ساتھی اور خاص طور پر سفید فام عورت ان واقعات سے دہشت زدہ ہوئی جارہی ہے۔"

میں منقش چوبی دروازے سے باہر نکلا تو قالینوں والی چوپال میں وہ شخص میرا منتظر تھا جو مجھے وہاں تک لایا تھا۔ وہاں موجود لوگوں کی تعداد میں اضافہ ہوچکا تھا اور وہ کئی ٹولیوں میں بٹے ہوئے تھے۔ کوئی گرم گرم قہوہ پی رہا تھا۔ کہیں سے چائے کی اشتہا انگیز خوشبو آرہی تھی اور ایک ٹولی کے وسط میں مختلف قسم کی شرابوں کی ملی جلی بوتلیں نظر آرہی تھیں۔ خاص بات یہ تھی کہ وہاں بیٹھے ہوئے خوش باش شنگاریوں میں سے کوئی بھی غیر مسلح نہیں تھا۔ ہر ایک کے شانے سے کوئی نہ کوئی آتشیں ہتھیار جھول رہا تھا۔

میرے باہر نکلتے ہی صندل خان کسی طرف سے لپک کر آیا اور میری طرف ہاتھ لہراتا ہوا، سردار پائندہ گل کے خاص کمرے میں جا گھسا۔ شاید سردار کو تنہائی کے عذاب سے محفوظ رکھنے کی ذمے داری اس نے اپنے سر لی ہوئی تھی اور وہ اپنا فرض بڑی خوش اسلوبی سے سرانجام دے رہا تھا۔

میں واپس پہنچا تو میرے سر پر سے بہت بڑا بوجھ ہٹ چکا تھا اور شاید اس کے اثرات میرے بشرے پر بھی واضح تھے کیونکہ ویرا نے مجھے دیکھتے ہی ہانک لگائی تھی "خاصے سرخرو نظر آرہے ہو۔ معلوم ہوتا ہے کہ خان بابا نے تمہیں کوئی اچھی خبر سنائی ہے" مجھے وہاں لانے والا ویرا کی بات کو سنی ان سنی کرکے واپس چلا گیا اور میں اس تخت پر جا بیٹھا جہاں وہ تینوں کارڈز کھیلنے میں مصروف تھے۔

"چہرے کی سرخی پر مت جاؤ" میں نے ویرا سے کہا "اگر ہم اس صحت افزا مقام پر اتنی ہی بے رحمی کے ساتھ کھاتے پیتے رہے تو ہماری جلد کی تمام باریک شریانوں سے خون باہر آنے لگے گا۔ سردار پائندہ گل کے عزائم خوفناک ہیں۔ وہ پوری سنجیدگی سے ان پر عمل کرنے کا ارادہ رکھتا ہے۔"

"وہ کیا چاہتا ہے؟ تفصیل سے بتاؤ نا!" غزالہ کی آنکھوں سے خوف جھانکنے لگا۔

"جب تک میں جنت گل کو اس کے سامنے پیش نہیں کروں گا، تم لوگ اس کے یرغمالی رہوگے" میں نے مختصر ترین الفاظ میں انہیں آگاہ کیا "تمہاری دیکھ بھال پوری توجہ سے کی جائے گی۔"

"اس کا مطلب ہے کہ ہمیں بلاوجہ نہیں اٹھایا گیا۔ ... نے شروع ہی سے اپنا منصوبہ تیار کرلیا تھا" سلطان شاہ ... سانس لے کر بولا "اب جنت گل کی تلاش میں تم کہاں کہاں ... پھرو گے؟"

"اس بارے میں اس کے آدمی میری رہنمائی کریں گے ... الحال وہ لڑکی کابل میں ہے۔"

"کابل کے راستے بھیانک جنگ کی زد میں آئے ہوئے ... وہاں تک پہنچنا اور پھر وہاں سے صحیح سلامت واپس نکل ... جوکھوں کا کام ہوگا" غزالہ بدستور پریشان تھی "یہ کوئی اچھی ... نہیں ہے۔"

"احتیاط!" میں نے سرگوشیانہ لہجے میں کہا "اس کا نام ... اس کے لیے خان بابا کا خطاب ہی بہتر ہے۔"

"تم نے خان بابا سے اپنے اور بدرو دادا کے پرانے مراسم ... ذکر کیا تھا؟" ویرا نے پوچھا۔

"اس بارے میں میری ہر بات رائیگاں جاتی" میں نے ...

"اب تو بدرو دادا ہی کی طرف سے میری سفارش آئے تو بات ... سکتی ہے۔ خان بابا میری کوئی بات نہیں سنے گا۔"

"اور اس کے آدمیوں کو ہم نے اپنی ناکام کارروائی ... بدظن کردیا تھا۔ ہوسکتا ہے کہ عبدل اور ولی واپس جا کر بدلا ... تمہارے بارے میں ایک لفظ بھی نہ بتائیں" سلطان شاہ نے کہا۔

"ہاں! موجودہ صورتِ حال بہت مایوس کن ہے" میں ... انہیں آنکھ مارتے ہوئے کہا "یہ بتاؤ کہ تمہیں کارڈز کہاں سے ... گئے؟"

"ایک شنگاری دو گڈیاں دے گیا تھا۔ تاش کھیلتے ہوئے ... وقت آسانی سے گزر گیا" ویرا کھڑکی سے باہر دیکھتے ہوئے بولی ... "بارش رکنے کے آثار ہیں۔ مطلع بھی صاف ہوتا جارہا ہے۔ ... بہتر ہونے کے بعد ہمیں باہر نکلنے کی اجازت تو مل جائے گی نا؟"

میں نے مایوسی سے سر ہلاتے ہوئے کہا "یہ نہ بھولو کہ ہم یہاں ... قیدی ہیں اور پھر یہاں کے حالات بھی مخدوش ہیں۔ وہ گھنٹیاں ... بھی وقت بج سکتی ہیں۔ خان بابا ان بدمعاشوں کی طرف سے ... ہے۔"

"گھنٹیوں کے بارے میں تم نے خان بابا سے بات کی تھی ..." ویرا نے حیرت سے پوچھا۔

"ہاں، وہ کچھ نامعلوم بدمعاش ہیں جو شنگاریوں میں ... دہراس پھیلاتے پھر رہے ہیں۔ جس دن بھی ان کا کوئی آدمی ... گیا، ان کی پوری ٹولی موت کے گھاٹ اتار دی جائے گی۔"

میں ان کے ساتھ اس قسم کی باتیں کرتا رہا جن کے بارے میں ... پائندہ گل نے اجازت دی تھی لیکن میں نے انہیں اشاروں ... میں یہ سمجھا دیا تھا کہ میں بقیہ باتیں موقع ملنے پر بتاؤں گا۔ اس بڑے کمرے میں ہم چاروں کے علاوہ اور کوئی موجود نہ ...

پھر وہاں جدید مواصلاتی وسائل کی کوئی جھلک بھی نظر نہیں آئی ... کی بنا پر وہاں گفتگو سننے والے حساس آلات کی موجودگی کا ... ان حالات میں میرا حد سے زیادہ محتاط رویہ ان تینوں کے ... کا سبب بن گیا لیکن غنیمت یہ ہوا کہ کسی نے مجھ سے ... میں الجھنے کی کوشش نہیں کی اور ہم چاروں تاش کھیلنے میں ... ہوگئے۔

اسی دوران میں ایک شنگاری واڈکا کی دو بوتلیں، برف سے بھرا ... گلاس اور ڈرائی فروٹ کی ٹوکری لے کر آیا تو وہ تینوں اس ... مہمان نوازی پر حیران رہ گئے۔

"یہ فراخدلانہ مدارات ہیں" میں نے ہنس کر کہا "خان بابا سے ... بوتل فی کس یومیہ کا معاہدہ ہوا ہے۔ یہ آج کا کوٹا ہے۔ کل نیا ... پانی آئے گا۔ خان بابا کو ہر بات کا علم ہے۔ وہ یہاں تک ... ہے کہ ہم راستے میں صندل خان کی بوتلوں پر ہاتھ صاف ... کرتے ہوئے آئے ہیں۔"

"خان بابا تو شراب نہیں پیتا ہوگا؟" غزالہ نے تائید طلب ... میں پوچھا۔

"مجھے تو وہ بلانوش لگتا ہے۔ جو خود نہ پیئے وہ مہمانوں یا قیدیوں ... کو بلا سکتا ہے۔" میں ہنس پڑا۔

"غضب خدا کا" غزالہ اپنے اضطراری ردِعمل پر قابو نہ رکھ ... "اس کی نورانی صورت اور شرعی لباس دیکھ کر تو یہ اندازہ ہوتا ... وہ کوئی باعمل عالم ہوگا لیکن تم کچھ اور ہی بتا رہے ہو۔"

"خان بابا تو پھر بھی پہاڑی قبیلے کا سردار ہے۔ افغانستان میں ... اور شرعی لباس کی کچھ روایتی حیثیت ہوگئی ہے" میں نے کہا۔ ... اور قاضی، زاہد اور رند، سب ہی کا ایک حلیہ ملے گا۔ لباس ... قطع سے کسی کے بارے میں کچھ اندازہ لگانا بہت مشکل ... شنگاریوں میں مجھے ابھی تک کوئی بے ریش مرد نظر نہیں آیا ..."

ویرا نے ندیدے پن کا مظاہرہ کرتے ہوئے فوراً ہی ایک بوتل ... پانی کا جگ، گلاسوں سمیت پہلے سے موجود تھا۔ وہ دو ... بناتے ہوئے بولی "ایسے موسم میں بوتل کا دیدار کرتے رہنا ... نعمت ہے۔ پینے کے بعد کھیل میں لطف آئے گا۔ تم نے یہ ... بہت زبردست کیا ہے۔ اس طرح قید کی بوریت کم ہوجائے ..."

"تم چاہو تو مزید لطف پیدا کرنے کے لیے صندل خان کو بھی ... جا سکتا ہے" سلطان شاہ جل کر بولا۔

"تم بلاوجہ سلگتے رہو" ویرا اپنے لب تر کرتے ہوئے ہنسی "یہ ... میرے خدا نے مجھے ان ویران پہاڑوں میں بھی اپنا شوق ... کا موقع دیا ہے۔ یہ میری طلب کی سچائی نہیں تو اور کیا ..."

"خدا ایک ہی ہے۔ وہ میرا یا تمہارا نہیں بلکہ سب کا پروردگار ہے" سلطان شاہ کو ویرا کے استہزا پر غصہ آگیا "اس نے یہ نعمت نہیں بھیجی ہے بلکہ تمہاری رسی ڈھیلی چھوڑی ہے۔ جب وہ اس رسی کو ایک خفیف سا جھٹکا دے گا تو تمہاری آنکھیں اپنے حلقوں سے باہر ابل پڑیں گی اور......"

میں نے جلدی سے اس کی بات کاٹ دی۔ مجھے ڈر تھا کہ سلطان شاہ جوشِ خطابت میں توحید اور تثلیث کے مسئلے پر بولنا نہ شروع کردے۔ اس وقت تک ویرا فرزانہ بنی ہوئی تھی اور اسلام کی دعوے دار بن کر اپنا کردار بخوبی ادا کرتی چلی آرہی تھی۔ باہمی چپقلش کے نتیجے میں، میں کسی انکشاف سے گریز کرنا چاہ رہا تھا۔

ابتدا میں غزالہ میری پارٹنر تھی۔ سلطان شاہ، ویرا کے ساتھ تھا۔ نوک جھونک کے بعد شاید سلطان شاہ کی کھوپڑی میں ابال برقرار رہا۔ ویرا نے اسے کئی غلط چالوں پر ٹوکا لیکن سلطان شاہ کا کھیل بگڑتا ہی چلا گیا۔ آخر ویرا نے اکتائے ہوئے انداز میں اپنے پتے پھینک دیئے۔

"ہمیں جاڑوں کے موسم میں یہاں آنا چاہیے تھا" اس نے ہلکی سی انگڑائی لیتے ہوئے کہا "بعض لوگوں کے لیے آج کل کا معتدل موسم بھی سخت ناسازگار ہے۔ گرمی لگتی ہے تو سارے بخارات دماغ میں چڑھ جاتے ہیں۔"

"یہ حد سے بڑھ رہی ہے" سلطان شاہ مجھ سے مخاطب ہوکر غرایا "اسے خاموش رکھو ورنہ بات بہت بڑھ جائے گی اور میں ذمے دار نہیں ہوں گا۔" اس کے چہرے پر زلزلے کے سے آثار نمایاں تھے۔

"مجھے کون خاموش کرے گا؟" ویرا نے غزالہ کو آنکھ مارتے ہوئے بے پروائی سے کہا "میں خود بھی باؤلے مردوں کے منہ لگنا پسند نہیں کرتی۔ کیا پتا کب غراتے غراتے اچانک دانت مار بیٹھیں۔"

سلطان شاہ نے کوئی تلخ جواب دینا چاہا لیکن غصے کی زیادتی کی وجہ سے الفاظ اس کے دہانے میں ہی گڈمڈ ہوکر رہ گئے۔ ان مضحکہ خیز اور بے معنی آوازوں پر میں نے بہت مشکل سے اپنے بے ساختہ قہقہے کو روکا تھا۔ غزالہ بہت محبت اور نرمی سے سلطان شاہ کا بازو تھام کر اسے دوسرے تخت کی طرف لے گئی۔

"بعض اوقات تم اس کے ساتھ بہت زیادتی کر بیٹھتی ہو" ان دونوں کے دور نکل جانے کے بعد میں نے نیچی آواز میں ویرا کو ملامت کرتے ہوئے کہا "یہاں ہمیں ایسی رنجشوں سے بچنے کی کوشش کرنی چاہیے۔"

"تم فکر نہ کرو۔ میں تھوڑی دیر بعد اسے منالوں گی۔ دراصل وہ بات بے بات چڑنے لگتا ہے اس لیے اسے چڑانے میں مزہ آتا ہے۔ اس بے کیف قید میں یہی تو ایک رنگینی ہے۔ اگر سلطان شاہ بھی تمہارے ساتھ روانہ کردیا گیا تو میرے لیے یہاں وقت کاٹنا دشوار ہوجائے گا۔"

"حالات نے ایک دم ایسا پلٹا کھایا ہے کہ ہم ڈون کوانگ فو کے آدمیوں کو بالکل بھول گئے ہیں۔ وہ لوگ ہمیں شہر کے ہر گوشے میں تلاش کرتے پھر رہے ہوں گے" میں نے اسی نیچی آواز میں کہا۔

"یہاں سے واپسی کی نوبت آئے گی تو ان لوگوں کے بارے میں بھی سوچ لیا جائے گا۔ فی الحال ان فضول باتوں میں سر نہ کھپاؤ اور اس دھیمے انداز میں مجھے وہ سب بتاتے چلے جاؤ جو خان بابا کے ذریعے تمہارے علم میں آیا ہے۔ اس وقت قرب وجوار میں ان کا کوئی آدمی نہیں ہے۔"

جنت گل اور اس کے خاندان کے بارے میں پائندہ گل نے جو کچھ کہا' وہ حیران کن اور سنسنی خیز ضرور تھا لیکن اس کا ہماری قید سے کوئی براہِ راست تعلق نہیں تھا اس لیے میں نے وہ ذکر سرے سے گول کرتے ہوئے' گھنٹیوں والوں کی کہانی چھیڑ دی جو ویرا کے لیے متوقع ہونے کے باوجود دلچسپ تھی۔

"گھنٹی کی آواز پر جس بے دردی سے چو طرفہ فائرنگ کی جاتی ہے اسی سے اندازہ ہوگیا تھا کہ وہ خان بابا کے بہی خواہوں میں سے نہیں ہوسکتے۔" میری روداد سن لینے کے بعد ویرا نے سرگوشیانہ آواز میں کہا "ہمارے لیے یہ بات بہت خوش آئندہ ہے کہ شنگارا ویلی میں خان بابا ہی طاقت اور اختیار کا منبع نہیں ہے بلکہ یہاں اس کے طاقتور حریف بھی موجود ہیں جو بظاہر ہمیں اپنی موجودگی کا احساس دلانے کی کوشش کررہے ہیں۔"

ویرا کے آخری فقرے نے مجھے بری طرح چونکا دیا "گھنٹیوں والے جو بھی ہوں' مقامی لوگ ہی ہوں گے۔ یہ ان کے آپس کے معاملات ہیں۔ ان میں ہماری کیا اہمیت ہوسکتی ہے؟ وہ ہمیں اپنی موجودگی یا طاقت کا احساس دلا کر کیا مقصد حاصل کرنا چاہتے ہیں؟"

"کمال ہے کہ اتنی موٹی سی بات ابھی تک تمہاری عقل میں نہیں آسکی۔ اس وقت ساری اہمیت ہی ہماری ہے۔ عبدالرحیم خان کے قتل کے بعد خان بابا گوشہ نشین ہوکر عملاً سرداری سے دستبردار ہوچکا ہے۔ اس کے اندھے پیرو کاروں نے اس کی سرداری کا بھرم رکھا ہوا ہے۔ جب تک وہ چھوٹے خان کے قتل کا انتقام نہیں لے لیتا' اپنے پورے اختیار کے ساتھ گھنٹیوں والوں کا پیچھا نہیں کرسکتا۔ اسے کمزور پاکر اس کے حریفوں نے اپنی سرگرمیاں تیز کردی ہیں۔ شاید وہ خان بابا کا انتقام پورا ہونے سے پہلے' اسے معزول کرکے اقتدار پر قابض ہونا چاہتے ہیں۔ خان بابا کے خلاف کسی بھی بغاوت کے لیے یہ وقت بہت سازگار ہے۔" وہ سرگوشیانہ لہجے میں مسلسل بولے جارہی تھی "شاید ان لوگوں کو معلوم ہوگیا ہے کہ ہمیں جنت گل کا گھیراؤ کرنے کے لیے شنگارا ویلی لایا گیا ہے اسی لیے انہوں نے ہمارے سفر کے تین اہم ترین مرحلوں پر گھنٹیاں بجاکر خان بابا کے وفاداروں کے ساتھ ہمیں بھی وارننگ دی ہے کہ ہم اقتدار کی ہوس کی اس جنگ سے دور رہیں جب کہ خان بابا تمہیں داؤ پر لگانے پر تل گیا ہے..."

"تمہاری بات میری سمجھ میں آرہی ہے" میں نے [illegible] لہجے میں کہا "لیکن ہم ان اطراف میں اجنبی ہیں۔ تمہاری [illegible] وارننگ ہمارے لیے کیسے قابل فہم ہوسکتی ہے؟ اگر تمہارا یہ خیال درست ہے کہ گھنٹیوں والے ہم کو جنت گل کا پیچھا کرنے سے روک کر' خان بابا کو ذلیل ورسوا کرنا چاہتے ہیں تو تم میری ایک بات لکھ لو کہ وہ بہت جلد ہم سے رابطہ کرنے کی کوشش کریں گے تاکہ اپنا پیغام ہم تک پہنچا سکیں۔"

"ہوسکتا ہے" اس نے میری بات کو اہمیت دیے بغیر کہا "ان کے لیے سہل راستہ یہ ہوگا کہ جب تم کابل کے ارادے سے یہاں سے نکلو تو وہ راستے میں کہیں بھی حملہ کرکے پورے کارواں کو صاف کردیں۔ تم دیکھ ہی چکے ہو کہ پیغا سرائے سے یہاں تک پورا راستہ ایسی گوریلا کارروائیوں کے لیے بہت سازگار ہے۔"

"خان بابا تو کل ہی مجھے کابل کی طرف بھیجنے کا ارادہ کیے بیٹھا تھا۔ غنیمت ہے کہ میں نے اس سے دو تین روز تک آرام کرنے کی مہلت مانگ لی۔ میرا خیال ہے کہ اس وقت تک صورت حال خاصی صاف ہوجائے گی۔ اب ہمیں ہر قدم پر اپنی آنکھیں کھلی رکھنی پڑیں گی۔ اندازے یا فیصلے کی ذرا سی غلطی ہم چاروں کو جہنم واصل کردے گی۔"

"تم لوگ مسلسل کیا باتیں کیے جارہے ہو؟" غزالہ کی آواز نے ہم دونوں کو بری طرح چونکا دیا۔ وہ سلطان شاہ کو اس کے تخت پر چھوڑ کر خاموشی سے ہماری طرف لوٹ آئی تھی۔

"آپس کی باتیں ہیں۔ چاہو تو تم بھی شامل ہوسکتی ہو" ویرا نے خوش دلی سے کہا۔

"سلطان شاہ کا خون کھول رہا ہے" اس نے بتایا "وہ سمجھ رہا ہے کہ اب تم اس کے خلاف ڈینی کے کان بھرنے کی کوشش کررہی ہو۔ میں نے بہت مشکل سے اسے دوبارہ ادھر آنے سے روکا ہے۔"

"غصے میں اس کی عقل واقعی خوب چلنے لگتی ہے" ویرا نے گہری سنجیدگی سے کہا "میں ڈینی سے کہہ رہی تھی کہ سلطان شاہ اب ہمارے لیے ناقابل برداشت ہوتا جارہا ہے اس لیے موقع ملتے ہی اسے کسی خطرناک چوٹی سے نیچے دھکیل دیا جانا چاہیے۔ یہاں اس کا قصہ یہیں دفن ہوجائے گا لیکن ڈینی میری مخالفت کررہا ہے۔ اس کا کہنا ہے کہ تم سلطان شاہ کی موت کا صدمہ برداشت نہیں کرسکو گی۔ وہ تمہیں سگے بھائی کی طرح عزیز ہے۔"

غزالہ حیرت اور صدمے سے منہ پھاڑے' ویرا کی یہ بکواس سنتی رہی۔ اس کی آنکھوں سے ملامت آمیز بے یقینی جھلک رہی تھی جیسے اسے ویرا سے ایسی سنگدلی کی امید نہ رہی ہو۔ اس کے یاقوتی ہونٹوں کے گوشے فرطِ جذبات سے کپکپا رہے تھے۔ پھر جب اس کی آنکھوں کے گوشوں میں نمی چمکنے لگی تو میں اپنی خاموشی برقرار نہ رکھ سکا۔

"سلطان شاہ کا دماغ خراب ہے اور یہ بھی نری بکواس کررہی ہے۔ ہم یہاں کے خطرناک حالات پر غوروخوض کررہے تھے۔ موقع پاکر یہ تمہیں بھی بریف کردے گی۔ اس بار ہم بہت برے پھنسے ہیں۔"

غزالہ کے ہونٹوں پر مسکراہٹ پھیل گئی اور اس نے دونوں ہتھیلیوں سے رگڑ کر آنکھوں کی نمی کو خشک کرتے ہوئے ویرا سے کہا "تم نے تو میری جان ہی نکال دی تھی۔ میں سوچ بھی نہیں سکتی تھی کہ تم سلطان شاہ کے بارے میں ایسے بے رحمانہ انداز میں سوچو گی۔ وہ مجھے واقعی اپنے بھائی کی طرح عزیز ہے۔"

"لیکن تھوڑا سا کریک بھی ہے" ویرا تیزی سے بولی "اس سے کہو کہ وہ میرے بارے میں اوٹ پٹانگ باتیں نہ سوچا کرے ورنہ اس کی ننھی سی کھوپڑی کسی خود کار بم کی طرح ایک دن اچانک پھٹ جائے گی۔"

"اب تم اسی کے پاس لوٹ جاؤ" میں نے غزالہ کو پچکارتے ہوئے کہا "اس وقت اس کے دماغ میں شیطان گھسا ہوا ہے۔ وہ سوچے گا کہ تم بھی اس کے خلاف ہونے والی سازش میں شامل ہوگئی ہو۔ ہم دونوں بھی تھوڑی سی پینے کے بعد ادھر ہی آتے ہیں تاکہ ان دونوں میں صلح صفائی کرائی جاسکے۔"

غزالہ بے چون وچرا کیے واپس چلی گئی اور ہم دونوں نے اپنے اپنے گلاس اٹھا لیے۔

○☆○

دیر سے کیے جانے والے مرغن اور ثقیل ناشتے نے ہم چاروں کو دوپہر کے کھانے کی ضرورت سے بے نیاز کردیا تھا۔ جب اشتہا انگیز کھانوں سے لدے ہوئے تھال لائے گئے تو میں نے انہیں جوں کا توں لوٹانا چاہا لیکن ویرا نے ایک تھال میں سے بھنے ہوئے گوشت کی قاب نکال لی۔ ریشے سے عاری' لذیذ اور گلے ہوئے گوشت نے ویرا کو پاگل کیا ہوا تھا۔ اس وقت تک وہ سلطان شاہ کو منا چکی تھی اس لیے اس نے اپنے ہاتھ سے گوشت کا ایک پارچہ اسے کھلایا پھر اس قاب کی مدد سے اپنی شراب کا نشہ دو آتشہ کرنے میں مصروف ہوگئی۔

اس دوران میں غزالہ اور سلطان شاہ کو شنگارا ویلی کے خطرناک حالات کے بارے میں بریف کیا جاچکا تھا اور سب ہی اس بارے میں فکر مند تھے۔ ہمیں یوں محسوس ہورہا تھا جیسے ہم چاروں کو شرف آباد والے فلیٹ سے اغوا کرنے کے بعد ایک ایسے آتش فشاں کے دہانے پر باندھ کر بٹھادیا گیا ہو جو کسی بھی لمحے پھٹنے والا تھا۔

شنگارا ویلی میں پائندہ گل کے خلاف جو سازش پروان چڑھ رہی تھی وہ اپنی نوعیت کے اعتبار سے حیران کن تھی۔ کسی بھی حکمران کے خلاف میدان میں اترنے کے لیے ضروری ہوتا ہے کہ سب سے پہلے متبادل قیادت کو سامنے لایا جائے اور لوگ اس کی ذات پر اعتماد کرتے ہوئے مخالف دھڑے کا ساتھ دینے کا فیصلہ کرلیں لیکن شنگارا ویلی میں معاملہ ہی بالکل الٹا تھا۔ گھنٹی والوں کی تحریک موجود تھی۔ وہ اہم مواقع پر فعال ہوکر سردار پائندہ گل کے وفاداروں کو چیلنج بھی کررہے تھے لیکن ان کے سربراہ کا کوئی پتا نہیں تھا۔ میں یہ بات سمجھنے سے قاصر تھا کہ متبادل قائد کے علاوہ' وہ کون سا عنصر تھا جس نے کچھ لوگوں کو پائندہ گل کے خلاف صف آرا ہونے پر آمادہ کرلیا تھا۔ بظاہر ایسا معلوم ہورہا تھا جیسے گھنٹیوں والے صرف پائندہ گل کو اکھاڑ پھینکنے میں دلچسپی رکھتے ہوں۔ اس کے بعد شنگارا ویلی کی حکمرانی جس کے بھی قبضے میں آئے' اس سے انہیں زیادہ دلچسپی نہیں تھی۔

آزاد فطرت اور روایت پرست قبائلیوں کا وہ رویّہ ہر اعتبار سے ناقابلِ فہم تھا۔ کسی قائد کے بغیر لوگوں کا بغاوت پر آمادہ ہونا اس کے لیے کسی بھی بہت بڑے خطرے کی نشان دہی کررہا تھا۔

لیکن وہ مسائل ان کے اپنے تھے۔ میرے لیے تشویش کی بات یہ تھی کہ ہم لوگ وہاں آکر پھنس چکے تھے سب سے امید افزا امکان وہی رہ گیا تھا جس کی نشان دہی خود سردار پائندہ گل نے کی تھی یعنی ہمارا اس کے مخالفین سے ہوجاتا اور پھر ہم ان سے ساز باز کرکے وہاں سے نکل بھاگنے کی کوشش کرتے۔ پائندہ گل ایک گرگِ باراں دیدہ تھا۔ وہ اچھی طرح جانتا تھا کہ اس کے مخالفین ہمیں شنگارا ویلی سے نکالنے کی کوشش کرسکتے ہیں اس لیے اس نے ہماری نقل وحرکت پر پابندی لگاکر ہمیں اسی کمرے تک محدود کردیا تھا۔ میری سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ پائندہ گل کے وفاداروں سے بھری ہوئی اس حویلی میں مخالف گروہ کا کوئی آدمی کس طرح داخل ہوسکے گا۔ ہماری آرزو اور گھنٹیوں والوں کی خواہش اپنی جگہ' لیکن بظاہر اس کے پورے ہونے کے آثار بہت موہوم اور تقریباً نہ ہونے کے برابر تھے۔

ہمارے پاس کوئی مصروفیت نہیں تھی اس لیے ہم تھوڑے تھوڑے وقفے سے اسی مسئلے پر سر کھپاتے رہے۔ باتوں کا ایک دور ختم ہوتا پھر کسی کو کوئی نئی بات سوجھتی اور دوبارہ پورے جوش وخروش سے بحث کا نیا سلسلہ چل پڑتا لیکن ہربار آخر میں ہم خود کو اسی بند دروازے کے سامنے پاتے جس میں ہم محصور تھے۔

باہر ہونے والی دھواں دھار بارش کا سلسلہ موقوف ہونے کے بعد وہاں تیز دھوپ بھی چمکنے لگی۔ باہر سے آنے والی روشنی سے ہمارے کمرے میں اس قدر اجالا پھیل گیا کہ مشعل کی روشنی قطعی غیر ضروری ہوکر رہ گئی اور ہم نے اسے گل کردیا۔ پھر وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ باہر شام کا دھندلکا پھیلنے لگا جو بہت تیزی کے ساتھ اندھیرے میں معدوم ہوتا چلا گیا۔ ویرا کے اشارے پر سلطان شاہ نے مشعلیں روشن کردیں۔

اندھیرا ہونے کے ساتھ ہی صندل خان ایک آدمی کے ساتھ ہمارے کمرے میں آموجود ہوا۔ اس کا ساتھی ایک ٹوکری چھوڑ کر

فوراً واپس لوٹ گیا۔ صندل خان نے آتے ہی زبانی گرم جوشی کا اظہار کیا۔ یہ دیگر بات ہے کہ اس نے ہم میں سے کسی سے ہاتھ ملانے کی ضرورت محسوس نہیں کی۔ میں فوراً ہی اسے لے کر ایک خالی تخت پر بیٹھ گیا۔ ویرا' غزالہ اور سلطان شاہ کے ساتھ الگ تخت پر بیٹھی رہی۔ اس نے اپنے سامنے مے نوشی کے لوازم سجائے ہوئے تھے اور وہ کسی بھی لمحے شام کا پہلا پیگ پینے کے موڈ میں نظر آرہی تھی۔

"آج خان بابا سے تمہاری ملاقات کیسی رہی؟" صندل خان نے سرسری لہجے میں پوچھا۔

"کابل کے سفر کا حکم ملا ہے۔ کیا اس نے تمہیں کچھ نہیں بتایا؟" میں نے جوابی سوال داغ دیا۔

"خان بابا کم گو آدمی ہے اور ہم اس کا بہت زیادہ احترام کرتے ہیں۔ جو کچھ اس نے کہا' وہ میں نے سن لیا مگر میں اس سے کوئی سوال نہیں کرسکتا تھا۔ مجھے اتنا معلوم ہے کہ تم کو دو تین دن بعد کابل روانہ ہونا ہے اور خان بابا نے تمہیں گھنٹی والوں کی بدمعاشی کے بارے میں بھی بتادیا ہے۔"

"ہاں!" میں نے اقرار کیا "اس میں کوئی راز کی بات نہیں تھی۔ میرا خیال ہے کہ تم لوگ اس بارے میں ضرورت سے زیادہ احتیاط سے کام لیتے رہے ہو۔ دھواں دھار فائرنگ سے ہی ظاہر ہوگیا تھا کہ وہ خان بابا کے دوست نہیں ہوسکتے۔ اب میرا ذہن بالکل صاف ہوگیا ہے۔ خان بابا نے اس بارے میں میرے سوال کا برا نہیں مانا تھا۔"

"خان بابا عظیم ہے۔ وہ پل بھر میں فیصلے کرنے کی صلاحیت رکھتا ہے۔ ہم تو اس کے حکم کے غلام ہیں" وہ ہنس کر بولا پھر اچانک ہی ویرا کی طرف متوجہ ہوگیا۔ "فرزانہ خانم! تم وہاں بیٹھ کر ان پارساؤں کا ایمان کیوں آزما رہی ہو۔ سارا سازوسامان لے کر ادھر ہی کیوں نہیں آجاتیں؟ میں بھی ٹوکری میں اپنا مال لے آیا ہوں۔ مل بیٹھ کر پینے میں کچھ عجیب ہی لطف آتا ہے۔"

"تم ٹھیک کہہ رہے ہو۔ ساتھ دینے والی ایک عورت بھی ہو تو بات ہی کچھ اور ہوتی ہے" میں نے سرہلاتے ہوئے کہا۔ "دنیا کے سارے ہی مرد پینے کے بعد ایک جیسی باتیں کرنے لگتے ہیں۔ ان میں دشمنوں کی سرکوبی اور عورتوں کی رنگین کہانیوں کے علاوہ کچھ بھی نہیں ہوتا۔"

"تم نے تجربے کی بات کی ہے۔ ہر شرابی اپنی کامرانیوں کے قصے سنانے پر اصرار کرتا ہے۔ اور شنگاری مرد تو خدا کی پناہ! میں ان سے بہت محبت کرتا ہوں۔ ان میں سے بہتیرے میرے بچپن کے ساتھی ہیں لیکن نشے کی حالت میں وہ کاٹھ کے الو کی طرح ٹھس ہوکر رہ جاتے ہیں۔ بولنا چالنا بھول کر' خالی خالی نظروں سے کسی ایک سمت میں دیکھنے لگتے ہیں اور پھر ادھر ہی دیکھتے رہتے ہیں۔ اپنی بات سنانے کے لیے عام طور پر انہیں جھنجوڑنا پڑتا ہے۔ راستے میں' میں نے زندگی میں پہلی بار کسی عورت کے ساتھ شراب پی تھی اور بخدا فرزانہ کے ساتھ پینے میں لطف آگیا تھا۔ تم لوگ چلے گئے تو میں ان محفلوں کو برسوں یاد رکھوں گا" وہ پینے سے پہلے ہی ترنگ میں آیا ہوا تھا۔

"ان حسرتوں سے بچنے کے لیے تمہیں دو کام کرنے ہوں گے" میں نے سنجیدگی سے کہا۔

"دو نہیں' تم چار کام بتاؤ" وہ متجسس انداز میں میری طرف جھک آیا۔

"تمہیں فرزانہ کے ساتھ مے نوشی میں لطف آتا ہے اس لیے ہم' تم دونوں کو یہاں چھوڑنے پر آمادہ ہیں۔ تم ہمارا بندوبست کسی اور کمرے میں کروادو۔" میں نے سنجیدگی برقرار رکھتے ہوئے کہا۔ "دوسرے مسئلے کا حل یہ ہے کہ جب ہم یہاں سے واپس لوٹیں تو تم فرزانہ کی ممی بنا کر اسے یہیں روک لینا..."

"ممی؟" صندل خان نے حیرت سے دہرایا "مگر کس کی ممی؟ شنگاری غیر قبیلے کی عورتوں سے شادی تو کرسکتے ہیں مگر انہیں یہاں نہیں رکھ سکتے۔ فرزانہ کو کون اپنے بچوں کی ممی بنائے گا؟"

سلطان شاہ کے حلق سے ایک بے ساختہ قہقہہ ابل پڑا اور وہ اپنی جگہ بیٹھے بیٹھے بولا "برادر صندل خان! تم واقعی پکے شنگاری ہو۔ کسی نے سچ کہا ہے کہ پٹھان کی کھوپڑی میں کوئی بات ایک بار گھس جائے تو اس کا باہر نکلنا مشکل ہوتا ہے۔ تم نے فرزانہ کو اپنی نہیں' کسی اور ہی کی بیوی بنانے کا منصوبہ بنالیا۔ ڈینی نے بچے پالنے والی ممی کا ذکر نہیں کیا تھا۔ وہ فرعونوں والی ممی کی بات کررہا تھا۔ تم فرزانہ کو مار کر مسالوں میں اس طرح جماسکتے ہو کہ یہ ہمیشہ اسی طرح تروتازہ نظر آئے گی۔ اسے دیکھتے دیکھتے اکتا جاؤ تو کسی گھائی میں لڑھکا دینا۔"

صندل خان نے خفت آمیز انداز میں زور زور سے ہنسنا شروع کردیا۔

ویرا ہمارے ساتھ ہی آبیٹھی۔ سلطان شاہ نے دوبارہ ہانک لگائی "فرزانہ بھی تھوڑی دیر پہلے تمہیں یاد کررہی تھی۔ شاید اسے تمہاری مردانگی پسند آگئی ہے۔ کئی بار تمہاری تعریف بھی کرچکی ہے۔"

اس وقت تک صندل خان' سلطان شاہ کا مذاق سمجھ چکا تھا۔ وہ بدستور ہنستے ہوئے بولا "اپنے لب ولہجے سے تو تم بھی پٹھان معلوم ہوتے ہو۔ کمال ہے کہ تم عورتوں سے بھی ایسا کھلا کھلا مذاق کرلیتے ہو۔"

"یہ بس چند گز کے فرق سے پٹھان ہوتے ہوتے رہ گیا" ویرا نے منہ بنا کر کہا "ہری پور کے علاقے سے ذرا آگے پیدا ہوا ہوتا تو یہ بھی تمہارے خان بابا کی طرح کڑک پٹھان ہوتا۔"

"خان بابا کا نام درمیان میں مت لاؤ" صندل خان یک بیک سنجیدہ ہوگیا "ہم لوگ اپنے سردار کے بارے میں ایسی باتیں

برداشت کرنے کے عادی نہیں ہیں۔ ہزار سلطان شاہ مل کر بھی ایک خان بابا کے برابر نہیں ہوسکتے۔"

"اوہ! تم برا مان گئے" ویرا جلدی سے بولی "میرا مطلب یہ نہیں تھا۔ میں آئندہ محتاط رہوں گی۔"

ویرا کے ایک غیر محتاط تبصرے کی وجہ سے خوشگوار فضا میں چند لمحوں کے لیے تناؤ پیدا ہوگیا۔ اس نے خاموشی کے ساتھ تینوں کے لیے گلاس تیار کیے اور خاموشی سے ہی پینے کی ابتدا ہوئی۔ میں نے اپنے اور ویرا کے لیے سگریٹ سلگائی تو صندل خان اچانک بول پڑا "تم نے اپنے ساتھ فرزانہ کو بھی سگریٹ پینی سکھادی ہے۔"

"اسے کوئی کچھ نہیں سکھاسکتا" میں نے ایک کش لے کر کہا۔ "میری اور اس کی ملاقات ہوئی تو یہ سگریٹ نوشی کی عادی تھی۔ شراب تو شاید اس نے پیدا ہوتے ہی پینی شروع کردی تھی۔"

"تمہیں اس کے بارے میں اس قدر مبالغہ نہیں کرنا چاہیے" صندل خان نے کہا۔

"ڈینی درست کہہ رہا ہے" ویرا نے فوراً میری حمایت کرتے ہوئے کہا "پیدائش کے فوراً بعد ہی مجھے برانڈی کے دو چمچے پلائے گئے تھے اور وہ میری پہلی غذا تھی۔ شاید میری وہ طلب آج تک اپنی جگہ برقرار ہے۔"

"یہ تمہارے حق میں اچھا ہی ہوا کہ صبغت اللہ چینغا سرائے سے واپس چلا گیا۔ وہ عورتوں سے بہت بدکتا ہے اور پھر فرزانہ کی شراب اور سگریٹ نوشی تو وہ بالکل بھی برداشت نہ کرتا" وہ بولا۔

"لیکن ہمیں اغوا کرنے والوں میں شاید وہی پیش پیش تھا؟" میں نے طنز سے کہا۔

"ہاں۔ وہ ہمارا پارٹی لیڈر تھا۔ اس کے چلے جانے کے بعد ہی میں نے معاملات سنبھالے تھے۔"

"اس کا جانا ہمارے ساتھ ساتھ تمہارے لیے بھی بہتر ثابت ہوا کہ تم کسی بدمزگی کے بغیر' ہمیں بہت کامیابی سے گالان کی بستی میں لے آئے پھر تمہیں فرزانہ جیسی شاندار عورت سے بھی دوستی کرنے کا موقع مل گیا۔"

اس نے فوراً ہی میری تصحیح کرنی ضروری سمجھی "نہیں' میری تم میں سے کسی کی دوستی نہیں ہے۔ بس تم واقفیت یا شناسائی کہہ سکتے ہو۔ دوستی یا دشمنی کا فیصلہ تمہاری کابل سے واپسی پر ہوگا۔"

"کیا یہ عجیب بات نہیں ہے کہ ہم پر دوستوں سے زیادہ مہربان ہو۔ ہمارے ساتھ گھل مل کر باتیں کرتے ہو لیکن دوستی سے انکاری ہو۔ ایک ساتھ کھانے پینے کے بعد دوستی میں کیا کمی رہ جاتی ہے؟" ویرا نے پوچھا۔

"شراب خانوں میں بہت سے لوگ جمع ہوکر شراب پیتے ہیں لیکن وہ ایک دوسرے کے دوست نہیں ہوتے۔"

"وہ اپنے اپنے پیسوں سے خرید کر پیتے ہیں۔ یہاں تو تم ہماری پُرتکلف میزبانی کررہے ہو۔"

"یہ ہماری روایت ہے۔ ہم اپنے دشمن کو بھی بھوکا نہیں مارتے۔ ابھی تک ہم تمہیں کھلا پلا رہے ہیں لیکن ہم نے تمہارا نمک تک نہیں چکھا ہے۔ یہی ہماری دوستی اور دشمنی کی کسوٹی ہے۔ خان بابا کی خواہش ہو تو ہم کتوں کے ساتھ بھی کھانا کھاسکتے ہیں۔ میں نے اس کھلی اجازت کی روشنی میں ہی تم کو چینغا سرائے میں اپنے دسترخوان میں شریک کیا تھا لیکن خان بابا نے تم سے ایک پیالی پانی کو بھی نہیں پوچھا ہوگا۔"

"ہاں' مجھے حیرت ہوئی تھی" میں نے کہا "تم نے راستے میں ہمیں حلق تک شراب پلائی تھی لیکن خان بابا نے مجھ سے جھوٹوں بھی نہ پوچھا حالانکہ وہ خود واڈکا پیتا رہا تھا اور وہاں بوتل بھی موجود تھی۔"

"بس' شنگارا دیلی کے سردار اور عام آدمی میں یہی فرق ہے۔" وہ بولا۔

"لیکن تم عام آدمی تو نہیں معلوم ہوتے" میں نے اس کی انا کو ابھارنے کے لیے کہا "خان بابا تم سے خلوت میں باتیں کررہا تھا۔ عام شنگاری تمہارا احترام کرتے ہیں۔ تم خان بابا کے مقربین میں سے معلوم ہوتے ہو۔"

"اس نے تم سے بھی خلوت میں باتیں کی تھیں" وہ مسکرا کر بولا "اپنے بارے میں کیا کہتے ہو؟"

"باتوں میں تم سے جیتنا بہت مشکل ہے" ویرا مسکراتی ہوئی نظروں سے اس کی طرف دیکھتے ہوئے بولی "یہ تو بتاؤ کہ ہم پر گھومنے پھرنے کی پابندی ہے لیکن کیا ایسا ہوسکتا ہے کہ تمہارے آدمیوں کی نگرانی میں ہمیں پورے گالان کی سیر کرادی جائے؟"

"گالان کی سیر؟" اس نے حیرت سے دہرایا "یہاں رکھا ہی کیا ہے جس کی سیر کروگی؟"

"حویلی سے پہلے نظر آنے والی آبادی بہت شاندار ہے۔ میرا خیال ہے کہ اس کا ہر مکان قابل دید ہوگا..."

"تم لوگ ادھر نہیں جاسکتے" صندل خان نے ویرا کی بات کاٹ کر کہا "گالان سردار کا رہائشی علاقہ ہے۔ وہ اپنے تمام لشکریوں اور جرگے کے ساتھ اس حویلی میں رہتا ہے اور اس کے سارے رشتے دار اس آبادی میں رہتے ہیں جس کا تم ذکر کررہی ہو۔ اس آبادی میں باہر والوں کا داخلہ منع ہے۔"

"بے پردگی کا معاملہ ہو تو تم صرف مجھے اور غزالہ کو وہاں لے جاسکتے ہو۔ مرد یہیں رہیں گے۔"

"باہر والی عورتیں بھی وہاں نہیں جاسکتیں۔ انہیں دیکھ کر گالان والیاں بگڑسکتی ہیں۔ تمہارے لباس' بال' چال ڈھال یا کسی بھی بات سے ان کے ذہنوں میں فتور پیدا ہوسکتا ہے۔ ہم لوگ اس برے وقت سے ڈرتے ہیں جب گالان والیاں رات کے اندھیرے میں اپنے مردوں کے کانوں میں انوکھی سرگوشیاں کرنے لگیں۔"

"آبادی نہ سہی۔ وہ اونٹ یا زرافہ کی گردن جیسی پہاڑی بھی

دیکھی جاسکتی ہے" ویرا مُصر رہی۔
"نادانی کی باتیں نہ کرو" وہ ہنس کر بولا "ادھر جانے کے نام سے شنگاری تک لرزہ براندام ہوجاتے ہیں۔ وہاں خان بابا کے خاص محافظ جاتے ہیں یا پھر وہ مجرم لے جائے جاتے ہیں جنہیں اس چوٹی سے درے میں گرا کر موت کی سزا دینی ہوتی ہے۔ وہ تفریح کا نہیں' دہشت اور عبرت کا مقام ہے۔"
"ہمیں اسی چھت کے نیچے اپنا وقت گزارنے کی عادت ڈالنی ہوگی" میں نے مایوسی سے کہا۔
"تمہیں نہیں' ان تینوں کو" صندل خان نے اپنے لبوں سے سگار ہٹا کر کہا "تمہارے لیے تو کابل کی کھلی فضائیں منتظر ہیں۔ وہاں لڑائی ضرور ہورہی ہے لیکن سنا ہے کہ بعض محفوظ علاقوں میں راتیں جاگتی ہیں۔"
"تمہیں معلوم ہے کہ مجھے کابل کیوں بھیجا جارہا ہے؟" میں نے اس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے سوال کیا۔
"یہ ایک کھلا ہوا راز ہے۔ خان بابا کو جنت گل کا سرور کار ہے۔ باہر آنے جانے والے ہر شنگاری کو یہ راز معلوم ہے لیکن کوئی اس بارے میں بات نہیں کرتا۔ میں بھی تم سے انجان بن جاتا لیکن مجھے معلوم ہوچکا ہے کہ خان بابا نے یہی مقصد حاصل کرنے کے لیے تم چاروں کو یہاں بلوایا ہے۔"
"مجھے کون بتاسکے گا کہ جنت گل کابل کے کس علاقے میں مل سکے گی؟" میں نے پوچھا۔
"خان بابا ہی کسی کو نامزد کرے گا۔ ویسے تو صبغت اللہ بھی آج شام ہی واپس آیا ہے۔ وہ جلال آباد میں اپنا کام پورا کرنے کے بعد کابل کی طرف نکل گیا تھا۔ اس کے پاس تازہ ترین اطلاعات ہوں گی۔"
میرے لیے وہ اطلاع تشویش انگیز تھی۔ اس وقت تک میں نے صبغت اللہ کو نہیں دیکھا تھا لیکن دورانِ سفر بدرو داوا کے ٹرانزٹ کیمپ میں صندل خان نے ہم سے نرم اور مفاہمانہ رویّہ اختیار کیا تھا۔ یہ اسی کا دم تھا کہ اس کے بعد سے ہمیں کوئی پریشانی نہیں اٹھانی پڑی تھی۔ ہم لوگ شنگاریوں کی قید میں ہوتے ہوئے بھی ہر قسم کی آسائشوں سے فیض یاب ہورہے تھے۔ اگر ہمیں صندل خان کی براہِ راست نگرانی سے نکال کر صبغت اللہ کے حوالے کردیا جاتا تو وہ ہمارے لیے بہت سے مصائب پیدا کرسکتا تھا۔
ہماری وہ محفل زیادہ دیر تک نہیں چل سکی کیونکہ اندھیرا گہرا ہونے کے ساتھ ہی رات کا کھانا آگیا۔ اس بار صندل خان ہمارے ساتھ کھانے میں شریک نہیں ہوا بلکہ الگ بیٹھا شراب پیتا رہا۔ اس دوران میں اس نے گھما پھرا کر کئی بار یہ جاننے کی کوشش کی کہ گھنٹیوں والوں کے بارے میں میرے اور سردار پائندہ گل کے درمیان کیا بات ہوئی تھی لیکن میں نے سردار پائندہ گل کی بتائی ہوئی حد سے ذرا بھی تجاوز نہیں کیا۔
صندل خان ہر معاملے میں خود کو اپنے سردار کا فرماں بردار ثابت کرتا چلا آیا تھا لیکن پائندہ گل کے باغیوں کے بارے میں اس کی غیر معمولی دلچسپی نے میرے دل میں شبہات پیدا کردیئے۔ مجھے یوں محسوس ہونے لگا جیسے وہ اپنے سردار کا معتمد ہونے کے ساتھ ساتھ باغیوں سے بھی ملا ہوا تھا اور ان کے مفادات کے تحفظ کے لیے مجھ سے یہ جاننا چاہ رہا تھا کہ پائندہ گل ان کی سرکوبی کے لیے کیا حکمتِ عملی اختیار کرنے والا تھا۔
ہم لوگ کھانے سے فارغ ہوگئے پھر بھی صندل خان کافی دیر تک ہمارے پاس بیٹھا اِدھر اُدھر کی ہانکتا رہا۔ ویرا اس کی توجہ کا خاص مرکز تھی۔ اس نے نچلی وادی میں پہنچنے کے بعد ویرا سے جس بے اعتنائی کا مظاہرہ کیا تھا وہ یکسر ختم ہوچکی تھی۔ میں نے یہ نتیجہ اخذ کیا کہ ویرا نے مردوں کو لبھانے اور رجھانے والی حرکتوں سے اس کے دل و دماغ پر قبضہ جمالیا تھا لیکن وہ دوسروں کے سامنے خود کو ویرا سے بے نیاز ظاہر کرنے کی کوشش کرتا رہا تھا۔ البتہ شراب کے خمار سے کھوپڑی گرم ہونے کے بعد وہ ساری احتیاط کو بالائے طاق رکھ کر بے تکلفی پر اتر آیا تھا۔ اس کی حوصلہ افزائی میں اس امر کا بھی خاصا دخل تھا کہ ہمارے اس کمرے میں صندل خان کے علاوہ کوئی دوسرا شنگاری نہیں تھا۔
صندل خان جھومتا اور لڑکھڑاتا ہوا اٹھا تو ایک طرف سے ویرا نے اسے سہارا دیا' دوسری طرف سے میں نے اس کا بوجھ سنبھالنے کی کوشش کی لیکن وہ بدمعاش مخمور ہونے کے باوجود اس قدر چالاک تھا کہ اس نے سارا زور ویرا پر ڈال کر اپنا بازو اس کے شانے پر رکھ لیا۔
ہم دونوں اسے لے کر بمشکل نکاسی کے دروازے تک ہی پہنچے ہوں گے کہ اچانک سامنے سے وحشت زدہ چہروں والے دو شنگاری ہمارے سامنے آگئے۔ انہوں نے جھک کر صندل خان کو تعظیم دی لیکن اسے اپنے گرد و پیش کا کچھ ہوش ہی نہیں تھا۔ ان دونوں نے ہمیں فارغ کرکے صندل خان کو اپنی تحویل میں لے لیا اور وہاں سے چلے گئے۔
"معلوم ہوتا ہے کہ کچھ نادیدہ موکھلوں یا سوراخوں سے اس کمرے کی نگرانی کی جارہی ہے" ویرا نے واپس لوٹتے ہوئے معنی خیز لہجے میں کہا "ایسا نہ ہوتا تو اچانک وہ شنگاری نہ آتے۔"
"نگرانی ہوتی ہے تو ہو' ہمیں فکر مند ہونے کی کیا ضرورت ہے؟ ہم یہاں کون سی گڑبڑ کررہے ہیں؟"
"ان سوراخوں سے ہماری آوازیں بھی سنی جاسکتی ہیں۔ ہمیں اہم باتوں کے لیے سرگوشیوں پر انحصار کرنا پڑے گا۔" وہ بولی "یہ بدماغ لوگ ہماری طرف سے بھڑک گئے تو انہیں سنبھالنا مشکل ہوجائے گا۔"
"احتیاط اپنی جگہ ہے لیکن نگرانی کرنے والے بالکل ہوش

ہیں۔ وہ اردو نہیں سمجھ سکیں گے۔"
"زیادہ اہم باتیں انگریزی میں بھی کی جاسکتی ہیں۔ مجھے پورا یقین ہے کہ یہاں دور دور تک کوئی انگریزی جاننے والا نہیں مل سکے گا" اس نے فوری خیال کے تحت پُرجوش لہجے میں کہا اور میں فوراً ہی اس کے مشورے کی افادیت کا قائل ہوگیا۔ انگریزی زبان ہمارے لیے بلاشبہ محفوظ ترین تھی۔
اس وقت سلطان شاہ نے میری توقع کے برعکس ویرا کو تنقید کا نشانہ نہیں بنایا۔ شاید اس نے سمجھ لیا تھا کہ ہماری ضروریات کے تقاضے کیا تھے۔ ویرا' صندل خان کے ساتھ جس آزادروی کا مظاہرہ کررہی تھی' وہ اس کے ماحول اور مزاج کے خلاف نہیں تھا۔ وہ مغرب کے آزاد معاشرے میں پلی بڑھی تھی۔ وہاں مرد و زن کے آزادانہ میل جول پر کوئی قدغن نہیں تھی۔ پھر صندل خان تو بس اس کے لمس ہی سے مدہوش ہوا جارہا تھا۔ اس بارے میں ویرا کو اپنے اوپر کوئی جبر نہیں کرنا پڑا تھا۔ ہاں' صندل خان کی توجہ اگر غزالہ کی طرف مبذول ہوجاتی تو نہ میں اسے حد سے تجاوز کرنے کی اجازت دیتا' نہ وہ اپنے بدن پر کسی اجنبی کے گھناؤنے ہاتھوں کا لمس برداشت کرپاتی۔ اس لیے جو کچھ ہورہا تھا' اس کی طرف سے آنکھیں بند کرلینا ہی سب سے بہتر تھا۔
شنگاریوں کو قدرت نے کشادہ قد و قامت سے نوازا تھا اور انہوں نے اپنے استعمال کی ہر چیز کا سائز ضرورت سے بڑا رکھا تھا۔ مجھے چیغا سرائے کے برآمدے میں پڑی ہوئی وہ دیو ہیکل چارپائیاں یاد تھیں جن پر بیک وقت دسیوں افراد آرام سے سو سکتے تھے۔ یہی صورت ہمارے بستروں کی تھی۔ کمرے میں موجود ہر تخت اس قدر بڑا تھا کہ ہم چاروں ہی بہت آرام سے ایک تخت پر سو سکتے تھے لیکن شنگاریوں نے ہمارے لیے چار تخت الگ الگ ڈالے ہوئے تھے اور ہر تخت آرام دہ بستر اور کمبلوں سے آراستہ تھا۔
سونے کا مرحلہ آیا تو میں نے تجویز پیش کی کہ ہم صرف دو تخت استعمال کریں تاکہ کسی ناگہانی مصیبت کی صورت میں آپس کا رابطہ برقرار رہے۔ الگ الگ سونے میں یہ خرابی تھی کہ کسی ایک پر کوئی آپڑتا تو دوسروں کو اس کے انجام کی بھنک بھی نہ مل پاتی۔
"یہ نہیں ہوسکتا" میری تجویز سنتے ہی ویرا سنک گئی "تم دونوں تو خیر میاں بیوی ہو۔ ایک تخت بلکہ ایک ہی بڑے کمبل میں لپٹ کر سوجاؤ گے۔ شاید تم خود بھی یہی چاہ رہے ہو۔ شراب اور مرغن غذاؤں کو کہیں نہ کہیں تو اثر دکھانا ہی ہے مگر یہ ناممکن ہے کہ میں سلطان شاہ کے ساتھ سوؤں..."
"میں لعنت بھیجتا ہوں تمہارے ساتھ سونے والے پر" سلطان شاہ نے بھڑک کر اس کی بات کاٹ دی "تمہارے ساتھ بستر کا اشتراک کرنے سے بہتر تو یہ ہوگا کہ میں کھلے آسمان کے نیچے کسی پتھریلی چٹان پر رات گزار دوں۔ میں تم پر بالکل بھروسا نہیں کرسکتا۔ تم نے آج دن بھر شراب نوشی کی ہے۔"
"اب تو روز ایسا ہی ہوگا" ویرا سینہ تان کر بولی "یہ کیسے ہوسکتا ہے کہ میں خان بابا کی طرف سے آنے والی بوتل کو خالی نہ کروں؟ ہم دونوں کا الگ الگ سونا ہی بہتر رہے گا۔"
"تم میری پوری بات سنے بغیر آپس میں الجھ رہے ہو" میں نے سختی سے کہا "میں نے یہ رائے خود غرضی کے تحت پیش نہیں کی تھی۔ تم غزالہ کے ساتھ سوؤگی۔ میں سلطان شاہ کے تخت پر رات بسر کروں گا۔ مردانہ اور زنانہ بستر الگ ہونے کے بعد کسی کو کوئی شکایت نہیں ہونی چاہیے۔"
وہ دونوں حیرت سے میری شکل دیکھنے لگے۔ انہیں یقین ہی نہیں آرہا تھا کہ میری تجویز اتنی سادہ اور سہل ہوسکتی ہے۔
"تم نے ہمارے اعتراض کے بعد قلابازی کھائی ہے" ویرا نے بے اعتباری سے کہا "ورنہ تم وہی سوچ رہے تھے جو میں نے سمجھا تھا۔ کئی راتوں کی بے آرامی کے بعد تمہیں اس طرح سوچنے کا پورا پورا حق ہے۔ تم شادی شدہ ہو اور تمہاری بیوی بھی یہاں موجود ہے۔"
"چپ رہو" میں نے اسے پھٹکار دیا "میں اس وقت بھولا ہوا تھا کہ میں شادی شدہ ہوں۔ ان نخروں میں پڑ کر ہم اپنی مٹی پلید کرالیں گے۔ تم دونوں کو تعصب اور تنگ نظری کو خیرباد کہنا ہوگا۔"
"میں نے تمہاری تجویز پر کوئی اعتراض نہیں کیا تھا" سلطان شاہ نے منہ لٹکا کر کہا "میں نے تو اس کی بات کا جواب دیا تھا۔ اسے میری بے عزتی کرنے کا کوئی حق نہیں ہے۔"
"اب چپ ہوجاؤ ورنہ میں اپنا سر پھوڑ لوں گا" میں نے غراتے ہوئے کہا "تم بھی اس سے کم نہیں ہو۔ میری سمجھ میں نہیں آتا کہ میں تمہیں کس طرح راہِ راست پر لاسکوں گا۔"
میرے مصنوعی تیور دیکھ کر ان دونوں نے چپ سادھ لی۔ غزالہ نے اندرونی تخت کا رخ کیا تو ویرا بھی اس کے پیچھے ہولی۔ میں نے کھڑکی والی دیوار کے ساتھ بچھے ہوئے تخت کا انتخاب کرلیا۔
سلطان شاہ نے کمرے میں ایک مشعل روشن رہنے دی تو غزالہ نے اعتراض جڑ دیا۔ اس کا کہنا تھا کہ مشعل کی چراند اور روشنی میں وہ ایک پل بھی نہیں سوسکے گی۔ اس کی فرمائش پر کمرے میں مکمل اندھیرا کردیا گیا اور سلطان شاہ کھڑکی سے آنے والی ہلکی ہلکی روشنی کے سہارے میرے تخت پر آگیا۔
میں تخت پر چت لیٹا ہوا' اپنے خیالوں میں گم تھا۔ سلطان شاہ کچھ دیر تک بے چینی سے کروٹیں بدلتا رہا پھر میرے کان کے نیچے منمنایا "تم نے غزالہ کو ویرا کے ساتھ سلا کر بہت عقل مندی کی ہے۔"
"تم کیوں بھول رہے ہو کہ وہ ویرا نہیں' فرزانہ ہے" میں نے پھاڑ کھانے والے لہجے میں آہستہ سے کہا "جو منہ میں آتا ہے وہ بکتے چلے جاتے ہو۔ کبھی تو اپنی عقل پر بھی تھوڑا سا زور دے لیا

کرو۔"

"میں مانتا ہوں کہ کبھی کبھی مجھ سے غلطی ہو جاتی ہے لیکن جب سے ہم گالان پہنچے ہیں' تم بہت چڑچڑے ہو گئے ہو۔ اس وقت تم مجھے آرام سے بھی سمجھا سکتے تھے" اس نے شکوہ کیا۔

"میں ساری عمر تمہیں سمجھاتا اور سکھاتا رہوں گا۔ تم اپنی عقل سے کب کام لینا شروع کرو گے؟"

"آئندہ میں محتاط رہوں گا۔ تمہارا یہ زہریلا لہجہ مجھے کسی دن خون کے آنسو رلا دے گا" اس کی آواز دل گرفتہ ہو گئی تھی لیکن مجھے اس پر ذرا بھی ترس نہیں آیا۔ غلطی کرنے کے بعد خود پر مظلومیت طاری کرنے کی عادت میرے لیے کبھی بھی قابلِ برداشت نہیں رہی تھی۔

میں کافی دیر تک منتظر رہا کہ وہ میری عقل مندی کی وضاحت کرے لیکن وہ اپنی جگہ پر خاموش اور بے سدھ پڑا رہا۔ تنگ آ کر میں نے اسے جھنجھوڑ ڈالا "کب بتاؤ گے کہ میں نے کیا عقل مندی کی ہے؟"

"اس وقت تم چڑچڑے ہو رہے ہو۔ تم سے بات کرنی بے کار ہے" اس کی آواز بھاری تھی۔

"میرا غصہ وقتی ہوتا ہے" میں نے بمشکل خود پر قابو پاتے ہوئے کہا "جلدی بتاؤ کہ تم کیا کہہ رہے تھے؟"

"غزالہ' فرزانہ کا خیال رکھے گی۔ اگر وہ الگ سوتی تو رات میں صندل خان بہت خاموشی سے اسے اٹھوا سکتا تھا۔" اس نے گہری سنجیدگی کے ساتھ کہا "موقع ملا تو میں غزالہ کو بھی ہوشیار کر دوں گا۔"

اس بار مجھے اپنا غصہ پینا پڑ گیا۔ میرے لیے ویرا ایک عذاب بن کر رہ گئی تھی۔ ایک طرف صندل خان اس پر مرا جا رہا تھا تو دوسری طرف سلطان شاہ بھی اس سے بے پناہ نفرت جتانے کے باوجود اسی کی فکر میں گھلا جا رہا تھا اور وہ اطمینان سے اپنے بستر پر دراز تھی۔

میں نے انتہائی تحمل سے کام لیتے ہوئے کہا "غزالہ کو پریشان کرنے کی ضرورت نہیں' تم بھی آرام سے سو جاؤ۔ میں فرزانہ کی نگرانی کرتا رہوں گا۔ صندل خان کو ایسی حرکت کرنی ہوتی تو کل رات وہ وادی میں خود مختار تھا۔ گالان میں خان بابا سے قریب رہتے ہوئے وہ ایسی کوئی حرکت نہیں کرے گا۔"

اس کے بعد وہ خاموش ہو گیا۔ ویرا اور غزالہ کی جانب سے کچھ دیر تک دبی دبی سرگوشیاں سنائی دیتی رہیں۔ آخر کار اُدھر بھی سکوت طاری ہو گیا۔ کافی دیر گزرنے کے بعد میں نے ہولے سے سلطان شاہ کو پکارا لیکن کہیں سے کوئی جواب نہ آیا۔ وہ تینوں گہری نیند سو چکے تھے۔ اس وقت تک فضا میں خاصی خنکی ہو چلی تھی۔ میں نے سر سے پیر تک دبیز اونی کمبل تان کر آنکھیں موند لیں کیونکہ مجھ پر بھی نیند کا غلبہ ہو چلا تھا۔

میں کب تک سویا اور کتنی دیر تک سوتا رہا' اس بارے میں مجھے کوئی اندازہ نہیں ہو سکا۔ بس دم گھٹنے کے اذیت ناک احساس سے میں ہڑبڑا کر بیدار ہو گیا۔ بیدار ہوتے ہی مجھے معلوم ہو گیا کہ وہ میرا وہم نہیں تھا بلکہ میرے منہ پر ایک بڑا سا ہاتھ پوری طاقت کے ساتھ جما ہوا تھا۔ میرے دونوں ہاتھ غیر ارادی طور پر اپنے دہانے کی طرف گئے تو میں نے بڑے بڑے بالوں سے بھری ہوئی ایک چوڑی کلائی کو اپنی گرفت میں پایا۔

"شور مت کرنا۔ ہم تمہارے دوست ہیں۔ گھنٹیوں والے!" میرے کان میں ایک خفیف اور نامانوس سی بھنبھناہٹ گونجی اور میرے رونگٹے کھڑے ہو گئے۔ میرے اندازے کے عین مطابق ان لوگوں نے مجھ تک پہنچنے میں حیرت ناک سرعت سے کام لیا تھا۔ وہ سردار پائندہ گل کے باغی تھے۔ سردار کو ان کا کوئی نام و نشان نہیں مل رہا تھا لیکن اس کی اپنی چھت کے نیچے ایک باغی مجھ تک پہنچنے میں کامیاب ہو گیا تھا۔

مجھے نہایت بھونڈے انداز میں گہری نیند سے بیدار کیا گیا تھا مگر وہ صورتِ حال اس قدر لرزہ خیز تھی کہ میرے ذہن نے فوراً ہی بہت تیزی کے ساتھ کام کرنا شروع کر دیا۔

اگر وہ واقعی گھنٹی والوں کا آدمی تھا تو ہمارے لیے نجات کی راہ پیدا ہونے کا امکان سامنے آ سکتا تھا لیکن وہ سردار پائندہ گل کی کوئی چال بھی ہو سکتی تھی۔ اگر وہ اس طرح میرا امتحان لینا چاہ رہا تھا تو اس شخص سے تعاون پر آمادگی کا نتیجہ ہم سب کے لیے تباہ کن ہو سکتا تھا۔

وہ پوری قوت سے میرا دہانہ بند کیے' میرے کسی جوابی ردِ عمل کا منتظر تھا۔ غلط فیصلہ یا میرا غلط جواب اسی لمحے ہماری تقدیروں کے فیصلے کر سکتا تھا۔ میرے پاس بالکل بھی وقت نہیں تھا۔ میں نے ایک سیکنڈ کے ہزارویں حصے میں ان امکانات کا تجزیہ کیا اور پھر اپنے سر کو اثبات میں ہلا دیا۔

میرے دہانے کو اس وحشیانہ گرفت سے فوراً ہی آزادی مل گئی۔ میں نے چند گہرے گہرے سانس لیے تو مجھے اپنی سانسوں کی آواز اس کمرے میں گونجتی ہوئی محسوس ہوئی۔ کمرے میں گہرا سکوت طاری تھا۔ وہ تینوں بے خبر سو رہے تھے۔

"بستر چھوڑ کر بے آواز قدموں سے میرے پیچھے چلے آؤ" گرم گرم سانسوں کے لمس کے ساتھ میرے بائیں کان میں وہی بھنبھناہٹ سنائی دی "یہاں کا چپہ چپہ میرا دیکھا بھالا ہے۔"

تخت پر سے اٹھتے ہوئے میرے دل میں خیال آیا کہ میں کہنی مار کر سلطان شاہ کی نیند خراب کر دوں لیکن میں نے وہ ارادہ فوراً ہی مسترد کر دیا۔ سلطان شاہ بوکھلاہٹ میں غیر ضروری آوازیں نکال کر پورا کھیل خراب کر سکتا تھا۔ میں نے اس پُراسرار اجنبی کی بات مان کر جو سنگین خطرہ مول لیا تھا' اسے آخری نتیجے تک پہنچانے کے لیے ضروری تھا کہ کسی مداخلت کے بغیر اسے اپنی کارروائی مکمل کرنے کا موقع دیا جائے۔ آخر میں جو کچھ بھی سامنے آتا' اس کی روشنی میں' میں کوئی بھی ہنگامی فیصلہ کر سکتا تھا۔

میں تخت سے نیچے اترا تو میرا دل کنپٹیوں میں دھڑکتا ہوا محسوس ہو رہا تھا اور موسم میں خنکی ہونے کے باوجود میرے بدن کے مساموں سے پسینہ پھوٹ پڑا تھا۔ میرے لیے سب سے زیادہ پریشان کن بات یہ تھی کہ ان نازک لمحات میں' ہتھیار کے نام پر میرے پاس ایک پرانا بلیڈ تک نہیں تھا جب کہ میں ہر طرف سے دشمن کی بھاری' مسلح اور خون آشام نفری میں گھرا ہوا تھا۔ میری یا پُراسرار اجنبی کی کسی بھی آہٹ یا لغزش کے نتیجے میں وہ خوابناک ماحول بگڑتا تو در و دیوار سے نکلنے والے خونخوار شنگاری مجھے لمحہ بھر میں ٹھکانے لگا سکتے تھے۔

اس کمرے کے دروازے سے باہر قدم رکھتے ہوئے میں خوف زدہ تھا۔ مجھے ڈر تھا کہ کہیں خفیہ سوراخوں سے نگرانی کرنے والے اچانک سامنے نہ آ جائیں لیکن وہ بھی شاید سوئے ہوئے تھے۔ میں اس دیو قامت سائے کے پیچھے راہداری میں نکل آیا مگر کہیں سے کوئی نمودار نہیں ہوا۔ ہر طرف موت کا سا سناٹا طاری تھا۔

ہمارے کمرے میں کھڑکی ہونے کی وجہ سے باہر سے تھوڑی بہت روشنی اندر آ رہی تھی لیکن راہ داری میں آسیبی سناٹے کے ساتھ ہی پُرہول اندھیرا بھی پھیلا ہوا تھا جس میں اس آدمی کا ہیولا ایک تاریک تر دھبے کی صورت میں متحرک نظر آ رہا تھا۔ میں اس پر نظریں جمائے' چند قدم کے فاصلے سے پنجوں کے بل اس کے پیچھے چل رہا تھا۔ اچانک وہ ایک جگہ بائیں طرف گھوما اور اندھیرے میں تحلیل ہو گیا۔ لمحہ بھر کے لیے میں چکرا کر رہ گیا۔ اسے شاید میرے ردِ عمل کا اندازہ تھا۔ وہ ایک مرتبہ پھر نظر آیا پھر دوبارہ غائب ہو گیا۔ اس بار میں بڑھ کر اس مقام پر پہنچا تو مجھے بائیں طرف ایک خلا نظر آیا اور میں گھوم کر اسی میں داخل ہو گیا۔

وہ ایک تنگ سی کوٹھری تھی۔ وہ آگے کسی چیز پر جھکا ہوا کام کر رہا تھا۔ پھر اس نے بغیر کوئی آواز پیدا کیے ایک دروازہ کھول دیا جو اس تنگ کوٹھری کو کسی اور حصے سے ملاتا تھا۔ دروازہ کھلتے ہی دوسری طرف سے حبس اور سیلن کا ایک تیز بھبکا آیا مگر وہ کوئی تردد کیے بغیر دروازے میں داخل ہو گیا۔ میں اس کے پیچھے تھا۔

اس دروازے سے گزرنے کے بعد میں نے خود کو ایک اور بڑے کمرے میں پایا۔ اندھیرے کی وجہ سے اس کی وسعت کا اندازہ نہیں ہو سکا لیکن وہ اتنا بڑا ضرور تھا کہ اس کی آخری دیواریں نظر نہیں آ رہی تھیں۔ مجھے لانے والے نے میرے آنے کے بعد کوٹھری کا دروازہ احتیاط سے بند کر دیا۔

میں اپنے گرد و پیش کے جائزے میں ہی مصروف تھا کہ اچانک کہیں سے ایک نقاب پوش میرے سامنے آ کھڑا ہوا۔ اس کے بھاری بھرکم وجود پر شنگاریوں جیسا لباس تھا۔ ہاتھ میں میگزین چڑھی ہوئی کلاشنکوف دبی ہوئی تھی لیکن اس کے چہرے پر سیاہ رنگ کا ایک چست نقاب چڑھا ہوا تھا۔

"مجھے یہ دیکھ کر خوشی ہوئی کہ تم کسی مزاحمت کے بغیر یہاں آنے پر آمادہ ہو گئے۔" نقاب پوش نے سکوت توڑتے ہوئے بھرائی ہوئی آواز میں کہا تو صاف ظاہر ہو رہا تھا کہ وہ اپنی آواز بدلنے کی کوشش کر رہا تھا۔ اس کا ایک ہی مطلب تھا کہ اسے میری جانب سے پہچان لیے جانے کا خدشہ تھا۔ جب کہ میں اردو جاننے والے گنے چُنے شنگاریوں سے ہی واقف تھا۔ میں نے فوری طور پر یہ اندازہ لگانے کی کوشش شروع کر دی کہ وہ میرے دیکھے ہوئے شنگاریوں میں سے کون ہو سکتا ہے۔ گہرے اندھیرے کی وجہ سے مجھے صرف یہ معلوم ہو سکا تھا کہ وہ خاصا تنومند اور دراز قامت تھا اور یہ خواص کم و بیش پورے قبیلے میں مشترک تھے۔

"مجھے اس طرح یہاں کیوں لایا گیا ہے؟" میں نے دھیمی آواز میں پوچھا۔ "سردار پائندہ گل کو اس ملاقات کا علم ہو گیا تو وہ مجھے زندہ نہیں چھوڑے گا۔ تمہیں علم ہو گا کہ میں اس کا قیدی ہوں۔"

وہ میرا ہاتھ تھام کر اُس تاریک کمرے کے دور افتادہ حصہ کی طرف چل دیا۔ اس کے سخت اور کھردرے ہاتھ کی گرفت دوستانہ تھی۔ چلتے چلتے وہ کہنے لگا۔ "پائندہ گل کا خوف اپنے سر سے اتار دو۔ اب وہ مردار خور گدھ سے زیادہ حیثیت نہیں رکھتا۔ وہ ہمیں پوری وادی میں ڈھونڈتا پھر رہا ہے لیکن تم دیکھ لو کہ میں اس کی چھت کے نیچے موجود ہوں اور اس کے فرشتوں کو بھی میری یہاں موجودگی کا علم نہیں ہے۔"

"تم کون ہو اور مجھ سے کیا چاہتے ہو؟" میں نے پوری احتیاط سے کام لیتے ہوئے پوچھا۔

"گھنٹیوں والے میرے آدمی ہیں۔ انہوں نے گالان کی اس حویلی میں چھپے ہوئے بوڑھے گدھ کا سکھ اور چین برباد کر دیا ہے۔ وہ میرے ایک اشارے کے منتظر ہیں لیکن میں بڑی خونریزی سے بچنا چاہتا ہوں۔ عید قریب ہے۔ جب وہ نیچے وادی میں ہونے والے میلے میں آئے گا تو اس کی گردن اتار کر نیزوں پر ٹانگ دی جائے گی۔ لیکن تم ہمارا ساتھ دو تو یہ بڑا کام عید سے پہلے بھی پورا ہو سکتا ہے۔ اس زرخیز وادی کو اب پائندہ گل کے عذاب سے نجات ملنی چاہیے۔ وہ یہاں پیدا ہونے والی افیم سے ہیروئن بنا کر کروڑوں کا غبن کر رہا ہے۔ اس بھاری آمدنی سے شنگاریوں کو ذرا بھی فیض نہیں پہنچ رہا ہے۔ بس وہ اپنے خوشامدی کتوں کو نوازتا رہتا ہے۔"

ان پہاڑوں میں بھی اقتدار کی وہی جنگ چلتی ہوئی نظر آ رہی تھی جو باہر کی دنیا میں بہت سے ملکوں کو اپنی لپیٹ میں لیے ہوئے تھی۔ حکمرانوں کا حریف انہیں بددیانت اور غاصب قرار دے کر' خود اختیاری کا طالب تھا۔ فرق صرف اتنا تھا کہ ہر مہذب ملک میں جائز وسائل کی لوٹ کھسوٹ پر اجارہ داری کا جھگڑا تھا اور اس وادی میں ہیروئن کی اندھی آمدنی نے نفرتوں کے بیج بو دیے تھے۔

"میں بار بار یہی پوچھ رہا ہوں کہ تم مجھ سے کیا چاہتے ہو؟" میں نے اس سے کہا۔

"تم جنت گل کی تلاش میں کابل جانے کے بجائے' یہاں سے

فرار ہو جاؤ۔" اس نے کافی دور نکل آنے کے بعد ایک جگہ رک کر آہستگی سے کہا۔ "پائندہ گل نے قسم کھائی ہے کہ وہ جب تک اپنے بدمعاش بھانجے کے قاتل کو سزا نہیں دے گا' گوشہ نشینی سے نکل کر اپنے اختیارات استعمال نہیں کرے گا۔ میں چاہتا ہوں کہ تم اس کا ساتھ نہ دو۔ وہ اپنے ڈیرے میں بند رہے اور ہم ہتھیار لے کر نکل پڑیں۔ مجھے یقین ہے کہ ہم وادی کو اس کے ظلم سے نجات دلانے میں کامیاب ہو جائیں گے۔ اور وہ ذلت کی موت مارا جائے گا۔" "میں ان پہاڑوں میں اجنبی ہوں۔ مجھے بہت سوچ سمجھ کر فیصلہ کرنا ہوگا۔"

"وہ جنت گل کو موت کی سزا دینے میں کامیاب ہو گیا تو شنگارا ویلی کی آدھی سے زیادہ جوان اور بوڑھی عورتوں کے سر مونڈ کر چالیس دن کے لیے ان کی چھاتیاں برہنہ کرا دی جائیں گی۔" وہ پُرجوش مگر دھیمے لہجے میں کہنے لگا۔ "اس دہشت نے پوری وادی میں اندر ہی اندر اضطراب کی لہر دوڑا دی ہے۔ عبدالرحیم خان کا پائندہ گل کے علاوہ اور کوئی مرد وارث نہیں ہے۔ سب کو یقین تھا کہ پائندہ گل کی بوڑھی ہڈیاں سیکڑوں میل دور چھپے ہوئے قاتل سے انتقام لینے کے قابل نہیں ہیں۔ اس لیے بے شمار عورتیں عبدالرحیم خان کی میت پر اپنے بال کھول کر گریہ و ماتم کرتی رہی تھیں۔ اب ان سب کی عزت خطرے میں ہے۔ جن عورتوں کے ناخن بھی نامحرموں کی نگاہوں سے محفوظ تھے' انہیں چالیس دن تک اپنی چھاتیاں برہنہ کرکے بستیوں کی خاک چھاننی ہوگی۔ وہ وقت آنے سے پہلے ہی جانے کتنے غیرت مند شنگاری اپنے ہاتھوں سے اپنی عورتوں' ماؤں اور بچیوں کو موت کے گھاٹ اتار دیں گے۔ اس وادی میں بچے جننے والیوں کا کال پڑ جائے گا اور پھر باہر سے لائی جانے والی عورتوں کے بوجھ سے یہ چٹانیں رو پڑیں گی۔ شنگارا ویلی کو اس تباہی سے بچانے کے لیے ہم نے اپنی سرگرمیاں تیز کردی ہیں۔ ہم کامیاب ہوگئے تو تم کو بھی فوراً آزادی مل جائے گی ورنہ پائندہ گل نے تمہیں کابل بھیج کر تمہارے ساتھیوں کو یرغمال بنانے کا فیصلہ کرلیا ہے۔ ہمارا ساتھ دے کر تم خسارے میں نہیں رہو گے۔ یہ میرا وعدہ ہے اور شنگاری اپنے قول کے دھنی ہوتے ہیں۔"

وہ جو کچھ کہہ رہا تھا' درست کہہ رہا تھا۔ سردار پائندہ گل نے بھی مجھ سے اپنے ان ہی عزائم کا ذکر کیا تھا۔ ان میں کوئی مبالغہ نہیں تھا۔ پائندہ گل نے جب مجھ سے وہ باتیں کیں تو وہ بہت مظلوم اور دل گرفتہ نظر آرہا تھا لیکن وہی باتیں اس نقاب پوش نے دہرائیں تو پائندہ گل یک بیک' ایک خود غرض درندہ معلوم ہونے لگا تھا۔ "تم نے مجھے یہاں تک بلوایا ہے تو اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ تمہارے ہاتھ بہت لمبے ہیں۔" میں نے تفکر آمیز لہجے میں کہا۔ "فی الحال میں تمہاری پیشکش پر غور کروں گا۔ فرض کرو کہ میں تمہارا ساتھ نہیں دیتا تو تم ہم لوگوں کے ساتھ کیا سلوک کرو گے؟"

"وہی جو پائندہ گل اور اس کے حامیوں کے ساتھ کریں گے۔" اس نے بلاتوقف جواب دیا۔ "ہم کسی قیمت پر تم کو کابل نہیں جانے دیں گے۔ ہو سکتا ہے کہ راستے میں ہی تمہارا کام تمام کردیا جائے۔"

"یا پھر ہمیں کسی بھی وقت خاموشی سے ٹھکانے لگا دیا جائے؟" میں نے پوچھا۔

"ہم بزدلی کے کام نہیں کرتے۔ چھپ کر وار کرنا ہماری سرشت میں ہی نہیں ہے۔" اس کا لہجہ قدرے تیز ہوگیا۔ "ہم اپنے دشمن کو للکار کر اس پر سامنے سے وار کرتے ہیں۔ نتیجہ کچھ بھی نکلے' ہماری دلیری اور بے خوفی پر حرف نہیں آتا۔ اس بارے میں تمہیں فکرمند نہیں ہونا چاہیے۔ جب طبل بجے گا اور ہم آگ برساتے ہوئے اس حویلی میں گھسیں گے تو ہماری راہ میں آنے والا ہر شخص بھون دیا جائے گا۔ تمہارا حشر ان ہی کے ساتھ ہوگا۔"

"مجھے کل تک کی مہلت درکار ہے۔ میں اپنے ساتھیوں سے مشورہ کرکے ہی کوئی فیصلہ کرسکوں گا۔"

"ٹھیک ہے۔ میں اتنا انتظار کرسکتا ہوں مگر فیصلہ کرتے ہوئے یہ یاد رکھنا کہ میرا دوستی کا ہاتھ ٹھکرانے کے بعد تمہیں شنگارا ویلی کی زمین پر کہیں امان نہیں مل سکے گی۔" اس نے سختی سے کہا۔

"میں یہ بات اچھی طرح سمجھ چکا ہوں۔ کیا تم مجھے اپنی صورت نہیں دکھاؤ گے؟"

"ابھی اس کا وقت نہیں آیا۔" وہ سرسری لہجے میں کہتے کہتے ایک دم چونک کر بدلے ہوئے لہجے میں بولا۔ "یہ تو بتاؤ کہ جنت گل اپنے اور تمہارے بارے میں جو کہانی سناتی پھر رہی ہے اس میں کتنی صداقت ہے؟"

"کون سی کہانی؟" میں نے انجان بن کر پوچھا۔ "میری اس سے بہت سی باتیں ہوئی تھیں۔"

"صرف باتیں نہیں' وہ مرد اور عورت کے ازلی تعلق کی باتیں کررہی ہے۔ کیا یہاں لائے جانے سے پہلے بھی تم پائندہ گل یا عبدالرحیم خان کے یرغمالی رہ چکے ہو؟" وہ بہت زیادہ متجسس ہو چکا تھا۔ "دونوں باتیں درست ہیں۔" میں نے ہولے سے کہا۔ "شاید یہی بات پائندہ گل کو ڈس رہی ہے کہ جنت گل نے مجھ کو اپنے وجود کی خوشبو سے روشناس کیوں کیا۔ یہ اس کی مرضی تھی اور تم جانتے ہو کہ جب جنت گل جیسی عورت پیش قدمی کرنے پر تل جائے تو دنیا کا کوئی مرد مقابلہ پر نہیں رک سکتا۔ شاید تمہیں جنت گل اور پائندہ گل کے رشتے کے بارے میں تو معلوم ہی ہوگا۔"

"مجھے سب معلوم ہے لیکن ہم لوگ کیچڑ میں سنگ باری نہیں کرتے۔ چھینٹوں سے اپنا دامن بھی داغ دار ہونے کا ڈر لگا رہتا ہے۔ شہروں کی خاک چھاننے والے مرد کہیں نہ کہیں ڈگمگا ہی جاتے ہیں۔ یہ پائندہ گل کا ایسا قصور نہیں ہے کہ اسے بستیوں میں بدنام کیا جائے۔ اس کی لڑکی نسل کے ساتھ مزاج کے اعتبار سے بھی حرام زادی ہے ورنہ کون اپنے گندے نسب کو بازاروں میں اچھالتا پھرتا ہے؟ سرداری کا جھگڑا نمٹ جائے پھر میں خود ہی اسے سزا دوں گا۔ جنت گل نے ایک یرغمالی کے بستر پر جاکر سارے شنگاریوں کے منہ پر تھوکا ہے۔ یہ صرف پائندہ گل کا معاملہ نہیں

"تمہیں معلوم ہونا چاہیے کہ میں نے اس پر جبر نہیں کیا تھا۔" اس کے تیور دیکھتے ہوئے' میں نے فوراً اپنی صفائی میں پرانی کہانی دہرانی ضروری سمجھتے ہوئے کہا۔ "اس نے میرے ساتھ زبردستی کی تھی۔"

"تمہارے بتائے بغیر بھی یہ اندازہ ہوجاتا ہے۔ زبردستی کا نشانہ بننے والی عورتیں عزت کے خوف سے خاموش رہتی ہیں یا پھر کسی شہ زور سے فریاد کرتی ہیں لیکن وہ تو خود اپنی کہانی سناتی پھر رہی ہے۔ اسی سے ظاہر ہوتا ہے کہ اس کے ساتھ جو کچھ ہوا' اس کی مرضی سے ہوا۔ جب سے طفیم خان لنگڑا ہوا ہے' وہ بالکل ہی بے حجاب اور بے لگام ہوگئی ہے۔ اب اس بے شرم لڑکی کی بات مت کرو۔ وہ پائندہ گل کے ہاتھوں اس جرم میں نہیں ماری جائے گی کہ وہ عبدالرحیم خان کی قاتل ہے اب میں اسے ماروں گا کہ اس نے ایک قیدی کے ساتھ اپنا منہ کالا کیا تھا۔"

"کیا اب میں واپس جاسکتا ہوں؟" میں نے جھجکتے ہوئے سوال کیا۔

"اکیلے لوٹے تو مارے جاؤ گے۔ میرا آدمی تمہارے ساتھ جائے گا۔" یہ کہہ کر اس نے اپنے دہانے سے جھینگر کی ہلکی سی آواز نکالی اور اپنی بات جاری رکھتے ہوئے بولا۔ "میں نے تمہیں سوچنے کے لیے کل تک کا وقت دیا ہے۔ اب میری تم سے ملاقات نہیں ہوگی۔ تمہارا فیصلہ کل رات کے کھانے کے وقت مجھ تک پہنچ جائے گا۔ تمہیں میری تجویز منظور ہو تو بڑی قاب خالی کرکے تھال میں اوندھی کردینا۔ یہ نشانی نہ ہوئی تو تم پائندہ گل کے ہم نوا سمجھے جاؤ گے۔"

اس اثنا میں اس کا آدمی میرے قریب آکر خاموشی سے کھڑا ہوگیا تھا۔

"تو کیا کھانا لانے والوں میں بھی تمہارے وفادار موجود ہیں۔" میں اضطراری لہجے میں پوچھ بیٹھا۔

"غیر ضروری سوال مت کرو۔" وہ غرایا۔ "میری کچھ نہ کچھ بنیاد ہے جس کے زور پر میں نے پائندہ گل کو مار گرانے کا بیڑا اٹھایا ہوا ہے۔ میرے لیے کون کون کام کررہا ہے' تمہیں اس سے کوئی غرض نہیں ہونی چاہیے۔ تم بس وہ کرو جو میں نے تمہیں بتایا ہے۔ اس سے آگے دیکھنا میرا کام ہے۔"

یہ کہہ کر وہ اندھیرے کمرے میں اندر کی طرف بڑھتا چلا گیا اور دوسرا آدمی مجھے اپنے ساتھ لے کر واپس اسی دروازے کی طرف چل دیا' جدھر سے ہم داخل ہوئے تھے۔

کوٹھڑی کا دروازہ کھول کر اس نے بہت احتیاط سے باہر کی سن گن لی پھر پہلے مجھے باہر نکال دیا۔ دروازہ بند کرنے کے بعد وہ راہداری میں ہولیا۔ وہاں بدستور تاریکی اور سناٹے کی حکمرانی تھی۔ یوں معلوم ہو رہا تھا جیسے اس حصہ میں رہنے والے شنگاری افیم کھا کر گہری نیند سوئے ہوئے ہوں۔

اس نے مجھے بحفاظت میرے کمرے میں پہنچا دیا اور خود دروازے سے ہی ایک طرف غائب ہوگیا۔ تاریک کمرے میں وہ تینوں بدستور گہری نیند سوئے ہوئے تھے۔ میں خاموشی کے ساتھ سلطان شاہ کے برابر میں اپنی جگہ پر دراز ہوگیا مگر میری نیند اچاٹ ہوچکی تھی۔ مجھے رہ رہ کر اس آدمی کی صورت یاد آرہی تھی جو مجھے نقاب پوش تک لے گیا تھا۔

سردار پائندہ گل کا معاملہ ابتدا ہی سے کچھ اوٹ پٹانگ انداز میں سامنے آیا تھا۔ اس کے اصل مراسم مافیا کے سیٹھ حبیب جیوانی سے تھے۔ ان دونوں میں ہیروئن کا لین دین چلتا رہتا تھا پھر اسپیشل ٹاسک فورس اور مقامی حکام نے مافیا کے اڈے 'ٹریڈ لائن' پر بھرپور کارروائی کرکے ان کا صفایا کیا تو سردار پائندہ گل کو اس رقم کی فکر ہوگئی جو اسے حبیب جیوانی سے وصول کرنی تھی۔ حبیب جیوانی مارا جاچکا تھا اس لیے پائندہ گل میرے پیچھے لگ گیا۔ وہ کہانی اپنی جگہ پر خاصی بے تکی تھی لیکن وہ لوگ بھاگ دوڑ کرکے مجھے پکڑنے میں کامیاب ہوگئے اور زبردست سودے بازی کے بعد' اول خان نے ان لوگوں کو وہ ہیروئن واپس کردی جو مافیا کے اڈے پر چھاپے کے دوران پکڑی گئی تھی۔ پائندہ گل رقم یا مال کا طلب گار تھا۔ مال واپس مل جانے پر اس نے میری آزادی کا حکم جاری کردیا لیکن عین اسی وقت جنت گل مجھے اپنے وجود کی رعنائیوں سے لذت آشنا کرانے کے بعد مجھے فرار میں مدد دینے پر آمادہ ہوچکی تھی۔ اسی الجھاؤ میں عبدالرحیم خان مارا گیا اور میں وہاں سے نکل

آنے کے باوجود پائندہ گل کی مخاصمت سے جان نہ بچا سکا۔ رہی سہی کسر جنت گل نے پوری کردی۔ اس نے اپنی کہانی پھیلا کر پائندہ گل کو میری طرف متوجہ ہونے پر مجبور کردیا۔ اس کہانی میں زن اور زر کا تنازعہ تھا۔ محبت اور مخالفت کی پرانی گھسی پٹی کارفرمائیوں نے جنت گل کو پائندہ گل کے خلاف لاکھڑا کیا تھا لیکن ہمارے گالان پہنچنے کے بعد اس روایتی اختلاف نے یک بیک پیچیدگی اختیار کرلی تھی۔ ہم عملاً پائندہ گل اور اس کے وفاداروں کی تحویل میں تھے لیکن ہماری بہتری گھنٹیوں والوں سے مل جانے میں نظر آرہی تھی۔

میں دیر تک بستر پر پڑا کروٹیں بدلتا رہا لیکن نیند کا دور دور تک پتا نہیں تھا۔ میں نے سگریٹ سلگا کر کمرے میں ٹہلنا شروع کردیا۔ مجھے ٹہلتے ہوئے چند منٹ بھی نہیں گزرے ہوں گے کہ کوئی دروازے پر آپہنچا اور اس نے ٹارچ کی تیز روشنی میرے اوپر مرکوز کردی۔ میں ٹھٹک کر اپنی جگہ پر رک گیا۔

تیز روشنی کی وجہ سے میں آنے والے کو نہیں دیکھ سکا۔ روشنی کا دائرہ میرے بدن پر چند ثانیوں تک حرکت کرتا رہا پھر وہ شخص ٹارچ بجھا کر واپس لوٹ گیا۔ مجھے سخت حیرت ہوئی کہ میری بے ضرر چہل قدمی نے کسی محافظ کو میری طرف متوجہ کردیا تھا لیکن جب میں ایک باغی کے ساتھ اس کمرے سے نکل کر باہر گیا تھا تو کسی کے کان پر جوں بھی نہیں رینگی تھی۔ میرے لیے وہ بات فکرانگیز تھی۔ گھنٹیوں والوں کو پائندہ گل کی حویلی میں بہت زیادہ اثر و رسوخ حاصل تھا اور ان کی دوستی کی پیشکش کو مسترد کردینا آسان نہیں تھا۔

ان تینوں کے لیے وہ معمول کی ایک اور صبح تھی۔ وہ رات بھر گہری نیند سوتے رہے تھے اس لیے بیدار ہونے کے بعد بہت تازہ دم اور ہشاش بشاش تھے مگر غزالہ مجھے دیکھتے ہی فکرمند ہوگئی۔

"معلوم ہوتا ہے کہ تم ساری رات جاگتے رہے ہو۔" اس نے میری آنکھوں میں دیکھتے ہوئے تشویش سے کہا۔

"کچھ لوگوں نے سونے نہیں دیا۔" میں نے اس کے قریب ہوکر انگریزی میں کہا۔

"کیا مطلب؟" میرے جواب پر ویرا چونکے بغیر نہ رہ سکی۔ "کیا رات کو یہاں کوئی اور بھی تھا؟"

"گہری نیند میں میرا منہ دبوچ کر مجھے بیدار کیا گیا تھا۔" میں نے اپنے لب و لہجے کو سپاٹ رکھتے ہوئے کہا۔ "تم لوگ حیرت یا کسی جوش و خروش کا مظاہرہ کیے بغیر انگریزی زبان استعمال کرسکتے ہو۔ ہماری اس وقت بھی کڑی نگرانی ہو رہی ہوگی۔ ان لوگوں کو ہم پر کوئی شبہ نہیں ہونا چاہیے۔"

"ہم سب ہی محتاط ہیں۔ تم احتیاطی تدابیر پر لیکچر دینے کے بجائے اپنی کہانی سناؤ۔ یہاں ختم مزاج بوڑھے کے آدمیوں کے علاوہ اور کون آسکتا ہے؟"

"کہیں ایسا تو نہیں کہ پُراسرار باغیوں کے بارے میں تمہارا خدشہ درست ثابت ہوا ہو؟" غزالہ کے ذہن میں وہ خیال اچانک ہی آیا تھا لیکن اس کے لہجے سے حیرت کا کوئی تاثر نہیں ملتا تھا۔

میں نے اپنے سر کو اثبات میں جنبش دیتے ہوئے کہا۔ "یہی ہوا ہے۔ وہ لوگ بغاوت پر تلے بیٹھے ہیں۔ اندر ہی اندر لاوا پک رہا ہے مگر اب وہ اپنے پروگرام کو جلد از جلد عملی جامہ پہنانا چاہتے ہیں۔ اس بارے میں ویرا نے کل جن خیالات کا اظہار کیا تھا، وہ حقائق سے بہت قریب ہیں۔ میری ان کے سربراہ سے بات ہوئی تھی۔"

"اس سے پہلے کہ باہر سے کوئی مداخلت ہو، پوری بات سناتے چلے جاؤ۔" ویرا نے کہا۔

میں نے بظاہر غزالہ کو خطاب کرتے ہوئے پچھلی رات کے واقعات دہرانے شروع کردیے۔

"یہ ہمارے لیے غیبی امداد ہے۔" میرے خاموش ہونے پر غزالہ بولی۔ "میری سمجھ میں نہیں آرہا کہ میں اپنی خوشی کو کس طرح قابو میں رکھوں! ہم میں سے کوئی سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ ان بے رحم پہاڑوں میں ہمارا کوئی ہمدرد پیدا ہوجائے گا۔ آج رات بڑی قاب کو اوندھا ہی ہونا چاہیے۔"

"میرا بھی یہی خیال ہے۔" ویرا نے اپنی جگہ سے تائید کی۔ "ہمیں یہ موقع نہیں گنوانا چاہیے۔"

اس سے پہلے کہ میں ان دونوں کی رائے پر کوئی تبصرہ کرتا، راہداری میں تیز تیز قدموں کی دھمک سنائی دی۔ ہم چاروں چونک کر ادھر دیکھنے لگے۔ آنے والوں میں صندل خان پیش پیش تھا۔

وہ بہت تیزی سے اندر آیا اور اس نے بگڑے ہوئے لہجے میں پوچھا۔ "ابھی تم لوگ کس خفیہ زبان میں باتیں کر رہے تھے؟" اس کی آنکھوں میں گہرے شکوک و شبہات جھلک رہے تھے۔

ایک لمحے کے لیے مجھے یوں محسوس ہوا جیسے پچھلی رات نقاب کی اوٹ سے میں نے اسی کی آواز سنی ہو مگر میں پُریقین نہ ہوسکا۔ آپس کی شادیوں کی وجہ سے شنگاریوں کی نسلی خصوصیات بڑی حد تک یکساں تھیں۔ وہ سب ہی جسیم اور قد آور تھے۔ بدلی ہوئی آواز کی وجہ سے یہ کہنا ناممکن تھا کہ صندل خان ہی نقاب پوش کے روپ میں مجھ سے ملا تھا۔ وہ اردو جاننے والے شنگاریوں میں سے کوئی بھی ہوسکتا تھا۔

"خفیہ زبان؟" ویرا ہنس کر صندل خان سے کہہ رہی تھی۔ "ہم انگریزی بول رہے تھے۔"

"جب تم سب اردو بول اور سمجھ سکتے ہو تو انگریزی میں باتیں کرنے کی کیا ضرورت تھی؟" صندل خان کے تلخ لب و لہجے میں کوئی تبدیلی رونما نہیں ہوئی تھی۔

"یہ لوگ میرے ایک تحقیقی مقالے پر بات کر رہے تھے۔" ویرا کے پاس فوراً ہی جواب تیار تھا۔ "وہ مقالہ انگریزی میں لکھا گیا ہے۔ یہاں فرصت ہے تو اسی پر تبادلۂ خیال چل پڑا......"

"نہیں!" اس نے ویرا کی بات کاٹ دی۔ "تم مجھ سے اصل بات چھپا رہی ہو۔"

"ہم یہاں مجبور اور بے بس ہیں۔" میں نے کہا۔ "تمہارے آدمی ہر وقت ہماری نگرانی کر رہے ہیں۔ آخر تمہیں ہماری طرف سے کس قسم کا اندیشہ یا خطرہ لاحق ہے؟ ہم انگریزی میں باتیں کرکے تمہارا کیا بگاڑ سکتے ہیں؟"

"اس کی نوبت ہی نہیں آئے گی۔ تم نے کوئی بھی غلط قدم اٹھانے کی کوشش کی تو اپنی جانوں سے ہاتھ دھو بیٹھو گے۔" وہ مجھے گھورتے ہوئے بولا۔ "ایک بار خان بابا کے سامنے پہنچانے کے بعد، اب میں تمہارے بارے میں ہر پابندی سے آزاد ہوچکا ہوں۔ یہاں کے محافظ بہت ذمہ دار اور بااختیار ہیں۔ وہ تمہیں گولی بھی مار سکتے ہیں۔"

"اگر ہمارے مقدر میں یہی لکھ دیا گیا ہے تو اسے کوئی نہیں ٹال سکتا لیکن تم یقین کرو کہ میں سچ بول رہی ہوں۔ گالان کی فضا تخلیقی کام کے لیے بہت عمدہ ہے۔ ہوسکتا ہے کہ میں بعد میں بھی یہاں آکر رہنا چاہوں۔"

"تخلیق؟" صندل خان ہونٹ سکوڑ کر پھنکارا۔ "ان پہاڑوں میں عورتیں بس بچے تخلیق کرتی ہیں یا گھر سنبھالتی ہیں۔ تم لوگ یہ یاد رکھنا کہ خان بابا کے نمک خوار تم سے ایک لمحے کے لیے بھی غافل نہیں ہیں۔"

اس وقت وہ ایک مرتبہ پھر ویرا سے بے پروا نظر آرہا تھا۔ ویرا کے ساتھ اس کا دُہرا رویّہ میری سمجھ سے باہر تھا۔

وہ واپسی کے لیے پلٹا تو ویرا نے نرمی سے پوچھا۔ "اب ہمیں انگریزی زبان کے استعمال کی آزادی ہے یا اس پر پابندی لگادی گئی ہے؟ ہم تمہیں کسی قیمت پر بھی ناراض نہیں کرنا چاہتے۔"

"تم کتوں اور بلیوں کی زبان بھی استعمال کرسکتی ہو لیکن یہ یاد رکھنا کہ یہاں لائے جانے والے خان بابا کی مرضی کے بغیر نیچے کی وادی میں بھی قدم نہیں رکھ سکتے جہاں ہمارے قیدی اور غلام کام کرتے ہیں۔"

وہ جتنی تیزی کے ساتھ آیا تھا اس سے کہیں زیادہ تیزی کے ساتھ کمرے سے نکلتا چلا گیا۔ اس کے دونوں مسلح ساتھی اس کی تقلید کر رہے تھے۔ میں نے ان دونوں کا بہت غور سے جائزہ لیا لیکن ان میں سے کسی میں اس شخص کی شباہت نہیں تھی جس نے رات کو مجھے سوتے سے بیدار کیا تھا۔

"اب ہم تمہارے مقالہ پر کس زبان میں بات کریں؟" کچھ دیر کے بعد غزالہ نے ویرا سے پوچھا۔

"انگریزی ہی استعمال کرنی پڑے گی۔" ویرا نے تفکر آمیز لہجہ اختیار کرتے ہوئے کہا۔ "میرا خیال ہے کہ ہم نے صندل خان کی غلط فہمی دور کردی ہے۔" صاف ظاہر تھا کہ وہ نگرانی کرنے والوں کو سنانے کے لیے ایسی بات کر رہی تھی۔

"تم نے نقاب پوش کی صورت نہیں دیکھی۔" سلطان شاہ خاصی روانی سے انگریزی میں کہنے لگا۔ "لیکن تم دوسرے آدمی کو پہچان سکتے ہو۔ وہ زیادہ دیر تک تمہاری نظروں سے نہیں بچ سکے گا۔"

"اسے پہچان کر ہم کون سا تیر مار لیں گے؟" میں نے جواب دیا۔ "ویسے بھی ہم نے ان سے مل جانے کا فیصلہ کرلیا ہے۔"

"تو یہ بالکل طے ہوگیا؟" ویرا نے پوچھا اور میں نے تائید میں سر ہلا دیا۔

"اگر یہ لوگ انگریزی کو پسند نہیں کرتے تو ہمیں اردو میں باتیں کرنی چاہئیں۔" ویرا نے پٹڑی بدل کر اردو میں کہا۔ "میرے مقالہ پر بعد میں بات ہوسکتی ہے۔ کیونکہ میرا مسودہ کراچی میں ہے۔ اس پر میں واپس لوٹنے کے بعد ہی کام کرسکوں گی۔ اس وقت خان بابا اور اس کے آدمیوں کی خوشنودی ہمارے لیے زیادہ اہم ہے۔"

وہ دن بہت پھیکا اور بے کیف گزرا۔ ہم میں سے ہر ایک خاموش اور اپنی جگہ پر سوچوں میں ڈوبا ہوا تھا۔ ہر شخص جانتا تھا کہ ہاتھیوں کی لڑائی میں مینڈک بھی کود پڑیں تو ان کا نام و نشان تک نہیں ملتا۔ سردار پائندہ گل بظاہر بہت زیادہ قوت اور اختیارات کا مالک تھا لیکن دوسری طرف اس کے حریفوں کو بھی حیرت ناک حمایت حاصل تھی۔ کچھ نہیں کہا جاسکتا تھا کہ گھنٹی کی آواز پر فضا کو جلے ہوئے بارود کی بو سے بھر دینے والوں میں سے کتنے ان کے ساتھ تھے۔ ان دونوں فریقوں کے کسی بھی تصادم میں ہماری حیثیت خاصی مخدوش ہوسکتی تھی۔ شاید ان ہی خدشات نے ہر ایک کو سنجیدہ اور فکرمند کیا ہوا تھا۔ پائندہ گل کے وعدہ کے مطابق ہمیں واڈکا کی دو نئی بوتلیں پہنچا دی گئی تھیں لیکن ویرا نے دوپہر گزر جانے کے باوجود انہیں ہاتھ بھی نہیں لگایا۔ میں بیشتر وقت بستر پر پڑا اپنی سوچوں میں ڈوبا رہا۔

گالان کی فضاؤں میں آخری بار گھنٹی کی آواز کو بلند ہوئے ڈیڑھ دن سے زائد مدت گزر چکی تھی لیکن میں جانتا تھا کہ وہ خاموشی کسی طوفان کی آمد کا پیش خیمہ تھی۔ اس طوفان میں اُس بڑی قاب کو خاص اہمیت حاصل تھی جو ہمارے رات کے کھانے کے ساتھ آنی تھی۔ دیکھنا یہ تھا کہ ہماری طرف سے قاب کو الٹنے کے بعد گھنٹیوں والے کیا حکمتِ عملی اختیار کرتے ہیں اور ہم تک اپنی ہدایات پہنچانے کے لیے کون سا ذریعہ استعمال کرتے ہیں؟

جوں ہی سورج کی روشنی کی جگہ مشعلوں کے زرد شعلوں نے سنبھالی، صندل خان اپنی ٹوکری سمیت ہمارے کمرے میں آموجود ہوا۔ اس وقت وہ بہت خوشگوار موڈ میں نظر آرہا تھا۔

"کیا بات ہے؟ آج تم سب ست اور بیمار نظر آرہے ہو۔" وہ آتے ہی ویرا سے مخاطب ہوکر چہکا۔

"تمہاری پھنکار نے صبح سے اب تک طبیعت کو بے مزہ کیا ہوا

ہے۔" ویرا موقع دیکھ کر چوکنے والی نہیں تھی۔

"اوہ!" وہ بے ڈھنگے انداز میں ہنس دیا۔ "ہماری طبیعتوں میں فطری تجسس موجود ہے۔ کوئی بھی نئی بات سامنے آتی ہے تو ہمارا ردِعمل بہت پُرجوش ہوتا ہے۔ بدقسمتی سے اس وادی میں کوئی بھی انگریزی زبان سے واقف نہیں ہے۔ ہمارے آدمیوں کو وہ زبان بہت عجیب محسوس ہوئی تھی۔"

"یہ نئی بات نہیں تھی۔" اسے وضاحتوں پر آمادہ پاکر ویرا کا حوصلہ بڑھ گیا۔ "چیغا سرائے سے یہاں تک کے سفر میں تم ہم پر بہت مہربان رہے تھے لیکن سفر ختم ہوتے ہی تمہارا رویّہ درشت ہوگیا تھا۔ تم اپنے مزاج کے مالک ہو۔ جب چاہتے ہو عزت سے نوازنے لگتے ہو، اُکتا جاؤ تو عزت اتار کر رکھ دیتے ہو۔"

"تم غلط سمجھ رہی ہو۔" وہ مدافعانہ مسکراہٹ کے ساتھ بولا۔ "خان بابا کے غلاموں میں میرا منصب بہت اونچا ہے مگر پھر بھی میری کچھ حدود ہیں۔ مجھے ہروقت اپنے آس پاس کا دھیان رکھنا پڑتا ہے۔"

میں بظاہر سکون سے بیٹھا رہا لیکن اس کی بات نے مجھے چونکا دیا۔ اس کے الفاظ سے خان بابا سے قدرے برگشتگی کی بو آرہی تھی۔ جب کہ خان بابا نے مجھے خاص طور پر بعض باتیں صندل خان کو بتانے سے منع کیا تھا۔ وہ محض اتفاقات نہیں ہوسکتے تھے۔ میرے ذہن نے خود بخود نقاب پوش اور صندل خان کا موازنہ کرکے ان میں شباہت تلاش کرنے کا عمل شروع کردیا جس کے نتائج سنسنی خیز تھے۔

"تو کیا میں یہ سمجھ لوں کہ تم یہاں اپنی مصلحتوں کے قیدی ہو؟" ویرا نے مسکرا کر پوچھا۔

"یہاں صرف خان بابا اپنی مرضی کا مالک ہے۔ اس کے علاوہ ہر شخص کو محتاط رہنا پڑتا ہے۔" اس کی آواز دھیمی ہوگئی اور نگاہیں بے چینی سے کمرے کی خالی دیواروں کا طواف کرنے لگیں۔ "جب سے گھنٹیوں والوں نے سر اٹھایا ہے ہر شنگاری خان بابا کی برہمی سے خوف زدہ رہتا ہے۔ وہ اس عمر میں بھی اتنا توانا ہے کہ اپنی انگلیوں کی گرفت سے انسانوں کی کھوپڑیاں چٹخا دیتا ہے۔"

"پتا نہیں تم صبح احتیاط سے کام لے رہے تھے یا اب محتاط ہو!" ویرا شانے اچکا کر بولی۔

"اجالے میں جو شخص حویلی کا نگران ہوتا ہے وہ بچپن سے میری ٹوہ میں رہتا ہے۔ سورج غروب ہونے سے لے کر صبح نمودار ہونے تک میرے آدمی انتظام سنبھالے رہتے ہیں۔ اس وقت میں بے فکر ہوتا ہوں اور تمہارے ساتھ آبیٹھتا ہوں۔ میری یہاں موجودگی میں انہیں بے فکری میسر آجاتی ہے۔"

"لیکن آج صبح تو تم ہی ڈانٹ پھٹکار کے لیے آئے تھے۔" ویرا اس کی جان کو آگئی تھی۔

"شاہ وزیر سمیت دن والے نگراں اردو سے نابلد ہیں۔ تمہاری انگریزی سن کر اس نے مجھے خان بابا کے ڈیرے سے بلوایا تھا تاکہ میں تم سے پوچھ گچھ کرسکوں۔ وہ میرے ساتھ ہی یہاں آیا تھا اور کسی احمق کی طرح خاموش کھڑا ہوا تھا۔" صندل خان شراب کو چھوئے بغیر ہی موج میں آیا ہوا تھا۔

اس کی باتوں میں مجھے اس کے خلاف ایک اور نکتہ مل گیا تھا۔ رات کی نگرانی والا عملہ اس کی کمان میں ہوتا تھا اور نقاب پوش نے مجھ سے ملاقات کے لیے رات ہی کا انتخاب کیا تھا۔ اگر صندل خان ہی گھنٹی والوں کا سرغنہ تھا تو اس کے لیے بہت آسان تھا کہ ہمارے کمرے کی خفیہ دیکھ بھال کرنے والوں کو مقررہ اوقات میں کہیں اور الجھا کر مجھے خواب گاہ سے نکلوا کر نقاب پوش کی حیثیت سے ملاقات کرتا اور پھر خاموشی سے واپس بھجوا دیتا۔ میں ان تمام نکات پر جتنا غور کررہا تھا، یہ امکان کہ صندل خان ہی باغیوں کا سربراہ تھا، پختہ ہوتا نظر آرہا تھا۔ وہ پائندہ گل کی ناک کے عین نیچے اپنا کھیل کھیل رہا تھا۔ یہ اور بات تھی کہ پائندہ گل بھی اس سے مطمئن نہیں تھا۔

صندل خان اپنا دل بہلانے کے لیے ہماری طرف آتا تھا۔ اس نے ویرا کی تابڑتوڑ جرح سے فارغ ہوتے ہی ویرا سے ساقی گری کی فرمائش کی۔ وہ بھی دن بھر کی اکتائی ہوئی تھی۔ اس نے بسروچشم صندل خان کی فرمائش کو عملی جامہ پہنانا شروع کردیا۔ میں اس رات پوری طرح چاق وچوبند رہنا چاہتا تھا اس لیے میں نے طبیعت کی گرانی کا بہانہ کرکے اپنی رفتار بہت سست رکھی لیکن وہ دونوں تھوڑی ہی دیر میں رنگ پر آگئے۔

باتوں ہی باتوں میں صبغت اللہ کا ذکر نکل آیا تو صندل خان نے بتایا ہم لوگوں کے ساتھ نرم رویّہ اپنانے پر اسے صبغت اللہ کی برہمی کا سامنا کرنا پڑا لیکن گالان میں وہ ہم پر سختی کرنے سے قاصر تھا کیونکہ ہمیں ہر سہولت پائندہ گل کی مرضی اور اجازت سے فراہم کی جارہی تھی۔

اس نے جلال آباد کی کارروائی میں بھاری رسد پر قبضہ کیا تھا۔ اس نے سارے ہتھیار اور ان کے بے شمار راؤنڈز پاکستان کے سرحدی علاقوں کی طرف روانہ کردیے تھے جہاں ان کے دام کھرے کرلیے گئے تھے۔ اناج کی بوریوں سے لدے ہوئے دو ٹرک لے کر وہ کابل کی طرف نکل گیا تھا جہاں اشیائے خوردونوش کا شدید بحران آیا ہوا تھا۔ کابل میں وہ ٹرک بہت مہنگے فروخت ہوگئے۔ اس رقم سے صبغت اللہ نے ہیروئن کی تیاری میں کام آنے والے کیمیکلز کے تین ڈرموں کا سودا کیا تھا۔ کابل میں مقیم ایک سکھ ادویہ سازی کے خام مال کے نام پر وہ کیمیکل درآمد کرکے چور بازار میں بیچتا تھا اور افیم کی تیاری کے موسم میں اس پر دس گنا نفع کماتا تھا۔ صبغت اللہ کی ان کامیابیوں نے خان بابا کو بہت خوش کردیا تھا، جس کے نتیجے میں اسے بادران جانے کی اجازت مل گئی تھی۔ بادران، شنگارا ویلی ہی کی ایک دور افتادہ بستی تھی جہاں صبغت اللہ کا خاندان آباد تھا۔ صندل خان نے بتایا کہ صبغت اللہ ہم لوگوں سے ملاقات کا خواہش مند تھا لیکن اگلی صبح بادران روانہ ہونے کی تیاریوں میں مصروف ہونے کی وجہ سے وہ ادھر نہیں آسکا تھا۔ میرے لیے صبغت اللہ کی ذات میں کوئی دلچسپی نہیں تھی لیکن اس ذکر میں موت کے سوداگروں کی درونِ خانہ مصروفیات بھی شامل تھیں، اس لیے میں نیم دلی سے اس میں حصہ لیتا رہا پھر ویرا اور صندل خان سے معذرت کرکے اس تخت کی طرف چل دیا جہاں سلطان شاہ وقت کاٹنے کے لیے غزالہ کے ساتھ رمی کھیل رہا تھا۔

"کمال ہے، آج تم اپنی من پسند محفل چھوڑ کر ادھر آگئے۔" غزالہ نے خوشگوار حیرت سے کہا۔ "معلوم ہوتا ہے کہ دن بھر کی بیکاری تمہارے موڈ پر بہت زیادہ اثرانداز ہوئی ہے۔"

"مجھے اس مردود پر شبہ ہے۔" میں نے بیٹھتے ہوئے، انگریزی میں سرگوشی کی۔

"نقاب پوش؟" غزالہ نے زیرِلب بڑبڑا کر انگریزی ہی میں استفسار کیا۔

"ہاں! میرا خیال ہے کہ یہ اس وقت ہمیں ٹٹولنے کی نیت سے آیا ہے۔ تم پتے ملا کر دوبارہ کارڈ بانٹنے شروع کردو تاکہ وہ ہمیں کھیل میں مصروف سمجھتا رہے۔" میں ایک ہی سانس میں کہتا چلا گیا۔

"وہ ویرا کے ساتھ راز و نیاز میں منہمک ہے۔ اسے ہمارا خیال بھی نہیں آئے گا۔" سلطان شاہ منمنایا۔

"اسے کباب میں سے ہڈی نکل جانے کی خوشی ہوگی۔" غزالہ نے پتے پھینٹتے ہوئے کہا۔ مگر میرا ذہن خلا میں اڑ رہا تھا۔ میری سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ ہمارے ساتھ کس قسم کا کھیل کھیلا جارہا تھا۔

کڑیاں ملانے پر، میرے ذہن میں ایک نیا شبہ سر ابھار رہا تھا کہ شاید گھنٹی والوں میں سے کوئی ہمارے قریب نہیں پھٹک سکا تھا۔ صندل خان نے اپنے آدمیوں کی ملی بھگت سے رات والا ڈراما رچایا تھا۔ وہ مجھے سہل تر آزادی کا لالچ دے کر اپنے جال میں پھانسنا چاہ رہا تھا تاکہ مجھے بدنیت اور سازشی قرار دے کر پائندہ گل کی نظروں سے گرا سکے۔ وہ پائندہ گل کو ہمارے عزائم کے بارے میں بدگمان کردیتا تو وہ مغلوب الغضب سردار ہماری موت کا فیصلہ بھی صادر کرسکتا تھا۔ ہم اس سرزمین پر اجنبی تھے اور وہ اپنی قسم توڑے بغیر ہمیں سزا سنا سکتا تھا۔ شاید صندل خان ہم تینوں سے چھٹکارا حاصل کرکے، ویرا کو مالِ غنیمت کے طور پر اپنی تحویل میں لینے کی منصوبہ بندی کررہا تھا۔

ہم تینوں مشینی انداز میں پتے پھینکتے اور سمیٹتے رہے۔ ہماری باتیں جاری تھیں لیکن میں نے اپنے نئے شبہات کا ذکر کرکے انہیں مزید پراگندہ نہیں کیا تھا۔ ان دونوں کی ساری ذہنی ورزش اسی ایک نکتہ پر مرکوز تھی کہ صندل خان باغیوں کا سربراہ تھا یا نہیں؟

وقت رینگ رینگ کر گزر رہا تھا مگر پھر بھی کھانے کا وقت آہی گیا۔ تھال کے گرد بیٹھتے ہی میں نے دیکھ لیا کہ سب سے بڑی قاب میں پہاڑی تیتروں کے بُھنے ہوئے پارچوں کا ڈھیر موجود تھا۔ ہم چاروں کو بڑی قاب کی اہمیت کا اندازہ تھا اس لیے سب ہی نے حیرت اور اشتیاق کے ساتھ ان پارچوں پر دھاوا بولا اور کسی دوسرے کھانے کو چھیڑنے سے پہلے بڑی قاب کو بالکل خالی کردیا۔

میں نے کن انکھیوں سے صندل خان کی طرف دیکھا تو وہ پچھلے روز کے معمول کی طرح ایک طرف بیٹھا شراب پی رہا تھا مگر اس کی نگاہیں ہم لوگوں کی طرف ہی مرکوز تھیں۔ میں فوراً ہی تھال کی طرف متوجہ ہوگیا۔

ہم لوگ یکے بعد دیگرے کھانے سے فارغ ہوتے چلے گئے۔ میں دانستہ ہاتھ روک کر کھا رہا تھا تاکہ آخر تک مصروف رہ سکوں۔ پھر میں اکیلا رہ گیا۔ میں نے چند لقموں میں اپنی رکابی صاف کی اور پانی پینے کے بعد برتن سمیٹتے ہوئے، نہایت سرسری انداز میں بڑی قاب کو تھال میں الٹا کردیا۔

معاً صندل خان کے حلق سے ایک عجیب سی غراہٹ بلند ہوئی اور اس نے اپنے کندھے سے جھولتی ہوئی سب مشین گن ہاتھوں میں تھام کر اپنی جگہ چھوڑ دی۔ میرا دل اچھل کر حلق میں آگیا۔ شاید صندل خان اسی لمحہ کے انتظار میں اپنا جال پھیلائے بیٹھا تھا۔ میں نے نقاب پوش سے یک جہتی کا اظہار کرکے شاید اپنی گردن میں خود پھندا ڈال لیا تھا۔

صندل خان کی تحیرزدہ آنکھیں تھال میں رکھی ہوئی بڑی قاب پر جمی ہوئی تھیں۔ پھر وہ خودکلامی کے انداز میں بولنے لگا۔ "میں اندھا ہوں نہ میں نے بہت زیادہ شراب پی ہوئی ہے۔ پھر بھی میں جو کچھ دیکھ رہا ہوں وہ ناقابلِ یقین ہے۔ یہ کیسے ہوسکتا ہے؟ یہ کیسے ہوسکتا ہے؟"

پھر وہ چونک کر اپنے قدموں پر لمحہ بھر کے لیے لڑکھڑایا۔ اس نے اپنے ہاتھ میں دبی ہوئی گن کی نال ہماری طرف سیدھی کی اور براہِ راست مجھ سے مخاطب ہوگیا۔ "سچ سچ بتاؤ، اندر کون غدار ہے جو تم سے ملا ہوا ہے؟ تم کس نمک حرام کے ساتھ پیغام رسانی کی کوشش کررہے ہو؟"

"تمہیں کوئی غلط فہمی ہوئی ہے۔" میں نے عاجزی سے کہا۔ "ہم نے کچھ بھی تو نہیں کیا۔ تمہیں ہماری کس بات نے اچانک اشتعال دلایا ہے؟" یہ کہہ کر میں نے سوالیہ نظروں سے اپنے ساتھیوں کی طرف دیکھا لیکن ان سب کے چہرے سپاٹ اور ماتمی ہونے کی حد تک سنجیدہ تھے۔ اسی وقت مزید تین شنگاری کلاشنکوفیں تانے اندر گھس آئے۔

صندل خان کی آنکھیں پھر بڑی قاب پر جم گئیں۔ "خدا کی قسم یہ وہی حرکت ہے جو بادران والے دشمن کی قید سے اپنے پیغام باہر پہنچانے کے لیے استعمال کرتے ہیں۔ یہ ان کا جدّی پشتی راز

ہے مگر میں اس سے خوب واقف ہوں۔ سچ سچ بتاؤ کہ بڑی قاب کو تم نے کس کے لیے الٹا کیا ہے؟"

صندل خان کا وہ ردِعمل اس قدر بے ساختہ تھا کہ میں الجھن میں پڑ گیا۔ وہ اس کی سازش ہوتی تو وہ اتنی اضطراری اداکاری کا مظاہرہ نہیں کر سکتا تھا۔ اس کی آنکھوں سے ظاہر ہو رہا تھا کہ وہ سچ بول رہا تھا۔ میں نے کمزور آواز میں کہا۔ "یہ محض اتفاق ہے کہ میں نے خالی قاب کو الٹ دیا۔ اس میں کوئی گڑبڑ پوشیدہ ہے تو میں اسے سیدھا کیے دیتا ہوں۔ ہم دن رات تمہارے سامنے ہیں۔ حویلی میں ہمارا کس سے رابطہ ہو سکتا ہے؟ میں نے بادران کا ذکر تمہاری زبان سے پہلی بار سنا ہے۔ ان کا کوئی راز ہمارے علم میں نہیں ہے۔"

"یہ کسی بات کا کھلا کھلا مثبت جواب ہے۔" وہ نشے کی جھونک میں غرایا۔ "بڑی قاب سیدھی ہو تو انکار اور الٹی ہو تو اقرار ہوتا ہے۔ صبغت اللہ اس بات کی گواہی دے گا کہ میں غلط نہیں کہہ رہا۔ بادران اس کا آبائی علاقہ ہے۔ وہ وہاں کے ہر راز سے واقف ہے مگر میں بھی اتنا انجان نہیں ہوں کہ تم میری آنکھوں میں دھول جھونک سکو۔"

میں دل ہی دل میں اس نقاب پوش کو کوس کر رہ گیا جس نے مجھے اس قدر خطرناک طریقہ بتایا تھا کہ میں اس پر عمل کرتے ہی پکڑا گیا تھا۔ وہ کوئی بادرانی ہی ہو سکتا تھا جسے یہ زعم رہا ہو کہ اس کے گاؤں کا جنگی راز کسی دوسرے شنگاری کے علم میں نہیں ہوگا۔ اس صورت حال سے میرے اعصاب پر تناؤ طاری ہونے لگا تھا۔

میں نے خالی الذہنی اور ناامیدی کے عالم میں' صندل خان کے پیچھے کھڑے ہوئے مسلح شنگاریوں کی طرف دیکھا تو یکبارگی میرا حوصلہ بندھ گیا۔ ان تینوں میں سے ایک شخص وہی تھا جس نے مجھے پچھلی رات زبردستی بیدار کیا تھا۔ میں نے اپنے کمرے میں آنے والے ستاروں کے موہوم سے انعکاس میں اس کی صورت دیکھی تھی لیکن اس کا ایک ایک نقش میرے دماغ میں پوری طرح محفوظ تھا۔ مجھے آس ہو گئی کہ ہمارا ایک حمایتی وہاں موجود تھا۔

"مجھے صدمہ ہے کہ تم ابھی تک ہماری طرف سے مطمئن نہیں ہو۔" میں نے گہرے متاسفانہ لہجے میں کہا۔ "خان بابا کی چھت کے نیچے کس میں حوصلہ ہو سکتا ہے کہ وہ ہم جیسے مجبوروں کے ساتھ کوئی سازش یا ہمدردی کرے؟ ہمارے پاس کسی کو دینے کے لیے کچھ بھی نہیں ہے۔ کون ہمارا ساتھ دینے کی حماقت کرے گا؟"

اس نے دو تین مرتبہ اپنی پلکیں جھپکائیں پھر ویرا سے مخاطب ہو کر بولا۔ "تم کیوں خاموش ہو؟ تمہارے پاس میرے سوالوں کا کیا جواب ہے؟ تمہارا یہ ساتھی بہت چالاک اور مکار لومڑ معلوم ہوتا ہے۔"

"میں ڈینی سے بہتر جواب نہیں دے سکتی اس لیے خاموش ہوں۔ ویسے بھی تم ڈینی سے مخاطب رہے ہو۔ یہ چالاک ضرور ہے۔ مگر تم سے کسی مکاری کی حماقت نہیں کر سکتا۔ ہم سب یہ بات جانتے ہیں کہ یہاں ہماری زندگیاں تمہارے ایک اشارہ کی محتاج ہیں۔ اس قدر کمزور پوزیشن میں ہم کیا سازش کر سکتے ہیں۔"

میرے پہچانے ہوئے شنگاری نے اچانک مقامی بولی میں کچھ کہنا شروع کر دیا۔ صندل خان اس کی طرف متوجہ ہو کر اپنا سر ہلانے لگا۔ جیسے اس کی بات معقول ہو۔ اس کے خاموش ہونے پر صندل خان نے بولنا شروع کر دیا۔ ان دونوں میں چند مکالموں کا تبادلہ ہوا۔ پھر صندل خان ایک تخت کے کنارے پر بیٹھ گیا۔ بقیہ تینوں شنگاری بدستور کلاشنکوفیں تانے کھڑے رہے۔ میں نے صندل خان سے بات کرنے والے شنگاری سے نگاہیں چار کر کے، نظروں ہی نظروں میں کوئی کنایہ لینے کی کوشش کی لیکن وہ مجھے بری طرح نظرانداز کر رہا تھا۔

"قاب سیدھی کر کے برتن اٹھا لو۔" کچھ دیر تک سوچ میں مستغرق رہنے کے بعد صندل خان نے اپنے آدمیوں سے کہا۔ "میں خان بابا سے بات کر کے ان لوگوں کے بارے میں آج ہی کوئی فیصلہ کرتا ہوں۔"

شاید بقیہ دو شنگاری اردو سے نابلد تھے۔ صندل خان سے بات کرنے والے نے اپنی بولی میں ان سے کچھ کہا۔ ایک نے بڑھ کر برتن اٹھا لیے۔ ان کے جانے سے پہلے صندل خان ہمارے کمرے سے چلا گیا۔ بعد میں وہ تینوں بھی کچھ کہے بغیر وہاں سے نکل گئے اور ہم چاروں خالی خالی نظروں سے ایک دوسرے کی طرف دیکھنے لگے۔

صندل خان کے غیر متوقع ردِعمل نے سب کچھ گڈمڈ کر کے رکھ دیا تھا۔ لیکن ایک بات بہرحال صاف ہو گئی تھی کہ نقاب پوش والے قصے سے اس کا دور کا بھی کوئی تعلق نہیں تھا۔

"حیرت ہے کہ یہاں قاب کو الٹانے سے اتنی دور کی بات نکل آئی۔" کچھ دیر بعد غزالہ نے معصومانہ انداز میں کہا۔ "اپنی چمڑی محفوظ رکھنے کے لیے ہمیں بہت زیادہ احتیاط سے کام لینا ہوگا۔" وہ جو کچھ کہہ رہی تھی' وہ چھپے ہوئے نگرانوں کو اپنی بے گناہی کا یقین دلانے کے لیے تھا ورنہ ہم چاروں کے دلوں میں چور موجود تھا۔

"کراچی وغیرہ کی ہنگامہ خیز زندگی کے بعد یہاں ایسا معلوم ہو رہا تھا جیسے میں خواب دیکھ رہی ہوں۔ آج کی زندگی کی حقیقتوں کے مقابلہ میں گالان کے تجربات فکشن محسوس ہو رہے ہیں۔ صدیوں سے یہاں کچھ بھی نہیں بدلا۔" ویرا نے غزالہ کا مقصد بھانپ کر گرہ لگائی۔ "روزمرہ کے لگے بندھے معمولات میں خفیف سی تبدیلیوں کے ذریعہ پیغام رسانی کا طریقہ دنیا بھر میں متروک ہو جانے کے باوجود یہاں آج بھی رائج ہے۔"

"کیا پتا کہ پانی کا گلاس داہنے کے بجائے بائیں ہاتھ میں پکڑنے سے کوئی خفیہ پیغام بنتا ہو۔" سلطان شاہ نے بات آگے بڑھاتے ہوئے کہا۔ "آج صندل خان نے کم از کم میری تو جان ہی نکال دی تھی۔"

"تم ٹھیک کہہ رہے ہو۔ پتھر کے زمانے سے پیغام رسانی کے روایتی طریقے چلے آ رہے ہیں۔" ویرا بولی۔ "لیکن اب یہ فن بلکہ ایک باقاعدہ سائنس بن چکی ہے۔ جس کی ابتدا مورس کوڈ سے ہوئی تھی۔"

میں خاموشی سے ان کے تبصرے سنتا رہا۔ ویرا اچانک ہی میری طرف متوجہ ہو گئی۔ "تم نے کیوں اداس بکرے کی طرح مُنہ لٹکایا ہوا ہے؟ آنکھوں سے ایسی تشویش ٹپک رہی ہے جیسے آسمان گرنے والا ہو۔"

"تمہارے ذہن پر شراب کا سرور طاری ہے اس لیے تمہیں سات خون معاف ہیں۔ میری چھٹی حس نئی صورتِ حال سے مطمئن نہیں ہے۔ کاش یہ رات خیریت سے گزر جائے!" میں نے سنجیدگی سے کہا۔

ہم لوگ سونے کی تیاریوں میں مصروف تھے کہ چار مسلح شنگاری دندناتے ہوئے ہمارے کمرے میں گھس آئے۔ ان میں وہی شخص سب سے آگے تھا جسے میں اچھی طرح پہچانتا تھا۔ اس نے اس وقت تک اردو کا ایک لفظ بھی نہیں بولا تھا مگر پچھلی رات کے تجربہ کی بنا پر معلوم تھا کہ وہ اردو پر قادر تھا لیکن مجھے اس سے گفتگو کی ابتدا کرنے کی ضرورت پیش نہیں آئی۔ اس نے اپنے ساتھیوں سے ایک قدم آگے بڑھ کر مجھے آنکھ ماری پھر تحکمانہ لہجے میں بولا۔ "تم لوگوں کو بھیڑوں کے پرانے باڑے میں چلنا ہے۔ یہ خان بابا کا حکم ہے۔"

ہم بے چون وچرا ایکجا ہو گئے۔ مجھے اس کی طرف سے الجھن تھی۔ اس لیے میں نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا۔ "خدا کا شکر ہے کہ تم ہماری بولی جانتے ہو۔ تمہارا احسان ہوگا اگر تم اپنا نام بھی بتا دو۔"

"قندوز خان۔ اب زیادہ بک بک نہ کرو اور باہر کی طرف چل پڑو۔" اس نے اپنی کلاشنکوف کی نال سے اشارہ کرتے ہوئے کہا اور ہم لوگ بے زبان چوپایوں کی طرح نکاسی کے راستے کی طرف چل دیے۔

وہ پچھلی رات والا راستہ تھا۔ فرق صرف اتنا تھا کہ راہداری میں اندھیرا دور کرنے کے لیے' اس وقت دیوارگیر مشعلیں روشن تھیں۔ راہداری میں کچھ دور جانے کے بعد وہ اچانک بائیں جانب اسی کوٹھری میں گھس گیا جہاں سے میں پچھلی رات گزرا تھا۔ وہ راستہ تنگ تھا اس لیے ہم ایک قطار کی صورت میں مڑے۔ اس وقت تک وہ کوٹھری کا بے آواز دروازہ کھول چکا تھا۔ ہم اس سے گزر کر دوسری طرف نکلے تو ہمارے عقب میں بقیہ تینوں شنگاری بھی اسی طرف آ گئے۔ وہ ایک وسیع اور سایہ دار احاطہ تھا۔ وہاں بھی چند مشعلیں روشن تھیں لیکن اس رقبے کے لیے ان کی روشنی ناکافی تھی۔ اس وقت مجھے وہاں رچی ہوئی بساند اور سیلن کو پہچاننے میں دشواری نہیں ہوئی۔ وہ یقینی طور پر بھیڑوں کا کوئی متروک باڑہ تھا جہاں بیک وقت سیکڑوں بھیڑیں سما سکتی تھیں۔ پتھریلی زمین پر جمی ہوئی گھاس اور خشک غلاظت کی تہوں سے اندازہ ہو رہا تھا کہ وہ جگہ خاصی مدت سے زیرِاستعمال نہیں تھی۔

"تم دونوں الگ ہو جاؤ۔" قندوز خان نے ایک جگہ رک کر عورتوں سے کہا۔ "ہم عورتوں پر ہاتھ اٹھانا مردانگی کے خلاف سمجھتے ہیں لیکن تم نے ہمارے کام میں دخل اندازی کی تو ہم تمہارے ہاتھ پیر باندھنے پر مجبور ہو جائیں گے۔" وہاں پھیلی ہوئی ناکافی روشنی میں اس کا چہرہ خشمناک اور ڈراؤنا نظر آ رہا تھا۔

ایک شخص کہیں سے رسّی کی کئی لچھیاں لے آیا۔ میرے اور سلطان شاہ کے ہاتھ پشت پر لے جا کر باندھے گئے تو ہم نے زیادہ احتجاج نہیں کیا کیونکہ ہمیں آنے والی مصیبت کے بارے میں ذرا بھی اندازہ نہیں ہو سکا تھا۔ ہمارے ہاتھ باندھنے کے بعد اچانک دو شنگاریوں نے اپنی کلاشنکوفیں زمین پر ڈالیں اور ہم سے لپٹ پڑے۔ وہ دونوں بہت توانا اور جسیم تھے۔ شاید ہم ان کا مقابلہ کر ہی لیتے لیکن ہاتھ بندھے ہوئے ہونے کی وجہ سے ہم دونوں ہی بے بس تھے۔ ہم چیخ چلّا کر اپنی مدافعت کی کوششیں کرتے رہے لیکن زیادہ دیر تک اپنے قدموں پر کھڑے نہ رہ سکے۔ انہوں نے ہمیں زمین پر گراتے ہی پوری مہارت اور پھرتی کے ساتھ ہمارے پیر بھی باندھ ڈالے۔

دونوں عورتوں نے اس وحشیانہ سلوک پر احتجاج کرتے ہوئے' ہماری طرف بڑھنے کا ارادہ کیا لیکن قندوز خان نے ایک ہلکا سا برسٹ مار کر انہیں اپنی جگہ رکے رہنے پر مجبور کر دیا۔ کلاشنکوف کی مہلک گولیاں سنگلاخ زمین سے اچٹ کر اِدھر اُدھر تیر گئیں۔ معاملہ یک بیک بہت گمبھیر ہو گیا تھا۔

ان دونوں نے ہمیں بے بس کر کے اپنے کندھوں پر لادا اور ایک ایسے مقام پر لے گئے جہاں کی چھت کو سہارنے والے شہتیر سے کئی رسیاں جھول رہی تھیں۔ دو رسیوں کے سروں سے ہمارے پیر مزید جکڑے گئے پھر بے رحمانہ جھٹکوں کے ساتھ ہم سر کے بل فضا میں معلق ہوتے چلے گئے۔ ہماری کھوپڑیاں زمین سے چند فٹ بلند کرنے کے بعد رسیاں باندھ دی گئیں اور ہم الٹے لٹکے رہ گئے۔ الٹی قاب نے چند ہی گھنٹوں میں ہمیں اس حال کو پہنچا دیا تھا۔

ویرا ہذیانی انداز میں ان پر برستی رہی۔ اس کی گالیاں تینوں شنگاریوں کی سمجھ سے باہر تھیں۔ قندوز خان خاموشی سے اس کی بے بسی سے لطف اندوز ہوتا رہا۔ ہمیں لٹکانے کے بعد تینوں شنگاریوں نے ایک طرف بیٹھ کر اس طرح سگریٹیں جلائیں جیسے وہ کسی اہم کام کو پایۂ تکمیل تک پہنچا کر فارغ ہوئے ہوں۔

قندوز خان نے اپنی بولی میں ان سے کچھ کہا پھر نپے تلے قدموں سے چلتا ہوا ہمارے قریب آ کھڑا ہوا۔

"جب تک تم لوگ حویلی والے غدار کے بارے میں زبان نہیں کھولو گے' اسی حالت میں بھوکے پیاسے لٹکے رہو گے۔ حتیٰ کہ تمہاری روحیں جسم کا ساتھ چھوڑ دیں گی۔" وہ اونچی اور نفرت انگیز آواز میں بولا۔

"یہ تم کیا کہہ رہے ہو؟" میں نے پھنسی پھنسی اور نیچی آواز میں کہا۔ "ہم زیادہ دیر تک یہ اذیت برداشت نہیں کر سکیں گے۔

پھر ہماری زبانیں چل پڑیں گی۔ کیا تم یہی چاہ رہے ہو؟" میں نے مبہم الفاظ استعمال کیے تھے تاکہ وہاں کوئی اور بھی ہماری بات سن یا سمجھ رہا ہو تو کوئی حتمی نتیجہ اخذ نہ کر سکے۔

"صبر اور ہمت سے کام لو۔" اس بار اُس کی آواز اونچی نہیں تھی لیکن وہ سرگوشی کی حد تک دھیمی بھی نہیں ہوئی تھی۔ "اُس کمرے میں پل پل تمہاری نگرانی ہو رہی تھی۔ یہاں کوئی دیکھنے اور سننے والا نہیں ہے۔ صبح تک نقشہ بدل جائے گا اور تم اپنی اس تکلیف کو بھول جاؤ گے۔ صندل خان کی ہوشیاری نے تمہیں اس ناگہانی مصیبت میں ڈالا ہے۔"

"کھایا پیا منہ کو آرہا ہے۔ صبح تک کون یہ اذیت سہہ سکے گا؟" میں نے کہا۔ "ہو سکتا ہے کہ نقشہ بدلنے تک ہماری روحیں قفسِ عنصری سے پرواز کر چکی ہوں۔ کاش میں نے تم لوگوں کے بہکاوے میں آکر قلابازی نہ کی ہوتی۔"

"مایوسی اور بدگمانی کی باتیں مت کرو۔ تم دونوں اتنے بودے نظر نہیں آتے جتنے بنتے ہو۔"

"معلوم ہوتا ہے کہ قندوز بھائی تمہارا رات والا دوست ہے۔" سلطان شاہ نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا۔ "اس سے کہو کہ یہ تھوڑی دیر کے لیے الٹا لٹک کر دیکھے کہ اس حالت میں رات گزارنی کتنی مشکل ہے۔"

"بس زیادہ باتیں نہ کرو۔ ایسا نہ ہو کہ تمہاری خواہش پوری ہو جائے۔" پھر اس کی آواز کرخت اور بلند ہو گئی۔ "تمہاری ضد زیادہ دیر تک قائم نہیں رہ سکے گی۔ تم نے صبح تک ہٹ دھرمی نہ چھوڑی تو تمہاری کھوپڑیوں کے نیچے الاؤ دہکا دیے جائیں گے اور تمہارے بھیجے پگھل کر ناک کے راستے باہر آجائیں گے۔"

"کیا ایسا بھی ہو سکتا ہے؟" سلطان شاہ نے بوکھلائی ہوئی آواز میں سوال کیا۔

وہ کوئی جواب دیے بغیر ایک طرف چلا گیا۔ میں جس رسّی کے سہارے لٹکایا گیا تھا اس میں کچھ بل موجود تھے جو میرے بوجھ سے آہستہ آہستہ کھل رہے تھے اور میں اسی رفتار سے گھومتا جا رہا تھا۔ میرے لیے وہ حالت مضحکہ خیز ہی نہیں، بہت زیادہ تکلیف دہ بھی تھی۔ میں نے دیکھا کہ قندوز خان اپنے تینوں ساتھیوں کے پاس جا بیٹھا تھا۔ ویرا اور غزالہ بھی تھک ہار کر نیچے بیٹھ چکی تھیں۔ ان دونوں نے اپنے دل کی بھڑاس نکالنے کے لیے صرف زبان کا سہارا لیا تھا۔ عملی طور پر انہوں نے قندوز خان کی ہدایات سے انحراف نہیں کیا تھا۔ میری دانست میں ان کا وہ رویّہ دانشمندانہ تھا کیونکہ وہ دونوں ان شنگاریوں کی وحشیانہ طاقت کا مقابلہ کرنے کے قابل نہیں تھیں۔ اگر ان لوگوں کو ایک بار عورتوں سے بھڑنا پڑ جاتا تو وہ ان کی توہین و تذلیل کے لیے کوئی بھی حد عبور کر سکتے تھے۔

گھومتی ہوئی رسّی کی وجہ سے میں اس باڑے کے تقریباً ہر حصے کا جائزہ لے رہا تھا۔ تیسرے چکر میں مجھے قندوز خان اپنی جگہ پر نظر نہیں آیا۔ میں نے آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر ہر طرف دیکھا لیکن وہ کہیں بھی موجود نہیں تھا اور ہم سب، اردو سے ناواقف شنگاریوں کے رحم و کرم پر رہ گئے تھے۔ قندوز خان کی موجودگی کی وجہ سے میرے دل کو جو ڈھارس تھی، وہ تشویش میں بدل گئی کیونکہ مشعلوں کی لرزاں روشنی میں دونوں عورتوں کے چہرے زرد اور سُتے ہوئے نظر آرہے تھے۔ بدقسمتی یہ تھی کہ انہیں قندوز خان کے دوہرے کردار کا بالکل علم نہیں تھا۔ اسی وجہ سے وہ ہم دونوں کے مقابلے میں زیادہ فکرمند اور متوحش نظر آرہی تھیں۔

وقت دھیمے دھیمے سرکتا رہا۔ ماحول اور مناظر میں ذرا بھی تبدیلی رونما نہیں ہوئی۔ یوں معلوم ہو رہا تھا جیسے سب کچھ اپنی جگہ منجمد ہو کر رہ گیا ہو اور مجھے الٹا لٹکے ہوئے گھنٹوں گزر چکے ہوں۔ میری رسّی کے بل ختم ہو چکے تھے لیکن پنڈلی کی جِلد میں پیوست ہوتی ہوئی رسی نے مجھے بے چین کیا ہوا تھا۔

"کیا ہم واقعی ساری رات چمگادڑوں کی طرح الٹے لٹکے رہیں گے؟" سلطان شاہ نے مایوسانہ لہجے میں سکوت کو توڑا تو میں چونک پڑا۔ "اب تو قندوز خان بھی یہاں موجود نہیں ہے۔"

"مقدرات کو ٹالنا انسانی بساط سے باہر ہے....." میں نے دلاسا دینے کے لئے زبان کھولی ہی تھی کہ اس نے بیزاری کے ساتھ میری بات کاٹ دی۔

"حیرت ہے کہ تم الٹے لٹکنے کے باوجود فلسفہ بول رہے ہو۔ مجھے ان باتوں سے قطعی دلچسپی نہیں ہے۔ ان میں سے کوئی بھی میرے قریب آیا تو میں اس سے الجھ پڑوں گا۔"

"تم ایسا کر ہی نہیں سکتے۔ کیونکہ تمہارے ہاتھ بھی بندھے ہوئے ہیں۔" اس کی باتوں کے ردِّعمل میں میرا لہجہ چڑانے والا ہو گیا۔ "یہ تینوں اردو زبان نہیں سمجھتے اس لئے تمہاری گالیاں اور کوسنے بھی رائگاں جائیں گے۔"

کافی وقت گزر گیا۔ دہشت اور بے یقینی کے باوجود ہر ایک تکان کا شکار ہو چلا تھا۔ پہلے ویرا اسی گندی اور کھردری زمین پر دراز ہوئی پھر شنگاریوں نے باری باری پہرا دینے کا فیصلہ کر لیا۔ ان میں سے ایک پہلے بیٹھا رہا۔ بقیہ دو نے اپنی پگڑیاں کھول کر زمین پر بچھائیں اور ان پر لیٹ گئے۔ اس کے بعد غزالہ بھی زیادہ دیر تک بیٹھی نہیں رہ سکی۔ میرا اندازہ تھا کہ آدھی رات گزر چکی تھی۔ ہر طرف سکوت کی حکمرانی تھی۔ جس سے ماحول کی ہیبت میں مزید اضافہ ہو رہا تھا۔ اس وقت بھی قندوز خان کی آمد کے کوئی آثار نہیں تھے۔ صندل خان نے شاید نشے میں ہونے کی وجہ سے ہمیں رات بھر کے لئے اس ٹولی کے حوالے کر دیا تھا۔ مجھے پورا یقین تھا کہ صبح وہ ضرور آئے گا اور اگر اس وقت تک قندوز کی یقین دہانی کے مطابق نقشہ بدلنے والی کوئی کارروائی شروع نہ ہوئی تو ہم پر تشدد کا ناقابلِ برداشت اور لامتناہی سلسلہ شروع ہو سکتا تھا جس میں ہمارے سروں کے نیچے آگ دہکانے کا عمل بھی شامل ہوتا۔

پھر میں چونک پڑا۔ مجھے شبہ ہوا کہ وہ میرا وہم تھا۔ رات کے پُرہول سناٹے میں مجھے دور سے کئی گھنٹیوں کی آوازیں گونجتی ہوئی سنائی دیں۔ پھر حیرت ناک طور پر فضا میں بے شمار گھنٹیاں بجنے لگیں۔ پہرے پر مامور محافظ اچھل کر اٹھا اور اس نے اپنی بندوق کی نال اوپر اٹھا کر گولیاں چلانی شروع کر دیں۔ اس کے ساتھی ہڑبڑا کر اٹھے اور انہوں نے بھی اندھا دھند ہوائی فائرنگ شروع کر دی۔ ان کی گولیاں پھوس کی چھت کو چیر کر اوپر جا رہی تھیں۔ باہر سے بھی فائرنگ کا سلسلہ شروع ہو چکا تھا جو تیزی کے ساتھ شدت اختیار کرتا جا رہا تھا۔ معلوم ہو رہا تھا کہ گھنٹیوں والے نیند سے بیدار ہو کر اس چاند ماری میں شریک ہوتے جا رہے تھے۔

ایک طرف دھواں دھار فائرنگ کے شور سے کان پڑی آواز سنائی دے رہی تھی اور دوسری طرف سے لاتعداد گھنٹیاں بجائی جا رہی تھیں۔ ایسا معلوم ہو رہا تھا جیسے گھنٹی والوں نے گالان کے گرد پھیل کر ایک ساتھ گھنٹیاں بجانی شروع کر دی تھیں اور گولیاں چلانے والے اپنی اپنی جگہوں سے گولیاں چلا کر سردار پائندہ گل سے وفاداری کا اعلان کرنے میں مصروف تھے۔ ویرا اور غزالہ نے خوف زدہ ہو کر اپنی جگہیں چھوڑ دی تھیں۔

اس وقت تک میں نے جو کچھ سنا تھا، اس کے مطابق شنگارا کے کسی بھی حصے میں اچانک ایک گھنٹی بجنے لگتی تھی اور تھوڑی سی فائرنگ کے بعد گھنٹی بجانے والا پُراسرار طور پر کہیں روپوش ہو جاتا تھا مگر اس رات بے شمار گھنٹیاں مسلسل بج رہی تھیں۔ وہ اس ہوائی فائرنگ سے خوف زدہ ہو کر بھاگتے ہوئے نظر نہیں آ رہے تھے۔ شاید قندوز خان کی پیش گوئی درست ثابت ہونے کی گھڑی سر پر آگئی تھی۔

ہمارے ساتھ موجود تینوں شنگاری وحشیانہ چیخ و پکار کے ساتھ اپنے میگزین لوڈ کر کے بے مقصد گولیاں چلاتے رہے۔ وہ کسی طویل لڑائی کی تیاری کر کے نہیں آئے تھے۔ اس لئے تھوڑی ہی دیر میں ان کا گولیوں کا ذخیرہ ختم ہو گیا مگر گھنٹیوں کا شور اپنی جگہ برقرار تھا۔ وقت گزرنے کے ساتھ ان کی گھنٹیوں کی ملی جلی آواز نے ایک عجیب سا جنگی ترنم اختیار کر لیا تھا۔

میگزین خالی ہوتے ہی ان میں سے ایک شنگاری اچھل کر باڑے کے راستے کی طرف دوڑ پڑا۔ بقیہ دونوں افراد نے وہیں کھڑے کھڑے جوش و خروش سے باتیں کرنی شروع کر دیں۔ شاید وہ باہر پھیلی ہوئی ہڑبونگ پر تبادلۂ خیال کر رہے تھے اور جذبات میں آپے سے باہر ہوئے جا رہے تھے۔

"ان سے ہرگز نہ الجھنا۔" ویرا کو دبے قدموں ان کی طرف بڑھتے دیکھ کر میں دہشت زدہ ہو کر چیخ پڑا۔ "اس وقت ان پر درندگی طاری ہو چکی ہے۔ یہ لحاظ کئے بغیر تمہیں ادھیڑ ڈالیں گے۔"

ویرا اپنی جگہ پر رک گئی۔ دونوں آدمیوں نے لمحہ بھر کے لئے اس کی طرف دیکھا اور پھر اپنے مباحثے میں الجھ گئے۔ اُن کے نزدیک شاید ہماری حیثیت ثانوی ہو چکی تھی۔ اصل اہمیت گھنٹیوں کی آواز کی تھی۔

"مشاعرہ ہو رہا ہے۔" سلطان شاہ مسرت سے بولا "گھنٹیاں بج رہی ہیں، گولیاں چل رہی ہیں۔ اگر ہمیں یہاں سے زندہ واپس لوٹنے کا موقع مل سکا تو ہمیں اپنے تجربات پر خود یقین نہیں آئے گا۔ تصادم کا سلسلہ چل نکلا ہے تو اب کچھ نہ کچھ ہو کر رہے گا۔ قندوز خان جھوٹ نہیں بول رہا تھا۔"

"میرا خیال ہے کہ ابھی تصادم نہیں ہوا۔ چھیڑ چھاڑ چل رہی ہے۔" میں نے ہولناک شور پر سے دھیان ہٹائے بغیر کہا "تم غور کرو تو گولیوں اور گھنٹیوں کی آوازوں میں مرنے یا زخمی ہونے والوں کی دردناک چیخیں شامل نہیں ہیں۔"

"تم ٹھیک کہہ رہے ہو۔" سلطان شاہ نے فوراً ہی تائید کی "مقابلہ ہو رہا ہوتا تو وہ لوگ بھی گھنٹیاں چھوڑ کر ہتھیار سنبھال چکے ہوتے۔ ویسے بھی گھنٹیوں کی آواز قدرے دور سے آرہی ہے اور ایک ہی فاصلے پر ٹھہری ہوئی ہے۔ بس ہوا کے ساتھ اس میں کچھ کمی بیشی ہوتی ہوئی محسوس ہو رہی ہے۔"

"باغی بہت چالاک معلوم ہوتے ہیں۔ وہ پائندہ گل کے حامیوں کی کمزوریوں سے فائدہ اٹھا کر اُن کا بھاری ایمونیشن ضائع کرا رہے ہیں۔ یہ گدھے اسی رفتار سے گولیاں برساتے رہے تو چند گھنٹوں میں نہتے رہ جائیں گے۔"

"اس مقصد کے لئے ایک گھنٹی کی آواز بھی کافی تھی۔ انہوں نے اتنا بکھیڑا کیوں پھیلایا ہے؟"

"ایک گھنٹی بج رہی ہوتی تو پائندہ گل کے حامی ابھی تک اس آواز کی سمت میں نکل پڑے ہوتے۔ ہر طرف سے آنے والی آوازوں نے انہیں بُری طرح بدحواس کر دیا ہے۔ بس وہ اپنی اپنی جگہ پر رک کر گولیاں برباد کیے جا رہے ہیں۔ باغیوں کو اپنے مقصد میں نمایاں کامیابی حاصل ہو رہی ہے۔"

"تم نے کہا تھا کہ باغی ان پر للکار کر وار کریں گے لیکن یہ تو شب خون مارا گیا ہے۔"

"جب تصادم ہی شروع نہیں ہوا تو شب خون کیسا؟ ہو سکتا ہے کہ یہ بے شمار گھنٹیاں للکارنے ہی کے لئے بجائی جا رہی ہوں۔ جنگ و جدل کے لئے بھی ان لوگوں نے اپنے اصول بنائے ہوئے ہوں گے۔"

اچانک کوٹھری والے دروازے سے کوئی ہانپتا ہوا اندر داخل ہوا۔ اس کے ہاتھ میں رائفل دبی ہوئی تھی۔ اس نے وہیں رک کر اپنی بولی میں زور سے کچھ کہا، ہمارے دونوں نگراں پلٹ کر اس کی بات سنتے رہے۔ بات ختم کر کے وہ آدمی اسی تیزی سے واپس چلا گیا، جس تیزی سے نمودار ہوا تھا۔ دونوں نگراں بھی بگٹٹ اسی طرف دوڑ پڑے۔ انہوں نے ہماری طرف نظر اٹھا کر بھی نہیں دیکھا تھا۔

میدان صاف ہوتے ہی ویرا ہم دونوں کی طرف دوڑی چلی آئی۔ غزالہ اس کے پیچھے تھی۔

"اس سے پہلے کہ وہ لوگ واپس آئیں، ہماری رسیاں کاٹ

دو" سلطان شاہ بولا۔

"اتنی عقل مجھے بھی ہے۔ تھوڑی دیر تک چپ چاپ لٹکے رہو۔" ویرا نے ترشی سے کہا پھر غزالہ کے ساتھ مل کر میرے پیروں سے بندھی ہوئی رسی کھولنے میں مصروف ہوگئی۔ میں نے ان دونوں کو یاد دلایا کہ میرے ہاتھ بھی بندھے ہوئے ہیں اگر پہلے میرے ہاتھ آزاد کردیے جائیں تو میں خاصی حد تک اپنا بوجھ سہار سکتا ہوں۔

سلطان شاہ کی زبان پھر چل پڑی۔ باہر افراتفری پھیلنے کے بعد وہ کچھ بشاش نظر آنے لگا تھا۔ حقیقت یہ تھی کہ اس تبدیلی سے مجھے بھی خوشی ہوئی تھی۔ اگر باغیوں کو کامیابی حاصل ہوجاتی تو ہمیں بدترین ذہنی اذیت سے فی الفور نجات مل سکتی تھی۔ بصورت دیگر مجھے کابل کی خاک چھاننی پڑتی جس کے نتیجہ خیز ہونے کے بعد ہم لوگوں کو پائندہ گل کے آہنی چنگل سے آزادی مل سکتی تھی۔

میں چند ہی منٹ میں اپنے قدموں پر کھڑا ہوا گیا۔ کئی گھنٹوں تک مسلسل الٹا لٹکا رہنے کی وجہ سے میری پنڈلیاں دُکھنے لگی تھیں اور آنکھوں کے سامنے اندھیرا چھا رہا تھا لیکن وہ وقت ان عارضی تکلیفوں پر دھیان دینے کا نہیں تھا۔ ہم تینوں مل کر سلطان شاہ کو آزاد کرانے میں مصروف ہوگئے۔

سلطان شاہ پوری طرح آزاد نہیں ہوپایا تھا کہ کوٹھری کی طرف سے دھمک سنائی دی۔ ہم سب چونک گئے۔ آنے والا قندوز خان تھا۔ اس کی پشت پر ایک تھیلا لدا ہوا تھا۔ اس نے دروازہ عبور کرتے ہی وہ تھیلا زمین پر رکھا تو لوہے کی ہلکی سی کھنک فضا میں گونج کر رہ گئی۔

"اس تھیلے میں ہتھیار اور فاضل راؤنڈز ہیں۔" اس نے وہیں سے کہا "تم لوگ مشعلیں گل کرکے یہیں چھپے رہو۔ اگر کوئی ادھر آئے تو بے دریغ بھون دینا۔ حالات قابو میں آنے کے بعد میں واپس آؤں گا۔ اس وقت تک تمہیں ہر قیمت پر یہیں چھپے رہنا ہے۔ تم باہر نکلے تو تمہاری زندگی کی کوئی ضمانت نہیں ہوگی۔"

اس کی بات پوری ہونے سے پہلے ہی میں دوڑتا ہوا اس کے نزدیک پہنچ گیا تھا۔ میں نے اس کا بازو تھام کر پوچھا "کم از کم اتنا تو بتاتے جاؤ کہ یہ سب کیا ہو رہا ہے اور آگے کیا ہونے والا ہے؟"

اس وقت میں نے ہر احتیاط کو بالائے طاق رکھ دیا تھا۔ مجھے اندازہ تھا کہ حویلی میں اندرونی حفاظت اور نگرانی کا سارا نظام درہم برہم ہوچکا تھا۔ بیرونی خطرے نے پائندہ گل کے ہر آدمی کے اوسان خطا کردیے تھے۔

"ابھی صرف گھنٹیاں بج رہی ہیں اور دشمن اپنا ایمونیشن برباد کررہا ہے۔ صبح کی پہلی کرن کے ساتھ طبل بجا دیا جائے گا اور دن چڑھے گا لان پر یلغار شروع ہوجائے گی۔" وہ جلدی جلدی بولنے لگا۔ "سب کچھ منصوبے کے مطابق ہوتا چلا گیا تو اندھیرا پھیلنے سے بہت پہلے ہم یہاں قابض ہوچکے ہوں گے۔"

وہ فوراً ہی واپس چلا گیا۔ اس اثنا میں سلطان شاہ بھی سیدھا کھڑا ہوچکا تھا۔ وہ تینوں بہت تیزی سے میری طرف … تھیلے میں سے سب مشین گنیں نکالنے لگا۔ … لیکن تھیلے میں چھ سب مشین گنیں تھیں۔ فاضل … گولیوں سے بھرے ہوئے ڈبوں کی تعداد بہت کافی تھی۔

چاروں نے فوراً ہی اپنی اپنی گنوں میں بھرے ہوئے میگزین چڑھا لئے۔

"مشعلیں بجھا دو۔ ہم اندھیرے میں دروازے کے قریب رہیں گے تاکہ آنے والوں پر پیچھے سے برسٹ مار سکیں۔" … کہا "سناٹا ہونے تک ہم یہیں چھپے رہیں گے۔"

ہتھیار وغیرہ مل جانے کے بعد ہر ایک کا حوصلہ بلند ہوگیا تھا۔ آناً فاناً میں اس متروک باڑے کی تمام مشعلیں بجھا دی گئیں اور ہم دو دو کی ٹولیوں میں دروازے کے دائیں بائیں بیٹھ گئے۔ غزالہ میرے ساتھ تھی اور ویرا، سلطان شاہ کی طرف جا کر …

باہر ہونے والی فائرنگ ماند پڑتے پڑتے رک گئی۔ لوگوں کے پاس فالتو گولیوں کے ذخائر ختم ہوگئے تھے یا نیند کی جھونک میں بستروں سے نکلنے والے مقامیوں کو ہوش آگیا تھا کہ وہ گولیاں برباد کرکے خود اپنی قبر کھود رہے تھے۔ حویلی میں … جانے والی فائرنگ چند منٹ کے بعد ہی رک چکی تھی۔ شاید … والوں کو اپنے میگزین اور جیبیں خالی کرنے کے بعد کمک لینے کے موقع پر ضروری ہدایات دے دی گئی تھیں۔

ہر طرف سے صرف گھنٹیوں کا شور سنائی دے رہا تھا۔ بھانت بھانت کے لاتعداد ہتھیاروں کے بھیانک شور کے بعد وہ آوازیں کم از کم مجھے بہت خوشگوار محسوس ہورہی تھیں۔ … نگرانی کرنے والوں کی مجنونانہ فائرنگ نے پھوس اور مٹی … ہوئی چھت میں کافی بڑا شگاف ڈال دیا تھا جس میں سے تاروں … آسمان نظر آرہا تھا۔ گھور سیاہی میں صبح کے اجالے کی کوئی جھلک موجود نہیں تھی۔

"میں دہل کر رہ گئی ہوں" غزالہ میرے شانے سے سر ٹکا … تھکی ہوئی آواز میں کہہ رہی تھی۔ "اکا دکا جنونی سے تو میرا … پڑ چکا ہے لیکن یہ تو پورا کا پورا قبیلہ وحشی اور خون آشام … ہورہا ہے۔"

"ابھی تو کچھ بھی نہیں ہوا۔ صبح کی روشنی پھیلنے کے ساتھ … یہ پہاڑیاں خون میں نہا جائیں گی۔ ان میں آپس کی رشتے داریاں … چلتی ہیں۔ میری سمجھ نہیں آتا کہ دونوں حریف کس طرح … ایک دوسرے کے خلاف صف آرا ہوسکیں گے۔" میں نے … اظہار کرتے ہوئے کہا۔

"فائرنگ تھم گئی ہے۔ کیا ہمارا یہاں رہنا ضروری ہے؟" … نے لمحہ بھر سکوت کے بعد پوچھا۔

"حویلی کا کنٹرول ابھی تک پائندہ گل کے ہاتھوں میں … وہ ہم سے برہم ہے۔ ہم نے اندر جانے کی کوشش کی تو … لوگ ہمیں الٹا لٹکانے کے بجائے جھلاہٹ میں ماہی … مویشیوں کا باڑہ ہی ہے تو اس میں ریوڑ لانے کا کوئی …"

"… کیا ہم اُدھر سے باہر نکلنے کی کوشش نہیں کرسکتے۔ … کچھ نہ کچھ کرنا ہمارے حق میں بہتر ہوسکتا ہے۔"

"… کی آواز بتا رہی ہے کہ باغی گالان کی ڈھلانوں پر ہر … ہوسکتا ہے کہ حویلی کے گرد پائندہ گل کے … گھیرا قائم کرچکے ہوں۔ اندھیرے میں ہم ان میں سے … کا نشانہ بن سکتے ہیں۔ ہمیں یہیں رہ کر بازی الٹنے کا … مناسب وقت پر قندوز خان خود ہمیں نکالے گا۔"

"… تو بھول ہی گئی تھی۔ تم نے اتنی بھیڑ میں اس قابل … رام کرلیا؟"

… قندوز خان کے بارے میں بتانے لگا۔ دروازے کی … جانب سے بھی دبی دبی سرگوشیوں کی آوازیں آرہی تھیں۔ … سلطان شاہ کے لئے یکجا ہو کر خاموش رہنا بہت دشوار تھا۔

… قریب ہی ایک ایک رائفل کے دو فائر ہوئے پھر سناٹا … شاید پائندہ گل کے آدمی باغیوں کو یہ جتانا چاہ رہے تھے کہ وہ … طرح چوکنے ہیں اور ان کی چال کو سمجھ چکے ہیں۔ اس لئے … فائرنگ موقوف کرکے اُن کے خوں ریز استقبال کے لیے … لگائے بیٹھے تھے۔

"کیا تمہیں یہ بات عجیب نہیں معلوم ہو رہی کہ خنک رات … سے آدمی چٹانوں پر بیٹھے گھنٹیاں بجائے چلے جارہے ہیں … ان کا خاطر خواہ رد عمل کافی دیر سے موقوف ہوچکا ہے؟" … پوچھا۔

"یہاں کی ہر بات عجیب بلکہ ناقابلِ فہم ہے۔ تمہیں کوئی … بات نظر آئی ہو تو بتاؤ!"

مجھے اپنے سوال کا جواب چند منٹ بعد مل گیا۔ باغیوں نے … کے انداز میں اپنی حرکتوں کا ناقدانہ جائزہ لے کر گھنٹیاں … بند کردیں۔ ان کی اس عقل مندی کے نتیجے میں ہر طرف گہرا … طاری ہوگیا۔ مجھے اس خاموشی سے الجھن ہونے لگی۔ جب … دھند فائرنگ چل رہی تھی، ہم لوگ بھی اپنے کسی حریف … فکری سے باڑے پر رکھ سکتے تھے۔ افراتفری اور شور میں کسی … اندازہ نہ ہوپاتا کہ ہم نے متروک باڑے میں آتشیں ہتھیار … کئے ہیں۔ سناٹے میں چلائی جانے والی ایک گولی بھی بھڑکے … کو دیوانہ بنا سکتی تھی۔

"شاید میری بات باغیوں تک پہنچ گئی۔" خاموشی چھا جانے … غزالہ بولی۔ میرا ساتھ میسر آجانے پر اس کے لب ولہجے میں … اور طمانیت کے ساتھ شیرینی بھی پیدا ہوگئی تھی۔ اس کی … اندازہ ہی نہیں ہو رہا تھا کہ وہ تھوڑی دیر پہلے بہت زیادہ … اور پریشان تھی۔

"اب اگر کوئی اِدھر آنکلا تو ہم اسے گولیوں کا نشانہ نہیں بنا …"

"… سوچ بچار نہ کرو۔" وہ بے پروایانہ لہجے میں بولی "کوئی آئے تو آنکھیں بند کرکے اسے بھون دو۔ قندوز خان کے لائے ہوئے تھیلے میں گولیوں کی اتنی وافر مقدار ہے کہ ہم بہت دیر تک اپنا دفاع کرسکتے ہیں۔"

"مجھے خوشی ہے کہ تمہارا حوصلہ اتنا بلند ہے لیکن دعا کرو کہ ہمیں اس آزمائش سے نہ گزرنا پڑے۔"

"یہ دعا تو میں نے زبان نہ کھولنے سے پہلے ہی مانگ لی تھی۔"

اس نے کہا اور دبی دبی آواز میں ہنس پڑی۔ مجھے یوں محسوس ہوا جیسے میرے کانوں میں ہزاروں جلترنگ دھیمے سروں میں بج اٹھے ہوں۔ میں اسی سُرور میں کھویا ہوا تھا کہ کسی ہیولے نے مجھے بری طرح چونکا دیا۔ میرا ہاتھ بے اختیار اپنی سب مشین گن پر گیا لیکن اسی لمحے سلطان شاہ بول پڑا "یہاں تو سارا کھیل ہی ماند پڑ گیا۔ ہم کب تک اندھیرے میں دبکے بیٹھے رہیں گے؟ مجھے وحشت ہورہی ہے۔ تم نے کہا تھا کہ ہمیں سناٹا ہونے تک یہاں رہنا ہوگا۔"

"یہ عارضی سناٹا ہے۔ اصل گڑبڑ اجالا پھیلنے کے بعد شروع ہوگی۔ فی الحال خاموشی سے اپنی جگہ بیٹھے رہو۔"

"عجیب مصیبت ہے۔" وہ بڑبڑایا "پھر ایسا کرو کہ ویرا کو میرے پاس سے ہٹا دو۔"

"کیوں؟ کیا وہ تمہیں کھا رہی ہے؟" اس کی بے وقت کی راگنی پر مجھے غصہ آگیا۔

"تھوڑی سی آزادی اور ایک گن مل جانے کے بعد اس پر خرمستیاں سوار ہورہی ہیں۔" اس کی آواز سے بے بسی مترشح تھی۔ "ہر پانچ منٹ کے بعد اسے اپنے کپڑوں میں کسی کیڑے کے گھس جانے کا وہم ہورہا ہے۔ اتنے گہرے اندھیرے میں کیڑوں کو تلاش کرنا میرے بس سے باہر ہے مگر وہ مجھے تنگ کرنے پر تلی ہوئی ہے۔ تم تھوڑی دیر کے لئے غزالہ کو ادھر بھیج دو تاکہ یہ اس کے سارے کیڑے جھاڑ دے۔ میں تمہارے ساتھ بیٹھ جاتا ہوں۔"

"میں نے دانستہ دونوں عورتوں کو یکجا نہیں کیا۔ کوئی ادھر آنکلا تو حملے میں پہل مجھے یا تم کو کرنی ہوگی۔ ان وحشیوں کو زیر کرنا ان عورتوں کے بس کی بات نہیں ہے۔ چلو! واپس اپنی جگہ پر جاؤ۔"

"وہ عورت نہیں، پوری پوری مصیبت ہے۔ تم ہی ادھر چلے جاؤ۔" وہ ڈھٹائی سے وہیں بیٹھ گیا۔

"کبھی کبھی اس کی بات بھی مان لیا کرو۔" غزالہ نے نرمی سے اس کی سفارش کی۔ "تمہیں معلوم ہے کہ وہ اکثر اس کے ساتھ شرارتوں پر تلی رہتی ہے اور یہ بے زار ہوتا ہے۔"

میں نے ایک گہرا سانس لے کر اپنی جگہ چھوڑ دی اور وزنی تھیلا اٹھا کر ویرا کی طرف چل دیا۔

"ہلو!" ویرا نے سرگوشیانہ لہجے میں میرا استقبال کیا "مجھے معلوم تھا کہ اب تم میرے پاس آؤ گے۔"

"تم پاگل ہو۔ مجھے سلطان شاہ نے زبردستی ادھر بھیجا ہے۔" میں نے جھلا کر کہا۔

"کیا میں اسے کاٹ رہی تھی؟" اس نے تند لہجے میں سوال

کیا۔

"تم نے اس کے ساتھ کیڑوں کا کیا چکر چلایا ہوا تھا؟" میں نے برہمی سے پوچھا۔

"کیڑے؟" اس کی آواز تحیر زدہ تھی۔ "میں اسے یہ بتا رہی تھی کہ کبھی کبھی اس کے دماغ کے کیڑے مجھے اپنے بدن پر رینگتے ہوئے محسوس ہوتے ہیں۔ اس نے یہ بات تمہارے کان میں بھی پھونک دی؟"

"بعض اوقات تمہاری یہ حرکتیں ناقابل برداشت......" میں بولتے بولتے یکایک خاموش ہوگیا کیونکہ میرے کانوں نے کسی کے قدموں کی دھمک محسوس کی تھی۔ شاید کوٹھری سے باہر والی راہداری میں کوئی موجود تھا۔

اس وقت تک میں ان لوگوں سے جو کچھ بھی کہتا رہا' اس سے قطع نظر مجھے یہ اطمینان تھا کہ ہم لوگ حویلی کے عقب میں بنے ہوئے باڑے میں موجود تھے اور کوٹھری سے ملحق راہداری عموماً ویران ہی رہتی تھی پھر گھنٹیوں کے شور نے جو فضا پیدا کردی تھی' اس کے نتیجے میں سارے شکاریوں کا رخ پائندہ گل کے کمرے یا حویلی کے کھلے صحن کی طرف ہونا چاہئے تھا جہاں فیصلے کیے جاسکتے تھے۔ اس دور افتادہ حصے میں کسی کی غیر ضروری آمدورفت کا امکان کم ہی تھا لیکن باہر سے سنائی دینے والی آہٹوں نے مجھے مضطرب کردیا تھا۔

وہ آہٹیں قریب آنے کے ساتھ ہی واضح ہوگئیں۔ کوئی تنک کوٹھری میں داخل ہوا اور میں اپنی سب مشین گن تھام کر سیدھا کھڑا ہوگیا۔ بند دروازہ کھلا لیکن فوراً کوئی نمودار نہیں ہوا۔ شاید وہ کوٹھری میں رک کر باڑے میں پھیلی ہوئی تاریکی کا جائزہ لے رہا تھا۔ ویرا ابھی اس وقت تک میرے ساتھ پوزیشن لے چکی تھی۔

کوٹھری میں سے ایک دھیمی مردانہ آواز ابھری۔ اس کا مختصر سا فقرہ ناقابل فہم تھا لیکن لہجہ استفسار طلب تھا۔ ہوسکتا ہے کہ اس نے مقامی بولی میں کوئی سوال کیا ہو۔

لمحہ بھر انتظار کرنے کے بعد اس نے باڑے میں آنے کا فیصلہ کرلیا۔ جوں ہی اس کا سر' دروازے کے تاریک خلا میں سے نمودار ہوا' میں نے اپنی سب مشین گن کی نال تھام کر اس کا وزنی دستہ پوری قوت سے اس پر رسید کردیا۔ مجھے خوف تھا کہ کہیں مجھ سے پہلے کوئی فائر نہ کھول بیٹھے کھٹ کی آواز کے ساتھ ہی آنے والے کے منہ سے ہلکی سی کراہ نکلی اور وہ منہ کے بل زمین پر ڈھیر ہوگیا۔ اس کی پنڈلیاں کوٹھری میں ہی رہ گئیں تھیں۔

وہ باریش وجود بہت وزنی تھا۔ سلطان شاہ کی مدد سے میں نے اسے باڑے میں گھسیٹ کر دروازہ بند کردیا۔ دونوں عورتوں کو ہوشیار رہنے کی ہدایت کرکے ہم اپنے شکار کو گھسیٹتے ہوئے ایک دور افتادہ گوشے میں لے گئے جہاں وہ آسانی سے نظر نہیں آسکتا تھا۔

"نرخرا دبا کر اس کا قصہ تمام کردو۔" میں نے سرد لہجے میں سلطان شاہ سے کہا۔

وہ جھکا اور کوئی مشقت کئے بغیر چند ثانیوں بعد ...

"اس کی کھوپڑی کا حشر کسی خربوزے جیسا ہوا ہے ... ہے اور دل بے جان۔ آؤ' واپس چلتے ہیں۔"

وہ کون تھا اور کس ارادے سے وہاں آیا تھا' یہ سب ... اہم تھے۔ اطمینان بخش بات یہ تھی کہ ہماری آزادی کو لاحق ہونے والا ایک سنگین خطرہ بہت خوش اسلوبی کے ساتھ ٹل گیا تھا۔ ... والے نے واحد جملہ مقامی بولی میں ادا کیا تھا۔ اس کا ... مطلب تھا کہ اسے باڑے میں کسی شکاری کی تلاش یا موجودگی کی توقع تھی۔ وہ اکیلا ہی اس طرف آیا تھا لیکن اس کے بعد کوئی ... اسی امید یا تلاش میں ادھر نازل ہوسکتا تھا۔ میں نے ان تینوں کو یکجا کرکے سخت لہجے میں اس خطرے سے آگاہ کردیا اور انہیں تاکید کی کہ میری طرف سے اجازت کے بغیر کوئی گولی نہیں چلائے گا۔ ... پہلی کامیابی کے بعد اس فیصلے پر اعتراض کی کوئی گنجائش نہیں ... تھی۔

پائندہ گل کے حامیوں کی طرف سے گاہے گاہے اکا دکا ... ہوتے رہے لیکن گھنٹیوں کا شور ایک بار ختم ہونے کے بعد دوبارہ سنائی نہیں دیا۔ اپنی سزایابی کے دوران اس وقت ایک جگہ ٹھہرا ... معلوم ہورہا تھا لیکن آزادی ملنے کے بعد وقت گزرنے کا ... احساس نہیں ہوا۔ حتیٰ کہ چھت کے چوڑے شگاف میں سے ... پر ہلکی سی سفیدی نظر آنے لگی اور گالان کی فضا میں گرجدار نقارے ... دن دنا دن گونجنے لگی۔ اس وقت تک قندوز خان کا کہا ہوا ہر ... درست ثابت ہوتا چلا آیا تھا۔ باغیوں کی طرف سے طبل جنگ بجا دیا گیا تھا اور سردار پائندہ گل کی قلعہ بند حویلی پر کسی بھی لمحہ ... کشی کا آغاز ہوسکتا تھا جو دونوں میں سے کسی ایک فریق کی مکمل ... تک جاری رہتی۔

جنگی نقارے کی بلند آواز میں موت کی ہیبت رچی ہوئی تھی۔ ... باڑے کے درودیوار سے مجھے اچانک ہی حسرت جھلکتی نظر آنے لگی۔ شکار اولی میں سردار پائندہ گل کی عظمت وجبروت کی ... نشانیاں کسی بھی وقت گھنٹیوں والوں کے ہاتھوں پامال ہونے والی تھیں۔ معاً مجھے خیال آیا کہ میں اس جنگ کے پہلے مقتول کو ... میرے ہاتھوں مارا گیا تھا' دن کے اجالے میں دیکھ لوں تاکہ معلوم ہوسکے کہ وہ کون تھا۔

میں اپنی سب مشین گن سمیت اس طرف چل دیا جہاں ... لاش پڑی ہوئی تھی۔ سینہ تک آئی ہوئی بے ترتیب داڑھی ... گھونگریالے بالوں کی بنا پر میں نے اسے دور ہی سے پہچان لیا۔ ... ان دو مقامیوں میں سے ایک تھا جو پچھلی صبح صندل خان کے ساتھ ہماری انگریزی بول چال کی تحقیقات کرنے آئے تھے۔ وہ صندل خان کا حریف' شاہ وزیر نہیں تو اس کا ساتھی ضرور تھا۔ اس کی کھلے ہوئے پپوٹوں میں پتلیاں اوپر چڑھی ہوئی تھیں اور آنکھوں سے جھانکتی ہوئی غیر فطری سفیدی بہت بھیانک لگ رہی تھی۔ وہ ... زمین پر چت پڑا ہوا تھا۔ اس کی پچکی ہوئی کھوپڑی سے بہنے والا خون خاصی دور تک لوتھڑوں کی صورت میں جم گیا تھا۔

عجیب اتفاق تھا کہ صندل خان' پائندہ گل کے وفاداروں کی ... میں شامل تھا اور میں نے باغیوں سے سازباز کرنے کے باوجود' ... میں سب سے پہلے اسی کے حریف یا اس کے کسی قریبی ... کو ہلاک کیا تھا۔

... اپنی جگہ پر واپس لوٹ آیا۔ اجالا تیزی کے ساتھ پھیلتا ... رہا تھا۔ رات کے اندھیرے میں ہمارے لئے خود کو چھپائے رکھنا ... آسان تھا لیکن روشنی پھیلنے کے بعد وہ آسانی ہم سے رخصت ... ہوگئی تھی۔ سایہ دار باڑے میں سپاٹ زمین اور چوبی سہاروں پر ... کے ہوئے چھپر کے علاوہ کوئی ایسی آڑ نہیں تھی جو ہمیں پناہ فراہم کرسکے۔ بس وہ کوٹھری تھی جو ایک صندوق کی صورت میں باڑے میں بڑھی ہوئی تھی۔ ہمارے لئے اس کی بغلی دیواروں کی اوٹ کے علاوہ کوئی جائے پناہ نہیں تھی۔ ہم سامنے سے ہٹ کر دیواروں کے ساتھ بیٹھ گئے۔

جنگی نقارہ کافی دیر تک گونجتا رہا۔ پھر حویلی کے کسی حصے میں ... یکے بعد دیگرے' رائفل کے تین فائر ہوئے اور نقارہ خاموش ہوگیا۔ وہ عمل اتنا ہم آہنگ تھا کہ لمحہ بھر کے لئے شبہ ہوتا تھا کہ رائفل کی تیسری گولی نے نقارے پر تنتے ہوئے چمڑے کو پھاڑ ڈالا ... لیکن ایسا نہیں تھا کہ نقارہ دوبارہ بج رہا تھا۔ گولیاں حویلی سے ... آئی تھیں۔ اس خون آشام قبائلی ماحول میں کئی دن گزارنے کے بعد میرے لئے یہ سمجھنا بہت مشکل نہیں رہا تھا کہ باغیوں نے نقارہ پیٹ کر اعلان جنگ کیا تھا اور حویلی والوں نے گولیاں داغ کر مقابلہ کرنے کا اعلان کردیا تھا۔

یہ ہماری خوش قسمتی تھی کہ الٹا لٹکائے جانے کے دوران میں مجھے یا سلطان شاہ کو قے نہیں ہوئی تھی اس لئے ہمارے پیٹ بھرے ہوئے تھے۔ بڑی قاب کو خالی کرنے کے چکر میں ہم چاروں نے پرخوری کا مظاہرہ کیا تھا اس لئے کسی کو بھوک نہیں لگ رہی تھی البتہ رات کی بسیار نوشی کی وجہ سے ویرا کو پیاس ستانے لگی تھی۔ اندھیرے میں دیا سلائی کی روشنی اور جلتی ہوئی سگریٹ کے روشن شرارے کے دیکھ لئے جانے کے خوف سے میں نے رات بھر سگریٹ نوشی سے احتراز کیا تھا۔ سورج کی روشنی میں وہ خطرہ نہیں رہا تھا۔ میں نے اپنے لئے سگریٹ سلگائی تو ویرا نے بھی بے تابانہ انداز میں ایک سگریٹ مانگ لی۔

صبح کا ملگجا اجالا بہت سرعت کے ساتھ چمکیلی دھوپ میں بدلتا چلا گیا۔ میرے لئے ایک ایک لمحہ اعصاب شکن ثابت ہورہا تھا۔ ... کار باہر سے بہت بڑے غول کے شوروغل کے ساتھ زبردست فائرنگ شروع ہوگئی۔ جواب میں ہونے والی فائرنگ نے قیامت کا سماں باندھ دیا۔ اس بار ہیجانی شور میں کربناک انسانی چیخیں بھی شامل تھیں۔ انسانوں کی آزادی اور بہبود کے نام پر خون کی ہولی شروع ہوچکی تھی۔

اس باڑے میں بیٹھ کر میں باہر کی صورت حال کے بارے میں صرف قیاس ہی کرسکتا تھا اور وہ قیاس بہت لرزہ انگیز تھا۔ فائرنگ میں ملے جلے ہتھیار استعمال ہو رہے تھے۔ حملہ آوروں کی طرف سے شاید راکٹ لانچرز بھی استعمال کیے جانے لگے تھے۔ زناٹے کی آوازوں کے ساتھ ہلکے دھماکے سنائی دینے لگے تھے۔ ان کے جواب میں حویلی والوں نے بھاری ہتھیار آزمانے شروع کردیئے تھے۔ ان کی گھن گرج سے باڑے کی چوڑی دیواریں تک لرز رہی تھیں۔ فائرنگ اور بارودی دھماکوں کی شدت سے اندازہ ہورہا تھا کہ باہر گھمسان کا رن پڑا ہوا تھا۔ ہم سب ایک جگہ جمع ہوچکے تھے۔

"خدا کی پناہ!" ویرا بڑبڑائی۔ "یوں معلوم ہوتا ہے جیسے آج گالان کی پوری آبادی نیست ونابود ہوجائے گی۔ آبادی والے حصے میں تو اب تک بہت بڑی تباہی پھیل چکی ہوگی۔"

"یہ سب مکافات عمل کا ایک حصہ ہے۔" میں نے سرد لہجے میں کہا "یہ لوگ ناقابل تسخیر پہاڑوں میں بیٹھ کر ہمارے شہروں میں موت کی سوداگری کررہے ہیں۔ اس وادی میں تیار ہونے والی ہیروئن' نہ جانے کتنے جوانوں کو کراہت انگیز موت کی اندھی وادیوں میں دھکیل چکی ہے۔ آج ان کا بھیانک جرم ان کے سروں پر موت کا شیطانی ناچ ناچ رہا ہے۔ جن خود غرض درندوں کے سامنے دنیا کا ہر قانون بے بس ہوچکا تھا ان کی سرکوبی کے لئے قدرت کا اپنا قانون حرکت میں آجاتا ہے۔ دیکھ لو کہ افیم پیدا کرکے' اس سے ہیروئن کشید کرنے والے آج آپس میں ٹکرا رہے ہیں۔ یہ لڑائی شاید اندھیرا پھیلنے سے پہلے اپنے انجام کو پہنچ جائے لیکن یہ لوگ برسوں اپنے زخم چاٹتے رہیں گے۔"

"مجھے اپنی عافیت کی فکر ہے اور تم اس کڑے وقت میں بھی یہ سوچ رہے ہو؟" ویرا نے حیرت سے آنکھیں پھاڑ کر کہا "یہاں بسنے والے سب لوگ موت کے سوداگر نہیں ہیں' یہ دھندا تو پائندہ گل چلا رہا ہے۔"

"باغیوں کی نظریں بھی ہیروئن کی اندھی آمدنی پر لگی ہوئی ہیں۔" میں نے زہریلی ہنسی کے ساتھ کہا "یہ سب ایک ہی تھیلی کے چٹے بٹے ہیں۔ ہر شخص ہیروئن کی تباہ کاریوں سے واقف ہے اس لئے ان پہاڑوں میں ایک گرام ہیروئن بھی استعمال نہیں ہوتی۔ پتھر کے آرام دہ اور خوب صورت مکانوں میں دن رات اپنی عورتوں اور بچوں کے ساتھ مست رہنے والے یہ کیوں نہیں سوچتے کہ پائندہ گل ان سے کوئی کام لئے بغیر' انہیں ساری آسائشیں کہاں سے فراہم کرتا ہے؟ یہ سب اس جرم میں شریک ہیں۔ انہوں نے اپنے عیش و آرام کے لئے دوسروں کو تباہ کرنے پر کمر باندھی ہوئی ہے اور آج ان کی تباہی کی باری ہے۔ تم خاموشی سے تماشا دیکھتی رہو۔ شاید اس گھناؤنے دھندے کا یہی ایک رخ آج تک میری نگاہوں سے اوجھل تھا جو اب سامنے آگیا ہے۔"

"ڈیبی!" اچانک باہر سے ایک بگڑی ہوئی اور وحشت زدہ آواز گونجی۔ "میں قندوز خان ہوں۔"

بھاگتے ہوئے قدموں کی آواز کے ساتھ کوٹھری کا دروازہ کھلا

اور قندوز خان ابتر حالت میں باڑے میں آگیا۔ اس کی رائفل کی نال اور لباس سے ملے جلے بارود کی تیز بو آرہی تھی۔ ہم چاروں نے بھرپور تجسس کے ساتھ اسے گھیرلیا۔ وہ چڑھے ہوئے سانسوں کے درمیان بولا "بہت لوگ مر رہے ہیں۔ ہمارے سردار' صبغت اللہ نے اپنے آدمیوں کا حوصلہ بڑھانے کے لئے سامنے آنے کا فیصلہ کرلیا ہے۔ اب حویلی میں بھی بارود چلے گا — تم لوگ باہر آکر راہداریاں سنبھال لو۔ جو بھی ادھر کا رخ کرے اسے گرا دو۔ ہمارے آدمی ادھر نہیں آئیں گے۔ ہم سب پائندہ گل کا گھیراؤ کریں گے۔ اس کی لاش گرتے ہی لڑائی بند ہوجائے گی۔"

صبغت اللہ کا نام سنتے ہی مجھے ذہنی جھٹکا لگا۔ پچھلی رات تک وہ کسی خوشامدی کی طرح پائندہ گل کی خوشنودی حاصل کرنے میں لگا ہوا تھا لیکن درپردہ اس کے خلاف سازش کا جال تیار کررہا تھا۔ وہ بادرانی تھا اور اس نے سوچے سمجھے بغیر مجھے قاب الٹی کرکے اپنا پیغام پہنچانے کا مشورہ دیا تھا۔ صندل خان نے بالکل صحیح کہا تھا کہ بادران والوں کا خفیہ طریقہ تھا اور حویلی میں موجود کوئی بادرانی پائندہ گل سے نمک حرامی کررہا تھا۔

قندوز خان اس وقت اعصاب زدہ ہورہا تھا۔ وہ مجھے تقریباً کھینچتا ہوا' اپنے ساتھ راہداری میں لے گیا "بس یہ تمہارا مورچا ہے۔ یہاں ڈٹ کر آنے والوں کا مقابلہ کرو۔"

وہ میرا جواب سنے بغیر' دوڑتا ہوا واپس چلا گیا۔ سلطان شاہ فاضل راؤنڈز اور میگزین کا تھیلا کوٹھری میں لے آیا تھا۔ ہم سب نے اپنے لباسوں میں فاضل راؤنڈز بھرنے شروع کردیئے۔ بھرے ہوئے میگزین نیفوں میں اڑس لئے گئے اور ہم نے راہداری کے دونوں سروں پر اپنی نظریں جمادیں۔

باہر سے آنے والی آوازیں اپنے عروج پر تھیں۔ چھوٹے اور بڑے بور کے ہتھیار گرج رہے تھے۔ انسانی چیخوں اور آہ وبکا کا شور بھی سنائی دے رہا تھا۔ پھر ہم سے بہت قریب' ایک زوردار دھماکا ہوا۔ ہم اپنی جگہ پر لرز کر رہ گئے۔ سلطان شاہ نے کوٹھری کا دروازہ کھولا اور فوراً ہی بند کردیا۔ شاید کوئی راکٹ اس باڑے پر آکر گرا تھا۔ اس کا بڑا حصہ منہدم ہوچکا تھا اور فضا گرد وغبار سے اٹی ہوئی تھی۔ قندوز خان کو گئے ہوئے زیادہ دیر نہیں ہوئی تھی کہ حویلی کے اندرونی حصوں میں بھی گولیاں چلنے لگیں۔ ویرا نے فوراً ہی اپنی سب مشین گن سیدھی کرکے راہداری میں ہلکا سا برسٹ ماردیا۔

"یہ کیا کررہی ہو؟" میں نے اضطراری لہجے میں کہا "ہم میدان میں اتر چکے ہیں۔ اس وقت ایک ایک گولی بہت قیمتی ہے ہم تھیلا اپنے ساتھ لٹکائے نہیں پھریں گے۔"

اس کی آنکھوں میں چمک پیدا ہوگئی تھی۔ وہ ہنس کر بولی "کافی دنوں بعد سب مشین گن چلائی ہے۔ مزہ آگیا۔ تم فکر نہ کرو۔ میں تھیلے کی آخری گولی بھی استعمال کرکے رہوں گی۔ قندوز خان نے ڈھیل دی ہے تو اب میں تمہیں اپنا تماشا دکھاؤں گی۔ ہمیں دونوں حریفوں کے ساتھ برابری کا سلوک کرنا ہوگا۔"

گولیوں کی تڑتڑاہٹ سن کر میں تیزی سے پلٹا تو سلطان شاہ راہداری کے دوسرے سرے کی طرف برسٹ مار رہا تھا جبکہ راہداری آخر تک خالی پڑی تھی۔

"کیا ہم سب پاگل ہوگئے ہیں؟" میں غصے کے عالم میں چیخ پڑا۔

"خون گرم کررہا تھا۔" سلطان شاہ بولا۔ "ادھر ہمارا کمرا ہے۔ وہاں ایک بوتل میں کافی شراب بچی ہوئی ہے۔ میں ویرا کے لیے وہ بوتل لے کر آتا ہوں۔" وہ میرے کچھ بولنے سے پہلے کمرے کی طرف ہولیا۔

"اس وقت کوئی تمہاری بات نہیں سنے گا۔ ہر ایک کو اس کے حال پر چھوڑ دو۔ جو زندہ بچے گا وہ کراچی لوٹ جائے گا۔ تم نے سنا نہیں کہ مجھ سے ہروقت بھڑکنے والا میرے لیے شراب لانے کے لیے گیا ہے!" ویرا استہزائیہ لہجے میں کہہ رہی تھی۔ "ہم لوگوں نے تمہاری سوچ اپنالی ہے تو اب تم فکرمند کیوں ہورہے ہو؟"

میں دل ہی دل میں پیچ و تاب کھا کر رہ گیا۔ پتا نہیں وہ شکاریوں سے اپنے مصائب کا انتقام لینے پر تل گئے تھے یا واقعی انہیں ہیروئن کے فروغ کی سزا دینے کا ارادہ رکھتے تھے۔ اُن کی نیتوں کا حال ان ہی کو معلوم تھا۔ مجھے حیرت اس بات پر تھی کہ ویرا کی پیاس بجھانے کے لیے سلطان شاہ کمرے سے پانی کے بجائے شراب لینے گیا تھا جبکہ وہ ہروقت میری اور ویرا کی مے نوشی پر کڑی تنقید کرتا رہتا تھا۔

حویلی کے اندر تواتر سے فائرنگ ہونے لگی تھی۔ سلطان شاہ بوتل لے کر آیا تو ویرا نے دو گھونٹ لینے کے بعد میری طرف دیکھا۔ میں نے غزالہ سے نظریں چرا کر ایک لمبا گھونٹ اپنے حلق میں انڈیل لیا۔ اسی وقت سامنے سے دو آدمی دوڑتے ہوئے نمودار ہوئے۔ ویرا نے بایاں گھٹنا زمین پر ٹیک کر ان دونوں کو باڑھ پر رکھ لیا۔ ان کے جسموں سے خون کے کئی فوارے ابل پڑے اور وہ دلخراش چیخوں کے ساتھ وہیں ڈھیر ہوگئے۔

"میں پائندہ گل کی طرف جارہا ہوں۔ یہ باڑہ شاید فرار کا خفیہ راستہ ہے۔ تم لوگ یہاں سے نہ ہلنا۔" میں نے یہ کہہ کر آگے بڑھنا چاہا لیکن غزالہ نے میرا بازو پکڑ لیا۔ اس کا کہنا تھا کہ اپنے منفرد خدوخال کی وجہ سے میرا خونخوار مقامیوں کی بھیڑ میں سے زندہ نکلنا محال تھا۔

ایک مرتبہ پھر راہداری میں کچھ لوگ نمودار ہوئے لیکن اپنے دونوں ساتھیوں کی لاشیں دیکھتے ہی وہ زمین پر گر گئے۔ میں بھی سینے کے بل زمین پر لیٹ گیا۔ ویرا' غزالہ کا ہاتھ تھام کر بجلی کی سی سرعت سے بغلی کوٹھری میں رینگ گئی۔ میں نے اپنی سب مشین گن کا دہانہ کھول دیا۔ دوسری طرف سے جوابی فائرنگ ہوئی اور گولیاں میرے اوپر سے گزر گئیں۔ اسی وقت ویرا اپنی کمین گاہ سے نکلی۔ اس نے دیوار کے سہارے کھڑے ہوکر ان لوگوں پر پورا میگزین خالی کردیا اور فضا ان کی دلدوز چیخوں سے لرز اٹھی۔ ویرا دوبارہ کوٹھری میں

ب ہوگئی۔
حویلی میں ہونے والی بغاوت نے پائندہ گل کے آدمیوں کے پیر اکھاڑ دیئے تھے کیونکہ دوسری طرف سے پہلا شکار آیا اور سلطان شاہ نے سفاکانہ انداز میں اس کا پورا بدن چھلنی کردیا۔ پائندہ گل کی براہ راست سرپرستی میں حویلی کے اندر پرورش پانے والے جرم کی سنگینی ہر شک وشبہ سے بالاتر تھی۔

ویرا میگزین لوڈ کرکے ایک بار پھر باہر نکل آئی۔ اس نے مسلح دشمنوں کے سامنے کھڑے ہوکر اپنی جان کی بازی لگائی تھی۔ ویرا کے بجائے' مقامیوں کو فائرنگ کرنے میں پہل کرنے کا موقع مل جاتا تو اس کے جسم کے چیتھڑے اڑ جاتے لیکن اس وقت ویرا کے سر پر جنون سوار ہوچکا تھا اس لیے اسے سمجھانا بے سود تھا۔

ہم لوگ اس چوہے دان میں گھات لگائے بیٹھے رہے۔ مقابلے سے بھاگنے والوں کی کئی ٹولیاں آئیں اور بری طرح لہولہان ہوئیں۔ کچھ مارے گئے' بعض زخمی ہوکر وہیں تڑپتے اور گھسٹتے رہے۔ اکادکا افراد دور ہی سے خطرہ بھانپ کر واپس بھاگ لیے۔ وہ راہداری خاصی کشادہ تھی لیکن ہر سرے پر متعدد دیوہیکل جسموں کے ڈھیر ہونے سے راستہ بالکل مسدود ہوکر رہ گیا تھا۔ پھر شاید واپس بھاگنے والوں نے بھی اس راہداری پر ہمارے قبضے کی خبر پھیلا دی۔ اس لیے تھوڑی دیر بعد ہی بھگوڑوں کی اس طرف آمد کا سلسلہ رک گیا۔ اس خونریزی میں غزالہ نے سرے سے حصہ نہیں لیا تھا۔ ہم تینوں کو بھی اس کی مدد کی ضرورت محسوس نہیں ہوئی تھی۔

حویلی کے اندر اور باہر لڑائی جاری رہی۔ فائرنگ کا ابتدائی زور ٹوٹ گیا تھا۔ جوش و خروش میں اندھا دھند گولیاں برسانے کے بجائے شاید نشانوں کو تاک تاک کر فائر کیے جانے لگے تھے۔ کافی دیر بعد حویلی میں ایک غلغلہ بلند ہوا۔ آثار نعرہ بازی کی طرف اشارہ کررہے تھے۔ حویلی کے اندر ہونے والی جنگ پر اس شور کا نمایاں اثر ہوا۔ تھوڑی ہی دیر میں بارود کی شور دم توڑنے لگا اور بتدریج وہ سلسلہ ختم ہوتا نظر آنے لگا۔

بھگوڑوں کی آمد کا سلسلہ موقوف ہوجانے کے باوجود ہم تیار بیٹھے ہوئے تھے کہ قندوز خان لاشوں اور زخمیوں کو پھلانگتا ہوا ہمارے پاس آپہنچا۔ اس نے سب سے پہلے ویرا سے ہاتھ ملایا پھر نہایت گرم جوشی سے مجھ سے لپٹ کر فرط جذبات سے رندھی ہوئی آواز میں بولا۔ "مبارک ہو' ہم نے پائندہ گل کو مار لیا ہے۔ اس کے حمایتی بہت تیزی کے ساتھ ہتھیار ڈال رہے ہیں۔ یہ جنگ ہم نے جیت لی ہے۔" میرے سینے سے الگ ہوکر اس نے دونوں ہاتھ میرے ساتھ مصافحہ کیا تو میری انا کو بہت سکون ملا۔ وہ پہلا شکاری تھا جس کی نرم وگداز ہتھیلیوں کا دوستانہ دباؤ میں نے محسوس کیا تھا۔ اس نے سلطان شاہ سے بھی معانقہ اور مصافحہ کیا۔ غزالہ سے نرماہٹ سے ہاتھ ملایا پھر ہمارے ساتھ راہداری میں پڑے ہوئے لوگوں کا جائزہ لینے میں مصروف ہوگیا۔

ان کی کل تعداد چودہ تھی۔ ان میں سے آٹھ زندگی کے بکھیڑوں سے نجات پاچکے تھے۔ چھ افراد بری طرح زخمی اور بے ہوش تھے۔ بے رحمانہ فائرنگ کی وجہ سے ساری لاشیں بری طرح ادھڑی ہوئی تھیں۔

"ان کا بھی قصہ تمام کردیا جائے؟" ویرا نے مشین گن کی نال سے زخمیوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے پوچھا۔

"نہیں۔" اس نے سختی سے کہا۔ "ہمارے رواج کے مطابق ہتھیار ڈالنے والوں کے زخمی اب ہماری امان میں ہیں۔"

ان لوگوں کی ہر بات انوکھی اور نرالی تھی۔ وہ ایک طرف غدار اور سازشی تھے اور دوسری طرف اعلیٰ ترین جنگی اصولوں کے پیروکار بھی۔ بیرونی دنیا سے منقطع خطے میں محصور ہونے کی وجہ سے وہ بدترین تضادات میں مبتلا تھے۔

وہ ہمیں اپنے ساتھ لے کر ایک طرف چل دیا۔ حویلی میں ہر طرف خون اور گولیوں کے نشانات بکھرے ہوئے تھے۔ کہیں کہیں خون آلود لاشیں پڑی ہوئی تھیں۔ کچھ مایوس اور نہتے لوگ زخمیوں کی دیکھ بھال میں مصروف تھے۔

"یہ ہارنے والے ہیں جو ہتھیار ڈالنے کے بعد اپنے زخمی الگ کرتے پھر رہے ہیں۔" قندوز خان نے بتایا۔ "جنگ ختم ہونے کے بعد ہمارے ساتھی بھی یہی کام کررہے ہیں لیکن وہ ہتھیار بند ہیں۔"

وہ پُرشوق لہجے میں ہمیں بتا رہا تھا کہ ان لوگوں کے حویلی میں موجود ہونے کی وجہ سے حملہ آوروں نے حویلی کے آس پاس راکٹ برسائے تھے۔ وہ براہ راست حویلی کو نشانہ بناتے تو جنگ بہت جلد ختم ہوگئی ہوتی مگر اس اقدام میں صبغت اللہ اور اس کے ساتھیوں کی جانوں کو سخت خطرہ لاحق ہوسکتا تھا۔

مختلف پُرپیچ راستوں سے گزار کر وہ ہمیں حویلی کے صحن میں لے گیا' جہاں پائندہ گل کی زخموں سے چور لاش ایک تخت پر رکھی ہوئی تھی۔ موت کے اس سرگرم سوداگر کا بدن سر سے پیر تک چھلنی تھا صرف چہرے پر پانچ گولیوں کے سوراخ تھے جو بائیں آنکھ' پیشانی اور جبڑوں میں گھس کر شاید کھوپڑی سے نکل گئی تھیں۔ تخت کے گرد لاتعداد ہتھیاروں کا ڈھیر پڑا ہوا تھا۔ پائندہ گل کے اکادکا حامی اس وقت بھی اپنے ہاتھوں میں دبے ہوئے ہتھیار خاموشی سے اس ڈھیر پر ڈالنے آرہے تھے۔

تخت کے قریب ایک آراستہ مسند پر نیا سردار براجمان تھا۔ میں اسے دیکھتے ہی چونک پڑا۔ اسی وقت ہم دونوں کی نگاہیں چار ہوئیں۔ میری نظروں میں تحیر کی جھلکیاں دیکھ کر اس کا مسکراتا ہوا چہرہ کسی پتھر کی طرح سخت اور بے جان ہوتا چلا گیا۔

"وہ کیا دیکھ رہے ہو؟" مسند پر بیٹھے ہوئے سردار نے سرد اور سپاٹ لہجے میں پوچھا۔

"کچھ نہیں' تمہیں دیکھ کر میرے حافظے میں ماضی کی ایک تصویر ابھر آئی تھی" میں نے دھیرے سے کہا۔

"میرا خیال تھا کہ تم وہ سب بھول چکے ہوگے" اس کی آواز کاٹ دار ہوگئی "ماضی یاد رکھنے کے لیے نہیں ہوتا۔ تمہیں بھی وہ سب بھلا دینا چاہیے۔"

"میں پوری کوشش کروں گا" میں نے سر جھکا کر کہا۔ وہاں اس سے بحث کی ذرا بھی گنجائش نہیں تھی۔ وہاں ہتھیار ڈالنے والے بھی آرہے تھے اور اس کے مسلح ساتھی بھی اپنے نئے سردار کے وقار اور احترام کے علم بردار بنے' مستعد کھڑے ہوئے تھے۔ ہم دونوں کے براہِ راست مکالمے سے قندوز خان حیرت سے بے حال ہوا جارہا تھا۔ اسے معلوم تھا کہ اس کا آقا نقاب پوش کے روپ میں مجھ سے مل چکا تھا اور مجھے اچھی طرح پہچانتا تھا لیکن یہ بات اس کے وہم وگمان میں بھی نہیں تھی کہ ان کا نیا سردار میرے لیے اجنبی نہیں ہوگا۔

اس وقت جنگی ماحول برقرار تھا۔ ہتھیار ڈالے جاچکے تھے لیکن پھر بھی دونوں فریقوں کی وحشت ناک آنکھوں میں خون کی پیاس چھلک رہی تھی۔ فضا جلے ہوئے بارود کی تیز بو سے زیادہ بوجھل تھی۔ صحن کے بعض حصوں میں آگ لگی ہوئی تھی۔ کئی مقامات سے دُھواں اٹھ رہا تھا۔ اس نازک ماحول میں ذرا بھی لغزش کا مظاہرہ کرتا تو ان بے شمار قبائلیوں میں سے کسی کے بھی غیظ وغضب کا نشانہ بن سکتا تھا۔

میرے جواب پر نئے سردار کے تیور نرم پڑ گئے "پھر آؤ! شنگارا ویلی تم چاروں کو اپنے مہمان کے طور پر خوش آمدید کہتی ہے۔ جہالت اور بربریت کا پرانا دور ختم ہوگیا۔ اب تم قیدی یا یرغمالی نہیں ہو۔"

اس نے دونوں ہاتھ فضا میں پھیلا دیے۔ میں اس مردود کے احترام میں لپک کر آگے بڑھا اور اس نے اپنی مسند چھوڑ کر مجھے اپنے سینے سے لگا کر بھینچ لیا۔ اس کی گرم جوشی سے میری پسلیاں کڑکڑا اٹھیں۔ میرا اندازہ تھا کہ وہ گرم جوشی کی آڑ لے کر مجھے اپنی وحشیانہ طاقت سے مرعوب کرنا چاہ رہا تھا۔

میں اس سے الگ ہوا تو میرے پیچھے ویرا تھی اور نیا سردار اسی پوزیشن میں کھڑا ہوا تھا۔ مجھے ویرا کی عافیت خطرے میں نظر آنے لگی۔ وہاں پائے جانے والے جنگی ماحول میں کسی کا بھی جنسی شوق بیدار ہونے کا قطعاً کوئی امکان نہیں تھا لیکن وہ جوش میں ویرا کو اپنی زور آزمائی کا نشانہ بنا سکتا تھا۔

ویرا اس کی طرف بڑھی تو اس کے بدن نے ایسی پوزیشن لے لی تھی کہ وہ نئے سردار سے بہ آسانی بغل گیر ہوسکے لیکن سردار نے ویرا سے صرف ہاتھ ملا کر خیر مقدمی کلمات کہنے پر اکتفا کیا۔

"تمہیں سرداری کا اعزاز مبارک ہو۔ تم نے بہت بھیانک جنگ جیت کر یہ مقام حاصل کیا ہے۔" ویرا نے اسے مبارک باد دیتے ہوئے کہا۔ میرے مقابلے میں اس نے حاضر دماغی سے کام لینے کی کوشش کی تھی۔

"مرنے والا خود کو خان بابا' سردار بابا اور خان اعظم کہلوانا پسند کرتا تھا" اس نے پائندہ گل کے بے جان جسم کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا "خدا اس کی روح کو نہ شرمائے۔ اب وہ ہم سے اچھی جگہ ہے لیکن میں اپنے لوگوں کو بتا چکا ہوں اور تم بھی سُن لو کہ میرا کوئی لقب نہیں ہوگا۔ میں صرف سردار صبغت اللہ شنگاری کہلوانا پسند کروں گا۔ میں تمہاری مبارک باد پر تم کو سلام کرتا ہوں۔"

"وعلیکم السّلام" ویرا نے گہری سنجیدگی کے ساتھ کہا۔ وہ آگے بھی کچھ کہنا چاہتی تھی لیکن فوراً ہی صبغت اللہ کا منہ بگڑ گیا اور وہ ویرا کی بات کاٹ کر بولا "میں نے تم کو سلام نہیں کیا تھا" اس کی آواز میں ہلکی سی جھنجلاہٹ تھی۔

"تم ہی نے تو کہا تھا کہ میں تمہاری مبارک باد پر تم کو سلام کرتا ہوں" ویرا معصومیت سے بولی۔

"سردار صبغت اللہ نے تمہاری تعریف کی تھی" قندوز خان نے جلدی سے وضاحت کی "یہاں مرد' عورتوں کو سلام نہیں کرتے۔ سلام میں پہل عورتوں کو کرنی پڑتی ہے۔"

"اوہ!" ویرا بے خوفی سے بولی "شاید دوسرے قبائل کی طرح یہاں بھی عورت کو مرد سے کم تر سمجھا جاتا ہے؟"

"عورت اور مرد میں کوئی مقابلہ ہی نہیں ہے" صبغت اللہ نے اپنا فیصلہ صادر کردیا "مرد کما کر لاتا ہے تو عورت چولہا روشن کرتی ہے۔ جنگ' دفاع' زراعت' کاروبار یہ سب مرد ہی کرتا ہے۔"

"لیکن ہر مرد کو عورت ہی جنتی ہے۔ سردار صبغت اللہ!" ویرا اُڑی رہی۔

"ہر مرد کو ساری عورتیں مل کر نہیں جنتیں۔ ہر مرد کی صرف اور صرف ایک ماں ہوتی ہے۔ ان پہاڑوں کے فرزند اپنی ماؤں کو جھک کر سلام کرتے ہیں' ان کے قدم چھوتے ہیں۔ لیکن وہ ساری عورتوں کو اپنی ماں جیسی عزت نہیں دے سکتے۔ عام عورتوں کو لڑنے اور کمانے والوں کا احترام کرنا پڑتا ہے۔"

"شاید یہی وجہ ہے کہ تم نے ڈینی کو گلے لگایا لیکن مجھے کم تر سمجھ کر اس اعزاز سے محروم رکھا" ویرا بہت سنجیدگی کے ساتھ شنگارا ویلی کے نئے حکمران کی ٹانگ کھینچنے پر تل گئی تھی۔

"تم احمق معلوم ہوتی ہو یا شاید تم کو یہاں کے رسوم ورواج کا علم نہیں ہے۔ یہاں ولایت جیسی بے حیائی نہیں ہے۔ اجنبی مرد اور عورت گلے ملتے ہیں تو فوراً ہی گناہ کا بیج پروان چڑھنے لگتا ہے۔ یہ احمقانہ باتیں نہ کرو اور اپنے دوسرے ساتھیوں کو بھی آ

موقع دو۔"

صبغت اللہ نے غزالہ سے ہاتھ ملایا' سلطان شاہ کو گلے سے لگایا پھر اپنی مسند پر بیٹھ گیا۔ اس دوران میں وہاں ہتھیار ڈالنے والوں کی خاصی تعداد جمع ہوچکی تھی۔ ہم چاروں کے ہٹتے ہی انہوں نے ایک منظم قطار کی صورت میں پیش قدمی شروع کردی

صبغت اللہ نے اپنے داہنے ہاتھ کی پشت آگے پھیلا دی۔ پائندہ گل کے نہتے اور شکست خوردہ حمایتی' یکے بعد دیگرے صبغت اللہ کے ہاتھ کی پشت کا بوسہ لے کر اس سے وفاداری کا اظہار کرتے اور آگے بڑھتے رہے۔

"انہیں مہمان خانے میں لے جاؤ" اسی اثنا میں صبغت اللہ نے قندوز خان کو ہدایت کی اور یوں ہمیں وہاں سے جلد ہی روانہ ہونے کا موقع مل گیا۔

اس خوں آشام لڑائی میں مارے جانے والوں کی لاشیں یکجا کی جاچکی تھیں اور بہت سے لوگ مل جل کر زخمیوں کی دیکھ بھال کرنے میں مصروف تھے۔ مسلح اور نہتے لوگوں میں ہتھیاروں کے علاوہ کوئی ایسا فرق نظر نہیں آرہا تھا جس کی بنا پر یہ اندازہ کیا جاسکتا کہ وہ تھوڑی دیر پہلے ایک دوسرے کے لہو کے پیاسے ہو رہے تھے۔

ان کے جنگی اصولوں کے بارے میں پہلی بات اس وقت سامنے آئی تھی جب قندوز خان نے دشمن کے بے بس قیدیوں کو اپنی امان میں قرار دے کر ویرا کو ان کے قتلِ عام سے روک دیا تھا۔ دوسری اچھی بات یہ تھی کہ مرنے کے بعد پائندہ گل کی لاش کی بے حرمتی یا تذلیل نہیں کی گئی تھی۔ بس اس کے وفاداروں کے حوصلے پست کرنے کے لیے اس کی لاش کی خاموش نمائش کی جارہی تھی۔

ان لوگوں میں انفرادی سوچ یا وفاداری کے رجحانات سرے سے موجود نہیں تھے۔ وہ اطاعت یا بغاوت بھی باجماعت کرتے تھے اور ان میں غیر جانب دار طبقے کا سرے سے وجود ہی نہیں تھا۔ اطاعت اور بغاوت کی ہر دو صورتوں میں وہ صرف اپنے سربراہ کے حکم کے پابند ہوتے تھے اور اپنے سروں سے سردار کا سایہ اٹھنے کے ساتھ ہی بے چون وچرا دوسرے فریق کی بالادستی کو تسلیم کرلینے کے عادی معلوم ہوتے تھے۔ ان کے قدیم اور نسبتاً محصور معاشرے میں امن وعافیت کے ساتھ زندہ رہنے کے لیے وہ رویّہ ناگزیر تھا۔ اگر وہ اقتدار کی جنگ کو انفرادی انا کا مسئلہ بنانے کے عادی ہوتے تو گالان اور اس کے مضافات میں چھڑنے والی جنگ دور دراز کی آبادیوں کو بھی اپنی لپیٹ میں لے کر تہس نہس کرسکتی تھی اور ایسی دو چار ہی جنگیں ان کی پوری نسل کو فنا کے گھاٹ اتارنے کے لیے کافی ہوتیں۔

مجھے اچھی طرح اندازہ تھا کہ حویلی میں جنگ کی خوں ریزی اور تباہ کاری کے جو دردناک مناظر نظر آرہے تھے وہ اس تباہی کا عشر عشیر بھی نہیں تھے جو حویلی سے باہر پھیلی ہوگی۔ دونوں فریقوں نے ایک دوسرے کو گرمانے کے بعد کئی گھنٹوں تک جم کر آگ اور خون کی بھیانک ہولی کھیلی تھی۔ میرا اندازہ تھا کہ قبائلی اقتدار کی اس لڑائی میں مرنے اور زخمی ہونے والوں کی تعداد بہت زیادہ ہوسکتی تھی۔

قندوز خان اس بار ہمیں حویلی میں ایک مختلف سمت میں لے جارہا تھا۔ چند منٹ کے بعد ہم ایک خوب صورت چوبی دروازے کے قریب پہنچ گئے۔ وہ دروازہ بھی سردار کے کمرے کے دروازے کی طرح بہت وزنی اور نقش دار تھا۔ وہاں ایک چاق وچوبند شنگاری چوکی داری پر مامور تھا۔ قندوز خان کو دیکھ کر اس نے اپنا داہنا ہاتھ پیشانی تک لے جاکر اسے سلام کیا۔ قندوز خان نے سر کی جنبش سے اس کے سلام کا جواب دینے کے ساتھ ہی مقامی بولی میں کچھ کہا اور اس چوکی دار نے مستعدی کے ساتھ منقش دروازہ کھول دیا۔

کچھ دیر پہلے جنگ چھڑی ہوئی تھی تو ہر شخص پورے جوش وخروش کے ساتھ اس میں ملوث تھا لیکن چوکی دار کی وہاں موجودگی سے یہ ظاہر ہورہا تھا کہ پائندہ گل کی ہلاکت کی خبر پھیلنے کے بعد' نہ صرف جنگ بند ہوگئی تھی بلکہ جنگ کا ایندھن بننے سے بچ جانے والے شنگاریوں نے اپنی پرانی وفاداریوں کو بھول بھال کر' نہایت نیک نیتی سے اپنی اپنی ذمّے داریاں سنبھال لی تھیں۔

اس دروازے سے اندر داخل ہوتے ہی مجھے اندازہ ہوگیا کہ وہ شنگارا ویلی کے سردار کا مہمان خانہ تھا۔ اس دروازے کے ساتھ ہی ایک بڑا سا پائیدان پڑا ہوا تھا۔ قندوز نے اپنے جوتے وہاں چھوڑ دیے۔ ہم چاروں کو نیند کے عالم میں بے ہوش کرکے فلیٹ کی خواب گاہوں سے اغوا کیا گیا تھا اس لیے ہم ابتدا ہی سے برہنہ پا چلے آرہے تھے۔ ہم اس پائیدان پر اپنے تلوے رگڑ کر آگے بڑھتے چلے گئے' جہاں ایک ہی قسم اور نمونے کے کئی بڑے بڑے اونی قالینوں نے فرش کا چپہ چپہ چھپایا ہوا تھا۔ اس کمرے کا عرض بیس فٹ اور طول کم وبیش تیس فٹ رہا ہوگا۔ اس کے درمیانی حصے میں موٹے موٹے گاؤ تکیے اور متعدد گدّیاں ایک خصوصی ترتیب سے رکھی ہوئی تھیں۔ دروازے کی مخالف سمت والی سنگی دیوار سپاٹ تھی البتہ اس کے دونوں سروں پر اتنی جگہ چھوڑ دی گئی تھی جس میں سے ایک آدمی آسانی سے گزر سکتا تھا۔ ان خالی جگہوں میں کوئی پٹ یا دروازہ نہیں تھا۔ داہنی اور بائیں جانب کی دیواروں میں تین تین یکساں دروازے نظر آرہے تھے۔

قندوز خان باوقار انداز میں چلتا ہوا اس کمرے کے وسط میں پہنچا اور ایک گدّی لے کر قالین پر بیٹھ گیا۔ "تم لوگ بھی تھوڑی دیر یہاں آرام کرو" اس نے فخر آمیز نظروں سے ہماری طرف دیکھتے ہوئے کہا "داہنی اور بائیں جانب تم کو جو چھ دروازے نظر آرہے ہیں' یہ سب سونے کے الگ الگ کمروں میں کھلتے ہیں۔ تم چاہو تو الگ الگ کمروں میں رہ سکتے ہو' چاہو تو عورتیں ایک جگہ اور مرد

اک جگہ رہ سکتے ہیں۔ ویسے ہر کمرے میں تین آرام دہ مسہریاں ہیں۔ ان سب کو جھاڑ پونچھ کر تیار کردیا جائے گا۔ سامنے والی دیوار کے پیچھے غسل خانے وغیرہ ہیں۔"

میں نے وہاں بیٹھتے ہوئے دیکھا کہ وہاں خشک میووں سے بھری ہوئی کئی ٹوکریاں رکھی ہوئی تھیں۔ مجھے شدت سے احساس ہوا کہ اس روایتی فرشی نشست گاہ میں حقہ موجود نہیں تھا۔

"چاہو گے تو تھوڑی دیر میں تازہ حقہ بھی فراہم کردیا جائے گا" میری خواہش سُن کر قندوز خان ہنستے ہوئے بولا "ہم لوگ پہلے حقہ ہی پیتے تھے لیکن جب سے ہم نے پہاڑوں سے باہر قدم نکالے ہیں' لوگوں میں سگریٹ پینے کا شوق پیدا ہوگیا ہے۔ شاید ہر فیشن اسی طرح نئی آبادیوں میں اپنی جگہ بناتا ہے۔ اب تمہیں ہمارے علاقوں میں بڑی عمر کے بھی سگریٹ پیتے ہوئے نظر آئیں گے۔ یہاں حقہ بہت تیزی کے ساتھ ترک کیا گیا ہے۔"

سردار پائندہ گل کی زندگی میں ہم چاروں کو صندل خان کا قرب حاصل تھا صندل خان کا شمار پائندہ گل کے چہیتے لوگوں میں ہوتا تھا۔ وہ ہمارے ساتھ بیٹھ کر نہ صرف شراب پیتا رہا تھا بلکہ چند ممنوعہ موضوعات کے علاوہ دیگر موضوعات پر کھل کر باتیں کرتا رہا تھا۔ ہم نے اس سے گھما پھرا کر کچھ ایسی باتیں بھی معلوم کرلی تھیں جو شاید عام حالات میں آسانی کے ساتھ ہمارے علم میں نہ آتیں۔ اس سے میل جول میں ایک مرحلہ ایسا بھی آیا تھا کہ مجھے اس پر سازشیوں کا سرغنہ ہونے کا شبہ ہونے لگا تھا لیکن بعد کے واقعات نے ثابت کردیا تھا کہ صندل خان دل و جان سے پائندہ گل کا وفادار تھا۔ وہ پائندہ گل کے لیے اپنی جان دے سکتا تھا لیکن اس سے دغا نہیں کرسکتا تھا۔

مجھے شدید حیرت تھی کہ پائندہ گل کے اقتدار اور زندگی کے لیے وہ شخص زہریلا ناگ ثابت ہوا تھا جو پچھلے روز تک اپنی اعلیٰ کارکردگی اور جانبازی کے قصے سُنا کر پائندہ گل کو مسحور و مرعوب کرتا رہا تھا۔ وہ جلال آباد سے لُوٹ کے مال کو ٹھکانے لگا کر' اپنے سردار کے لیے نہ صرف بھاری رقم لایا تھا بلکہ ہیروئن کی تیاری میں استعمال ہونے والے اہم ترین کیمیکل کے تین ڈرم بھی خرید لایا تھا۔ وہ اس قدر چالاک اور مکار تھا کہ اس نے گالان پہنچنے کے بعد ہم لوگوں کا رخ کئے بغیر ہی اپنے سردار سے بادران جانے کی اجازت لے لی تھی اور بظاہر اپنے سفر کی تیاریوں میں مصروف ہوگیا تھا۔ پائندہ گل اور دوسرے شنگاریوں کی آنکھوں میں دھول جھونکنے کے لیے وہ سفر کی تیاریوں میں اُلجھا رہا تھا لیکن رات کے اندھیرے میں موقع پا کر حویلی میں گھس آیا اور کسی چور کی طرح مجھ سے ملاقات کرکے واپس لوٹ گیا۔

گھنٹیوں والوں کی بغاوت کے سلسلے میں ہمیں جو شخص ابتدا ہی سے مشکوک نظر آتا رہا وہ بالکل بے گناہ ثابت ہوا تھا اور اس معاملے سے لاتعلق نظر آنے والا صبغت اللہ اس سازش کا روحِ رواں ثابت ہوا تھا۔

صندل خان کے انجام کے بارے میں ہمیں کچھ علم نہیں تھا۔ نہ ہی میں اس موقعے پر اس کا ذکر چھیڑ کر قندوز خان کو کسی بھی طرح چونکانا چاہتا تھا۔ میرے لیے اتنا ہی کافی تھا کہ شنگارا ویلی یا گالان میں ہماری قیدیوں والی حیثیت ختم ہوچکی تھی۔ اور ہم آزاد مہمانوں کی طرح وہاں مقیم تھے۔ ہمیں اپنے دل کی بھڑاس نکالنے کے لیے صندل خان کے متبادل کے طور پر قندوز خان مل چکا تھا۔ ہمارے لیے بہتر یہی تھا کہ ہم اس سے از سرِ نو معلومات حاصل کرنے کی کوششیں کرتے اور پھر ان ہی کی روشنی میں اپنی جلد از جلد روانگی کا منصوبہ مرتب کرتے۔

لیکن ان دنوں میری اور ویرا کی سوچ ایک ہی رُخ پر چل رہی تھی۔ ابھی وہ سوال میرے ذہن ہی میں تھا کہ ویرا نے قندوز خان سے سوال کر ڈالا "مجھے حیرت ہے کہ شنگارا ویلی کے بزرگوں نے یہاں سگریٹ نوشی کے رواج کی مخالفت نہیں کی۔ آگے چل کر یہ رواج تباہ کن بھی ثابت ہوسکتا ہے۔"

"وہ کیسے؟" قندوز خان نے حیرت سے اپنی پلکیں جھپکاتے ہوئے سوال کیا۔

"ان پہاڑوں میں افیم اور ہیروئن کی بہتات ہے" ویرا نے کاغذی باداموں والی ٹوکری اپنی طرف سرکاتے ہوئے کہا "یہ کوئی ڈھکی چھُپی بات نہیں ہے کہ محلول کی صورت میں سرنج سے لینے کے بجائے دنیا بھر میں ہیروئن کو سگریٹ کے ساتھ پینے کے طریقے مقبول ہیں۔ سگریٹ کی آمد کے بعد تمہارے نوجوان لڑکے بھی ہیروئن پینے کی طرف مائل ہوجائیں گے۔ ویسے بھی دنیا بھر میں سگریٹ نوشی کو معاشرتی عیب قرار دے کر' اس کے خلاف مہم چلائی جارہی ہے۔ یورپ کو چھوڑ دو۔ تمہارے اس برصغیر سے ذرا اور مشرق میں عادی سگریٹ نوشوں پر قرنطینہ جیسی پابندیاں عائد کی جاچکی ہیں۔ وہ ہوائی اڈوں وغیرہ پر برسرِعام سگریٹ نہیں پی سکتے۔ اپنا شوق پورا کرنے کے لیے انہیں شیشے کی دیواروں والے مخصوص اور دور افتادہ کمروں کا رخ کرنا پڑتا ہے جہاں ہر رنگ' نسل اور طبقے کے لوگ ندیدوں کی طرح سگریٹوں کے سرے چوس چوس کر ایک دوسرے پر غلیظ دُھواں اُگلتے رہتے ہیں لیکن شنگارا ویلی میں اس کا اُلٹ ہو رہا ہے۔ لوگ تیزی کے ساتھ حقے کو بھول کر سگریٹ نوشی میں مبتلا ہوتے جارہے ہیں۔"

"تم اپنے حساب سے ٹھیک کہہ رہی ہو" قندوز خان کے ہونٹوں پر عارفانہ سی مسکراہٹ پھیل گئی۔ اس نے براہِ راست ویرا کی طرف دیکھتے ہوئے کہا "شنگارا ویلی میں قانون اور اختیار کے دو سرچشمے ہیں۔ ایک سردار اور دوسرا جرگہ۔ سردار کا ہر فیصلہ اٹل اور آخری ہوتا ہے لیکن جہاں وہ ضرورت محسوس کرتا ہے' وہاں جرگے سے رائے لے لیتا ہے۔ مرحوم پائندہ گل نے جرگے کے مشورے کے بعد شنگارا ویلی میں سگریٹ لانے اور پینے کی اجازت دی تھی لیکن یہاں کا کوئی بچہ بھی ہیروئن کی ایک چٹکی استعمال کرنے کی جرأت نہیں کرسکتا۔"

میں نے محسوس کیا کہ اس نے پائندہ گل کے نام کے ساتھ مرحوم کا سابقہ لگا کر اپنی اس روایتی رواداری کو برقرار رکھا تھا جو جنگ ختم ہونے کے بعد دونوں فریقوں میں نمایاں طور پر کارفرما نظر آرہی تھی۔

ادھر ویرا اس سے اُلجھی ہوئی تھی "میں وہی جاننا چاہتی تھی۔ وہ کون سی چیز یا کس قسم کا خوف ہے جو مقامیوں کو ہیروئن کے استعمال سے روکتا ہے۔ یہاں سب جانتے ہیں کہ ہیروئن ایک قیمتی نشہ ہے۔ یہاں لوگ شراب' چرس اور نسوار کا نشہ بھی کرتے ہیں' کیا ان کے دل میں ہیروئن کا گہرا سرور آزمانے کی خواہش پیدا نہیں ہوتی ہوگی؟"

"یہاں ہیروئن چند گنے چُنے لوگ تیار کرتے ہیں۔ ان کے ہاتھوں سے گزر کر سارا مال سردار کے پاس آجاتا ہے" وہ ویرا کو سمجھانے کی کوشش کرنے لگا "سردار پہلی فرصت میں اس مال کو آگے روانہ کردیتا ہے۔ پھر ہمارے مولویوں نے لوگوں کو اچھی طرح سمجھا دیا ہے کہ ہیروئن' خنزیر سے زیادہ حرام ہے۔ تم جانتی ہوگی کہ مسلمانوں میں خنزیر کتنا بُرا سمجھا جاتا ہے۔ ویسے تو شراب بھی حرام ہے لیکن لاکھوں مسلمان شراب پیتے ہیں مگر تم نے کسی مسلمان کو جانتے بوجھتے ہوئے خنزیر کا گوشت چباتے ہوئے نہیں دیکھا ہوگا۔ ہر شنگاری پورے خلوصِ دل سے یہ یقین رکھتا ہے کہ ہیروئن پینے کے بعد وہ عذاب کی لپیٹ میں آجائے گا۔ دوسری رکاوٹ یہ ہے کہ یہاں ہیروئن کا ایک کش بھی لگانے والا بدترین سزا سے نہیں بچ سکتا۔ اسے چھاتی تک زمین میں زندہ گاڑ کر اس پر بھوکے ریچھ چھوڑے جاسکتے ہیں' اس کے بیوی بچّے عمر بھر کے لیے سردار کے غلام بنائے جاسکتے ہیں' اس کے گھر کے ایک ایک تنکے کو مسمار کرکے جلایا جاسکتا ہے۔ یہ ایسی بھیانک سزائیں ہیں کہ ہر شخص ہیروئن سے پناہ مانگتا ہے۔ پچھلے برسوں میں یہاں ایک بار بھی کسی کو ہیروئن پینے کے جرم میں سزا نہیں دی گئی۔ اور شاید آئندہ بھی اس کی نوبت نہیں آئے گی۔"

"تم ٹھیک کہہ رہے ہو" سلطان شاہ نے اس کی تائید کرتے ہوئے کہا "تمہارے مولویوں کی محنت اور سخت ترین سزائیں اپنی جگہ پر ہیں مگر اصل بات یہ ہے کہ ہیروئن پر یہاں سخت کنٹرول ہے۔ اسے تیار کرنے والے لوگ سردار کے خاص آدمی ہوں گے۔ ہیروئن عام شنگاری کی تحویل میں آتی ہے نہ یہاں کے بازاروں میں پہنچتی ہے۔ کارخانے سے نکل کر سیدھی سردار کے پاس اور وہاں سے گاہک کے پاس چلی جاتی ہے۔ اسی وجہ سے تمہاری وادیوں کی خوشگوار فضاؤں میں موت کا دُھواں کہیں نہیں منڈلاتا۔ تم لوگ اس کی تباہ کاری سے پوری طرح باخبر ہو اور تم نے اپنے سارے وسائل استعمال کرکے اپنے بچّوں اور نوجوانوں کو موت کے اس نشے سے بچایا ہوا ہے۔ جو کچھ بناتے ہو اسے ہماری بستیوں اور شہروں کی طرف روانہ کردیتے ہو اور اس آمدنی سے شنگارا ویلی میں بہتر سہولتیں پیدا کرنے کے خواب دیکھ رہے ہو۔"

"بالکل' بالکل!" قندوز خان نے سرہلا کر کہا۔ وہ جنگ جو اور تندرست ہونے کے باوجود خاصا سادہ لوح تھا۔ وہ سلطان شاہ کے آخری فقروں میں پنہاں طنز کو سرے سے سمجھ ہی نہیں سکا تھا۔

"کبھی تم نے یہ سوچا ہے کہ شنگارا ویلی سے باہر نکلنے کے بعد یہ مہلک ہیروئن' جو یہاں خنزیر سے زیادہ حرام سمجھی جاتی ہے' پیسے کے لالچ میں تمہارے مسلمان بھائیوں کو بھی بیچی اور پلائی جاتی ہوگی" میں نے موقع پا کر اس کی سمجھ کے مطابق ایک کھُلا کھُلا سوال کر ڈالا۔

وہ آہستہ سے ہنس پڑا اور ہنستے ہوئے بے پروائی سے بولا "یہ کاروبار ہے۔ جو لوگ ہم سے مال خریدتے ہیں' وہ اسے سمندر میں تو نہیں ڈبوتے ہوں گے۔ زیادہ داموں پر کہیں نہ کہیں بیچتے ہی ہوں گے۔ ان کے خریداروں میں ہندو' مسلمان' عیسائی سب ہی ہوتے ہوں گے۔ اس سے ہمیں کیا لینا؟"

"میں شکایت نہیں کررہا لیکن تمہیں شاید یہ سُن کر حیرت ہو کہ پاکستان میں لاکھوں نوجوان اس مہلک نشے کے عادی ہوچکے ہیں اور کوڑا گھروں یا گندے نالوں میں جانوروں سے بدتر زندگی گزار رہے ہیں۔"

"اتنی تفصیل نہیں معلوم" اس پر میری بات کا خاطر خواہ اثر نہیں ہوا تھا۔ وہ سرسری لہجے میں بولتا رہا "ہاں' یہ ضرور معلوم ہے پاکستانی بیوپاری ہمارے مال کے اچھے دام دیتے ہیں اور ان کے پاس کھپت بھی تیزی سے بڑھ رہی ہے۔"

"کیا یہ ممکن نہیں کہ اپنے ان پاکستانی بھائیوں کو اس خنزیری نشے سے محفوظ رکھنے کے لیے تم لوگ کچھ کرسکو؟" میں نے نہایت دردمندانہ عاجزی کے ساتھ کہا۔

اس کے چہرے پر یک بیک گہری سنجیدگی طاری ہوگئی اور وہ مضبوط آواز میں بولا "مجھے زیادہ تفصیلات کا علم نہیں ہے۔ مگر ہم سُنتے رہتے ہیں کہ افغانی اور پاکستانی مسلمان بھائیوں کے حوالے سے مرحوم پائندہ گل سے شکایتیں کی جاتی تھیں" اس مرحلے پر اس کی آواز میں تلخی کا زہر سرایت کرگیا "شکوے کرنے والے یہ بھول جاتے ہیں کہ اگر افغانی اور پاکستانی ہمارے بھائی ہیں تو ہم بھی ان کے بھائی ہیں۔ وہ ہمارے بارے میں کیوں نہیں سوچتے۔"

"وہ تمہارے بارے میں کیا سوچ سکتے ہیں؟" میں نے حیرت سے پوچھا۔

"ان سنگلاخ پہاڑوں میں زرخیز زمینیں بنانا بہت مشکل کام ہے۔ جنگل اور جھاڑیاں کاٹ کر' جو چھوٹے چھوٹے قابلِ کاشت ٹکڑے بنائے گئے ہیں' ان پر ہم گنتی کی چند ہی فصلیں بو سکتے ہیں۔ ان میں افیم کی فصل سب سے زیادہ نفع بخش ہوتی ہے۔ ہم وہی

اُگاتے ہیں اور اس سے ہونے والی آمدنی کے ذریعے شنگارا ویلی کے ہزاروں چولہے روشن رکھتے ہیں۔ کسی نے کبھی یہ سوچا کہ اگر ہم اپنی ان فصلوں کو آگ لگادیں تو ہم اپنے بچّوں کا پیٹ کہاں سے پالیں گے؟ افیم کی آمدنی کے بغیر ہم زندہ رہنے کا تصور بھی نہیں کرسکتے۔ ہمارے شیر خوار بچّے اپنی ماؤں کی سوکھی چھاتیاں چھوڑ چھوڑ کر لہولہان کردیں گے لیکن اپنے حلق تک تر نہیں کرسکیں گے۔۔۔"

"افیم کی کاشت ختم کرنے پر نقد امداد بھی تو دی جاتی ہے" میں نے اس کی بات کاٹ کر کہا۔

"یہ میرے بجائے ان پاکستانیوں سے پوچھو جنھوں نے مردان اور صوابی کے علاقوں میں یہ زخم کھائے ہیں۔ وہ لوگ امداد بھیک کی طرح دیتے ہیں جو پورے ایک سیزن بھی نہیں چلتی۔ زمین اور فصل برباد کرنے کے بعد ان میں سے زیادہ تر بے خانماں برباد ہوگئے۔ کچھ دوسرے علاقوں میں ہجرت کرگئے اور بعض کو کارخانوں میں چھوٹی چھوٹی نوکریاں مل گئیں لیکن وہ سب پریشان رہے۔ جو ہوشیار تھے انہوں نے سارے وعدوں پر لات مار کر دوبارہ اپنی زمینیں آباد کرلیں۔ ایسے لوگ دوبارہ خوش حالی کا منہ دیکھ رہے ہیں۔ ہم ان جیسا انجام نہیں چاہتے۔ ہم افیم کے جدی پشتی کاشتکار ہیں۔ ہم اسی میں خوش اور خوش حال رہ سکتے ہیں۔ یہ قدرت کا انعام ہے کہ ہمارے صبر اور شکر کے نتیجے میں اس نے ہمیں ہیروئن کی راہ دکھادی۔ ہمارے وہم وگمان میں بھی نہیں تھا کہ ہماری فصلیں کبھی اتنی آمدنی دے سکیں گی۔ پہلے یہ اندھی آمدنی لوٹی جارہی تھی۔ اب یہاں انقلاب آیا ہے تو تم دیکھنا کہ چند برس میں شنگارا ویلی کس طرح پھلتی پھولتی ہے۔"

"ان پہاڑوں سے باہر نکلنے کے بعد ہیروئن جو مہلک تباہی پھیلا رہی ہے، اس پر تمہیں کوئی ملال نہیں ہے؟" میں نے چند ثانیوں کے توقف کے بعد اس سے سوال کیا۔

"ہمیں ملال کیوں ہو؟" اس نے اُلٹا مجھ سے سوال کرڈالا "تم سب شہری اور پڑھے لکھے ہو، تمہیں مجھ سے زیادہ معلوم ہوگا کہ افغانستان میں روسیوں نے ہتھیاروں اور بارود کے انبار لگادیے ہیں۔ وہاں امریکا وغیرہ سے بھی اندھا دھند جنگی امداد چلی آرہی ہے۔ ہر ملک یہ خدمت افغانیوں کی عزت اور آزادی کے لیے سرانجام دے رہا ہے لیکن اس کا نتیجہ کیا ہے؟ ہر گولی افغانوں کو ہی موت کی نیند سُلا رہی ہے۔ شنگارا ویلی والے تو کھل کر کہتے ہیں کہ دونوں خونی بھیڑیوں میں سے کسی کو افغانیوں یا افغانستان سے محبت نہیں ہے۔ وہ پرائے گھر میں گھُس کر اپنی وحشیانہ جنگ لڑ رہے ہیں۔ اس جنگ میں وہ گھر اور گھر والوں کو تہس نہس کیے دے رہے ہیں اور ان کے سر فخر سے اونچے ہیں۔ ہم افیم کو صاف کرکے ہیروئن بناتے ہیں۔ تم چاہو تو تم بھی اپنے نوجوانوں کو اسی طرح ہیروئن سے بچاسکتے ہو جیسے ہم نے بچایا ہوا ہے۔ ساری ہیروئن ولایت بھیج دو۔ وہ تمہارے بھائیوں اور پڑوسیوں کو گولہ بارود سے مار رہے ہیں تم ان کی گلی گلی میں ہیروئن پھیلا کر انہیں اپاہج بنادو۔ ہم لوگوں نے ہیروئن بنائی ہی گوروں کے لیے تھی۔ ایک کلو کے ایک کروڑ پاکستانی روپے وہی دے سکتے تھے لیکن شہری دلالوں نے ہمیں [illegible] سے اُتار دیا۔ ہمیں کم دام ملتے ہیں۔ وہ ملاوٹ کرکے کچھ مال مقامی منڈیوں میں پھینکتے ہیں، جو بچ جاتا ہے اسے باہر لے جاتے ہیں اور ہم سے کئی گنا زیادہ نفع کماتے ہیں۔"

"تمہاری معلومات حیرت ناک ہیں" ویرا نے اعتراف کیا "مجھے اندازہ نہیں تھا کہ عام شنگاریوں میں بھی اتنی سوجھ بوجھ پائی جاتی ہوگی۔ تمہارا اصل مسئلہ کسی منافع بخش متبادل روزگار کا ہے۔"

"میں عام شنگاری نہیں ہوں" قندوز خان نے ویرا کی فوری تصحیح کرتے ہوئے کہا "عام شنگاری اردو نہیں بولا کرتے۔ اردو بولنے والے وہ لوگ ہیں جو سردار کی ہدایت پر باہر جاتے آتے رہتے ہیں۔ میں بارہا کابل، جلال آباد، پشاور اور نوشہرہ تک جاچکا ہوں۔ ہمیں اصل کہانیوں کا علم باہر جاکر ہی ہوتا ہے۔۔۔۔ اور تم نے متبادل روزگار کی جو بات کی، وہ دیوانے کا خواب ہے۔ ان پہاڑوں میں کوئی ٹرک تک نہیں آسکتا۔ یہاں پانی ہے نہ بجلی۔ یہاں کارخانے لگ ہی نہیں سکتے۔ ہم سے جو بھی بات کرتا ہے، یہی کہتا ہے کہ ہم اپنے بزرگوں کی ہڈیوں کو ان پہاڑوں میں لاوارث چھوڑ کر میدانی علاقوں میں چلے جائیں۔ یہ جبری ہجرت ہمیں گوارا نہیں ہے۔ مرحوم پائندہ گل نے شنگارا ویلی کی آمدنی میں زبردست دھاندلی مچائی ہوئی تھی لیکن پھر بھی کوئی شنگاری بھوکا نہیں سوتا تھا۔ ہمارے ان پڑھ قبیلوں کی تو بات چھوڑو، سرحد کے دونوں طرف ہزاروں پڑھے لکھے لڑکوں کو روزگار نہیں ملتا۔ ہمارے بچے ہوئے، بہترین گرستے ہتھیاروں کے سب سے بڑے خریدار ایسے ہی بے روزگار لڑکے ہیں۔ عزت کی روزی حاصل کرنے میں ناکام ہونے کے بعد وہ چوری، ڈکیتی، اغوا، رہزنی اور تاوان جیسے گندے کاموں کا رُخ کررہے ہیں۔ ایک کامیاب واردات ان کی زندگی کے سارے دلدر دور کردیتی ہے۔ ان میں کلاشنکوف بہت مقبول ہوئی ہے۔ تم ہی بتاؤ کہ جہاں پڑھے لکھے مقامیوں کو نوکری نہیں ملتی تو پہاڑوں سے اُترنے والے، جاہل اور تندخو شنگاریوں کو کہاں روزگار ملے گا؟ یہ اپنا مسکن چھوڑنے کے بعد چور، ڈاکو، رہزن اور قاتل بن جائیں گے۔ ہمارے بوڑھوں کو کشکول تھام کر بھیک مانگنی پڑے گی۔ یہ سب اس قدر بھیانک نظر آتا ہے کہ ہم جہاں اور جس حال میں ہیں، بس خوش ہیں۔ ہم کسی قیمت پر دربدر بھٹکنا پسند نہیں کریں گے۔ ہماری قدیم روایتیں خاک میں مل جائیں گی۔ جب شہروں کے اوباش اور لفنگے ہماری عورتوں کو ڈھٹائی سے گھوریں گے تو ان کی عزتیں تاراج ہوجائیں گی، چند لاشیں گریں گی۔ کچھ دنوں تک فتنہ وفساد چلتا رہے گا پھر ہماری عورتیں بھی شہر والیوں کے ہمارے چہروں پر تھوک دیں گی۔ یہ تمام باتیں کوئی بھی [illegible] برداشت نہیں کرسکتا۔"

[illegible] کی باتیں معقول اور دلائل پر مبنی تھیں۔ شہروں میں بیٹھ [illegible] محسوس ہوتا تھا جیسے تعزیری قوانین سے آزاد قبائل میں [illegible] شخص افیم کی کاشت اور ہیروئن کی تیاری میں ملوث [illegible] ہر [illegible] کی سوداگری کررہا ہے اور جلد سے جلد، زیادہ سے زیادہ [illegible] کمانے کے جنون میں مبتلا ہے لیکن گالان کے اس آرام دہ [illegible] میں قندوز خان سے باتیں کرنے کے بعد مجھے شدت کے [illegible] ان کی مجبوریوں کا احساس ہونے لگا تھا۔ دولت کمانے اور جمع [illegible] کی ہوس پائندہ گل اور اس کے چند ساتھیوں کو تو ہوسکتی تھی [illegible] شنگاریوں کے لیے وہ عیش وعشرت یا دولت وثروت کا [illegible] نہیں تھا بلکہ ان کی بقا، رزق اور روزی کا مسئلہ تھا۔ ان [illegible] پہاڑوں میں اپنی قدیم روایات میں محصور رہ کر زندگی [illegible] والے شنگاری کسی کم قیمت والی فصل پر محنت کرتے تو [illegible] گھروں میں فاقوں کی نوبت آسکتی تھی۔ اپنے گھروں کے [illegible] تین وقت روشن رکھنے کے لیے وہ اپنے سردار اور جرگے کی [illegible] ہدایات کے مطابق افیم کی فصلوں کی آبیاری کرنے پر مجبور تھے۔ [illegible] بات تھی کہ انہیں ہیروئن سے ہونے والی بے اندازہ آمدنی [illegible] کم فیض حاصل ہورہا تھا اور اس ہنرکاری کے نتیجے میں ان [illegible] میں بھی ایک مراعات یافتہ طبقہ اُبھرتا جارہا تھا جو اقتدار پر [illegible] ہونے کے ساتھ ساتھ ساری دولت بھی اپنی تحویل میں لیے [illegible] رہا تھا۔

قندوز خان نے بہت عمدہ مثال دی تھی۔ افغانستان میں گھُس [illegible] روسی اور امریکا کے حمایت یافتہ حلیف ایک خوں ریز جنگ لڑ [illegible] رہے تھے۔ دونوں فریق اس ملک اور اس کے باسیوں کی خیر خواہی [illegible] کے دعوے دار تھے لیکن ان دونوں کو بھی بہت زیادہ نقصان [illegible] پہنچ رہے تھے۔ عمارتیں کھنڈرات میں تبدیل کی جارہی تھیں، [illegible] تاخت وتاراج کی جارہی تھیں، سرسبز فصلوں کو گڑگڑاتے [illegible] ٹینک روند رہے تھے، ہر طرف موت اور بربادی کی طاغوتی [illegible] شیطانی ناچ ناچ رہی تھیں لیکن جنگ آزما فریقوں کے [illegible] کوئی فرق رونما نہیں ہورہا تھا۔ کچھ یہی کیفیت شنگارا [illegible] کی بھی تھی۔ پائندہ گل اس وادی کا بزرگ، مربی اور سردار [illegible] ہر آن اپنے لوگوں کی خیر خواہی اور آبرومندی کے تذکرے [illegible] کرتا رہتا تھا لیکن اس کے مار ڈالے جانے سے ذرا پہلے، مجھے بتایا [illegible] گیا کہ وہ بے ایمان تھا اور وادی کی دولت کو لوٹ کر اپنے [illegible] بھر رہا تھا۔ صبغت اللہ نے اپنے حامیوں کی مدد، طاقت اور [illegible] جانی قربانیوں کے نتیجے میں اس نام نہاد خیر خواہ کو مار ڈالا تھا [illegible] شنگارا ویلی کا سردار بن بیٹھا تھا۔ کون جانتا تھا کہ اس کے [illegible] پایا تھا؟ اسے شنگارا ویلی کے مظلوم اور بے مایا انسانوں سے [illegible] تھی یا اس کی نظریں پائندہ گل کی جیب میں جانے والے پیسے پر جمی ہوئی تھیں؟ یہ فیصلہ اس کی زندگی یا کم از کم اس کے عہدِ سرداری میں ہونے والا نہیں تھا۔

"تمہاری باتیں دل کو لگتی ہیں" ویرا اس کی باتوں سے قائل ہوکے کہہ رہی تھی "تم لوگ بہت مجبور ہو۔ تمہارے مذہب کے بارے میں میری معلومات خاصی ناقص ہیں مگر میں یہ بات اچھی طرح جانتی ہوں کہ تم لوگوں کی مجبوری اپنی انتہا کو پہنچ جائے تو تم پر حرام بھی حلال ہوجاتا ہے۔ شاید تم اس لیے ہیروئن بنانے پر۔۔۔"

"بس!" قندوز خان نے اپنا ایک ہاتھ فضا میں بلند کرکے برہمی سے اس کی بات کاٹ دی۔ غصے کی وجہ سے اس کا سرخ وسفید چہرہ لال بھبھوکا ہوگیا تھا۔ وہ اونچی آواز میں کہہ رہا تھا "ہم اتنے گئے گزرے نہیں ہیں کہ زندہ رہنے کے لیے حرام کھانے پر آمادہ ہوجائیں، تم نے ہیروئن بنانے کو حرام کیسے کہا؟"

"تمہیں معلوم ہے کہ فرزانہ بس نام کی مسلمان ہے۔" میں نے ویرا کو حیرت اور خوف سے گنگ پاکر، جلدی سے بات سنبھالتے ہوئے کہا "جو پاکستانی مرد باہر جاکر سفید عورتوں سے شادیاں کرتے ہیں، ان کی اولادیں ایسی ہی نکلتی ہیں۔ فرزانہ عملاً پوری مسلمان ہے نہ عیسائی۔ یہ ہر بات کو اسی طرح گڈمڈ کردیتی ہے۔"

"میں مانے لیتا ہوں کہ اس نے حرام کا لفظ اپنی کم فہمی کی بنا پر استعمال کرلیا ہوگا مگر اس کے ساتھ تم کو بھی یہ اعتراض تھا کہ ہماری ہیروئن پاکستانیوں کو تباہ کررہی ہے۔ تم بتاؤ کہ اس میں ہمارا کیا قصور ہے؟"

اس کے بگڑے ہوئے تیوروں نے مجھے فوری طور پر محتاط ہونے پر مجبور کردیا اور میں نے دبے لہجے میں کہا "اصل بات تو یہ ہے کہ ہمیں اپنے گھر میں ہیروئن کی روک تھام کرنی چاہیے۔ دوسری بات یہ ہے کہ ہیروئن کہیں بنتی ہے تو بازار میں آتی ہے۔ اس اعتبار سے تھوڑا بہت قصور تم لوگوں کا بھی ہے۔"

"استغفراللہ!" وہ دہاڑا "مجھے تم سے ایسی بودی دلیل کی اُمید نہیں تھی۔ دنیا میں سب سے زیادہ انسان ہتھیاروں کے استعمال سے مرے ہیں لیکن آج تک کسی نے ہتھیار سازی کو حرام قرار دیا نہ ہتھیار بنانے والوں کو قصوروار قرار دیا۔ ہتھیار دفاع کے لیے بنتے ہیں۔ تم رائفل کی گولی اپنے سینے میں اُتار لو تو یہ ہتھیار بنانے والے کا قصور نہیں ہوگا۔ ہیروئن سے دوائیں بناؤ تو وہ جان بچانے کے کام آتی ہیں۔ انہیں نادر ونایاب سمجھا جاتا ہے۔ ہیروئن دشمن کو پلاؤ تو وہ چند روز میں تمہارا مطیع بلکہ غلام بن جاتا ہے لیکن تم یہ نشہ اپنے ہی بچّوں کو پلانے لگو تو اس میں قصور کس کا ہوگا؟ یہ سراسر تمہارا لالچ اور تمہاری گمراہی ہے۔"

"تم ٹھیک کہہ رہے ہو۔" میں نے ہتھیار ڈالتے ہوئے کہا "شاید ہماری سوچ ہی بگڑی ہوئی ہے۔"

"شاید نہیں، یہ یقینی بات ہے" اس نے اپنی شہادت کی انگلی زور زور سے لہراتے ہوئے کہا "فوج، پولیس، قانون اور طاقت کے

ہوتے ہوئے بھی تم کسی بُرائی کو پھیلنے سے نہیں روک سکتے تو یہ تمہاری اپنی خرابی ہے۔ کل کو تمہارے نوجوان اپنے سینوں میں چاقو کے پھل اُتارنے لگیں تو تم چاقو بنانے والوں کو کوسنے لگو گے۔ ان سے کہو گے کہ وہ اپنا کاروبار بند کرکے بھوکے پیاسے مرنے لگیں؟ یہ عجیب مذاق ہے۔ جس دن تم ہیروئن خریدنا بند کردو گے' پہلے اس کے دام گرنے شروع ہوں گے اور پھر ایک دن ہیروئن خود ہی ناپید ہوجائے گی۔ جب تک اس کی منڈیاں اور خریدار موجود ہیں' یہ کام دن بہ دن ترقی کرتا رہے گا کیونکہ اس سے ہزاروں آدمیوں کی روزی وابستہ ہے۔"

بابائے معاشیات' آدم اسمتھ نے طلب اور رسد کا جو اصول اپنی کتاب میں درج کیا تھا وہ قندوز خان کو کسی تعلیم کے بغیر از بر تھا۔ مجھے حیرت ہورہی تھی کہ ہیروئن کے انسداد کا کام کرنے والے علاقائی اور بین الاقوامی اداروں کے اعلیٰ تعلیم یافتہ لوگ اس اصول پر غور کیوں نہیں کرتے تھے؟ ہیروئن کے معاملے میں وہ ہر معاشی اور اقتصادی اصول کو پس پشت ڈال کر' منڈیوں اور خریداروں کے خاتمے کے بجائے پیداوار کے ہر منبع کو نیست و نابود کرنے پر تُلے ہوئے تھے۔ شاید اس لیے کہ افیم یورپ' امریکا یا آسٹریلیا میں پیدا نہیں ہوتی تھی بلکہ اس کی تمام تر عالمی پیداوار چند غریب ایشیائی ملکوں تک محدود تھی۔ انہیں کچلنے کے لیے وہ دولت سے لے کر دھونس' دھمکی اور تشدّد تک کا سہارا لینے کے لیے کمربستہ تھے۔

اس بارے میں قندوز خان کا ذہن کُھل کر ہمارے سامنے آگیا تھا۔ ویسے بھی وہ موضوع تلخی اختیار کرتا جارہا تھا' اس لیے میں فضا کا بوجھل پن دور کرنے کے لیے اچانک ہی ہنس پڑا "ہم سب بلاوجہ جذباتی ہوئے جارہے ہیں۔ ہم نے پورے پاکستان یا افغانستان کا ٹھیکا تو نہیں لیا ہوا ہے۔ تم جو کچھ کررہے ہو' محنت اور شوق سے کرتے رہو۔ ہمیں تم لوگوں کی روزی کے ذرائع پر اعتراض کرنے کا کوئی حق نہیں ہے۔ یہاں سے واپس جانے کے بعد ہم اپنے بااثر لوگوں سے بھی بات کریں گے کہ وہ ہیروئن کے خلاف میدان میں اُتر آئیں۔"

"ہیروئن کے خلاف نہیں" اس نے فوری طور پر میری تصحیح کرتے ہوئے کہا "اپنے ملک میں ہیروئن کے استعمال کے خلاف۔ تم یقین کرو کہ گئے گزرے مسلمان پر بھی مولوی کا زبردست اثر ہوتا ہے۔ تمہارے مولویوں نے ایک بار لوگوں کو یہ یقین دلا دیا کہ ہیروئن خنزیر کے گوشت سے زیادہ حرام ہے تو تمہارے لڑکے ہیروئن سے توبہ کرنی شروع کردیں گے اور ہمارا سارا مال راستے میں رُکے بغیر ولایت جانے لگے گا۔"

"ہم ایسا ہی کریں گے" میں نے اس کی ہاں میں ہاں ملاتے ہوئے کہا ورنہ حقیقت یہ ہے کہ مجھے اس کے زورِ بیان سے پورا اتفاق نہیں تھا۔ مذہب میں حلال اور حرام کے درمیان بہت واضح حدِ فاصل موجود تھی۔ جو اشیا حرام تھیں' وہ سب حرام تھیں۔ ایسا نہیں تھا کہ کوئی کم حرام اور کوئی زیادہ حرام ہو۔ جو لوگ شراب پیتے تھے اور سؤر کا گوشت نہیں کھاتے تھے تو اس میں مذہب کے اعتبار سے کوئی خاص نکتہ نہیں تھا بلکہ اس کا تعلق ذاتی کراہت سے بھی ہوسکتا تھا۔ اس قسم کی کمزور تاویلیں جاہل شنگاریوں کو متاثر کرسکتی تھیں لیکن جدید تہذیب و تمدن کا شعور رکھنے والے' پڑھے لکھے نوجوانوں کو ہیروئن اور خنزیر کے موازنے سے نہیں ڈرایا جاسکتا تھا۔

"تم مولویوں کی بات کررہے ہو تو معلوم ہورہا ہے کہ ہم سب کو بھی پورا مولوی سمجھ رہے ہو" سلطان شاہ نے بات سے بات نکال کر موضوع کو کسی اور پٹڑی پر ڈالنے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔

"نعوذ باللہ!" اس نے اپنا داہنا کان مروڑ کر ہولے سے اپنے رخسار پر اپنی انگلیاں مارتے ہوئے' بُرا سامنہ بنا کر کہا "یہ تم نے کیا کہہ دیا؟ کل رات میں برتن لینے آیا تو وہاں شراب کی بوتل موجود تھی۔ مجھے معلوم ہے کہ فرزانہ اور ڈینی شرابی ہیں۔ ان کو کون احمق مولوی سمجھ سکتا ہے؟"

"پھر ان کی بوتلیں کہاں ہیں؟" سلطان شاہ نے بے ساختہ سوال کیا اور سب لوگ ہنس پڑے۔

"اوہ! تم ٹھیک کہہ رہے ہو۔ باتوں میں اُلجھ کر میں سب کچھ بھول گیا تھا" قندوز خان سٹپٹا کر بولا "تم لوگوں پر رات بہت بھاری گزری ہے پھر صبح لڑائی چھڑ جانے کی وجہ سے ناشتے یا کھانے کی نوبت بھی نہیں آسکی۔ مجھے تمہارے لیے کچھ نہ کچھ بندوبست کرنا چاہیے تھا کیونکہ باقاعدہ کھانا رات گئے تک ہی مل سکے گا۔"

"فکر نہ کرو۔ ہم لوگ بھوک کے کچے نہیں ہیں" سلطان شاہ بے پروائی سے بولا "کھانا ملنے تک ڈرائی فروٹ ٹھونگ کر گزارا کرتے رہیں گے۔ البتہ ان دونوں کے لیے ایک آدھ بوتل کا بندوبست نہ ہوا تو یہ جمائیاں لے لے کر ہمیں بیزار کردیں گے۔ ان کا نشہ ٹوٹنے لگے تو یہ دونوں فلسفی بن کر بور کرنے لگتے ہیں۔"

قندوز خان کے دانت نکل پڑے "یہ اچھی بات ہے کہ تم سب آپس میں بہت بے تکلف ہو۔ میں انتظامات کا جائزہ لے کر ابھی چند منٹ میں واپس آتا ہوں۔"

یہ کہہ کر وہ اُٹھا اور اسی ہال میں بنی ہوئی خواب گاہوں میں سے ایک کی طرف بڑھتا چلا گیا۔

ہماری گفتگو کے دوران میں متعدد شنگاری بڑے بڑے تھال سمیت ان تمام خواب گاہوں میں جاچکے تھے اور شاید صفائی کے ساتھ ہی ان خواب گاہوں کی مناسب تزئین میں مصروف تھے۔

"آج میں تم میں ایک حیرت ناک تبدیلی دیکھ رہی ہوں" قندوز خان کے چلے جانے کے بعد غزالہ نے سلطان شاہ سے چھیڑنے والے لہجے میں کہا "کہیں تمہاری کایا پلٹ تو نہیں ہوگئی ہے؟"

"کیسی تبدیلی؟" غزالہ کے اس غیر متوقع وار پر سلطان شاہ بوکھلا گیا۔ اس کی ویرا سے ہروقت نوک جھونک چلتی تھی لیکن غزالہ اس کے ساتھ ہمیشہ سنجیدہ رہتی تھی۔ کسی کی حمایت کرنے کا موقع نہ مل سکے تو خاموش رہ کر اس کی کوشش کرتی تھی۔ اس وقت غزالہ کے اچانک [illegible] نے سلطان شاہ کو بہت زیادہ حیران کردیا تھا۔

"[illegible] باڑے سے نجات ملنے کے بعد تم خود فرزانہ کے لیے واڈکا [illegible] اٹھا کر لائے تھے اور اب تم نے دوسری بار اس کے لیے [illegible] کا بندوبست کرنے کی بات اُٹھائی ہے۔ مجھے دال میں کچھ کالا [illegible] ہورہا ہے" غزالہ بولی۔

"میں نے ڈینی کا بھی نام لیا تھا" سلطان شاہ مدافعانہ آواز میں [illegible] بری جوتی کو بھی فرزانہ کی پروا نہیں ہوتی تو پھر دال میں کالا کیا [illegible] یہ تمہاری غلط فہمی ہے..."

"[illegible] جوتی کو پروا ہو بھی نہیں سکتی" میں نے غزالہ کی بات اُچک [illegible] مسکراتے ہوئے کہا "کیونکہ ابھی تک ہم چاروں ننگے پاؤں [illegible] رہے ہیں۔ معلوم ہوتا ہے کہ فرزانہ کے لباس میں سے کیڑے [illegible] نکالتے' تم دونوں میں کسی نہ کسی قسم کی مصالحت ہوچکی [illegible] بہتر ہوگا کہ تم خود ہی اس معاملے پر روشنی ڈال دو۔"

"میں فرزانہ کے لیے صبح بوتل اس لیے لایا تھا کہ اس کی [illegible] افزائی کرسکوں۔ اس وقت ہم میں سے کسی کو بھی جنگ کا [illegible] معلوم نہیں تھا۔ یہ ترنگ میں آئی ہوئی تھی اور میں اسے لمبی [illegible] کے لیے تیار کررہا تھا" سلطان شاہ نے کھسیائے ہوئے انداز [illegible] ندامت کرنے کی کوشش کی۔

"اور اس وقت فرزانہ کو کیوں پلانی چاہتے ہو؟" میں نے نکیلے [illegible] لہجے میں پوچھا۔

"فرزانہ کی نہیں' میں نے تم دونوں کی بات کی تھی تاکہ [illegible] بدل سکے۔ اس وقت تم بھی یہی چاہ رہے تھے" وہ بے بسی [illegible] بولا "معلوم ہوتا ہے کہ فرزانہ نے تم دونوں کو بھی اپنے [illegible] اُلو بنایا ہے۔"

"یہ کوئی نئی بات نہیں ہے" اس بار ویرا بول پڑی "ہم تینوں [illegible] ایک دوسرے سے ملے ہوئے ہیں۔ بس تم ہی مجھ سے بدکتے [illegible] صبح ہونے سے پہلے باڑے میں خشک اور گندی گھاس میں [illegible] تنگ کرنے والے کیڑے میرے بدن پر چڑھ رہے تھے تو تم نے انہیں [illegible] سے صاف انکار کردیا تھا اور بھاگ گئے تھے۔"

"تمہیں معلوم ہے کہ میں نامحرم عورتوں کے بدن کو ہاتھ نہیں [illegible]" سلطان شاہ بُرا سامنہ بنا کر بولا "وہ سب تمہارا فراڈ تھا۔ ورنہ [illegible] ہوسکتا ہے کہ تمہارے جسم پر کیڑوں نے یلغار کی ہوئی ہو اور [illegible] پر ایک چیونٹی بھی نہ آئی ہو؟"

"[illegible] کیڑے آدمی کو دیکھ بھال کر منتخب کرتے ہیں" میں نے کہا [illegible] موذی کیڑا بھی ہر ایک کو نہیں کاٹتا۔ ان ہی لوگوں کو تاک تاک کر پریشان کرتا ہے جن کا خون میٹھا ہو۔"

"یعنی میرا خون کڑوا ہے؟" سلطان شاہ مجھ پر آنکھیں نکالنے لگا۔

"میں نے تمہارے خون کو کچھ نہیں کہا' مچھروں کی مثال دی تھی۔ رات والے باڑے میں تو سرے سے مچھر ہی نہیں تھے۔ فرزانہ کو تنگ کرنے والے کیڑے شاید اس کی بُو پر گئے ہوں گے۔"

"بُو نہیں بدبُو!" سلطان شاہ اتنی اونچی آواز میں بڑبڑایا کہ ویرا کو وہ تبصرہ سُن کر غصہ آگیا۔

"اس سے پوچھو کہ یہ نامحرم عورتوں کو چھونے سے ڈرتا ہے تو چوروں کی طرح ان کا پیچھا کیوں کرتا ہے؟" ویرا نے غصیلے لہجے میں مجھ سے کہا۔ میں اس کی بات سننے کے بعد استفسار طلب نظروں سے سلطان شاہ کی طرف دیکھنے لگا۔

"یہ جھوٹ بول رہی ہے۔ ہم ہروقت ایک دوسرے کے سامنے رہے ہیں۔ غزالہ کسی ضرورت سے باہر جاتی ہے تو میں اس کے ساتھ باہر تک ضرور جاتا ہوں اور اسے ساتھ لے کر آتا ہوں لیکن فرزانہ غسل خانے وغیرہ جاتی ہے تو میں جان بوجھ کر اس کے پیچھے نہیں جاتا۔ کیا پتا وہ مجھ پر کس وقت کوئی الزام لگا بیٹھے۔"

"میں نہیں' تم جھوٹے ہو" ویرا نے ترکی بہ ترکی جواب دیا "دو جیپوں میں جیغا سرائے سے یہاں آتے ہوئے جب ہم نے بادوباراں کے طوفان میں گھرنے کے بعد غاروں میں پناہ لی تھی تو تم اندھیرے میں میرے پیچھے لگے ہوئے تھے۔ تم نے خود ڈینی سے اقرار کیا ہے کہ تم اندھیرے میں چھپ کر مجھے دیکھتے رہے تھے۔"

"میں شراب کے نشے میں دھت' صندل خان کی کسی دست درازی کے خوف سے تمہاری حفاظت کررہا تھا۔ میری نیک نیتی کو غلط رنگ دینے کی کوشش مت کرو۔ اس رات صندل خان کے عزائم اچھے نہیں تھے۔"

"جو ہاتھی پر سواری گانٹھنے کا شوقین ہوتا ہے' وہ اسے اپنے قابو میں کرنا بھی جانتا ہے۔ وہ میری مرضی کے خلاف کوئی بھی حرکت کرتا تو میں ایک سیکنڈ کے ہزارویں حصے میں اسے بے ہوش کرسکتی تھی۔ تم جانتے ہو کہ مارشل آرٹس میں میری مہارت ہر شعبے سے بالاتر ہے پھر تمہیں میری حفاظت کرنے کی کیا ضرورت تھی؟"

"لعنت ہے میرے اوپر!" سلطان شاہ لاجواب ہوکر خود ملامتی پر اُتر آیا اور بھنّائے ہوئے لہجے میں بولا "اب کوئی شنگاری تمہیں زبردستی بھی اٹھا لے گیا تو میں اپنی آنکھیں بند کرلوں گا مگر اپنی جگہ سے نہیں ہلوں گا۔ میں نے تمہارے ساتھ نیکی کی اور تم میرے اسی فعل پر الزام تراشی کررہی ہو۔"

"باتوں کا ہیر پھیر نہ چلاؤ۔ ایک طرف تم میرے بدن کو ہاتھ لگانے سے ڈرتے ہو اور دوسری طرف صندل خان سے جلتے ہو۔

تمہارے سینے پر یہ سانپ لوٹ [illegible] ہوگا کہ میں اس کے بجائے تمہارے ساتھ جیپ میں کیوں نہیں گئی۔ یہ کھلی کھلی رقابت تھی۔ وہ تو غنیمت ہوا کہ میں نے اسے قابو میں کیے رکھا۔ وہاں ذرا سی بھی بے اعتدالی ہوتی تو تمہیں اپنے رقیب کو مارنے کا ایک معقول بہانہ مل جاتا" اسے کمزور پڑتا دیکھ کر ویرا حاوی ہونے کی کوشش کرنے لگی۔

"لاحول ولا قوۃ" سلطان شاہ اپنا سر جھٹک کر غرایا "اگر میں صندل خان کو اپنا رقیب سمجھ رہا تھا تو پھر باڑے میں، میں نے تمہاری دل جوئی کی کوششیں کیوں نہیں کیں؟ تمہارے تو پورے لباس میں کیڑے ہی کیڑے گھس گئے تھے۔"

"اصل بات یہی ہے" ویرا ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے بولی "تمہارے رویّے میں یہ تضاد کیوں ہے؟ میں اسی کا سبب جاننا چاہتی ہوں تاکہ تم سے اپنے مراسم اسی کے مطابق رکھوں۔"

"شاید میں پاگل ہوں جو بلاوجہ تم سے ہمدردی کرتا پھرتا ہوں۔" وہ بے زاری کے عالم میں بولا "میری خطا معاف کرو۔ آئندہ میں محتاط رہوں گا۔ تم چاہو تو ابھی اور اسی لمحے صندل خان کے پاس جاسکتی ہو۔"

"یہ صندل خان کا کیا ذکر ہورہا ہے؟" اچانک میرے عقب سے قندوز خان کی آواز اُبھری۔ شاید اس نے واپس آتے ہوئے سلطان شاہ کی زبان سے صندل خان کا نام سُن لیا تھا۔

"وہ اچھا آدمی تھا اور ہمارا دوست بن گیا تھا" میں نے کہا "پتا نہیں، اب وہ زندہ ہے یا مارا جاچکا ہے؟"

"اسے میں نے جنگ ختم ہونے کے بعد زندہ مگر زخمی حالت میں دیکھا۔" وہ قریب آکر بولا "مگر تم لوگ بہت سادہ لوح ہو کہ اسے اپنا دوست سمجھ رہے ہو۔"

"اس نے ہماری بہت دیکھ بھال کی تھی" میں نے کہا "وہ نہ ہوتا تو ہم یہاں بہت پریشان ہوجاتے۔"

"تھال میں بڑی قاب کو اوندھا دیکھتے ہی اس کی کھوپڑی بھک گئی تھی۔ اس نے تم چاروں کو ایک قطار میں کھڑا کرکے تمہاری پنڈلیوں کو گولیوں کی باڑھ سے چھلنی کرنے کا ارادہ کرلیا تھا تاکہ تم ملنے جلنے سے بھی معذور ہوجاؤ۔ مجھے معاملات کی نزاکت کا اندازہ تھا اس لیے میں وقت سے چند منٹ پہلے ہی خالی برتن لینے آگیا۔ میں نے اسے مشورہ دیا کہ پائندہ گل سے مشورہ کیے بغیر کوئی قدم اُٹھانا مناسب نہیں ہوگا۔ غنیمت ہوا کہ اس نے میری بات مان لی اور تمہاری ٹانگیں بچ گئیں۔ بعد میں تمہیں چند گھنٹوں کے لیے اُلٹا لٹک کر جو تکلیف اٹھانی پڑی، وہ ٹانگوں سے ہمیشہ کے لیے محرومی کے مقابلے میں کچھ بھی نہیں تھی" اس نے فخر آمیز مسکراہٹ کے ساتھ انکشاف کیا۔

"غنیمت ہے کہ پچھلی رات خیریت سے گزر گئی" میں نے ان سنسنی خیز لمحات کو یاد کرتے ہوئے پُرخیال انداز میں کہا "ویسے تم ایمان داری سے سوچو کہ وہ پائندہ گل کا وفادار تھا اور الٹی قاب کو دیکھ کر بالکل صحیح بھڑکا تھا۔ صبغت اللہ بادرانی ہے اور اسی نے کسی جھونک میں ہمیں اپنا روایتی طریقہ اختیار کرنے کی ہدایت دے ڈالی تھی اور صندل خان اُلٹی قاب کا مطلب اچھی طرح جانتا تھا۔ تم اس کی جگہ ہوتے تو تمہارا ردِعمل شاید اور بھی شدید ہوتا۔ اس اکلوتے واقعے کے علاوہ صندل خان شروع سے آخر تک ہمارے ساتھ بہت مہربانی سے پیش آتا رہا تھا۔"

"تم اس سے اتنے ہی مانوس ہو تو فکر نہ کرو، اسے تمہاری خدمت پر مامور کردیا جائے گا۔" اس کی آواز میں ہلکی سی تلخی پیدا ہوگئی "جنگ کا فیصلہ ہوجانے کے بعد اب وہ نئے سردار کا وفادار ہوچکا ہوگا" یہ کہہ کر وہ واپس مڑگیا "آؤ! اب اپنے کمروں میں آکر آرام کرو۔ وہاں تمہاری آسائش کی ہر چیز موجود ہے۔"

ہم چاروں خاموشی سے اس کے پیچھے ہولیے۔ وہ ایک کمرے کے درمیانی دروازے میں داخل ہوا تو ہم اس کے ساتھ تھے۔ گالان کے معیار کے مطابق وہ واقعی ایک شاندار خواب گاہ کہی جاسکتی تھی۔ جس طرح وہ قبائلی، ہم لوگوں کے مقابلے میں جسیم اور قد آور تھے اسی طرح ان کے یہاں ہر چیز ضرورت سے زیادہ بڑی ملتی۔ بڑے بڑے کمرے، سونے کے لیے بڑے تخت، کھانے کے لیے چار کے برابر ایک تندوری روٹی، لباس اتنے ڈھیلے ڈھالے کہ ان میں بیک وقت دو آدمی سما سکیں۔ حد یہ تھی کہ ان کے کھانے اور پینے کے برتن بھی غیر معمولی طور پر بڑے ہوتے تھے۔ اس کشادہ خواب گاہ کا پورا فرش قالین سے ڈھکا ہوا تھا۔ ایک دیوار کے ساتھ قطار کی صورت میں تین بڑے تخت، ایک دوسرے سے قدرے فاصلے پر بچھے ہوئے تھے۔ یہ تخت ہماری پچھلی خواب گاہ والے جہازی تختوں سے چھوٹے ہونے کے باوجود، ایک شنگاری کی ضرورت سے کہیں زیادہ بڑے تھے۔ ہر تخت پر ایک دبیز گدا اور اس پر سفید چادر بچھی ہوئی تھی۔ دو پھولے ہوئے نرم تکیے، [illegible] کے لحاف اور ہلکے اونی کمبل اس کے علاوہ تھے۔ ہر تخت کے سرہانے ایک چوبی تپائی رکھی ہوئی تھی، جس پر انواع واقسام کے خشک پھلوں سے لدی ہوئی ٹوکری، پانی سے بھرے ہوئے جگ اور گلاس کے علاوہ واڈکا کی سربمہر بوتل بھی رکھی ہوئی تھی۔

"مجھے اندازہ نہیں تھا کہ میرے آدمی اتنے ذہین ہیں" قندوز خان نے ہنستے ہوئے کہا "دیکھ لو، انہوں نے ہر بستر کے ساتھ شراب کی بوتل کا بندوبست کیا ہوا ہے۔ تم چاروں کی خواب گاہیں ایسے ہی لوازم سے آراستہ ہوچکی ہیں۔"

"تین بستروں والا یہ کمرا ایک آدمی کے لیے استعمال ہوگا؟" سلطان شاہ نے حیرت سے پوچھا۔ قندوز خان کی بروقت آمد کی [illegible] سے وہ اپنی اور ویرا کی لڑائی کو شاید یکسر فراموش کرچکا تھا۔

"ہمارا کوئی مہمان اکیلا نہیں آتا۔ اس کے ساتھ ایک [illegible] محافظ یا خدمت گار ضرور ہوتے ہیں جو دن رات اپنے مالک کے ساتھ رہتے ہیں۔ اسی وجہ سے تمہیں یہاں تین بستر نظر آرہے ہیں ورنہ حقیقتاً یہ ایک مہمان کا کمرا ہے۔"

"چار بڑے بڑے کمرے اور بارہ بوتلیں!" غزالہ تحیرزدہ آواز میں بڑبڑائی "اتنا عیش و آرام ہمیں راس نہیں آسکے گا۔ میرا تو خیال ہے کہ اسی کمرے میں ایک بستر کا اضافہ کردیا جائے تو ہم چاروں آرام سے گزارا کرسکتے ہیں۔"

ویرا نے فوراً ہی غزالہ کے خیال کی تائید کی اور قندوز خان عجیب انداز میں ہنس پڑا۔ مجھے محسوس ہوا کہ اس کی ہنسی میں تضحیک کا خفیف سا عنصر شامل تھا۔

"شہر والے سب ایک جیسے ہوتے ہیں" ہنسنے کے بعد وہ سنجیدگی سے بولا "عبدالرحیم خان کی میت پر شہروں سے پائندہ گل کے تین مہمان آئے تھے تو وہ بھی ایک ہی کمرے میں رہے تھے۔ انہیں بڑے بڑے اور خالی کمروں سے خوف آرہا تھا۔ تم بھی شاید ڈر رہے ہو لیکن یقین رکھو کہ گالان میں تم سب محفوظ و مامون ہو۔ تمہاری عورتوں تک پر کوئی بُری نگاہ ڈالنے کی جرأت نہیں کرسکے گا۔ سب جانتے ہیں کہ اس وادی کے سردار کی مہمان عورتوں سے بدنگاہی کرنے والوں کی آنکھیں کالی چیلوں سے نُچوا دی جاتی ہیں۔"

"ہمیں پہلے بھی کوئی خوف لاحق نہیں تھا" میں نے بے پروائی سے کہا "شہری لوگ اپنی اپنی ذات کے خول میں بند رہنے کے بجائے، مل جل کر وقت گزارنا پسند کرتے ہیں۔ یہاں ہمیں ایک دوسرے سے ہنسنے بولنے کی سہولت حاصل رہے گی، ہر بات کو اپنے معیار سے پرکھنے کی عادت اچھی نہیں ہوتی۔"

"اوہ! تم بُرا مان گئے" وہ جلدی سے بولا "ہم لوگ بھی مردم بیزار نہیں ہیں لیکن بہت زیادہ میل جول سے جلد ہی اکتا جاتے ہیں۔ جاڑوں کی لمبی اور اندھیری راتوں میں جب ہم چیڑ کے الاؤ روشن کرکے ان کے شعلوں پر سالم جانور بھونتے ہیں اور نقارے کی آواز پر رقاص ناچتے ہیں تو ہم رات بھر وہاں سے نہیں ہلتے۔ عجیب کھیل تماشے ہوتے رہتے ہیں لیکن عام دنوں میں ایک شنگاری کا خواب یہ ہوتا ہے کہ وہ کسی اونچی چٹان پر اکیلا بیٹھ کر اپنی بانسری بجارہا ہو، اس کی بھری ہوئی رائفل پہلو میں رکھی ہو، اس کی نگاہیں ڈوبتے ہوئے سورج کی خوں رنگ شعاعوں پر مرکوز ہوں اور دیکھتے ہی دیکھتے ہر طرف سے گہرے اندھیرے کی چادر اسے اپنی آغوش میں سمیٹ لے۔ فضا میں اس کی بانسری کے سُر گونج رہے ہوں یا پھر پالتو بھیڑوں کے ممیانے کی آوازیں۔ ان علاقوں میں بہت سے لوگ ہر رات کھلے آسمان کے نیچے سُر الاپتے الاپتے اسی طرح ننگی چٹانوں پر گہری نیند سوجاتے ہیں اور پھر اگلی صبح کے سورج کی کرنیں ہی انہیں بیدار ہونے پر مجبور کرتی ہیں۔"

"شاید تمہارے رومان میں بھی سورج، بانسری، رائفل، بھیڑوں اور چٹانوں کے علاوہ کچھ نہیں ہے" ویرا نے اس کی باتوں میں دلچسپی لیتے ہوئے پوچھا۔ اس وقت تک ہم پانچوں قالین پر بیٹھ چکے تھے۔

اس کی آنکھوں میں بے نام سی اُداسی اُتر آئی "تم ٹھیک کہہ رہی ہو۔ یہاں رہنے والوں کے رومان کی انتہا یہی ہے کیونکہ غیر منکوحہ عورت یہاں شجرِ ممنوعہ ہے۔ پہاڑوں میں مقید زندگی گزارنے والے اسی خشک اور سنگلاخ رومان کے عادی ہیں لیکن باہر آنے جانے والوں کو یہ سب بہت بے کیف معلوم ہوتا ہے۔"

اس وقت میرا ذہن پائندہ گل کے ان تین مہمانوں میں اُلجھا ہوا تھا جو عبدالرحیم خان کی میت پر آئے تھے۔ قندوز خان کی زبان سے ان کا ذکر سنتے ہی میرا ذہن بدرو دادا کی طرف بھٹک گیا تھا۔ گالان کے حالات ڈرامائی طور پر بدل چکے تھے اور ہمیں وہاں سے آزادی ملنے کے آثار بھی پیدا ہوچلے تھے مگر پھر بھی مجھے خلش تھی کہ بدرو دادا نے میری حمایت میں کوئی پیش رفت نہیں کی تھی۔ اس کی طرف سے مکمل خاموشی سے ایک ہی نتیجہ اخذ کیا جاسکتا تھا کہ عبدل اور ولی نے ہم سے مار کھانے کے بعد انتقام کے طور پر اپنے آقا کو ہمارے بارے میں آگاہ نہیں کیا تھا۔

ویرا نے قندوز خان کی کمزوری بھانپ لی تھی اور شہروں کی ملی جلی رونقوں کے حوالے سے اس کے محروم جذبوں سے بہت بے رحمی سے کھیل رہی تھی۔ میں خاموشی سے کسی وقفے کا منتظر رہا اور موقع ملتے ہی گفتگو میں اپنی ٹانگ اڑا بیٹھا۔ "چھوٹے خان کی تدفین میں باہر سے شرکت کرنے والوں میں بدرو بھی رہا ہوگا؟"

"وہی تو اپنے ٹرک میں لاش کو جیغا سرائے تک لایا تھا" قندوز خان نے بلاتوقف جواب دیا "وہ ہمارے لیے بھی بہت اہم آدمی رہے گا۔ مگر تم اسے کیسے جانتے ہو؟"

"وہ میرا بہت پُرانا دوست ہے۔ اسے علم ہوجاتا کہ پائندہ گل میرے پیچھے لگا ہوا ہے تو وہ درمیان میں پڑ کر مصالحت کی کوئی نہ کوئی راہ نکال ہی لیتا اور ہمیں یہاں تک کا سفر نہ کرنا پڑتا۔"

"پشاور سے اس کا پیغام آیا ہوا ہے" وہ چونک کر بولا "وہ پائندہ گل سے ملنا چاہتا تھا۔ ہم لوگ اپنے معاملوں میں مصروف تھے اس لیے جواب میں خاموشی اختیار کرلی۔ وہ کسی بھی وقت جیغا سرائے پہنچ سکتا ہے۔ سردار صبغت اللہ کو حیرت ہے کہ وہ اتنی کم مدت میں دوبارہ یہاں کیوں آنا چاہ رہا ہے۔ اب بات سمجھ میں آئی کہ وہ تمہارے لیے سفارش لے کر آیا ہوگا۔ اسے کیا پتا کہ پائندہ گل بے چارہ اب مرحوم ومغفور ہوچکا ہے۔"

میری اور قندوز خان کی گفتگو کے دوران میں ویرا کو وقت مل گیا اور اس نے پُھرتی کے ساتھ ایک بوتل کھول کر تین گلاس صاف کرلیے۔ اس نے دو گلاس تیار کرلیے لیکن تیسرے کو خالی رہنے دیا۔

"میری اس سے ملاقات نہ ہوسکے تو تم اسے میرا سلام پہنچادینا۔ تم سے معلومات حاصل کرنے کے بعد وہ ہماری پوری کہانی سمجھ جائے گا۔ یہاں گھنٹیوں والا قصہ نہ چل پڑا ہوتا تو ہماری

ساری اُمیدیں اسی کی ذات سے وابستہ تھیں۔ مجھے راستے میں معلوم ہوا کہ ہمیں اغوا کر کے یہاں لانے کے لیے اسی کا ٹرک اور عملہ استعمال کیا گیا تھا۔ یہ بات کراچی میں ہی معلوم ہو جاتی تو بات وہیں نمٹ جاتی۔"

"فرزانہ خانم! تیسرا گلاس بھی بھردو!" قندوز خان نے ویرا کے پس وپیش کو سمجھتے ہوئے کہا "میں تمہیں بتا چکا ہوں کہ جو شنگاری اردو بول لیتے ہیں' ان کا باہر آنا جانا لگا رہتا ہے اور ان پہاڑوں سے باہر نکلنے والے شراب کے جادو سے کسی طرح نہیں بچ سکتے۔ تھوڑی دیر تک میں بھی تمہارا ساتھ دوں گا۔"

ویرا' شنگاریوں میں اپنا ایک اور ہم ذوق دریافت کر کے خوش ہو گئی۔

میں نے چند ثانیوں تک دیوار گیر مشعلوں کا جائزہ لینے کے بعد ایک سوچا سمجھا سوال کر ڈالا "مجھے حیرت ہے کہ ہیروئن سے بے تحاشا پیسہ کمانے کے باوجود پائندہ گل نے یہاں بجلی جیسی بنیادی سہولت فراہم کرنے کی کوشش نہیں کی۔ بجلی آجانے کے بعد تمہیں نہ صرف ان مشعلوں سے نجات مل سکتی ہے بلکہ تمہاری بستیوں میں ٹیلی وژن جیسی تفریحی سہولتیں بھی میسر آسکتی ہیں۔"

"اپنے سوال کا جواب تم نے خود ہی دے ڈالا ہے" قندوز خان نے بھونڈے انداز میں' ایک ہی سانس میں آدھا گلاس خالی کرنے کے بعد کہا "بجلی بہت سی مصیبتوں کی جڑ ہے۔ پائندہ گل نے اس بارے میں سوچا تھا۔ اس کے کمرے میں ایک جنریٹر آج بھی پوشیدہ ہے۔ یہاں کے لوگ روشنی دینے والی شیشے کی گیندوں کو دیکھ کر حیرت زدہ رہ گئے تھے۔ پھر پائندہ گل نے اپنے جرگے کے ساتھ پوری چار راتوں تک بند کمرے میں ٹیلی وژن کے سارے پروگرام دیکھے اور فیصلہ کیا کہ یہاں بجلی تباہی پھیلا دے گی۔ لوگ کاہل اور کام چور ہو جائیں گے۔ یہاں جرائم ہونے لگیں گے اور عورتیں بالکل ہی بے لگام بلکہ آوارہ ہو جائیں گی۔ بنی سنوری عورتوں کو نامحرم مردوں سے عشق ومحبت کرتے ہوئے دیکھ کر وہ بھی آنکھیں لڑانے لگیں گی اور کچھ پتا نہیں چل سکے گا کہ کس کی کوکھ میں کس کا گناہ پروان چڑھ رہا ہے۔ یہ بے اعتباری خون کے رشتوں کو نگل جائے گی اور شنگارا ویلی کا امن وسکون غارت ہو جائے گا۔ بجلی کی روشنی کے ساتھ آنے والی اس بربادی کے امکان نے ہر ایک کو دہشت زدہ کر دیا۔ وہ جنریٹر پائندہ گل کے کمرے میں چُھپا ہوا ہے اور شنگارا ویلی کا واحد ٹیلی وژن اسی حویلی کے ایک تہ خانے میں بند ہے۔ پائندہ گل نے جوش میں آکر روشن قمقموں کا تماشا ضرور لگایا تھا لیکن ٹیلی وژن کی کسی کو کانوں کان بھی خبر نہیں ہو سکی۔"

"یہ بہت عجیب بات ہے۔ تم لوگوں کی سوچ اسی قدر سوقیانہ رہی تو شنگارا ویلی میں دس خونی انقلاب بھی کوئی بڑی تبدیلی نہیں لا سکیں گے" میں نے ملامت بھرے لہجے میں کہا "بجلی تو ترقی کی بنیاد ہوتی ہے۔"

"بڑی تبدیلیوں سے ہم خود ڈرتے ہیں۔" وہ کسی جھجک کے بغیر بولا۔ "ترقی اپنے ساتھ تباہی بھی لاتی ہے۔ اس کا سب سے پہلا وار انسانوں اور انسانیت پر ہوتا ہے۔ ہمیں معلوم ہے کہ شنگارا ویلی میں ہم' تم لوگوں سے ڈیڑھ دو سو سال پیچھے جی رہے ہیں مگر ہم اس پُر مشقت زندگی سے خوش ہیں کیونکہ ہمیں اپنی رسمیں اور قدیم روایات اپنی جانوں سے بڑھ کر عزیز ہیں۔ اپنی عورتوں کی شرم وحیا اور عصمت وعفت کو ہم کسی قیمت پر قربان نہیں کر سکتے۔ جب تک ہم زندہ ہیں' ان ہی مشعلوں کی روشنی میں اپنی شامیں گزارتے رہیں گے۔"

اپنی بات ختم کرتے ہی اس نے دوسرے گھونٹ میں اپنا گلاس خالی کر ڈالا۔ ایسا معلوم ہو رہا تھا۔ جیسے اس جذباتی گفتگو نے یک بیک ہی اس کی پیاس بہت زیادہ بڑھا دی ہو۔

"بُرا نہ مانو تو میں یہ کہوں گی کہ تم ندیدے پن سے شراب پی رہے ہو۔" ویرا دلکش مسکان کے ساتھ بولی۔

اس نے اپنی پیشانی کو دونوں ہتھیلیوں میں دبا کر زور سے ہلایا پھر بولا۔ "نازک مزاج لوگوں کے ساتھ ہمیں بھی تکلف کرنا پڑتا ہے۔ جب شنگاری مل کر پیتے ہیں تو رنگ ہی کچھ اور ہوتا ہے۔"

"کیا شراب پینے کے ساتھ بوتلیں بھی چبا جاتے ہو؟" ویرا مسلسل اس کی آنکھوں میں جھانکے جا رہی تھی۔

"کوئی خدمت گار نہ ہو تو شاید ہم بوتلیں بھی چبا ڈالیں' فرزانہ خانم!" وہ ویرا کی بات کا بُرا مانے بغیر' اس کی طرف جھک کر بولا۔ "الگ الگ ہر شراب دھیمی ہوتی ہے۔ ان سب کو ملا لو تو بس کمال ہو جاتا ہے۔ ایک خدمات گار بڑی سی بالٹی میں بھانت بھانت کی شرابوں کی کئی کئی بوتلیں اُلٹ کر' انہیں چشمے کے ٹھنڈے پانی میں گھولتا رہتا ہے اور ڈونگے سے ہمارے خالی پیالے بھرتا رہتا ہے۔ ہم بالٹی' ڈونگوں اور پیالوں سے پینے والے لوگ ہیں۔ یہ گلاس تو ہمارے پیالوں کے چوتھائی سے بھی چھوٹے ہیں۔"

میرے ہونٹوں پر بے ساختہ مسکراہٹ پھیل گئی۔ مجھے ایک بہت پُرانا واقعہ یاد آگیا تھا۔ وہ ہمارے بھلے دن تھے۔ ایک دوست کو شراب نوشی کی تحریک ہوئی تو اسے پینے کے آداب کا مطلق علم نہیں تھا۔ بیئر کی بوتل چُھپا کر بیت الخلا میں لے گیا۔ بوتل لوٹے میں خالی کی اور اسے پانی سے بھر دیا۔ ٹونٹی سے منہ لگا کر لوٹا خالی کر دینے پر بھی اسے سرور نہ آیا تو اس نے اندازہ لگا لیا کہ اس کے اعصاب بہت مضبوط تھے۔ کافی دنوں بعد اسے علم ہوا کہ بیئر میں الکحل کا تناسب ہر شراب سے بہت کم ہوتا ہے اور وہ خالص شکل میں پی جاتی ہے۔ پانی میں ملا کر نہیں۔ آداب مے نوشی سے واقف ہونے کے بعد موصوف اسکاچ کا دوسرا پیگ پیتے ہی جذبات زدہ ہو جایا کرتے تھے۔ میں نے اپنی زندگی میں لوٹے سے بیئر پینے کا وہ پہلا قصہ سُنا تھا اور قندوز خان اپنے قبیلے میں بالٹی اور پیالوں کی داستان سُنا رہا تھا۔

"بالٹی سے کاک ٹیل پینے کے بعد تم لوگوں کو کون سنبھالتا ہوگا؟" ویرا نے پُر تشویش لہجے میں پوچھا۔

"ایسی محفلیں روز روز نہیں جمتیں۔ ہم لوگ جب بھی کہیں بیٹھتے ہیں تو خود سے اٹھنے کی باری نہیں آتی۔ ہر ایک ہی شراب پی کر اپنی جگہ پر ڈھیر ہوتا چلا جاتا ہے۔ آخر میں بچنے والی شراب خدمت گار کے حصے میں آتی ہے اور وہ بھی بالٹی اپنے معدے میں خالی کر کے وہیں اوندھا ہو جاتا ہے۔" وہ سرور کے عالم میں بتانے لگا۔ "جب تک شراب دل بھر کر نہ پی جائے مزہ آ ہی نہیں سکتا۔ تھوڑی بہت پینے کے بعد تو شنگاریوں کی کھوپڑیاں سُن ہو جاتی ہیں اور وہ پتھر کے بُت بن کر رہ جاتے ہیں۔ انہیں وقت پر مزید شراب مل جائے تو ان سے بہتر لطیفہ گو اور خوش مذاق لوگ روئے زمین پر کہیں نہیں مل سکتے۔ دوسری صورت میں وہ کاٹھ کے اُلو سے بھی بدتر ہو جاتے ہیں۔"

"ایسے مواقع پر پائندہ گل کے تہ خانے والا ٹیلی وژن بھی دیکھا جاتا ہوگا؟" میں نے کریدا۔

"نہیں" اس نے سختی سے کہا۔ "پائندہ گل اپنے جرگے کے ساتھ ہر روز تہ خانے میں جاتا تھا اور بہت دیر سے واپس آتا تھا۔ اس وقت فضا میں جنریٹر کی آسیبی آواز بھی دور تک گونجتی تھی۔ میرا خیال ہے کہ وہ لوگ تہ خانے میں چُھپ کر ٹیلی وژن دیکھتے تھے کیونکہ ان کے لیے شراب اور کھانے کی ساری چیزیں نیچے ہی رکھ دی جاتی تھیں۔ پائندہ گل کے اندر اُترنے کے بعد کسی کو اس تہ خانے میں جانے کی اجازت نہیں تھی۔ چھوٹے خان کی موت کے بعد سے اس نے اپنے پسندیدہ تہ خانے میں جانے کا سلسلہ ختم کیا ہوا تھا۔ کبھی کبھی میرا دل بہت مچلتا ہے لیکن گالان میں میں نے آج تک ٹیلی وژن کی صورت نہیں دیکھی۔ پشاور سے وی سی آر اور ایک پشتو فلم لا کر یہاں کے مردوں کو دکھا دی جائے تو مجھے پورا یقین ہے کہ سارے شنگاری بدمست ہاتھیوں کی طرح بے قابو ہو جائیں گے۔ تمہاری پشتو فلموں میں بے حجاب عورتوں کے ناچ؟ الامان! مجھے تو حیرت ہوتی ہے کہ سنیماؤں میں تماشائی بے قابو ہو کر پردے سے کیوں نہیں لپٹ جاتے۔ میں کبھی کوئی پورا ناچ نہیں دیکھ سکا۔ پتا نہیں سرحد کی کس تحصیل میں یہ سب ہوتا ہوگا۔"

"تم اپنا دل چھوٹا نہ کرو۔" ویرا نے دوبارہ اس کا گلاس لبریز کرتے ہوئے کہا۔ "اب صبغت اللہ یہاں کا سردار ہے۔ وہ پائندہ گل کی ہر چیز پر قابض ہے۔ تم روز ٹیلی وژن دیکھ سکو گے۔ چاہو تو تم کابل یا پشاور سے وی سی آر اور کچھ پشتو فلمیں بھی لا سکتے ہو۔ اب تمہیں ہر طرح کی آزادی حاصل ہو جائے گی۔"

"صبغت اللہ بہت سخت آدمی ہے۔ وہ نئی روشنی کا کٹر مخالف ہے۔ میرا تو خیال ہے کہ وہ اب تک جنریٹر اور ٹیلی وژن کو توڑ پھوڑ کر برباد کر چکا ہوگا۔ وہ صاف کہتا ہے کہ پہلے لوگ گانا سُننے کے لیے 'رات کے اندھیرے میں چوروں کی طرح منہ چھپا کر گانے والیوں کے کوٹھے پر جاتے تھے۔ آج ٹیلی وژن نے ان کوٹھوں کو نئی دنیا کی ہر کوٹھی میں پہنچا دیا ہے۔ ماں' باپ' میاں' بیوی' بہن' بھائی کی کوئی شرم یا چوری باقی نہیں رہی۔ سب ایک ساتھ بیٹھ کر ان مراثیوں کو دیکھتے اور سنتے ہیں اور ان کی تعریفیں کرتے ہیں۔ اس میٹھے زہر نے انہیں اتنا بے حس اور بے غیرت بنا دیا ہے کہ اب انہوں نے برائی کو برائی نہیں بلکہ اچھائی سمجھنا شروع کر دیا ہے اور یہ قیامت قریب ہونے کی ایک نشانی ہے۔ ایسے سب لوگ کندۂ جہنم بنائے جائیں گے۔ صبغت اللہ دوسروں سے چھپ کر کوئی کام نہیں کرے گا۔" اس مرحلے پر وہ اچانک ہی میری طرف متوجہ ہوا تو اس کی آنکھیں کسی اندرونی جذبے کے تحت چمک رہی تھیں۔ اس نے قدرے نیچی آواز میں مجھ سے پوچھا "یہ بات ابھی تک میری سمجھ میں نہیں آسکی کہ تمہاری اور سردار صبغت اللہ کی پرانی شناسائی کہاں سے نکل آئی۔ وہ نقاب لگا کر تم سے ملا تو بالکل اجنبی تھا لیکن آج تم دونوں کا آمنا سامنا ہوا تو تمہارے درمیان رمزیہ گفتگو شروع ہو گئی۔ یہ بات رہ رہ کر میرے دماغ پر کچوکے لگا رہی ہے۔"

"تم اپنے سردار کے بارے میں متجسس ہو رہے ہو؟" میں نے ہلکے سے طنز سے کہا۔ "شاید تم یہ بات فراموش کر بیٹھے ہو کہ اس نے مجھے ماضی کو بھول جانے کی ہدایت کی تھی۔"

"نہیں' نہیں! میری کیا مجال کہ میں سردار صبغت اللہ کے بارے میں تجسس کر سکوں۔" اس نے بوکھلائے ہوئے انداز میں کہا اور دونوں ہاتھوں سے اپنا منہ پیٹنے لگا۔ ویرا نے اس کے دونوں ہاتھ پکڑنے کے لیے آگے بڑھنے کا ارادہ کیا مگر میں نے آنکھ کے اشارے سے اسے روک دیا اور خاموشی سے اس کا تماشا دیکھتا رہا۔

"نہیں' نہیں' یہ ہرگز نہیں ہو سکتا۔" چند ثانیوں بعد وہ اپنے سر کو جھٹکتے ہوئے' بھرائی ہوئی آواز میں بولا۔ "کیسے ہو سکتا ہے کہ میں اپنے سردار کی باتوں کا کھوج لگاتا پھروں؟ تم بھول جاؤ کہ میں نے تم سے کچھ پوچھا تھا۔"

"تم فکر مت کرو۔ یہ بات یہیں ختم ہو گئی۔" میں نے مہربانہ انداز میں اس کی پشت پر ہلکی سی تھپکی دیتے ہوئے کہا۔ "میرا فرض تھا کہ سردار صبغت اللہ کی ہدایت تمہیں یاد دلا دوں۔ تم اس کے باوجود اصرار کرتے تو میں پوری کہانی تمہارے سامنے دُہرا دیتا۔ اس سے مجھے کوئی فرق نہیں پڑتا تھا۔"

قندوز خان نے متاسفانہ انداز میں اپنا سر ہلاتے ہوئے' اپنا گلاس غٹاغٹ خالی کر دیا جس کے نتیجے میں اس کی دونوں آنکھوں میں ہلکی سی نمی تیرنے لگی پھر وہ وہاں سے اُٹھ گیا۔

"کہاں چل دیے؟" سلطان شاہ نے حیرت سے پوچھا۔ "تھوڑی دیر تک ہمارا ساتھ نہیں دو گے؟"

"میرا دل مجھے ملامت کررہا ہے کہ میں نے پہلے ہی دن اپنے سردار کی ہدایت بھلا دی۔" اس کی آواز دل گرفتہ ہو چلی تھی۔ "میں باہر جا کر دوسرے کام دیکھوں گا۔ اگر صندل خان اس قابل ہوا تو میں تمہاری دیکھ بھال کے لیے اسے یہاں بھیج دیتا ہوں۔ تمہیں اُس سے ڈرنے یا شرمندہ ہونے کی کوئی ضرورت نہیں۔"

"ہوسکے تو جانے سے پہلے اسی کمرے میں چوتھے بستر کا بندوبست بھی کراتے جاؤ تاکہ ہم سب یکجا رہ سکیں۔ رات بھر کی تھکان کے بعد اب ہم تھوڑی دیر سونا چاہیں گے۔" سلطان شاہ نے کہا اور وہ اثبات میں سرہلاتا ہوا' ہمارے کمرے سے نکلتا چلا گیا۔

"اس وقت تم نے اس کی دُکھتی رگ پر ہاتھ ڈال دیا۔" اس کے چلے جانے کے بعد غزالہ بولی۔ "ویسے مجھے بھی تمہاری اور صبغت اللہ کی گفتگو سن کر بہت حیرت ہوئی تھی۔ وہ کس ماضی کا ذکر کررہا تھا؟"

"صبغت اللہ نے اپنے تایا زاد بھائی کو ایک جگہ نوکر رکھوایا تھا۔" میں نے مافیا کے ہیڈ کوارٹرز' ٹریڈ لائن کا نام لیے بغیر رازدارانہ لہجے میں کہا۔ "میں نے اسے بس ایک دفعہ ہی دیکھا تھا لیکن آج دوبارہ دیکھتے ہی اسے پہچان لیا۔"

"ایک جگہ کیوں کہہ رہے ہو؟" ویرا جھنجلائی ہوئی آواز میں بولی۔ "کھل کر ٹریڈ لائن کا نام کیوں نہیں لیتے؟ اب تو یہ بات کھل ہی چکی ہے کہ تم نے اُن کے ساتھ مل کر انہیں مروایا تھا۔"

"اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا کہ وہ کون سی جگہ تھی۔" میں نے ڈھٹائی سے کام لیتے ہوئے کہا۔ "تمہاری تسلی کے لیے' ہم اس ادارے کو ٹریڈ لائن کہہ لیتے ہیں۔ صبغت اللہ کے کزن کو اپنے نامعلوم دشمنوں کا خوف تھا اور اسے کراچی میں کوئی ایسی کمین گاہ درکار تھی جہاں وہ لوگ نہ پہنچ سکیں۔ مافیا مشکوک ماضی رکھنے والے لوگوں کو ہمیشہ خوش آمدید کہتی رہی تھی' اس لیے اسے چوکیدار رکھ لیا گیا۔ وہ اپنی ڈیوٹی ختم کرنے کے بعد بھی وہیں رہتا تھا۔"

"یہ بہت معمولی سی بات تھی۔ اس کے لیے صبغت اللہ کو رازداری کی ضرورت کیوں محسوس ہوئی؟" اس بار ویرا نے سوال کیا تھا۔ "تمہاری نگاہوں میں اپنے لیے شناسائی کی جھلک دیکھتے ہی صبغت اللہ نے غیر معمولی ردِعمل کا مظاہرہ کیا تھا۔ شاید اسے امید نہیں تھی کہ تم اسے پہچان لوگے۔"

"ماضی کے حوالے سے میرے اور اس کے درمیان وہی ایک مشترکہ معاملہ تھا۔ صبغت اللہ کے ذہن میں کوئی دوسری بات رہی ہو تو میں اس سے ناواقف ہوں۔" میں نے نئے پیکٹ سے ایک سگریٹ منتخب کرتے ہوئے کہا۔

"یہ اِدھر پیچھے کیا ہے؟" غزالہ اس کمرے کے عقبی دروازے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے اٹھ کھڑی ہوئی۔ بقیہ لوگوں نے بھی اس کا ساتھ دیا کیونکہ ہر ایک ہی اپنی نئی قیام گاہ کا تفصیلی جائزہ لینے میں دلچسپی رکھتا تھا۔ اس کام کے لیے وہ وقت بہت موزوں تھا۔

اُس کمرے کا پچھلا دروازہ ایک چھپر سے ڈھکے ہوئے برآمدے میں کھلتا تھا۔ اس سے آگے کھلا صحن تھا جو پتھروں کی دیوار سے گھرا ہوا تھا۔ اُس برآمدے میں' اِس سمت کی تینوں خوابگاہوں کے دروازے کھلتے تھے۔ آگے جا کر وہ برآمدہ صحن کے اس حصے میں ختم ہوجاتا تھا جہاں غسل خانے وغیرہ بنے ہوئے تھے۔ وہ بندوبست بہت اچھا تھا۔ کمروں میں رہنے والے لوگ وسطی ہال میں داخل ہوئے بغیر' عقبی دروازوں سے کہیں بھی آجاسکتے تھے۔ ہم لوگ واپسی میں وسطی ہال سے گزر کر اپنے کمرے میں پہنچے تو دو تنومند شگاری وہاں چوتھا بستر جما رہے تھے۔

ان لوگوں کے فارغ ہونے تک ہم چاروں ڈرائی فروٹ کھاتے رہے۔ مجھے اور ویرا کو واڈکا کے ساتھ لذیذ بادام اور نمکین پستے بہت لطف دے رہے تھے۔ کیونکہ ہمارے معدوں نے فریاد کرنی شروع کردی تھی۔

قندوز خان ہمیں نہ بھی بتاتا تو یہ بہت سامنے کی بات تھی کہ پورے گالان کے ساتھ' اس حویلی میں بھی رات بھر کشیدگی کی فضا طاری رہی تھی اور سورج طلوع ہونے کے ساتھ ہی خوں ریزی کی ابتدا ہوگئی تھی۔ گھنٹوں طویل لڑائی کا اختتام اس وقت ہوا جب پائندہ گل موت کے گھاٹ اتار دیا گیا لیکن جنگ ختم ہونے کے ساتھ ہی مُردوں کی تدفین اور زخمی ہونے والوں کی دیکھ بھال کا مسئلہ چل پڑا تھا۔ لڑنے والوں کا تعلق ایک ہی قبیلے سے تھا اور شاید ان میں آپس کی رشتے داریاں بھی تھیں۔ اس لیے جیتنے والوں کے لیے یہ ممکن نہیں تھا کہ وہ ان لاشوں اور زخمیوں کو بھول بھال کر اپنی فتح یابی کا جشن منانا شروع کردیں۔ جب تک وہ دونوں طرف کے مُردوں کو ٹھکانے نہ لگا لیتے' کھانے پینے کی باقاعدہ تیاریوں کا امکان ہی نہیں تھا۔ میرا اندازہ تھا کہ آدھی رات سے پہلے کھانا ملنے کے کوئی آثار نہیں تھے۔ بہتر یہی تھا کہ ہم لوگ اس دوران میں اپنی نیند پوری کرلیتے۔ ویرا تیسرا گلاس خالی کرکے' عقبی دروازے کی طرف چلی تو ہم تینوں نے الگ الگ بستر سنبھال لیے جو بہت نرم اور آرام دہ تھے۔

ویرا خاصی دیر بعد آئی تو بالکل تازہ دم تھی۔ اس کی زبانی پتا چلا کہ غسل خانوں میں تازہ پانی سے بھرے ہوئے ڈرم موجود تھے اور غسل خانوں کی تعداد بھی خوابگاہوں کے برابر تھی۔ وہ خوش خبری ایسی تھی کہ ہم تینوں ہی بستر چھوڑنے پر مجبور ہوگئے۔

اِس بار ہمیں واقعی مہمان سمجھا جارہا تھا کیونکہ پچھلے برآمدے میں چوکھٹ کے ساتھ چپلوں کے چار جوڑے بھی رکھے ہوئے تھے۔ ان میں سے ایک جوڑا گیلا تھا جو شاید ویرا نے استعمال کیا تھا۔

میل اور مٹی میں اٹے ہوئے پیروں میں چپلیں ڈالنے کے بعد ہمیں بہت خوشی ہوئی کیونکہ اب ہم گالان کی کرکراہٹ سے محفوظ رہ سکتے تھے۔ ہم تینوں باجماعت اس سمت میں چل پڑے جدھر غسل خانے وغیرہ واقع تھے۔



گہری نیند سے میری آنکھ کھلی تو کمرے کی فضا میں حیوانی چربی جلنے کی تیز بو پھیلی ہوئی تھی۔ میں نے کسل مندی کے عالم میں دیوار گیر مشعل کی طرف سر گھمایا تو ویرا اپنے تخت پر ایک شگاری کے ساتھ براجمان نظر آئی اور فوراً ہی میرے ذہن پر چھایا ہوا خمار کافور ہوگیا۔

اس شگاری کی پشت میری طرف تھی اس لیے میں اسے نہیں پہچان سکا لیکن ہاڑ اور لباس سے وہ واضح طور پر کوئی شگاری ہی نظر آرہا تھا۔

"کس سے باتیں ہو رہی ہیں؟" میں نے تخت سے اٹھ کر اونچی آواز میں سوال کیا تو وہ دونوں ہی چونک کر میری طرف متوجہ ہوگئے۔ اس وقت میں نے اسے فوراً پہچان لیا۔ وہ صندل خان تھا۔

اس کا چہرہ زخمی تھا۔ بائیں کلائی پر بھی پٹی بندھی ہوئی نظر آرہی تھی۔ اس نے پھیکی مسکراہٹ کے ساتھ شکست خوردہ لہجے میں کہا۔ "مجھے تم لوگوں کی خدمت اور دیکھ بھال پر مامور کیا گیا ہے۔"

"اور تم ہمیں ایک بار پھر الٹا لٹکا دو گے!" میں نے اپنے بستر سے اترتے ہوئے خوش دلی سے کہا۔

"رات گئی بات گئی۔ اب اسے بھول جاؤ۔ میں پوری طرح سردار صبغت اللہ کا وفادار ہوں۔ پورے گالان نے اُس کے ہاتھ پر بیعت کرلی ہے اور تم اس کے خاص مہمان قرار دیے جاچکے ہو۔" اس نے کہا۔

"میں مذاق کررہا تھا۔" میں نے اس کے قریب پہنچ کر' اس کے زخموں کا جائزہ لیتے ہوئے کہا۔ "ہمیں تم سے کوئی شکوہ نہیں ہے۔ یہ بتاؤ کہ تمہارے زخم کیسے ہیں؟ کلائی کی ہڈی تو سلامت ہے نا؟"

"دوچار دن میں سب ٹھیک ہوجائے گا۔ ہم لوگوں کے زخم حیرتناک سرعت کے ساتھ بھرتے ہیں۔ یہ اچھا کیا کہ تم لوگوں نے نیند بھرلی۔ میں تو کل رات سے پلکیں بھی نہیں جھپکا سکا ہوں۔"

"شاید دن ڈھلے کافی دیر ہوچکی ہے۔" میں نے عقبی کھڑکی سے باہر پھیلی ہوئی تاریکی کا جائزہ لیتے ہوئے کہا۔ "اس وقت باہر کیا ہو رہا ہے؟ لوگوں کے کیا حال چال ہیں؟"

"سب ٹھیک ٹھاک ہے۔ ہم لوگوں میں سب سے بڑی خوبی یا خرابی یہ ہے کہ ہم جس بات کو درست سمجھتے ہیں' اس کے حق میں پوری قوت سے لڑتے ہیں اور اگر ہار جاتے ہیں تو پوری خندہ پیشانی سے اپنی شکست تسلیم کرکے' خود کو فاتح حریف کے حوالے کر دیتے ہیں۔ ستاسی شگاریوں کی تدفین کے بعد چولہے جلالیے گئے ہیں' تنور روشن ہونے والے ہیں۔ اب جلد ہی سب کی شکم پری کا سلسلہ شروع ہوجائے گا۔"

"جیتنے والے جشن بھی منائیں گے؟" میں نے رازدارانہ سرگوشی میں سوال کیا۔

لمحہ بھر کے لیے اس نے گہری نظروں سے مجھے گھورا پھر بولا۔ "نہیں' آپس کی لڑائیوں میں مرنے اور مارنے' جیتنے اور ہارنے والے ایک دوسرے سے اتنے قریب ہوتے ہیں کہ فتح بھی سوگوار ہو کر رہ جاتی ہے۔ ستاسی لاشوں میں یہ شناخت کرنا مشکل ہے کہ کون کس کے ساتھ تھا۔ ستاسی شگاریوں کے خون کا نذرانہ دے کر بادرانی اقتدار میں آگئے ہیں۔ اللہ اُن کا اقتدار مستحکم کرے اور ہماری زمین کو جلد ہی ایسی کسی اور خوں ریزی کا سامنا نہ کرنا پڑے!"

ستاسی انسانوں کی موت کے ذکر پر میرا دل بھاری ہوگیا۔ وہ جنگ جس پیمانے پر لڑی گئی تھی' اس کے لحاظ سے وہ بہت بھاری جانی نقصان تھا۔ جنگ کے بعد شگاریوں کے ردِعمل کے بارے میں وہ جو کچھ کہہ رہا تھا' اس سے قندوز خان کی باتوں کی تائید ہوتی تھی مگر وہ باتیں میری سمجھ سے بالاتر تھیں۔ ابھی کسی کے خون کا پیاسا ہونا اور اگلے ہی لمحے میں اس کا مطیع و فرماں بردار بن جانا انسانی فطرت کے خلاف تھا۔ انسان کا رویہ مشینی کبھی بھی نہیں ہوسکتا۔ یہ ممکن ہی نہیں ہے کہ ایک بٹن دبا کر انسان کو کسی سے نفرت پر ابھارا جائے اور دوسرا بٹن دبا کر اسے' اسی فرد یا شے سے محبت کرنے پر مجبور کردیا جائے۔ بظاہر یوں معلوم ہوتا تھا کہ شگاریوں نے اپنی لڑاکا نسل معدوم ہوجانے کے خوف سے وہ معاشرتی سمجھوتا کرلیا تھا اور زبان سے بھی اسی کا اظہار و اقرار کرتے رہتے تھے ورنہ ان کے دلوں کا حال اندر ہی اندر پکنے والے آتش فشانوں سے مختلف نہیں ہوسکتا تھا۔

"تمہاری سوچ بہت اچھی اور دعا بہت معصومانہ ہے۔ تم لوگوں کے بارے میں میں یقین سے کچھ نہیں کہہ سکتا لیکن شہروں میں لوگ بہت کینہ پرور ہوتے ہیں۔ ایک بار کسی خرابی کی بنیاد پڑجائے تو برسوں جھگڑے چلتے رہتے ہیں۔ لوگ دلوں میں کدورت چھپائے' اپنے حریفوں کی گھات میں لگے رہتے ہیں۔" میں نے بے پروائی سے کہا۔

"ہم لوگ بھی عام انسانوں سے مختلف نہیں ہیں۔" اس کے لہجے میں ہلکی سی تلخی در آئی۔ "عبدالرحیم خان مارا گیا تو پائندہ گل آخری سانس تک اس کے انتقام کو نہیں بھول سکا تھا لیکن بعض معاملات میں بہتیرے سمجھوتے کرنے پڑتے ہیں' اپنی انا اور خود پرستی کو خاک میں ملانا پڑتا ہے۔ یہ جنگ بھی ایسے ہی معاملات میں شامل تھی۔ چالیس برس پہلے' ہمارے بڑوں نے شگارا ولی کو ہمیشہ آباد رکھنے کے لیے جو فیصلے کیے تھے' ہم آج بھی اُن پر عمل

کرتے ہیں۔ شاید تمہیں یہ معلوم نہ ہو کہ سورج ڈھلنے تک اگر کسی ایک فریق کا بڑا نہ مارا جاتا تو یہ لڑائی برابری پر تھم جاتی۔ ہماری آپس کی جنگیں ایک سورج کی روشنی میں لڑی جاتی ہیں۔ سورج غروب ہوتے ہی فائرنگ بند ہوجاتی ہے اور جرگہ بیٹھ جاتا ہے۔ لڑائی اگلے دن جاری نہیں رہتی بلکہ دونوں فریق حکمرانی میں حصے دار بن جاتے ہیں۔"

جو مثال میں نہیں دینی چاہ رہا تھا' وہ اس نے خود دہرادی تھی۔ اس کی وہ گفتگو دلچسپ ہونے کے ساتھ ہی اس کے دلی جذبات کی بھرپور غمازی کررہی تھی۔ میں نے بات آگے بڑھانے کے لیے حیرت سے کہا۔ "ایک دن کی لڑائی کا تصور بہت عجیب ہے۔ کیا یہ بھی تمہارے بزرگوں کا فیصلہ تھا؟"

"ہاں!" اس نے پُر خیال انداز میں فضا میں کسی نقطے کو گھورتے ہوئے کہا۔ "چالیس برس پہلے اس وادی پر پیرکوٹ والے حکمراں تھے۔ مرحوم پائندہ گل کے باپ نے پیرکوٹیوں کے خلاف ہتھیار اٹھائے تو گیارہ روز تک پوری شنگارادیلی خون اور بارودی شعلوں میں نہاتی رہی۔ ساڑھے تین سو جوان مارے گئے تو دونوں طرف کے بڑے بلبلا اٹھے۔ انہیں صاف نظر آرہا تھا کہ شنگاری آپس ہی میں ٹکرا کر فنا ہوجائیں گے۔ انہوں نے عورتوں کی سفید چادریں لہرالہرا کے دونوں حریفوں کو خوں ریزی سے روکنا چاہا لیکن سب کے سروں پر خون سوار تھا۔ گیارہویں شام سردار شہباز پیرکوٹی مارا گیا تو ہماری تاریخ کی وہ بدترین جنگ بند ہوئی۔ اس لڑائی نے پوری وادی کو لہولہان اور نڈھال کردیا تھا۔ اس بربادی کے بعد سارے قبیلوں کے بزرگ نئے سردار' خستہ گل کے پاس آئے' جرگہ بھی بیٹھ گیا اور تین دن بعد وہ فیصلے کیے گئے جو آج بھی یہاں رائج ہیں۔ وہ تباہی اس قدر بھیانک تھی کہ خستہ گل کی موت پر یہاں کسی شورش نے سر نہیں اٹھایا اور اس کا بڑا بیٹا' پائندہ گل یہاں کا سردار بن گیا۔ چالیس برس بعد' آج سرداری کے لیے پہلی لڑائی ہوئی ہے اور خوشی کی بات ہے کہ شنگاریوں کو اپنے بزرگوں کے کیے ہوئے فیصلے یاد ہیں۔ ہماری یہ عہد پرستی اپنا رنگ ضرور دکھائے گی اور سردار صبغت اللہ انصاف سے سرداری کرے گا۔"

"بادرانیوں کے بعد میں تمہاری زبان سے پیرکوٹیوں کا ذکر سن رہا ہوں۔ اس وادی میں کتنے قبیلے آباد ہیں؟"

"شنگارادیلی میں چھوٹے اور بڑے بائیس قبیلے آباد ہیں لیکن سب مل جل کر رہتے ہیں اور ایک دوسرے کی رسوم و روایات کا پورا پورا احترام کرتے ہیں۔" اس نے لمحہ بھر سوچنے کے بعد جواب دیا۔

"اور گالان میں کون سا قبیلہ رہتا ہے؟" میں نے اگلا سوال کیا۔

"گالان اس وادی کا پایہ تخت ہے۔ یہاں شنگارادیلی کا سردار اور اس کا خاندان وغیرہ رہتا ہے۔ آج کی جنگ ہارنے کے بعد' مرحوم پائندہ گل کے خاندان اور قبیلے والے یہاں سے اپنی پرانی بستی کی طرف کوچ کرجائیں گے جہاں سے وہ چالیس برس پہلے آئے تھے اور گالان کی بستی کو بادران والے آباد کریں گے۔"

"تو تم بھی ان ہی کے ساتھ چلے جاؤ گے؟" میں نے جھجکتا ہوا سا سوال کیا۔

"نہیں' میں پرانے سردار کا لشکری تھا' جب تک نیا سردار مجھے فارغ نہ کرے' میں گالان سے نہیں جاسکتا۔" اس کی آواز پُرخیال اور ذومعنی ہوگئی اور وہ آہستگی سے بولا۔ "کاش! سردار صبغت اللہ مجھے فارغ ہی کردے۔"

"کیوں؟ کیا تم نئے سردار سے خوش نہیں ہو؟" میں نے اس کے قریب سرک کے سرگوشی میں پوچھا۔

"یہ خوشی اور ناخوشی کی بات نہیں ہے۔ مجھے میرے بڑوں کے فیصلے نے باندھا ہوا ہے لیکن میں ایک عام انسان ہوں۔ میں نے ساری عمر مرحوم پائندہ گل کی خدمت اور اطاعت کی' اس کا نمک کھاتا رہا۔ وہ میرا محسن اور مربی تھا۔ میں جب تک یہاں رہوں گا' گالان کا ہر سنگ ریزہ مجھے اس کی یاد دلاتا اور خون کے آنسو رلاتا رہے گا۔ میرے لیے یہاں سے چلا جانا ہی میرے حق میں بہتر ہوگا۔" وہ نیچی آواز میں بولتے بولتے یک بیک بہت زیادہ جذباتی ہوگیا اور رقت سے اس کی آواز رندھنے لگی۔ اس کی کیفیت دیکھ کر میرے ہاتھ پاؤں پھول گئے۔

"خود پر قابو رکھو' صندل خان!" میں نے اسے دلاسا دیتے ہوئے کہا۔ "روزنوں میں سے کسی نے تمہیں مرحوم کے لیے روتے دیکھ لیا تو تمہارے ساتھ ہم بھی صبغت اللہ کے عتاب میں آجائیں گے۔"

اس نے جلدی سے اپنے دامن سے اپنی آنکھوں میں آئی ہوئی نمی خشک کرلی اور دل گرفتہ آواز میں بولا۔ "ڈرو نہیں' یہاں ٹھہرائے جانے والوں کی نگرانی نہیں ہوتی۔ دیکھے یا سن لیے جانے کا شبہ بھی ہوتا تو میں ہرگز اپنے دل کی بات زبان پر نہ لاتا لیکن اب ڈر رہا ہوں کہ کہیں تم صبغت اللہ یا قندوز خان سے میری مخبری نہ کردو۔"

"تم بالکل فکر نہ کرو۔ یہ بات آگے نہیں جائے گی۔ ہم بھی اِن حالات سے بہت پریشان ہیں۔" اُس کے دل میں نئے سردار کے خلاف بغض و عناد کے جذبات پرورش پارہے تھے اس لیے میں نے اسے اپنے ہاتھ میں رکھنا ضروری سمجھتے ہوئے کہا۔ مجھے خوشی تھی کہ میری چھیڑ چھاڑ نے اسے پھٹ پڑنے پر مجبور کردیا تھا۔

"میں تم پر کیسے اعتماد کرلوں؟" اس نے میری آنکھوں میں جھانکتے ہوئے سوال کیا۔ "تم نے کھانے کے بعد بڑی قاب شاید صبغت اللہ بادرانی ہی کو کوئی پیغام پہنچانے کے لیے اوندھی کی تھی۔"

"اب تو سارا کھیل تمہارے سامنے آگیا ہے۔ گھنٹیوں والے نہ جانے کب سے پائندہ گل کے خلاف تیاریاں کررہے تھے۔ اس اندرونی بغاوت میں ہمارا کیا کردار ہوسکتا تھا؟ ہم بادرانیوں کے کس کام آسکتے تھے؟"

"کچھ نہ کچھ ضرور تھا۔" وہ بے اعتباری سے بولا۔ "ورنہ یہ کیسے ممکن تھا کہ وہ مردے دفنانے سے پہلے تم کو ویران باڑے سے نکال کر اس مہمان خانے میں پہنچادیتے؟ میں تمہیں ایک بات اور بتادوں کہ سردار پائندہ گل گوشہ نشین نہ ہوتا تو آج کی لڑائی کا نقشہ ہی کچھ اور ہوتا۔ وہ آخر میں اپنے کمرے سے نکلا تھا اور صبغت اللہ نے اس پر اپنا پورا میگزین خالی کرکے جنگ جیت لی۔ وہ صبغت اللہ کو اپنے مقابل دیکھ کر بھونچکا رہ گیا تھا۔"

"ہم پر یہ مہربانی قندوز خان نے کی ہے۔" ویرا اچانک ہی بولنے لگی اور میں سمجھ گیا کہ اسے صندل خان کے ذہن کی دھند صاف کرنے کے لیے کوئی مضبوط نکتہ سوجھ گیا ہے۔ وہ کہہ رہی تھی۔ "اس نے الٹی قاب پر تمہاری برہمی اور ہماری درگت بھی دیکھی تھی۔ اسے قلق تھا کہ ہم لوگ اپنی ایک اتفاقی حماقت کی وجہ سے بادرانیوں کے حامی سمجھ لیے گئے ہیں۔ پچھلی رات کو جب گھنٹیوں کا شور تیز ہوا تو سارے محافظ ویران باڑے سے چلے گئے تھے اور ہم دونوں عورتوں نے اپنے ساتھیوں کے پیر کھول کر انہیں اُس عقوبت سے نجات دلادی تھی۔ پھر ہم نے چند ہتھیار تلاش کرلیے اور وہیں اندھیرے میں دبک کر اپنے انجام کا انتظار کرنے لگے۔ باڑے پر ایک راکٹ گرا تو ہمیں راہ داری میں گھسنا پڑا۔ ہمیں کچھ پتا نہیں تھا کہ حویلی میں کیا ہورہا ہے۔ کچھ لوگ رائفلیں تانے ہماری طرف آئے تو ہم نے اپنی جانوں کے خوف سے اُن پر فائر کھول دیا۔ ہم کو مطلق علم نہیں تھا کہ وہ کس کے حامی تھے۔ بعد میں قندوز خان نے بتایا کہ ہمارے ہاتھوں مرنے اور زخمی ہونے والے پائندہ گل کے حامی تھے جو باڑے میں گھس کر باہر فرار ہونا چاہ رہے تھے۔ اللہ ہمیں معاف کرے' ہم سے وہ سب بے خبری میں ہوا لیکن قندوز خان اس بات سے بہت خوش ہوا کہ ہم نے صبغت اللہ کی حمایت میں ہتھیار اٹھائے تھے۔ ان دو باتوں کی وجہ سے ہم اس مہمان خانے میں نظر آرہے ہیں۔" اس دوران میں غزالہ' پھر سلطان شاہ بھی بیدار ہوچکا تھا۔

صندل خان اس کا ایک ایک لفظ بہت غور سے سن رہا تھا۔ اس کے خاموش ہونے پر اداسی سے بولا۔ "میں تم کو اسی لیے پسند کرتا ہوں کہ تم بہت معصوم اور بھولی بھالی ہو۔ سادگی سے ہر بات سچ سچ بتادیتی ہو۔ تم نہ بتاتیں تو دو چار دن میں مجھے پتا چل جاتا کہ وہ راستہ کس نے روکا ہوا تھا۔ شاید تمہیں اندازہ نہیں کہ حویلی کا سب سے اہم مورچا تم ہی نے سنبھالا ہوا تھا۔ اس باڑے کے ایک خفیہ تہ خانے میں آگ لگانے والے بموں کی پیٹیاں چھپی ہوئی تھیں۔ وہ بم ہمارے ہاتھ آجاتے تو بادرانیوں کے جسموں میں آگ لگ جاتی اور وہ بری طرح پسپا ہوجاتے لیکن افسوس کہ تم نے اپنی حفاظت کے خوف سے کسی کو اُدھر نہیں جانے دیا اور ہم ہار گئے۔"

"تم بھول رہے ہو تمہاری ہار باہر نہیں ہوئی۔" میں نے کہا۔ "اندر پائندہ گل کے مارے جانے کے بعد تم نے ہتھیار ڈالے ہیں۔ صبغت اللہ اسی گھات میں تھا۔ اس واقعے کو کسی بھی طرح نہیں ٹالا جاسکتا تھا۔"

"یہ بات تمہاری سمجھ میں نہیں آئے گی۔" اس کی مایوسی اور گہری ہوگئی۔ "سردار پائندہ گل اپنے کمرے میں محصور تھا۔ وہ باہر اپنے لشکریوں کے پیر اکھڑنے کی خبر سننے کے بعد' ان کو حوصلہ دینے کے لیے باہر آیا تھا اور مارا گیا۔ اگر وہ بم ہمارے ہاتھ لگ گئے ہوتے تو باہر ہمارا پلہ بھاری رہتا اور سردار پائندہ گل کو باہر آنے کی ضرورت پیش نہ آتی۔ پٹتے ہوئے بادرانیوں کا حوصلہ بڑھانے کے لیے صبغت اللہ کو سامنے آنا پڑتا اور ہمارے حامی' باغیوں میں اس کی حیثیت پہچانتے ہی اسے مار گراتے۔ اس جنگ کا نقشہ تم لوگوں نے اپنی بے وقوفی سے پلٹا ہے۔ خیر' جو ہوگیا' سو ہوگیا۔ اب اسے لوٹانا ناممکن ہے۔ کاش! صبغت اللہ تمہارے اس احسان کا بدلہ دے سکے۔"

اس کے انکشاف سے میری کھوپڑی سن ہوکر رہ گئی۔ شاید ان لوگوں کے ذہن میں جنگی اسکیم کا خاکہ پہلے سے تیار تھا اور قندوز خان نے صبغت اللہ سے ملنے والی ہدایات کے عین مطابق' الٹی قاب دیکھتے ہی صندل خان کو فوری کارروائی سے روک کر ہمیں متروک باڑے میں لے جانے کا مشورہ دیا اور صندل خان نے سردار پائندہ گل کی تائید حاصل کرتے ہی ہمیں اس ویران احاطے میں بھجوادیا۔ اس کے وہم و گمان میں بھی نہیں رہا ہوگا کہ سردار پائندہ گل اور اس کے وفاداروں پر وہ رات بھاری گزرنے والی ہے۔ پھر جب گھنٹیوں کا شور تیز ہوا تو ہماری نگرانی پر مامور شنگاری حویلی میں بلوالیے گئے۔ اس سنہرے موقعے سے فائدہ اٹھا کر قندوز خان نے ہتھیاروں کا وزنی تھیلا ہمارے حوالے کرکے' وہ محاذ ہمیں سونپ دیا۔ شاید حویلی کے اندر ان کے پاس قابل اعتماد نفری کی کمی تھی جب کہ ہم بڑی قاب کو الٹ کر' انہیں اپنی پوری حمایت کا یقین دلا چکے تھے۔ صبغت اللہ نے بہت چالاکی کے ساتھ ہمیں سردار پائندہ گل کے خلاف استعمال کرڈالا تھا۔ اگر صندل خان ہم سے نہ کھلتا تو ہمارے فرشتوں کو بھی علم نہ ہو پاتا کہ ہم نے گھنٹیوں والوں کے لیے کیسا عظیم کارنامہ انجام دیا تھا۔

"صبغت اللہ کے تیور اچھے نہیں ہیں۔" میں نے اس سے چند گھنٹے پہلے ہونے والی ملاقات کو یاد کرتے ہوئے' رازدارانہ سرگوشی میں کہا۔ "اگر اس نے فوری طور پر ہمیں یہاں سے روانہ ہونے کی اجازت نہیں دی تو ہم کچھ اور سوچنے پر مجبور ہوجائیں گے۔ ہم غیر معینہ مدت تک اِس مہمان خانے میں قید نہیں رہ سکتے۔"

"یہ بڑی سفاک سرزمین ہے۔ یہاں تم کچھ نہیں کرسکو گے۔ اگر تم شہر میں میرے اخراجات اٹھانے کی ذمّے داری قبول کرو تو پھر سوچنے کا کام مجھ پر چھوڑ دو۔ یہ لوگ تمہیں' تمہاری مرضی کے خلاف یہاں نہیں روک سکیں گے۔"

میرا دل اچھل کر حلق میں آگیا۔ پتھر میں جونک لگ رہی تھی میرے سان و گمان میں بھی نہیں تھا کہ پہاڑوں سے گھری ہوئی اس بے رحم وادی میں کوئی شنگاری ہمارا دوست اور ہمدرد بن جائے گا۔

"اخراجات ہی نہیں' ہم تمہیں مالا مال کردیں گے۔" میں نے دبے جوش کے ساتھ کہا۔

"پھر یہ بات طے ہے۔" اس نے اپنا داہنا ہاتھ میرے ہاتھ میں دے دیا۔ صندل خان کی سخت' کھردری اور چوڑی ہتھیلی میں میرے ہاتھ کی ہڈیاں چیخ اٹھیں۔ میری انگلیوں کا دباؤ اس کا کچھ نہیں بگاڑ سکا تھا۔

"ایک بات بتاؤ!" اس سے مفاہمت ہوجانے کے بعد اچانک ہی غزالہ اسے مخاطب کر بیٹھی اور وہ پوری طرح غزالہ کی طرف متوجہ ہوگیا۔ وہ قدرے توقف کے بعد بولی۔ "میں نے سنا ہے کہ شنگارا کے بزرگ اس علاقے میں بجلی کی فراہمی کے کٹر مخالف ہیں۔ پھر یہاں ہیروئن کیسے بنتی ہوگی؟ اس کی تیاری کے لیے کچھ برقی آلات تو ناگزیر ہوتے ہیں۔"

"پہلے اس کام کے لیے کم آواز والے جاپانی جنریٹر استعمال کیے جاتے تھے۔ جن غاروں میں ہیروئن بنائی جاتی تھی وہاں عام لوگوں کا داخلہ یا گزر منع تھا۔" وہ بتانے لگا۔ "اب بگڑتے ہوئے حالات کی وجہ سے ہیروئن سازی کا کام ایسے بند فوجی ٹرکوں میں منتقل کردیا گیا ہے جو زخمیوں کو لے جانے کے لیے استعمال ہوتے ہیں۔ فولادی کیبن والے دو روسی ٹرکوں کے انجن جنریٹر بھی چلاتے ہیں۔ ان ٹرکوں پر مٹیالا رنگ پھیر کر' انہیں شنگاراویلی کی حدود سے باہر' پہاڑوں میں چھپا دیا گیا ہے۔ ان کی حفاظت کے لیے چار جیپوں میں مسلح محافظ رہتے ہیں اور دی محافظ انجنوں کے لیے نیچے سے ڈیزل لاتے ہیں۔ کھیپ تیار ہوتے ہی گالان پہنچادی جاتی تھی اور پھر سردار پائندہ گل اسے آگے بڑھادیتا تھا۔"

"یعنی وہ لوگ مستقل طور پر وادی سے باہر پہاڑوں میں رہتے ہیں؟" غزالہ نے حیرت سے پوچھا۔

"ہاں' خطرات بڑھ جانے کی وجہ سے ایسا بندوبست ضروری ہوگیا تھا۔" وہ بولا۔

"خطرات؟" سلطان شاہ نے حیرت سے دہرایا۔ "ان آزاد علاقوں میں کیسے خطرات ہوسکتے ہیں؟"

"پہلے ہیروئن سازی کے لیے ہماری حوصلہ افزائی کی گئی تھی۔" اس نے تلخی سے کہا۔ "باہر سے آنے والے ماہروں نے ہمارے لڑکوں کو افیم سے ہیروئن بنانے کے طریقے سکھائے مگر اب یہ نشہ ان کے ملکوں میں مقبول ہوگیا ہے تو وہ چاہتے ہیں کہ ہم اس نفع بخش کام کو ختم کردیں لیکن وہ بھول گئے ہیں کہ وقت کا پہیہ الٹا نہیں چلایا جاسکتا۔ انہیں معلوم ہے کہ شنگاراویلی میں افیم کاشت ہوتی ہے اور اس سے ہیروئن بنتی ہے۔ ان کے جہاز ہماری لیبارٹریوں کا پتا چلانے کے لیے وادی پر نیچی پروازیں کرتے ہیں۔ سنا ہے کہ انہوں نے پاکستان میں افیم اور ہیروئن پر قابو پانے کے لیے جبری کام بھی کروائے ہیں۔ ہم ڈرتے ہیں کہ کہیں وہ جہازوں سے اپنی مسلح چھاتہ فوج ان پہاڑوں میں نہ اتار دیں۔ اس خوف سے ہم نے ہیروئن بنانے کا کام وادی سے باہر منتقل کردیا ہے۔"

وہ قندوز خان کی سنائی ہوئی ادھوری کہانی کا بقیہ حصہ تھا۔ وہ لوگ بیرونی دنیا سے بالکل کٹ کر اپنے حال میں مست رہنے کے لیے کوشاں تھے لیکن پھر بھی وہ بیرونی دباؤ سے آزاد نہیں تھے۔ انہیں غیر ملکیوں کی طاقت اور حربی برتری نے خوف میں مبتلا کیا ہوا تھا۔ صندل خان جن خدشات کا اظہار کررہا تھا وہ بے بنیاد نہیں تھے۔ جو لوگ ہیروئن کے خلاف عالمی مہم کی سربراہی کررہے تھے' ان کے ہاتھ بہت لمبے تھے۔ وہ کسی خوف کے بغیر' شنگاراویلی میں بڑے پیمانے کی فوجی کارروائی کرسکتے تھے مگر اطمینان کی بات یہ تھی کہ اس وقت تک وہ لوگ عملاً افغانستان یا اس کے قرب و جوار میں موجود نہیں تھے جب کہ شنگاراویلی پر دھاوا بولنے کے لیے انہیں آس پاس کے علاقے میں کسی اڈے یا ٹھکانے کی شدید ضرورت تھی۔ اس کے بغیر وہ اس پہاڑی وادی کے لیے کوئی حقیقی خطرہ پیدا نہیں کرسکتے تھے۔

سلطان شاہ شاید ان امکانات سے بے خبر تھا اس لیے وہ صندل خان سے پوچھ رہا تھا۔ "اگر وہ لوگ ایسی مخالفت پر کمربستہ ہیں تو وہ تمہارے ایمبولنس ٹرکوں کا بھی سراغ لگالیں گے۔"

"انہیں نشانہ بنانا اتنا آسان نہیں ہوگا۔ اجنبیوں کے لیے ان پہاڑوں میں قدم قدم پر موت اپنا جال پھیلائے بیٹھی رہتی ہے۔ نئے لوگوں کو یہاں پھونک پھونک کر پیش قدمی کرنی پڑے گی جب کہ ہماری وہ گاڑیاں بہت تیزی کے ساتھ اپنی جگہ بدل سکتی ہیں۔ وہ اس راستے سے بہت دور اور الگ تھلگ ہیں' جو چیغا سرائے سے یہاں تک کے سفر میں تم نے دیکھا ہوگا۔ ان پر کوئی کڑا وقت آہی گیا تو محافظوں کے پاس' دشمن کو مار بھگانے کے لیے اسٹنگر میزائل ہیں جو کندھے پر رکھنے والے لانچروں سے فائر کیے جاتے ہیں۔"

اس کے دل و دماغ پر ویرا نے ایسا سحر طاری کیا ہوا تھا کہ وہ ویرا کو راست گو' معصوم اور بھولی بھالی قرار دے چکا تھا۔ ویرا نے اس پر اپنی گرفت مضبوط رکھنے کے لیے' اس کے ساتھ الذہن کے ساتھ باتیں کرنی شروع کردیں۔ کراچی سے اپنے اغوا کے بعد' اس وقت مجھے پہلی بار اطمینان ہوا تھا کہ ہماری حکمت عملی کامیاب ثابت ہوئی تھی اور ہم بیک وقت نئے سردار اور اس کے ایک باغی کا اعتماد جیتنے میں کامیاب ہوگئے تھے۔

میں نے سوچا کہ میں' صندل خان سے صبغت اللہ کے تایازاد بھائی' ارسلا خان کا ذکر چھیڑوں۔ مجھے یقین تھا کہ اس نام سے بھی کوئی نہ کوئی عجیب کہانی وابستہ رہی ہوگی ورنہ صبغت اللہ اسے کراچی میں کوئی معمولی نوکری دلانے کے لیے مانیا سے رجوع نہ کرتا لیکن میں نے اپنے اس خیال کو خود ہی مسترد کردیا۔

اس وقت تک ہم نے صندل خان کو یہ کامیاب تاثر دیا تھا کہ صبغت اللہ اور اس کے حواریوں سے ہماری کوئی ملی بھگت نہیں تھی بلکہ ہم نادانستگی میں اس کے آلہ کار بن گئے تھے جس کے نتیجے میں اس نے ہمیں بعض فوری مراعات سے نوازا تھا۔ اگر اس موقعے پر میں ارسلا خان کا پرانا ذکر چھیڑتا تو صندل خان یہ سوچنے پر مجبور ہوجاتا کہ مہینوں پہلے شنگاراویلی سے کوچ کرجانے والے ارسلا خان سے میرا کیا تعلق تھا۔ وہ صبغت اللہ کا قریبی رشتے دار تھا اس لیے صندل خان کو یہ شبہ ہوسکتا تھا کہ میری اور صبغت اللہ کی کوئی پرانی شناسائی ہے جسے میں اس سے چھپا رہا ہوں۔ یہ ایک بات اسے ہم چاروں سے بدظن کردینے کے لیے بہت کافی ہوتی اور ہم اس اجنبی ماحول میں ایک مضبوط متبادل سہارے سے محروم ہوجاتے۔

ویرا اپنے اس سفر کی یادوں کو دہرا رہی تھی جو اس نے چیغا سرائے سے وہاں تک پہنچنے کے لیے طے کیا تھا۔ وہ بہت زیادہ خوابناک انداز میں شنگاراویلی کے قدرتی حُسن اور مناظر کی تعریف کررہی تھی۔ اسے وہ تمام سزائیں سنسنی خیز اور ہیجان انگیز معلوم ہورہی تھیں جو پائندہ گل نے اپنی سرکش رعایا کے لیے نافذ کی ہوئی تھیں۔ وارثوں والی میت پر بین اور نوحہ کرنے والی ماتم گسار عورتوں کو گنجا کرکے چالیس روز تک برہنہ چھاتیوں کے ساتھ دربدر ذلیل و خوار کرنا' ہیروئن پینے والوں کو سینے تک سنگلاخ زمین میں دفن کرکے بھوکے ریچھوں سے نچواتا اور بدنگاہ مردوں کی آنکھوں کو کالی چیلوں سے نکلواتا اسے اچھوتا اور تحیّر خیز معلوم ہورہا تھا اور صندل خان اپنے محبوب و مرحوم سردار کی وہ توصیف سن کر ویرا پر نظروں ہی نظروں میں قربان ہوا جارہا تھا۔

سلطان شاہ کے بشرے سے صاف ظاہر ہورہا تھا کہ اسے ان دونوں کا باہمی رویہ بری طرح کھل رہا تھا۔ جوں ہی ویرا نے اپنی بات ختم کی' وہ براہ راست صندل خان سے مخاطب ہوگیا۔ "یہ کن خاص چیلوں کا ذکر ہورہا ہے؟ میرا تو خیال ہے کہ ساری ہی چیلیں کالی ہوتی ہیں۔ میں نے اپنی پوری عمر میں کبھی کوئی سفید چیل نہیں دیکھی۔ ہاں ابابیلوں کی بات ذرا مختلف ہے۔"

"تمہارا مشاہدہ یا پھر نظریں کمزور ہیں۔" صندل خان سے پہلے ویرا بول پڑی۔ "تمام چیلیں کالی نہیں' سرمئی ہوتی ہیں اور اس میں بھی گہرے کتھئی رنگ کی آمیزش ہوتی ہے۔ وہ دور سے سیاہ نظر آنے کے باوجود گہرے کالے رنگ کی نہیں ہوتیں۔ کالی چیل تو چیز ہی کچھ اور ہوگی۔"

"تم اپنی قابلیت مت جھاڑو۔ میں نے سوال صندل خان سے کیا تھا۔" سلطان شاہ چڑ کر بولا۔

"یہ ٹھیک کہہ رہی ہے۔" صندل خان نے ویرا کی تائید کی۔ "اتنی وضاحت تو شاید میں بھی نہیں کرسکتا تھا۔" پھر وہ ویرا سے مخاطب ہوگیا۔ "تمہیں چیلوں کے بارے میں اتنی معلومات کیسے حاصل ہیں؟"

"یہ کون سی خاص معلومات ہیں؟" سلطان شاہ نے پھر اپنی ٹانگ اڑادی۔ "جس کے پاس کرنے کے لیے کوئی کام نہ ہو' وہ دو چار گھنٹے چیلوں کو دیکھتا رہے۔ ان کے بارے میں اس سے زیادہ جان جائے گا۔"

"تم فرزانہ کے ساتھ زیادتی کررہے ہو۔" صندل خان نے احتجاج کیا اور مستفسرانہ نگاہوں سے ویرا کی طرف دیکھنے لگا۔

"جب میں یورپ میں تھی تو مجھے چیلیں پالنے کا خبط ہوگیا تھا۔" ویرا نے سلطان شاہ کو سلگانے کے لیے معصومانہ سنجیدگی سے کہا۔ "اسی زمانے میں' میں نے ان کے بارے میں بہت کچھ سیکھا تھا۔"

"مرحوم سردار کو یہ جان کر بہت خوشی ہوتی۔" صندل خان نے حسرت سے کہا۔ "دراصل کالی چیلیں اسی نے پالی ہوئی تھیں۔ وہ صرف مینڈک یا پھر ہمارے لیے ذبح ہونے والے جانوروں کی آنکھیں کھاتی تھیں۔ میں نے بس ایک بار ہی وہ بھیانک منظر دیکھا تھا۔ ایک کالی چیل کو پنجرے سے نکال کر بند کمرے میں چھوڑا گیا پھر مجرم کو اندر دھکیل دیا گیا۔ چیل فوراً ہی اپنے پنجے نکال کر اس کے چہرے پر حملہ آور ہوئی اور اس کے ہاتھوں کو زخمی کرکے اپنے دونوں پنجوں سے اس کی آنکھیں نکال لے گئی۔ وہ بدنصیب آج بھی گالان میں چٹائیاں بنتا ہے۔ حیرت کی بات یہ ہے کہ اسے اندھا کرنے کے بعد چیل نے دوبارہ اس کے بدن کے کسی حصے پر حملہ نہیں کیا اور ایک کونے میں بیٹھ کر اس کی دونوں آنکھیں کھاتی رہی۔ مرحوم سردار عبرتناک سزائیں دینے میں اپنا ثانی نہیں رکھتا تھا۔"

شاید وہ گفتگو اور نوک جھونک مزید آگے بڑھتی لیکن اسی وقت فضا کھانوں کی اشتہا انگیز خوشبو سے مہک اٹھی۔ بھنے ہوئے گوشت کی بو ہر خوشبو پر غالب تھی۔ ہم سب ہی بے چین ہوگئے۔

میرا خیال تھا کہ ہمارا کھانا اسی خواب گاہ میں پہنچایا جائے گا لیکن چند ساعتوں کے بعد ایک شنگاری نے اندر کی سمت والے دروازے سے نمودار ہوکر کچھ کہا اور صندل خان نے فوراً ہی اپنی جگہ چھوڑ دی۔ "آؤ! باہر والے کمرے میں کھانا تمہارا انتظار کررہا ہے۔"

ہماری طرح صندل بھی صبح سے بھوکا تھا۔ اس نے ہمارے ساتھ کھانے میں شریک ہونے سے گریز کرنا چاہا لیکن وہ ویرا کے اصرار کو نہیں ٹال سکا۔ دو شنگاری ضرورت کی کوئی بھی چیز فراہم کرنے کے لیے مستعد کھڑے ہوئے تھے۔

"پچھلے چوبیس گھنٹوں میں یہ پہلا کھانا ہے جو میسر آیا ہے۔" میں نے صندل خان سے کہا۔ "یہ دونوں بھی جنگ سے تھکے ہوئے اور بھوکے ہوں گے۔ انہیں بھی ساتھ بٹھالو۔ کھانا بہت زیادہ ہے۔"

"اپنا پیٹ بھرو اور اِن فضول باتوں کو چھوڑو۔" صندل خان نے قدرے تیزی سے کہا۔ "یہاں کچھ بچ گیا تو یہ بعد میں کھالیں گے ورنہ انہیں لنگر سے کھانا ملے گا۔ یہ مہمانوں کے ساتھ نہیں بیٹھ سکتے۔"

میں اس کی بات پوری ہونے سے پہلے ہی کھانے سے انصاف کرنے میں مصروف ہوچکا تھا۔

"آرام سے پیٹ بھرلو اور یہ بھی سن لو کہ کھانے کے بعد تمہیں نئے سردار کے پاس جانا ہے۔" تھوڑی دیر بعد صندل خان نے وہ انکشاف کرکے مجھے چونکا دیا۔ "وہ صرف تم سے ملنا چاہتا ہے۔"

"یہ خبر تمہیں کب اور کیسے ملی؟" میں نے بے تکلفی سے پوچھا کیونکہ دونوں شگاری خدمت گار اردو سے بے بہرہ نظر آرہے تھے۔

"کھانے کی اطلاع دینے والے نے بتایا تھا لیکن میں نے شروع میں یہ ذکر کرکے تمہاری بھوک خراب کرنے سے گریز کیا تھا۔" وہ تندوری نان کے ساتھ نمکین گوشت کا ایک بڑا سا پارچہ نگلنے کے بعد بولا۔

اس کے بعد کھانے کے دوران میں خاموشی رہی۔ سب پورے انہماک سے کھانے میں مصروف رہے۔ اچھی طرح شکم سیر ہونے کے بعد میں نے سگریٹ سلگائی تو ویرا نے بھی میرا ساتھ دیا۔ میرے لیے صبغت اللہ کی وہ طلبی غیر متوقع نہیں تھی۔ جب اس سے میری ملاقات ہوئی تو اس نے میری آنکھوں میں شناسائی کی جھلکیاں دیکھ کر مختصر طور پر بات ختم کردی تھی۔ شگاریوں کی بھیڑ میں وہ مجھ سے زیادہ باتیں کر بھی نہیں سکتا تھا۔ یہ اِخیال تھا کہ وہ اسی معاملے پر کچھ گفتگو کرے گا اور پھر ہماری واپسی کا معاملہ طے پاجائے گا۔

خدمات گار برتن وغیرہ سمیٹ کر لے گئے تو میں صندل خان کے ساتھ اُٹھ کھڑا ہوا۔

"میری واپسی تک کوئی مسئلہ کھڑا نہ کردینا۔" میں نے خشمگیں نظروں سے سلطان شاہ کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ "آج تم فرزانہ سے کچھ زیادہ ہی الجھ رہے ہو۔"

"یہاں گڑبڑ کا امکان ہو تو فرزانہ کو بھی اپنے ساتھ لے چلتے ہیں۔" میری پریشانی سے آگاہ ہوتے ہی صندل خان نے اپنی تجویز پیش کردی۔ "تمہیں سردار صبغت اللہ کے پاس تنہا جانا ہوگا۔ جب تک تم وہاں سے فارغ ہوگے' اتنی دیر میں میں فرزانہ کو حویلی اور کالی چیلوں والے پنجرے کی سیر کرادوں گا۔"

"نہیں' اس کی ضرورت نہیں ہے۔" سلطان شاہ فوراً ہی خشک لہجے میں بول پڑا۔ "ہمارے درمیان اتنے زیادہ اختلافات نہیں ہیں کہ ہم تھوڑی دیر بھی سکون سے نہ رہ سکیں۔" پھر وہ مجھ سے مخاطب ہوگیا۔ "تم بے فکر ہو کر صندل بھائی کے ساتھ جاؤ۔ چاہو تو واپسی میں فرزانہ کے بدلے حویلی کی سیر بھی کرتے آنا۔"

ویرا وہاں رہ کر صندل خان کو اپنے قابو میں کرنے کے ساتھ ساتھ' سلطان شاہ کو جلانے کی کوشش بھی کررہی تھی۔ اس لیے صندل خان کے ساتھ اس کا رویہ فیاضانہ تھا۔ ورنہ وہ خود بھی اس شگاری سے ایک مخصوص فاصلہ برقرار رکھنا چاہتی تھی۔ اس نے بھی سلطان شاہ کی رائے کی تائید کی اور میں صندل خان کے ساتھ نئے سردار سے پہلی تفصیلی ملاقات کے لیے روانہ ہوگیا۔ اس بار میں ننگے پاؤں نہیں تھا۔

راستے میں ہر جگہ مشعلوں کی زرد اور لرزتی ہوئی روشنی نے ایک پراسرار سماں باندھا ہوا تھا۔ وہ لوگ سورج غروب ہوتے ہی رات کا کھانا کھانے اور جلد سوجانے کے عادی تھے لیکن اس وقت آدھی رات گزرجانے کے باوجود حویلی میں' ڈھیلے ڈھالے لباسوں والے شگاری اپنے شانوں سے ہتھیار لٹکائے' آسیبی سایوں کی طرح گھومتے پھر رہے تھے۔ ان لوگوں نے حویلی کے ہر حصے سے خون اور لڑائی کے دیگر آثار کو اتنی صفائی سے مٹادیا تھا کہ یہ اندازہ ہی نہیں ہوتا تھا کہ چند گھنٹوں قبل وہ حویلی جنگ کا مرکز بنی ہوئی تھی۔ راستہ طے کرتے ہوئے میری بے چین نگاہیں قندوز خان کو تلاش کرتی رہیں لیکن وہ کہیں نظر نہیں آیا۔ مجھے اس کی طویل غیر حاضری سے قدرے تشویش ہونے لگی تھی۔ پہلے وہ مسلسل ہمارے ساتھ چپکا رہا تھا لیکن صندل خان کو بھیجنے کے بعد وہ ایک دم غائب ہوگیا تھا۔ شاید اسے صندل خان کے لیے ہماری ہمدردیاں پسند نہیں آئی تھیں۔

"تمہیں اب ہر وقت گھنٹیوں کی آوازیں نہیں ڈرائیں گی۔" راستے میں صندل خان نے کہا۔ "پہلے تم نے بار بار آسیب اور بدروحوں کا ذکر کرکے مجھے بھی اعصاب زدہ کردیا تھا اور میں تم پر جھپٹ کر تمہیں خاموش کرانے پر مجبور ہوگیا تھا۔"

"وہ صورت حال ہی ایسی تھی۔ گھنٹیاں خود بخود بجتی تھیں اور معدوم ہوجاتی تھیں۔ مجھے کچھ علم نہیں تھا کہ وہ سب کیوں ہوتا ہے۔" بات کرتے کرتے' اچانک مجھے بدروحوں کے بارے میں اس کا نظریہ یاد آگیا اور میں نے پوچھا۔ "تم کہہ رہے تھے کہ بدروحیں تمہارے مُردوں کے پیٹ میں گھس کر لوگوں کو پریشان کرتی ہیں' اس لیے تم مرنے والوں کے پیٹ چاک کرکے' ان کی ساری آلائشیں مغربی ڈھلانوں پر پھینک دیتے ہو جہاں گدھ وہ سب کھاجاتے ہیں۔ بدروحوں کا مُردوں کے پیٹ میں بھری ہوئی آلائشوں سے کیا تعلق ہے؟"

"بدروحیں ہمیشہ بھوک اور پیاس سے بلبلاتی پھرتی ہیں۔ اپنے اس چکر میں وہ زندہ انسانوں کو نہیں ستاتیں۔ مُردہ انسانوں کے پیٹ کی آلائش ان کی مرغوب غذا ہوتی ہے۔ جوں ہی کوئی مرتا ہے' وہ اس کے پیٹ میں گھسنے کی کوشش شروع کردیتی ہیں۔ لاش پر دوسرا پہر گزر جائے تو انہیں پناہ گاہ مل جاتی ہے اور وہ اپنا پیٹ بھرنے کے بعد دہشت زدہ کرنے والی حرکتیں شروع کردیتی ہیں۔ اسی لیے ہم مُردوں کا پیٹ فوراً صاف کردیتے ہیں۔" اس نے وضاحت کے ساتھ اپنا نظریہ پیش کیا جو حیران کن ہونے کے باوجود نیا نہیں تھا۔ اس سے ملتے جلتے نظریات افریقہ کے بہت سے قبائل میں بھی عام تھے۔ خاص بات یہ تھی کہ علم اور تہذیب سے دور' اپنے خول میں بند رہ کر زندگی گزارنے والے ہی اس قسم کے جاہلانہ توہمات کا شکار پائے جاتے تھے۔

"اس کا مطلب ہے کہ اس وقت گالان میں ستاسی بدروحیں اپنے پنجے گاڑ چکی ہیں؟" میں نے کہا۔

"یہ کیا کہہ رہے ہو؟" وہ بوکھلا کر بولا۔ اس کی آنکھوں سے یک بیک خوف اور وحشت کا اظہار ہونے لگا تھا۔ "کیا تم پر دوبارہ اسی قسم کا دورہ پڑ رہا ہے؟"

"یہ دورہ نہیں ہے۔ میں ان ستاسی شگاریوں کے بارے میں سوچ رہا تھا جو آج کی لڑائی میں مارے گئے ہیں اور انہیں دفنایا جاچکا ہے۔ ان کے پیٹ تو صاف نہیں کیے گئے ہوں گے؟"

"کیسی باتیں کررہے ہو؟ مُردوں کو غسل دینے سے پہلے پیٹ خالی کردیے گئے تھے۔ ہر شگاری اس عمل کی اہمیت سے پوری طرح واقف ہے۔ جان بوجھ کر کوئی بھی مصائب کو دعوت دینا پسند نہیں کرتا۔"

میرے اندازے کے حساب سے ان لوگوں نے پیٹ وغیرہ صاف کرکے' اتنی بڑی تعداد میں مُردے دفن کرنے میں غیر معمولی مہارت اور پھرتی کا مظاہرہ کیا تھا۔ جنگی معاشرے سے تعلق رکھنے کی بنا پر شاید وہ ایسے غیر معمولی کام تیزی سے سرانجام دینے کے عادی ہوگئے تھے۔

صندل خان نے بتایا کہ صبغت اللہ کی حمایت میں لڑنے کے لیے گرد و نواح کے کئی قبائل سے مسلح لوگوں کی بھاری نفری نے گالان پر لشکر کشی کی تھی۔ جنگ ختم ہونے کے بعد' ان میں سے بہت سے لوگ حویلی میں ٹھہرے ہوئے تھے' جن کی وجہ سے راستوں اور راہداریوں میں زیادہ چہل پہل نظر آرہی تھی۔ بقیہ لوگ حویلی کے سامنے والے میدان میں ہی پڑاؤ ڈالے ہوئے تھے۔

آخر کار ہم اندر ہی اندر چلتے ہوئے' قالینوں سے آراستہ اس دربار ہال میں پہنچ گئے جس کے ایک سرے پر منقش چوبی دروازہ موجود تھا۔ میں نے پائندہ گل سے اسی دروازے کے پیچھے ملاقات کی تھی۔

اس وقت دربار ہال لوگوں سے بھرا ہوا تھا۔ شاید وہاں کھانے کا دور ختم ہوچکا تھا مگر فضا میں اشتہا انگیز خوشبوئیں چکراتی پھر رہی تھیں۔ ساتھ ہی ہال کی فضا سگریٹوں کے دھوئیں سے بھری ہوئی تھی کیونکہ بیشتر شگاری لیٹ یا بیٹھ کر خوش گپیاں کرنے کے ساتھ ساتھ سگریٹ نوشی بھی کررہے تھے۔

وہ سب ہی صندل خان کے جانے پہچانے لوگ تھے۔ وہ کسی سے ہنستا بولتا اور کسی کو اشارے کرتا ہوا آگے بڑھتا رہا۔ بند دروازے کے قریب پہنچ کر' اس نے وہاں موجود مسلح شگاری سے کچھ کہا۔ وہ فوراً ہی دروازہ کھول کر اندر چلا گیا۔ واپسی پر اس نے جو کچھ کہا' وہ سن لینے کے بعد صندل خان مجھے لے کر دیوار کے ساتھ' ایک گوشے میں بیٹھ گیا۔ اندر نیا سردار کچھ لوگوں کے ساتھ ملاقات میں مصروف تھا اور ہمیں باہر رک کر اس کے فارغ ہونے کا انتظار کرنا تھا۔ مجھے وقت کی ستم ظریفی کا اندازہ ہوا کہ پچھلی رات تک صندل خان' سردار پائندہ گل کے خاص الخاص لوگوں میں شامل تھا۔ اسے سردار کے کمرے میں داخل ہونے کے لیے کسی کی اجازت یا انتظار کی ضرورت نہیں تھی۔ وہ جب چاہتا' دروازہ کھول کر بے دھڑک اندر جاسکتا تھا لیکن گالان میں برپا ہونے والے خونی انقلاب نے اس قلیل سی مدت میں اسے اس بلند مقام سے ایسی جگہ لا پھینکا تھا جہاں وہ ایک عام شگاری کے علاوہ کچھ بھی نہیں تھا۔

وہاں بیٹھے ہوئے میری نظر ان دو آدمیوں پر پڑی جو بڑی بڑی بالٹیوں میں سے کوئی مشروب طالب گاروں کو بانٹتے پھر رہے تھے۔ میرے استفسار پر صندل خان نے پھیکی مسکراہٹ کے ساتھ بتایا کہ اس بڑے اجتماع میں شراب پینے والوں کو ان بالٹیوں کے ذریعے شراب تقسیم کی جارہی تھی۔

"تم چاہو تو وقت گزاری کے لیے ایک آدھ گلاس بھروالو۔" اس نے ایک طرف رکھے ہوئے خالی گلاسوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ "پتا نہیں سردار صبغت اللہ کتنی دیر میں فارغ ہو۔"

"اس وقت موڈ نہیں ہے۔" میں نے مسکرا کر اس کی پیشکش کو ٹال دیا۔

کچھ دیر بعد سردار کے کمرے کا دروازہ کھلا اور اس میں سے ڈھیلے ڈھالے اور لمبے لباسوں والے لوگوں کی بھیڑ ایک قطار کی صورت میں باہر آنے لگی۔ باہر آکر وہ لوگ اپنے اپنے شناساؤں کے ساتھ بیٹھتے جارہے تھے۔ وہ سلسلہ ختم ہونے کے بعد محافظ نے ہماری طرف اشارہ کیا اور ہم نے اپنی جگہ چھوڑ دی۔

میں دروازے کی طرف بڑھا تو صندل خان بھی میرے ساتھ تھا مگر محافظ نے اسے روک کر نرمی سے کچھ کہا تو صندل خان کے چہرے پر خجالت آمیز مسکراہٹ پھیل گئی۔ اس نے مجھ سے کہا۔ "سردار نے تمہیں تنہا طلب کیا ہے۔ میں یہیں رک کر تمہاری واپسی کا انتظار کروں گا۔"

"انتظار کی ضرورت نہیں' تم جاکر آرام کرو۔ میں خود واپس

لوٹ جاؤں گا۔"

"تم چاہو تو میں یہاں رکا رہ سکتا ہوں۔" اس نے اپنے شانے اچکا کر بے بسی سے کہا۔ "مجھے تمہاری دیکھ بھال پر مامور کیا گیا ہے۔ حویلی بہت وسیع اور پرپیچ ہے۔ ایسا نہ ہو کہ واپسی پر تم بھٹک جاؤ۔"

"نہیں، تم جاکر آرام کرو!" میں نے سختی سے کہا۔ "میں بھٹک کر کہاں جاؤں گا؟ ویسے بھی یہ مردانہ حویلی ہے۔ یہاں کسی عورت کی پرچھائیں تک نظر نہیں آئی ہے۔ میرے بھٹکنے سے کسی کی بے پردگی نہیں ہوگی۔"

مسلح محافظ میرے اندر جانے کے انتظار میں دروازہ کھولے کھڑا تھا۔ دیر ہونے پر اُس نے میرے شانے پر اپنے ہاتھ کا دباؤ ڈالا اور میں صندل خان پر الوداعی نظریں ڈالتا ہوا اندر داخل ہوگیا۔

اندر مشعلوں کا اجالا پھیلا ہوا تھا۔ شیشے کی عقبی دیوار پر پردے کھنچے ہوئے تھے اور صبغت اللہ دبیز قالین پر گاؤ تکیے کے سہارے بیٹھا ہوا تھا۔ اس کے چہرے پر گہری سنجیدگی طاری تھی اور اس کی عقابی نگاہیں میری طرف جمی ہوئی تھیں۔

"آؤ! میں تمہاری کارکردگی سے بہت خوش ہوں۔ قندوز خان نے مجھے بتایا ہے کہ تم چاروں نے کسی کو ویران باڑے کی طرف نہیں آنے دیا تھا۔ وہاں موجود بموں کا ذخیرہ اب ہمارے قبضے میں ہے۔"

"ہمیں معلوم نہیں تھا کہ ہمیں بموں کی حفاظت پر مامور کیا گیا ہے۔" میں نے ہلکے سے شکایتی لہجے میں کہا۔ "ہم سے ذرا سی بھی لغزش ہوجاتی تو نہ جانے کیا ہوتا۔ غنیمت ہے کہ ہماری عزت رہ گئی۔"

"جنگ میں ہر ایک کو ہر بات کا علم ہونا ضروری نہیں ہوتا۔ اہم بات یہ ہے کہ تم نے اپنے ذمے لگایا ہوا کام بہت اچھے طریقے سے سرانجام دیا۔ تمہیں یہاں کوئی تکلیف تو نہیں ہے....؟ کھڑے کیوں ہو؟ بیٹھ جاؤ!"

"فی الحال کوئی تکلیف نہیں ہے۔" میں نے بیٹھنے کے بعد کہا۔ "لیکن کل ہماری واپسی کا بندوبست ہوجائے تو بہت اچھا ہوگا۔ ہمیں گھر سے نکلے ہوئے کئی دن ہوچکے ہیں....."

"نہیں۔" اس نے میری بات کاٹتے ہوئے کہا۔ "تمہیں میری خاطر چند روز یہاں رہنا ہوگا۔ میں تمہاری ضرورت کی ہر چیز تم کو مہیا کرنے کی کوشش کروں گا۔ اس کے بعد تمہیں پوری عزت کے ساتھ رخصت کردیا جائے گا۔"

"لیکن یہاں کے حالات تمہارے قابو میں آچکے ہیں۔ ہم بے مقصد یہاں رہ کر کیا کریں گے؟"

"ابھی ایک دو اہم کام باقی ہیں جن کے لیے تمہاری ضرورت ہوگی۔" وہ معنی خیز لہجے میں بولا۔

"اہم کام؟" میں چونک پڑا۔ "اس وادی میں میرے لیے کیا اہم کام ہوسکتا ہے؟"

"اُن کی اہمیت میرے لیے ہے... یہ بتاؤ کہ میری ہدایت سے پہلے تم نے کسی سے ارسلا خان کے بارے میں بات تو نہیں کی تھی؟" اس کا لہجہ دھیما اور تجسس آمیز تھا۔ خاص بات یہ تھی کہ وہ مجھ سے مکمل تخلیئے میں بات کررہا تھا۔ حد یہ تھی کہ اس گفتگو میں قندوز خان تک کو شریک نہیں کیا گیا تھا۔

"نہیں، اس کی ضرورت ہی پیش نہیں آئی تھی۔ تم کراچی میں مجھ سے کسی اور نام سے ملے تھے۔ مجھے یہ بھی معلوم نہیں تھا کہ ارسلا خان تشنگارا ویلی کا رہنے والا ہے۔ آج میں نے تمہیں دیکھ کر پہچانا تو میرے ذہن میں ارسلا خان کی تصویر ابھر آئی۔ پھر میں نے تمہاری ہدایت پر ماضی کو یکسر بھلا دیا اس لیے قندوز خان سے بھی پرانی باتوں کا ذکر نہیں کیا۔"

"تم بہت سمجھ دار آدمی ہو، مجھے تم سے یہی امید تھی" اتنا کہہ کر اس نے پہلو تبدیل کیا اور گمبھیر لہجے میں بولنے لگا "مجھے تمہاری اور جنت گل کی کہانی کا بخوبی علم ہے۔ کل رات، جب میں نقاب لگا کر تم سے ملا تھا، تم نے مجھے بتایا تھا کہ جنت گل نے گناہ کے لیے تم پر جبر کیا تھا۔ مجبور آدمی کا کوئی گناہ نہیں گنا جاتا۔ جب وہ گنا نہیں جاتا تو اسے بھلایا بھی جاسکتا ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ تم جرگے کے سامنے ایسے کسی واقعے سے انکار کردو جس سے جنت گل پر حرف آتا ہو۔"

اس کی خواہش نے مجھے حد سے زیادہ حیران کردیا، میں نے کہا "تم کل رات بھی اس پر بہت برہم تھے۔ تم نے کہا تھا کہ جنت گل نے ایک یرغمالی کی آغوش میں گر کر ہر تشنگاری کے منہ پر تھوکا ہے اور تم سرداری کا جھگڑا نمٹانے کے بعد اسے خود اس سنگین جرم کی سزا دوگے۔"

"مجھے میری کہی ہوئی باتیں یاد دلانے کی کوشش مت کرو" وہ خشک لہجے میں بولا "میں نے تو یہ بھی کہا تھا کہ ہم لوگ کیچڑ میں پتھر نہیں پھینکتے کیونکہ اپنے اوپر بھی چھینٹیں آنے کا ڈر ہوتا ہے لیکن میں اپنے پرانے زخم کیسے بھلا سکتا ہوں؟ یہ وادی اور یہاں کی سخت روایات اپنی جگہ ہیں مگر میں اپنی انا کو کہاں لے جاؤں؟ تمہارے لیے یہ سب باتیں بے کار ہیں۔ یہ بتاؤ کہ تم میری تجویز کے بارے میں کیا کہتے ہو؟"

بات یک بیک بہت گمبھیر ہوگئی تھی۔ میں نے سنبھل کر کہا "میرے خیال میں بہتر تو یہ ہوتا کہ اس معاملے کو نہ اٹھایا جاتا۔ میں تمہارے کہنے پر جھوٹ بول بھی دوں تو کیا فرق پڑے گا؟ جنت گل اپنی کہانی پھیلاتی رہے گی۔"

"تم اپنے انکار پر ڈٹ جاؤ تو اسے میں سنبھال لوں گا۔ اُس کی بکواس کو یہ کہہ کر حقارت سے مسترد کیا جاسکتا ہے کہ وہ اپنے ناجائز باپ کے قبیلے کو رُسوا کرنے کے لیے جھوٹ بول رہی ہے۔ میں تمہیں اسی لیے یہاں روکنا چاہتا ہوں کہ اسے پکڑ کر یہاں لایا جائے۔ تم جنت گل، اس کی گونگی ماں اور لنگڑے ضیغم کے سامنے اپنا بیان دوگے اور ہر ایک تمہارے بیان پر یقین کرلے گا" اس کے ذہن میں ایک باقاعدہ منصوبہ پرورش پارہا تھا۔

مجھے خیال آیا کہ صبغت اللہ کی نیت خراب ہوچکی تھی۔ اس نے اپنے حریف کو مار کر اس کی مسند اقتدار پر قبضہ جمالیا تھا اور اب اس کی خوش جمال، خوش ادا، سبک اندام اور سیم تن لڑکی پر اپنی ہوسناک نگاہیں گاڑے بیٹھا تھا۔ میرے بیان کے ذریعے اسے زبردستی پاک دامن قرار دے کر شاید وہ اس پر بھی قابض ہونا چاہتا تھا ورنہ یہ کیسے ممکن تھا کہ جس لڑکی کو وہ پچھلی رات تک واجب القتل قرار دیتا رہا تھا، اقتدار کا نشہ چڑھتے ہی اس کا سازشی ذہن اس لڑکی کو آبرومند قرار دلوانے کی ترکیبیں سوچنے میں مصروف ہوگیا تھا۔

"اس کا مطلب ہے کہ جب تک وہ تینوں گالان نہیں لائے جاتے، ہمیں یہیں رہنا ہوگا؟" میں نے اپنی ذہنی کیفیت کو چھپاتے ہوئے پرتشویش لہجے میں سوال کیا۔

"ضیغم اور گونگی کو کسی بھی وقت کابل سے اٹھا کر یہاں لایا جاسکتا ہے۔ اصل مسئلہ جنت گل کا ہے۔ وہ تشنگاریوں سے چھپتی پھر رہی ہے لیکن وہ زیادہ دنوں تک نہیں بچ سکے گی۔ جب اسے پائندہ گل کی موت کی خبر ملے گی تو وہ سامنے آنے کی حماقت کرگزرے گی اور اس کی تاک میں لگے ہوئے، میرے آدمی اس پر ہاتھ ڈال دیں گے" وہ خود ہی اپنے منصوبے کے خدوخال واضح کرتا جارہا تھا۔ اس نے اضطراری طور پر میرے قریب سرک کر کہا "یہ سب کام چند روز میں ہوجائے گا۔ چیغا سرائے میں گاڑی تیار رہے گی۔ جنت گل کے ہاتھ آتے ہی، وقت ضائع کیے بغیر وہ تینوں یہاں پہنچادیے جائیں گے۔ اس دوران میں تمہیں یہاں ہر طرح کا آرام حاصل رہے گا۔"

"برا نہ مانو تو میں ایک بات جاننی چاہتا ہوں" میں جھجکتے ہوئے کہا۔

"اگر تمہارا سوال تہذیب اور رواداری کی حد میں ہوا تو میں اس کا جواب ضرور دوں گا۔"

"جنت گل کو اس کے ایک پاپ سے بری الذمہ قرار دے کر تم کیا حاصل کرنا چاہتے ہو؟" وہ سوال کرتے ہوئے، میرے ذہن میں ارسلا خان کا نام بچھو کے ڈنک کی طرح چبھ رہا تھا۔ اس وقت تک میری اور صبغت اللہ کی جو بھی باتیں ہوئی تھیں، ان میں ارسلا خان کا کوئی کردار سامنے نہیں آسکا تھا۔

"اس کی رگوں میں ایک تشنگاری کا خون دوڑ رہا ہے۔" وہ ایک گہرا سانس لے کر بولا "میں اسے ہر قیمت پر اس وادی میں واپس لانا چاہتا ہوں۔ اسے بے لگام نہیں چھوڑا جاسکتا۔"

"اپنی ہرزہ سرائیوں کی بنا پر وہ اقبالی مجرمہ بن چکی ہے۔ تم اتنے بکھیڑے میں پڑنے کے بجائے اسے یہاں لا کر یرغمالی کے ساتھ بدکاری کے جرم میں سزائے موت دے سکتے ہو" میں نے اس کے گرد گھیرا تنگ کردیا۔

"میں اسے زندہ رکھنا چاہتا ہوں۔ تم میری بات سمجھ رہے ہو نا؟" وہ میری طرف جھک کر تیز لہجے میں بولا "وہ مرگئی تو چند برسوں بعد لوگ سب کچھ بھول جائیں گے مگر میں اپنی آگ میں جلتا رہوں گا۔ اس کی موت میرے درد کا درماں نہیں ہے۔ وہ زندہ رہے اور زندگی بھر کسی بادرانی کے بچے جنتی رہے تو مجھے سکون مل سکے گا۔ میں نے تم کو اپنے دل کی بات بتادی ہے۔ میرا خیال ہے کہ اب تم سب کچھ سمجھ گئے ہوگے۔"

"یعنی... یعنی تم اسے اپنی بیوی بنانا چاہتے ہو؟" میں نے اس کا چہرہ تکتے ہوئے حیرت سے پوچھا۔

"نہیں!" وہ دہاڑا۔ غصے سے اس کا چہرہ سرخ ہوگیا تھا "میں اسے اتنی عزت نہیں دے سکتا۔ میں یہاں کا سردار ہوں۔ بادران کی کوئی پاک باز لڑکی ہی میری بیوی بن سکے گی۔ پائندہ گل نے میرے تایا زاد پر گھناؤنا اور جھوٹا الزام لگا کر میرے سینے میں برچھی اتاری تھی۔ میں وہ تڑپ آج تک محسوس کررہا ہوں۔ اس الزام تراشی کے بعد ہی میرے دل میں پائندہ گل کے خلاف نفرت اور بغاوت کا بیج پھوٹا تھا۔ اس وقت وہ سردار تھا اور میں اس کا لشکری۔ میں اس کا کچھ نہیں بگاڑ سکتا تھا۔ میں نے اس کے ظلم پر چپ سادھ لی اور دل و جان سے اس کے احکام کی تعمیل میں لگ گیا مگر ساتھ ساتھ میں نے وادی میں اپنے ہم خیالوں کو گھنٹی والوں کے روپ میں اکٹھا کرنا شروع کردیا اور تم نے دیکھ لیا کہ آج پائندہ گل ایک غیرت مند بادرانی کے ہاتھوں، منوں مٹی کے نیچے جاسویا ہے لیکن اس کی موت بھی میرا دل ٹھنڈا نہیں کرسکی ہے۔ اس کی کوئی جائز اولاد زندہ نہیں ہے۔ ایک جنت گل ضرور موجود ہے۔ اسے کسی وحشی بادرانی کو سونپ کر ہی مجھے سکون مل سکے گا۔ یہ اسی وقت ممکن ہے جب جنت گل کا دامن بے داغ ثابت ہو۔ داغ دار عورت کو تو کسی تشنگاری کے غلام بھی قبول کرنے پر آمادہ نہیں ہوں گے۔"

اس کی باتیں وحشیانہ اور لرزہ خیز تھیں۔ میں ان اشاروں کنایوں سے کافی کچھ سمجھ گیا تھا لیکن پوری کہانی پھر بھی سامنے نہیں آسکی تھی اس لیے میں نے کند ذہنی کا مظاہرہ کرتے ہوئے کہا "شاید پائندہ گل نے ارسلا خان کے ساتھ کوئی زیادتی کی تھی جس نے تمہیں تڑپایا ہوا ہے۔ اگر تم کھل کر نہیں بتانا چاہتے تو میں تم کو زیادہ کھل کر بولنے پر مجبور نہیں کرسکتا۔ تم نے اسی آگ کی جلن سے پائندہ گل کو مار کر سرداری پر قبضہ کیا ہے..." میری نگاہیں اس کے باریش چہرے پر مرکوز تھیں۔ میری باتوں پر اس کے چہرے کا رنگ بہ تدریج سرخ تر ہوتا جارہا تھا۔ اس کی عقابی آنکھوں کی منتقمانہ چمک گہری ہوتی جارہی تھی ادھر میں اس کے صبر کا پیمانہ

چھلکانے کی نیت سے اپنی بات کو طول دیتا جارہا تھا۔ پھر وہی ہوا جو میں چاہتا تھا۔ صبغت اللہ کی برداشت جواب دے گئی اور اس نے میری بات کاٹ دی۔

"جلیبی کی طرح الجھی ہوئی باتیں مت کرو" وہ غراتے ہوئے بولا "میں کسی سے نہیں ڈرتا۔ آج تک بس قندوز خان میرا راز جانتا تھا' اب تم بھی کان کھول کر سن لو کہ پائندہ گل نے ارسلا خان کو اس کے ناکردہ جرم پر اسے اونٹ کی گردن جیسی چوٹی سے درّے میں گرانے کی بھیانک سزا دی تھی مگر میں نے اس سزا پر عمل ہونے سے پہلے ارسلا خان کو راتوں رات یہاں سے نکال دیا۔ اس نے قسمیں کھائیں' مقدس کتاب پر حلف لے کر کہا کہ اس نے زرتاشہ کو بے آبرو نہیں کیا تھا مگر زرتاشہ نے اس کا گریبان نہیں چھوڑا۔ اُس بدنصیب لڑکی کو مرتے دم تک پورا یقین رہا کہ جب وہ اپنی بھیڑیں چرا رہی تھی تو پیچھے سے ارسلا خان نے اس کے سر پر چوٹ مار کر اسے بے ہوش کیا اور کسی خونی درندے کی طرح اسی حالت میں اُس کے بدن کو روند ڈالا مگر ارسلا خان کہتا تھا کہ یہ زرتاشہ کی بھیانک غلط فہمی تھی۔ وہ اتفاقاً ادھر جانکلا تھا۔ اس نے زمین پر ناگفتہ حالت میں پڑی ہوئی زرتاشہ پر عبدالرحیم خان کو جھکے دیکھا تو خاموشی سے اس کے سر پر پہنچنے کے بجائے اسے دور سے ہی للکار بیٹھا اور عبدالرحیم خان وہاں سے بھاگ نکلا۔ اصل بھیڑیا وہ تھا جو اپنے ماموں کے گھمنڈ میں مبتلا رہتا تھا۔ ارسلا خان کچھ دور تک اس کا ناکام پیچھا کرنے کے بعد واپس لوٹا تو زرتاشہ کسی بیوہ کی مانگ کی طرح اُجڑی ہوئی' پتھروں پر بے ہوش پڑی تھی۔ اس کے سر سے خون جاری تھا۔ ارسلا خان نے اس کا زخم سنبھال کر اسے بستی کی طرف اٹھالانے کا ارادہ کیا تو وہ اچانک ہوش میں آگئی اور بپھری ہوئی شیرنی کی طرح ارسلا خان پر ٹوٹ پڑی۔ ارسلا خان نے اسے حقیقت بتائی مگر اس نے اعتبار نہیں کیا کیونکہ ان ویران ڈھلانوں پر دور دور تک کوئی تیسرا شخص نہیں تھا اور ارسلا خان کے پاس وہاں موجود ہونے کا کوئی جواز نہیں تھا۔

"زرتاشہ اس کا گریبان تھام کر اسے تھپڑ مارتی اور پوری قوت سے چیختی چلاتی رہی۔ اس پر ہذیان کا عالم طاری تھا اور ویران آنکھوں میں دیوانگی اتر آئی تھی۔ اس کی اونچی آوازوں کی بازگشت پہاڑوں سے ٹکرا کر بستی تک پہنچی تو بہت سے لوگ اُدھر دوڑ پڑے۔ سب نے بدنصیب اور مظلوم زرتاشہ کی بات پر یقین کرلیا۔ ارسلا کی صفائی پر کسی نے دھیان نہیں دیا۔ سردار کے سامنے پیشی پر وہ کہانی دہرائی گئی' ارسلا خان کے الزام پر عبدالرحیم خان کو طلب کیا گیا تو اس نے معصومیت سے الزام ماننے سے انکار کردیا۔ اس کا کہنا تھا کہ وہ پوری دوپہر اپنے گھر میں سوتا رہا تھا۔ اس کی ماں نے اپنے بیٹے کے حق میں گواہی دی۔ پائندہ گل نے اپنی بہن کی گواہی پر ارسلا خان کی ہر فریاد کو موت سے دہشت زدہ ہوجانے والے مجرم کی چیخ وپکار قرار دے کر مسترد کردیا اور اسے موت کی سزا سنادی۔ میں تنہائی میں ارسلا خان سے ملا تو اس نے مجھے اصل کہانی سنائی مگر بدقسمتی یہ تھی کہ اُس کے پاس کوئی گواہ نہیں تھا۔ لٹنے والی زرتاشہ بھی اسی کو اپنا مجرم قرار دے رہی تھی۔ سب راستے بند تھے۔ میں ارسلا خان کو اچھی طرح جانتا ہوں۔ وہ مجھ سے جھوٹ نہیں بول سکتا تھا۔ پھر موت کی دہلیز پر تو ہر پاپی کی زبان آنچ اگلنے لگتی ہے۔ اس کی بے گناہی کا یقین کرلینے کے بعد میں نے اسی رات اسے قید خانے فرار کرادیا۔ صبح اسے سزائے موت کے لیے لے جانے والے لشکری وہاں پہنچے تو کوٹھری خالی تھی۔ بعد میں' میں نے کراچی میں اسے تمہارے پاس نوکر کرادیا۔ میں نے میں اپنا نام اور حلیہ بدل کر قیام کیا تھا۔ مجھے یقین تھا کہ تم مجھے نہیں پہچان سکوگے لیکن تم نے پہلی ہی نظر میں مجھے پہچان لیا تو مجھے تم سے کچھ تلخ باتیں کرنی پڑیں۔"

اس نے خاموش ہوکر شراب کی بوتل کی طرف ہاتھ بڑھایا تو میں نے احتراماً بوتل اٹھا کر اس کے لیے گلاس لبریز کردیا کیونکہ شنگاریوں کے پینے کا اندازہ ہی تھا۔

"اپنے لیے بھی لے لو" اس نے کھوئی کھوئی آواز میں کہا اور اپنا گلاس اٹھا کر منہ سے لگالیا۔ شاید ماضی کی یادوں نے غصے اور ہیجان کے بعد اس پر کچھ اداسی طاری کردی تھی۔ میں نے اپنے لیے پانی ملا کر گلاس بنایا اور ایک بڑا گھونٹ لے کر خاموشی کے ساتھ' اس کے دوبارہ بولنے کا انتظار کرتا رہا۔

"ارسلا خان فرار ہوگیا۔ زرتاشہ سر کے زخم میں کیڑے پڑنے اور زیادتی کے صدمے سے تیسرے دن پاگل ہوگئی۔ اس نے اسی رات اونٹ کی گردن والی پہاڑی سے نیچے کود کر اپنی جان دے دی۔ گالان میں چرچے ہونے لگے۔ گھاگ اور دوراندیش لوگوں کا خیال تھا کہ پائندہ گل نے زرتاشہ کے قصے میں عجلت سے فیصلہ سنا کر انصاف کا خون کیا تھا" صبغت اللہ نے اپنا حلق تر کرکے دوبارہ بولنا شروع کیا تو اس کی آواز پہلے کے مقابلے میں قدرے دھیمی اور پرسکون تھی "دبی زبان میں لوگ اُقرباپروری کی بات بھی کرتے تھے کیونکہ پائندہ گل کو اپنے بھانجے سے بہت محبت تھی مگر گالان میں عبدالرحیم خان کی شہرت اچھی نہیں تھی۔ وہ لڑکیوں سے سامنا ہونے پر نظریں جھکا لینے کے بجائے انہیں گھورا کرتا تھا۔ عورتوں کی بعض گزرگاہوں پر وہ پہلے سے بیٹھ کر ان کے آنے جانے کا انتظار کیا کرتا تھا۔ زرتاشہ کے واقعے کے بعد گالان کی عورتوں اور لڑکیوں نے اکیلے باہر نکلنا چھوڑ دیا۔ وہ ٹولیوں میں باہر آتی تھیں اور سورج غروب ہونے سے پہلے گھروں میں بند ہوجاتی تھیں۔ وہ گالان میں خوف ودہشت کے عجیب دن تھے۔ پھر عبدالرحیم خان کی ماں کو اچانک کوڑھ نکل آئی تو لوگوں نے اسے قدرت کی طرف سے جھوٹی گواہی کی سزا قرار دیا۔ پائندہ گل اپنی بہن کی عیادت کے لیے بستی میں گیا تو اسے لوگوں میں ہونے والی باتوں کا اُڑتا اڑتا علم ہوا اور اس نے عبدالرحیم خان کو ہمیشہ کے لیے وادی سے باہر بھیج دیا۔ عام لوگوں کو یہ پتا تھا کہ وہ سردار کے کسی کام سے گیا ہے مگر میں اپنی جان سوزی سے پائندہ گل کے اتنے قریب ہوچکا تھا کہ اس نے مجھے اصل بات بتادی۔ میری ہدایت پر قندوز خان نے پائندہ گل کے فیصلے پر پوشیدہ تنقید کرنے والوں سے ملنا شروع کردیا۔ ان میں سے ایک نے کہا کہ پائندہ گل سچا انصاف کرنا چاہتا تو پیرکوٹ کے نباض کو طلب کرسکتا تھا۔ وہ شنگارا ویلی کا اکلوتا حکیم ہے اور کلائی کی دھڑکتی ہوئی رگ پکڑ کر تین دن کا کھایا پیا تک بتادیتا ہے۔ وہ پورے یقین سے فیصلہ دے سکتا تھا کہ ارسلا خان اور عبدالرحیم خان میں سے کس نے زرتاشہ کے ساتھ درندگی کی تھی مگر وہ بعد کی باتیں تھیں۔ ایک بادرانی کی پرنور پیشانی پر رسوائی کی سیاہی مل دی گئی تھی۔ میں نے کابل میں جنت گل کے پیچھے آدمی لگایا اور اس نے جنت گل کو پشاور جا کر عبدالرحیم خان پر ڈورے ڈالنے پر آمادہ کرلیا۔ وہ خود بھی اپنی پسند کے کسی شنگاری کی تلاش میں رہتی تھی۔ وہ ایک لمبی کہانی ہے۔ اس کا مختصر انجام تمہارے سامنے ہے کہ آخر کار جنت گل کے ہاتھوں عبدالرحیم خان اپنے کیفر کردار کو پہنچ گیا" اس نے رک کر ایک اور گھونٹ لیا اور اس کا گلاس آدھے سے بھی کم رہ گیا۔

"یہ تفصیلات سن کر میرا رواں رواں لرز اٹھا ہے" میں نے جھرجھری لے کر کہا "یقین نہیں آتا کہ دل نواز اور سادہ لوح پہاڑی لوگوں کی زندگی میں بھی ایسے ہیبت ناک واقعات رونما ہوتے ہوں گے۔"

"ایسا برسوں' قرنوں میں کبھی کبھار ہی ہوتا ہے۔ انسان اپنے گندے کھیل کھیلتا ہے اور قدرت کی بے آواز لاٹھی اپنے معجزے دکھاتی رہتی ہے" وہ بولا "عبدالرحیم خان کی ماں اور پائندہ گل کی بہن بھی چند ہفتوں کی بیماری کے بعد چٹ پٹ مرگئی۔ اس نے مرنے سے پہلے بہت سے لوگوں کے سامنے کہا کہ میں جھوٹی تھی۔ اس نے تین مرتبہ اس جملے کی تکرار کی لیکن کوئی وضاحت نہیں کی۔ سننے والوں نے وہ بات آگے پھیلادی کہ اس مکار بڑھیا نے زرتاشہ کے معاملے میں اپنی جھوٹی گواہی کا اعتراف کرلیا ہے۔ اس کے بعد قندوز خان سے ملنے والوں کی تعداد تیزی سے بڑھنے لگی اور ہم نے پائندہ گل کو ہراساں کرنے کے لیے چوری چھپے گھنٹیاں بجوانے کا سلسلہ شروع کردیا جو آج اس کی موت پر ختم ہوا ہے۔ تینوں ظالم اور بے ایمان جہنم واصل ہوچکے ہیں۔ ارسلا خان آج بھی زندہ ہے۔ اب میں چاہتا ہوں کہ جنت گل کو یہاں لاؤں۔ تم اس کے اعتراف کا انکار کرو اور پھر میں اس کو ارسلا خان کے حوالے کردوں۔ عبدالرحیم خان کی ماں کے اعتراف کے بعد شنگارا کے بیشتر لوگوں کو ارسلا خان کی بے گناہی کا یقین آچکا ہے۔ وہ اسے قبول کرلیں گے۔ کینہ پرور اور حاسد فطرت والے لوگ میری طاقت کی وجہ سے اپنی زبانیں بند رکھیں گے اور میں اس کے خلاف صادر کیا ہوا' پائندہ گل کا فیصلہ منسوخ کردوں گا۔ اسی طرح ارسلا خان اور بادران کی عزت بحال ہوسکتی ہے۔ پائندہ گل کے خاندان میں اب کوئی مرد باقی نہیں رہا۔ جو عمر رسیدہ عورتیں رہ گئی ہیں' وہ ہر برس جنت گل کی کوکھ سے ارسلا خان کے بادرانی بیٹے یا بیٹی کی پیدائش کی خبر سن کر انگاروں پر لوٹتی رہیں گی۔"

"لڑکیاں تو مائیں ہی بنتی ہیں۔ اس سے انہیں کیا تکلیف ہوگی؟" میں نے حیرت سے پوچھا۔

"تم آج سب کچھ جان لینے پر تُل گئے ہو؟" اس کے ہونٹوں پر پہلی بار پھیکی اور ہلکی سی ہنسی نمودار ہوئی "پائندہ گل کا پورا خاندان اپنی برتری کے گھمنڈ میں برباد ہوا ہے۔ یہ لوگ شنگارا ویلی کے دوسرے قبیلوں کی لڑکیاں تو بیاہ لاتے تھے مگر انہوں نے پچھلے پچاس سال سے اپنی کوئی لڑکی کسی دوسرے قبیلے میں نہیں بیاہی۔ اپنی لڑکیوں کو خاندان میں کھپانے کے لیے وہ چار چار شادیاں کرتے رہے مگر قدرت بھی ان میں لڑکوں سے زیادہ لڑکیاں پیدا کرتی رہی۔ یہ پچاس برس میں پہلا واقعہ ہوگا کہ پائندہ گل کے خاندان کی کوئی جائز یا ناجائز لڑکی بادران والوں کی بہو بنے گی۔ پہاڑوں میں بسنے والوں کے لیے یہ بھی اعزاز کی بات ہوگی۔ اسی لیے میں تمہیں جھوٹ بولنے کی ترغیب دے رہا ہوں۔ وہ ایک بار ارسلا خان کے نکاح میں آگئی تو وہ جنت گل کے سارے کس بل نکال دے گا۔ تم جانتے ہو کہ پائندہ گل نے تمہیں کیوں نہ مارا اور جنت گل کے لہو کا پیاسا کیوں ہورہا تھا؟"

میں نے اپنے سر کو نفی میں ہلادیا۔ قبائلی رسوم ورواج کے سامنے دلیل کا کوئی کام نہیں تھا۔

"جنت گل کابل میں جو کچھ کہتی پھر رہی ہے' اس کے نتیجے میں تم پائندہ گل کے نیم داماد بن چکے تھے اور ہماری طرف داماد پر وار کرنا بزدلی' کمینگی اور گالی سمجھا جاتا ہے۔ تم اسے تھپڑ بھی ماردیتے تو وہ تمہارے سامنے سر نہیں اٹھا سکتا تھا اور جنت گل پر اسے اس لیے غصہ تھا کہ اس نے پائندہ گل کا خون ہوتے ہوئے بھی تم جیسے اجنبی سے اپنا رشتہ استوار کیا تھا۔ وہ زندہ رہتی تو کسی سے بھی شادی کرکے پائندہ گل کی عزت کو خاک میں ملا سکتی تھی۔ وہ عقل مند ہوتا تو اپنی جوانی کی بھول کو اسی وقت زندہ درگور کردیتا جب لوگوں نے جنت خانم کی شکل وصورت میں پائندہ گل کی شباہت دیکھ کر اسے جنت گل کہنا شروع کیا تھا۔ شاید اسے یہ تسکین ملتی ہوگی کہ اس کی سگی اولادیں زیادہ دن نہ جی سکیں تو جنت گل کی بھرپور زندگی اس کی مردانگی کا انعام ہے جسے اپنی قدرتی عمر پوری کرنے کا حق ملنا چاہیے۔"

"تمہاری ساری باتوں نے مجھے متاثر کیا ہے۔ میں وہی کروں گا جو تم چاہو گے۔ مگر مجھے یہ کہنے دو کہ آج گالان میں جو خونریز معرکہ ہوا ہے' اس کی بنیاد تم نے نہیں رکھی تھی..."

اس نے برہمی سے میری بات درمیان میں سے ہی اڑادی "یہ تم کیسے کہہ سکتے ہو؟ قندوز خان ہر بات کا گواہ ہے۔ سرداری میں

نے حاصل کی ہے۔ اس خونی انقلاب کا بانی کوئی اور ہوتا تو وہ کسی بھی قیمت پر مجھے آگے بڑھ کر شنگاریوں سے بیعت نہ لینے دیتا۔ اس وقت میری جگہ وہ بُرا جمان ہوتا۔"

"تم بلاوجہ جذباتی ہو رہے ہو۔ میں یہ بتانا چاہ رہا تھا کہ یہ بنیاد عبدالرحیم خان نے اس وقت ڈالی تھی جب اس نے بدنیتی سے زرتاشہ کے سر پر ضرب لگائی تھی۔ اس ضرب نے آج اس کے ماموں کے سارے جاہ و جلال کو پاش پاش کر کے رکھ دیا ہے۔"

وہ خوش ہو کر بولا "اسی لیے میں کہتا ہوں کہ تم شہری لوگ سیدھی بات کرنے کے بجائے الفاظ کی جلیبیاں بناتے ہو۔ اس میں سے مطلب تلاش کرنا پڑتا ہے جب کہ ہم لوگوں کی آدھی بات بھی اپنی جگہ پر مکمل اور سیدھی ہوتی ہے۔ اس میں کوئی ہیر پھیر نہیں ہوتا۔ بہرحال، مجھے خوشی ہے کہ تم مجھ سے متفق ہو گئے ہو۔"

"میں جنت گل کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر اس کے دعوے کی تردید کروں گا۔ مگر یہ بتاؤ کہ ارسلا خان کو تم کیسے یہاں لاؤ گے؟ تم اس چھاپے کو بھول رہے ہو جس میں تم لوگوں کی ہیروئن پکڑی گئی تھی اور ہیروئن کی واپسی یا اس کی قیمت کی ادائیگی کے لیے عبدالرحیم خان نے مجھے یرغمال بنائے رکھا تھا۔"

"ارسلا خان کا اس چھاپے سے کیا تعلق نکل آیا؟" اس نے پوچھا۔

"تمہیں معلوم ہے کہ وہاں تباہی پھیلنے کے بعد سب کچھ پولیس کے قبضے میں چلا گیا۔ اخباروں سے مجھے معلوم ہوا تھا کہ وہاں سے زخمی حالت میں پکڑے جانے والوں میں ارسلا خان بھی تھا۔ اب تک اسے کسی نہ کسی جیل میں پہنچا دیا گیا ہوگا۔ تم اسے وہاں سے کیسے لاؤ گے؟" میں نے اسے اصل مسئلے سے آگاہ کرتے ہوئے کہا۔

"تم فکر نہ کرو" وہ مسکراتے ہوئے بولا "تمہاری کوئی جیل پائندہ گل کے قید خانے سے زیادہ خطرناک اور محفوظ نہیں ہو سکتی۔ وہ یہاں سے فرار ہو گیا تھا تو وہاں سے بھی نکال لیا جائے گا۔ ہم لوگ اپنی داڑھیاں بے ترتیبی سے بڑھا کر الجھا لیں تو ہم سب ایک جیسے نظر آنے لگتے ہیں۔ ایک دفعہ میرا کوئی آدمی جیل میں اس سے مل کر، اس کا حلیہ دیکھ آئے۔ اس کے چند دن بعد ہی ارسلا خان کا کوئی ہم شکل جیل میں بیٹھا ہوگا اور وہ گالان کی طرف آ رہا ہوگا۔"

"یعنی تم جیل میں آدمی ہی بدل دو گے؟" میں نے حیرت سے سوال کیا۔

"اس کا ہم شکل ملاقاتی جا کر وہیں رہ جائے گا۔ ملاقاتی کے بجائے ارسلا خان اطمینان سے باہر آ جائے گا۔ پہرے والے بس صورت شکل دیکھتے ہیں۔ اسی میں وہ دھوکا کھا جائیں گے۔ دوسرا آدمی ارسلا خان نہیں ہوگا اس لیے کوئی بھی اچھا وکیل پہلی ہی پیشی پر اسے عدالت سے آزاد کرا لے گا" اس نے اطمینان سے کہا اور مجھے بے اختیار مافیا کے سیٹھ حبیب جیوانی کا نام یاد آ گیا۔ اسے بھی جرمنی میں قید کی سزا سنائی گئی تھی مگر سسلی کی مدر مافیا نے اس کے ایک ہم شکل کو بھاری معاوضے پر جیل میں پہنچا کر اسے وہاں سے باہر نکال لیا تھا۔

"اور لباس؟ جیل میں قیدیوں کو نمبروں والا خاص لباس پہنایا جاتا ہے۔ ہو سکتا ہے کہ ارسلا خان کو ہتھکڑیاں بھی لگائی گئی ہوں۔ یہ کھیل اتنا سادہ اور سہل نہیں ہوگا جتنا تم سمجھ رہے ہو۔"

"جیلوں میں خالص چرس اور ہیروئن سونے کے دام بکتی ہے۔ یہ دونوں ہمارے گھر کی کھیتیاں ہیں۔ ان کی رشوت دے کر ہر کام کرا لیا جائے گا۔ پیسے سے زیادہ خالص مال کی عزت کی جاتی ہے۔"

"میری دعا ہے کہ تمہیں اپنے مقصد میں کامیابی حاصل ہو۔ قندوز خان کہاں غائب ہے؟ وہ شام سے نظر نہیں آیا" بات پوری کرتے کرتے، اچانک مجھے قندوز خان یاد آ گیا۔

"صندل خان تمہاری واپسی کے انتظار میں باہر بیٹھا اونگھ رہا ہوگا اور قندوز خان تمہارے ساتھیوں سے اس کے بارے میں معلومات حاصل کر رہا ہوگا۔ اس نے تم لوگوں کے ساتھ کافی وقت گزارا ہے۔ کیا کہتا ہے؟"

"وہ پائندہ گل کا خاص آدمی تھا اس لیے تبدیلی پر مایوس نظر آ رہا ہے لیکن تمہاری اطاعت قبول کر چکا ہے۔"

صبغت اللہ زہریلے انداز میں اتنی زور سے ہنسا کہ اس کے سفید دانتوں کی قطاریں چمکنے لگیں "پائندہ گل کا خاص آدمی میں تھا۔ وہ میرا ماتحت تھا۔ میں اس کے دماغ کو خوب اچھی طرح جانتا ہوں۔ ذرا محنت اور توجہ سے اسے ٹٹولو اور نتیجے سے مجھے آگاہ کرو۔ مجھے اس پر بالکل بھروسا نہیں رہا ہے۔ میں نے دانستہ اسے باہر بٹھائے رکھا ہے۔"

وہاں بھی محلاتی سازشوں اور جوڑ توڑ کا سلسلہ پوری شدت سے چل رہا تھا۔ مجھے یوں محسوس ہوا جیسے ایک دوسرے کے عزائم پر ہر لحہ شک و شبہ کرنا، مخالفوں کو آپس میں لڑوانا اور حلیفوں کو ہر لمحے کڑی آزمائشوں سے گزارنا اقتدار قائم رکھنے کے لیے ناگزیر تھا۔ اقتدار بڑی سلطنت کا ہو یا شنگاراویلی جیسے محدود قبائلی علاقے کا، اس کی خوراک ہمیشہ یکساں رہتی ہے۔ وہ سب سے پہلے باہمی اعتماد کو نگلتا ہے اور جوں جوں حکمراں ہر بات کو شبہ کی نظر سے دیکھنے کے عادی ہوتے جاتے ہیں، ان کی کرسی مستحکم ہوتی چلی جاتی ہے۔ جس دن وہ کسی پر اعتبار کر بیٹھتے ہیں، انہیں کرسی سے نیچے گھسیٹ کر کوئی اور اوپر چڑھ بیٹھتا ہے۔

"وہ باہر رک کر انتظار کرنے پر مُصر تھا مگر میں نے اسے واپس جا کر آرام کرنے کی اجازت دے دی تھی۔ پتا نہیں وہ بیٹھا ہے یا چلا گیا" میں نے کہا "ویسے وہ بہت گہرا معلوم ہوتا ہے۔ اپنے دل کی بات آسانی سے زبان پر نہیں لائے گا۔ اس کے ساتھ کوئی چال چلنی پڑے گی۔"

"اس سے اچھی چال کیا ہوگی کہ تم میری برائیاں کر کے مجھ پر

...عتادی ظاہر کرنے لگو۔ اس کے دل میں چور ہوا تو وہ تم کو اپنا ...ل سمجھ کر فوراً کھل جائے گا۔" اس نے کسی تردد کے بغیر

...سازشی خود اپنے دام میں آ گیا تھا۔ میں پہلے ہی وہ حربے ...ال کر کے صندل خان کو اپنے اعتماد میں لے چکا تھا۔ صبغت ...ی اجازت سے مجھے ایک کھلی ڈھال میسر آ گئی تھی۔ صندل ...یری مٹھی میں آ چکا تھا مگر میں بے خوف ہو گیا تھا۔ وہ میری ...کھول بھی دیتا تو میں صبغت اللہ کے سامنے جواز پیش کر سکتا ...میں نے صندل خان کی نیت کا اندازہ لگانے کے لیے، اس کی ...ت کے مطابق مخالفانہ باتیں کی تھیں۔

گالان کی اس چھوٹی سی سطح مرتفع پر میں اقتدار کے ایسے ...اور رموز سے واقف ہو رہا تھا جو پہلے میری سمجھ میں نہیں آتے ...صبغت اللہ نے اپنی مجبوری کے تحت مجھے ایک ایسا ہتھیار ...پ دیا تھا کہ میرے اور صندل خان کے کسی تنازعے کی صورت ...اس کے فرشتے بھی سچ اور جھوٹ کا سراغ نہیں لگا سکتے تھے۔ ...ہمیشہ اور ہر جگہ یہی ہوتا تھا کہ حکمراں اپنی ناگزیر ضرورتوں کی ...ے اپنے گرد مصلحتوں کا ایسا بھیانک جال بن لیتے ہیں کہ ...سچ کا پتا چلتا ہے نہ جھوٹ کی تمیز باقی رہ جاتی ہے۔ وہ سب ...ں کے درمیان رہ کر بھی حقائق سے بے خبر رہتے ہیں۔ سچ اور ...ٹ کے ملغوبے میں سے حقیقت کو برآمد کرنے کے لیے انہیں ...اعتماد کے لوگوں پر انحصار کرنا پڑتا ہے اور اگر ان کی صفوں ...مجھ جیسا کوئی شاطر اور خود غرض شخص گھس جائے تو انہیں ایسی ...لے جا کر مار سکتا ہے جہاں پانی بھی نہ ملے۔

"تمہاری یہ تجویز بہت معقول ہے" میں نے پورے خلوص ...ے کہا "میں اس پر ضرور عمل کروں گا۔"

"اُس کے ساتھ نرمی نہ برتو۔ اسے خوب رگڑو۔ اب وہ پرانا ...دل خان نہیں بلکہ تمہارا خدمت گار ہے۔ میں تمہارے ذریعے ...اُس کی اصل اوقات کا احساس دلانا چاہتا ہوں۔ ایک بار وہ ...رے بالکل ٹوٹ پھوٹ جائے گا تو میں دوبارہ اسے اپنے لیے ...کار بنالوں گا۔ وہ اپنے دل کی گہرائیوں سے میری بالادستی قبول ...لے تو بہت کام کا آدمی ثابت ہو سکتا ہے" وہ رفتہ رفتہ مجھ سے ...کھلتا جا رہا تھا۔

"تمہاری ہر ہدایت میرے دل پر نقش ہوتی جا رہی ہے" میں ...نے اسے یقین دلایا "میں اب تمہارے مقاصد کو سمجھتا جا رہا ہوں۔ ...قیام کے چند دنوں میں، میں ان ہی کے مطابق کام کرنے کی ...کوشش کروں گا... ویسے ایک بات اب بھی میرے ذہن میں چبھ ...رہی ہے کہ تم جنت گل کے معاملے میں اس کے ماں باپ کو بلاوجہ ...گھسیٹ رہے ہو۔ تم جنت گل کو یہاں لا کر بھی اپنا مقصد حاصل ...کر سکتے ہو۔ ان دونوں کی کوئی افادیت میری سمجھ میں نہیں آتی۔"

"بہت سی باتیں آسانی سے سمجھ میں نہیں آتیں۔ جس کا معاملہ ہو، اس کے ذہن میں پوری بساط جمی ہوئی ہوتی ہے اور اسے معلوم ہوتا ہے کہ کس مہرے کو کب اور کہاں کھیلنا ہے۔ میں اپنے لوگوں کو بہت اچھی طرح جانتا ہوں۔ جنت گل کے وجود اور اصلیت سے صرف سترہ شنگاری واقف تھے۔ یہ وہ لوگ تھے جو پائندہ گل کے کاموں کے لیے باہر آتے جاتے رہتے تھے۔ ان لوگوں نے باہر کی ہر بات اپنے سینوں میں دفن رکھی ہوئی ہے۔ ان میں سے پانچ آج کی لڑائی میں مارے گئے۔ اب ان کی تعداد بارہ رہ گئی ہے۔ ان بارہ میں، میرے علاوہ قندوز خان اور صندل خان بھی شامل ہیں۔ ان کے علاوہ، پوری وادی کے ہزاروں باسیوں میں پائندہ گل کی عزت اور ساکھ تھی۔ اب اچانک اعلان کیا جائے گا کہ کابل میں پائندہ گل کی ایک ناجائز بیٹی پل رہی تھی جو اب جوان ہو چکی ہے تو لوگوں پر بے یقینی اور حیرتوں کے پہاڑ ٹوٹ پڑیں گے۔ وہ جنت گل کی شکل میں پائندہ گل کی ہلکی سی شباہت کی بنیاد پر اسے اپنے پرانے سردار کی اولاد نہیں مانیں گے۔ تم ہماری عورتوں کے مزاج سے واقف نہیں ہو۔ اس اعلان سے ان میں بھونچال آ جائے گا۔ وہ سر جوڑ کر زبان درازیاں اور طعنہ زنی کریں گی۔ پوری وادی میں بے چینی اور اضطراب کی ایک نئی لہر دوڑ جائے گی۔ لوگ اس اعلان کو میری بدنیتی سمجھ کر میرے خلاف بھی ہو سکتے ہیں۔ میں اپنے اقتدار کے لیے اتنا بڑا خطرہ مول نہیں لے سکتا اسی لیے کچا کھیل نہیں کھیلنا چاہتا۔ گالان کی پوری بستی کے سامنے جنت گل کو پیش کیا جائے گا تو لنگڑا ضیغم خان برسوں پرانی، اس رات کی کہانی سنائے گا جب پائندہ گل اس کے گھر میں مہمان ہوا تھا۔ اس کی بیوی اس کی باتوں کی تصدیق کرے گی۔ ضیغم خان دروغ گوئی کرے گا تو وہ اشاروں سے سب کو آگاہ کر دے گی اور ضیغم خان راست گوئی پر آمادہ نہ ہوا تو اسے بھرے مجمع میں الٹا ٹانگ دیا جائے گا۔ جب تک اس کہانی کے سارے زندہ کردار گالان میں جمع نہیں ہوتے، حجتیں تمام نہیں ہوں گی۔ اتنے ثبوتوں کے بعد کوئی جنم جلی بوڑھی بھی حقیقت سے منہ نہیں پھیر سکے گی اور میں کسی کو حرف گیری کا موقع دیے بغیر ارسلا خان اور بادرانیوں کے سر پر برتری کا تاج سجادوں گا۔ میرے منصوبے کی پرامن تکمیل کے لیے ان تینوں کا یہاں لایا جانا ناگزیر ہے۔"

"تم واقعی بہت دور کی کوڑی لاتے ہو" میں اس کی دوراندیشی کی داد دیے بغیر نہ رہ سکا "مجھے حیرت ہے کہ تم جیسا زیرک شخص اتنے عرصے تک شنگاراویلی کا سردار کیوں نہیں بن سکا۔ پائندہ گل کے خاندان کی عزت و آبرو پر تمہارا پہلا ہی وار کاری اور آخری ثابت ہوگا۔ سب کے منہ بند ہو جائیں گے اور پائندہ گل کی آزاد خیال بیٹی بادرانیوں کی بہو بنا کر پابندیوں میں جکڑ دی جائے گی۔ تمہارا منصوبہ واقعی شاندار اور بے داغ ہے۔"

وہ نسل در نسل چلنے والی قبائلی دشمنیوں اور رقابتوں کی ایک المناک کہانی تھی۔ زرتاشہ شاید گالان کی کوئی عام سی چرواہی تھی

لیکن اس کے سر سے بہنے والے خون نے بڑے ہولناک انداز میں اپنا رنگ دکھایا تھا۔ وہ خود مری' عبدالرحیم خان مارا گیا' ستاسی شنگاری جنگ میں پیوند خاک ہوئے۔ اور اب جنت گل کو انتقام کی اس بھڑکتی ہوئی آگ کا ایندھن بنایا جانے والا تھا۔ وہ کابل جیسے روشن خیال شہر میں' پائندہ گل کے بھیجے ہوئے پیسوں سے پروان چڑھتی رہی۔ وہ تعلیم یافتہ' آزاد خیال اور قدرے رنگین مزاج تھی۔ وہ اپنی مرضی سے پیدا نہیں ہوئی تھی بلکہ مجبوریوں اور غلط فہمیوں کی پیداوار تھی اور اسے اچھی طرح بتا دیا گیا تھا کہ زمین پر اس کا وجود ایک گالی سے کم نہیں ہے۔ اس نے عزت دار بننے کی کوئی کوشش کرنے کے بجائے پوری طرح کیچڑ میں لتھڑ کر زندہ رہنے کو ترجیح دی تھی اور اپنی زبان سے اپنے نسب کی کمزوری کا برملا اعتراف کرتی پھرتی تھی۔ میرے معاملے میں بھی اس نے پوری بے خوفی کا اظہار کیا تھا۔ مجھے یہ سوچ کر ہی خوف آنے لگا تھا کہ جنت گل جیسی نرم و نازک لڑکی کو ایک تندخو اور سخت گیر بادرانی کے حوالے کیا جانے والا تھا۔ پوری زندگی آزاد رہنے والی وہ لڑکی' شنگارا دیلی کی کڑی پابندیوں اور گھٹے ہوئے ماحول کو کسی بھی قیمت پر قبول نہیں کر سکتی تھی لیکن میں اقتدار کے تازہ نشے میں مست' صبغت اللہ خان کی رضا کے خلاف زبان ہلا کر اپنی اور اپنے تینوں ساتھیوں کی عافیت خطرے میں نہیں ڈال سکتا تھا۔ میرا ذہن جنت گل کے مسکراتے ہوئے شریر چہرے اور دلفریب پیکر میں الجھا رہا مگر میں اس بارے میں کچھ کہے بغیر سردار صبغت اللہ سے اِدھر اُدھر کی باتیں کرتا رہا۔ میری غائب دماغی زیادہ دیر تک اس سے پوشیدہ نہ رہ سکی اور اس نے چبھتے ہوئے لہجے میں مجھے ٹوک ہی دیا۔

"تم کہاں کھوئے ہوئے ہو؟ میں کچھ کہہ رہا ہوں اور تم کچھ اور ہی بول رہے ہو۔"

"معاف کرنا۔ میرے دماغ پر نیند کا غلبہ ہو رہا ہے۔ کل کی پوری رات کی بے خوابی اب پریشان کر رہی ہے۔"

"میں بھی کئی راتوں کا جاگا ہوا ہوں لیکن تمہاری طرح بہک نہیں رہا۔ خیر! تم جاؤ اور آرام کرو۔ صندل خان کے بارے میں' میں نے جو کچھ کہا ہے' اسے ذہن میں رکھنا۔ میں اس کی طرف سے فکرمند ہوں۔"

"تم بالکل بے فکر رہو۔ اب یہ میرا اپنا کام ہے" میں وہاں سے چلنے کے لیے اٹھ کھڑا ہوا۔

"یہاں جو باتیں ہوئی ہیں' وہ اپنی ذات تک محدود رکھنا۔ میں کسی سے نہیں ڈرتا لیکن خفیہ باتوں کی غیر ضروری تشہیر کو پسند نہیں کرتا۔ لوگوں کو فارغ وقت میں سر جوڑ کر باتیں بنانے کا موقع مل جاتا ہے۔"

"میں سب کچھ چھپا لوں گا مگر جنت گل کے بارے میں اپنے انحراف کا کوئی نہ کوئی سبب تو اپنے ساتھیوں کو بتانا ہی ہوگا۔ وہ تینوں میرے ساتھ پیش آنے والے واقعات سے آگاہ ہیں" میں نے کہا۔

"تم اپنے ساتھیوں کو اعتماد میں لے سکتے ہو لیکن کسی اور سے بات کرنے کی ضرورت نہیں۔ یہ نہ سمجھ لینا کہ قندوز خان میرا آدمی ہے تو اس سے کوئی بات چھپانے کی ضرورت نہیں ہے" اس نے تاکید کرتے ہوئے کہا۔

میں اس کو یقین دہانی کرا کے وہاں سے رخصت ہو گیا۔ باہر آیا تو ہال میں لوگوں کا جوش و خروش ٹھنڈا پڑ چکا تھا۔ بیشتر شنگری قالینوں پر آڑے سیدھے لیٹے ہوئے گہری نیند سو رہے تھے۔ بعض کے خراٹوں نے فضا میں ناخوشگوار شور پیدا کیا ہوا تھا۔ جو جاگ رہے تھے' وہ بھی ست اور غنودگی کا شکار نظر آ رہے تھے۔ بالٹیوں والے دونوں ساقیوں کا پتا نہیں تھا۔ صندل خان بھی موجود نہیں تھا۔

وہاں نظر آنے والی نمایاں تبدیلیوں سے مجھے اندازہ ہوا کہ میں نے صبغت اللہ کے پاس کافی دیر لگا دی تھی۔

میں اپنا راستہ بناتا ہوا' وہاں سے نکلا تو حویلی میں رات کا طلسماتی سحر طاری تھا۔ روشن مشعلوں کی تعداد کم کر دی گئی تھی اور اِکا دُکا محافظوں کی موجودگی کے علاوہ' راستوں میں کوئی متنفس موجود نہیں تھا۔ پچھلی شب بیداری اور پھر صبر آزما جنگ کی تھکاوٹ سے نڈھال ہو کر سارے ہی لشکری گہری نیند سو چکے تھے۔

اپنی قائم کی ہوئی نشانیوں کے سہارے' مجھے مہمان خانے تک پہنچنے میں کوئی دشواری نہیں ہوئی۔ وہاں بھی وسطی ہال میں ویرانی راج تھا البتہ فضا میں تمباکو کی خوش گوار مہک رچی ہوئی تھی۔ مجھے حقہ بھی نظر آ گیا جو شاید ہماری فرمائش کے نتیجے میں وہاں فراہم کیا گیا تھا۔ میں نے حقے کی اسٹک اٹھا کر ایک گہرا کش لیا تو وہ ٹھنڈا ہو چکا تھا۔ اس کی بڑی سی چلم میں رکھے ہوئے انگارے راکھ میں تبدیل ہو چکے تھے۔ اس سرسری سے جائزے سے نمٹ کر میں اپنی خواب گاہ کی طرف چل دیا۔ وہاں وہ تینوں بیدار اور میرے بارے میں فکرمند تھے۔

مجھے دیکھتے ہی انہوں نے اپنے بستر چھوڑ دیے اور واپسی میں اتنی زیادہ تاخیر کے بارے میں مجھ پر سوالات کی بھرمار کر دی۔ میں خاموش مسکراہٹ کے ساتھ ان کی بولیاں سنتا رہا پھر ان کی بات کا جواب دینے کے بجائے قندوز خان کے بارے میں سوال کر ڈالا۔ غزالہ نے بتایا کہ وہ بہت دیر تک ان تینوں کے ساتھ اور میرے طویل انتظار سے اکتا کر تھوڑی ہی دیر پہلے ستانے کے لیے گیا تھا کیونکہ میرے فارغ ہونے کے بعد اسے دوبارہ صبغت اللہ کے پاس جانا تھا۔

ان لوگوں سے مجھے معلوم ہوا کہ صندل خان اس مہمان خانے کے دو خدمت گاروں کے ساتھ دوسری قطار کی ایک خواب گاہ میں سو رہا تھا۔ سونے کے لیے جانے سے پہلے' اس نے ہمارے کمرے میں پانی وغیرہ کا بندوبست کر دیا تھا مگر پھر بھی تاکید کی تھی کہ کسی کو کسی چیز کی ضرورت ہو تو اسے جگا لیا جائے۔ اپنے ... خرابی کی وجہ سے وہ بے چارہ ہم لوگوں کے حاکم ... ایک حقیقی خدمت گزار کے درجے پر ... میری واپسی سے ان لوگوں کی فکرمندی ... میں سب کچھ جان لینے کا تجسس بیدار ہو گیا تھا۔ میں نے ... لگا کہ انہیں فوراً اعتماد میں نہیں لیا گیا تو وہ رات کے بقیہ ... میں بھی نہیں سو سکیں گے۔

"انقلاب آتے ہی یہاں سازشوں کا سلسلہ چل نکلا ہے" میں ... دونوں دروازوں کا جائزہ لینے کے بعد دھیمی آواز میں کہا۔ شام ... میں خود کو وہاں مطمئن اور پُراعتماد محسوس کر رہا تھا لیکن رات ... اندھیرا اور سناٹا پھیلنے کے بعد میرے دل میں عجیب سی' خوف اور بے اعتمادی سرایت کرنے لگی تھی۔

"ایک طرف صندل خان ہم سے ساز باز کر رہا ہے تو دوسری طرف صبغت اللہ مجھ سے اُس کی مخبری کرانی چاہ رہا ہے۔" میں نے اپنی بات جاری رکھتے ہوئے کہا "یہ ان کی آپس کی باتیں ہیں مگر ان حالات میں ہماری پوزیشن بہت مخدوش ہو گئی ہے۔ ہمیں بہت ... کر اگلے چند روز گزارنے ہوں گے کیونکہ یہاں سے فوری طور ... ہماری گلوخلاصی کی کوئی امید نہیں ہے۔ صبغت اللہ چند دنوں ... ہمیں یہاں سے جانے کی اجازت دے گا۔"

"مگر کیوں؟ یہ معاہدے کی خلاف ورزی ہے" ویرا اکھڑ کے بولی ... سے طے ہوا تھا کہ تم بغاوت میں اس کا ساتھ دو گے تو وہ ہم ... کو فوراً یہاں سے رہائی دے دے گا۔ اب وہ اپنی بات سے ... پھر رہا ہے؟"

"وہ مکار اور سازشی ذہن کا مالک ہے اس لیے میں اس سے یہ ... نہیں کر سکا" میں نے ایمان داری سے کہا۔ "وہ کینہ پرور بھی ... میری بات دل میں رکھ کر' بعد میں اس کا بدلہ لے سکتا ہے۔ ... کو یہ پتا چل جائے کہ آج کی لڑائی کی اصل وجہ کیا تھی تو حیرت ... تمہاری آنکھیں پیشانیوں پر جا چڑھیں گی۔"

"ہمیں مزید چند روز یہاں روکنے میں اس کی کیا مصلحت ...؟" سلطان شاہ کی آنکھوں سے تشویش جھلک رہی تھی۔

"وہ چاہتا ہے کہ میں جنت گل کی پھیلائی ہوئی بدنامی کی تردید ... " میں اپنی بات پوری نہیں کر سکا۔ ویرا نے درمیان میں ... میری بات اچک لی تھی۔

"یعنی جو کچھ ہوا تھا' اس سے انکار کر دو؟" ویرا کو میری بات پر یقین نہیں آ سکا تھا۔

"بدقسمتی سے ایسا ہی ہے" میں نے سر جھکا کر افسردگی سے کہا ... جنت گل کو جھوٹی مگر باعفت قرار دے کر اپنے تایا زاد بھائی کے ... بنانا چاہتا ہے۔ نہ چاہتے ہوئے بھی مجھے اس کی مرضی کے ... سر جھکانا پڑے گا۔"

اس تکلیف دہ موضوع کے سامنے آتے ہی غزالہ میرے پاس سے ٹل کر بستر کی طرف چلی گئی۔ اسے اندازہ تھا کہ جنت گل کا ذکر مجھے اس کے سامنے شرمندگی سے دوچار کر دے گا۔ وہ مجھے ان دونوں سے کھل کر بات کرنے کا موقع دینا چاہتی تھی۔

"یہ تو انوکھی ہی بات ہے" ویرا تحیر زدہ آواز میں بولی "ان علاقوں میں ایسے جرم کا شبہ ہونے پر خون کی ندیاں بہہ جاتی ہیں اور تم کہہ رہے ہو تو وہ سب کچھ جھٹلا کر جنت گل کو اپنے خاندان میں لانا چاہتا ہے۔ یہ بالکل ہی الٹی بات ہے۔"

"یہ کینہ پروری' انا' انتقام اور اندھی دشمنی کے جذبات ہیں جو تمہاری سمجھ میں نہیں آ سکیں گے" میں نے ایک گہرا سانس لے کر کہا مگر پھر مجھے اختصار سے وہ باتیں دہرانی ہی پڑیں جو میرے اور صبغت اللہ کے درمیان ہوئی تھیں۔ پہلے میں نے زرتاشہ' عبدالرحیم اور ارسلا خان کی مثلث کا ذکر گول کر دیا لیکن اس کے بغیر کہانی مکمل نہیں ہوتی تھی۔ ان دونوں نے سوالات کی بھرمار کر دی کہ ارسلا خان شنگارا دیلی سے کراچی کیوں گیا تھا؟ صبغت اللہ کسی اور بادرانی کے بجائے اسی کو جنت گل کا شوہر کیوں بنانا چاہتا تھا؟

مجھے وہ دردناک قصہ بھی سنانا پڑ گیا۔ سارے واقعات ایک دوسرے سے اس قدر پیوستہ تھے کہ ان میں اختصار سے کام لینے کی گنجائش ہی نہیں تھی۔ رات کے دو بج چکے تھے اس لیے میں نے وقت بچانے کے لیے کچھ باتیں حذف کیں جس کے نتیجے میں سوالات کا سلسلہ شروع ہو گیا اور وہ رات ان ہی تذکروں کی نذر ہو گئی۔

صبح کا اجالا پھیلنے کے بعد صندل خان بیدار ہونے کے بعد ہماری طرف آیا تو ہماری بیٹھک دیکھ کر حیران رہ گیا۔ سگریٹوں کے ادھ جلے ٹکڑوں کا ڈھیر' بکھرے ہوئے گلاس' بے خوابی سے متورم آنکھیں ہماری رات کی کہانی سنا رہی تھیں۔

"کیا تم لوگوں نے پوری رات جاگ کر گزاری ہے؟" اس نے اندر آ کر حیرت سے پوچھا۔

"قیدی سے مہمان بننے کے بعد ہماری نیندیں اچاٹ ہو گئی ہیں۔" ویرا نے تھکن آلود مسکراہٹ کے ساتھ کہا۔

"مجھے سچ سچ بتاؤ کہ کیا بات ہے؟" اس نے ہمارے قریب بیٹھ کر رازدارانہ سرگوشی میں پوچھا۔

"صبغت اللہ فی الحال ہمیں جانے کی اجازت دینے پر آمادہ نہیں ہے" میں نے آہستگی سے کہا۔ اجالا بڑھنے کے ساتھ ساتھ' میرے اعتماد میں خود بخود اضافہ ہوتا جا رہا تھا۔ دل سے یہ خوف جاتا رہا تھا کہ کہیں کسی تاریک گوشے میں کوئی مخبر ہماری باتیں سننے کے لیے چھپا ہوا نہ ہو۔

"مگر کیوں؟" اس کے چہرے سے الجھن مترشح ہونے لگی "خان بابا تم سے ایک کام لینا چاہتا تھا اس لیے اس کے روکنے کا جواز تھا مگر سردار صبغت اللہ تم سے کیا چاہتا ہے؟ یہاں مہمان

داری بہت مہنگی پڑتی ہے کیونکہ ضرورت کی ہر چیز بیغا سرائے یا اس سے بھی آگے کے میدانی بازاروں سے لائی جاتی ہے اور صبغت اللہ کے حمایتیوں کی بڑی تعداد کے آجانے سے گالان میں موجود خوراک اور رسد کے ذخائر پر ایک دم دباؤ آگیا ہے۔ یہاں کا راشن بس آج ساتھ دے سکے گا۔ شام تک نیچے سے گاڑیاں رسد نہ لائیں تو کل صبح مرغن ناشتے کے بجائے سب کو صرف پانی پر گزارا کرنا ہوگا۔"

وہ بات میرے ذہن میں نہیں آسکی تھی۔ اضافی نفری کے خورد و نوش کے انتظامات کا معاملہ آسان نہیں تھا "ہاں۔ ہمیں روانہ کرکے وہ چار آدمیوں کا راشن بچا سکتا ہے مگر ایسا نہیں کررہا۔"

"ہوسکتا ہے کہ وہ کسی بہانے سے تم چاروں کو مروا دینے کے ارادے سے باندھ رہا ہو" اس کی آواز مزید دھیمی اور ہیجان آمیز ہوگئی "رات وہ اتنی دیر تک تم سے کیا باتیں کرتا رہا تھا؟ تم بہت دیر سے واپس آئے تھے۔ اس وقت میں پانی پینے کے لیے جاگا ہوا تھا۔"

اس بارے میں مجھے کچھ سوچنے کا موقع ہی نہیں مل سکا تھا اس لیے میں اس کے سوال پر سٹپٹا گیا مگر پھر فوراً ہی سنبھل کر بولا "میرے پہنچنے تک وہ بہت زیادہ شراب پی چکا تھا۔ بس بار بار ہم لوگوں کی دلیری اور ثابت قدمی کی تعریف کیے جارہا تھا۔ اس نے بڑی مشکل سے اقرار کیا کہ اس نے ہم سے باڑے میں پوشیدہ بموں کے ذخیرے کی حفاظت کا کام لیا تھا۔ وہ کہہ رہا تھا کہ ہماری اچھی طرح خاطر تواضع کیے بغیر وہ ہمیں واپس نہیں جانے دے گا۔"

"میرے بارے میں بھی ضرور کچھ نہ کچھ بات ہوئی ہوگی؟" وہ مضطرب ہوا جارہا تھا۔

"ہاں" میں نے اقرار کیا "اس نے مجھ سے دیکھ بھال کے بارے میں پوچھا تھا۔ اس کے لہجے سے اس خواہش کا اظہار ہو رہا تھا کہ وہ میری زبان سے تمہاری شکایت سننی چاہتا ہو۔ میں نے تمہاری مستعدی اور وفاداری کا ذکر کیا تو مایوسی سے اس کا چہرہ لٹک گیا تھا۔ اس کے دل میں تمہارے خلاف ضرور کوئی رنجش موجود ہے۔"

"یہ دو لومڑوں کا مقابلہ ہے" وہ زہرخند کے ساتھ بولا "میں اس کی رگ رگ سے واقف ہوں اور وہ میرے مزاج سے اچھی طرح واقف ہے۔ ہم زیادہ دنوں تک ایک ساتھ نہیں چل سکتے۔ تم یہاں سے فرار ہونے پر رضامند ہو تو میں آج ہی سے اپنا کام شروع کردوں؟ پانچ آدمیوں کے فرار کی تیاری میں خاصا وقت لگ جائے گا۔"

اس کی زبان سے وقت لگنے کی بات سنتے ہی میں نے بے دھڑک کہہ دیا "ہاں، تم تیاریاں شروع کردو۔ وقت کا زیاں مہلک ثابت ہوسکتا ہے۔ حالات سازگار نظر آئے تو فرار کا ارادہ ملتوی بھی کیا جاسکتا ہے۔"

"ٹھیک ہے" وہ میری ذو معنی رضامندی کا مفہوم سمجھے بغیر مطمئن ہوگیا۔ چند ثانیوں کی خاموشی کے بعد اس نے میری طرف دیکھتے ہوئے پوچھا "اس نے تم سے جنت گل کے بارے میں کوئی پوچھ گچھ کی تھی؟"

"میں اس کے لیے تیار تھا مگر اس نے وہ ذکر ہی نہیں" میں صاف مکر گیا۔ اس وقت تک صندل خان سے ہمارا بہت زیادہ میل جول رہا تھا مگر یہ بات ہمارے حق میں تھی کہ اس سے جنت گل والے معاملے پر کبھی بھی کھل کر بات نہیں ہوئی تھی۔ وہ پائندہ گل کا اندھا پیروکار تھا اور اس کے احترام کی وجہ سے جنت گل کے بارے میں بات کرنے سے گریزاں رہتا تھا۔ البتہ اتنا ضرور ہوا تھا کہ پائندہ گل سے اپنی ملاقات کے بعد میں نے اسے یہ بتا دیا تھا کہ پائندہ گل مجھے جنت گل کی تلاش میں کابل بھیجنے کا خواہاں تھا۔ یہ بات کسی بھی اعتبار سے قابل گرفت نہیں تھی۔

وہ سینہ بہ سینہ چلنے والی کہانیوں کے ذریعے اس بات سے بخوبی واقف رہا ہوگا کہ جنت گل میرے بارے میں کیا کہتی پھر رہی تھی لیکن یہ نوبت نہیں آئی تھی کہ مجھے صندل خان کے روبرو اس حقیقت کا اعتراف کرنا پڑتا۔ میری جو کچھ بات ہوئی، وہ پائندہ گل سے ہوئی تھی جو مارا جاچکا تھا۔ میرے منکر ہوجانے کی صورت میں اس جانب کوئی ایسا حریف موجود نہیں تھا جو یہ کہہ سکتا کہ میں نے پہلے جس بات کا اقرار کیا تھا، اُس سے منحرف ہو رہا تھا۔

"یہ ناقابلِ یقین ہے" صندل خان خود کلامی کے انداز میں بڑبڑایا "سردار ضرور بدل گیا ہے لیکن اس وادی اور یہاں کے باسیوں کی قدیم روایات بدستور برقرار ہیں۔ اس پر عبدالرحیم خان کے خون کا بدلہ واجب نہیں ہے لیکن شنگاریوں کی بدترین بے عزتی کا بدلہ لینا اس پر فرض ہے۔ پتا نہیں وہ اس بارے میں کیا سوچ رہا ہے؟ شاید وہ ضرورت سے زیادہ چالاک بننے کی کوشش کررہا ہے۔ بھول گیا ہے کہ اس طرح وہ خسارے میں رہے گا۔"

گفتگو بہت نازک موڑ پر آگئی تھی۔ شنگاریوں کی بدترین بے عزتی والا اشارہ واضح طور پر میری جانب تھا۔ اس بارے میں کوئی بھی سوال فیصلہ کن ثابت ہوسکتا تھا۔ میں نے ان کڑے لمحات کو ٹالنے کے لیے سگریٹ سلگانی شروع کردی۔ ویرا اور سلطان شاہ کو بھی اس موقعے کی نزاکت کا پورا پورا احساس تھا اس لیے وہ دونوں بھی خاموش ہی رہے۔ غزالہ پہلے ہی وہاں سے اٹھ کر عقبی دروازے سے باہر نکل چکی تھی۔

فضا پر کچھ دیر تک بوجھل اور اعصاب شکن خاموشی طاری رہی۔ ہم تینوں موضوع کے تسلسل سے خائف تھے اور وہ کسی گہری سوچ میں مستغرق تھا۔ آخر کار وہ بوجھل انداز میں اٹھ کھڑا ہوا اور بولا "اب میں چلتا ہوں، میں تیاری کے سلسلے میں یہاں سے کچھ گھنٹوں کے لیے غائب رہوں گا۔ تم سے کوئی پوچھے تو لاعلمی ظاہر کرتے ہوئے، بس اتنا کہہ دینا کہ تم نے مجھ سے سونف کی شراب کی خواہش ظاہر کی تھی۔"

"اور سونف کی شراب کا مطالبہ تمہاری غیر حاضری کا جواز پیدا کردے گا؟" ویرا نے پوچھا۔

"ہاں، اس کے لیے مجھے گالان سے نیچے جانا پڑے گا" وہ سنجیدگی سے بولا "سب جانتے ہیں کہ سونف کی بہترین شراب کچھنار والے بناتے ہیں اور وہ بستی یہاں سے ذرا لمبی مسافت پر ہے۔"

"جاؤ، میں سونف کی شراب کی منتظر رہوں گی" ویرا اونچی آواز میں بولی۔

وہ چلا گیا اور ایک بار پھر ہم تینوں وہاں بیٹھے رہ گئے۔ سب کی کھوپڑیوں پر جمود طاری ہو چلا تھا۔ شاید کسی کے پاس کہنے کے لیے کوئی بات باقی نہیں رہی تھی اس لیے تینوں خالی خالی نظروں سے ایک دوسرے کے چہرے تکتے رہے۔ لیکن وہ مضحکہ خیز صورت حال زیادہ دیر تک قائم نہیں رہی۔ ویرا نے اچانک ہی کھلکھلا کر ہنسنا شروع کردیا۔ اس پر پڑنے والا ہنسی کا دورہ اتنا شدید تھا کہ وہ میری یا سلطان شاہ کی کسی بات کا جواب نہیں دے سکی اور ہم دونوں کچھ نہ سمجھنے کے باوجود مسکرانے پر مجبور ہوگئے۔

"ہم تینوں ایک دوسرے کو ہونقوں کی طرح یوں دیکھ رہے تھے جیسے سب ایک دوسرے کے لیے اجنبی ہوں" غزالہ کے آنے پر ویرا نے اپنی بے ساختہ ہنسی کا سبب بتاتے ہوئے کہا "خاص طور پر سلطان شاہ ایسے برے برے منہ بنا رہا تھا جیسے اسے بدہضمی ہوگئی ہو۔ یہی دیکھ کر میری ہنسی چھوٹ گئی۔"

ویرا کی وضاحت سنتے ہی سلطان شاہ کے ہونٹوں سے مسکراہٹ کافور ہوگئی اور وہ اُٹھ کر اس دروازے کی طرف چل دیا جو وسطی ہال میں کھلتا تھا۔

اس دن کا ناشتا بھی بہت بھرپور اور پرتکلف تھا۔ کسی چیز سے یہ ظاہر نہیں ہو رہا تھا کہ گالان میں صرف رات تک کی خوراک کے ذخائر باقی رہ گئے۔ ہم چاروں نے آنے والی متوقع قلت کے پیشِ نظر بسیار خوری کا مظاہرہ کیا جو ہمارے حق میں اس اعتبار سے مضر ثابت ہوا کہ شکم سیر ہوتے ہی ہم پر نیند کا خمار طاری ہونے لگا اور ہم رات کی بیداری کا حساب پورا کرنے کے لیے بستروں پر دراز ہوگئے۔

میری کب آنکھ لگی، مجھے علم نہیں۔ بیدار ہوا تو مجھ سے پہلے وہ تینوں اپنی نیند پوری کرچکے تھے اور نہا دھو کر قندوز خان کے ساتھ خوش گپیوں میں مصروف تھے۔ میں اس سے سلام دعا کرکے نہانے کے لیے چل دیا۔

میں واپس آکر ان لوگوں کی محفل میں شریک ہوا تو ایک بری خبر میری منتظر تھی۔

صبغت اللہ کے کسی مخبر نے صندل خان کو گالان کی ڈھلانوں سے اتر کر کچھنار کی طرف جاتے ہوئے دیکھ لیا تھا اور اسے واپسی پر اس بارے میں سخت سرزنش کی گئی تھی۔ ان تینوں نے قندوز خان سے وہ خبر سننے کے بعد کوئی رد عمل ظاہر نہیں کیا تھا اس لیے وہ بات وہیں رہ گئی تھی۔ جب قندوز خان نے وہ خبر میرے سامنے دہرائی تو میں نے اشتباہ آمیز لہجے میں کہا "اس کی نیت میں یقیناً کوئی فتور آیا ہوا ہے۔ صبح میں نے اس سے سونف کی شراب کی خواہش ظاہر کی تھی۔ اس کے بعد میں اس کا انتظار کرتا رہا مگر وہ یوں غائب ہوا جیسے گدھے کے سر سے سینگ۔ یہ پتا چلا کہ وہ یہاں سے نکل کر کچھنار نامی بستی کی طرف کیوں گیا تھا؟"

"پھر وہ سچ بول رہا ہے" میری بات سن کر قندوز خان سنجیدہ ہوگیا "اس نے یہی کہا ہے کہ تم میں سے کسی نے سونف کی شراب پینے کی خواہش ظاہر کی تھی اور وہ کچھنار کی طرف دوڑا چلا گیا۔ وہ کچھنار سے ایک گیلن بھر لایا ہے۔ سونف کی شراب وہاں بہت عمدہ بنتی ہے۔"

"تم نے ان لوگوں سے صندل خان کے بیان کی تصدیق نہیں کرائی؟" میں نے اپنے ساتھیوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے حیرت سے کہا "یہ بات ان کے سامنے ہوئی تھی۔"

"میں نے خاص طور پر ذکر کرنا مناسب نہیں سمجھا۔ میرا خیال تھا کہ باتوں باتوں میں سچ اور جھوٹ کا پتا چل جائے گا۔" قندوز خان نے بے پروائی سے کہا "ویسے بھی تحقیق کے لیے ایک آدمی کچھنار کی طرف بھیج دیا گیا ہے۔"

"اتنی سختی سے وہ بھڑک جائے گا" میں نے کہا کیونکہ صبغت اللہ مجھے بتا چکا تھا کہ قندوز خان بھی غزالہ وغیرہ سے اس کے بارے میں پوچھ گچھ کرنے آیا تھا اور اسے صندل خان پر اپنے سردار کی بے اعتمادی کا علم تھا۔

"بھڑکے گا تو وہ مارا جائے گا" قندوز خان نے بے رحمانہ سرد مہری سے کہا "وہ تمہاری زبان جانتا ہے۔ اسے ہر قیمت پر تمہاری خدمت میں رہنا چاہیے تھا۔ شراب لینے کے لیے کسی اور کو کچھنار بھیجا جاسکتا تھا۔"

میں نے آگے کچھ نہیں کہا۔ میرا کوئی بھی اعتراض، صندل خان کی بے جا حمایت پر محمول سمجھا جاسکتا تھا۔

قندوز خان نے باہر سے ایک خدمت گار کے ذریعے وہ کنستر اندر منگوالیا جس میں صندل خان کی لائی ہوئی شراب موجود تھی۔ ڈھکن کھولتے ہی دیسی شراب کی تیز بو کے بھبکے فضا میں پھیل گئے۔ قندوز خان نے ندیدے پن سے تین گلاس بنائے ہمارے گلاسوں میں تین چوتھائی سے زیادہ پانی ڈالا گیا۔ اس نے اپنا گلاس کنستر ہی سے لبریز کیا تھا۔ میرے اور ویرا کے لیے وہ سیال اپنے حلق سے اتارنا دوبھر ہو رہا تھا۔ قندوز خان غٹاغٹ پیے جارہا تھا۔

"یہ پورا کنستر تم ہی لے جانا" میں نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا "مجھے اس میں مٹی کے تیل سے زیادہ گندی بو آرہی ہے۔ میں

نے خود پر جبر کیا تو ابکائی کر بیٹھوں گا۔" ویرا نے فوراً ہی میری تائید کر ڈالی۔

قندوز خان میری پیش کش پر کھل اٹھا "میں بڑے شوق سے لے جاؤں گا۔ تمہیں شاید تیز شرابوں کا شوق نہیں ہے۔ یہ اس وادی کی بہترین سوغات سمجھی جاتی ہے۔ دور دور سے اس کی فرمائشیں آتی رہتی ہیں۔"

"شراب اور بند کمروں سے میری طبیعت اکتا گئی ہے" غزالہ نے بُرا سا منہ بنا کر قندوز خان سے کہا "کیا یہ ممکن نہیں کہ ہم اپنا کچھ وقت گالان کی کھلی اور صحت افزا فضا میں گزار سکیں؟"

"ابھی چلتے ہیں" قندوز خان نے کہا اور پھر اپنا گلاس خالی کردیا۔ اپنے دل پسند مشروب کے بارے میں میری اور ویرا کی رائے سے وہ واقف ہوچکا تھا لہٰذا اس نے ہم دونوں کے گلاس بھی خالی کردیے۔ وہ ہمیں باہر لے جانے کے ارادے سے اٹھا تو اس کی آنکھوں میں خمار کے سرخ ڈورے تیر رہے تھے۔

باہر سورج کی تیز روشنی کے باوجود خنکی پھیلی ہوئی تھی۔ حویلی کے صحن اور دالانوں میں لوگوں کی بھیڑ بھاڑ میں قدرے کمی واقع ہوچکی تھی۔ شاید بعض لشکریوں کی واپسی کا سلسلہ شروع ہوچکا تھا۔ حویلی سے باہر' کھلے میدان میں قصباتی میلے کا سا سماں تھا۔ وہاں خطرناک صورتوں' ڈھیلے ڈھالے لباسوں اور کرخت آوازوں والے لحیم شحیم قبائلیوں کی بڑی تعداد موجود تھی۔ ان کے جسموں پر سجے ہوئے ہتھیاروں سے ہی اندازہ ہورہا تھا کہ وہ وہاں صرف لڑنے مرنے کی نیت سے آئے تھے۔ وہ سب ہی جسموں میں اترنے والی تیز نگاہوں سے ہم چاروں کو گھور رہے تھے۔ قندوز خان لوگوں سے ملتا ملاتا ہمارے پیچھے آرہا تھا اور غزالہ میرا بازو تھام کر مجھے اس بھیڑ سے باہر کھینچے جارہی تھی۔

"مجھے ان سب سے خوف آرہا ہے" وہ میرے کان کے نیچے منمنائی "ایسا معلوم ہورہا ہے جیسے یہ ہمیں آنکھوں ہی آنکھوں میں کھا جائیں گے اور قندوز خان کہہ رہا تھا کہ یہاں ہمارے ساتھ کوئی بدنگاہی نہیں ہوگی۔"

"تم ہی کو باہر کی ہوا کھانے کا شوق تھا" سلطان شاہ اس کی منمناہٹ سن کر بولا "میری دانست میں یہ بہت زیادہ تہذیب اور شائستگی کا مظاہرہ کررہے ہیں۔ ہمارے پیچھے قندوز خان نہ آرہا ہوتا تو اب تک کئی من چلے جنگ جو تم دونوں کے بازو تھام چکے ہوتے۔"

"واپس لوٹ چلو۔ بند دیواروں میں ہم زیادہ محفوظ رہیں گے" غزالہ بولی۔ وہ واقعی گھبرا گئی تھی۔

"میں تو تمہیں ساتھ لے کر بستی کی طرف جانے کا ارادہ کررہی تھی" ویرا نے اسے چڑانے والے لہجے میں کہا "یہ دونوں قندوز خان کے ساتھ یہیں کہیں بیٹھ کے ہمارا انتظار کرسکتے ہیں۔ بستی کی سیر بہت دلچسپ ہوگی۔ وہاں مرد ہی نہیں' ان کی عورتیں اور بچے بھی ہوں گے۔ ہم ان کا رہن سہن بھی دیکھ لیں گے۔"

"مجھے اپنا تماشا بنانے سے کوئی دلچسپی نہیں ہے" غزالہ چڑ کر بولی "ان کا رہن سہن ان ہی کو مبارک ہو۔"

"وہ ہماری فرمائش پر ہمیں باہر لایا ہے" میں نے نرمی سے کہا "اب فوراً واپس لوٹنے میں سبکی ہوگی۔ تھوڑا سا وقت گزار کر واپس لوٹ جائیں گے" ہم لوگ ان شنگاریوں کے درمیان سے گزرتے ہوئے اپنی باتیں کرتے جارہے تھے اور وہ اپنی بولی بول رہے تھے لیکن ہم ان کی بات سمجھ رہے تھے نہ وہ ہماری باتیں سمجھ پارہے تھے۔

چند منٹ بعد ہم اس بھیڑ سے باہر نکل گئے۔ قندوز خان بھی تیز تیز قدموں سے چلتا ہوا ہم سے آملا۔ اس کی چال ہی سے ظاہر ہورہا تھا کہ کچھنار کی تیز شراب کے بخارات نے اس کے معدے سے نکل کر اس کی کھوپڑی پر اپنا اثر جمانا شروع کردیا تھا۔

"تم دعویٰ کررہے تھے کہ گالان میں کوئی ہم دونوں عورتوں پر نگاہ نہیں ڈالے گا مگر یہاں سب ہی ہمیں دیدے پھاڑ پھاڑ کر گھور رہے تھے۔" ویرا نے اس کی کیفیت کا اندازہ لگا کر بے تکلفی سے کہا۔

"وہ گالان کے باسیوں کی بات تھی" قندوز خان نے اس کی شکایت کا بُرا مانے بغیر کہا "یہ باہر سے آئے ہوئے ہیں۔ ان کو تم لوگوں کے بارے میں کچھ معلوم نہیں۔ ان میں سے بیشتر اس وادی کے دہقان ہیں۔ تم نے دیکھا نہیں کہ وہ کھلے آسمان کے نیچے اپنی پگڑیاں بچھائے' پتھر کے سرہانوں پر کتنے اطمینان سے لیٹے اور بیٹھے ہوئے ہیں۔ تم لوگوں کے اجنبی خدوخال اور چھوٹے بدن انہیں حیران کررہے ہوں گے۔ یہ وہ لوگ ہیں جن کے بڑوں نے بھی کبھی ان پہاڑوں سے باہر کی دنیا نہیں دیکھی تھی۔ ان کی حیرت زدہ نگاہوں سے تمہیں کوئی خطرہ لاحق نہیں ہوسکتا۔"

حویلی کے احاطے کی دیوار کے ساتھ ساتھ ہم لوگ بغلی سمت میں مُڑے تو چند ہی لمحوں میں وہ بھیڑ بھاڑ ہماری نظروں سے اوجھل ہوگئی۔ اس طرف دور تک سبزے اور درختوں کی بہار پھیلی ہوئی تھی۔ ہم مزید آگے جانے کے بجائے' اسی جگہ ابھرے ہوئے پتھروں پر ٹک کر بیٹھ گئے۔

"ہم اسی طرف آگے چلیں تو وہ ویران باڑہ آجائے گا جہاں پرسوں رات تمہیں لٹکایا گیا تھا" کچھ دیر کی فرحت افزا خاموشی کے بعد قندوز خان ہمیں بتانے لگا "راہداری میں کھلنے والی کوٹھری کا مضبوط دروازہ اندر سے مقفل کردیا گیا ہے ورنہ اِدھر سے بھی ہم حویلی میں داخل ہوسکتے تھے۔"

"تو کیا آگ لگانے والے بموں کا ذخیرہ اس باڑے سے نکال لیا گیا ہے؟" میں نے محض بات بڑھانے کی نیت سے کہا مگر قندوز خان فوراً ہی بری طرح چونک پڑا۔

"تمہیں ان بموں کے بارے میں کیسے معلوم ہوا؟" اس نے اِشتباہ آمیز لہجے میں پوچھا۔

لمحہ بھر کے لیے میں بوکھلا گیا۔ مجھے پہلا خیال یہ آیا کہ میں نے ...ے وہ سوال کر کے فاش غلطی کی تھی کیونکہ آتش گیر بموں کے ...ے کی بات صندل خان نے بتائی تھی۔ قندوز خان نے اس ...ن تک بموں کے بارے میں زبان نہیں کھولی تھی مگر اگلے ہی ...ے مجھے یاد آگیا کہ صبغت اللہ نے ہم چاروں کی کارکردگی کی ...ف کرتے ہوئے' بموں کے اس ذخیرے کو پائندہ گل کے ...یوں سے بچائے رکھنے کا خصوصی ذکر کیا تھا' میں نے کہا "رات ...سردار صبغت اللہ نے بتایا تھا ورنہ مجھے معلوم ہی نہیں تھا کہ تم ...ہیں کس مقصد کے لیے وہاں رو کے رکھا تھا۔"

اس کے چہرے کے تنے ہوئے عضلات یک لخت ڈھیلے پڑ گئے ...سکراتے ہوئے بولا "تمہیں معلوم ہوجاتا کہ تم جہنم کے دہانے پر ...ے ہوئے ہو تو باڑے پر راکٹ گرتے ہی تم وہاں سے بھاگ نکلتے۔ ...نہاری بے خبری ہی کا کمال تھا کہ تم نے آخر تک وہ مورچا نہیں ...وڑا۔ اس راکٹ نے باڑے کے ایک حصے کو تباہ کردیا تھا مگر وہ ...رہ محفوظ رہا۔ اگر راکٹ اسے بھی لپیٹ میں لے لیتا تو بہت ...ناک تباہی پھیل جاتی۔ حویلی کا تنکا تنکا راکھ ہوجاتا اور اندر پھنسے ...ے سارے آدمی جل کر کوئلہ بن جاتے۔ یہ سردار صبغت اللہ ...ا کا خیال تھا کہ تمہیں بے خبر رکھا جائے۔ شنگاریوں کو اس ...رے کے بارے میں معلوم تھا اس لیے ہمارے آدمی بھی زیادہ دیر ...ں وہاں نہ ٹکتے۔ کوئی بہت زیادہ ہمت کر بھی لیتا تو راکٹ گرنے ...ے بعد میدان چھوڑ کر وہاں سے بھاگ نکلتا۔ وہ ذخیرہ اب باڑے ...ے سے نکال لیا گیا ہے۔"

گالان میں سب کچھ اسرار کے تہ در تہ پردوں میں چھپا ہوا ...ا۔ اصلیت بہت آہستگی سے اور مرحلہ وار ہمارے علم میں آرہی ...ی۔ پہلے میرا خیال تھا کہ اس جنگ میں ہمارا کوئی کردار نہیں تھا۔ ...ر صندل خان کے انکشاف اور صبغت اللہ کی تائید سے یہ اندازہ ...ہوا کہ حویلی کے اندر قابل اعتماد یا باغی نفری کی کمی کی وجہ سے اس ...مورچے کی حفاظت کا کام ہم چاروں سے لیا گیا تھا اور اب سرور ...ں آیا ہوا قندوز خان کچھ اور ہی بتا رہا تھا۔ اس باڑے اور اس ...ے ملحق راہداری میں اس قدر سنگین خطرہ تھا کہ وہ خود بھی ...ہتھیاروں کا تھیلا ہمارے حوالے کر کے واپس بھاگ گیا تھا۔ دیدہ ...دانستہ کوئی بھی شنگاری موت کے اس بھیانک دہانے پر نہیں ٹھہر ...سکتا تھا۔ صندل خان نے ٹھیک ہی کہا تھا کہ اس ذخیرے تک رسائی ...نہ ہونے کی وجہ سے پائندہ گل کے حامیوں کو شکست کا منہ دیکھنا ...پڑا۔ وہاں تک پہنچنے کے راستے کاٹنے کے لیے ہمیں چارا بنایا گیا ...اور یہی وجہ تھی کہ ہماری طرف سے سازش میں شرکت کا خفیہ ...اشارہ ملتے ہی صبغت اللہ نے گالان کے گرد چھپے ہوئے باغیوں کو ...سرعت سے حرکت میں لا کر اگلی ہی صبح حویلی پر دھاوا بول دیا۔

قندوز خان کے بیان نے آخرکار اس کہانی کو مکمل کر کے میری ...بچی کچھی الجھن بالکل دور کردی تھی۔

تھوڑی ہی دیر گزری ہوگی کہ کچھ فاصلے پر نشیب سے ایک آدھ متحرک دھبا نمودار ہوا پھر اس نے بوریوں وغیرہ سے لدے ہوئے خچروں کی ایک قطار کی صورت اختیار کرلی۔ میں نے قندوز خان کو اس طرف متوجہ کیا تو اس کے منہ سے بے اختیار تشکر آمیز کلمات نکل پڑے اور میں حیرت سے اس کا منہ دیکھنے لگا۔

"یہاں خوراک ختم ہونے والی تھی" میری استفسار طلب نگاہوں کو پڑھ کر اس نے بتایا "میدانی منڈیوں سے گاڑیاں لوٹ آئی ہیں۔ ان خچروں پر کھانے کا سامان آرہا ہے۔ سردار صبغت اللہ کو بہت بے چینی سے اس کارواں کی آمد کا انتظار تھا۔ ابھی تھکے ہوئے خچر دور ہیں۔ آؤ' چل کر اسے خوش خبری سنادیں۔"

ہم لوگ خود بھی زیادہ دیر تک باہر رہنے کے موڈ میں نہیں تھے اس لیے فوراً ہی اٹھ کھڑے ہوئے۔

"اِدھر سے اوپر آنے کا کون سا راستہ ہے؟" تیز تیز قدموں سے اس کے ساتھ چلتے ہوئے میں نے سوال کیا "ہم لوگوں کو تو کسی اور راستے سے اوپر لایا گیا تھا جو بستی سے ہو کر حویلی کی طرف آتا ہے۔"

"اب تم دوست ہو اس لیے تمہیں یہ بتانے میں کوئی ہرج نہیں ہے کہ گالان کی بلندی سے نیچے آنے جانے کے کئی آسان راستے ہیں جن سے لوگ پیدل اور خچروں پر سوار ہو کر آتے جاتے رہتے ہیں۔" وہ بولا "پائندہ گل نے تمہیں قیدی بنا کر بلایا تھا اس لیے تمہیں سب سے لمبے اور خطرناک راستے سے اوپر لایا گیا تھا تاکہ تم گالان سے فرار ہونے کے بارے میں سوچ بھی نہ سکو۔ مرنے والا مکاری اور سفاکی میں اپنا ثانی نہیں رکھتا تھا۔"

میرا خیال تھا کہ مکاری میں وہ سب ہی ایک دوسرے سے بڑھ چڑھ کر تھے۔

واپسی میں ہمیں ایک بار پھر پھٹی پھٹی اور وحشت زدہ آنکھوں کے ہجوم میں سے گزرنا پڑا۔ اس بار میں نے ان بے حجاب نظروں کا گہرا جائزہ لیا تو مجھے وہاں تحیّر کے علاوہ کچھ بھی نظر نہیں آیا۔

حویلی میں پہنچنے کے بعد قندوز خان اپنے نئے آقا سے ملنے کے لیے چلا گیا اور ہم چاروں راستہ تلاش کرتے ہوئے اپنے مہمان خانے تک پہنچ گئے۔ وہاں صندل خان پریشانی کے عالم میں ہمارا انتظار کررہا تھا۔ اس کے لٹکے ہوئے چہرے سے تھکان اور مایوسی مترشح تھی۔ ہمیں دیکھتے ہی وہ اٹھ کھڑا ہوا۔

"تم سب کہاں چلے گئے تھے؟ میں کب سے نئے کپڑوں کے ساتھ تمہارا انتظار کررہا ہوں" اس نے شکوہ کیا۔

"ہم قندوز خان کے ساتھ باہر کھلی فضا میں گئے ہوئے تھے" میں نے اسے بتایا۔

"میرے ساتھ بدمعاشی شروع کردی گئی ہے" وہ جھلا کر بولا "میں ایک ایک سے پوچھتا پھر رہا ہوں لیکن کسی نے مجھے یہ نہیں بتایا کہ تم لوگ قندوز خان کے ساتھ باہر نکلے ہو۔ میری کچھ سمجھ میں

نہیں آرہا کہ میرے ساتھ کیا کھیل کھیلا جارہا ہے؟" وہ بہت زیادہ پریشان اور کبیدہ خاطر دکھائی دینے لگا تھا۔

میں اس کی طرف دیکھ کر رہ گیا لیکن اس وقت زبان سے کچھ نہیں بولا اور خاموشی سے اپنے کمرے کی طرف چل دیا۔ وہ بھی ایک تھیلا اٹھاکر ہمارے ساتھ ہولیا۔ کمرے میں پہنچ کر اس نے وہ تھیلا ایک بستر پر الٹ دیا اور وہاں کئی رنگوں کے مردانہ جوڑے پھیل گئے۔ وہ نئے نہیں تھے لیکن دھلے ہوئے اور بے داغ ضرور تھے۔ ان کی تراش خراش مقامی وضع کی تھی۔ اس وقت تک ہم لوگوں کے جسم پر وہی لباس منڈھے ہوئے تھے جن میں ہمیں اغوا کیا گیا تھا۔ گردوغبار سے اٹے ہوئے راستوں کے طویل سفر' ماردھاڑ اور مسلسل استعمال کی وجہ سے ہمارے کپڑے بہت گندے ہوچکے تھے۔ مجھے خوشی ہوئی کہ صندل خان نے ہماری اس ضرورت کو ہمارے مطالبے سے پہلے محسوس کرلیا تھا۔

"یہ سب مردانہ کپڑے ہیں۔ ہم دونوں کیا کریں گی؟" غزالہ نے اس ڈھیر کو الٹ پلٹ کر دیکھنے کے بعد کہا۔

"عورتوں کے کپڑے کسی کو نہیں دیئے جاسکتے۔ میں چھوٹے بڑے ناپ کے دس جوڑے لے آیا ہوں۔ تم کو بھی ان ہی میں سے دو جوڑے چھانٹ کر گزارا کرنا ہوگا" اس نے نرمی سے کہا "یہاں سے نکلنے میں تمہارے یہ لباس مددگار ثابت ہوں گے۔ تم کو دور سے دیکھ کر کوئی نہیں پہچان سکے گا کہ تم مقامی نہیں ہو۔"

عورتوں کو اس کام میں الجھا ہوا چھوڑ کر میں صندل خان کو ایک طرف لے گیا اور آخری بستر پر جابیٹھا تاکہ کوئی آنے والا ہم دونوں پر شبہ نہ کرسکے۔ وہاں بیٹھنے کے بعد میں نے ہمدردانہ لہجے میں پوچھا "سنا ہے کہ آج تم کو سرزنش کی گئی ہے؟ کسی مخبر نے تم کو گالان سے نکل کر کچھنار کی طرف جاتے ہوئے دیکھ لیا تھا؟"

"میں جوش میں یہ بھول گیا تھا کہ شنگاریوں کے اعصاب اور ماحول پر ابھی تک جنگ طاری ہے اور چپے چپے پر نئے سردار کے مخبروں کا جال پھیلا ہوا ہے۔ میں اپنی ساری احتیاط کے باوجود خود کو پوشیدہ رکھنے میں ناکام رہا لیکن میں فکرمند نہیں ہوں۔ سونف کی شراب کی کہانی سناکر میں نے سردار صبغت اللہ کا غصہ ٹھنڈا کردیا ہے" وہ ندامت آمیز لہجے میں بولا۔

"بات ختم نہیں ہوئی بلکہ اب چل پڑی ہے" میں نے معنی خیز لہجے میں کہا "کسی کو تحقیقات کے لیے کچھنار بھیجا گیا ہے۔"

میری بات پر اس کا چہرہ دھواں ہوگیا اور وہ کھوئی کھوئی سی آواز میں بولا "اس کا مطلب ہے کہ میری بات پر اعتبار نہیں کیا گیا۔ کیا انہوں نے تم سے بھی کوئی پوچھ کچھ کی تھی؟"

میں نے اسے اپنی اور قندوز خان کی باتیں بتادیں "تمہیں بہت محتاط اور چوکنا رہنا ہوگا۔ شاید وہ لوگ تمہارے پیچھے لگ گئے ہیں۔ تمہاری ذرا سی بھی لغزش ہم سب کو ایک ساتھ لے ڈوبے گی۔"

"آج میں خچروں کا بندوبست کرنے کے لیے گیا تھا" اس نے رازداری سے کہا "خچروں کے بغیر ہمارا گالان سے نکلنا مشکل ہے۔ ان کے ذریعے ہم چند میل کا سفر کرکے اس مقام تک جائیں گے جہاں ایک جیپ ہماری منتظر ہوگی۔ سدھائے ہوئے خچروں کے انتظام کے بارے میں مجھے کل تک جواب مل جائے گا۔ وہ آدمی بہت مضبوط اور بھروسے والا ہے۔ تحقیقات کے لیے جانے والا آدمی اس تک پہنچ بھی گیا تو کچھ اگلوا نہیں سکے گا۔ اس کٹھن موڑ پر ہمیں ایک دوسرے سے عہد کرنا ہوگا کہ کسی ایک فریق کا ستارہ گردش میں آگیا تو وہ دوسرے کو نہیں پھنسوائے گا۔"

"میری طرف سے تم پورا یقین رکھو" مجھے اس سے ہمدردی سی محسوس ہونے لگی۔ میں نے اسے نہیں بتایا تھا مگر میں جانتا تھا کہ صبغت اللہ اور قندوز خان اس کی نیت اور ارادوں کے بارے میں مطمئن نہیں ہیں اور کسی بھی وقت اس پر ہاتھ ڈالنے کے عزائم لیے بیٹھے ہیں۔

"میں بھی تم سے وعدہ کرتا ہوں کہ پکڑا گیا تو تمہارے ارادوں کے بارے میں ایک لفظ بھی اپنی زبان سے نہیں نکالوں گا" وہ یک بیک جذباتی ہوگیا "مجھے امید ہے کہ ایسا بُرا وقت نہیں آئے گا اور ہم ایک ساتھ بادرانیوں کی لائی ہوئی نحوست سے آزاد ہونے میں کامیاب ہوجائیں گے' میں نے خان بابا کی زندگی میں تمہارے ساتھ کوئی زیادتی کی ہو تو مجھے سچے دل سے معاف کردینا۔ آج کے بعد تم مجھے ہمیشہ اپنا خیرخواہ اور ہمدرد پاؤ گے۔"

میرے الفاظ حلق ہی میں پھنس کر رہ گئے مگر اس نے میری نظروں میں پوشیدہ پیغام پڑھ لیا اور ہمارے کمرے سے چلاگیا۔

اس کے جاتے ہی میری نگاہ اس کنستر پر پڑی جو وہ ہمارے لیے کچھنار سے لایا تھا۔ میں فوراً ہی باہر نکلا تاکہ اس کے ذریعے وہ بدبودار کنستر قندوز خان کو بھجواسکوں۔ باہر آکر میں یہ دیکھ کر حیران رہ گیا کہ وہ ان چند ثانیوں میں ہی بہت دور نکل چکا تھا اور غیرمعمولی تیزرفتاری کے ساتھ مہمان خانے سے نکاسی کے راستے کی طرف جارہا تھا۔ میں نے اسے آواز دی تو وہ فوراً ہی پلٹ پڑا اور رک کر میری طرف دیکھنے لگا۔

وہ میری طرف واپس نہیں آیا۔ ایسا معلوم ہورہا تھا جیسے اسے کہیں جانے کی عجلت ہو۔ میں نے اسے کنستر کے بارے میں آگاہ کیا تو اس نے وہیں سے جواب دیا کہ وہ باہر سے کسی کو اس کام کے لیے بھیج دے گا۔ یہ کہہ کر وہ الوداعی انداز میں ہاتھ لہراکر سیدھا باہر نکلتا چلاگیا۔

اس وقت صندل خان کا رویّہ بہت عجیب اور ناقابل فہم تھا۔ کوئی بات میرے لاشعور میں کھٹک رہی تھی مگر میں اسے سمجھنے سے قاصر تھا۔ میں اپنی اس بے نام خلش کو کوئی معنی پہنانے کے چکر میں الجھا رہا اور ان تینوں نے اپنے میلے کپڑے مردانہ شنگاری لباس سے بدل ڈالے۔ خوش قسمتی سے دونوں عورتوں کو ان کی ناپ کے

ہاں مل گئے تھے جن میں ان کا رنگ روپ اس قدر نکھر آیا تھا کہ ان پر نگاہ نہیں ٹھہر رہی تھی۔

میں نے بھی غسل خانے میں جاکر اپنے میلے کپڑوں سے چھٹکارا حاصل کرلیا۔

شام کی ہوا خوری سے واپسی پر قندوز خان ایسا غائب ہوا کہ اس کی جھلک ہی نہیں دکھائی دی۔ میں نے رات کے کھانے تک کئی بار صندل خان کو بیرونی ہال اور اس کے کمرے میں تلاش کیا لیکن اس کا بھی سراغ نہیں مل سکا۔ کھانا لانے والا شنگاری اردو سے نابلد تھا۔ میں نے اس سے اشاروں کنایوں میں صندل خان کے بارے میں معلوم کرنا چاہا لیکن وہ میری بات سمجھ سکا نہ مجھے کچھ سمجھاسکا۔

ایک طرف یہ صورتِ حال تھی کہ ان دونوں میں ایک ہمارے پاس سے جاتا تھا تو دوسرا فوری طور پر آموجود ہوتا تھا۔ ان لوگوں سے عمومی اور پُرپیچ مسائل پر تبادلۂ خیال میں مصروف رہ کر ہمیں یہ اندازہ ہی نہیں ہوپاتا تھا کہ ہم کسی اجنبی ماحول میں پھنسے ہوئے تھے۔ دوسری طرف وہ دونوں ہی ایک ساتھ غائب ہوگئے تھے۔ وہاں کیا ہورہا تھا' یہ ہمارے علم میں نہیں تھا کیونکہ ہمیں اندر کی تمام خبریں ان ہی دونوں سے ملتی تھیں۔

ہم کھانے میں مصروف تھے تو تھوڑے تھوڑے وقفے سے تین شنگاری ہمارے کمرے میں آئے۔ انہوں نے دروازہ کھول کر تجسس نگاہوں سے پورے کمرے کا جائزہ لیا اور واپس لوٹ گئے۔ ان کے انداز سے صاف ظاہر ہورہا تھا کہ انہیں ہمارے کمرے میں کسی فرد یا چیز کی تلاش تھی۔ اس آمدورفت نے ہمارے دلوں میں موجود تجسس کو اور بڑھادیا۔ وہاں کوئی ایسا فرد موجود نہیں تھا جو ہمارا اطمینان کراسکتا۔ میرے ذہن میں ایک موہوم سی امید تھی کہ شاید کھانے کے بعد سردار صبغت اللہ مجھے بلالے۔ اس سے ملاقات ہوجاتی تو مجھے اپنے سوالوں کے جوابات مل سکتے تھے۔

کھانے سے فارغ ہوتے ہوتے ایک چوتھے آدمی نے بھی ہمارے کمرے کا جائزہ لے ڈالا۔ اس نے ہر تخت کے نیچے جھانک کر اپنا اطمینان کیا اور لوٹ گیا۔ میں خالی برتن وہیں چھوڑ کر وسطی ہال میں جابیٹھا جہاں حقہ تازہ کردیا گیا تھا اور فضا تمباکو کی خوشگوار بو سے مہک رہی تھی۔

"کچھ دیر سے یہاں پُراسرار نقل وحرکت شروع ہوگئی ہے۔ کیا تمہیں اس پر تشویش نہیں ہے؟" سلطان شاہ نے میرے قریب بیٹھتے ہوئے پُرتشویش لہجے میں سوال کیا۔

"نقل وحرکت سے زیادہ پریشانی اس بات کی ہے کہ قندوز خان کے ساتھ ہی صندل خان بھی غائب ہوگیا ہے اور ہم ان شنگاریوں میں گھرے رہ گئے ہیں جو ہمارے لیے بالکل گونگے اور بہرے ہیں۔"

"کیوں نہ باہر نکل کر ان دونوں میں سے کسی کو تلاش کرنے کی کوشش کی جائے؟" اس کی تجویز معقول تھی مگر ان غیریقینی حالات میں ہمارا ادھراُدھر بھٹکنا خطرناک بھی ثابت ہوسکتا تھا۔ میرے ذہن میں یہ بات جمی ہوئی تھی کہ صندل خان کو ہماری مہمان داری کی کل وقتی ذمے داری سونپی گئی تھی۔ اگر وہ کسی کام سے چلاگیا تھا تو اسے جلد ہی لوٹ آنا چاہیے تھا۔ اس کی طویل ہوتی ہوئی غیرحاضری کسی سنگین گڑبڑ کی نشان دہی کررہی تھی جو کسی چھوٹی موٹی جوابی بغاوت کی کوشش بھی ہوسکتی تھی۔

میں حقے کے کش لے کر ان ہی گتھیوں کو سلجھانے کی کوشش کررہا تھا کہ اچانک قندوز خان عجلت سے ہال میں داخل ہوتا ہوا نظر آیا اور میرا دل خوش ہوگیا۔ ہمیں ہال میں موجود دیکھ کر وہ ہمارے کمرے کی طرف جانے کے بجائے' وہیں آگیا۔ اس کے چہرے سے پریشانی ہویدا تھی۔ میں اسے دیکھتے ہی اٹھ کھڑا ہوا۔

"صندل خان کہاں ہے؟" اس نے کسی تمہید کے بغیر مجھ سے سوال کیا۔ اس نے میرے بدلے ہوئے لباس کو نظرانداز کردیا تھا۔

"تم سے الگ ہونے کے بعد اس سے سرسری ملاقات ہوئی تھی۔ وہ ہمیں صاف کپڑے دے کر کہیں چلاگیا تھا" میں نے جواب دیا۔ "میں خود کئی گھنٹوں سے اس کی تلاش میں ہوں۔ اس دوران میں چار شنگاری ہمارے کمرے کی تلاشی لے چکے ہیں لیکن کوئی بھی ہمیں کچھ نہیں بتاسکا۔ مجھے بے چینی سے تمہارا انتظار تھا۔"

"وہ غائب ہے" قندوز خان نے قدرے جھلاہٹ کے ساتھ کہا "حویلی اور گالان میں تلاش کے باوجود اس کا سراغ نہیں مل سکا۔ شاید وہ اپنے سر پر بھیانک خطرات منڈلاتے ہوئے دیکھ کر یہاں سے فرار ہوگیا ہے۔ اس نے آخری ملاقات میں تم سے کوئی خاص بات کی تھی؟ میرا اشارہ اس کی سرزنش کی طرف ہے۔"

"نہیں.... وہ پُرسکون نظر آرہا تھا۔ میں نے سونف کی شراب لانے پر اس کا شکریہ ادا کرکے اپنی ناپسندیدگی کا اظہار کیا تھا۔ اس پر بھی اس نے زبان نہیں کھولی۔ بعد میں ایک خدمت گار وہ کنستر لے گیا تھا۔"

"اس کی تلاش جاری ہے۔ ہوسکتا ہے کہ وہ رات کے سناٹے کے انتظار میں کہیں چھپا ہوا ہو۔ حویلی میں آدمی پھیلادیئے گئے ہیں۔ کچھ ٹولیاں وادی سے نکاس کے خفیہ راستوں کی طرف دوڑادی گئی ہیں۔ اگر وہ نکل بھاگا ہے تو ہمارے آدمی جلد ہی اسے جالیں گے۔ احتیاطاً تم لوگ اسی مہمان خانے میں رہو۔ باہر کے حالات تمہارے لیے سازگار نہیں ہیں۔"

"کچھنار جانے والا کیا خبر لایا؟ کیا وہ وہاں صرف شراب لینے ہی گیا تھا؟" میں نے خوف کی ایک اندرونی لہر کے ساتھ پوچھا۔

اس نے تیز نظروں سے میری طرف دیکھا اور زہریلی آواز میں بولا "وہ کچھنار میں تین آدمیوں سے ملا تھا۔ ان میں سے ایک بہت مشتبہ آدمی ہے جو خچروں کو سدھانے کا کام کرتا ہے۔ شاید صندل

خان کو کسی طرح کھنار جانے والے کے بارے میں بھنک مل گئی اور وہ خطرہ بھانپ کر' بُرا وقت آنے سے پہلے ہی یہاں سے نکل گیا۔ سردار صبغت اللہ اس کے اچانک غائب ہوجانے پر بہت برہم ہے۔ اس نے کھنار کے ان تینوں آدمیوں کی گرفتاری کا فرمان جاری کردیا ہے۔ جن سے صندل خان نے ملاقات کی تھی۔ جلّادوں کے بھیانک حربوں کے سامنے وہ زیادہ دیر تک جھوٹ نہیں بول سکیں گے۔"

صندل خان کا ہانکا شروع ہوچکا تھا۔ وہ مہم ہمارے لیے بھی خطرناک ثابت ہوسکتی تھی۔ مجھے خیال ہوا کہ وہ گھبرا کر بھاگ نکلنے کے بجائے میدان میں ڈٹا رہتا تو شاید اس کے بچے رہنے کے امکانات روشن رہتے۔ روپوشی یا فرار کی راہ اختیار کرکے اس نے خونی بھیڑیوں کے ایک غول کو اپنے پیچھے لگالیا تھا۔ لیکن وہ ان ہی پہاڑوں میں پلا بڑھا تھا اور اپنے لوگوں کی فطرت سے بہت اچھی طرح واقف تھا۔ میرے خیال کے برعکس یہ بھی ہوسکتا تھا کہ صبغت اللہ کے آدمی بالا ہی بالا خچر سدھانے والے کھناری کو پکڑ کر اپنے تشدد کا نشانہ بناتے اور اس کی زبان سے سچ سنتے ہی صندل خان کو بے خبری میں دبوچ لیتے۔ اس صورت میں وہ کوئی مزاحمت کیے بغیر' اپنے مخالفوں کے سفاکانہ عزائم کی بھینٹ چڑھ جاتا اور کوئی اس کا پُرسانِ حال نہ ہوتا۔

قندوز خان عجلت میں تھا۔ مجھ سے معلومات حاصل کرنے اور اپنی ہدایت دینے کے بعد وہ وہاں نہیں رکا۔ جس رفتار سے آیا تھا۔ اس سے زیادہ تیزی کے ساتھ واپس چلا گیا۔

ہم لوگ جب تک جاگتے رہے' مجھے یہ امید رہی کہ کسی بھی لمحے صبغت اللہ کی طرف سے بلاوا آسکتا ہے لیکن باہر کسی کے قدموں کی چاپ نہ گونجی اور ہم نیند کی آغوش میں چلے گئے۔

اگلا دن اس سے کہیں زیادہ بے یقینی اور تذبذب کے عالم میں شروع ہوا۔ مجھے افسوس ہورہا تھا کہ میں نے قندوز خان سے صندل کی جگہ اردو جاننے والے کسی اور شنگاری کی بندوبست کی بات کیوں نہیں کی۔ وہ رابطہ ختم ہونے کے بعد ہم اپنے گردوپیش سے بری طرح کٹ کر رہ گئے تھے۔

اس وقت ہماری کوفت اور تشویش میں مزید اضافہ ہوگیا جب اس مہمان خانے کے کمروں میں بھی وحشت ناک چہروں اور بڑی بڑی پگڑیوں والے نیم مہذب شنگاری آنے لگے ان کی وجہ سے ہم اپنے کمرے میں محبوس ہوکر رہ گئے۔ شام ہونے تک بقیہ پانچوں کمرے آباد ہوچکے تھے اور حویلی کا وہ حصہ شنگاریوں کی اونچی اور نامانوس آوازوں کے ساتھ ہی وحشیانہ قہقہوں سے گونجنے لگا تھا۔ ان لوگوں کے آجانے کی وجہ سے خدمت گار بہت زیادہ مصروف ہوگئے تھے یا پھر وہ اپنے لوگوں کے آجانے کے بعد ہمیں نظرانداز کررہے تھے کیونکہ ان کی آمدورفت کا سلسلہ بھی معدوم ہوچکا تھا۔

"ان وحشیوں میں گھِر کر میں ایک لمحے کے لیے بھی نہیں سوسکوں گی" غزالہ نے شام کو خوف زدہ آواز میں کہا "ہر بستر کے ساتھ موجود شراب کی بوتل انہیں آپے سے باہر کرسکتی ہے۔ ہماری احتیاط کے باوجود انہیں معلوم ہوچکا ہوگا کہ اس کمرے میں دو شہری عورتیں بھی ہیں۔ ایسا نہ ہو کہ تجسس یا بدمستی سے مغلوب ہوکر کوئی رات میں یہاں گھس آئے۔"

"پتا نہیں تم اتنی بودی کیوں بن رہی ہو؟" ویرا نے کاٹ دار لہجے میں کہا "یہ لوگ ہمیں بھون کر نہیں کھاجائیں گے۔ تم یہ کیوں بھول رہی ہو کہ ہم چاروں بھی سردار کے معزز مہمان ہیں۔ یہ لوگ اپنے سردار کے مہمانوں کے ساتھ کسی بدسلوکی کی جرأت نہیں کرسکیں گے۔ اس چھت کے نیچے یہ مسلح شنگاری بالکل بے ضرر ہیں۔"

"میں یہ کہنا چاہ رہی تھی کہ ہمیں اس مہمان خانے کے بجائے پرانے کمرے میں منتقل کردیا جائے تو شاید ہم سکون سے رہ سکیں گے" غزالہ نے بے بسی کے ساتھ میری طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

"اول تو یہاں کوئی ایسا شخص نہیں ہے جس سے میں اس بارے میں بات کرسکوں۔ قندوز خان آ بھی جائے تو وہ اس بات کا بُرا مان سکتا ہے کہ ہم اس کے ہم وطنوں کو حقیر اور ناقابلِ برداشت سمجھتے ہیں۔ ان لوگوں کو اس مہمان خانے میں رکھا جارہا ہے تو یہ ضرور اس وادی کے معززین میں شمار ہوتے ہوں گے۔"

"معززین!" سلطان شاہ نے سر جھٹک کر زہرخند کے ساتھ کہا "تم نے ان معززین کا حال دیکھا ہے؟ کپڑے میلے کچیلے اور شاید بدبودار ہیں۔ بڑھے ہوئے ناخنوں میں میل بھرا ہوا ہے۔ اکھڑ لہجے میں اس طرح زور زور سے بول رہے ہیں جیسے ایک دوسرے کو گالیاں دے رہے ہوں۔ گالان میں رہنے والے ان سے بہت بہتر ہیں۔"

"چند روز میں تم ان سے بھی مانوس ہوجاؤ گے" میں نے مسکرا کر کہا "صندل خان کے ساتھ فرار ہونے کے امکانات ختم ہوچکے ہیں۔ اب ہم صبغت اللہ کی مرضی سے ہی یہ وادی چھوڑ سکیں گے۔"

"دعا کرو کہ ڈینی کی چہیتی جلد از جلد ان لوگوں کے ہاتھ آجائے ورنہ ہماری مٹی پلید ہوکر رہ جائے گی" ویرا نے غزالہ سے مخاطب ہوکر کہا "جنت گل کا دیدار کیے بغیر ہم یہاں سے باہر نہیں جاسکیں گے۔"

"جنت گل!" سلطان شاہ نے حسرت سے ایک گہرا سانس لے کر کہا "مجھے حیرت ہے کہ دنیا کی ہر عجیب لڑکی ڈینی ہی سے ٹکراتی ہے۔ لوگ خربوزے کو قابو میں کرکے چھری کا شکار بناتے ہیں۔ میں نے یہ کہیں نہیں دیکھا کہ کوئی خربوزہ خود لڑھک کر چھری پر آگرا ہو۔ دیکھو' یہ کہانی کیا رنگ دکھاتی ہے؟"

"یہ تم سے ٹکرائی ہوئی ہے" میں نے خفّت آمیز مسکراہٹ کے ساتھ ویرا کی طرف اشارہ کرکے کہا "میرا خیال ہے کہ اس سے زیادہ عجیب لڑکی روئے زمین پر نہیں مل سکے گی۔"

"یہ بھی تمہارے ذریعے ہی میرے گلے پڑی ہے" سلطان شاہ نے منہ بنا کر برجستگی سے کہا اور ہم سب شنگاریوں کی طرح بے ساختہ ہنس پڑے۔ چند لمحوں کے لیے فضا کا بوجھل پن دور ہوگیا تھا۔

اس رات جب ہم بستروں پر دراز ہوچکے تھے تو قندوز خان آپہنچا۔ میں نے بہت تپاک سے اسے خوش آمدید کہا لیکن اس نے جواب میں کسی گرم جوشی کا مظاہرہ نہیں کیا اور خاموشی سے میرے پاس آبیٹھا۔

"کیا بات ہے؟ آج تم اداس اور پریشان نظر آرہے ہو" میں نے آہستگی سے پوچھا۔

"میں اپنی پریشانیاں بہت جلد ان لوگوں کو لوٹادوں گا جو ان کا سبب بنے ہیں" اس نے سرد مہری سے کہا "دوست بن کر دغا دینے والے' کھلے دشمنوں سے زیادہ خطرناک ہوتے ہیں۔ میں ان کو نہیں بخشوں گا۔"

"تم کس کا ذکر کررہے ہو؟" میں نے دھڑکتے ہوئے دل کے ساتھ پوچھا۔

"وقت آنے پر سب سامنے آجائے گا" اس نے اسی بے اعتنائی سے جواب دیا "اس وقت میں تمہاری خیر خبر لینے اور یہ بتانے آیا ہوں کہ صندل خان شنگارا ویلی سے کسی چور کی طرح بھاگتے ہوئے پکڑا گیا۔ کھنار کا خچروں والا بھی اس وقت ہمارے قید خانے میں ہے۔ وہ جلد ہی سب کچھ اگل دیں گے۔"

اس بری خبر سے میرا دورانِ خون یک بیک تیز ہوگیا مگر میں نے بظاہر پُرسکون رہتے ہوئے کہا "یہ اچھی بات ہے کہ تمہارے مجرم تمہارے قبضے میں آگئے۔ یہ تمہارا اندرونی معاملہ ہے۔ مجھے صرف اتنی سی فکر تھی کہ صندل خان کے غائب ہوجانے کے بعد یہاں اردو جاننے والا کوئی نہیں ہے۔ تم کسی اور کا بندوبست کردو تو بہت مہربانی ہوگی۔"

"یہ ناممکن ہے" مجھے اس کا لہجہ روکھا محسوس ہوا "اردو جاننے والے باہر کے کاموں پر گئے ہوئے ہیں۔ گالان میں سردار کے علاوہ صرف میں تمہاری بولی جانتا ہوں اسی لیے یہاں کا چکر لگانے آیا ہوں۔ تمہیں کھانے پینے کی کوئی شکایت ہو تو مجھے بتاؤ۔ میں خدمت گاروں کو سمجھادوں گا۔"

"ہمیں ہر طرح کا آرام میسر ہے۔ کسی مقامی سے بات چیت نہ ہونے کی وجہ سے ہم سب خود کو اکیلا اور اجنبی محسوس کرنے لگے ہیں۔ تم بھی بہت زیادہ مصروف نظر آنے لگے ہو ورنہ تمہارے ساتھ بہت اچھا وقت گزر رہا تھا۔"

"میں اس وقت بھی مشکل سے وقت نکال کر یہاں آیا ہوں۔ یہ چند روز سردار صبغت اللہ کے لیے بہت اہم ہیں۔ کہیں بھی ذرا سی بے پروائی ہوئی تو ہماری ساری محنت رائیگاں جاسکتی ہے۔"

"سردار سے ہماری ملاقات کب ہوسکے گی؟" میں اپنے ذہن میں اٹکا ہوا دوسرا سوال بھی زبان پر لے آیا۔

"کیوں؟" میرے سوال پر اس کی تیوریاں چڑھ گئیں "ایسی کون سی بات ہے جو تم میرے بجائے سردار صبغت اللہ سے کرنی چاہتے ہو؟ اگر میری ہی کوئی شکایت ہے تو دوسری بات ہے۔"

"ارے' تم تو ناراض ہورہے ہو" میں نے اس کا بازو دباتے ہوئے خوشامدانہ لہجے میں کہا "میں سردار سے صرف یہ معلوم کرنا چاہتا تھا کہ ہم یہاں سے کب تک روانہ ہوسکیں گے۔ ہمیں یہاں آئے ہوئے کافی وقت گزر چکا ہے۔"

"وہ بہت مصروف ہے۔ تم نے دیکھا نہیں کہ مہمان خانہ بھر چکا ہے۔ تبدیلی کے بعد دور دراز کے قبیلوں سے معززین آئے ہوئے ہیں۔ وہ ان سے ملاقاتوں میں پرانے اور نئے معاملات طے کرنے میں لگا ہوا ہے۔ ہوسکتا ہے کہ کئی دن تک وہ تم کو وقت نہ دے سکے۔ موقع ملا تو میں تمہارا سوال اس تک پہنچادوں گا۔"

"اگر مہمانوں کے لیے ضرورت ہو تو ہم یہ کمرا چھوڑ کر کہیں اور منتقل ہونے کے لیے تیار ہیں" ویرا نے موقع پاتے ہی غزالہ کی خواہش کی خوب صورت ترجمانی کرتے ہوئے کہا۔

"فی الحال تم یہیں رہو۔ واپس جانے والے نئے آنے والوں کے لیے جگہ خالی کرتے رہیں گے۔ بعد میں ضرورت پیش آئی تو دیکھا جائے گا۔ مجھے معلوم ہے کہ غزالہ کو ان کی آنکھیں ڈراؤنی لگتی ہیں۔ اس کا بہتر علاج یہ ہے کہ دونوں عورتیں ضرورت کے بغیر باہر نہ نکلیں۔ مردانہ شنگاری لباس میں ان پر زیادہ نگاہیں اٹھیں گی" ویرا کی بات کا جواب دیتے ہوئے اس نے یہ بھی جتادیا کہ وہ غزالہ کا پچھلے روز کا ردِعمل بھولا نہیں تھا۔

وہ ہمیں مزید فکر و تشویش میں مبتلا کرکے لوٹ گیا۔ اس وقت تک مہمان خانے میں خاصی خاموشی پھیل چکی تھی۔ اِکادُکا ہی آوازیں سنائی دے رہی تھیں۔ غالباً وہ سب ہی جلد سوجانے کے عادی تھے۔ ہمارے لیے وہ خوشی کی بات تھی کہ ہم رات کے سناٹے میں پوری یکسوئی کے ساتھ مشورے کرسکتے تھے۔

صبغت اللہ نے ہم لوگوں کی واپسی جنت گل کی آمد سے مشروط کرنے کے ساتھ یہ بھی کہا تھا کہ وہ اس معاملے کو ہر ایک حتیٰ کہ قندوز خان سے بھی پوشیدہ رکھنا چاہتا ہے اس لیے میں قندوز خان سے یہ نہیں پوچھ سکا کہ جنت گل اور اس کے والدین کو گالان لانے کے سلسلے میں کیا پیش رفت ہوئی تھی۔

"اس وقت قندوز خان ہم لوگوں سے بھڑکا ہوا نظر آرہا تھا" باتوں باتوں میں سلطان شاہ نے کہا "اس کے رویے میں پہلے جیسی گرم جوشی اور بے تکلفی نہیں تھی۔ وہ صرف اپنے مطلب کی بات کررہا تھا۔"

"ہوسکتا ہے کہ وہ کام کی زیادتی کے اثرات ہوں۔ بغاوت

کرنا اتنا مشکل نہیں ہوتا جتنا بعد کے حالات کو سنبھالنا۔" میں نے جواباً ان تینوں کی تشویش رفع کرنے کے لیے بے پروائی سے کہا۔

"صندل خان اور نچروں والے پر تشدد ہو رہا ہے۔ یہ بھی تو ہوسکتا ہے کہ ان کے منہ سے ہمارے خلاف کوئی بات نکل گئی ہو۔ اس کی بعض باتیں ذومعنی تھیں جو ہم پر بھی لاگو ہوسکتی ہیں۔"

"ان باتوں پر بہت زیادہ سر کھپانا بے سود ہے۔ یہاں ہم سب ہی اوکھلی میں سر دیئے بیٹھے ہیں۔ آگے جو کچھ ہوگا اس کا مقابلہ کرنا ہی ہوگا۔ ہمیں اپنی توانائیاں آنے والے وقت کے لیے محفوظ رکھنی چاہئیں۔"

سلطان شاہ مجھ سے الجھتا رہا۔ وہ صورتِ حال سے اتنا بے خبر نہیں تھا جتنا خود کو ظاہر کرتا رہا تھا۔ میں اسے ٹالتا رہا۔ وہ رات ہمارے لیے پچھلی رات سے زیادہ بھاری تھی۔ تفکرات اپنی جگہ پر تھے۔ غزالہ باربار چونک رہی تھی۔ غسل خانوں وغیرہ کی طرف جانے والی راہداری میں وقفے وقفے سے جاری رہنے والی آمدورفت اس کے اعصاب پر اثرانداز ہو رہی تھی۔ اس کی تسلی کے لیے میں نے دونوں دروازوں کے کھانچوں میں بلیاں پھنسا کر انہیں اندر سے مقفل کرادیا تھا مگر پھر بھی کوئی گہری نیند نہیں سوسکا اور وہ رات اونگھتے اور باتیں کرتے ہوئے گزر گئی۔

صبح سویرے ہمارے دروازے پر ہلکا سا دھماکا ہوا پھر دروازہ پیٹا جانے لگا۔ ہم چاروں ہڑبڑا کر بستروں سے نیچے اتر آئے پھر باہر سے قندوز خان کی غصیلی آواز آئی۔ وہ دروازہ کھولنے کا مطالبہ کر رہا تھا۔

میں نے دروازے سے بلی ہٹا کر پٹ کھول دیا۔ قندوز خان مجھے پیچھے دھکیلتا ہوا اندر گھس آیا۔ اس کے پیچھے تین خونخوار شنگاری بھی اندر آگئے۔ ان کے ہاتھوں میں میگزین چڑھی ہوئی کلاشنکوف موت کے قہقہے اگلنے کے لیے تیار تھیں۔ ان سب کے تیور بہت جارحانہ اور خطرناک نظر آرہے تھے۔

"باہر چلو!" قندوز خان میرے سینے پر ہاتھ مار کر نفرت آمیز آواز میں پھنکارا "میں سردار صبغت اللہ شنگاری کے نام پر تم چاروں کو گرفتار کر رہا ہوں۔ تم میں سے جس نے بھی چون وچرا کی اسے بھون ڈالا جائے گا۔"

میری زبان خشک ہونے لگی۔ غزالہ' ویرا اور سلطان شاہ کے چہروں کے رنگ فق ہوگئے تھے۔ ان تینوں نے قندوز خان کے حکم کے بغیر مشینی انداز میں اپنے ہاتھ اوپر اٹھالیے تھے۔

قندوز خان کی آنکھوں میں اس وقت قہرونفرت کے شعلے لپک رہے تھے۔ مجھے محسوس ہوا کہ میں نے ذرا بھی زبان کھولی تو وہ وحشی اپنے آدمیوں کو فائر کرنے کا اشارہ دے دے گا۔ وہ بالکل ہی بدلا ہوا اور کسی خونی درندے سے مشابہ نظر آرہا تھا۔ میں سر جھکا کر خاموشی سے کھلے ہوئے دروازے کی طرف بڑھ گیا۔

اس مختصر سے مسلح دستے کی آمد اور غیرمعمولی آوازوں کی وجہ سے ہمارے دروازے پر متجسس شنگاری جمع ہونے لگے تھے۔ وہ حیران وپریشان آنکھوں سے ایک دوسرے کی طرف دیکھ کر سرگوشیاں کر رہے تھے۔ ہمارا محروم ومجبور جلوس باہر نکلا تو بڑھتی ہوئی وہ بھیڑ کائی کی طرح چھٹتی چلی گئی اور ہمارے لیے خودبخود راستہ بن گیا۔

قندوز خان نے دوست بن کر ہمیں جس تحقیر وذلت سے دوچار کیا تھا' صندل خان نے دشمن ہوتے ہوئے بھی ہمیں اس سے محفوظ رکھا تھا۔ سردار پائندہ گل کی زندگی میں وہ ہمیں ایک مہربان ساتھی کی طرح گپ شپ کی خوش گوار فضا میں پیغا سرائے سے گالان تک لایا تھا اور بعد میں بھی اس کا رویہ مفاہمانہ رہا تھا۔

اس بار ہمارا رخ کسی اور ہی سمت میں تھا۔ حویلی کے وہ راستے نسبتاً ویران پڑے ہوئے تھے۔ چند منٹ کی مسافت کے بعد میرے نتھنوں میں آلو' پیاز اور اناج کی ملی جلی بو آئی۔ شاید وہیں کہیں غذائی اشیاء کو ذخیرہ کیا جاتا تھا۔ آخرکار ہم حویلی سے نکل کر کھلے آسمان کے نیچے پہنچ گئے۔

خودرو گھاس سے ڈھکے ہوئے اس میدان میں ہم ایک سائبان کے نیچے رک گئے۔ مسلح شنگاریوں نے زمین پر جما ہوا مسطح چٹان کا ایک ٹکڑا ہٹایا اور زمین میں بے ہنگم سیڑھیاں نمودار ہوگئیں۔

"جاؤ' اب سردار صبغت اللہ کے سامنے پیشی تک یہ زنداں تمہارا مقدر ہے" قندوز خان دہاڑا۔

اس کی بات سے ظاہر ہو رہا تھا کہ وہ ہمیں اس زمین دوز قید خانے میں اتار کر خود رخصت ہونے کا ارادہ رکھتا ہے اس لیے میں نے مڑ کر بہت عاجزی سے کہا "مگر ہمارا قصور تو بتادو....."

قندوز خان نے مجھے مزید بولنے کی اجازت نہیں دی اور دانت پیس کر بولا "جاؤ! اندر اترو گے تو تمہیں خود بخود سب کچھ معلوم ہوجائے گا۔ انجان بن کر اپنے سیاہ کرتوتوں پر پردہ ڈالنے کی کوشش مت کرو۔"

ہم چاروں بے زبان بھیڑوں کی ایک قطار کی صورت میں ان ناہموار سیڑھیوں سے نیچے اترنے لگے۔ آخری فرد کے اترنے کے بعد اس تہ خانے کا دہانہ بند کردیا گیا۔ مجھے ڈر تھا کہ دہانہ بند ہوتے ہی اندر گھور اندھیرا پھیل جائے گا مگر آگے ہلکی سی روشنی پھیلی ہوئی تھی جس کا مخرج ہمارے سامنے نہیں تھا۔

سیڑھیوں کا اختتام صندوق نما ایک کمرے میں ہوا۔ پہاڑ کے سینے میں تراشا ہوا وہ کمرا بیس فٹ لمبا اور تقریباً اتنا ہی چوڑا تھا۔ اس کی چھت میں ہوا اور روشنی کے لیے ایک کھڑکی بنی ہوئی تھی جو ایک سرنگ کی طرح موٹی چھت سے گزر کر شاید سائبان کے نیچے ہی کھلتی تھی۔ اس ہوادان کے اوپری حصے پر مضبوط چوبی رکاوٹیں لگی ہوئی تھیں۔

ایک طرف کوئی دیوہیکل انسانی وجود بے حس وحرکت پڑا ہوا

...یوں محسوس ہوا جیسے اس قید خانے کے کسی گوشے میں ...پھنکارا ہو۔ میں سرعت سے اس آواز کی طرف گھوما تو ...میں دو انسانی ہیولے گٹھڑیوں کی طرح سکڑے اور سمٹے ہوئے ...وہ بالکل کونے سے لگے ہوئے بیٹھے تھے۔

"ارے' یہ تو صندل خان ہے" ویرا کی خوف اور تحیر میں ڈوبی آواز نے مجھے چونکا دیا۔ وہ زمین پر ساکت پڑے ہوئے انسانی ...کے سرہانے کھڑی ہوئی تھی۔ میں فوراً اس کے قریب پہنچ گیا۔ اس کا لباس تار تار تھا اور پورا بدن خون میں ڈوبا ہوا تھا۔ ...تشدد سے اس کی ایک آنکھ ضائع ہوچکی تھی دوسری ...ت مگر بند کی ہوئی تھی۔ وہ کسی لاش کی طرح ساکت تھا۔ اس ...دونوں ٹانگیں غیرفطری انداز میں ایک دوسرے سے کافی فاصلے ...تھیں۔

وہ ویرا کو پسند کرتا تھا۔ اسے ایسی ابتر حالت میں دیکھ کر ویرا ...دل میں ہمدردی کے جذبات امڈ آئے اور اس نے نیچے بیٹھ کر ...کے بائیں پہلو پر ہاتھ رکھ دیا۔ اس کے دل کی دھڑکن محسوس ...کے وہ پرجوش آواز میں بولی "یہ زندہ ہے مگر بے ہوش ہوگیا ...خدا کی پناہ! ان درندوں نے اس کا قیمہ بنا کر رکھ دیا ہے۔"

...صندل خان کے بدن پر بھی زخموں کے متعدد نشان موجود ...اس کی دونوں کلائیوں اور پنڈلیوں پر بہت زیادہ ورم آیا ہوا ...اس کی زبان کھلوانے کے لیے اس پر تشدد کی انتہا کردی گئی۔ ...وہ اس عقوبت کو نہیں سہہ سکا تھا۔ اس نے اعترافات کرلیے اور اسی وجہ سے ہم کو اس کے پاس پہنچادیا گیا تھا۔

...اس کی حالت دیکھ کر میرا دل خراب ہونے لگا۔ پیغا سرائے ...گالان تک وہ ہمارا دشمن بھی رہا اور پھر دوست بھی بنا مگر اس ...ہمیں کبھی کسی شکایت کا موقع نہیں دیا۔ اس کے دونوں روپ ...کئے جانے کے قابل تھے۔ تحمل اور رواداری سے مالا مال' اس ...شنگاری کا وہ انجام لرزہ خیز تھا۔ وہ کسی بھی طرح اس بربریت کا ...دار نہیں تھا۔

ویرا اس کے سرہانے بیٹھی ہوئی' اس کے دونوں رخسار ...تھپتھپا رہی تھی اور باربار اسے پکارے جارہی تھی۔

...کچھ دیر بعد ویرا کی کوششیں رنگ لائیں۔ صندل خان کے ...ہونٹوں سے بے مقصد بڑبڑاہٹ بلند ہوئی پھر اس کی گردن ...جنبش کی اور آخرکار اس کی اکلوتی آنکھ نیم وا ہوگئی۔ اس کی ...صورت یکایک ڈراؤنی لگنے لگی۔

"صندل خان!" چند لمحوں تک ویرا کی طرف دیکھنے کے بعد وہ ...ڈوبی ہوئی آواز میں رک رک کر بولا "مجھے معاف کردینا۔ میں تم ...سے کئے ہوئے عہد پر قائم نہیں رہ سکا۔ ان ظالموں نے ...میرے ساتھ ایسی درندگی کی ہے جو ہم خونی بھیڑیوں سے بھی روا ...نہیں رکھتے۔ کاش! کاش' میں زبان کھولنے سے پہلے مرگیا ہوتا" ...اس کی اٹکتی ہوئی آواز پر گہری نقاہت طاری تھی۔ وہ تھک کر

خاموش ہوگیا۔ اس کی گردن ایک طرف ڈھلک گئی اور اس نے اپنی آنکھ موندلی۔

غزالہ اپنی انگلیاں منہ میں دیئے پھٹی پھٹی آنکھوں سے صندل خان کی طرف دیکھے جارہی تھی۔ اس کے جسم پر تشنج کی سی کیفیت طاری تھی۔ سلطان شاہ بھی بدترین صدمے کی حالت میں نظر آرہا تھا۔ ہم چاروں اس کے گرد موجود تھے مگر بے بس تھے۔ اس کے لیے کچھ بھی نہیں کرسکتے تھے۔

"مجھے اس پر بہت مان تھا" صندل خان اسی حالت میں رک رک کر' ٹوٹے پھوٹے الفاظ میں' ہولے ہولے بڑبڑانے لگا "مگر نچروں والے نے میرا مان توڑ دیا۔ اس نے میری ہر بات اگل دی۔ میں سچ کہہ رہا ہوں کہ میں پھر بھی ہار نہ مانتا۔ انہوں نے میری دونوں کلائیاں توڑ دیں۔ ایک پنڈلی توڑ ڈالی میں پھر بھی خاموش رہا تو انہوں نے میری ٹانگیں چیر کر مجھے چابک سے ادھیڑنا شروع کردیا۔ میری ٹانگیں اتنی چیری گئیں کہ میری کھال پھٹ گئی اور خون کے فوارے بہہ نکلے پھر میری قوت برداشت جواب دے گئی۔ میں ڈینی سے اپنا قول ہار گیا۔ مجھے کچھ یاد نہیں کہ میں نے انہیں کیا کیا بتا ڈالا۔ میں نے سب ہی بتایا ہوگا جو وہ تمہیں بھی یہاں لے آئے۔ میں نے پہلے ہی کہا تھا کہ بادرانی بہت مکار ہیں۔ یہ کسی بہانے سے تم سب کو مار ڈالیں گے۔ میں مر رہا ہوں' میرے بدن سے اتنا خون بہہ چکا ہے کہ میں بچ ہی نہیں سکتا۔ مگر مجھے دکھ ہے کہ میری وجہ سے وہ چار بھی مارے جائیں گے جنہوں نے میری زبان پر بھروسا کیا تھا۔ میں یہاں سے اکیلا اسی لیے بھاگا تھا کہ میری بدقسمتی کے سائے تمہیں بھی نہ لے ڈوبیں مگر یہ ہوکر رہا۔ میں کس قدر بدنصیب ہوں کہ اپنے سینے پر بدعہدی کا سیاہ داغ لے کر بادرانیوں کی قید میں مر رہا ہوں" وہ پھر خاموش ہوگیا۔

ویرا کی بڑی بڑی اور چمک دار آنکھوں میں آنسو جھلملا رہے تھے۔ وہ اس شنگاری کے لیے دکھی تھی جسے ابتدا ہی سے اپنا کھلونا بناتی چلی آئی تھی۔ پھر شاید اس کے گرم گرم آنسو صندل خان کے چہرے پر گرنے لگے۔

صندل خان کی آنکھ پوری کھل گئی۔ موت کے بھیانک خواب میں ڈوبی ہوئی اس آنکھ نے ویرا کا روتا ہوا چہرہ حیرت سے دیکھا اور صندل خان کے ہونٹ لرز اٹھے "آ..... آں... آنسو! نف..... فرزانہ!" پھر اس کی گردن کو ایک سخت جھٹکا لگا اور وہ آنکھ وہیں پتھرا گئی۔ صندل خان مرچکا تھا۔ شاید اسے اطمینان ہوگیا تھا کہ اس کی لاش پر کوئی رونے والا بھی موجود تھا۔

سلطان شاہ نے جھک کر اس کی پتھرائی ہوئی آنکھ بند کی تو ویرا ضبط نہ کرسکی اور بلک کر رو پڑی۔ میں نے اتنی مدت میں اسے پہلی بار روتے دیکھا تھا۔ وہ صندل خان سے زیادہ بھیانک لاشیں دیکھ کر بھی کبھی متاثر نہیں ہوئی تھی مگر اس وقت رو رہی تھی۔

"کیا مرگیا؟" ویرا کے رونے پر قید خانے کے تاریک گوشے

سے ٹوٹی پھوٹی اردو میں ایک سہمی ہوئی مردانہ آواز ابھری۔ ہم سب ہی ایک لمحے کے لیے صندل خان کا کرب بھول کر ادھر متوجہ ہوگئے۔ ہمارے لیے یہ بات حیران کن تھی کہ اس زنداں میں ہمارے علاوہ بھی کوئی اور قیدی اردو سے واقف تھا۔

"ہاں مرگیا" میں نے لحظہ بھر بعد اس کے سوال کا جواب دیتے ہوئے پوچھا "مگر تم کون ہو؟"

"ضیغم خان!" خوف زدہ آواز میں آنے والے اس جواب نے میرے اعصاب کو ہلا کر رکھ دیا۔ وہ کہہ رہا تھا "ادھر آؤ! شاید وحشت سے یہ عورت بھی بے ہوش ہوگئی ہے۔ مجھے مدد کی ضرورت ہے۔"

ان ٹوٹے پھوٹے فقروں نے میرے وجود میں ہلچل مچادی۔ شاید جنت گل بھی وہیں موجود تھی!

صندل خان جب اپنے سانسوں کی ٹوٹتی ہوئی لڑی کو سنبھالنے کی جاں گسل جدوجہد میں الجھا ہوا تھا اور اسے مدد کی شدید ضرورت تھی اس وقت ہم اس کے لئے کچھ بھی نہیں کرسکے تھے۔ بس اس کی ہمدردی میں اس کے گرد جمع ہوکر اپنے تجسس کی پیاس بجھاتے اور اس کے مرنے کا تماشا دیکھتے رہے۔ اس وقت اس کی بے جان لاش گور و کفن کے علاوہ ہر ضرورت سے بے نیاز ہوچکی تھی، ہم مُردے کی وہ ضرورتیں پوری کرنے کے قابل نہیں تھے جب کہ صندل خان کا دم نکلتے ہی ضیغم خان نے اپنی موجودگی اور پھر کسی عورت کی بے ہوشی کا اعلان کرکے گویا ہمارے سروں پر لٹھ دے مارا تھا۔ میں سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ اس قید خانے میں صندل خان کے ساتھ ضیغم خان بھی بند ہوگا۔

تہ خانے کی پتھریلی سیڑھیاں اترتے ہوئے میں نے یہ ضرور سوچا تھا کہ ہمارا سامنا صندل خان اور کچھنار کے خچروں والے سے ہوگا۔ اسی لئے جب میں نے تہ خانے کے ایک تاریک کونے میں انسانی ہیولے دیکھے تو سرسری طور پر انہیں نظرانداز کردیا تھا۔ کیونکہ اس وقت ہمارے لئے صندل خان سب سے اہم تھا۔

جوں ہی ضیغم خان کی زبان سے عورت کا لفظ نکلا، میری نظروں میں مسکراتی ہوئی جنت گل مجسم ہوگئی۔ اسی کے ساتھ میرے ذہن میں یہ خوف بھی ابھر آیا کہ تہ خانے کی نیم تاریک خلوت میں ہم سب کا یوں یکجا ہونا سنگین خطرے سے کم نہیں تھا۔ ویرا اور غزالہ کو پہلے ہی سے جنت گل کے بارے میں تجسس تھا۔ وہ اس سے مل بیٹھتیں تو اس سے سچ اگلوانے کی پوری پوری صلاحیت رکھتی تھیں۔ اس سچ کے انکشاف کے بعد میرے لئے سر اٹھانے کی بھی گنجائش نہ رہتی۔ عبدالرحیم خان کے فلیٹ کی رومان پرور خواب گاہ میں جنت گل کی دعوت انگیز پیش قدمیوں کو اپنے گلے کا ہار بناتے ہوئے میں نے سوچا بھی نہیں تھا کہ ایک دن دنیا اتنی مختصر ہوجائے گی کہ وہ کابلی دوشیزہ غزالہ کے روبرو آبیٹھے گی۔

صندل خان کی لاش سے اس تاریک گوشے کی طرف بڑھتے ہوئے میرے دل میں شدت سے اس آرزو نے سر ابھارا کہ کاش بے ہوش ہونے والی عورت جنت گل نہ ہو۔ شاید یہ میرے دل کی گہرائیوں سے نکلی ہوئی اس آرزو کا کرشمہ تھا کہ جب میں اس کونے میں پہنچا تو وہاں مرد کے کندھے سے لگی ہوئی ایک بھاری سی عورت ساکت بیٹھی ہوئی تھی جو جنت گل ہو ہی نہیں سکتی تھی۔ اس پر پہلی نظر ڈالتے ہی میرے دل میں اطمینان کی لہر دوڑ گئی۔

اس نیم تاریک، بدبودار اور سیلن زدہ قید خانے میں ضیغم خان اور ایک عورت کی موجودگی کے انکشاف نے ان تینوں کو بھی میرے پیچھے آنے پر مجبور کردیا تھا اور ہم چاروں ہی ایک ساتھ اس جوڑے تک پہنچے تھے۔

مرد قد آور اور جسیم تھا۔ بیٹھا ہوا ہونے کے باوجود اس کی پرشکوہ شخصیت نمایاں ہورہی تھی۔ اس کے پکے بال انگریزی طرز میں کٹے ہوئے تھے اور چہرہ داڑھی مونچھوں سے بے نیاز تھا۔ پائندہ گل کی کہانی درمیان میں حائل نہ ہوتی تو اسے آسانی سے جنت گل کا باپ سمجھا جاسکتا تھا۔ اس کے شانے سے لگی ہوئی بے ہوش عورت قدرے پستہ قامت اور فربہی مائل تھی۔ اس کے لمبے لمبے بال اس کے شانوں اور سینے پر بے ترتیبی سے بکھرے ہوئے تھے لیکن ناکافی روشنی کی وجہ سے ان دونوں کے خدوخال واضح نہیں ہورہے تھے۔

"یہ عورت کون ہے؟" اپنے فطری تجسس سے مجبور ہوکر پہلا سوال غزالہ نے کیا تھا۔

"میری بیوی!" ضیغم خان نے بے بسی سے کہا "وہ لوگ اس بے چارے کو ہم دونوں کے سامنے روئی کی طرح دھن رہے تھے یہ اس کی موت کے صدمے سے بے ہوش ہوئی ہے اسے سہارا دے کر نیچے لٹانے میں میری مدد کرو۔ میری ایک ٹانگ خراب ہے جس کی وجہ سے مجھے بوجھ اٹھانے اور ہلنے جلنے میں تکلیف ہوتی ہے۔"

وہ بگڑے ہوئے تلفظ کے ساتھ ٹوٹی پھوٹی اردو میں اپنے مدعا کا اظہار کررہا تھا، زبان پر پوری طرح قادر نہ ہونے کے باوجود اس نے جو طویل جواب دیا اس سے ظاہر ہورہا تھا کہ وہ بہت چرب زبان اور باتونی ہے۔

"اگر یہ تمہاری بیوی ہے تو پھر گونگی بھی ہوگی؟" اس کے خاموش ہوتے ہی ویرا پوچھ بیٹھی۔

ویرا کی قیاس آرائی نے اسے حیران کردیا "تمہیں کیسے معلوم کہ یہ گونگی بھی ہے؟"

"زبان ہوتی تو یہ چیخے بغیر اتنی آسانی سے بے ہوش نہ ہوتی۔" ویرا کے ذہن سے صندل خان کی موت کے صدمے کے فوری اثرات زائل ہوچلے تھے اور وہ نارمل ہوتی جارہی تھی۔ اس نے کہا "تم اندھیرے سے نکل کر روشنی میں آؤ۔ ہم تمہاری بیوی کو بھی وہیں لے آتے ہیں۔" پھر اس نے بڑھ کر اس عورت کے دونوں شانے تھام کر اسے دیوار سے ٹکا دیا۔

ضیغم خان ہتھیلیاں فرش پر ٹیک کر بدقت تمام اپنے پیروں پر کھڑا ہوا اور پھر عملی طور پر تقریباً پھدکتا ہوا اس طرف چل دیا جہاں ہوادان سے آنے والی روشنی پڑرہی تھی۔ ویرا، سلطان شاہ کے ساتھ مل کر اس عورت کو بھی روشنی میں لے آئی۔ وہ جگہ صندل خان کی لاش سے بہت قریب تھی۔

روشنی میں سامنے آنے کے بعد عورت کے چہرے کے مٹتے ہوئے نقوش ماضی کی کسی حسین و جمیل دوشیزہ کا سراغ دے رہے تھے۔ اگر سردار پائندہ گل اپنے عالم شباب میں ضیغم خان کے ایما پر اس کی طرف مائل ہوگیا تھا تو اس میں اسے بہت زیادہ قصوروار نہیں گردانا جاسکتا تھا۔ حسین عورت کسی پہاڑی ندی کی طرح ہوتی ہے جہاں سارے مرد آب رواں کی طرح ڈھلان سے بہہ بہہ کر چلے آتے ہیں۔ گھاٹی سیراب ہوتو وہاں رک جانے والا پانی دوسری ڈھلانوں پر بہہ نکلتا ہے۔ ایسا نہیں ہوتا کہ نشیب کی طرف قبولیت نہ ملنے پر پانی دوبارہ اپنے منبع کی طرف سفر شروع کردے۔ اس کا سفر نشیب ہی کی طرف رہتا ہے جہاں جابجا جوہڑ، ندی نالے اور کھیت کھلیان اسے قبول کرتے رہتے ہیں۔

دونوں عورتیں ضیغم کی بیوی کو ہوش میں لانے کی تدبیریں کرنے لگیں اور میں دوبارہ صندل خان کی لاش کے پاس پہنچ گیا جہاں ضیغم خان اپنے متاسفانہ چہرے کے ساتھ پہلے سے موجود تھا۔

"تم یہاں کیسے پہنچے؟" میں نے اس سے پوچھا "سنا ہے کہ تم لندن میں رہا کرتے تھے۔"

"میں حیران ہوں کہ تم لوگ میرے بارے میں اتنا کچھ جانتے ہو جب کہ میں تمہارے بارے میں کچھ نہیں جانتا۔" اس نے اپنی عادت کے مطابق لمبی بات چھیڑ دی "میں کابلی ہی ہوں کل یا پرسوں کی رات کو اپنے گھر میں سویا ہوا تھا۔ سب کچھ سوتے میں ہی ہوگیا۔ آج رات آنکھ کھلی تو ہم دونوں یہاں بند تھے اور اسے مار پڑرہی تھی۔ ابھی تک کسی نے مجھ سے کوئی بات کرنے کی ضرورت ہی نہیں سمجھی۔ پتا نہیں ہم کتنی دیر یا دنوں تک مسلسل بے ہوش رہے ہیں۔"

میں نے دل ہی دل میں سوچا کہ اپنے حریفوں کو بے ہوش کرکے خاموشی سے اپنے ٹھکانوں پر لے آنا شنگاریوں کا محبوب مشغلہ تھا۔ میں نے سوال کیا "تمہیں علم ہے کہ تم اب کہاں اور کن لوگوں کے درمیان ہو؟"

"جگہ کا اندازہ نہیں لیکن یہ شنگاری معلوم ہوتے ہیں، میں انہیں جانتا ہوں۔"

مجھے اس کے کہے بغیر ہی سمجھ لینا چاہیے تھا کہ وہ پائندہ گل کا دیرینہ دوست رہ چکا تھا اس لئے اسے شنگاری زبان سے کچھ نہ کچھ واقفیت ضرور ہونی چاہیے تھی۔ میں نے اس سے کہا "اس تہ خانے کے باہر کوئی نہ کوئی محافظ ضرور ہوگا۔ تم ہوادان کے نیچے سے چیخ کر اسے اپنی طرف متوجہ کرکے اس قیدی کی موت کی خبر دے دو۔"

"تم ٹھیک کہہ رہے ہو۔" وہ جلدی سے بولا "مُردے کی موجودگی کی اطلاع ملنے پر وہ فوراً یہاں آئیں گے۔ یہ لوگ توہم پرست ہیں۔ فوراً مُردے کا پیٹ چیر کر اس کی آلائشیں ضائع کردیں گے۔ انہیں یقین ہے کہ کوئی مُردہ پورے دوپہر تک جوں کا توں پڑا رہے تو اس کے پیٹ میں بدروحیں گھس جاتی ہیں اور پوری بستی عتاب میں آجاتی ہے۔"

"تم بہت بولتے ہو۔" میں نے اسے گھورتے ہوئے کہا "جو کچھ میں نے کہا ہے اس پر عمل کرو۔ یہ فضول باتیں بعد میں بھی کی جاسکتی ہیں۔ پتا نہیں ہمیں کب تک یہاں رہنا پڑے؟"

وہ پھدکتا ہوا ہوادان کے نیچے پہنچ گیا۔ اس کی دوسری آواز پر ہی اوپر سے ایک شنگاری کا چہرہ جھانکنے لگا۔ دونوں میں مختصر سے مذاکرات ہوئے اور شنگاری وہاں سے غائب ہوگیا۔

اس کی بیوی اس اثنا میں ہوش میں آچکی تھی۔ اسے قوت گویائی سے محروم کردیا گیا تھا مگر آنکھوں سے خوف و دہشت کا نمایاں اظہار ہورہا تھا۔ اس کی خوف سے ابلتی ہوئی آنکھیں صندل خان کی لاش پر جمی ہوئی تھیں۔

"ڈرو نہیں" غزالہ نے اس مظلوم عورت کو تسلی دیتے ہوئے کہا "ہم قید ضرور ہیں لیکن فی الحال ہمیں زیادہ خطرہ نہیں ہے۔ ویسے بھی ہماری تعداد چھ ہوگئی ہے۔ تم میری بات سمجھ رہی ہو نا؟"

گونگی نے اثبات میں سر ہلایا۔ اسی کے ساتھ اس کے شوہر کی زبان چل پڑی "گوہر جان اردو اور پشتو اچھی طرح سمجھ لیتی ہے مگر میری طرح شنگاری بولی نہیں سمجھ سکتی۔ زبان غائب ہونے کی وجہ سے یہ بول نہیں سکتی۔"

ہم میں سے کسی کے کچھ کہنے سے پہلے گوہر جان نے اپنا پورا دہانہ کھول دیا۔ ہم سب ہی اس کی المناک کہانی سے واقف تھے۔ اس لئے میں بھی اس کے کھلے ہوئے دہانے میں جھانکنے کی خواہش پر قابو نہ رکھ سکا۔ اس کے دانتوں کے پیچھے ایک بھیانک خلا تھا۔ بس حلق کی جڑ میں ایک لوتھڑا سا ہل رہا تھا۔

اس عورت کو دلاسا دینے کے بعد اس کے شوہر کے حوالے کردیا گیا۔ اس اثنا میں تین مسلح شنگاری تہ خانے میں اتر آئے اور خاموشی کے ساتھ صندل خان کی خون آلود لاش کو اٹھا کر لے جانے لگے۔ اس موقع پر بھی ضیغم خان اپنی زبان کی خارش پر قابو نہ رکھ سکا۔ اس نے ان کو مخاطب کرکے کچھ کہنے کی کوشش کی لیکن اسے بری طرح دھتکار دیا گیا۔ جواب میں کہی جانے والی بات ہماری سمجھ میں نہیں آئی تھی لیکن جوابی لب و لہجے اور ضیغم خان کے خائفانہ ردِعمل نے پوری صورت حال واضح کردی تھی۔ وہ کسی خوف زدہ چوہے کی طرح دبک کر بیٹھ گیا تھا۔

وہ تینوں لاش لے کر چلے گئے۔ دہانہ بند کردیا گیا مگر صندل

خان کے جسم سے بہنے والے خون کے بڑے بڑے لوتھڑے وہیں فرش پر جمے رہ گئے تھے۔ چند گھنٹوں بعد ان لوتھڑوں سے پیدا ہونے والا تعفن ناقابل برداشت ہو سکتا تھا۔

ضیغم خان اور گوہر جان کی اردو فہمی کی وجہ سے ہم کھل کر باتیں نہیں کرپارہے تھے اس لئے میں اپنے ساتھیوں کو ان دونوں سے بعید ترین گوشے میں لے گیا۔ وہاں بیٹھتے ہی ویرا نے دو سگریٹیں سلگا کر ایک میری طرف بڑھادی۔

"تم فرار کے معاملے میں سنجیدہ نہیں تھے پھر بھی تمہاری اور صندل خان کی باہمی رضامندی عذاب بنتی نظر آرہی ہے۔ قندوز خان ہمیں پھاڑ کھانے پر تلا ہوا تھا۔" ویرا نے اس معاملے پر اپنی تشویش ظاہر کرتے ہوئے کہا۔

"تم کو ہر ایک سے بلاوجہ باتیں کرنے اور جوڑ توڑ کرنے کا شوق ہے۔" غزالہ نے ویرا سے زیادہ سخت انداز اختیار کرتے ہوئے اپنی زبان کھولی "جس راستے نہیں چلنا اس کے کوس گننے کا کیا فائدہ؟ لیکن تم اپنی دھن میں لگے رہتے ہو۔ وہاں اچھے خاصے رہ رہے تھے۔ اب یہاں نہ جانے کیا کچھ بھگتنا پڑے گا؟"

"یہ تمہاری دعاؤں کا اثر معلوم ہوتا ہے۔" میں نے غزالہ کو چڑاتے ہوئے کہا "تم مہمان خانے میں شنگاریوں کی بھیڑ سے بچ کر کہیں اور رہنا چاہ رہی تھیں۔ یہاں ایک کابلی جوڑے کے علاوہ اور کوئی نہیں ہے۔"

"یہ نہ بھولو کہ وہ جلد ہی ہمارے ساتھ وہی سلوک کریں گے جو صندل خان کے ساتھ کیا ہے۔" غزالہ چڑ کر بولی "اس مہلت کو مذاق میں ضائع کرنے کے بجائے گلوخلاصی کی کوئی تدبیر سوچو۔"

"ہم پر تشدد نہیں کیا جاسکتا۔" میں نے اپنی سوچی سمجھی رائے ظاہر کی۔ صندل خان سے وہ بہت کچھ اگلوانا چاہتے تھے۔ ہم انہیں کچھ نہیں بتاسکتے۔ وہ لوگ ہماری اس خواہش سے باخبر ہیں کہ ہم جلد از جلد یہاں سے نکلنا چاہتے ہیں۔ سب سے اہم بات یہ ہے کہ ہم سے بگاڑ پیدا کرکے صبغت اللہ' جنت گل والے منصوبے سے دست بردار ہونا پسند نہیں کرے گا۔ اس معاملے سے اس کی ذاتی اور قبیلے کی انا منسلک ہے۔ میری اس سے دوبدو بات ہوئی ہے۔ میں اس کے جذبات کی شدت سے پوری طرح آگاہ ہوں۔ میں تم لوگوں سے یہ ذکر کرنا بھول گیا تھا کہ اس نے مجھے صندل خان کی نیت کا کھوج لگانے کا جو کام سونپا تھا' اس سلسلے میں مجھے کوئی فرضی سازش کرنے یا اس کی برائیاں کرنے کی اجازت بھی دے دی تھی تاکہ صندل خان مجھے اپنا ہم نوا سمجھ کر کھل سکے......"

"لیکن تم صبغت اللہ سے ملنے سے پہلے ہی صندل خان کو فرار کے منصوبے پر کام کرنے کے لئے کہہ چکے تھے۔" سلطان شاہ نے مجھے یاد دلایا "وقت کے اس فرق کو تم کہاں لے جاؤ گے؟"

"کہیں بھی نہیں۔" میں نے بے پروائی سے کہا "انہیں صندل خان کی سازش پکڑنے سے دلچسپی تھی۔ انہیں وقت وغیرہ کا ہوش ہی نہیں رہا ہوگا۔ پھر یہ بھی نہ بھولو کہ صندل خان نے میری اور صبغت اللہ کی ملاقات کے اگلے دن کچھنار کا سفر کیا تھا۔ یہ سب باتیں ہمارے حق میں جاتی ہیں۔ صندل خان کی موت کا مجھے بہت دکھ ہے۔ وہ ہمارے لئے فرشتہ ثابت ہوا تھا مگر اس کے مرنے کے بعد میں حقائق کو اپنی سہولت کے مطابق توڑ مروڑ سکتا ہوں۔ وہ میری کسی بات کی تردید کے لئے قبر سے اٹھ کر نہیں آئے گا۔"

"اگر صبغت اللہ نے تمہیں چھوٹ دی تھی تو پھر اب ہمیں یہاں کیوں ڈالا گیا ہے؟" ویرا نے پوچھا۔ وہ تینوں مشترکہ محاذ بنا کر میرے پیچھے پڑ گئے تھے اور اپنی ہر بات کا معقول جواب سننا چاہتے تھے۔

"قندوز خان میری اور صبغت اللہ کی مفاہمت سے لاعلم ہے۔ اسے جنت گل والے قصے کی تو ہوا بھی نہیں لگی ہے۔" میں نے اپنے ذہن میں کڑیوں کو یکجا کرتے ہوئے کہا "اس کے بعد میں بھی صبغت اللہ سے ملنے میں کامیاب نہیں ہوسکا۔ میرا خیال ہے کہ صندل خان کے اعترافات سننے کے بعد قندوز خان نے اشتعال کے عالم میں اپنے طور پر یہاں لا ڈالا ہے۔ صبغت اللہ بہت مصروف ہے۔ ہوسکتا ہے کہ قندوز خان نے یہ بات اسے بتائی ہی نہ ہو۔"

"تم پھر بھول رہے ہو کہ ہمیں حراست میں لیتے ہوئے قندوز خان نے واضح طور پر اپنے سردار کا پورا نام لیا تھا۔" سلطان شاہ کے ذہن میں واقعات کی ہر تفصیل پورے تسلسل کے ساتھ محفوظ تھی۔

"سپاہی ہر ایک کو قانون کے نام پر گرفتار کرتے ہیں۔ یہ ضروری نہیں ہوتا کہ چیف جسٹس اپنی زبان یا دستخطوں سے فرمان جاری کرے تب ہی گرفتاری ہوسکتی ہے۔ قندوز خان اس کا اہم نمائندہ ہے۔ وہ جو کچھ کرتا ہے اسے صبغت اللہ کی پوری پشت پناہی حاصل ہوتی ہے۔ مجھے پورا یقین ہے کہ ہمارے بارے میں غلط فہمی ہوئی ہے۔ تہ خانے میں داخل ہونے تک میں بھی بہت پراگندہ ذہنی کا شکار تھا لیکن اب پوری صورت حال کا تجزیہ کرنے کے بعد میں مطمئن ہوں کہ ہمارا بال بھی بیکا نہیں ہوگا۔ قندوز خان کو ہمارے سامنے ندامت اور شرمندگی کا منہ دیکھنا ہوگا۔"

"خدا کرے کہ ایسا ہی ہو۔" سلطان شاہ بولا "ابھی تک ایک ہی بات کا اطمینان ہے کہ انہوں نے ہمیں صرف قید میں ڈالا ہے۔ تشدد کرنا ہوتا تو ہمیں مہمان خانے سے ہی بُرے سلوک کا نشانہ بنانا شروع کردیتے۔"

"مجھے حیرت اس بات کی ہے کہ کابلی ہنسوں کا جوڑا بھی یہیں موجود ہے۔" ویرا نے اپنی طرف سے بے فکر ہوتے ہی آگے سوچنا شروع کردیا۔ "ان کی یہاں موجودگی کا کیا مطلب ہوسکتا ہے؟"

"اس نے خود ہی بتایا ہے پچھلی رات ان دونوں کو ہوش آیا تو وہ یہیں تھے اور صندل خان پر تھرڈ ڈگری آزمائی جارہی تھی۔" میں

نے اپنے تجزیے کی روشنی میں کہا "ان دونوں سے ابھی تک کسی نے کوئی بات بھی نہیں کی ہے۔ اس سے صرف یہی ظاہر ہوتا ہے کہ فی الحال انہیں صرف بُرے انجام سے ڈرایا جارہا ہے۔ ان دونوں کو گالان لایا گیا تو صندل خان کو خون میں نہلایا جارہا تھا۔ وہ ایک تیر سے دو شکار کرنے کا سنہرا موقع تھا۔ اس سے زیادہ ڈرامائی صورت حال اور کیا ہوسکتی ہے کہ اپنے بستر پر سونے کے بعد آدمی ہوش میں آئے تو ٹارچر سیل میں موجود ہو اور اس کی نگاہوں کے سامنے کسی کو مرحلہ وار قتل کرنے کی ست کارروائی جاری ہو۔ اب بادرانی ان دونوں سے جو چاہیں گے وہ کہلوالیں گے۔ صندل خان کا دہشت ناک انجام ضیغم خان کا حوصلہ پست کرچکا ہے۔"

"تم میں یہی سب سے بڑی خرابی ہے کہ بعض اوقات تم بہت تیزی سے سوچنے لگتے ہو۔" ویرا بُرا سا منہ بنا کر بولی "تم نے اتنی جلدی نتائج پر چھلانگ نہ لگائی ہوتی تو ہم اس مسئلے پر سر کھپا کر آرام سے اپنا کافی وقت گزار سکتے تھے۔ دونوں باتیں طے ہوجانے کے بعد ہم اب انتظار کی کوفت میں مبتلا رہیں گے۔"

"ان دونوں سے چھیڑ چھاڑ جاری رکھی جاسکتی ہے۔" سلطان شاہ نے ضیغم خان اور گوہر جان کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا "ابھی تک ہم دوسروں سے ان کی کہانی سنتے آئے ہیں۔ ہوسکتا ہے کہ ان کے اعترافات زیادہ دلچسپ ہوں۔ ایک بار بات چل نکلی تو کسی نہ کسی طرح جنت گل کا ذکر بھی نکال لیا جائے گا۔"

"یہ تجویز مناسب ہے۔" ویرا اور غزالہ نے بیک آواز کہا۔

اس وقت مجھے احساس ہوا کہ عورت کہیں کی اور کیسی ہی ہو' اسے دوسروں کی نجی زندگی میں جھانکنے کی شدید خواہش رہتی ہے۔ مشرق و مغرب' شہر اور دیہات' کراچی اور گالان' جہالت اور اعلیٰ تعلیم سے اس فطری تجسس میں کوئی فرق نہیں پڑتا جو شاید عورت کے خمیر ہی میں شامل ہوتا ہے اور اس کے جسم سے روح کا رشتہ منقطع ہونے تک رنگ دکھاتا رہتا ہے۔

"اے! تم دونوں اُدھر کیوں چھپے ہوئے ہو؟" بات طے ہوتے ہی ویرا نے قدرے اونچی آواز میں اُن دونوں کو پکارا "ادھر روشنی میں آکر ہمارے ساتھ کیوں نہیں بیٹھتے؟ ہم سب آپس میں باتیں کرکے اس ماحول کی دہشت کو کافی کم کرسکتے ہیں۔ اٹھ کر آگے آجاؤ۔"

ان دونوں کی طرف سے ایک مرتبہ پھر وہی سانپ کی دبی دبی پھنکار سی سنائی دی جو میں اس زیر زمین قید خانے میں داخل ہوتے وقت بھی سن چکا تھا۔ اس بار میں نے اندازہ لگالیا کہ وہ آواز ضیغم خان کی گونگی بیوی گوہر جان کے ہونٹوں سے برآمد ہوئی تھی۔ زبان نہ ہونے کی وجہ سے' اس کے دہانے سے وہ آوازیں شاید اس وقت نکلتی تھیں جب وہ اضطراری طور پر کوئی مخصوص الفاظ ادا کرنے کی کوشش کرتی تھی۔

چھت میں بنے ہوئے ہوادان سے آنے والی روشنی کا رخ غیر محسوس انداز میں بدلتا جارہا تھا مگر اس کے قرب وجوار میں بھی اتنی روشنی تھی کہ ہم آسانی سے ایک دوسرے کو دیکھ سکتے تھے۔ ہم صندل خان کے خون سے آلودہ حصے سے بچ کر ایک ہی جگہ بیٹھ گئے۔ اس وقت دن کا وقت تھا اور ہم سب ہی اپنے تفکرات کے باوجود خاصے حوصلے دکھا رہے تھے لیکن میں اس بارے میں فکرمند تھا کہ ہمیں رات بھی اسی تہ خانے میں گزارنی پڑی تو گھور اندھیرے اور سیلن میں ہم کیا کریں گے۔ مجھے دوسرا خوف ان حشرات الارض کی طرف سے دامن گیر تھا جو اندھیرا پھیلتے ہی اپنی خوراک کی تلاش میں زمین دوز بلوں اور سوراخوں سے ابل پڑتے۔

"تم لوگ ہم دونوں کے بارے میں بہت سی باتیں جانتے ہو لیکن تم نے اپنے بارے میں ابھی تک کچھ بھی نہیں بتایا۔ تم یہاں کے لوگوں کے لباس میں ہونے کے باوجود ان میں سے نظر نہیں آرہے۔ تم کون ہو؟ کہاں سے آئے ہو؟ اور کس جرم کی سزا میں اس عقوبت کدے میں ڈالے گئے ہو؟" سکون سے بیٹھنے کے بعد لنگڑے ضیغم خان نے ایک ہی سانس میں بیک وقت کئی سوالات کر ڈالے۔

ضیغم خان کے گھناؤنے کردار سے بخوبی واقف ہونے کی وجہ سے میں کسی بھی طرح اسے قبول ہی نہیں کرپارہا تھا۔ میرے دل میں اس کے لئے نفرت' بغض اور تحقیر کے کینہ انگیز جذبات پرورش پارہے تھے۔ ایک ایسا شخص جو اپنی جھوٹی خود پرستی کی خاطر' اپنی جوان اور حسین بیوی کو زبردستی اپنے ایک دوست کی گود میں دھکیل دے' وہ کسی بھی طرح عزّت اور محبّت کے قابل نہیں ہوسکتا۔ میں نے اپنے چہرے پر نمودار ہونے والے تاثرات کو ضیغم خان سے پوشیدہ رکھنے کے لئے اپنا منہ دوسری طرف پھیر لیا مگر ویرا نے اس کے ساتھ بات جاری رکھی۔

"ہمیں کراچی سے اغوا کرکے شنگارا ویلی لایا گیا ہے۔" ویرا نے شاید تفصیل میں جانے کا ارادہ کرتے ہوئے' بات شروع کی تھی کہ ضیغم خان نے حسب عادت اس کی بات وہیں سے اچک لی۔

"اوہ! تو اس وقت ہم شنگارا ویلی والوں کے قیدی ہیں۔" اس کی آواز تحیر زدہ تھی "کیا نام ہے اس جگہ کا؟ ابھی تک تو میں یہ سوچ رہا تھا کہ شنگاریوں نے ہمیں افغانستان ہی کے کسی علاقے میں قید کیا ہوا ہے۔"

"تو کیا شنگارا ویلی افغانستان میں شامل نہیں ہے؟" اس بار ویرا نے حیرت سے پوچھا تھا۔

"کاغذ پر لکیریں لگانے سے کہیں بھی سرحدیں نہیں بنا کرتیں۔" اس کا جواب بہت فکر انگیز تھا "جب ان لکیروں میں رہنے والے ہی خود کو ان سرحدوں کا پابند نہ سمجھتے ہوں تو ان کا ہونا یا نہ ہونا یکساں ہوتا ہے۔ اس لئے ایسا جھوٹ بولنے سے کوئی فائدہ نہیں ہوتا۔ شنگاری افغانستان کو مانتے ہیں' نہ اس کے آئین اور قانون کو۔ وہ اپنے سرداری نظام سے خوش چلے آرہے ہیں۔ اس

علاقے میں سردار کی رضا ہی قانون کا درجہ رکھتی ہے۔ تم نے یہ نہیں بتایا کہ ہم شنگارا ویلی کے کس علاقے میں قید کئے گئے ہیں؟" اس کی زبان بمشکل رکنے پر آئی تھی۔

"شاید اسے گالان کہتے ہیں۔" ویرا نے سرسری لہجے میں کہا "ہم کئی دن سے یہاں قید ہیں۔"

"اوہ! پھر تو یہ شنگارا ویلی کا دارالخلافہ ہے۔ یہاں تم سردار پائندہ گل سے بھی ملی ہوگی؟"

"ابھی تک سردار کا ذکر ہی سنتے رہے ہیں' اس سے ملنے کی نوبت نہیں آئی۔" ویرا نے چالاکی سے کام لیتے ہوئے گول مول جواب دیا "کیا تم یہاں کے سردار سے واقف ہو؟" آخری سوال کرتے ہوئے بھی اس نے خونی انقلاب کے بعد برسراقتدار آنے والے صبغت اللہ کا نام نہیں لیا۔

"جانتا ہوں۔ میں اسے جانتا ہوں۔" اس کی آواز فکر آمیز اور گہری ہوگئی "لیکن میں حیران ہوں کہ یہاں سے جس آدمی کی لاش اٹھائی گئی' اس کا نام صندل خان تھا۔ صندل خان تو سردار پائندہ گل کا خاص مصاحب اور خوشامدی ہوا کرتا تھا۔ پھر اس پر تشدد کرکے موت کے منہ میں دھکیلنے والے اس سے ایسے سوال کررہے تھے جیسے اس نے بغاوت کی ہو۔ اس وادی کے باسی آسانی کے ساتھ اپنی وفاداریاں نہیں بدلا کرتے۔ کہیں ایسا تو نہیں کہ یہاں کوئی خون خرابہ ہوا ہو اور اب سب کچھ بدل گیا ہو۔ میرے سر پر ان باتوں کا بہت بوجھ سوار ہے۔ تم کچھ جانتی ہو؟"

اس نازک موڑ پر میں نے گفتگو میں شریک ہونے کا فیصلہ کرکے کہا "یہ کیا بتائے گی؟ مجھ سے سنو کہ یہاں کچھ نہ کچھ ضرور ہوا ہے۔ گولیاں چلی ہیں تو خون ریزی بھی ہوئی ہوگی۔ مگر ہمیں یہ نہیں معلوم کہ یہ سب کچھ کیوں ہوا تھا اور اس کا نتیجہ کیا نکلا۔ ہمیں خود بھی صندل خان کو یہاں دیکھ کر حیرت ہوئی تھی۔"

"اس نے مرنے سے پہلے تم سے بہت باتیں کی تھیں۔" ضیغم خان نے متجسس لہجے میں پوچھا "اس کی آواز بہت کمزور اور دھیمی تھی جو مجھ تک نہیں پہنچ رہی تھی۔ اس نے تمہیں کچھ نہ کچھ تو بتایا تھا۔ تم مجھے وہی بتادو۔ شاید میں یہاں کے حالات کا اندازہ لگانے میں کامیاب ہوجاؤں۔" وہ بہت کائیاں معلوم ہورہا تھا۔

"حالات کا اندازہ لگالینے سے کیا فرق پڑے گا؟" ویرا نے میری لائن پر چلتے ہوئے پوچھا۔

"بہت کچھ!" ضیغم خان کی آواز پرجوش ہوگئی "اگر پائندہ گل زندہ ہے تو تم یقین کرو کہ میں اس سے سامنا ہوتے ہی تم سب کو بچالوں گا۔ وہ میری بات نہیں ٹال سکے گا۔ اگر وہ معزول کیا جاچکا ہے تو میں کچھ بھی نہیں کرسکتا۔ میری امیدیں اسی کی زندگی سے وابستہ ہیں۔" اس مرحلے پر اس کی بیوی نے اپنے حلق سے خرخر کی بے معنی آوازیں پیدا کرکے اپنے شوہر کی پشت پر زور سے ایک ہاتھ مارا تو وہ خفت آمیز انداز میں ہنستے ہوئے اس سے ذرا دور سرک گیا۔

"میری بیوی پائندہ گل کو پسند نہیں کرتی۔" اس نے اپنی بات کا تسلسل جاری رکھتے ہوئے کہا "بلکہ شاید نفرت کرتی ہے مگر اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ پائندہ گل' گوہر جان کے جذبات کو خوب سمجھتا ہے۔"

"یہ بہت عجیب اور دلچسپ بات ہے۔" غزالہ بول پڑی "تمہیں اس پر ناز ہے اور تمہاری بیوی اس سے نفرت کرتی ہے تو اس کی کوئی بہت گہری وجہ ہوگی۔ ہمیں اس کے بارے میں بتاؤ۔"

"اس میں تمہارے لئے کچھ بھی نہیں ہوگا۔" وہ ٹالنے کے انداز میں بولا "وہ ہم تینوں کا آپس کا معاملہ ہے۔ جس کا ذکر کرنا بھی اچھا نہیں لگتا۔ تم مجھے صندل خان کی آخری باتوں کے بارے میں بتاؤ۔ ہم سب کی بقا کے لئے یہ جاننا بہت ضروری ہے کہ گالان میں اس وقت کون حکمراں ہے اور یہاں کے کیا حالات ہیں۔"

"اس کی ایک ہی بات میری سمجھ میں آسکی کہ اسے بادرانیوں کی قید میں مرنے کا افسوس تھا۔" اس کی ضد دیکھتے ہوئے میں نے تھوڑا سا کھلنے کا فیصلہ کرلیا "اس کی بقیہ باتیں بے ربط سی تھیں۔"

میرے الفاظ پر وہ لنگڑا اچھل پڑا "اس کا مطلب ہے کہ صرف چالیس برس بعد گالان کی زمین پھر خون میں نہاگئی۔ پائندہ گل کا باپ' شہباز پیرکوٹی کو فنا کرکے اقتدار پر قابض ہوا تھا اور اب بادرانیوں نے پائندہ گل کو مار ڈالا ہے۔ اگر وہ مارا جاچکا ہے اور یہاں بادرانی حکمراں ہیں تو سمجھ لو کہ ہم سب بھی مارے جائیں گے۔"

"بادرانیوں کو ہم سے کیا پرخاش ہوسکتی ہے؟" میں نے اس کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا۔

"تم سے نہ ہو لیکن وہ ہم دونوں میاں بیوی کو نہیں بخشیں گے۔ تم نے میرے دل میں ہول پیدا کردیا ہے۔"

"کیوں؟ اس کی کوئی نہ کوئی وجہ ضرور ہوگی۔" غزالہ نے اصرار کیا۔

وہ چند ثانیوں تک اپنا سر تھامے بیٹھا رہا۔ گوہر جان نے اسے دو مرتبہ جھنجوڑ کر تھپڑ لگائے مگر ضیغم خان اسے جھڑک کر رہ گیا۔ وہ ان دونوں کے مراسم کا عجیب پہلو تھا جو دونوں عورتوں کے لئے دلچسپی کا باعث تھا۔

"سردار پائندہ گل مرگیا....." آخرکار ضیغم خان نے اپنی بیوی کی طرف دیکھتے ہوئے سپاٹ آواز میں کہا "اب تو تیرے دل میں ٹھنڈ پڑگئی ہوگی' تجھے سکون مل گیا ہوگا۔"

گوہر جان کی آنکھیں اندرونی جوش سے چمکنے لگیں۔ ہونٹوں پر بہت جان دار مگر استہزائیہ مسکراہٹ ابھر آئی اور اس نے اپنے حلق سے عجیب و غریب آوازیں نکالتے ہوئے اپنے سر کو اثبات میں ہلانا شروع کردیا۔ جنت گل کی گونگی ماں کی طرف سے خوشی کا وہ نرالا اظہار فطری اور قابل فہم تھا۔

"وہ مرچکا ہے۔" ضیغم خان بدستور گوہر جان کی طرف دیکھتے ہوئے بولا "بادرانیوں سے جان بچانے کے لئے ہمیں وہی کہنا ہوگا جو میں اب کہہ رہا ہوں' کان کھول کر سن لے کہ پائندہ گل دوبارہ زندہ نہیں ہوسکتا۔ تو نے میرا ساتھ دیا تو میری بات کو کوئی نہیں جھٹلا سکے گا۔ تھوڑی سی ردوبدل کرکے ہم سارا الزام اسی کے سر ڈال سکتے ہیں۔" شاید اس خبیث کا سازشی ذہن کوئی اور ہی کہانی سوچ رہا تھا۔

میں نے اس کا ذہنی ارتکاز ختم کرنے کے ارادے سے سوال کیا "تم نے یہ کیسے فرض کرلیا کہ پائندہ گل زندہ نہیں ہے؟ یہ بھی تو ہوسکتا ہے کہ بادرانیوں نے اسے معزول کرکے اپنا قیدی بنالیا ہو۔"

گوہر جان نے سرہلا کر میرے سوال کی معقولیت کی تائید کی اور جواب طلب نظروں سے اپنے شوہر کو گھورنے لگی۔

"شنگارا ویلی میں اقتدار کی لڑائی کا فیصلہ کسی ایک بڑے کی موت کے بغیر نہیں ہوتا۔" لمحہ بھر بعد ضیغم خان کی زبان چلنے لگی "بادرانیوں کو پائندہ گل کی موت کے بعد ہی فتح حاصل ہوئی ہوگی اور اس کے حامیوں نے ہتھیار ڈالے ہوں گے۔ اگر اس کے لشکری میدان چھوڑ کر بھاگ جاتے اور وہ اکیلا رہ جاتا' تب بھی وہ جنگی قیدی بننے کی ذلت اٹھانے کے بجائے خودکشی کرلیتا۔ یہ اس وادی کی روایت ہے اور پائندہ گل مجھے اپنی روایتوں کے بارے میں بہت کچھ بتاتا رہتا تھا۔" پھر وہ اچانک ہی جھنجلا گیا "یہ تم کیا خرافات لے بیٹھے؟ مجھے یکسوئی کے ساتھ اپنی بیوی سے بات کرنے دو۔"

ضیغم خان کے جواب سے گوہر جان کے چہرے پر اطمینان کی لہر دوڑ گئی تھی۔ ضیغم خان فوراً ہی اس سے مخاطب ہوگیا "تو سن رہی ہے نا" اپنی بیوی سے تائیدی اشارہ پاکر اس نے اپنی بات جاری رکھی "وہ میرا دوست تھا اور اکثر مجھ سے ملنے کے لئے ہمارے گھر آتا رہتا تھا۔ اسے بڑا دکھ تھا کہ اس کی اولادیں پیدا ہوکر مرجاتی ہیں۔ وہ نئی شادی کرنے سے پہلے یہ جاننا چاہتا تھا کہ اس کے بچوں کی موت کہیں اس کی کجی یا کمزوری کے باعث تو نہیں ہوتی۔ میں اس کی ہاں میں ہاں ملاتا رہا۔ مجھے یہ معلوم نہیں تھا کہ وہ حرامی میرا ہی گھر تاک رہا ہے۔ ایک رات اس نے ہم دونوں کے پینے کے دودھ میں بہت سی افیم ملادی اور ہم نشے میں گہری نیند سوگئے تو وہ تیرے پاس پہنچ گیا۔ صبح تو نے مجھ پر الزام لگایا کہ میرے بلائے ہوئے دوست نے تیرے ساتھ بدسلوکی کی ہے اور اس الزام تراشی پر مجھے طیش آگیا۔ میں نے تجھے گرا کر تیری زبان کاٹ دی اس طرح سب کچھ وہی رہے گا بس میری پیشانی کا داغ ہلکا ہوجائے گا۔ بادرانی فوراً مان لیں گے کہ سردار پائندہ گل نے کابل کے ایک گھرانے کو تباہ کرنے کی کوشش کی تھی۔"

گوہر جان نے ہاتھ کے اشاروں اور بے معنی آوازوں کے ذریعے کچھ کہا جو ہم میں سے کسی کے لئے بھی قابل فہم نہیں تھا مگر ضیغم خان پوری طرح اس کی طرف متوجہ تھا۔ اس کی بات مکمل ہونے پر وہ مفاہمانہ انداز میں کہنے لگا "اس میں بیس اور بائیس برس کی بات ہی نہیں ہے۔ مجھ سے آج تک کسی نے کچھ پوچھا' نہ میں نے کسی کو کچھ بتایا۔ تو گونگی ہوچکی ہے۔ لوگوں کی باتیں سن کر اقرار یا انکار ہی کرسکتی ہے۔ لوگ اپنی اپنی باتیں بناتے رہے اور وہی آگے پھیلتی رہیں۔ پہلے بھی پائندہ گل گناہ گار تھا۔ میری کہانی میں بھی وہ گناہ گار ہے۔ اس سے کچھ بھی نہیں بدلتا۔ ہمیں یہاں اسی لئے لایا گیا ہے کہ بادرانی پرانی راکھ کو کریدنا چاہتے ہیں۔ وہ اس بارے میں ضرور بات کریں گے۔ بات چھیڑی تو ہم دونوں اسی کہانی پر جم جائیں گے۔ میں صاف کہہ دوں گا کہ ہمیں پائندہ گل سے ڈر لگتا تھا۔ اگر ہم کابل میں پھیلنے والی شرمناک کہانی کی تردید کرکے اسے لٹیرا قرار دیتے تو وہ ہمیں مروا دیتا۔ اس لئے ہم کبھی حقیقت زبان پر نہ لائے کیونکہ جو بے آبروئی ہونی تھی' وہ پہلے ہی ہوچکی تھی۔ میں نے تیرے ہاتھوں اتنی مار کھائی ہے اور ایسے ایسے دکھ اٹھائے ہیں کہ میری سزا پوری سے بھی زیادہ ہوچکی ہے۔ اب تجھے ہر حال میں میری بات کو اونچا رکھنا ہوگا۔"

گوہر جان نے اس کے سینے پر زوردار الٹا ہاتھ مارا اور ساتھ ہی اس کے حلق سے ایک بھیانک آواز برآمد ہوئی۔ اس نے منہ کھول کر زوردار قہقہہ لگایا تھا۔ پھر وہ فوراً ہی سنجیدہ ہوگئی۔ ضیغم خان بُرے بُرے منہ بنا کر اپنا سینہ سہلا رہا تھا۔ شاید وہ ہر وقت ہی اپنی بیوی سے پٹنے کا عادی ہوچکا تھا۔ اس کے احساس جرم نے اس سے ہر جوابی کارروائی کی قوت چھین لی تھی۔ وہ دونوں اپنے اپنے زخموں سمیت ایک دوسرے کے ساتھ رہنے پر مجبور تھے۔

میں ان کی پوری کتھا سے بخوبی واقف تھا۔ اس لئے آسانی سے سمجھ گیا کہ ضیغم خان نئی کہانی کے ذریعے اپنے گھناؤنے کردار کو پارسائی کا لبادہ پہنانا چاہ رہا تھا۔ کمال کی بات یہ تھی کہ اس نے اس پوری مدت میں ایک بار بھی جنت خانم یا جنت گل کا نام نہیں لیا تھا۔

میں نے انجان بن کر' ضیغم خان کو گھورتے ہوئے کہا "معلوم ہوتا ہے کہ تم دونوں اپنی جان بچانے کے لئے' مرے ہوئے پائندہ گل پر بہتان طرازی کا منصوبہ بنارہے ہو۔ تھوڑی دیر پہلے تمہاری ساری امیدیں پائندہ گل کی ذات سے وابستہ تھیں۔ بادرانیوں کی حکمرانی کا اندازہ لگاتے ہی تم نے اسے حرامی' مار آستین اور دوستوں کی عزّت کا قاتل قرار دینا شروع کردیا۔ ہوسکتا ہے کہ اس بے چارے نے تمہاری بیوی کی شکل بھی نہ دیکھی ہو۔ تم بلاوجہ ایک شریف مُردے کے خلاف ناپاک سازش تیار کررہے ہو۔"

وہ الجھن آمیز نظروں سے میری طرف دیکھتے ہوئے بولا "تم اس بارے میں کچھ نہیں جانتے اس لئے میرا راستہ کاٹ کر مجھے مصائب میں مبتلا کرنے کی کوشش مت کرو۔ آؤ! میں علیحدگی میں تمہیں کچھ اور بھی بتاتا ہوں۔ میری پوری بات سن کر تم حیرت سے اپنی انگلیاں چبا ڈالو گے۔ تمہاری عورتوں کے سامنے یہ بات

مناسب نہیں ہوگی۔"

"نہیں' ہربات ہمارے سامنے ہوگی۔" ویرا نے سختی سے احتجاج کیا "تم اتنی دیر سے ہمارے سامنے گندی اور بے ہودہ باتیں کررہے ہو۔ اس وقت ہماری موجودگی کا خیال نہیں آیا تو اب کیوں شرما رہے ہو؟"

"مجھے اپنی عزّت بھی عزیز ہے۔" وہ بے بسی کے ساتھ بولا۔ اس کا چہرہ لٹک گیا تھا۔

"ابھی تم خود ہی بتا چکے ہو کہ پائندہ گل نے تمہاری عزّت کے ساتھ غیرت کے بھی چیتھڑے اڑادیئے تھے۔" ویرا نے بے رحمی سے کہا "تمہارے پاس اب رہ ہی کیا گیا ہے جسے تم بچانا چاہ رہے ہو۔"

"تم مجبور کررہی ہو تو سنو!" چند ثانیوں کے بوجھل سکوت کے بعد اس نے شکست خوردہ آواز میں کہنا شروع کیا "وہ رات گزر گئی۔ جو ہونا تھا' وہ ہوگیا۔ میں لاولد تھا۔ میں نے پائندہ گل کی اس ذلیل حرکت کو اپنی قسمت کا لکھا سمجھ کر تسلیم کرلیا۔ اپنی اس المناک پامالی کے بعد گوہر جان ایک بچی کی ماں بنی اور ہم نے اس کا نام جنت خانم رکھا مگر دیکھنے والوں کو اس لڑکی کے چہرے مہرے میں پائندہ گل کے خدوخال نظر آنے لگے۔ اس کا نام خود بخود جنت گل پڑگیا۔ ہم نے بڑی محنت سے اسے پالا پوسا لیکن ہم اس کے گندے شنگاری خون کو نہیں سنبھال سکے۔ وہ بگڑ چکی ہے۔ ہمارے ساتھ رہنے کے بجائے اپنے مرضی کے لوگوں میں گھری رہتی ہے۔ کچھ دنوں سے وہ کابل کی مجلسوں میں ایک انوکھی ہی بات پھیلاتی پھر رہی ہے۔ اس نے پائندہ گل کے کسی یرغمالی سے منہ کالا کرکے تمام شنگاریوں کے منہ پر تھوک دیا ہے۔ یہ بھی سننے میں آیا ہے کہ اس نے پائندہ گل کے اکلوتے بھانجے کا خون کیا ہے۔ پائندہ گل کے آدمی کابل میں اسے ڈھونڈتے پھر رہے ہیں مگر وہ کہیں چھپ گئی ہے۔ وہ لڑکی میرے لئے اولاد سے زیادہ عذاب بن چکی ہے۔"

"بدبودار کیچڑ میں گلاب نہیں کھلا کرتے۔" غزالہ نے ترشی سے کہا "تم نے پائندہ گل کی حوصلہ افزائی کی ہو یا اس نے خود گوہر جان پر بری نظر ڈالی ہو' اس کا نتیجہ اچھا ہو ہی نہیں سکتا تھا۔ تم نے اس فتنے کو پال پوس کر اپنے ہی نہیں اور نہ جانے کس کس کے پاؤں پر کلہاڑی ماری ہے۔" غزالہ کے لئے جنت گل کا نام ہی ناقابل برداشت تھا۔ اس نے لگی لپٹی رکھے بغیر اپنے دل کی بھڑاس نکال لی۔

"کابل میں شنگاریوں نے اسے تلاش کرنا شروع کیا تو میں نے سکھ کا سانس لیا تھا کہ اب ہمیں اس کی ذات سے پیدا ہونے والی رسوائیوں سے نجات مل جائے گی۔ یہ بدبخت بادرانی اس کے بجائے ہمیں یہاں اٹھالائے۔ سمجھ میں نہیں آتا کہ یہ کیا ہورہا ہے؟" وہ الجھا ہوا اور آزردہ نظر آرہا تھا۔

"تم نے اسے جوان ہونے سے پہلے ہی کسی کے ہاتھ بیچ کیوں نہیں دیا؟" اچانک ویرا پوچھ بیٹھی "تمہارے یہاں تو شاید دلور کی رسم ہوتی ہے۔ دو چار لاکھ بھی ہاتھ آجاتے اور اس سے پیچھا بھی چھوٹ جاتا۔"

"کاش! تم نے اس کی باتیں سنی ہوتیں!" ضیغم خان ایک گہرا سانس لے کر درد بھری آواز میں بولا "وہ ہربات وقت اور اپنی عمر سے پہلے جانتی رہی ہے۔ مجھے دھمکیاں دیتی رہتی ہے کہ میں نے اس کی مرضی کے خلاف اس کی بات چلائی تو وہ روپوش ہوجائے گی پھر سنا کہ وہ پشاور میں پائندہ گل کے بھانجے سے عشق لڑا رہی ہے۔ آخر میں خبر آئی کہ اس نے عبدالرحیم خان کو مار ڈالا......"

گوہر جان نے حلق سے آواز نکال کر اسے اپنی طرف متوجہ کیا اور شہادت کی انگلی سے بار بار اس کی طرف اشارہ کرکے دونوں ہاتھ چلانے لگی۔ اس جوش و خروش میں اس کے منہ سے عجیب اور ڈراؤنی آوازیں بھی نکل رہی تھیں۔ ضیغم خان کی تیوریوں پر بل پڑنے لگے۔ وہ بے زاری کے عالم میں گوہر جان کی طرف دیکھتا رہا۔ پھر بے رخی سے بولا "ہاں یہ میرا گناہ ہے جو میرے سر پر ناچ رہا ہے۔ تو ہمیشہ ایسی ہی باتیں کرکے میرا خون جلاتی رہ۔ جب اسے جان سے مارنے کا ارادہ کیا تھا تو تیری ممتا تڑپ اٹھی تھی' اب طعنے دے رہی ہے۔"

گوہر جان کے ردّعمل سے پتا چل گیا کہ ضیغم خان نے اس کا مفہوم سمجھنے میں غلطی نہیں کی تھی۔ وہ عورت زبان سے محروم ہوجانے کے باوجود اپنے شوہر سے برابر کا مقابلہ کررہی تھی۔ دونوں عورتیں حیران نظروں سے وہ منظر دیکھنے لگیں اور میں وہاں سے اٹھ گیا۔

وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ میری تشویش میں اضافہ ہوتا جارہا تھا۔ مجھے پورا یقین تھا کہ قندوز خان کے ذریعے جوں ہی صبغت اللہ کو یہ معلوم ہوگا کہ ہمیں قید کردیا گیا ہے وہ فوراً ہماری رہائی کا فرمان جاری کردے گا۔ اس عمل میں زیادہ دیر نہیں لگنی چاہیے وہاں کے ماحول میں یہ ممکن نہیں تھا کہ قندوز خان وہ اہم خبر کئی گھنٹوں تک اپنے سردار کو نہ پہنچا سکے۔ صبغت اللہ لوگوں سے ملنے ملانے میں ضرور مصروف تھا مگر یہ بات ناقابل فہم لگتی تھی کہ قندوز خان کو اس کے پاس پھٹکنے کا موقع ہی نہ مل رہا ہو۔

شنگاریوں کا دن سورج کی پہلی کرن کے ساتھ شروع ہوتا تھا اور سورج ڈھلتے ہی ان کے یہاں رات آجاتی تھی۔ وہ کھانے پینے سے فارغ ہوکر جلد سوجانے کے عادی تھے۔ جنگ کی تیاریوں اور بعد کی مصروفیات نے ان سب کو کافی سے زیادہ تھکایا ہوا تھا۔ میرا خیال تھا کہ وہ پہلی فرصت میں تھکان اتارنے کے لئے سرشام ہی بستروں میں جاگھسیں گے۔ کچھ اور وقت گزر جاتا تو ہماری رہائی کا معاملہ اگلے دن پر ٹل جاتا اور ہم رات کے گھور اندھیرے میں خطرناک حشرات الارض کے رحم و کرم پر رہ جاتے۔ صندل خان کے سڑتے ہوئے خون کی بو انہیں ہماری کمین گاہ کی طرف متوجہ کرسکتی تھی۔ غنیمت یہ تھا کہ ہمیں مرحوم صندل خان کی مہربانی سے صاف ستھرے مقامی ملبوسات میسر آگئے تھے اور ہمارے پیر بھی

چپلوں سے محروم نہیں تھے۔

جب اجالا بالکل ہی ماند پڑنے لگا اور ہم سب شنگاریوں کے طویل انتظار سے یکسر مایوس ہوچکے تھے تو باہر سے کچھ لوگوں کے زور زور سے بولنے کی آوازیں آئیں پھر ہمیں اپنے سروں پر قدموں کی دھمک سنائی دینے لگی۔ ہم سب کے چہروں پر بحالی کی لہر سی دوڑ گئی۔ گونگی گوہر جان کی آنکھیں وحشیانہ انداز میں چمکنے لگی تھیں۔

پھر ہوادان سے آنے والی روشنی یک لخت کم ہوگئی۔ میں نے اوپر دیکھا تو وہاں کوئی تنومند شنگاری موجود تھا جس کی پشت سورج کی طرف اور چہرہ دھندلکے میں تھا۔ میں اسے نہیں پہچان سکا۔

"دہانہ کھل رہا ہے۔" ہوادان کے راستے قندوز خان کی سرد آواز آئی "تم سب ایک ایک کرکے باہر آؤ گے۔ جس نے کوئی چال بازی دکھانے کی کوشش کی' اسے گولی ماردی جائے گی۔"

سیڑھیوں پر بھی پھیکی روشنی نظر آنے لگی۔ سب سے پہلے گوہر جان نے ادھر دوڑ لگائی تھی۔ تینوں عورتوں کے بعد میں باہر نکلا تو قندوز خان سات مسلح شنگاریوں کے ساتھ عورتوں کو اپنے نرغے میں لئے کھڑا تھا۔

"خدا کا شکر ہے کہ تمہیں ہمارا خیال آگیا۔" میں نے ممنونیت سے لبریز لہجے میں کہا "شاید سردار نے ہمارے قید ہوجانے کی خبر ملتے ہی ہماری رہائی کا حکم دے دیا ہوگا۔"

قندوز خان نے غصیلی نظروں سے مجھے گھورتے ہوئے کہا "بک بک مت کرو۔ سردار ہربات سے باخبر رہتا ہے۔ تم کو اسی کے حکم سے یہاں ڈالا گیا تھا اور اب تم اس کے سامنے پیش کئے جاؤ گے۔"

اس کے الفاظ نے مجھے ہراساں کردیا۔ اپنی قید کے بارے میں' میں نے جو مفروضہ قائم کیا ہوا تھا وہ غلط ثابت ہورہا تھا۔ اگر صبغت اللہ ہی نے ہمیں اس حال کو پہنچانے کا حکم دیا تھا تو معاملہ بہت سنگین تھا۔ میں قندوز خان سے مزید ایک لفظ بھی نہیں کہہ سکا۔ میرا ذہن ایک مرتبہ پھر بُری طرح الجھ چکا تھا۔

میرے بعد سلطان شاہ اور آخر میں لنگڑا ضیغم خان پُھدکتا ہوا تہ خانے سے باہر آیا۔ ضیغم خان کی حالت سے ظاہر ہورہا تھا کہ کولہے کی مضروب ہڈی کی وجہ سے' اس کے لئے زینے چڑھنا عذاب سے کم نہیں تھا۔ اپنے غلیظ اور مکروہ فعل کے نتیجے میں وہ سر سے پیر تک عبرت کا نمونہ بن کر رہ گیا تھا۔

سب لوگوں کے یکجا ہوتے ہی تہ خانے کا دہانہ بند کردیا گیا اور قندوز خان کی رہنمائی میں پورا قافلہ حویلی کی طرف چل پڑا۔ میری پریشانی میری اپنی ذات تک محدود تھی کیونکہ قندوز خان کے انکشاف کے بعد مجھے اپنے ساتھیوں سے تبادلہ خیال کا کوئی موقع نہیں مل سکا تھا۔

ہمارا سفر خاموشی سے جاری رہا۔ حویلی کے ایک نیم تاریک حصے میں' جہاں راہداری دو سمتوں میں تقسیم ہورہی تھی' قندوز خان' ضیغم اور اس کی بیوی کو دو شنگاریوں کی معیت میں لے کر ہم سے الگ ہوا اور دوسری سمت میں مڑگیا۔ بقیہ پانچ شنگاری ہمیں لے کر اسی سمت میں چلتے رہے جدھر ان کا رخ تھا۔ اس تقسیم نے میری تشویش میں کچھ اور اضافہ کردیا لیکن میں کچھ بولنے کی ہمت نہیں کرسکا۔ اس بار ہم پانچ اجنبی شنگاریوں کے رحم و کرم پر رہ گئے تھے۔ وہ سب ہی اردو زبان سے نابلد تھے۔ خطرہ یہ تھا کہ کہیں وہ میری بات کا جواب دینے کے لئے اپنے ہتھیاروں کی زبان استعمال کرنا نہ شروع کردیں۔ دربار ہال میں پہنچنے کے بعد ہمیں اشاروں سے ایک جگہ روک دیا گیا۔ اس وقت ہال خالی تھا۔ اس کے ایک گوشے میں کھانا کھانے کی کئی چوکیاں ایک ترتیب سے سجی ہوئی تھیں۔ ایسا معلوم ہورہا تھا جیسے وہاں دعوت ہوچکی ہو یا ہونے والی ہو۔ ان چوکیوں کے مقابل ایک آراستہ مسند تھی جو عملاً فرشی ہونے کے باوجود فرشی قالین کی سطح سے کئی انچ اونچی تھی۔ اس مسند کے داہنے بائیں بھی کئی اور نشستیں تھیں جو اس سے نیچی اور غیر آراستہ تھیں۔

صبح تک حویلی میں خاصی بھیڑ بھاڑ تھی۔ جب میں صبغت اللہ سے ملاقات کے لئے وہاں پہنچا تو دربار ہال شنگاریوں سے بھرا ہوا تھا۔ بعد میں اس کے مہمان خانے میں بھی دور دراز سے آئے ہوئے مہمان بھرتے چلے گئے تھے۔ اس وقت دربار ہال کو خالی پاکر مجھے اندازہ ہوا کہ گالان سے باہر کے قبائلی جتنی تیزی کے ساتھ وہاں وارد ہوئے تھے اسی تیزی کے ساتھ اپنی اپنی بستیوں کی طرف لوٹ گئے تھے۔ اس کے دو ہی اسباب ہوسکتے تھے۔ اول ان لوگوں کا مزاج اور دوم گالان میں رسد کی فراہمی کے ذرائع پر اچانک آپڑنے والا دباؤ۔ اسباب کچھ بھی رہے ہوں' ہمارے لئے یہ بات اطمینان بخش تھی کہ کھردرے مزاج' بے باک نگاہوں' اکھڑ عادات اور خطرناک چہروں والے شنگاریوں کی بھاری تعداد میں غیر معمولی کمی آچکی تھی۔ شاید یہ اسی تبدیلی کا نتیجہ تھا کہ صبغت اللہ کو ہمارا خیال آگیا تھا۔

ہمیں لانے والوں میں سے ایک مسلح شخص اس منقش چوبی دروازے کی طرف بڑھتا چلا گیا جو سردار کے کمرے میں کھلتا تھا۔ بقیہ شنگاری ہمیں اپنی تحویل میں لئے وہیں کھڑے رہے۔

"سب سالے گاؤدی لگ رہے ہیں۔" سلطان شاہ نے سنجیدگی سے کہا۔ سلطان شاہ کی لب کشائی کے ساتھ ہی ہم سب کی نگاہیں شنگاریوں کی طرف اٹھ گئیں۔ وہ چونک کر سلطان شاہ کی طرف متوجہ ضرور ہوئے تھے لیکن ان کے بشروں پر ناگواری کے تاثرات تھے' انہوں نے سلطان شاہ کے بولنے پر اعتراض کیا تھا۔

"خدا کا شکر ادا کرو کہ یہ چاروں اردو سے ناواقف ہیں۔" ویرا نے ان کی خاموشی سے حوصلہ پاکر کہا "ورنہ یہ مار مار کر تمہارا حلیہ بگاڑ دیتے۔ تم سب سے آخر میں تہ خانے سے باہر نکلے تھے اس لئے تمہیں علم نہیں ہے کہ ڈپٹی صاحب کی تھیوری دھری رہ گئی ہے۔ ہمیں صبغت اللہ کے ایما پر قید خانے میں ڈالا گیا تھا۔"

"ہمیں اشاروں سے روکا گیا تو میں نے اسی وقت اندازہ لگالیا تھا کہ یہ بے چارے اردو سے پیدل ہیں۔" ویرا کی بات کا جواب دے کر وہ میری طرف متوجہ ہوگیا "کیا یہ ٹھیک کہہ رہی ہے؟"

میں نے اپنے سر کو اثباتی جنبش کے ساتھ کہا "قندوز خان نے یہی بتایا ہے۔ معاملات الجھے ہوئے نظر آرہے ہیں۔ اب اندر جانے کے بعد ہی صحیح صورت حال کا اندازہ ہوسکے گا۔"

"اب تو صندل خان بھی مارا جاچکا ہے۔" ویرا پر تشویش آواز میں بولی "ہماری جانوں پر بن آئی تو ہم یہاں سے نکلنے کے بارے میں سوچ بھی نہیں سکیں گے۔ صندل خان جیسا پہاڑوں کا کیڑا یہاں سے نکلتے ہی پکڑا گیا تو ہم کس گنتی میں ہیں؟ بے بسی کے ساتھ موت کا انتظار کرنے کے بجائے ہمیں لڑمرنے کے لئے تیار ہوجانا چاہیے۔"

"فی الحال اتنی دور کی باتیں نہ سوچو۔" سلطان شاہ نے بزرگانہ لب ولہجے میں کہا "ہوسکتا ہے کہ اوپر والا' اندر والے کے دل میں کوئی نیکی ڈال دے۔ ویسے ہم تینوں تمہارا عطیہ دے کر بھی بچ سکتے ہیں۔ تم نے صندل خان کے سرہانے آنسو بہا کر یہ ثابت کردیا ہے کہ تم ان وحشت ناک قبائلیوں میں خوش رہ سکتی ہو۔ یہ لوگ بھی بہت جلد تم سے مانوس ہوجائیں گے۔ زرتاشہ کی خودکشی کے بعد انہیں ویسے بھی ایک عورت کا خسارہ ہوچکا ہے۔"

"میں تمہارے منہ پر تھپڑ ماردوں گی۔" ویرا غصے سے بولی "ایک مرے ہوئے آدمی کے بارے میں ہرزہ سرائی کرتے ہوئے تمہیں شرم آنی چاہیے۔ وہ سچے دل سے ہمارا ہمدرد اور بہی خواہ تھا۔ میں اتنی سنگ دل نہیں ہوں کہ اپنے کسی خیرخواہ کو اتنی خراب حالت میں دیکھ کر بھی اپنے جذبات پر قابو رکھ سکوں......"

"اصل خرابی یہی ہے کہ تمہیں کہیں بھی اپنے جذبات پر قابو نہیں رہتا۔" شنگاریوں کی خاموشی کی وجہ سے وہ دونوں انہیں فراموش کرکے ایک مرتبہ پھر آپس میں الجھ پڑے تھے۔ سلطان شاہ نے ویرا کی بات پوری ہونے سے پہلے بولنا شروع کردیا تھا "جہاں موقعہ ملتا ہے پہلی فرصت میں پھسل پڑتی ہو اور اب ایک مردہ آدمی کی آڑ لے رہی ہو۔ میں نے تو اس کے بارے میں ایک لفظ بھی نہیں کہا۔ تم نے اس کی عقل کو ماؤف کردیا تھا۔ وہ تمہاری لچھے دار باتوں میں نہ پھنسا ہوتا تو ہمارے ساتھ ضرورت سے زیادہ ہمدردی دکھاتا اور نہ یوں بے بسی سے مارا جاتا۔"

"تم بھاڑ میں جاؤ۔" ویرا بھنا کر بولی "تمہارے منہ لگنے سے بہتر ہے کہ آدمی اپنا سر کسی پتھر پر دے مارے۔"

"اب تو جہاں بھی جانا ہوگا' ساتھ ہی جانا ہوگا۔" سلطان شاہ نے بے پروائی سے کہا "پتھروں سے سر لڑانے کا موقع بھی ہر ایک کو حاصل رہے گا۔ یہ دوسری بات ہے کہ تم نے ہم تینوں کو چھوڑ کر پندرہ پندرہ پونڈ کے بادرانی بچوں کی ماں بننے کا فیصلہ کرلیا ہو۔"

غزالہ نے اپنی بے ساختہ مسکراہٹ کو منہ پھیر کر ویرا کی نظروں سے چھپایا۔ میں نے ہنسی روکنے کے لئے بلاوجہ کھانسنا شروع کردیا۔ سلطان شاہ نے اپنی رو میں آکر ویرا کے تن بدن میں آگ لگادی تھی۔ غصّے کی شدت سے اس کا چہرہ بگڑ چکا تھا اور وہ کسی بھوکی شیرنی کی طرح اسے گھور رہی تھی۔ سلطان شاہ صورت حال کی نزاکت کو بھانپتے ہی ہم سب سے الگ کھسک کر چاروں شنگاریوں کے درمیان جاکھڑا ہوا۔ اس نے اپنے بائیں ہاتھ کی دیگر تمام انگلیاں بند کرکے چھوٹی انگلی بلند کی ہوئی تھی اور چہرے پر بیچارگی طاری کرلی تھی۔

مجھے یہ دیکھ کر حیرت ہوئی کہ وہ اشارہ گالان جیسی دور افتادہ بستی میں بھی اسی طرح قابل فہم تھا جس طرح کراچی میں۔ زبان سے کچھ کہے بغیر' ایک شنگاری نے سلطان شاہ کا بازو تھاما اور نکاسی کے راستے کی طرف بڑھتا چلا گیا۔ ویرا اپنی جگہ پر پیچ و تاب کھاتی اور غصے سے دانت پیستی رہ گئی۔

"صبر کرو" میں نے ویرا کے قریب ہوکر کہا "اب وہ بھی بہت طرار ہوگیا ہے۔ بعض اوقات ایسی برجستہ چوٹ کرجاتا ہے کہ آدمی لاجواب ہوکر اپنی بغلیں جھانکتا رہ جاتا ہے۔ تمہیں برُا ماننے کی ضرورت نہیں ہے۔"

"اسے طراری نہیں بدتمیزی کہتے ہیں۔" وہ میری طرف دیکھتے ہوئے غرائی "تمہاری خاموشی اور بے جا حمایت نے اب اسے ہر ایک پر حاوی کردیا ہے۔ میں کسی وقت اُس پر ہاتھ چھوڑ بیٹھوں گی۔" پھر یکایک ہی اس کا منہ بگڑ گیا اور وہ تنفر آمیز لہجے میں بڑبڑائی "ہونہہ! پندرہ پونڈ کے بادرانی بچے! الّو کا پٹھا!"

پھر سردار کے کمرے سے وہ شنگاری نمودار ہوا جو کچھ دیر پہلے ہم سے الگ ہوکر اندر گیا تھا۔

اس نے دور ہی سے ڈینی کا نعرہ لگایا اور میں اپنی جگہ چھوڑ کر چند قدم آگے بڑھ گیا۔ اس نے ہاتھ ہلا کر مجھے اپنی طرف آنے کا اشارہ کیا اور مقامی بولی میں اپنے ساتھیوں سے مخاطب ہونے لگا۔

میرے قریب پہنچنے سے پہلے ہی اس نے اپنی بات ختم کرلی اور مجھے لے کر دوبارہ سردار کے کمرے کی طرف چل دیا۔ اس نے دروازہ کھول کر مجھے اندر جانے کا اشارہ کیا مگر خود باہر ہی رکا رہا۔

اندر سردار صبغت اللہ مشعلوں کی روشنی میں اپنی جگہ پر براجمان تھا اور سگریٹ سلگائے شراب نوشی میں مصروف تھا۔ اس کی آنکھوں کی سرخی اور پپوٹوں کے ورم سے اندازہ ہورہا تھا کہ وہ بہت زیادہ شراب پئے ہوئے تھا۔ آگے بڑھنے پر مجھے کئی خالی بوتلیں بھی نظر آگئیں جو میرے اندازے کی تائید کررہی تھیں۔

"آؤ! میرا خیال ہے کہ زنداں میں تمہارا وقت اچھا نہیں گزرا ہوگا۔" اس کا لہجہ دوستانہ اور نشے کے اثرات سے عاری تھا "لیکن یہ بہت ضروری تھا۔ بیٹھو' اور اپنے لئے شراب انڈیلو۔"

اس نے اپنے ابتدائی کلمات ہی سے اس بات کی تصدیق کردی کہ قندوز خان نے جھوٹ نہیں بولا تھا۔ ہمیں اسی کی اجازت سے تہ خانے میں ڈالا گیا تھا۔ مجھے یک بیک اس کی صورت سے نفرت محسوس ہونے لگی۔ وہ سب ہی پاگل اور فاترالعقل معلوم ہوتے تھے۔ انہیں اپنی کسی بات کا پاس نہیں تھا۔ کسی کو معزز و محترم مہمان کا درجہ دینے کے بعد بدترین قید خانے میں ڈلوادینا ایک عام آدمی کے لئے ممکن نہیں تھا۔ میرا دل چاہا کہ میں ساغر و مینا کو لات مار کر اس پر ٹوٹ پڑوں اور اس کا گلا دبادوں لیکن میرے دل کے چور نے اس ابال کو فوراً ہی ٹھنڈا کردیا۔ میں نے صبغت اللہ کی دی ہوئی ایک چھوٹ کی آڑ لینے کا فیصلہ ضرور کیا ہوا تھا مگر حقیقت یہ تھی کہ میں نے صندل خان کے ساتھ مل کر گالان سے فرار ہونے کی سازش کی تھی۔ صندل خان کی ہلاکت کے ساتھ ہی وہ ادھوری سازش بھی دم توڑ چکی تھی اور میں صبغت اللہ کی دی ہوئی رعایت کا فائدہ اٹھا کر خود کو معصوم ظاہر کرسکتا تھا۔

میں کسی ردِّعمل کا مظاہرہ کئے بغیر اپنے لئے ایک گلاس تیار کرنے میں مصروف ہوگیا۔

"گالان بہت خطرناک جگہ ہے۔ مجھے اب یہاں گھٹن محسوس ہونے لگی ہے۔" صبغت اللہ کے ساتھ پہلا گھونٹ لینے کے بعد میں نے لب کشائی کی "ہمیں جلد از جلد روانگی کی اجازت ملنی چاہیے۔"

مدافعت کے بجائے' میری طرف سے جارحانہ لب ولہجے نے صبغت اللہ کو حیران کردیا "تم روانگی کی بات کررہے ہو' کیا تمہیں یہ فکر نہیں ہے کہ میں نے تمہیں قید خانے میں کیوں ڈلوایا تھا۔ تم پر صندل خان کے ساتھ فرار کی سازش کرنے کا الزام تھا۔ کچھنار کے خچروں والے نے یہ اعتراف کرلیا تھا کہ صندل خان نے پانچ سدھائے ہوئے اور تیز رفتار خچروں کی فراہمی کے سلسلے میں اُس سے بات چیت کی تھی۔ صندل خان کے چار ساتھی تم ہی لوگ ہوسکتے تھے۔"

"اگر تم پچھلی ملاقات میں طے ہونے والی باتیں بھول گئے ہو تو مجھے فکرمند ہونا پڑے گا۔" میں نے اس کی مخمور آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر سپاٹ لہجے میں کہا "یہ بات میری سمجھ میں نہیں آسکی کہ تم نے خود مجھے صندل خان کے دل کی بات اگلوانے کے لئے جھوٹ بولنے اور تمہاری برائیاں کرنے کی اجازت دی اور جب میں نے اُس پر عمل کرکے صندل خان کو بے نقاب کردیا تو تم نے اپنا وعدہ بھول کر مجھے اس ہولناک تہ خانے میں بند کرادیا۔ اس کا مطلب ہے کہ یہاں ہماری حیثیت کا کوئی تعین نہیں ہے۔ ہم کسی وقت بھی تمہارے عتاب میں آسکتے ہیں۔"

وہ صبر و سکون سے میری بات سنتا رہا۔ میرے آخری فقروں پر اس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ کھیلنے لگی۔ میری بات ختم ہونے پر اس نے سوال کیا "اگر تم نے میرے ایما پر' اس کے دل کا بھید پانے کے لئے' اسے کسی سازش پر اکسایا تھا تو تم نے اس اہم بات سے مجھے باخبر کیوں نہیں کیا؟"

"تم سے ملنے کی ہر کوشش ناکام ہوگئی۔ قندوز خان گواہ ہے کہ میں بار بار تم سے ملنے کی خواہش ظاہر کرتا رہا مگر تم مصروف تھے۔ تم نے مجھے منع کردیا تھا کہ میں قندوز خان کو کچھ نہ بتاؤں اس لئے میں نے قید خانے میں اترتے ہوئے بھی اپنی زبان بند رکھی۔ میں تم سے ملاقات کے انتظار میں اس حال کو پہنچا ہوں۔"

اس کے چہرے سے اچانک نرماہٹ جھلکنے لگی۔ اس نے گلاس کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا "مشتعل ہوکر تم نے پینے سے ہاتھ کیوں روک لیا؟ پیتے رہو' یہ معدے میں اتر کر تمہارا سارا غصہ چوس لے گی۔ ذرا یہ تو بتاؤ کہ صندل خان کو تم نے کس طرح اپنے ساتھ ملایا تھا؟"

میں نے گلاس سے ایک گھونٹ بھر کر کہا "پہلے میں نے محتاط الفاظ میں تمہاری برائی کی۔ وہ خاموشی سے سنتا رہا تو میں نے انقلاب کو غلط قرار دے کر تم پر اپنی بے اعتمادی کا کھلا اظہار کر ڈالا۔ اس پر صندل خان نے پائندہ گل سے اپنی لازوال وفاداری کا اظہار کرتے ہوئے' مشترکہ فرار کی پیشکش کی۔ اس کا دعویٰ تھا کہ وہ کسی خطرے کے بغیر ہم سب کو گالان سے نکال لے جائے گا۔ میں رضامند ہوگیا اور وہ سونف کی شراب لانے کے بہانے کچھنار کی طرف چل دیا۔ میں اسی وقت تم سے ملنا چاہتا تھا لیکن قندوز خان غائب تھا۔ وہ آیا تو اس نے تمہاری بے پناہ مصروفیت کی کہانی سنائی' پھر آج صبح اس نے ہماری حد سے زیادہ تذلیل کرکے ہمیں تہ خانے میں بند کردیا۔"

وہ ہنسنے لگا اور ڈھٹائی سے بولا "سب کچھ اسی طرح ہوا جس طرح میں نے سوچا تھا۔ جب سے صندل خان کو کچھنار کی طرف جاتے ہوئے دیکھا گیا تھا' قندوز خان مجھے پَل پَل کی خبریں پہنچا رہا تھا۔ جب صندل خان اچانک لاپتا ہوا تو اس نے کچھنار والے کی گردن دبوچ لی اور اس نے معافی کا وعدہ لے کر پوری کہانی اُگل دی اور صندل خان اکیلا فرار ہوتے ہوئے پکڑا گیا۔ اس پر بڑا وقت برباد ہوا۔ جب اسے موت سر پر نظر آنے لگی تو اس کی زبان بھی چل پڑی۔ قندوز خان نے اس کی اور تم لوگوں کی ملی بھگت کے بارے میں بتایا تو میں نے اس پر اپنا بھرم رکھنے کے لئے تمہیں بھی قید میں ڈالنے کا حکم دے دیا۔ اب میں کہہ سکتا ہوں کہ میں نے تمہاری خطا معاف کردی ہے کیونکہ صندل خان نے تم لوگوں کو میرے خلاف ورغلایا تھا۔" اس نے خاموش ہوکر اپنا گلاس خالی کیا اور بات جاری رکھتے ہوئے بولا "یہ صرف بھرم ہی کی بات نہیں تھی۔ میں نے ضیغم خان اور اس کی بیوی کو بھی زنداں میں ڈلوادیا تھا تاکہ صندل خان کا عبرت ناک انجام ان کے حوصلے پست کرسکے اور وہ میری بات سے سرتابی کی جرأت نہ کرسکیں۔ ضیغم خان کے لئے بہت مشکل ہوتا کہ وہ بھرے جرگے کے سامنے اپنے اور پائندہ گل کے گھناؤنے گٹھ جوڑ کی کہانی سنا سکے مگر اب وہ رکے بغیر بولے گا۔ میں چاہتا تھا کہ وہ دونوں اسی حالت میں تم چاروں کو بھی دیکھ لیں تاکہ جرگے میں تم سب ایک دوسرے سے اجنبی نہ رہو۔ تمہارے قید کئے جانے کے بعد کوئی سوچ بھی نہیں سکے گا کہ میری اور تمہاری کوئی سازباز ہے۔ یہ بتاؤ کہ زنداں میں ضیغم خان سے تمہاری کیا باتیں ہوئیں؟ وہ کیا سوچ رہا ہے؟"

"ابھی تک وہ کچھ بھی نہیں سمجھ سکا۔" میں نے اس کی نئی کہانی کا ذکر گول کر کے کہا "وہ جنت گل کی پھیلائی ہوئی کہانی سے باخبر ہے لیکن میں نے اسے یہ نہیں بتایا کہ اس کی بیٹی کے نازک وجود کی حرارت سے آشنا ہونے والا یرغمالی میں ہی ہوں۔ اسے یہ حیرت ضرور ہے کہ ہم لوگ اس کے بارے میں کیسے جانتے ہیں۔"

اس نے اپنی ران پر ہاتھ مار کر والہانہ انداز میں کہا "سب کچھ اسی طرح ہو رہا ہے۔ تم بہت عقل مند انسان ہو۔ اس وقت قندوز خان اس بے غیرت کابلی کو یہ سمجھا رہا ہو گا کہ صبح اسے کیا کہنا ہے۔ تمہیں یہ سن کر خوشی ہو گی کہ جنت گل بھی آج اسی چھت کے نیچے ہے۔ اس سے کوئی بات نہیں کی گئی۔ بس کل صبح اسے اچانک ہی جرگے کے روبرو پیش کیا جائے گا۔ وہاں ڈرامائی کھیل شروع ہو گا اور تمہارے انکار کے بعد میری مرضی کا فیصلہ ہو جائے گا۔"

جنت گل کی موجودگی کا ذکر سنتے ہی' میرے دل کی دھڑکنیں یک بیک تیز ہو گئیں۔ کوہساروں کی اس دوغلی شہزادی سے ایک بار قرب آشنا ہونے کے بعد آسانی سے بھلا دینا ممکن نہیں تھا۔ مجھے بے اختیار وہ سنسنی خیز لمحات یاد آ گئے جب میں نے عبدالرحیم خان سے نظر بچا کر جنت گل کے ساتھ خاموش چھیڑ خانی کا آغاز کیا تھا اور اس طرح دار حسینہ نے بھی اپنے محبوب سے شکایت کرنے کے بجائے' بالا ہی بالا جوابی چھیڑ چھاڑ کا سلسلہ شروع کر دیا تھا۔ جنت گل کے اِس حوصلہ افزا ردِ عمل نے میرے دل میں گناہ کی پہلی چنگاری سلگائی تھی جس نے بعد میں جذبوں کی ہولناک آگ کا روپ دھار کر ہم دونوں ہی کو اپنے لہو رنگ شعلوں کا ایندھن بنا لیا تھا۔

"اُس سے میری ملاقات ہو سکتی ہے؟" میں نے بے تابانہ لہجے میں صبغت اللہ سے پوچھا۔

"نہیں!" اس نے سرہلاتے ہوئے سرد لہجے میں کہا "میں نے اسے اجنبی نظروں سے بچانے کے لئے زنداں میں نہیں ڈالا تھا۔ وہ بادرانیوں کی ہونے والی بہو ہے۔ اب اس پر کسی اجنبی مرد کی نظریں بھی نہیں پڑ سکتیں۔ بستی کی دو دایاؤں کی نگرانی میں وہ ایک علیحدہ کمرے میں بند ہے اور تم؟ تم سے تو اس کے ملنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ تم وہ ہو جسے اس نے اپنے بدن کی خوشبو چرانے کی دعوت دی تھی۔"

"وہ سب اس کی زبردستی تھی۔ تم جانتے ہو کہ میں بدنگاہ نہیں ہوں۔ کل جرگے میں بھی وہ میرے سامنے آئے گی۔ پھر آج مل لینے میں کیا ہرج ہے؟" میں نے سوچے سمجھے بغیر اصرار کیا۔

"تم اُس سے ملنے پر مصر کیوں ہو؟" صبغت اللہ نے اپنی عقابی نظریں میرے چہرے پر گاڑ دیں "کہیں ایسا تو نہیں کہ جنت گل کے جبر کے تحت کئے ہوئے گناہ کی کچھ یادیں تمہارے ذہن میں سانپ بن کر کلبلا رہی ہوں؟ تم اسے ایک بار پھر دیکھنا چاہتے ہو؟ کوئی بیان واقرار کرنا چاہتے ہو؟ یا پھر......"

اس کے زہریلے فقروں نے میرے رونگٹے کھڑے کر دیئے اور میں نے اضطرار کی حالت میں اس کی بات کاٹ دی "مجھ پر ایسے الزامات عائد نہ کرو۔ بادرانیوں کی ہونے والی بہو اب میرے لئے بھی بہت محترم ہے۔ جب اس کے ذہن پر شیطان سوار ہوا تھا تو میں نے اپنے دامن کو سیاہ داغ سے بچانے کے لئے اس کو اپنی تلخ کلامی سے بہت ذلیل کیا تھا۔ میں اس سے اپنی بدزبانی کی معافی مانگنی چاہتا تھا...... لیکن نہیں' اب میں اُدھر کا رخ بھی نہیں کروں گا۔ خدا کی پناہ! تم کیسی کیسی باتیں سوچ رہے ہو۔ وہ عورت تم کو مبارک ہو۔ میں اس کے سائے سے بھی دور رہوں گا۔"

صبغت اللہ کسی بھیڑیئے کی طرح اپنے سفید دانتوں کی قطاریں چمکاتے ہوئے' منہ کھول کر ہنسا پھر بولا "غنیمت ہے کہ تم نے اپنی غلطی کا احساس کر لیا۔ آئندہ کبھی کسی ایسی عورت کے بارے میں نہ سوچنا جس پر کسی دوسرے کے نام کی مہر لگ چکی ہو۔ ضیغم خان لاکھوں میں ایک بے غیرت تھا جس نے پائندہ گل کو منہ تک غلاظت میں لتھیڑ دیا۔ بادرانی ایسے نہیں ہوتے۔ اپنی عورتوں کے بارے میں تجسس کرنے والے اجنبیوں کو وہ قبر سے بھی کھینچ لاتے ہیں اور لاش پر کالی چیلیں چھوڑ دیتے ہیں۔ شاید تمہیں معلوم نہ ہو کہ گالان کی یہ پالتو چیلیں صرف آنکھوں اور مغز پر پرورش پا رہی ہیں۔ ایسے حیوانی اعضا انہیں روز ملتے ہیں۔ کبھی کبھی انسانی کھوپڑی سامنے آ جائے تو ان کی عید ہو جاتی ہے۔"

لمحہ بھر میں جنت گل کے وجود کی زندگی کی حرارت سے بھرپور رعنائیاں میرے ذہن سے کافور ہو گئیں۔ دل کی دھڑکنیں اعتدال ہی پر نہیں آئیں بلکہ کالی چیلوں کے ذکر پر مزید سست ہو گئیں۔ مجھے اپنے بدن کے مسامات سے پسینہ پھوٹتا ہوا محسوس ہو رہا تھا۔ میں نے خود کو تقویت پہنچانے کے لیے گلاس ہونٹوں سے لگا لیا۔

"آج کی رات تم مہمان خانے میں گزارو گے۔" چند ثانیوں کے بوجھل سکوت کے بعد اس کی آواز ابھری "صبح کے ناشتے پر جرگے کے معززین میرے مہمان ہوں گے۔ نو بجے تم کو پیش کیا جائے گا۔"

"اور میرے ساتھی؟" میں نے خالی خالی نظروں سے اس کی طرف دیکھتے ہوئے کمزور آواز میں سوال کیا "انہیں تم نے ابھی تک شرف باریابی نہیں بخشا۔ وہ بے چینی کے ساتھ اس عزت افزائی کے منتظر ہیں۔"

انا پرست سردار کے ہونٹوں پر خفیف سی مسکراہٹ پھیل گئی۔ وہ تو ایک انسان تھا۔ خوشامد پتھر تک کو موم میں بدل کر رکھ دیتی ہے۔ وہ آہستگی سے بولا "اس وقت میرا ان سے ملنا قرین مصلحت نہیں ہے۔ کل جرگے میں تم سب آؤ گے۔ وہاں فیصلہ ہونے تک ہر ایک کے ساتھ عزت اور برابری کا سلوک کیا جاتا ہے۔"

"لیکن کارروائی مقامی یا پھر پشتو زبان میں ہو گی ہم کچھ بھی نہیں سمجھ پائیں گے۔"

"قندوز خان تمہیں ہر بات سے باخبر رکھے گا۔" وہ مکّارانہ مسکراہٹ کے ساتھ بولا "میرے دماغ میں صبح کا پورا نقشہ تیار ہے۔ جرگے والوں کے لیے کسی کا بندوبست کرنا پڑے گا کیونکہ ان میں سے زیادہ تر لوگ مقامی بولی کے علاوہ کوئی اور زبان نہیں جانتے...... بس ایک بات یاد رکھنا کہ تم جنت گل سے براہ راست بات کرو گے نہ اس کی کسی بات کا جواب دو گے۔ اس طرح میں پورے مقدمے کو اپنی مرضی کے مطابق چلا سکوں گا۔"

میرا گلاس خالی ہونے تک وہ تحمل سے اِدھر اُدھر کی باتیں کرتا رہا۔ جوں ہی میرا گلاس خالی ہوا' اس نے مصافحے کے لیے اپنا داہنا ہاتھ میری طرف بڑھا کر کہا "اب تم جا کر آرام کرو۔ مجھے ضیغم خان سے بھی کچھ باتیں کرنی ہیں۔ قندوز خان میرے فارغ ہونے کا انتظار کر رہا ہو گا۔"

میں نے رکوع کی حالت میں' پورے ادب و احترام سے اس مکّار بادرانی سے ہاتھ ملایا اور واپس چل دیا۔

دروازے سے باہر' قندوز خان اپنے دونوں قیدیوں سمیت قالین پر بیٹھا ہوا تھا۔ اس نے لمحہ بھر کے لیے رعونت سے میری طرف دیکھا۔ میں بھی اسے نظرانداز کرتا ہوا اُس سمت میں چل دیا جہاں میرے ساتھی' شنگاریوں کی نگرانی میں بیٹھے ہوئے تھے۔ میں نے آدھا فاصلہ بھی طے نہیں کیا تھا کہ مجھے اپنے عقب سے قندوز خان کی اونچی آواز سنائی دی۔ میں چونک کر پلٹا تو وہ مقامی بولی میں اپنے ان ساتھیوں کو' جو ہماری نگرانی کر رہے تھے' کچھ ہدایات دے رہا تھا۔ چند ثانیوں کے لیے رکنے کے بعد میں پھر آگے چل دیا۔ میرے وہاں پہنچنے سے پہلے ہی قندوز خان کی بات ختم ہو چکی تھی۔

میرے قریب پہنچنے سے پہلے ہی وہ سب قالین سے اٹھ کھڑے ہوئے تھے۔ ان میں غزالہ سب سے آگے تھی۔ اس نے کئی فٹ کے فاصلے سے میری کیفیت بھانپ کر معنی خیز لہجے میں کہا "تمہارے سانسوں سے شراب کی بو آ رہی ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ اندر بات بن گئی ہے۔"

میرے پہنچتے ہی شنگاریوں نے ہم سب کو اشاروں سے باہر کی طرف ہانکنا شروع کر دیا۔ میں نے باہر نکلتے ہوئے کہا "یہ بڑی بات ہے کہ ہم آج کی رات تہ خانے کے بجائے مہمان خانے میں بسر کریں گے۔ جنت گل بھی آج اسی حویلی کے کسی کمرے میں بند ہے۔ سارے کردار جمع ہو چکے ہیں۔ صبح جرگے کا ڈراما رچایا جائے گا۔"

"جنت گل یہاں موجود ہے؟" تینوں نے تقریباً بیک آواز وہی ایک سوال کیا۔

"پھر تو ہمیں تہ خانے ہی کا رخ کرنا چاہیے۔" ویرا اپنے تحیر زدہ سوال کے بعد بھی بات جاری رکھتے ہوئے بولی "جنت گل حویلی میں ہے تو تم رات بھر کسی چوپائے کی طرح اس کی بو کی تلاش میں بھٹکتے رہو گے۔ پہلے اس نے تم پر جبر کیا تھا۔ اب تم اس پر جبر کر کے حساب برابر کر سکتے ہو۔ کسی کو کانوں کان پتا نہیں چلے گا۔"

"غیر ضروری باتیں مت کرو۔" میں نے غرّا کر کہا "یہ لوگ جنت گل کے بارے میں بہت حساس ہیں۔ تمہاری باتوں کی بھنک کسی شنگاری کے کانوں میں پڑ گئی تو ہم سب کو کالی چیلوں کی خوراک بنا دیا جائے گا۔"

"بعض اوقات تم لوگوں کی حد سے بڑھی ہوئی بے تکلفی میرے لیے اذیت دہ ہو جاتی ہے۔" غزالہ نے مجروح لہجے میں مجھ سے پہلی بار احتجاج کیا "کیا یہ ممکن نہیں کہ ہم ایک دوسرے کے جذبات کا پاس کرتے رہیں؟"

غزالہ کے سنجیدہ ردِ عمل پر ویرا بوکھلا گئی اور جلدی سے اس کے قریب ہو کر خوشامدانہ لہجے میں بولی "مجھے معلوم ہے کہ تم نے ڈینی پر رکھ کر مجھے لتاڑا ہے۔ مجھے افسوس ہے' ڈارلنگ! تم دیکھو نا۔ یہ لوگ میری کیسی درگت بناتے رہتے ہیں؟ ابھی تھوڑی دیر پہلے وہ لفنگا مجھے کسی بادرانی کے بچوں کی ماں بنا رہا تھا پھر میرا گندہ جواب سننے کی باری آئی تو پیشاب کرنے کے بہانے باہر بھاگ گیا۔ میں کس سے بدلہ لوں؟ ان لوگوں نے مجھے کیا سمجھ رکھا ہے؟ میں مانتی ہوں کہ میں جھلاہٹ میں کبھی کبھار بہک بھی جاتی ہوں مگر تمہیں فراخ دلی سے مجھے معاف کر دینا چاہیے۔ ہم سب ہی تمہارا بہت زیادہ لحاظ کرتے ہیں اور تمہیں اپنے بے رحمانہ مذاق کا نشانہ نہیں بناتے۔"

"ماضی کے حوالے سے تمہاری یہ بات شاید درست ہو لیکن گالان کا پانی پی کر شاید ہم سب ہی سنگدل اور انا پرست ہوتے جا رہے ہیں۔" غزالہ کی آواز سے آزردگی مترشح تھی "سچ بتاؤ کہ کیا تم ڈینی کو اتنا ہی گھٹیا سمجھتی ہو کہ یہ رات بھر اس کمینی کی تلاش میں مارا مارا پھرتا رہے گا۔"

"ڈارلنگ! آئی ایم سو سوری!" ویرا محبت کے ساتھ اسے پچکارتے ہوئے بولی "اس وقت میں ڈینی کو رگیدنا چاہ رہی تھی۔ تمہاری دل آزاری کا موہوم سا ارادہ بھی نہیں تھا۔ آئندہ میں محتاط رہوں گی۔ اس بار مجھے معاف کر دو۔ میں اچھی طرح سمجھتی ہوں کہ جنت گل کے بارے میں کوئی سنگین مذاق سہنا تمہارے لیے کتنا مشکل ہے۔"

"اب مجھے رگیدنے کی خواہش نہ کرنا۔" میں نے ویرا سے کہا "تم دیکھ رہی ہو کہ چاند پر تھوکا ہوا سیدھا اپنے ہی منہ پر آگرتا ہے۔ جنت گل کا نام سنتے ہی تم آپے سے باہر ہو گئی تھیں۔"

"شٹ اپ!" ویرا آنکھیں نکال کر غرّائی "اب ہم جنت گل کے بارے میں بات نہیں کریں گے۔"

"میں تمہیں اس کے بارے میں بات کرنے سے نہیں روکتی۔" غزالہ نے خود کو سنبھال لیا تھا "میں حقیقت سے منہ نہیں موڑ سکتی۔ وہ بات کرو جو حقیقت سے قریب ہو۔ بے بنیاد الزام تراشیاں ہمیں پراگندہ کر کے رکھ دیں گی۔"

"جنت گل کو جہنم میں ڈالو اور یہ بتاؤ کہ اندر کیا طے ہوا ہے؟" سلطان شاہ نے دخل اندازی کی۔

میں نے اُس کے سوال کا جواب دینا شروع کیا ہی تھا کہ ہم مہمان خانے کے وسطی ہال میں داخل ہوگئے۔ ہال ویران پڑا ہوا تھا۔ کہیں کہیں سے اکا دکا خراٹوں کی آوازیں آرہی تھیں۔ شاید باہر سے آئے ہوئے بیشتر قبائلی معززین واپس جاچکے تھے۔ جو رہ گئے تھے وہ سرشام ہی اپنے کمروں میں جاسوئے تھے کیونکہ اس وقت تک سورج کو غروب ہوئے کافی دیر ہوچکی تھی۔ جنگی جنون دھیما ہونے کے ساتھ ہی وہ تیزی سے اپنے معمولات کی طرف لوٹ رہے تھے۔

ہمیں لانے والے ہم کو کمرے تک پہنچاکر واپس لوٹنے لگے تو مجھے اچانک یاد آیا کہ ہم نے وہ پورا دن فاقے کی حالت میں گزارا تھا۔ صبح ناشتے کی نوبت نہیں آنے پائی تھی کہ قندوز خان نے اپنے آدمیوں کے ساتھ ہمارے کمرے پر دھاوا بول کر ہمیں اپنی حراست میں لے لیا تھا پھر قید خانے میں دن بھر کھانے کو کچھ نہیں ملا۔ اگر وہ لوگ چلے جاتے تو مجھے مہمان خانے پر مامور خدمت گاروں کو تلاش کرنا پڑتا جو نہ جانے کس کمرے میں گھسے ہوئے تھے۔ حویلی میں جنت گل کی موجودگی کی وجہ سے میری اس نقل و حرکت کو شک و شبے کی نظر سے دیکھا جاسکتا تھا۔ اگر میں غلط فہمی میں کسی شنگاری سردار کی نیند میں خلل ڈالنے کا مرتکب ہو بیٹھتا تو وہ اپنی بددماغی کے باعث کوئی ہنگامہ بھی کھڑا کرسکتا تھا۔ بات صرف ہماری بھوک کی تھی لیکن اس سے پیوستہ امکانات خاصے حوصلہ شکن ہوسکتے تھے۔ میں نے لپک کر ایک شنگاری کو پکڑلیا۔

وہ بھڑک کردار کرنے کی پوزیشن میں میری طرف پلٹا۔ میں نے فوراً ہی اپنے پیٹ اور دہانے کی طرف اشارے کرکے اس پر اپنا مدعا ظاہر کیا اور وہ تفہیمی انداز میں سرہلاتا ہوا واپس چلا گیا۔

اس کمرے میں حسبِ معمول چار بوتلیں موجود تھیں۔ میری طرح ویرا بھی طویل بھوک اور پیاس سے پریشان تھی میں واپس ہوا تو وہ اپنی پیاس بجھانے کی کوششوں کا آغاز کرچکی تھی۔ میں تھکے ہارے انداز میں ایک بستر پر گر گیا۔

"تمہاری کہانی ادھوری رہ گئی تھی۔" سلطان شاہ نے اسی بستر پر بیٹھتے ہوئے مجھے یاد دلایا "میں نے دیکھ لیا ہے کہ تم نے اُن سے کھانے کی فرمائش کی ہے۔ کھانا آنے سے پہلے یہ کہانی پوری کرلی جائے تو بہتر ہوگا۔"

"دن بھر کے فاقے کا خیال آتے ہی مجھے نقاہت محسوس ہونے لگی ہے۔ کھانے کے بعد بات کریں گے۔" میں نے ہنس کر کہا۔

"یہ لوگ مہربان ہونے پر آتے ہیں تو حلق تک شکم سیر کرادیتے ہیں۔ برہم ہوتے ہیں تو بھوکا ماردیتے ہیں۔"

"آج ہم نے پہلا دن بھوک اور پیاس کی حالت میں گزارا ہے۔" غزالہ بولی "ورنہ چیغا سرائے میں صندل خان سے ملاقات ہونے کے بعد ہم مسلسل اپنے معمول سے زیادہ کھاپی رہے ہیں۔"

"پرخوری کی عادت پڑجانے کے بعد یہ دن بہت بھاری گزرا ہے۔" ویرا اپنا گلاس لے کر وہیں آگئی "ہم شروع سے خوراک کی قلت سے دوچار رہتے تو آج کا دن اتنا گراں نہ گزرتا۔ بھلے وقتوں کے بعد بُرا وقت آجائے تو قیامت ہی آجاتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ارب پتی اپنے دیوالہ نکلنے کی خبر سن کر نتائج کا انتظار نہیں کرتے بلکہ چپکے سے خودکشی کرلیتے ہیں۔ ان کے لیے اپنے معیار زندگی میں کمی لانے کا تصور ہی انہیں جاں کنی میں مبتلا کردیتا ہے۔"

"تم جو کچھ پی رہی ہو' اس میں پانی کے ساتھ غذائیت بلکہ کیلوریز بھی ہوتی ہیں۔ تم اور ڈینی تو اس پر گزارہ کرسکتے ہو' ہم دونوں کا کیا بنے گا۔ ہوسکتا ہے کہ اس وقت کھانا نہ مل سکے۔"

"صبر کرو۔ صبر کا پھل میٹھا ہوتا ہے۔" ویرا ہنس کر بولی "ہماری خواہشات کا پھل مل ضرور رہا ہے لیکن بے حد تلخ ہے۔ اس میں کیلوریز ہوتی ضرور ہیں لیکن جب یہ سیال معدے میں اترتا ہے تو وہاں آگ لگادیتا ہے۔ ہر گھونٹ کے ساتھ اشتہا میں اضافہ ہوتا چلا جاتا ہے۔ اسی لیے مے نوش بسیار خور بھی ہوتے ہیں۔"

ان کی مایوسی زیادہ دیر تک برقرار نہیں رہ سکی۔ مہمان خانے کے دو خدمت گار ہمارے لیے کھانا لے آئے۔ ہمیں لانے والوں میں سے کوئی واپس نہیں آیا تھا۔ شاید وہ خدمت گاروں کو ہمارے کھانے کا بندوبست کرنے کی ہدایات دے کر چلے گئے تھے اور ان کی واپسی کی امید نہیں تھی۔

کھانا گرم نہیں تھا۔ بس اس میں ہلکی سی حرارت باقی تھی۔ لیکن شنگاریوں کا مخصوص ذائقہ اس حالت میں بھی برقرار تھا۔ ہم چاروں ہی بے صبرے پن کے ساتھ کھانے پر ٹوٹ پڑے۔

ہم چاروں ہی یکساں انداز میں تھالیوں کو خالی کردینے میں جتے ہوئے تھے مگر اسی کے ساتھ ساتھ میرا ذہن بھی کام کررہا تھا۔ میری دانست میں صبح کے متوقع ڈرامے کے پانچ فریق تھے اور ہر ایک زبان کے بدترین مسئلے سے دوچار تھا۔ جرگے کے بیشتر اراکین مقامی بولی کے علاوہ کوئی اور زبان سمجھنے سے قاصر ہوتے۔ شاید ان میں سے چند ایک پشتو بھی سمجھ لیتے ہوں۔ مگر سردار صبغت اللہ کو شنگاری بولی کے ساتھ ہی پشتو اور اردو پر بھی پورا پورا عبور حاصل تھا۔ یہی حال قندوز خان کا بھی تھا۔ جنت گل ڈرامے کی تیسری فریق تھی۔ وہ پشتو کے علاوہ صرف انگریزی بول سکتی تھی۔ وہ اردو سمجھ ضرور لیتی تھی لیکن اسے بولنے پر قادر نہیں تھی۔ اگر وہ کسی بھی مرحلے پر انگریزی بولنی شروع کردیتی تو پوری وادی میں کوئی بھی اس کا مفہوم نہیں سمجھ سکتا تھا۔ جنت گل کے ماں باپ چوتھے فریق تھے۔ ان میں ضیغم خان واحد آدمی تھا جو پشتو اور اردو کے ساتھ شنگاری زبان پر دسترس رکھتا تھا۔ اس کی بیوی صرف اردو اور پشتو سمجھ سکتی تھی لیکن وہ بول نہیں سکتی تھی۔ ہم چاروں کے لیے صرف اردو یا انگریزی قابل فہم ہوتی۔ صرف سلطان شاہ پشتو بول اور سمجھ سکتا تھا میری سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ صبح ان معاملات پر کیسے قابو پایا جائے گا۔

ہم لوگ کھانا کھانے میں مصروف تھے اور خدمت گار بھی دور کھڑے ہمارے فارغ ہونے کا انتظار کررہے تھے کہ اچانک مہمان خانے کی پرسکون فضا میں کہیں سے ایک تیز رسیلی آواز گونج اٹھی "یہاں کوئی ہے جو مجھے رات کی ہولناک تنہائی سے نجات دلاسکے؟" وہ سوال انگریزی میں کیا گیا تھا۔ وہ آواز سن کر میرا دل تیزی سے دھڑک اٹھا کیونکہ جنت گل کی آواز میں ہزاروں میں بھی پہچان سکتا تھا۔

جنت گل کی دعوت انگیز آواز سنتے ہی دونوں خدمت گاروں کے چہروں پر زلزلے کے آثار نظر آئے اور انہوں نے تیزی کے ساتھ باہر کی طرف دوڑ لگادی۔ میرے تینوں ساتھیوں کی معنی خیز اور استفہامیہ نظریں میرے چہرے پر مرکوز ہوکر رہ گئیں۔ میں انہیں نظرانداز کرکے کھانا کھاتا رہا۔

"شاید جنت گل اسی مہمان خانے میں بند ہے۔ تم اس کی آواز تو پہچانتے ہوگے؟" غزالہ نے مجھے خاموش پاکر پوچھا "یہ اسی کی آواز ہوسکتی ہے۔" غزالہ کے لہجے میں تحیر اور سنسنی کا ملا جلا اثر نمایاں تھا۔

"وہی ہے" میں نے سرہلا کر اعتراف کیا "لیکن ہم میں سے کوئی اس کی کسی بات کا جواب نہیں دے گا۔"

"پورے گالان میں ہم چاروں کے علاوہ کوئی اور انگریزی نہیں سمجھ سکتا۔" ویرا نے سنسنی خیز لہجے میں سرگوشی کی "اس نے یقیناً ہم لوگوں کو' بلکہ شاید تم کو مخاطب کیا ہے۔"

"بچوں جیسی باتیں نہ کرو۔" میں نے بُرا سامنہ بناکر کہا "اسے کیا پتا کہ ہم لوگ بھی یہاں موجود ہیں اس کے لیے گالان اور یہاں کے سارے معاملات اجنبی ہیں۔ وہ پشتو کے علاوہ صرف انگریزی بول سکتی ہے اس لیے اس نے انگریزی کا سہارا لیا ہے اس نے اندازہ لگایا ہوگا کہ ان قبائلیوں میں انگریزی جاننے والوں کی تعداد بہت کم ہوگی اور ان میں سے کوئی بھی اس کی بات کا جواب دے سکتا ہے۔"

"وہ یہاں کے حالات سے بے خبر ہوسکتی ہے مگر تم تو سب کچھ جانتے ہو تمہیں اس کی بات کا جواب دینا چاہیے۔ اس سے تمہارا عارضی ہی سہی مگر قریبی تعلق رہ چکا ہے۔" ویرا نے کہا۔

"میرے تعلق کو جہنم میں ڈالو" میں نے جھنجلا کر کہا "میں تمہیں بتاچکا ہوں کہ سردار صبغت اللہ نے مجھے جنت گل سے براہ راست بات کرنے سے سختی سے منع کیا ہے۔ ہم میں سے کسی نے ذرا بھی زبان کھولی تو یہی سمجھا جائے گا کہ ہم جنت گل کے ساتھ مل کر کوئی سازش کررہے ہیں۔"

"ڈینی کا خیال درست ہے۔" غزالہ نے میری تائید کرتے ہوئے کہا "ہمیں چپ سادھ لینی چاہیے۔"

"مجھے ان بوڑھی لاشوں سے گھن آرہی ہے۔ ان دونوں عورتوں کو یہاں سے لے جاؤ ورنہ میں انہیں زخمی کربیٹھوں گی۔" فضا میں جنت گل کی غصیلی آواز دوبلند گونجی۔ شاید خدمت گار اس کے کمرے میں پہنچ چکے تھے اور وہ ان سے انگریزی میں اپنی بے زاری کا اظہار کررہی تھی۔

جواب میں کسی شنگاری مرد نے تیزی سے کچھ کہا۔ مجھے یقین تھا کہ مقامی بولی میں ادا کیے گئے وہ الفاظ ہماری طرح جنت گل کے لیے بھی ناقابل فہم رہے ہوں گے۔ وہ آوازیں اتنی بلند تھیں کہ قرب و جوار میں سوئے ہوئے کسی شنگاری مہمان کی نیند اچٹ گئی اور اس کی غنودہ اور بے زار آواز فضا میں گونج کر رہ گئی۔

غیرارادی طور پر ہم لوگوں کے ہاتھ تیزی کے ساتھ چلنے لگے۔ مہمان خانے کی چھت کے نیچے جو ڈراما شروع ہوچکا تھا اس سے پوری طرح لطف اندوز ہونے کے لیے ہمارا جلد از جلد کھانے سے فارغ ہونا ضروری تھا۔

"تم سب حرام زادے ہو۔" جنت گل انگریزی میں گرجی پھر تیز اور غصیلے لہجے میں پشتو بولنے لگی۔

ویرا نے کھانا ختم کرکے کچھ سیال اپنے معدے میں اتارا اور فیصلہ کن انداز میں اٹھ کھڑی ہوئی "میں تماشا دیکھنے جارہی ہوں۔ جنت گل بہت دلچسپ اور دلیر لڑکی معلوم ہوتی ہے۔ اسے دیکھے بغیر میرا تجسس دور نہیں ہوسکے گا۔ ہوسکتا کہ وہ غصے میں آپے سے باہر ہوکر خدمت گاروں پر حملہ کربیٹھے۔"

"نہیں!" میں نے سختی سے کہا "کوئی اس کمرے سے باہر نہیں جائے گا۔ اس وقت ہماری پوزیشن بہت نازک ہے۔ تمہیں اندازہ نہیں ہے کہ ہماری ذرا سی بے احتیاطی ہمیں دوبارہ زمین دوز قید خانے میں پہنچا سکتی ہے۔ سردار صبغت اللہ' جنت گل کے معاملے میں ضرورت سے زیادہ حساس ہوچکا ہے۔"

"میں اس سے بات نہیں کروں گی۔ بس ایک نظر ڈال کر لوٹ آؤں گی۔" ویرا نے اصرار کیا۔

"ایک ہی بات ہے' خونخوار مقامیوں کے درمیان تمہارے نرم اور دلکش خدوخال دیکھ کر اس کے دل میں امید کی ایک نئی چنگاری بھڑک اٹھے گی۔ ہوسکتا ہے کہ وہ تم تک پہنچنے کی کوشش میں رات بھر ہنگامہ آرائی کرتی رہے۔ میں تمہیں ایسے کسی چکر میں ملوث ہونے کی اجازت نہیں دے سکتا۔"

غزالہ اور سلطان شاہ بات کی پیچیدگی کو بخوبی سمجھ رہے تھے۔ انہوں نے اس بحث میں میرا ساتھ دیا اور ویرا شدید خواہش کے باوجود خواب گاہ سے باہر جانے میں کامیاب نہیں ہوسکی۔

دوسری طرف جنت گل کی برہمی کا سلسلہ جاری تھا۔ اس نے اپنی انگریزی کو بے اثر پاکر پشتو کا سہارا لیا ہوا تھا۔ سلطان شاہ نے بتایا کہ اس کی پشتو بھی انگریزی کی طرح رائیگاں جارہی تھی کیونکہ دوسرے فریق کی جانب سے بولی جانے والی زبان اس کے لیے ناقابل فہم تھی پھر شاید وہاں دھینگا مشتی کا سلسلہ شروع ہوگیا۔ ساتھ ہی دو عورتوں کی تیز و تند آوازیں آنے لگیں۔ وہ مقامی بولی بول رہی تھیں۔

جنت گل نرم و نازک ہونے کے ساتھ چالاک ضرور تھی مگر

اس میں لڑنے بھڑنے کی جسمانی صلاحیت نہیں تھی۔ چند ہی لمحوں بعد' یکے بعد دیگرے اُس کی دو چیخیں سنائی دیں۔ اس کی مظلومیت اور بے بسی سے ہم سب ہی ہمدردی محسوس کررہے تھے لیکن اس کی حمایت کرکے خود کو مشکلات میں پھنسانے کے لیے آمادہ نہیں تھے۔

مار کھانے کے بعد جنت گل کا جوش و خروش ٹھنڈا پڑگیا لیکن اس دوران میں مہمان خانے میں سوئے ہوئے کئی افراد بیدار ہوچکے تھے اور باہر سے ان کی خمار آلود اور استعجابیہ آوازیں سنائی دے رہی تھیں۔

تھوڑی دیر بعد ایک خدمت گار آیا اور کھانے کے خالی برتن اٹھاکر لے گیا۔

ہم چاروں سر جوڑ کر اس نئی صورت حال پر تبادلہ خیال کرتے رہے۔ میرا اندازہ تھا کہ گالان میں وہ ہماری آخری خطرناک رات تھی۔ اگر ہم اپنے اعصاب پر قابو رکھ کر وہ رات غیر جانبداری سے گزار لیتے اور صبح منعقد ہونے والے جرگے کے ذریعے صبغت اللہ اپنے طے شدہ مقاصد حاصل کرنے میں کامیاب ہوجاتا تو ہمیں گالان کے پرہول ماحول سے فوری طور پر نجات مل سکتی تھی۔ ہم جذبات کی رو میں بہہ کر اس امکان کو دھندلانے کی حماقت نہیں کرسکتے تھے۔

ہم اطمینان سے باتیں کررہے تھے۔ باہر پھیلے ہوئے تجسس اور اضطراب میں بھی خاصی کمی رونما ہوچکی تھی کہ اچانک ہمارے دروازے پر دستک ہوئی اور لمحہ بھر کے بعد ہی قندوز خان اندر گھس آیا۔

اس نے ہم لوگوں سے دور رک کر اشتباہ آمیز نظروں سے ہمارا اور کمرے کا جائزہ لیا پھر بولا "تمہیں معلوم ہے کہ یہاں کیا گڑبڑ ہوئی تھی؟"

"ہاں!" ویرا کے اقرار پر میرا دل اچھل کر حلق میں آگیا کہ کہیں وہ جنت گل کا نام نہ لے بیٹھے۔ میں نے اسے مزید بولنے کا موقع دیئے بغیر بات خود ہی سنبھال لی۔

"حیرت ناک طور پر کسی عورت نے انگریزی میں مدد کے لیے پکارنا شروع کردیا تھا۔ اس کے بعد کچھ گڑبڑ ہونے لگی تھی۔ کیا اس وقت گالان میں ویرا کے علاوہ بھی کوئی اور سفید فام عورت موجود ہے؟"

اس نے بے اعتباری سے میری طرف دیکھا پھر پوچھا "تم نے باہر نکل کر اصل صورت حال سے واقف ہونے کی کوشش نہیں کی؟"

"زمین دوز تہ خانے میں پورا دن گزارنے کے بعد ہم میں کوئی اور خطرہ مول لینے کی ہمت نہیں رہی۔ متجسس ہونے کے باوجود ہم اسی کمرے میں محدود رہے۔ تم لوگوں کے معاملات میں دخیل ہوتے ہوئے اب خوف آنے لگا ہے۔ تم کو شاید اسی گڑبڑ کی وجہ سے یہاں آنا پڑا ہے۔" میں نے کہا۔

"اُس عورت نے فرنگی زبان میں کیا کہا تھا؟" وہ میری کسی بھی بات کا جواب دیئے بغیر اپنی ہانکے جارہا تھا۔

"رات کی تنہائی سے نجات پانے کے لیے مدد چاہ رہی تھی۔ پھر کچھ گندی گالیاں دیتی رہی۔ تمہارے آدمیوں کی مداخلت کے بعد اس نے پشتو بولنی شروع کردی تھی۔ کون ہے وہ؟" میں نے پھر پوچھا۔

"اور تم نے اس کی بات سمجھ لینے کے باوجود کوئی جواب نہیں دیا؟" وہ میرے ہر سوال کو بُری طرح نظر انداز کیے جارہا تھا۔ ایسا معلوم ہورہا تھا جیسے ہماری طرف سے اس کا دل صاف نہ ہوا ہو۔

"فرنگی زبان بولنے والی تم لوگوں میں سے نہیں ہوسکتی تھی' اس لیے ہمارے جواب کی گنجائش ہی نہیں تھی" میں نے کہا "ہم آج کی رات زندان کے سخت اور ٹھنڈے فرش کے بجائے ان ہی بستروں پر گزارنا چاہتے ہیں۔"

اُس کے ہونٹوں پر زہریلی مسکراہٹ ابھر آئی۔ "مجھے خوشی ہے کہ زندان میں گزارے ہوئے چند گھنٹوں نے تمہاری عقلیں بہت تیز کردی ہیں۔ تمہاری عافیت اسی میں ہے کہ اس لڑکی کے سائے سے بچتے رہو۔"

"لڑکی؟" ویرا بے ساختہ اپنی حیرت کا اظہار کر بیٹھی۔ "آواز سے تو وہ عورت معلوم ہورہی تھی۔"

"ایک ہی بات ہے۔" قندوز خان جھلا کر بولا "عورت اور لڑکی میں کیا فرق ہوتا ہے؟"

آخری فقرہ قندوز خان کی جھلاہٹ کی پیداوار تھا مگر ویرا نے پوری سنجیدگی سے اس کا جواب دینا شروع کردیا۔ "ان اطراف کے ملکوں میں ساٹھ برس کی غیر شادی شدہ عورت کو بھی لڑکی کہا جاتا ہے جبکہ بارہ' پندرہ سال کی عمر میں شادی ہونے کے بعد لڑکی' عورت کہلانے لگتی ہے......"

"بس' بس!" قندوز خان نے اکتائے ہوئے انداز میں اس کی بات کاٹ دی۔ "تم بہت چرب زبان ہو۔ اس طرح تم مجھ سے کچھ بھی نہیں اگلوا سکو گی۔ میں تمہاری چالاکی کو سمجھ رہا ہوں۔"

جیسے ہی وہ واپسی کے لیے پلٹا' میں نے اسے روک لیا۔ "ہم اس لڑکی یا عورت سے دور رہنے کی پوری پوری کوشش کریں گے لیکن غسل خانے وغیرہ کی طرف جاتے ہوئے' پچھلی راہداری میں اس سے سامنا ہوگیا تو ہم کیا کریں گے؟"

"انجان بن کر خاموشی اور تیزی سے گزر جانا۔" اُس نے مڑ کر کہا پھر چونکتے ہوئے بولا "اچھا ہوا کہ تم نے یہ بات یاد دلا دی۔ جب اسے باہر نکالا جائے گا تو تمہارا پچھلا دروازہ باہر سے بند کردیا جائے گا۔ میں یہ بندوبست کرکے جاؤں گا۔ اسی میں تمہاری بہتری پوشیدہ ہے۔"

وہ چلا گیا تو ویرا ایک گہرا سانس لے کر' جگالی کرنے کے انداز میں اپنا منہ چلانے لگی۔

"اب جلدی سے اپنی ادھوری کہانی مکمل کر ڈالو۔" سلطان شاہ نے مجھے ٹوکا۔ "ایسا نہ ہو کہ صبح جرگے میں پیشی ہونے تک ہمیں معاملات کے سرپیر ہی کا کچھ پتا نہ چل سکے۔"

"جرگے میں تم تینوں خاموش تماشائی کی حیثیت سے شامل ہوگے۔" میں نے آنے والے کٹھن وقت کا اندازہ لگاتے ہوئے بوجھل آواز میں کہا "اس ناٹک کا مقصد وہی ہوگا جو میں تمہیں پہلے بتا چکا ہوں۔ جنت گل کو پائندہ گل کی ناجائز بیٹی قرار دینا اور پھر اسے عفت و حیا کا پاکیزہ پیکر قرار دے کر ارسلا خان کی بیوی بننے پر مجبور کرنا۔"

انہوں نے سوالات کا سلسلہ شروع کردیا۔ اس دوران میں' میں کن انکھیوں سے غزالہ کا جائزہ لیتا رہا۔ وہ بالکل خاموش اور اداس تھی۔ میں اُس کی خالی خالی آنکھوں میں اس کے اندرونی دکھ کی تحریر بخوبی پڑھ رہا تھا۔

دیر تک جاگتے رہنے کے بعد ہم چاروں' تمام مشعلیں گل کرکے اپنے اپنے بستروں پر دراز ہوگئے۔ غزالہ نے نہایت ہی باوقار رویئے کا مظاہرہ کرتے ہوئے' مجھے جنت گل کے سلسلے میں شرمندہ کرنے کی کوشش نہیں کی تھی بلکہ وہ اس موضوع سے بالکل ہی الگ تھلگ رہی تھی لیکن میرے دل کا چور میرے ذہن میں رہ رہ کر چوکے لگا رہا تھا۔

میں نے اپنی بے گناہی ثابت کرنے کے لیے ویرا کو جنت گل کے جبر کی کہانی سنائی تھی اور وہی بات غزالہ کے کانوں تک بھی پہنچی تھی لیکن میں اپنی داستان طرازی سے بخوبی واقف تھا۔ یہ حقیقت تھی کہ جنت گل نے پائندہ گل اور عبدالرحیم خان سے اپنی محرومیوں کا انتقام لینے کے لیے حریری لباس پہن کر میری آتش شوق کو ہوا دینے کا زہد شکن سوانگ رچایا تھا اور میں فوری طور پر اس سوانگ سے خوف زدہ بھی ہوگیا تھا۔ میرے ذہن میں پہلا خیال یہی آیا تھا کہ چھوٹا خان' اپنے وحشی مددگار کے ساتھ مل کر مجھے موت کے گھاٹ اتارنا چاہتا تھا جبکہ پائندہ گل مجھے زندہ سلامت اپنا قیدی بنانے کا خواہش مند تھا۔ پائندہ گل کی ہدایت سے انحراف کے لیے' اُن دونوں نے جنت گل کو اپنا آلہ کار بنا کر میرے پاس بھیجا تھا کہ میں اس کے حُسن اور دلربا پیکر کی رعنائیوں سے مدہوش ہوکر اس کی طرف پیش قدمی کروں اور وہ جنت گل کی عزت بچانے کے بہانے مجھے ہلاک کرسکیں۔

لیکن جنت گل نے میرا ذہن پڑھ کر میرا وہ خوف دور کردیا۔ وہ پائندہ گل سے متنفر تھی کیونکہ وہ اپنے بھانجے کو ہر قیمت پر اس سے شادی کرنے سے روک رہا تھا اور وہ اپنے محبوب' عبدالرحیم خان سے بھی بدظن تھی کیونکہ وہ بزدل تھا۔ جنت گل اپنے جذبوں کی چتا میں نجانے کب سے دھیمے دھیمے سلگ رہی تھی۔ اسے انتظار تھا کہ کب اس کا محبوب اسے اپنی بانہوں میں لے کر محبت کی نئی منزلوں سے آشنا کراتا ہے۔ لیکن وہ سعادت مند بھانجا اپنے ماموں کی اجازت کے بغیر کچھ بھی سوچنے پر قادر نہیں تھا۔ اس کے ذہن پر برف کی گہری تہ جمی ہوئی تھی۔ وہ بھولا ہوا تھا کہ جنت گل اپنے جسم و جمال کے لیے اُس کے خراج کی طلب گار تھی۔ ان دونوں سے اسی نفرت اور بے زاری نے جنت گل کو میرے روبرو لا کھڑا کیا تھا۔ پوری صورت حال کا ادراک ہونے کے بعد' عبدالرحیم خان کے کراچی والے فلیٹ میں جو کچھ ہوا' اس میں جنت گل کا جبر تھا نہ میری زبردستی۔ وہ جذبوں کی ایک وحشیانہ اور بہت اونچی لہر تھی جو تنہائی کے سمندر میں ہم دونوں کو اپنے ساتھ بہا لے گئی اور پھر ہمارے راستے جدا ہوگئے۔

میرا وہ رنگین اور مسحور کن خواب اگلی صبح ایک بھیانک حقیقت کا روپ دھار کر میرے سامنے آنے والا تھا۔ میں ابتدا سے ہی جنت گل کے جبر کی تکرار کرتا چلا آیا۔ لیکن اگلی صبح جبر و رضا کی بات نہیں ہونی تھی۔ صبغت اللہ کے سینے میں پروان چڑھنے والے کینہ پرور انتقام نے مجھے مجبور کردیا تھا کہ جب جنت گل اپنی بھیانک لغزش کا اعتراف کرے تو میں کھل کر اس سے انکار کردوں۔ غزالہ کی موجودگی میں جنت گل کا سامنا کرنا اور پھر اس کی سچ بات کی تردید کرنا مجھے ایک دشوار مرحلہ نظر آرہا تھا لیکن ہم چاروں کی سلامتی کا تقاضا تھا کہ میں دل پر جبر کرکے' آنکھیں بند کرکے' وہی کچھ کر گزروں جو شنگارا ویلی کا نیا سردار چاہتا تھا۔ اندھیرے اور بستر کی تنہائی میں میرا ذہن ان ہی الجھنوں میں کھویا رہا۔ اس وقت مجھے ہر حقیقت اپنے وجود سے سیکڑوں گنا بڑی محسوس ہورہی تھی۔ پھر ان ہی پریشانیوں میں' میں نیند کی سکون پرور دلدلوں میں ڈوبتا چلا گیا۔

اگلی صبح ہمیں سات بجے بیدار کردیا گیا۔ ہم چاروں منہ ہاتھ دھو کر پوری طرح بیٹھنے بھی نہ پائے تھے کہ ناشتا آگیا جو مقدار اور معیار دونوں اعتبار سے معمول سے کم تھا لیکن زیر زمین قید خانے کی فاقہ کشی سے ہزار درجے بہتر تھا۔

جوں جوں ہماری پیشی کا وقت قریب آتا جارہا تھا' ہم سب پر اعصابی تناؤ طاری ہوتا جارہا تھا۔ میرے ساتھ ویرا بھی بے چینی سے ٹہل ٹہل کر سگریٹ پہ سگریٹ پھونک رہی تھی۔ نو بجے قندوز خان ہمیں لینے آگیا۔ اس وقت اس کے چہرے سے بشاشت اور تازگی کے بجائے تشویش اور پریشانی ہویدا تھی۔

"تمہیں معلوم ہے کہ تمہیں جرگے میں کیا کرنا ہے؟" اس نے میرے قریب آکر آہستگی سے پوچھا۔ اُس کے لہجے کی بے اعتمادی سے ظاہر ہورہا تھا کہ اسے جرگے میں میرے کردار کے بارے میں کچھ معلوم نہیں تھا۔

"اچھی طرح۔" میں نے سر ہلا کر پورے اعتماد سے کہا "سردار صبغت اللہ نے تمہیں بتا ہی دیا ہوگا" میں نے اس کے دل میں بدگمانی کا بیج بونے کے لیے اپنی بات میں اضافہ کیا ورنہ صبغت اللہ مجھے بتا ہی چکا تھا کہ جو کچھ میرے اور اس کے درمیان طے پایا تھا' وہ ایک راز تھا جس میں قندوز خان کو شریک نہیں کیا گیا تھا۔

"مجھے کسی نے کچھ نہیں بتایا" اس نے مجروح آواز میں کہا "نہ

میں جاننا چاہتا ہوں۔ میرے لیے اتنا ہی کافی ہے کہ تم کو ہر بات بتا دی گئی ہے۔ یہ یاد رکھنا کہ جرگے میں بلا ضرورت اور اونچی آواز میں بولنا جرم ہے۔"

"تمہارا بہت بہت شکریہ۔" میں نے بلا وجہ اس کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر اس سے اپنے قرب کا مظاہرہ کرتے ہوئے کہا "یہ مجھے نہیں معلوم تھا۔ ویسے جرگے میں تم کو ہمارے ساتھ ہی بیٹھنا ہے۔ کوئی غلطی ہو رہی ہو تو تکلف کیے بغیر فوراً ہی ٹوک دینا۔ ہم میں سے کوئی بُرا نہیں مانے گا۔"

اس نے الجھن آمیز نظروں سے میری طرف دیکھا اور پوچھا "میں تمہارے ساتھ کیوں بیٹھوں گا؟"

"معاف کرنا۔ یہ بات روانی میں میرے منہ سے نکل گئی۔ میرا خیال ہے کہ زبان کی مجبوری کی وجہ سے ہم کو جرگے کی کارروائی بتاتے رہو گے۔" اس پر میری اس سوچی سمجھی بات کا اثر میری توقع کے عین مطابق ہوا۔ اس کا منہ یوں بگڑ گیا جیسے اس نے بے خبری میں کوئی کڑوی کسیلی چیز چبا ڈالی ہو۔

"چلو!" وہ ایک جھٹکے سے دروازے کی طرف چل دیا۔ میں اس کے پیچھے ہولیا۔

سردار صبغت اللہ کے کمرے کے بیرونی دربار ہال میں ماحول بہت گمبھیر تھا۔ لکڑی کی چوکیوں کے ایک طرف دس معمر اور باریش شنگاری بیٹھے ہوئے تھے، جن کے سینوں پر لہراتی ہوئی گھنی اور سفید داڑھیاں ان کے قوی ہیکل جسموں کو پرشکوہ بنا رہی تھیں۔ ان کے جسموں پر ڈھیلے ڈھالے لباس اور سروں پر بڑی بڑی پگڑیاں نظر آرہی تھیں۔ ان سے الگ مختلف عمروں کے پندرہ بیس شنگاری ایک طرف بیٹھے ہوئے تھے۔ سامنے پڑی ہوئی آراستہ مسند پر سردار صبغت اللہ براجمان تھا۔ سفید داڑھیوں والے شنگاریوں کی دوسری طرف ضیغم خان، اس کی گونگی بیوی اور جنت گل نظر آرہی تھی۔ جنت گل کے چہرے پر شدید حیرت نظر آرہی تھی جیسے اس کے لیے وہ تماشا غیر متوقع رہا ہو۔ وہ حیران اور خوف زدہ نظروں سے اِدھر اُدھر دیکھ رہی تھی۔

ہم لوگوں کے داخل ہوتے ہی ساری نظریں ہماری طرف اٹھ گئیں۔ میں نے چور نظروں سے دیکھا کہ مجھ پر نگاہ پڑتے ہی جنت گل ششدر رہ گئی تھی۔ نگاہیں چار ہونے کی امید میں وہ ایک ٹک میری ہی طرف دیکھتی رہی لیکن میں اس سے نظریں ملائے بغیر قندوز خان کے پیچھے چلتا رہا۔

ہمیں ضیغم خان وغیرہ سے قدرے فاصلے پر بٹھانے کے بعد قندوز خان، صبغت اللہ کی طرف گیا۔ مسند نشین سردار نے نیچی آواز میں اسے کچھ ہدایات دیں اور وہ واپس لوٹ کر ہمارے ساتھ بیٹھ گیا۔ اس کی پیشانی پر پڑی ہوئی شکنیں یہ ظاہر کر رہی تھیں کہ اسے آخری لمحات پر اپنا اعتماد میں لیا جانا گراں گزرا تھا۔

آخر سردار صبغت اللہ نے دھیمے لہجے میں بولنا شروع کردیا۔ قندوز خان نے ہمیں اس کی باتوں کا ترجمہ سنانا شروع کردیا۔ وہ جرگے کے اراکین اور گالان کے مقتدر لوگوں کو بتا رہا تھا کہ انہیں چند اہم فیصلوں کے لیے وہاں جمع کیا گیا تھا۔ ان میں سے ایک فیصلے کا تعلق مرحوم پائندہ گل کی ذات سے تھا۔

سردار صبغت اللہ کی مقامی بولی میں کی جانے والی تقریر شنگاریوں کے لیے قابل فہم تھی۔ ہمارے لیے اس کے ترجمے کا بندوبست تھا۔ ضیغم خان اس بولی سے واقف تھا۔ صرف گوہر جان اور جنت گل کو کچھ پتا نہیں چل رہا تھا اور دونوں حیران و پریشان نظروں سے اِدھر اُدھر دیکھ رہی تھیں۔ صبغت اللہ کی گھومتی ہوئی عقابی نظروں نے ان کی پریشانی کو بھانپ لیا اور اپنی تقریر میں وقفہ دے کر، ان دونوں سے پشتو میں مخاطب ہوگیا۔ اس نے ان دونوں کو قندوز خان کے قریب بیٹھنے کی ہدایت کی تھی۔

وہ دونوں عورتیں اس بات سے بخوبی آگاہ تھیں کہ ساری نگاہیں ان پر ہی مرکوز ہوگئی تھیں۔ وہ آئیں تو میں جنت گل سے نظریں نہ بچا سکا۔ نگاہیں چار ہوتے ہی اس کا چہرہ کسی اندرونی خوشی سے دمک اٹھا۔ وہ زبان سے کچھ کہے بغیر بیٹھی تو میرے اور اس کے درمیان میں قندوز خان حائل تھا۔

صبغت اللہ نے اپنی دھیمی تقریر دوبارہ شروع کردی۔ قندوز خان کی زبان بھی ساتھ چل پڑی۔ "مجھے دکھ ہے کہ پائندہ گل، جو اپنے نسب کو چلانے والا آخری مرد تھا، میرے ہاتھوں مارا گیا اور اب شنگارا ویلی میں اس کے خاندان کا نام و نشان مٹ جائے گا۔"

صبغت اللہ غم و اندوہ سے بھرپور اداکاری کرتے ہوئے کہہ رہا تھا "لیکن اس وادی کے ہر باسی کے بہتری کے لیے ایسا ہونا ہی تھا۔ پائندہ گل خود غرض، ضدی اور ہٹ دھرم ہوگیا تھا۔ ایفم کا سارا پیسہ وہ ہڑپ کر رہا تھا۔ جنگ ہوتی ہے تو سورما ہی مارے جاتے ہیں۔ بستروں میں منہ اوندھے کیے ہوئے لوگ، بیمار اور معذور نہیں مرا کرتے۔ ہم نے دن کا سورج ڈھلنے سے بہت پہلے جنگ جیت لی تھی۔ دونوں طرف کے ستاسی آدمی مارے گئے۔ میں ان سب کے گاڑھے خون کو سلام کرتا ہوں۔ چھیاسی سورماؤں کی میتوں کو عزت سے دفنا دیا گیا۔ ان کی لاشوں پر کوئی گریہ یا ماتم نہیں ہوا لیکن سب گواہ ہیں کہ پائندہ گل کی لاوارث لاش گالان کی بستی میں رکھی گئی تو اس کے خاندان کی چھ بدنصیب بوڑھی عورتوں نے اپنے بال کھول کر ماتم سے اپنے سینے زخمی کر ڈالے۔ ان میں چار بیوائیں تھیں اور دو ایسی معمر کنواریاں جن کے لیے پائندہ گل کو کبھی کوئی شنگاری پسند نہیں آیا۔ ان بے سہارا عورتوں کو برادران والوں نے اپنی کفالت میں لے لیا ہے۔ ان کے مقدر نے یاوری کی تو انہیں گالان ہی کی مٹی ملے گی اور شاید ساتویں کو بھی۔ سب کی آنکھیں حیرت سے پیشانیوں پر جا چڑھی ہیں لیکن میں وہی کہتا ہوں جس کا مجھے یقین ہوتا ہے۔ مجھے پتا چلا ہے کہ بائیس برس پہلے پائندہ گل نے کابل شہر میں اپنے ایک جگری دوست کی بیوی کی کوکھ میں تھوکا تھا اور آج اس کی وہ لغزش اس جوان لڑکی کی صورت میں ہمارے درمیان موجود ہے۔" اس نے داہنا ہاتھ اٹھا کر جنت گل کی طرف اشارہ کیا تھا۔

فضا میں تحیّر زدہ سرگوشیاں گونجنے لگیں۔ جرگے کے اراکین سمیت، سب لوگ حیرت اور بے یقینی سے ایک دوسرے کی طرف دیکھ رہے تھے۔ پہاڑوں کے حصار میں اپنی زندگیاں گزار دینے والے تجربے کار شنگاریوں کے لیے وہ انکشاف ایک دھماکے سے کم نہیں تھا۔

جنت گل کا چہرہ یک بیک سرخ ہوگیا اور وہ کسی کی پروا کیے بغیر، اضطرار کے عالم میں اٹھ کھڑی ہوئی اور انگریزی میں چلانے لگی۔ "ہاں، میں باسٹرڈ ہوں۔ مجھے فخر ہے کہ میں پائندہ گل کی اولاد ہوں، اس بے غیرت لنگڑے کی نہیں، جو دوسرے کی پگڑی اپنے سر پر جما کر عزت دار بننے کے خواب دیکھ رہا تھا۔" پھر اس نے یک بیک پھر کر پشتو میں بولنا شروع کردیا۔ ایک شنگاری اٹھ کر اس کے ساتھ بولنے لگا۔ شاید وہ جنت گل کی کہی ہوئی باتوں کو مقامی بولی میں ڈھال رہا تھا۔

چند منٹ کے لیے سارا ماحول درہم برہم ہو کر رہ گیا۔ کئی لوگ زور زور سے بولنے لگے۔ ضیغم خان کا چہرہ تاریک ہوگیا۔ گوہر جان کے ہونٹوں پر زہر میں ڈوبی ہوئی مسکراہٹ کھیلنے لگی۔ اس کے دہانے سے چند بے مقصد آوازیں بھی برآمد ہوئیں۔ شاید وہ اس بحران پر اپنی خوشی کا اظہار کر رہی تھی۔

میں نے محسوس کیا کہ صبغت اللہ دیدہ دانستہ ڈھیل دے رہا تھا۔ جب جنت گل کچھ ایسی باتیں، جو وہ اس کی زبان سے سب کو سنوانی چاہتا تھا، کہہ چکی تو وہ ہاتھ اٹھا کر غصیلی آواز میں بولنے لگا۔

قندوز خان نے جنت گل کے دونوں شانے دبوچ کر اسے زبردستی بیٹھنے پر مجبور کردیا۔

"یہ سب لوگوں کے لیے انوکھی بات ہے" قندوز خان اپنے سردار کی غضب ناک باتیں دہرانے لگا "اس لیے میں اس بار سب کی گستاخی معاف کر رہا ہوں۔ اونچی آواز میں یا بلا ضرورت بولنا، جرگے کی بے عزتی ہے، جس کی سزا مل کر رہتی ہے۔ اب کسی نے زبان کھولی تو میں اسے معاف نہیں کروں گا۔" پھر وہ ہم لوگوں کی طرف متوجہ ہو کر براہ راست اردو میں بولنے لگا "سب خاموشی سے سنو۔ باری آنے پر ہر ایک کو بولنے کا موقع دیا جائے گا۔"

جب صبغت اللہ اردو بول رہا تھا تو قندوز خان خاموش ہوگیا لیکن پہلے والے شنگاری نے فوراً ہی اردو کا مقامی بولی میں ترجمہ شروع کردیا تاکہ ہر شخص ہر بات سے باخبر رہ سکے۔

"پائندہ گل فرشتہ نہیں، ہم سب جیسا ایک انسان تھا اور ہر انسان خطا کا پتلا ہوتا ہے" صبغت اللہ نے اپنی بات دوبارہ شروع کردی "اس زیرک اور جہاں دیدہ انسان سے بھی ایک غلطی ہوئی۔ اس کا کوئی ولی وارث ہوتا تو خود اس لڑکی کی خبر گیری کرتا رہتا لیکن بدقسمتی سے ایسا نہیں ہے۔ یہ لڑکی جیسی بھی ہے، اس کی رگوں میں ایک مرحوم شنگاری کا خون دوڑ رہا ہے۔ پائندہ گل کے مرنے کے بعد جنت گل کی دیکھ بھال ہماری ذمے داری ہے۔"

"اس پر عبدالرحیم خان کے قتل کا الزام ہے" ایک شنگاری نے جرگے سے مخاطب ہو کر کہا "پائندہ گل نے مجھے خود بتایا تھا کہ عبدالرحیم خان کو جنت گل نام کی ایک لڑکی نے مارا ہے اور وہ اسے گالان میں لا کر اپنے بھانجے کے قتل کا بدلہ لے گا۔ اس کی ہم پر کیا ذمے داری ہو سکتی ہے؟"

"عبدالرحیم خان کے خون کا بدلہ لینا اس کے وارثوں کی ذمے داری تھی۔ پائندہ گل خود لاوارث مر گیا۔ کیا اب تم اس کے وارث ہونے کا دعویٰ کر رہے ہو؟" صبغت اللہ کے الفاظ زہر میں بجھے ہوئے تھے۔ پائندہ گل کی وراثت کے اقرار کا مطلب صبغت اللہ سے بے وفائی کے علاوہ اور کچھ نہیں ہو سکتا تھا۔

"میں اپنا اعتراض واپس لیتا ہوں" اس شنگاری کا منہ اتر گیا۔ جنت گل کے نام پر پیدا ہونے والا ابال صبغت اللہ کے تیور دیکھتے ہی بیٹھ گیا تھا۔

"مجھے معلوم ہے کہ میں خلاصہ سنا رہا ہوں۔ بہت سے لوگوں کے ذہنوں میں کئی سوالات کلبلا رہے ہوں گے۔ شاید تم میں سے بعض کو میری بات پر پورا یقین نہ آیا ہو۔ اسی لیے میں نے باہر سے کئی لوگوں کو یہاں بلایا ہوا ہے۔ ان میں پائندہ گل کا وہ دوست بھی ہے جس کے گھر میں جنت گل پیدا ہوئی اور پروان چڑھی۔ میرا خیال ہے کہ جرگہ اجازت دے تو ہم سب ضیغم خان کی کہانی سن لیں جو پائندہ گل کے گناہ سے پردہ اٹھا دے گی" اتنا کہہ کر وہ خاموش ہوگیا اور جرگے کے اراکین نے ایک دوسرے سے مشورہ کرنا شروع کردیا۔

"تم یہاں کیسے آپھنسے؟" صبغت اللہ کی تقریر کا تسلسل ختم ہونے کے بعد جنت گل نے حیرت سے مجھ سے پوچھا۔ میں نے ایک نظر اس کی طرف دیکھ کر اپنا سر جھکا لیا۔ قندوز خان اس کی زبان سے فرنگی بولی سن کر یک بیک چوکنا نظر آنے لگا تھا اور باری باری ہم دونوں کا جائزہ لے رہا تھا۔

"تم بولتے کیوں نہیں؟" چند ثانیوں کے بعد جنت گل جھلا کر دوبارہ بولی "کسی چور کی طرح منہ چھپائے کیوں بیٹھے ہو؟"

"یہ لڑکی یوں ہی مجھے تنگ کرتی رہے گی" میں نے قندوز خان سے مخاطب ہو کر کہا "اسے بتا دو کہ مجھے اس سے بات کرنے کی اجازت نہیں ہے۔ میں اس کی کسی بات کا جواب نہیں دے سکتا۔"

"اوہ! تو اب یوں مجھ سے انجان بنو گے؟" جنت گل، قندوز خان کی ترجمانی کے بغیر، آنکھیں نکال کر بولی "کم از کم یہ تو بتا دو کہ تمہیں کس سلسلے میں یہاں لایا گیا ہے؟ اس وقت تو تم بچ کر نکل گئے تھے۔"

میں نے بے بسی سے قندوز خان کی طرف دیکھتے ہوئے کہا "تم گواہ رہنا کہ میں نے بالکل خاموشی اختیار کی ہوئی ہے اور یہ مسلسل بولے جا رہی ہے۔ کیا تم اسے خاموش نہیں کروا سکتے؟"

"یہ تم سے کیا کہہ رہی ہے؟" قندوز خان نے مجھ سے پوچھا

"فرنگی زبان میری سمجھ میں نہیں آتی۔"

"بس بلاوجہ باتیں کرنے کی کوشش کررہی ہے" میں نے قندوز خان کی نظر بچاکر جنت گل کو آنکھ مارتے ہوئے کہا "یہ مجھے پہلے سے جانتی ہے۔ پتا نہیں سردار صبغت اللہ نے اسے میرے قریب کیوں بھیج دیا؟"

جرگے کے اراکین میں سے کسی نے بولنا شروع کردیا۔ قندوز خان نے بتایا کہ وہ لوگ سردار پائندہ گل کے بارے میں ضیغم خان کا بیان سننے پر آمادہ ہوچکے ہیں۔ اس کی بیوی اس کے ساتھ رہے گی تاکہ اشاروں کی مدد سے اپنے شوہر کے حقیقی بیان کی تائید اور جھوٹ کی تردید کرسکے۔

ضیغم خان اپنی مخصوص پُھدکتی ہوئی چال میں جرگے کے اراکین کے روبرو جا کھڑا ہوا۔ گوہر جان اس کے ساتھ تھی لیکن اس نے اپنے شوہر کو کوئی مدد دینے کی کوشش نہیں کی تھی۔

ضیغم خان نے ایک گہرے متاسفانہ سانس کے ساتھ ان دنوں کا ذکر چھیڑدیا جب اس کی اور پائندہ گل کی گہری دوستی تھی۔ پائندہ گل کا باپ زندہ اور شنگارا ویلی کا حکمراں تھا اور اس نے اپنے اکلوتے بیٹے کو جدید تہذیب و تمدن سے روشناس کرانے کے لیے پورے وسائل اور آزادی کے ساتھ اسے کابل میں چھوڑا ہوا تھا۔

مجھے کہانی کے دونوں رخ معلوم تھے۔ حقیقت کے بارے میں پائندہ گل نے خود مجھے ہر بات بتائی تھی اور ضیغم خان جو کچھ کہنے والا تھا' اس نے وہ ہم چاروں کے سامنے تہ خانے میں اپنی بیوی کے ساتھ طے کیا تھا۔ وہ اپنی نو تراشیدہ کہانی سناتا رہا۔ اس کی بیوی مغموم انداز میں سرہلا کر اس کی تائید کرتی رہی۔ ضیغم خان نے بہت چالاکی کے ساتھ اپنے گھناؤنے کردار کا ذکر حذف کرکے' جرم وگناہ کا سارا بوجھ پائندہ گل کے مُردہ کندھوں پر لاددیا تھا۔ اُس کی گونگی بیوی شروع سے آخر تک اس کی تائید میں سرہلاتی رہی۔ حتیٰ کہ ضیغم خان کے پاس الفاظ کا ذخیرہ ختم ہوگیا اور اس کی کہانی پوری ہوگئی۔

اس کھیل میں جنت گل کا کوئی کردار نہیں تھا۔ وہ اپنی مرضی سے اس دنیا میں نہیں آئی تھی۔ نہ ہی وہ یہ جان سکتی تھی کہ اس کی پیدائش میں کن دو فریقوں نے حصہ لیا تھا۔ وہ جو کچھ بھی کہتی' وہ سنی سنائی باتوں پر مشتمل ہوتا۔ اس کے باپ نے اس سے کہیں زیادہ حقائق بیان کردیے تھے۔ اس نے جرگے کے اراکین کو یہ بھی بتادیا تھا کہ کابل والوں نے جنت خانم کے خدوخال میں پائندہ گل سے گہری مشابہت دیکھنے کے بعد اسے طنزیہ پیرائے میں جنت گل کہنا شروع کردیا تھا اور پھر اس کا وہی نام چل نکلا۔

جنت گل کی پیشی کی ضرورت محسوس نہیں کی گئی۔ جرگے کے اراکین دیر تک آپس میں مشورے کرتے رہے۔ اس دوران میں جنت گل بہت پریشان رہی۔ وہ یہ سمجھنے سے قاصر تھی کہ وہ لوگ گڑے مُردے اُکھاڑنے پر کیوں تلے ہوئے تھے۔ اس نے کئی بار مجھے اور قندوز خان کو مخاطب کرنا چاہا لیکن ہم میں سے کسی نے اس کے سوالات کا جواب نہیں دیا۔ میرے تینوں ساتھیوں کے لیے جنت گل کی ذات گہری دلچسپی کا باعث بنی ہوئی تھی۔ ان میں سے کسی نے اس سے مخاطب ہونے کی مجرمانہ حماقت نہیں کی لیکن وہ جھک جھک کر اور مڑمڑ کر' باربار جنت گل کو دیکھے جارہے تھے۔ وہ حسین و جمیل کابلی دوشیزہ اس بھری محفل میں یکہ و تنہا ہونے کے باوجود بے خوف نظر آرہی تھی۔ شاید وہ پائندہ گل کے خون کا اثر تھا کہ اسے بدترین حالات میں بھی اپنے انجام کی کوئی فکر نہیں تھی۔

جرگے کے ارکین تبادلہ خیال میں مصروف تھے۔ چند شنگاری صبغت اللہ کے پاس جا بیٹھے تھے اور دھیمی آواز میں اس سے باتیں کررہے تھے۔ جرگے کی موجودگی میں وہاں سگریٹ نوشی کی ممانعت تھی اس لیے بے کاری کے عالم میں میرے کان ویرا اور غزالہ کی سرگوشیوں پر لگے ہوئے تھے۔

جنت گل کے حُسن و جمال نے ان دونوں کو مرعوب کیا ہوا تھا۔ قدرت نے اسے گوری چٹی رنگت کے ساتھ ہی کشیدہ قامت' مرمر سے تراشے ہوئے سبک و نازک بدن' تیکھے نقوش' غزالی آنکھوں' یاقوتی ہونٹوں اور دراز زلفوں سمیت ہراُس خوبی سے نوازا ہوا تھا جو کسی بھی نسوانی پیکر کو مرکز نگاہ بناسکتی ہے۔ ان دونوں کو حیرت تھی کہ اس قدر خوب رو اور خوش بدن لڑکی کے ذہن پر اندھے انتقام نے ایسے پردے ڈالے تھے کہ وہ خود ہی اپنی عزّت و آبرو کی دشمن ہوگئی تھی۔ ویرا کو مزید حیرت اس بات پر تھی کہ اس قتالۂ عالم نے اپنے باپ کی رسوائی کے لیے جس کھیل کا انتخاب کیا تھا اس میں مرکزی کردار کے لیے اس کی نگاہ میری ذات پر پڑی تھی۔

آخر کار جرگے کے ایک معمر رکن کی آواز پر ہر طرف خاموشی چھاگئی۔ قندوز خان اس کے فیصلے سے ہم کو آگاہ کرنے لگا' وہ کہہ رہا تھا۔ "پائندہ گل منوں خاک کے نیچے جاسویا ہے لیکن ہم نے جو کچھ سنا اور اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے' اس پر شبہ کرنے کی کوئی کمزور سی وجہ بھی موجود نہیں ہے۔ اس وادی میں سینہ بہ سینہ پھیلنے والی اس کہانی سے میرے بعض معزز ساتھی پہلے ہی واقف تھے۔ ان باتوں میں تھوڑا سا فرق ہے۔ پائندہ گل کے دل میں شیطان نے سر ابھارا یا ضیغم خان نے اسے اکسایا' یہ بات غیر اہم ہے۔ دونوں کا نتیجہ ایک ہی نکلنا تھا اور وہ نکل کر رہا۔ جنت گل کو پائندہ گل اور گوہر جان کی اولاد قرار دینے میں کوئی رکاوٹ حائل نہیں ہے۔ جنت گل کی رگوں میں شنگاری خون دوڑ رہا ہے۔ اب اس کے نصیب کا فیصلہ سردار صبغت اللہ کے ہاتھ میں ہے۔"

جرگے کے رکن کے خاموش ہوتے ہی سردار صبغت اللہ نے بولنا شروع کردیا "میں اس شنگاری لڑکی کو شہر کی غلاظتوں میں بھٹکنے کے لیے بے سہارا نہیں چھوڑ سکتا۔ پائندہ گل کی موت کے ساتھ ہی میرے اور اس کے اختلافات ختم ہوگئے۔ اب اس کی

اولاد کی دیکھ بھال میں کروں گا۔ جنت گل گالان میں رہے گی۔ میں ...ں کی شادی کراؤں گا۔ اگر اس کے نسب کی خرابی کی وجہ سے ...ی شنگاری نے اس کا پیغام نہ ڈالا تو میں ارسلا خان کو مجبور کروں ...ا کہ وہ اسے عزت سے اپنی بیوی بنالے۔ وہ کسی بھی دن یہاں پہنچنے والا ہے۔ عبدالرحیم خان اور پائندہ گل کی موت نے اس کی بے گناہی پر مہر لگادی ہے۔ جب عبدالرحیم خان کی ماں کو قدرت نے جھوٹی گواہی دینے کے جرم میں کوڑھ جیسے موذی مرض میں مبتلا ...ر تھا تو اسی وقت سب نے جان لیا تھا کہ زرتاشہ کو غلط فہمی ہوئی ...ی ارسلا خان بے قصور تھا۔ سارا گناہ عبدالرحیم خان کا تھا۔ ...ن کے ماموں نے کابل میں گوہر جان کو خراب کیا اور اس نے ...گالان کے ویرانے میں زرتاشہ کو اپنا نشانہ بنایا۔ ارسلا خان پر الزام لگانے والے سب لوگ اپنے اپنے انجام کو پہنچ چکے ہیں۔ پائندہ گل کی زندگی میں وہشت اور خوف سے شنگاریوں کی زبانیں گنگ تھیں لیکن آج میں ارسلا خان کا وارث ہوں۔ میں جرگے کے ارکان سے التجا کرتا ہوں کہ وہ ارسلا خان کے لیے امان کا اعلان کریں۔"

"یہ سب بکواس ہے" جنت گل اچانک ہی چیخ پڑی۔ دہشت ...ور صدمے سے اس کا چہرہ زرد ہورہا تھا "مجھے پائندہ گل کی بیٹی قرار ...ے کر تم ان پہاڑوں میں عمر قید کی سزا نہیں دے سکتے۔ میں تم جیسے ...وحشیوں میں چند روز بھی زندہ نہیں رہ سکتی۔ میں کسی ارسلا خان کو نہیں جانتی۔ وہ درندہ میرے قریب بھی آیا تو میں اس کا نرخرا پھاڑ ...ڈالوں گی۔ مجھے تم لوگوں کی ہوس ناک ہمدردیاں نہیں چاہئیں۔ میں ...اپنی حفاظت خود کرسکتی ہوں۔ میں وہیں واپس جاؤں گی جہاں میں ...پلا بڑھی ہوں۔ ضیغم خان میرا باپ نہیں تو کیا؟ گوہر جان میری ماں ...ہے۔ میں اپنے شہر میں اپنی ماں کے ساتھ رہوں گی۔ تم کسی قیمت پر ...مجھے یہاں نہیں روک سکتے۔"

"نسب خراب ہوجائے تو جوان خون اسی طرح بڑوں کے منہ ...آنے لگتا ہے" سردار صبغت اللہ کی آواز موت کی طرح سرد اور ...بھی تھی۔ "معزز جرگے نے تمہیں شنگاری تسلیم کرلیا ہے اور ...ان پہاڑوں میں لڑکیوں کو بولنے کا حق نہیں ہوتا۔ ان کی بہتری کے ...فیصلے ان کے بڑے کرتے ہیں۔ ابھی تم پر شہر کا جنون طاری ہے۔ تم ...غصے میں ہذیان بک رہی ہو۔ میں کھلے دل سے تم کو معاف کرتا ...ہوں۔ جب تمہارے دل کی بھڑاس نکل جائے گی تو تم میرے فیصلے ...کے سامنے سر جھکادوگی۔ اپنے سر پر چادر ڈال لو۔ شنگاری لڑکیاں ...گالان میں ننگے سر نہیں رہتیں...."

جنت گل جوش میں اپنی جگہ چھوڑ کر کئی قدم آگے بڑھ گئی اور ...صبغت اللہ کی بات کاٹ کر بولی "تم مکار اور سازشی درندے ہو۔ ...جھوٹ بول رہے ہو کہ پائندہ گل کی موت کے بعد تمہارے اور ...اس کے اختلافات ختم ہوگئے۔ تمہارے قبائلی خون میں ایک بار ...نفرت اور انتقام کا زہر گھل جائے تو وہ نسل در نسل چلتا ہے۔ میرے ...باپ کو مارنے کے بعد تم مجھے مال غنیمت سمجھ کر لوٹنا چاہتے ہو۔ میں فنا ہوجاؤں گی مگر تمہیں اپنے ارادوں میں کامیاب نہیں ہونے دوں گی۔"

سب لوگ جنت گل کی اس جسارت پر دم بخود رہ گئے تھے۔ جرگے کے اراکین خوف ناک نگاہوں سے اسے گھور رہے تھے۔ صبغت اللہ کا چہرہ سرخ ہوگیا تھا۔ تیزی کے ساتھ بولتے ہوئے قندوز خان کی زبان لڑکھڑانے لگی تھی۔ میری دانست میں جنت گل نے صبغت اللہ کی دکھتی رگ پر ہاتھ ڈال دیا تھا۔ وہ اپنے باپ کے قاتل کے دل کی گہرائیوں میں جھانک رہی تھی لیکن میں بے بس تھا۔ اس مخاصمانہ ماحول میں اس کی کوئی مدد نہیں کرسکتا تھا۔

"تم ہمارے منہ پر ہمیں بُرا بھلا کہہ رہی ہو" جرگے کے معمر ترین شخص نے غصے سے لرزتی ہوئی آواز میں کہا "غیرت اور انتقام ہمارے خون میں شامل ہے لیکن تم خوش نصیب ہو کہ تمہیں سردار صبغت اللہ جیسا مربّی مل رہا ہے۔ وہ تمہاری عزّت و آبرو کا محافظ ہوگا۔ ڈرو اس وقت سے جب تمہارا گستاخ لہجہ اور سرکش الفاظ شنگاریوں کے غضب کو بیدار کردیں۔ ان کی بے عزتی کرکے تم کچھ بھی حاصل نہیں کرسکوگی۔"

"میں تم سب کی بدترین بے عزتی کرچکی ہوں" جنت گل نے تڑپ کر کہا اور میں سناٹے میں آگیا "یہ پائندہ گل کا یرغمال تھا" اس نے میری طرف ہاتھ اٹھاکر کہا "میں پائندہ گل اور چھوٹے خان سے بدظن تھی۔ میں نے خود کو اس یرغمال کے حوالے کردیا۔ میں نے تم سب کے منہ پر رسوائی مل دی ہے۔ میں پارسا نہیں ہوں۔ میرا نسب خراب تھا اس لیے میں نے خود کو بھی خراب کرلیا۔ اب بتاؤ' کون ہے وہ شنگاری جو مجھے اپنی بیوی بنائے گا؟"

اٹھی ہوئی غضب ناک نگاہیں جھک گئیں' تیور ماند پڑگئے۔ دربار ہال میں ایسا گہرا سناٹا چھاگیا جیسے سب کو سانپ سونگھ گیا ہو۔ جنت گل کے انکشاف نے سب کی زبانیں گنگ کردی تھیں۔

"شاید تم یہاں سے جان بچاکر نکلنے کے لیے جھوٹ بولنے پر اتر آئی ہو" سردار صبغت اللہ سرد اور سفاکانہ آواز میں بولا "تمہیں معلوم نہیں کہ تمہارا یہ اعترافِ جرم درست ثابت ہوا تو کیسی بھیانک موت تمہارا مقدّر بنے گی۔ یرغمال تک کسی عورت کی رسائی پوری شنگاری قوم کے لیے ننگی گالی ہے..."

"ہاں' میں جانتی ہوں۔" جنت گل پر جنون کی سی کیفیت طاری ہوتی جارہی تھی "میں نے اپنے ظالم باپ سے انتقام لینے کے لیے تم سب کو یہ گالی دی تھی۔ زندگی بھر ارسلا خان یا کسی اور شنگاری کی قید میں سسکنے سے بہتر ہے کہ میری زندگی ختم کردی جائے۔ میں اپنے جرم کا اعتراف کررہی ہوں۔ چھلنی کردو میرے بدن کو۔"

جھکی ہوئی نگاہیں اوپر نہیں اٹھ سکیں۔ ہم لوگ ایک دوسرے کے سانسوں کی آواز صاف سن رہے تھے۔

صبغت اللہ سے فوری طور پر کوئی جواب نہیں بن پڑا۔ جنت

گل شرم وحیا کی ہر حد توڑنے پر تلی ہوئی تھی اور جرگے کی کارروائی صبغت اللہ کی گرفت سے باہر نکلتی ہوئی نظر آرہی تھی۔

”یہ یرغمالی تمہیں کہاں ملا تھا؟ آگے آؤ اور جرگے کے روبرو پوری کہانی سناؤ“ صبغت اللہ نے حکم دیا۔

جنت گل نے کسی جھجک کے بغیر عبدالرحیم کے فلیٹ میں پیش آنے والے واقعات بیان کرڈالے۔

”تم نے یہاں کی زندگی سے بچنے کے لیے یہ اعتراف کیا ہے اس لیے اس پر اعتبار نہیں کیا جاسکتا....“ صبغت اللہ نے گمبھیر لہجے میں اپنی بات شروع کی لیکن جنت گل نے پھر کر بات کاٹ دی۔

”ضیغم خان اور گوہرجان کے بیان پر تم سب نے مان لیا کہ میں پائندہ گل کا خون ہوں۔ اب میں اقرار جرم کررہی ہوں۔ یرغمالی بھی یہاں موجود ہے۔ اس سے پوچھ لو' فیصلہ ہوجائے گا۔ یہ لکھ لو کہ میں یہاں رہوں گی' نہ کسی وحشی شنگاری کو اپنے قریب آنے دوں گی۔ مجھے اس عذاب کے مقابلے میں اپنی موت زیادہ آسان لگتی ہے“ جنت گل نے فاتحانہ لہجے میں کہا ”ہر رات مرمر کر برسوں زندہ رہنے سے ایک بار مرجانا بہت بہتر ہوگا۔ میں تمہاری مجرم ہوں' مجھے مارڈالو۔“

وہ اس جرگے کا نازک ترین موڑ تھا۔ میرے دل کی دھڑکنیں تیز ہوگئیں اور بدن میں سنسنی کی لہریں دوڑنے لگیں۔ آخر کار میری باری بھی آہی گئی تھی۔ لمحہ بھر کے لیے مجھے چھوٹے خان کی ماں یاد آگئی جس نے اپنے بیٹے کی بے گناہی ثابت کرنے کے لیے جھوٹی گواہی دی تھی پھر کوڑھ میں مبتلا ہوکر چل بسی تھی لیکن پھر میرے ذہن پر دوسری باتیں غالب آگئیں۔

میں نے سوچا کہ میں جھوٹ بولنے کے بجائے حقیقت کا اعتراف کرلوں لیکن اس وقت تک مجھے یہ معلوم نہیں تھا کہ اس اعتراف کے نتیجے میں میرے ساتھ کیا سلوک کیا جائے گا۔ اگر اعتراف جرم کے نتیجے میں مجھے مجبور یرغمالی قرار دے کر معاف بھی کردیا جاتا تو جنت گل بہرحال موت کی سزاوار ٹھہرائی جاتی اور میں صبغت اللہ کے قہر کا نشانہ بن جاتا۔ اس نے صندل خان کو جس بے رحمی کے ساتھ مروایا تھا اس کے پیش نظر یہ بات بہت واضح تھی کہ میں بے بس یرغمالی قرار دے کر شنگاری جرگے کی طرف سے بری کردیا جاتا' تب بھی صبغت اللہ کے عتاب سے نہیں بچ سکتا تھا۔ نہ صرف میری جان خطرے میں پڑتی بلکہ دیرا' غزالہ اور سلطان شاہ کو بھی دردناک انجام سے دوچار ہونا پڑتا۔ کینہ پرور صبغت اللہ کسی نہ کسی حیلے سے ہم چاروں کو موت کی اندھی وادیوں میں دھکیل دیتا۔

میں سچ بولتا تو پانچ انسانی جانیں ضائع ہوجاتیں۔ صبغت اللہ کی مرضی اور ہدایت کے مطابق بولا ہوا ایک جھوٹ پانچ جانیں بچاسکتا تھا۔ یہ دیگر بات تھی کہ اس جھوٹ کے نتیجے میں جنت گل کو اس کی مرضی کے خلاف ارسلا خان کی بیوی بن کر بادرانیوں کی افزائش نسل کا عذاب سہنا پڑتا۔

ایک بے گناہ انسانی زندگی کی حرمت بہرحال ہر چیز پر افضل تھی۔ جنت گل ماردی جاتی تو اس کی کہانی اسی لمحے ختم ہوجاتی۔ وہ زندہ رہتی تو اس کے ہر سانس کے ساتھ امید کا بندھن باقی رہتا۔ کبھی بھی کچھ بھی ہوسکتا تھا اور اس کے دن پلٹ سکتے تھے۔ سانس سے آس قائم رہتی ہے اس لیے اس وقت تباہ کن سچ کے مقابلے میں دروغ مصلحت آمیز ہر لحاظ سے مناسب تھا مگر میں پھر بھی تذبذب میں مبتلا تھا۔

”ڈینی!“ سردار صبغت اللہ کی گونجیلی آواز نے مجھے چونکادیا ”تم نے قندوز خان سے سن لیا ہوگا کہ یہ عورت کیا کہہ رہی ہے۔ تم پائندہ گل اور عبدالرحیم خان کے یرغمالی تھے۔ سچ سچ بتاؤ کہ حقیقت کیا تھی؟؟“

”یہاں آکر بیان دو“ جرگے کے معمر ترین رکن نے اپنے سامنے اشارہ کرکے کہا۔ میں نے اپنی جگہ چھوڑدی اور جرگے کے اراکین کی طرف چل دیا۔ اس وقت میرے قدم منوں وزنی ہورہے تھے اور ذہن میں خیالات کے ہولناک گرداب چکرا رہے تھے۔ سچ یا جھوٹ؟ کربناک موت یا زندگی؟ اس وقت یہی دو سوال ہر خیال کا محور تھے۔

جرگے کے سامنے پہنچ کر مجھے یاد آیا کہ اس اجلاس کے بارے میں صبغت اللہ نے قندوز خان کو اپنے اعتماد میں نہیں لیا تھا۔ میری باتوں نے اس کے دل میں قدرے بدگمانی بھی پیدا کردی تھی لیکن سوال یہ سامنے آتا تھا کہ کیا قندوز خان اپنے سردار سے برگشتہ ہوکر ہمارے ساتھ اس حد تک جاسکتا تھا جس حد تک صندل خان نے پیش قدمی کی تھی؟ بدقسمتی سے اس سوال کا جواب نفی میں تھا۔ میں بے بسی سے اپنے برابر میں کھڑے ہوئے قندوز خان کی طرف دیکھ کر رہ گیا۔

”یہ جھوٹی ہے“ میری زبان غیرارادی طور پر چل پڑی ”یہ مجھ پر سراسر بہتان ہے۔“

”کیا؟“ جنت گل بے اعتباری سے دہاڑی ”کسی نے ان پہاڑوں کے سنگریزوں کو اس طرح نہ چھانا ہوگا جیسے تم نے میرے بدن کو دیکھا بھالا تھا اور اب تم کہہ رہے ہو کہ میں جھوٹی ہوں۔“

”اسے خاموش کردو!“ جرگے کے ایک رکن نے تیوریاں چڑھاکر غصیلے لہجے میں کہا ”یہ عورت اپنی بات کہہ چکی ہے۔ اسے گواہ کے بیان میں دخل انداز ہونے کا حق نہیں ہے۔ اس کی بدکلامی اور زبان درازی جاری رہی تو ہم ایک ہفتے تک بھی کسی فیصلے پر نہیں پہنچ سکیں گے۔“

وہ ہدایت جاری ہوتے ہی ایک شنگاری بجلی کی سی تیزی سے اپنی جگہ سے اٹھا اور جنت گل کی طرف دوڑ پڑا۔ جنت گل نے اس کے جارحانہ تیور بھانپ لیے۔ اس وقت قندوز خان میرے ساتھ کھڑا ہوا' ترجمانی کررہا تھا اس لیے جنت گل کو یہ معلوم نہیں ہوسکا کہ جرگے کی طرف سے کیا حکم صادر کیا گیا تھا لیکن اس کی چھٹی پوری طرح کام کررہی تھی۔ اس نے اپنی طرف آنے والے [illegible] رفتار شنگاری سے خوف زدہ ہوکر وسیع وعریض دربار ہال کے [illegible] کی طرف دوڑ لگانے کے بجائے اپنی جگہ پر حملہ کرنے کا [illegible] انداز اختیار کرلیا۔

وحشی شنگاری اپنی طاقت اور بھاری جسامت کے زعم میں [illegible] شکاری عقاب کی طرح بڑھتا رہا جو فضا میں غوطہ مار کر' اپنے [illegible] کی ایک ہی کاری ضرب سے اپنے شکار کو نیم مردہ کرکے پنجوں [illegible] دبوچ لیتا ہے۔ پھر جو کچھ ہوا وہ کسی کے وہم وگمان میں بھی نہیں [illegible] وہ شنگاری جنت گل سے ذرا ہی دور تھا کہ وہ اپنے قدموں پر [illegible] اچھلی اور اس کے پیروں کا رخ شنگاری کی طرف ہوگیا۔ وہ [illegible] ہوئی آئی کچھ اس کی رفتار اور پھر شنگاری کے دیوہیکل وجود کی [illegible]' جنت گل کی لاتیں ایک دھماکے کے ساتھ اس شنگاری کے [illegible] پر پڑیں اور وہ بری طرح ڈکارتا ہوا قالین پر ڈھیر ہوگیا۔ جنت [illegible] گل نے ہتھیلیاں ٹیک کر اپنا توازن سنبھالا اور بہت پھرتی کے ساتھ اگلے وار کے لیے تن کر کھڑی ہوگئی۔ اس کی برق رفتار [illegible] کارکردگی پر کئی لوگوں کے منہ سے بے ساختہ تحیرزدہ آوازیں نکل [illegible] گئیں۔

جسمانی طاقت اور ہتھیاروں کے بل پر لڑنے والے شنگاریوں [illegible] کے لیے جنت گل جیسی نرم ونازک لڑکی کی وہ مہارت حیرت ناک [illegible] تھی۔ وہ سوچ بھی نہیں سکے ہوں گے کہ جنت گل اپنے وجود سے کئی [illegible] گنا بھاری حریف کو یوں آناً فاناً میں ڈھیر کردے گی۔ قالین پر گرنے [illegible] والا شنگاری خفت اور جھلاہٹ کے عالم میں قالین سے اٹھا ہی تھا کہ جنت گل نے دوبارہ فضا میں اڑ کر اس پر لاتیں چلائیں۔ اس بار اس نے شنگاری کے سر اور چہرے کو نشانہ بنایا تھا۔ وہ غضب ناک [illegible] کراہوں کے ساتھ ایک مرتبہ پھر قالین پر الٹ گیا۔ مجھے خود بھی جنت گل کی اس مہارت کا علم نہیں تھا۔ میری دانست میں دیرا کو مارشل آرٹس پر قابل رشک عبور حاصل تھا اور وہ کئی نازک مواقع پر اس کا بھرپور مظاہرہ کرچکی تھی لیکن ہر طرف سے گھری ہوئی جنت گل نے چند ہی لمحوں میں اپنی مہارت کی دھاک بٹھادی تھی۔

جنت گل ایک جگہ رکنے کے بجائے دونوں ہتھیلیاں کھول کر [illegible]انہ انداز میں اپنے گرے ہوئے حریف کے گرد تھرک رہی [illegible] گھومتے ہوئے وہ غیرارادی طور پر قندوز خان کے قریب سے [illegible] اس کی توجہ اپنے شکار کی طرف متوجہ تھی۔ اس کی پشت قندوز خان کی طرف تھی۔ معاً قندوز خان کسی چیتے کی سی خاموشی سے حرکت میں آیا اور اس نے پیچھے سے جنت گل کی داہنی کنپٹی پر اپنا فولادی [illegible] جڑدیا۔ جنت گل ایک چیخ کے ساتھ لڑکھڑا کر قالین پر گری اور [illegible] ساکت ہوگئی۔ قندوز خان کی مردانہ ضرب نے اسے بے [illegible] کردیا تھا۔ گوہرجان دوڑ کر اس کے بدن سے لپٹ گئی۔

ایک بے بس اور کمزور عورت کے خلاف دو دیوپیکر شنگاریوں [illegible] کی محاذ آرائی شرم ناک تھی لیکن وہاں اس کھلی ہوئی دھاندلی اور [illegible] بے رحمی پر احتجاج کرنے والا کوئی نہیں تھا۔ قندوز خان بے پروایانہ انداز میں اپنی جگہ پر لوٹ آیا۔ جنت گل سے مار کھانے والا شنگاری قالین سے اٹھا تو اس کے چہرے پر کئی خون آلود لکیریں پھیلتی جارہی تھیں۔ جنت گل کے چرمی جوتوں نے اس کا چہرہ خاصا بگاڑدیا تھا۔

وہ غضب ناک انداز میں جنت گل کے بے ہوش جسم کی طرف بڑھا مگر صبغت اللہ کی درشت آواز نے اسے رکنے پر مجبور کردیا۔ صبغت اللہ نے تسلسل کے ساتھ کئی تحکمانہ فقرے ادا کیے لیکن قندوز خان نے ان کا ترجمہ نہیں کیا۔ وہ خاموش ہوا تو قندوز خان نے مجھے اپنا بیان جاری رکھنے کے لیے کہا۔

”جنت گل بلاشبہ ایک نڈر اور بے باک لڑکی ہے“ میں نے اس کی جائز تعریف سے اپنا سلسلہ کلام جوڑتے ہوئے کہا ”لیکن میرے بارے میں اس نے جو کچھ کہا' وہ ایک شرمناک افسانے سے زیادہ نہیں ہے۔ یہ درست ہے کہ پائندہ گل نے مجھے اغوا کروایا تھا' عبدالرحیم خان نے مجھے اپنے گھر میں محبوس رکھا تھا اور وہاں میں نے پہلی بار جنت گل کو دیکھا تھا۔ یہ اسی گھر میں چھوٹے خان کے ساتھ رہتی تھی۔ میں الگ کمرے میں بند رہتا تھا۔ چند ملاقاتوں کے علاوہ ہمارے درمیان کوئی دوسرا رشتہ یا تعلق موجود نہیں تھا۔ وہ کسی شنگاری یا بادرانی کی عورت بننے سے مرجانا بہتر سمجھتی ہے اس لیے اس نے ایسی کہانی تراشی ہے جس کا نتیجہ اس کی موت کی صورت میں نکلے۔“

”اگر وہ عبدالرحیم خان کے ساتھ رہتی تھی تو پھر اس نے اس کا خون کیوں کیا؟ کہا جاتا ہے کہ جنت گل نے وہ خون تمہاری موجودگی میں کیا تھا؟“ جرگے کی طرف سے سوال کیا گیا۔

جنت گل بے ہوش تھی اور اس کی طرف سے میرے بیان میں مداخلت کا کوئی خطرہ نہیں تھا اس لیے میں نے اختصار کی نیت سے کہا ”قتل میری موجودگی میں ضرور ہوا مگر میرے سامنے نہیں ہوا۔ میں اپنے کمرے میں بند تھا۔ میں نے ان دونوں کے زور زور سے بولنے کی آوازیں سنی تھیں۔ شاید وہ کسی بات پر لڑرہے تھے لیکن ان کی بولی میری سمجھ سے باہر تھی۔ پھر ایک فائر اور چیخ کی آواز آئی۔ کوئی فرش پر گرا' اس کے بعد سناٹا ہوگیا۔ تھوڑی دیر بعد جنت گل نے میرے کمرے کا تالا کھول کر بتایا کہ عبدالرحیم خان مرچکا تھا۔ وہ فلیٹ سے فرار ہورہی تھی۔ اس نے مجھے بھی آزاد کردیا اور میں وہاں سے نکل کھڑا ہوا۔ ہوسکتا ہے کہ جنت گل نے چھوٹے خان کو مارا ہو۔ یہ بھی ہوسکتا ہے کہ اس کا کوئی ساتھی پہلے ہی چھوٹے خان کو مار کر میری لاعلمی میں بھاگ نکلا ہو۔ میں اس بارے میں کچھ نہیں جانتا۔“

”تم یرغمالی بنائے گئے تو قصہ کچھ اور تھا“ جرگے کی طرف سے اگلا سوال کیا گیا ”تم بھاگے یا تمہیں چھوڑا گیا' وہ قصہ وہیں نمٹ گیا تھا۔ پھر تمہیں دوبارہ اغوا کرکے یہاں لانے کی کیا ضرورت پیش آئی؟“

”یہ سردار صبغت اللہ کو معلوم ہے۔ وہ ہمیں لانے والوں کا

سرخیل تھا" میں نے کہا۔

"سردار فریق نہیں بنایا جاسکتا۔ سوال تم سے کیا گیا ہے۔ اس کا جواب تم ہی دو گے۔" "پائندہ گل چاہتا تھا کہ میں جنت گل کو تلاش کرکے گالان لانے میں اس کی مدد کروں۔"

"کیوں؟" جرگے کے ایک رکن نے اس باریک نکتے کو پکڑلیا تھا اور مجھے وحشت ہونے لگی تھی۔

"وہ جنت گل سے اپنے بھانجے کے خون کا بدلہ لینا چاہتا تھا۔ اسے یقین تھا کہ چھوٹے خان کو جنت گل نے مارا ہے۔"

"کیا یہ کام وہ اپنے آدمیوں سے نہیں لے سکتا تھا؟" مجھ سے وہ چبھتا ہوا سوال پوچھا گیا۔

"اس کا جواب وہی دے سکتا تھا۔ اس نے بتایا تھا کہ شنگاری دور سے پہچان لیے جاتے ہیں اس لیے وہ جنت گل تک پہنچنے میں کامیاب نہیں ہوسکیں گے۔ میں آسانی سے اسے گھیرلوں گا۔"

"تم ہی کیوں؟ اس کام کے لیے کابل میں کرائے کے آدمی مل سکتے تھے۔ تم لوگوں کو کس مقصد کے لیے سیکڑوں میل دور سے اٹھا کر لایا گیا تھا؟ پائندہ گل نے تم سے تخلیئے میں کیا راز و نیاز کیے تھے؟"

جرگے کے اس رکن نے مجھے سخت امتحان میں ڈال دیا تھا۔ صبغت اللہ نے میرے ساتھ جو کچھ طے کیا تھا' بات ان حدود سے تجاوز کررہی تھی۔ جنت گل کے بارے میں فیصلہ کرنے کے لیے وہ سوال کلیدی اہمیت رکھتا تھا اور مجھے علم نہیں تھا کہ صبغت اللہ جواب میں میری زبان سے کیا سننا پسند کرے گا۔ چند ثانیوں کے لیے میرا ذہن چکرا کر رہ گیا تھا۔ کیا کہوں؟ کیا نہ کہوں؟ میں ایک بنیادی جھوٹ بول چکا تھا۔ اب اسے نبھانے کی باری تھی۔ میرے سامنے صرف ایک بات واضح تھی کہ سردار صبغت اللہ ہر قیمت پر جنت گل کو زندہ رکھ کر ارسلا خان کی بیوی بنانا چاہتا تھا اور یہ اسی وقت ممکن تھا جب جنت گل کا دامن بالکل بے داغ ثابت ہوتا۔

اگر میں یہ اعتراف کرلیتا کہ پائندہ گل نے بھی اسی کہانی پر بات کی تھی جسے میں جھوٹ قرار دے چکا تھا تو میرا وہ جواب کہ جنت گل نے کسی بادرانی کی بیوی بننے سے بچنے کے لیے موت کے راستے کا انتخاب کیا تھا' غلط ثابت ہوجاتا۔ جرگے کو یقین ہوجاتا کہ جنت گل نے وہ کہانی فی البدیہہ نہیں تراشی تھی بلکہ اس کی کچھ نہ کچھ بنیاد تھی اور پائندہ گل کو بھی ان قصوں کی سن گن مل چکی تھی۔ وہ بات طے ہوجانے کے بعد جنت گل کو الزام سے بچانا ناممکن ہوجاتا اور جنت گل کے ساتھ ہی ہم چاروں کی جانیں بھی خطرے میں پڑجاتیں۔

میری خاموشی سے صبغت اللہ نے میری الجھن بھانپ لی' اس نے کہا "اس وقت جرگے کے سامنے جنت گل کی پارسائی کا معاملہ درپیش ہے۔ شاید اسی مقصد کے لیے اب ہم نے بھٹکنا شروع کردیا ہے۔"

"میرا ہر سوال بہت اہم ہے" مجھے بند راستے پر لانے والے رکن نے قدرے برہمی سے کہا "ڈپٹی کہہ چکا ہے کہ جنت گل نے سردار صبغت اللہ کے ارادوں سے واقف ہونے کے بعد مرنے کا ارادہ کرکے ایک کہانی گھڑلی ہے۔ اگر پائندہ گل کی زندگی میں یہ سوال اٹھایا گیا تھا تو گواہ جھوٹا ثابت ہوجاتا ہے۔"

وہ ان ہی خطوط پر سوچ رہا تھا جو مجھے خوف زدہ کررہے تھے۔

"فلک شیر خان!" جرگے میں سے ایک اور آواز ابھری "سردار صبغت اللہ کا خیال درست ہے۔ تم معاملہ سلجھانے کے بجائے الجھانے کی کوشش کررہے ہو۔ اگر جنت گل بدکار ہوتی تب بھی پائندہ گل کو کیسے پتا چل سکتا تھا کہ ایسی کوئی بات ہوئی ہے؟ وہ خودسر اور ضدی آدمی تھا ذرا ذرا سی بات کو انا کا مسئلہ بنالیتا تھا۔ ہوسکتا ہے کہ ان چاروں کو یہاں لانے میں بھی اس کی ایسی ہی کوئی ضد کارفرما رہی ہو۔"

"یہ فلک شیر خان پر الزام ہے" جرگے سے اٹھنے والی تیسری آواز سے برہمی مترشح تھی "فلک شیر کی پائندہ گل سے گہری دوستی تھی تو اس سے کڑوی باز پرس کرنے کا حق نہیں چھینا جاسکتا۔ جرگے کے ہر رکن کو اپنی اپنی صوابدید کے مطابق حقیقت کا کھوج لگانے کا پورا پورا اختیار ہے۔ اس کی زبان بندی نہیں کی جاسکتی۔"

"زہریلی باتیں مت کرو ورنہ یہاں لاشیں گرجائیں گی" جرگے میں ایک شخص جوش میں آکر اٹھ کھڑا ہوا "ہمیں جلد از جلد کوئی فیصلہ کرنا ہے۔ جرگے کا ہر آدمی فلک شیر خان کی طرح بال کی کھال نکالتا رہا تو ہم کہیں کے نہیں رہیں گے۔ یہ زبان بندی نہیں' عقل مندی کی راہ ہے جس پر چلنا سب کا فرض ہے۔"

پھر بہت سے اراکین ایک ساتھ بولنے لگے اور تقریباً سب ہی اپنی اپنی جگہوں سے اٹھ کھڑے ہوئے۔ ان کے لہجوں میں تیزی تھی اور وہ اونچی آوازوں میں بول رہے تھے۔ فضا بہت خطرناک ہوچلی تھی۔

جنت گل اس وقت بھی بے ہوش پڑی ہوئی تھی۔ اس کی ماں اسے کھینچ کر ایک کونے میں لے گئی تھی اور اس کا سر اپنے زانو پر رکھ کر ہولے ہولے سہلا رہی تھی۔ کسی نے بھی گوہر جان کو روکنے یا ٹوکنے کی ضرورت محسوس نہیں کی تھی۔ اس کے چہرے سے ممتا کا کرب جھلک رہا تھا اور پرامید نگاہیں اپنی بیٹی کے چہرے پر مرکوز تھیں۔

ادھر جرگے کے اراکین میں تلخ کلامی بڑھتی ہی چلی گئی۔ کئی غصیلے معززین نے اپنے بدن پر سجے ہوئے آتشیں ہتھیار اپنے ہاتھوں میں لے لیے۔ رفتہ رفتہ اس تکرار نے چیخ پکار یا شاید گالی گلوچ کی صورت اختیار کرلی۔ پھر اچانک ہی کسی نے مشتعل ہوکر دو ہوائی فائر کردیے۔

بارود کی بدبو اور سرمئی دھوئیں کی لہراتی ہوئی لکیریں چھوڑتی ہوئی گولیاں پھوس کی چھت پھاڑ کر اوپر نکل گئیں۔ جواب میں بیک وقت کئی اور ہتھیار بھی گنگنا اٹھے۔ لمحہ بھر بعد وہ سب ہی ایک دوسرے پر آنکھیں نکال کر غراتے ہوئے ہوائی فائرنگ کررہے تھے اور فضا میں دھواں بھرتا جارہا تھا۔

صورت حال بہت تیزی سے بگڑ رہی تھی۔ چھت کی طرف اٹھی ہوئی' آگ اگلتی ہوئی بے رحم نالوں کا رخ کسی بھی لمحے کشادہ چھاتیوں کی طرف ہوسکتا تھا۔ سردار صبغت اللہ غصے میں دھاڑتا ہوا اپنی مسند سے اٹھ کھڑا ہوا۔

اس کی آواز میں نہ جانے کیا تاثیر تھی کہ فائرنگ کا سلسلہ فوراً ہی موقوف ہوگیا۔ جرگے کے چند لوگوں نے شکایتی لب و لہجے میں صبغت اللہ سے کچھ کہا۔ اس نے تیور بدلے بغیر انہیں جوابات دیے اور پھر بگڑے ہوئے تیور سدھرنے لگے۔ رفتہ رفتہ جرگے کے اراکین نے اپنی جگہیں سنبھالنی شروع کردیں۔

چند ثانیوں تک فضا میں ان سب کی ہلکی آوازوں کی بھنبھناہٹ گونجتی رہی پھر فلک شیر خان نے میری طرف متوجہ ہوکر کہا "میری بات کا جواب دو۔ پائندہ گل نے تنہائی میں تم سے کیا باتیں کی تھیں؟"

قدوز خان سے فلک شیر خان کے سوال کا ترجمہ سن کر میں نے اندازہ لگالیا کہ بگڑی ہوئی صورت حال کو سنبھالنے کے لیے صبغت اللہ کو اپنے حریفوں کا حق تسلیم کرنا پڑا تھا۔ جرگے میں ہڑبونگ اور افراتفری پھیلنے کے باوجود میرے سر پر مسلط سوال نہیں ٹالا جاسکا تھا۔

ان لوگوں کی باہمی تکرار کی وجہ سے مجھے اس بارے میں سوچنے کا موقع مل گیا تھا اس لیے دوسری بار میں نے زیادہ وقت لیے بغیر کہنا شروع کردیا "بات بہت عجیب سی تھی۔ میں اس کا ذکر زبان پر لاکر مرحوم پائندہ گل کی روح کو شرمانے سے گریز کررہا ہوں۔ اب مجبور کردیا گیا ہوں تو بولنا پڑ رہا ہے....."

"تم پائندہ گل کی روح کے شرمانے کی فکر نہ کرو" فلک شیر خان نے تلخی سے کہا "اس کی ہمدردی میں یہاں اب تک جو کچھ کہا گیا ہے' وہ قالین میں لپٹے ہوئے جوتوں سے کم نہیں تھا۔ تمہارے بیان سے اس میں کوئی کمی بیشی نہیں ہوگی کیونکہ تم باہر کے باسی ہو۔ تم بے فکر ہوکر اپنی بات کہہ جاؤ۔"

صبغت اللہ نے اپنی مسند پر پہلو بدل کر زور سے کھنکھارا۔ میں نے لمحہ بھر کے لیے اس کی طرف گردن گھمائی تو وہ اپنی دونوں مٹھیاں بھینچے' چھت میں پیدا ہوجانے والے شگافوں کو گھور رہا تھا۔

"وہ چاہتا تھا کہ میں جنت گل کو تلاش کرکے گالان لاؤں اور پھر اس سے شادی کرنے کا دعوے دار بن جاؤں" میرے وہ الفاظ ہر ایک کے لیے دھماکا خیز ثابت ہوئے اور وہاں ایک بار پھر تحیر زدہ سرگوشیاں پھیلنے لگیں۔ سردار صبغت اللہ بھی شدید حیرت اور بے یقینی سے میری طرف دیکھ رہا تھا۔ اس کے چہرے پر جھلاہٹ اور تشویش کے بجائے فتح مندانہ سی مسکراہٹ ناچنے لگی تھی۔

"وہ جنت گل کو ہلاک کرکے اس سے چھوٹے خان کے خون کا بدلہ لینا چاہتا تھا اور تم کہہ رہے ہو کہ وہ تمہاری اور جنت گل کی شادی کا آرزو مند تھا۔ تم یہ کیا بک رہے ہو؟" فلک شیر خان

"یہ بات کوئی نہیں سمجھ سکے گا اسی لیے میں نے اپنی زبان بند رکھی ہوئی تھی" میں نے متاسفانہ لہجے میں کہا "اس نے مجھ سے کھل کر باتیں کی تھیں۔ اس کے کرب کی ابتدا اس وقت ہوئی جب اس کو کمزور اور بوڑھا سمجھ کر گالان کی عورتوں نے چھوٹے خان کی میت پر گریہ و ماتم کیا تھا۔ انہوں نے مرنے والے کو لاوارث سمجھ کر پائندہ گل کی تذلیل کی تھی۔ وہ اپنی ساکھ بگڑنے پر افسردہ ہونے کے ساتھ ساتھ برہم بھی تھا۔ اس نے اپنی ساکھ بحال کیے بغیر اپنے اختیارات کے استعمال سے دستبردار ہوکر گوشہ نشینی اختیار کرلی تھی۔ اسے بری طرح احساس ہوا تھا کہ اپنی رعایا پر اس کی گرفت کمزور ہوگئی ہے۔ اپنے جاہ و جلال کی بحالی کے لیے وہ عبدالرحیم خان کی قاتلہ کو گالان لانا چاہتا تھا مگر اس کے دل میں اپنی بیٹی کے لیے نرم گوشہ بھی موجود تھا۔ اس نے مجھے سمجھایا کہ جب جنت گل کو مجرم قرار دے کر موت کی سزا سنائی جائے تو میں اس سے شادی کی خواہش کا اظہار کروں۔ ساتھ ہی اس کی طرف سے چھوٹے خان کا خون بہا دینے کی پیش کش کروں۔ وہ پانچ لاکھ کے خوں بہا کا مطالبہ کرے اور میں اسے فوراً مان لوں۔ یہ رقم وہ مجھ کو خفیہ طریقے سے خود ہی فراہم کرتا اور میں کھلے جرگے میں رقم اس کے حوالے کرکے جنت گل کو حاصل کرلیتا۔ اس طرح اس کی ساکھ بحال ہوجاتی اور جنت گل بھی موت کے چنگل میں جانے سے بچ جاتی۔"

"مگر تم شادی شدہ ہو" اپنے سوال کا جواب آنے پر فلک شیر خان بہت زیادہ نادم نظر آنے لگا تھا "تم نے یہ بات کیسے مان لی؟ شنگارا ویلی میں انتقام یا خون بہا کا قانون رائج ہونے کے باوجود خون بہا لینے یا دینے کی کوئی روایت نہیں رہی ہے۔ پھر پانچ لاکھ کی رقم پوری وادی میں کوئی نہیں دے سکتا تھا۔"

میں نے اپنی کہانی کا تانا بانا ان باتوں کے گرد بنا تھا جو میں سنتا چلا آیا تھا اس لیے میں نے اطمینان سے کہا "میری بیوی بھی یہاں موجود تھی۔ میں نے پائندہ گل سے سب کچھ کہا مگر وہ انا پرست اور ضدی آدمی تھا۔ اپنے سر میں سما جانے والی ہر بات کو ہر قیمت پر پورا کرنا چاہتا تھا۔ اس نے کہا کہ میں ایک نہیں بلکہ چار شادیوں کا حق رکھتا ہوں۔ میرے پاس کوئی دوسرا راستہ نہیں تھا۔ اپنی بات مان لینے کی صورت میں وہ مجھے پانچ لاکھ کا خفیہ انعام بھی دیتا۔ ایک طرف جنت گل جیسی حسین و جمیل دوشیزہ اور پانچ لاکھ کے ساتھ باعزت آزادی کا راستہ تھا دوسری طرف ہم چاروں کی حادثاتی موت کا خطرہ تھا۔ مجھے اس کی خواہش کے سامنے سر جھکانا پڑا۔ یہ اور بات ہے کہ پھر حالات بدلتے چلے گئے اور اس کی سوچی ہوئی کوئی بات پوری نہ ہوسکی۔ میں دوبارہ اس سے نہیں مل سکا۔"

"شاباش!" صبغت اللہ کی تحسین آمیز آواز گونجی "تم نے اس حقیقت پر سے پردہ اٹھایا ہے جو میری آنکھوں سے بھی اوجھل تھی۔ کسی قاتل سے خون بہا لے کر پائندہ گل یہاں ایک خطرناک روایت کی داغ بیل ڈال دیتا۔ پیسے والے غریبوں کو پیس کر رکھ دیتے۔ جب چاہتے' ان کے خون سے ہولی کھیلنی شروع کردیتے اور

مرنے والوں کے وارثوں کے منہ پر رقم دے مارتے۔ وہ ضدی اور انا پرست ہی نہیں' بلا کا مکار اور خود غرض بھی تھا۔ اس کی نسل فنا ہو رہی تھی اور وہ دوسروں کی نسلیں ختم کرنے کا بھیانک منصوبہ بنا رہا تھا۔"

پھر وہ جرگے سے مخاطب ہوگیا "فلک شیر خان! تم نے اپنے دوست کے کرتوت سن لیے؟ تمہارا دل بھر گیا یا اب بھی دبی ہوئی چنگاریوں کو کریدنے کا ارادہ رکھتے ہو؟"

"مجھے پائندہ گل سے دوستی کا طعنہ نہ دو" فلک شیر خان نے شکست خوردہ آواز میں کہا "جرگے میں بیٹھنے کے بعد کوئی کسی کا دوست یا دشمن نہیں رہتا۔ وہ صرف منصب ہوتا ہے اور انصاف کے لیے سچائی کو تلاش کرنا اس کا فرض ہوتا ہے۔ میں نے اپنا فرض پورا کیا ہے۔ مجھے اس پر کوئی ملال نہیں ہے۔"

"تمہارا بیان ہوگیا۔ اپنی جگہ پر لوٹ جاؤ!" جرگے کے معمر ترین رکن کی طرف سے میرے لیے ہدایت آئی اور میں اس کڑے امتحان میں سرخرو رہنے پر دل ہی دل میں خدا کا شکر ادا کرتا ہوا اپنی جگہ پر لوٹ آیا۔ اس بار قندوز خان نے میرا پیچھا کرنے کے بجائے صبغت اللہ کی مسند کا رخ کیا تھا۔

جنت گل کی ولدیت کا فیصلہ ہو چکا تھا۔ اس وقت جرگے کے ارکان سر جوڑ کر اس کی بے گناہی اور پاکبازی کے بارے میں کسی نتیجے پر پہنچنے کی کوشش کر رہے تھے جب کہ جنت گل' قندوز خان کی لگائی ہوئی وحشیانہ ضرب کے نتیجے میں بدستور بے ہوش تھی اور اس کی گونگی ماں ایک علیحدہ گوشے میں اسے سنبھالے ہوئی بیٹھی تھی۔ ضیغم خان کسی یتیم اور لاوارث کی طرح اکیلا بیٹھا ہوا' خالی خالی نظروں سے اِدھر اُدھر دیکھ رہا تھا۔

"تم بہت گہرے نکلے" میرے واپس لوٹتے ہی ویرا پھٹ پڑی "اگر پائندہ گل نے تمہیں جنت گل سے شادی کرنے پر مجبور کیا تھا تو یہ بات چھپانے کی کیا ضرورت تھی؟ تم تو شادی سے پہلے ہی اسے حاصل کر چکے تھے۔ اس وقت تمہیں کس نے روک لیا تھا جو شادی پر ہم میں سے کوئی تمہارے آڑے آتا؟"

"خرافات سے پرہیز کرو" میں آنکھیں نکال کر غرّایا "میرے اور جنت گل کے تعلق کے بارے میں اب تم ایک لفظ بھی نہیں بولوگی۔ تم دیکھ چکی ہو کہ یہ انتہا پسند لوگ ذرا ذرا سی بات پر وحشت اور بربریت کے مظاہرے پر اتر آتے ہیں۔ شادی والی بات میرے ذہن کی پیداوار ہے۔ پائندہ گل نے ایسی کوئی بات نہیں کی تھی۔ اس بارے میں ہم بعد میں بات کرسکتے ہیں۔ فی الحال اس بات کو غنیمت سمجھو کہ یہاں سب کچھ صبغت اللہ کے منصوبے کے مطابق ہوا ہے۔ اس کے پروگرام میں خلل پڑتا تو ہم دشواریوں میں گھر سکتے تھے۔"

"بلاوجہ غصہ نہ دکھاؤ" ویرا مرعوب ہوئے بغیر بولی "تمہارا رول ختم ہو جانے کے بعد اب کوئی بھی ادھر متوجہ نہیں ہے۔ قندوز خان سمیت ہر شخص اپنے اپنے دھندے میں مصروف ہو چکا ہے۔ میں یہ مان ہی نہیں سکتی کہ تم نے اس وقت کے ذہنی دباؤ میں وہ کہانی فی الفور گھڑی ہوگی۔ اس میں کچھ نہ کچھ حقیقت ضرور رہی ہوگی۔ تم نے ہم تینوں کو اندھیرے میں رکھ کر اپنا کھیل کھیلنے کی جو کوشش کی ہے اس پر تمہیں شرم آنی چاہیے۔"

"ہمارے یہاں مرد کو چار شادیوں کا حق حاصل ہے" غزالہ نے ویرا سے مخاطب ہو کر ادا سی سے کہا "کوئی مرد اپنے اس حق کو استعمال کرنے پر تل جائے تو عورت اسے کسی قیمت پر باز نہیں رکھ سکتی۔"

"تم بھی اس کی باتوں میں آکر بہک رہی ہو" میں نے حیرت اور بے بسی سے غزالہ سے کہا "میں جرگے کے سامنے پائندہ گل کی اصل باتیں دہرا کر تباہی کا خطرہ مول نہیں لے سکتا تھا۔ میں قسم کھا رہا ہوں کہ میں نے جو کچھ کہا وہ من گھڑت تھا۔ اس کا حقیقت سے دور کا تعلق بھی نہیں تھا۔ تم بلاوجہ آزردہ ہو رہی ہو۔"

"قسم کھانے کے بعد میں کچھ نہیں کہہ سکتا" سلطان شاہ نے ملامت آمیز لہجے میں کہا "تم نے جو کچھ کہا وہ حقیقت سے بہت قریب معلوم ہوتا ہے۔ انا اور پدری محبت کی جنگ میں الجھ کر پائندہ گل صرف وہی فیصلہ کرسکتا تھا جو تم نے سنایا ہے۔ اس کہانی کی سچائی کا اس سے بڑا ثبوت کیا ہو سکتا ہے کہ جرگے کے اراکین بھی اسے تسلیم کرنے پر مجبور ہوگئے؟ خوشی کی بات یہ ہے کہ اب پائندہ گل کی جگہ صبغت اللہ مسند نشین ہے اور وہ جنت گل کو ارسلا خان کی بیوی بنانے پر تلا ہوا ہے ورنہ واپسی کے سفر میں ہماری نفری میں اس کا اضافہ ہو سکتا تھا۔"

"تم پر لعنت ہو" میں دانت پیستے ہوئے بولا "پھر وہی راگ الاپے جا رہے ہو۔ میں تمہارا سر توڑ دوں گا۔ تم دونوں مل کر غزالہ کو بھڑکانے کی کوشش کر رہے ہو۔ وہ میری بات سمجھ چکی ہے۔"

"مشکل یہ ہے کہ بعض اوقات تم پورے اعتماد کے ساتھ اتنا مدلل جھوٹ بولنے لگتے ہو کہ سچ اور جھوٹ میں تمیز کرنی دشوار ہو جاتی ہے۔" غزالہ نے پھیکی اور افسردہ مسکراہٹ کے ساتھ کہا "میں نے تمہاری قسم پر اعتبار کرلیا ہے لیکن جنت گل پانچ لاکھ کی انعامی رقم کے ساتھ میرے ذہن میں پنجے گاڑے بیٹھی ہے۔"

"تم اِدھر کیا لینے آ رہے ہو؟" ویرا کی غصیلی آواز نے مجھے چونکا دیا۔ وہ ضیغم خان کو گھور رہی تھی جو اپنی جگہ چھوڑ کر ہماری طرف چلا آ رہا تھا۔ ہر قدم کے ساتھ اُس کے چہرے کے نقوش بن اور بگڑ رہے تھے۔

"میں اکیلا بیٹھا بے زار ہو رہا ہوں۔ گوہر جان اپنی بیٹی کی تیمارداری میں لگی ہوئی ہے۔ اجازت ہو تو میں بھی تمہارے پاس بیٹھ کر اپنے دل کا غبار ہلکا کرلوں۔ ہمارے دکھ کچھ ایک جیسے ہی معلوم ہوتے ہیں" وہ مسکین صورت بنا کر بولا۔

"خبردار' جو ہمیں اپنے ساتھ ملایا" سلطان شاہ غرّایا "ہم میں سے کوئی جعلی باپ نہیں ہے۔"

وہ آہستگی سے ہمارے ساتھ آ بیٹھا اور معذرت خواہانہ لہجے میں بولا "میرا یہ مقصد نہیں تھا۔ میرا اشارہ خسارے کی طرف تھا ہم لوگوں کا مساوی نقصان ہوا ہے۔ ان ذلتوں اور صعوبتوں کے نتیجے میں کچھ بھی ہاتھ نہیں آسکے گا۔"

"تم کس نقصان کا رونا رو رہے ہو؟" ویرا نے اس کی طرف دیکھتے ہوئے طنز سے پوچھا۔

"کابل میں مجھے جنت گل کی شادی کے عوض پانچ لاکھ آسانی سے مل سکتے تھے۔ وہ یہاں رہ گئی تو میری رقم ماری جائے گی اور تم تو پائندہ گل کے مرنے کے بعد انعام کی رقم سے محروم ہو ہی چکے ہو۔ اس نے بھی تم سے اتنی ہی رقم کا وعدہ کیا تھا۔ کیا یہ عجیب اتفاق نہیں ہے؟" اُس کی آواز سے حسرت جھلک رہی تھی۔

"تم لاولد اور زندگی کے آخری حصے میں پہنچے ہوئے ہو۔ تمہیں رقم کی ہوس کیوں ہے؟" سلطان شاہ نے پوچھا۔

"رقم کی کسے ضرورت نہیں ہوتی؟" اس کی آواز بدستور حسرت زدہ تھی "کابل میں دس پانچ ہزار کے بغیر آدمی عزت سے مر بھی نہیں سکتا۔ اچھا کفن ملتا ہے نہ صاف ستھری قبر۔ بعد میں فاتحہ درود بھی نہیں ہوتا۔ رقم ہاتھ آجاتی تو ایک لاکھ میں میری ٹانگ ٹھیک ہو سکتی تھی۔ جنت گل کسی کی بھی اولاد ہو لیکن اسے میں نے پالا پوسا ہے۔ اب میں اپنے پروان چڑھائے ہوئے پودے کے ثمرے سے بالکل محروم رہ جاؤں گا۔ وہ مجھ سے مفت میں چھین لی جائے گی۔"

"ہم نے سنا ہے کہ جنت گل کی تعلیم و تربیت کے لیے پائندہ گل تمہیں وظیفہ دیتا تھا" سلطان شاہ بولا۔

"کون سا احسان کرتا تھا؟" وہ بُرا سا منہ بنا کر بولا "آخر وہ اسی کی اولاد تھی۔ دیکھ لو کہ میں نے وہ رقم برباد نہیں کی۔ اسے بہترین تعلیم دلائی۔ جنگی فنون کی تربیت دلائی۔ اُس نے اپنے سے کئی گنا طاقتور شنگاری کی جو درگت بنائی' اس پر سب ہی انگشت بدنداں رہ گئے تھے۔"

وہ بے غیرت ہی نہیں' ڈھیٹ بھی تھا۔ شرم سے زمین میں گڑ جانے کے بجائے ایسے اطمینان اور بے تکلفی سے باتیں کر رہا تھا جیسے اس کی نظر میں تلخ حقائق کی کوئی اہمیت ہی نہ ہو۔ میں کوشش کے باوجود' خود کو اس سے بات کرنے پر آمادہ نہ کرسکا۔ مجھے اس کی صورت ہی سے خباثت ٹپکتی نظر آ رہی تھی۔

آخر کار جرگے کے سب سے بوڑھے شخص نے بولنا شروع کردیا "ہم کسی فیصلے پر نہیں پہنچ سکے" سردار صبغت اللہ کا چہرہ یکلخت تاریک پڑ گیا۔ سفید بالوں والا کہہ رہا تھا "دونوں کا بیان برابر ہے۔ ایک کا اعتراف اور دوسرے کا انکار انصاف کے لیے ناکافی ہے۔ تینوں عورتوں کو یہاں سے بھیج دیا جائے۔ ہم جنت گل کے ہوش میں آنے کا انتظار کریں گے۔ اس سے پوچھ گچھ کے دوسرے دور کے بعد ہی کوئی فیصلہ ہو سکے گا۔"

میرے لیے وہ اعلان غیر متوقع ہی نہیں' سنسنی خیز بھی تھا۔ صبغت اللہ جرگے کے اراکین پر اپنی مرضی تھوپنے میں ناکام رہا تھا۔ پتا نہیں وہ لوگ جنت گل سے مزید کیا پوچھنا چاہ رہے تھے۔ انہوں نے ویرا اور غزالہ کو وہاں سے بھیجنے کی ہدایت دے کر بات کو مزید الجھا دیا تھا۔ مردانہ محفل میں شاید جنت گل سے زیادہ ہی کھلی کھلی باتیں ہونے والی تھیں۔

جرگے کی ہدایت پر قندوز خان سرگرم ہوگیا۔ ایک شنگاری ہمارے سروں پر مسلط ہوا۔ وہ ویرا اور غزالہ کو اپنے ساتھ لے کر گوہر جان کی طرف گیا پھر ان تینوں عورتوں کو دربار ہال سے باہر لیتا چلا گیا۔ دو شنگاریوں نے جنت گل کے منہ پر پانی کے چھینٹے مار کر اسے جلد از جلد ہوش میں لانے کی کوششوں کا آغاز کردیا تھا۔

تھوڑی دیر بعد جنت گل ہوش میں آتے ہی بدک کر قالین سے اٹھی تھی لیکن تیورا کر دوبارہ وہیں بیٹھنے پر مجبور ہوگئی۔ وہ پھٹی پھٹی نظروں سے چاروں طرف دیکھ رہی تھی۔ چند ثانیوں بعد اس کی اعصابی قوت بحال ہوئی تو شنگاریوں نے اسے اس کے قدموں پر کھڑا کرکے کچھ کہا۔ جنت گل اور ان دونوں کے درمیان چند مکالمات کا تبادلہ ہوا۔ پھر جنت گل جرگے کی طرف چل دی۔ شاید اسے یہ جان کر اطمینان ہوا تھا کہ اس کے بارے میں کوئی فیصلہ نہیں کیا جاسکا تھا۔

"جھوٹ اور سچ ایک دوسرے میں گڈمڈ ہو کر رہ گئے ہیں" جنت گل کے پہنچنے کے بعد جرگے میں سے ایک شخص نرمی سے بولنے لگا "کسی فیصلے پر پہنچنے کے لیے ہم تم سے کچھ اور بھی پوچھنا چاہتے ہیں۔"

"میں تیار ہوں" جنت گل نے اپنے دائیں بائیں نگاہیں دوڑاتے ہوئے کہا۔

"وادی کا نباض اعظم تمہاری کلائی کی دھڑکتی ہوئی رگ پر انگلیاں رکھ کر سچ اور جھوٹ کا فیصلہ کرے گا" اسی شخص نے کہا "جب عورت کوئی خطا کرتی ہے تو اس کے سانسوں میں ایک اور دھڑکن جنم لیتی ہے۔ شنگارا ویلی کا نباض دوہری دھڑکن کو پہچاننے میں ید طولیٰ رکھتا ہے۔ اب وہی سچ اور جھوٹ کا فیصلہ صادر کرے گا۔"

جنت گل کے چہرے پر وحشت لہرانے لگی "اسے میری نبض میں میرے دل کی دھڑکن کے سوا کچھ نہیں ملے گا" اس نے تیزی سے کہا "میں دوسری دھڑکن سے چھٹکارا حاصل کر چکی ہوں۔ شہروں کے لیے یہ باتیں بہت پرانی ہوگئی ہیں۔ اس طرح تم کبھی بھی انصاف نہیں کرسکوگے۔ میں گناہ گار تھی۔ میں جو کچھ کہہ رہی ہوں' وہ مان لو۔ یہی انصاف ہوگا۔"

"یعنی تم نے اس کا خون کردیا؟" اس نے حیرت اور تیزی کے ساتھ پوچھا۔

"اس طرح بات واضح ہو سکتی ہے تو تم یہی سمجھ لو" جنت گل نے آہستگی سے کہا۔

"پھر تم اعتبار کے قابل نہیں ہو" وہ ایک دم ہی طیش میں آگیا "گوہر جان بھی یہی کرسکتی تھی۔ وہ پائندہ گل کے گناہ کا ہر نشان مٹا سکتی تھی۔ اس نے ایسا کیا ہوتا تو آج یہاں یہ جرگہ منعقد کرنے کی ضرورت پیش نہیں آئی ہوتی۔ کوئی عورت اپنی اولاد کا خون نہیں کرسکتی۔ جو ایسا کرے' اس کے قول و فعل پر بھروسا نہیں کیا جاسکتا۔ تم نے اپنی باتوں سے خود کو کسی اعتبار کے لائق نہیں چھوڑا۔ تمہارا مقصد صرف اور صرف اس وادی کے باسیوں کو

ذلیل اور رسوا کرنا ہے۔ ہم تمہارے اعتراف کو مسترد کرتے ہیں۔ یہ سراسر جھوٹ ہے کہ تم نے پائندہ گل کے ریغمالی کی خلوت میں رسائی حاصل کی تھی۔ ریغمالی خود انکاری ہے تم ناقابل اعتبار ہو اور یہی ہمارا فیصلہ ہے۔"

پہلے جرگے کی کارروائی رینگ رینگ کر آگے بڑھ رہی تھی۔ فیصلہ ہونے کا وقت آیا تو بات اتنی تیزی سے آگے بڑھی کہ سب ششدر رہ گئے۔ لوگوں نے اپنی جگہیں چھوڑ دیں۔ دربار ہال کی فضا میں ملی جلی آوازیں گونجنے لگیں۔ صبغت اللہ کا چہرہ مسرت سے دمک اٹھا۔ جنت گل غصے اور مایوسی کے عالم میں پشتو اور انگریزی میں چیخ رہی تھی اور اسے ہوش میں لانے والے دونوں شنگاری اسے کشاں کشاں دروازے کی طرف لے جارہے تھے۔

"میں عقل اور دانش کی فتح پر جرگے والوں کو مبارک باد دیتا ہوں" صبغت اللہ اونچی آواز میں اپنی بولی میں کہہ رہا تھا اور قندوز خان مسرت بھری آواز میں مجھے بتارہا تھا "پائندہ گل کی بیٹی کو پاکباز قرار دے کر جرگے نے اپنی دھاک بٹھادی ہے۔ اب جنت گل بادرانیوں کی امان میں رہے گی۔ میں ارسلا خان کا وارث ہوں۔ میں نے اس کی طرف سے جنت گل کو مانگنے میں پہل کی ہے۔ اب یہ اسی کی بیوی بنے گی۔ میں پھر کہے دیتا ہوں کہ ارسلا خان کے معاملے میں پائندہ گل نے بدنیتی کی تھی۔ وہ ہر قیمت پر اپنے بھانجے کو بچانا چاہتا تھا اس لیے اس نے وادی کے نباض اعظم کی مدد نہیں لی۔ وہ آجاتا تو عبدالرحیم خان اور ارسلا خان کی نبضیں تھام کر ایک پل میں بتادیتا کہ ان دونوں کنواروں میں سے کس نے زرتاشہ کے ساتھ زیادتی کی تھی۔ ارسلا خان کے ساتھ آج جیسا انصاف نہیں ہوا۔ اس کے لیے امان دی جائے۔ میں سردار ہوں اور اس کا وارث بھی۔ یہ میری انصاف پسندانہ آرزو ہے' اسے پورا ہونا چاہیے۔"

"یہ بڑی بات ہے کہ تم سردار ہوتے ہوئے بھی اسے امان دینے کا اپنا حق استعمال کرنے کے بجائے ہم سے التجا کررہے ہو" سفید بالوں والے معتبر ترین شنگاری نے کہا "میں اس جرگے کی طرف سے اعلان کرتا ہوں کہ ارسلا خان ہمارا بھائی ہے اس کے لیے پوری وادی کھلی ہے۔ اسے یہاں امان ملے گی' اب جرگہ ختم ہوتا ہے۔"

دیو پیکر شنگاری جھپٹ جھپٹ کر ایک دوسرے سے بغل گیر ہونے لگے۔ بہت سے لوگوں نے صبغت اللہ کو گھیر لیا اور قندوز خان ہم دونوں کو لے کر باہر چل دیا۔ صبغت اللہ کی دلی مراد پوری ہوجانے کے بعد وہاں ہماری کوئی ضرورت باقی نہیں رہی تھی البتہ ضیغم خان وہیں بیٹھا رہ گیا تھا۔

"آج تم نے بازی بالکل الٹ دی" قندوز خان نے مہمان خانے کا راستہ اختیار کرتے ہوئے مسرت آمیز سرگوشیانہ آواز میں کہا "باہر آنے جانے والے شنگاری کئی دن سے کابل کی وہ کہانی سن رہے تھے جو آج جنت گل نے سنائی ہے۔ دوسروں سے کچھ کہے بغیر' ہم سب شرمسار تھے۔ ہمیں گمان بھی نہیں تھا کہ جنت گل اتنا بڑا جھوٹ بول رہی ہوگی۔ آج تم نے ہر شنگاری کو فخر سے اپنا سر اونچا کرنے کا موقع دیا ہے۔ بادرانی تو آج خوشی میں شراب سے نہائیں گے۔ جنت گل ان کے قبیلے کو مل گئی ہے۔ یہ بہت بڑی بات ہے۔ پائندہ گل اور اس کے بڑے' بادرانیوں کو اس قابل نہیں سمجھتے تھے۔"

"وہ دونوں جنت گل کو کہاں لے گئے ہیں؟" سلطان شاہ نے اس سے پوچھا۔

"اب وہ بادرانیوں کی عزت ہے۔ وہ گالان کی بستی میں رہے گی۔ اسے لے جانے والے ارسلا کے بھتیجے تھے۔"

"اور ہمارا کیا بنے گا؟" وہ قصہ نمٹنے کے بعد مجھے اپنی فکر لاحق ہوگئی تھی۔

"تم نے بہت پامردی سے جرگے کا سامنا کرکے سچ بولا ہے۔ سردار صبغت اللہ تم سے خوش ہوگیا ہوگا۔ اب تمہیں تمہاری مرضی کے خلاف یہاں نہیں روکا جائے گا۔ تم جب بھی اس وادی کا رخ کروگے' یہاں کے بچے بچے کو اپنا دوست بلکہ احسان مند پاؤگے۔ صبح تک جنت گل کی زہر فشانی کے گنے چنے لوگ ہی واقف تھے لیکن جرگے کے بعد سب کو معلوم ہوجائے گا کہ جنت گل نے ان کے لیے کیسی بھیانک رسوائی کا سامان کیا تھا۔ تم حقیقت بیان نہ کرتے تو سب کچھ خاک میں مل جاتا۔"

ویرا اور غزالہ کو توقع نہیں تھی کہ ہم جرگے سے اتنی جلدی واپس لوٹ آئیں گے۔ ویرا نے اپنی فکر مندی رفع کرنے کے لیے شراب نوشی شروع کردی تھی۔ غزالہ منہ لپیٹے بستر پر دراز تھی۔ گوہر جان وہاں موجود نہیں تھی۔

"کیا فیصلہ ہوا؟ تم لوگ بہت جلد فارغ ہوگئے؟" ہمیں دیکھتے ہی غزالہ نے بستر چھوڑ کر پوچھا۔

"جنت گل کو جھوٹا قرار دے دیا گیا۔ اب وہاں سب خوشیاں منارہے ہیں" سلطان شاہ نے منہ بنا کر کہا کیونکہ قندوز خان ہمیں چھوڑ کر مہمان خانے کے دروازے سے ہی واپس لوٹ گیا تھا۔

"ہم لوگوں کے آنے کے بعد وہاں کیا ہوا تھا؟" ویرا نے متجسس لہجے میں پوچھا۔

سلطان شاہ اسے جرگے کی بقیہ کارروائی کے بارے میں بتانے لگا اور میں بستر پر دراز ہوگیا۔

اس دلچسپ ترین داستان کے بقیہ واقعات تیرہویں حصے میں ملاحظہ فرمائیں